حیاتِ شبلی

یعنی

شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
کے
سوانح حیات اور علمی و عملی کارنامے

مرتبہ

(مولانا) سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

دار المصنفین شبلی اکیڈمی
اعظم گڑھ یو-پی (ہند) ۲۷۶۰۰۱

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ

حیاتِ شبلیؒ

یعنی

شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

کے

سوانح حیات اور علمی و عملی کارنامے

مرتبہ

(مولانا) سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی

اعظم گڑھ یو-پی (ہند) ۲۷۶۰۰۱

سلسلہ دارالمصنفین نمبر : ٦٦

نام کتاب : حیات شبلیؒ

نام مصنف : مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

صفحات : ٦٧٦

طبع جدید : اکتوبر ٢٠٠٨ء

مطبع : معارف پریس، اعظم گڑھ، یوپی

ناشر : دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 276001 یوپی (انڈیا)

قیمت :

باہتمام : عبدالمنان ہلالی

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O. BOX NO. 19
AZAM GARH- 276001 U.P. (INDIA)
Email: Shibli_academy@rediffmail.com
www. Shibliacademy.org
Ph: (office) 05462-265080
Ph: (library) 05462-265017

ISBN- 978-81-906613-8-6

فہرست مضامین

حیات شبلی رحمۃ اللہ علیہ

فہرست رجال حواشی

حیات شبلیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیاتِ شبلی رحمۃ اللہ علیہ

پیش نظر کتاب ایک ایسی ہستی کے اوراقِ سوانح ہیں، جس نے بتیس برس ۱۸۸۲ء-۱۹۱۴ء تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پُرشور رکھا۔

سالہا گوش جہاں زمزمہ زا خواہد بود　　زیں نواہا کہ دریں گنبدِ گردوں زدہ است[1]

سوانح کے ذرائع علم | خاک سار نے استاد مرحوم کی صحبت و تربیت میں آٹھ برس (۱۹۰۵ء-۱۹۱۲ء) تک مسلسل گزارے اور دو برس اس طرح کہ جسم کہیں اور رہا، مگر روح ہمیشہ ان کے ساتھ رہی، یہ دس برس درحقیقت ان کی بتیس برس کی علمی و قومی زندگی کے سب سے مصروف ایام تھے، بلکہ انہی کو ان کے ستاون برس کی زندگی کا حاصل کہا جا سکتا ہے، خود انہی کا شعر ہے:

ساغر زندگیم حیف کہ جز درد نداشت　　جز ہمیں جرعہ آخر کہ بہ پایاں زدہ ام

ان کے اس مصروف ترین حصۂ زندگی کے اکثر لمحات میری نظر کے سامنے گزرے ہیں، اس لیے اس کے مالہ و ماعلیہ سے بہ حد بشری مجھے پوری واقفیت ہے اور اس واقفیت نے اس کتاب کی تالیف میں مدد دی۔

مولانا کے خاندانی اور ابتدائی زندگی کے واقعات، ان کے اعزہ و احباب اور ان کے ابتدائی شاگردوں سے پوچھے اور سنے، تعلیمی حالات خود مولانا کی زبان سے وقتاً فوقتاً سنتا رہا، علی گڑھ کے قیام کے واقعات کا بڑا حصہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے پرانے اوراق سے بہم پہنچا اور ان کی پوری زندگی کا خاکہ ان کے مکاتیب کے مرقع میں بہ آسانی مل گیا۔

---

[1] مولانا کا شعر ہے، اصل میں زدہ ام ہے۔

دانائے راز کارساز کی کارسازی کے قربان کہ راقم الحروف کو مولانا کی زندگی ہی میں ۱۹۰۸ء میں ان کے خطوط و مکاتیب کے جمع کرنے کا خیال آیا اور اس وقت اس کا مقصد خطوط کے علمی و ادبی ذخیرہ کی حفاظت کے سوا کچھ اور نہ تھا، لیکن اُن کی وفات کے بعد ان کی سوانح عمری کا خیال آیا، تو نظر آیا کہ گویا اللہ تعالیٰ نے ان مکاتیب کی تالیف و اشاعت کے ذریعہ درحقیقت صاحبِ مکاتیب کے سوانح زندگی کے ذخیرہ کو میرے ہاتھوں بلاقصد و ارادہ پہلے ہی سے محفوظ کرا دیا تھا، اسی طرح مولانا کے سوانح کی تالیف، واقعات کی ترتیب اور تاریخوں کے تعین میں مکاتیب کی یہ دونوں جلدیں بے حد کارآمد ہوئیں، اور اسی لیے سوانح و واقعات کے ذکر میں مکاتیب کے ہر خط کا حوالہ نمبر اور تاریخ کے تعین کے ساتھ دیا گیا ہے، تا کہ ہر شخص بہ آسانی واقعہ کی تحقیق کر سکے اور اس نظر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ حیاتِ شبلی درحقیقت مولانا شبلی کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔

بڑی تسکین اس سے ہوئی کہ بحمد اللہ اس وقت ہمارے درمیان مولانا کے ایک حبیب مکرم اور ان کی زندگی کے اکثر اوقات کے شریک و مشیر و ہم دم جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی موجود ہیں، جن سے واقعات کی تحقیق میں مدد ملی، اسی طرح مولانا کے علی گڑھ کے پرانے دوست میر ولایت حسین صاحب سے قیام علی گڑھ اور تعلقات سرسید کے واقعات کی تفتیش کی گئی اور انہوں نے مہربانی فرما کر کچھ واقعات لکھ کر بھی بھیجے۔

مولانا کی زندگی میں ان کی سوانح عمری کا خیال میری اہلی دیکھیے کہ مولانا کی زندگی میں کبھی یہ وہم نہیں آیا کہ یہ ہستی اس قدر جلد ہمارے درمیان سے اٹھ جائے گی، اس لیے ان کے سوانح حیات کے قلم بند کرنے کا خیال بھی نہیں ہوا، البتہ بعض دوسرے لوگوں کو اخیر زمانہ میں ادھر توجہ ہوئی، لیکن ان کے جواب میں مولانا نے کسی کو اپنے حالات کی مختصر سی کھتونی لکھ کر بھیج دی اور کسی کو کچھ کہہ کے ٹال دیا، چنانچہ رسالہ ادیب الہ آباد کے اڈیٹر شاکر صاحب میرٹھی نے اپنے رسالہ میں چھاپنے کے لیے کچھ حالات لکھ کر مانگے، تو جواب میں لکھا کہ ”یہ بالکل ناممکن ہے کہ میں اپنے حالات خود لکھ سکوں، مسلم ریویو میں ایک صاحب نے کچھ واقعات لکھے تھے، وہ آپ لے سکتے ہیں، اس کے سوا سید سلیمان پروفیسر ندوہ کو آپ بہ تاکید لکھیں تو وہ بہت کچھ لکھ سکتے ہیں۔“ (مکاتیب اول، مکتوب الیہ نمبر ۳۵)

لیکن نہ مجھے لکھا گیا اور نہ میں نے لکھا۔

مسلم ریویوالہ آباد کے جس مضمون کا حوالہ ہے، وہ غازی پور کے مشہور خاندان کے ممتاز فرد شاہ منیر عالم صاحب مرحوم کا لکھا ہوا ہے، جو انگریزی کے اچھے انشا پرداز تھے اور مولانا سے شخصی طور پر واقف تھے، یہ مضمون اگست ۱۹۱۲ء کے رسالہ مسلم ریویوالہ آباد میں چھپا تھا، اس مضمون کے لیے مختصر حالات خود مولانا نے لکھوا دیے تھے، جو تعلیم و سفر قیامِ علی گڑھ کے چند سرسری واقعات پر مشتمل ہے۔

۱۹۱۲ء میں سید محمد فاروق صاحب شاہ پوری نے کچھ حالات دریافت کیے تو ایک ایک دو دو سطروں میں کچھ اپنی تعلیم، کچھ قیامِ علی گڑھ اور کچھ اپنی تالیفات و آرا کا حال لکھ کر دو صفحوں میں خط کو تمام کر دیا اور آخر میں شرما کر یہ لکھ دیا[1] کہ ''خود اپنا آلھا کیا گاؤں''۔

مولانا کی ترتیبِ سوانح کی سعادت کے سب سے بڑے خواہش مند منشی سید افتخار عالم صاحب مارہروی مرحوم تھے، شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ جس طرح انہوں نے شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی لائف لکھی ہے (یعنی وہ اس طرح لکھی ہے کہ طرزِ انشا کے پہچاننے والوں کو وہ بہ ظاہر خود صاحب سوانح کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے) اسی طرح وہ مولانا کے سوانح کی بھی تالیف کریں، چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۰۹ء میں انہوں نے خود مولانا سے خواہش کی مگر مولانا نے اس کو کسی طرح قبول نہیں کیا، چنانچہ مولانا ابوالکلام کو لکھنؤ سے ۱۵ر جون ۱۹۰۹ء کو وہ لکھتے ہیں ''ہاں اور سنی! افتخار عالم صاحب، مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر ان ہی آلودہ ہاتھوں سے حیات شبلی کو چھونا چاہتے ہیں، اجازت اور حالات مانگتے ہیں، میں نے لکھ دیا ہے کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے، لیکن عالم السرائر[2] خدا کے سوا ایک اور بھی ہے وہاں سے منگوائیے، بھئی بتا تو نہ دو گے، ایسے لوگ لاکھ لکھیں تو کس کو خوشی[3] ہوگی''۔ (مکاتیب ابوالکلام-۳)

منشی سید افتخار عالم صاحب مولانا کے اس انکار کے بعد بھی اپنے خیال سے باز نہیں آئے، چنانچہ پانچ برس کے بعد پہلے تو خود مولانا کو لکھا، انہوں نے ۲۵ر جنوری ۱۹۱۴ء کو یہ ظریفانہ جواب دیا، ''میری لائف میرے بعد لکھئے گا ورنہ مکمل لائف کیوں کر ہوگی''۔ (مکاتیب اول مکتوب الیہ نمبر ۲۴)

---

۱ یہ خط معارف نومبر ۱۹۲۲ء میں چھپا ہے۔ ۲ عالم السرائر تو خدا کے سوا کوئی اور نہیں، مگر یہاں مقصود بعض مخفی حالات کا علم ہے۔ (س) ۳ اس فقرہ سے استکبار اور ترفع کا مفہوم نہ سمجھا جائے، مقصود یہ ہے کہ منشی صاحب مرحوم صرف اردو و فارسی کا علم رکھتے تھے، گو خوش سلیقہ اور سنجیدہ تھے، تاہم مولانا پر لکھنے کے لیے علوم عربیہ اور فنون کلامیہ اور ادب و تاریخ پر اطلاع ضروری تھی، اس لیے مولانا کا خیال تھا کہ وہ ان کی سوانح عمری کے فرض سے بہ آسانی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ (س)

یہ کیا معلوم تھا کہ اس کے دس ہی مہینوں کے بعد کاتب کی لائف یعنی زندگی واقعۃً پوری ہو جائے گی، بہ ہر حال منشی صاحب موصوف نے مولانا کے اس جواب کے بعد مجھے گھیرا کہ میں مولانا کے قلم سے ان کی خواہش کی تکمیل کرادوں اور اس غرض کے لیے انہوں نے فروری ۱۹۱۴ء میں مجھے پونہ خط لکھا، میں نے مولانا سے ان کی سفارش کی تو مجھے جواباً ارشاد ہوا "افتخار عالم صاحب میری لائف کیا لکھیں گے، کبھی تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی لکھنا"۔ (مکاتیب سلیمان ۲۶)

ہائے ان کی یہ پیشین گوئی بھی حرف بہ حرف کیسی پوری ہوئی، سچ مچ میں دنیا کے اور کاموں سے آخر فارغ ہی ہو کر ادھر متوجہ ہوا۔

وفات کے بعد ان کے سوانح پر مضامین اور رسالے | راقم نے مولانا کی وفات کے بعد مولانا کے مختصر حالات پہلے تو الغزالی کے ایک نئے اڈیشن میں جو اس زمانہ میں اصح المطابع لکھنؤ میں چھپ کر تمام ہوا تھا، بہ طور دیباچہ کے لکھے، پھر اسی کو معارف اگست ۱۹۱۶ء میں چھاپ دیا، اور مولانا کے مرض الموت کے حالات و وفات اور آخری احوال پر مسلسل دو تین مضمون فروری ۱۹۰۵ء کے زمین دار لاہور میں لکھے، مولانا کے دوسرے قدیم احباب و اعزہ میں سے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۰ر جنوری ۱۹۱۵ء میں، مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے اپنے دل گداز میں، خواجہ غلام الثقلین صاحب نے اپنے رسالہ "عصر جدید" مورخہ ۱۷ر دسمبر ۱۹۱۴ء میں، سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی نے اپنے رسالہ اردوئے معلٰی میں اور مولانا عبداللہ العمادی نے زمین دار مورخہ ۲۳ر نومبر ۱۹۱۴ء میں اور بہت سے اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹروں نے ان کے حالات مرثیے اور نوحے اپنے اپنے اخباروں اور رسالوں میں لکھے اور شائع کیے، مگر ان میں استناد کے قابل یہی تین چار اول الذکر مضامین ہیں اور اس وقت سے لے کر اس وقت تک مولانا کے حالات کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے، اس کا ماخذ زیادہ تر پہلا اور کچھ دوسرا اور تیسرا اور چوتھا مضمون ہے۔

ان کی سوانح عمری مستقلاً لکھنے کی کوشش سب سے پہلے منشی محمد مہدی صاحب نائب مہتمم تاریخ بھوپال نے کی، انہوں نے بشیر پاشا سیریز اٹاوہ کے ضمن میں مولانا کے حال میں ۱۹۲۵ء میں ایک رسالہ "تذکرہ شمس العلما مولانا شبلی" کے نام سے لکھ کر شائع کیا۔

حیاتِ شبلی کی ترتیب کا آغاز و انجام | خاکسار نے سیرت کی مصروفیت اور خاندانی اور ابتدائی

حالات کے عدم واقفیت کے سبب اس کام کو پہلے اپنے رفیق وشریک کار عبدالسلام صاحب ندوی کے سپرد کیا کہ وہ مولانا سے برادری اور ہم وطنی کا تعلق رکھتے ہیں، اس لیے وہ اس کام کو مجھ سے بہتر انجام دے سکتے تھے، چنانچہ انہوں نے اس کام کو اس طرح انجام دیا کہ خاندانی حالات کے ساتھ مکاتیب شبلی کے متفرق معلومات کو بہ ترتیب یک جا کر دیا، ان اوراق کو مولانا شیروانی اور مولانا مرحوم کے دوسرے احباب اور تلامذہ نے دیکھا تو اس مجموعہ میں زندگی کی روح نظر نہ آئی، پھر یہ کام مولانا کے پرانے شاگرد مولوی اقبال احمد صاحب سہیل، ایم اے، ال، ال، بی، ایم ایل، اے وکیل اعظم گڑھ کے سپرد کیا گیا کہ وہ مولانا کے خاندانی تعلقات اور قدیم واقفیت کی بنا پر بہت کچھ لکھنے کے اہل تھے، چنانچہ انہوں نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مولوی عبدالسلام صاحب کے مسودہ کو گھٹا بڑھا کر اور علی گڑھ کے بہت سے نئے واقعات کا اضافہ کر کے اپنے زورِ قلم سے بزم میں رزم کی شان پیدا کر دی، ان کا یہ مضمون ''سیرت شبلی'' کے عنوان سے الاصلاح سرائے میر میں ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے چھ نمبروں میں مسلسل نکلتا رہا، اس کے بعد وہ اسمبلی کی ممبری اور اس کے سیاسی فرائض میں ایسے الجھے کہ اس سیرت شبلی کے مسودہ کو تمام کرنے کے لیے وہ مناسب وقت وفرصت کا انتظار ہی کرتے رہ گئے۔

اس لیت ولعل میں سالہا سال گزر گئے، اس اثنا میں مولانا کے بہت سے احباب اور ان کے سوانح کے مطالعہ کے مشاق اسی اشتیاق میں چل بسے، یہاں تک کہ ۱۹۴۰ء آ گیا، یعنی مولانا کی وفات اور دارالمصنفین کی بنیاد پر پچیس چھبیس برس گزر گئے، احباب کا تقاضا ہوا کہ دارالمصنفین کی پچیس برس کی سلور جوبلی منائی جائے، میرا اصول یہ ہے کہ:

ع نمی رویم بہ راہے کہ کارواں رفتست

اس پامال رسم کو چھوڑ کر یہ خیال آیا کہ اس جوبلی کی یادگار میں خود موضوع جوبلی یعنی مولانا شبلی کی سوانح عمری کا وہ کام کیوں نہ انجام دے دیا جائے جو سالہا سال سے فرصت کے انتظار میں پڑا ہے، چنانچہ بسم اللہ کر کے ۱۹۴۰ء میں اس کا آغاز کر دیا، آخر تین برس کی محنت میں ۱۹۴۲ء میں یہ انجام کو پہنچا اور اسی زمانہ میں اس کی چھپائی بھی شروع ہوگئی، مگر کیا عجیب بات ہے کہ جس طرح صاحب سوانح کی وفات ۱۹۱۴ء والی یورپ کی جنگِ عظیم میں واقع ہوئی، ان کی یہ سوانح عمری کی تالیف بھی ۱۹۴۰ء والی جنگ عظیم میں واقع ہوئی، جس سے زیادہ مقدار میں کاغذ کے ملنے کی دقت ایسی ضخیم کتاب کی چھپائی

میں ہارج ہوتی رہی اور آخر کسی نہ کسی شکل سے یہ مشکل حل ہوئی، اور چھپنے کی صورت نکلی۔

معاونوں کا شکریہ میں آخر میں اپنے ان تمام بزرگوں اور دوستوں کا مشکور ہوں، جنھوں نے اس کام کی تکمیل میں مجھے مدد دی، بالخصوص مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کا جن کے مجموعہ اوراق کے سبب سے مکاتیب کی ورق گردانی اور کاغذات اور مسودات کی تلاش کی مصیبت سے بہت کچھ نجات ملی اور مولوی اقبال احمد سہیل صاحب کا جن کی تحریر سے اعظم گڑھ کے بعض علمی واقعات اور مولانا کے خاندانی اور ابتدائی حالات کے جاننے میں بڑی مدد ملی اس کے بعد محبی منشی محمد امین صاحب زبیری کا جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ وغیرہ کے پرانے فائلوں سے بہت سی مفید تحریریں، نظمیں اور واقعات نقل کر کر کے مجھے بھیجتے رہے۔

سب سے زیادہ مخدومی نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا ممنون ہوں جنھوں نے مسودہ کے ان آٹھ سو صفحوں کو بڑی محنت سے حرف حرف پڑھا اور کہیں کہیں اپنے علم و مشاہدہ کی بنا پر کچھ کچھ بڑھایا، اور اس طرح میرے بیانات پر اپنی ذاتی واقفیت کی مہر سے گویا توثیق کی۔ فللّٰہ الحمد۔

حیاتِ شبلی کے معتقد و منتقد خاک سار کو یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تالیف سوانح عمریوں کے صحیح اصول پر پوری منطبق ہے، تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ معلوم ہو اس کو بے کم و کاست سپرد قلم کر دیا جائے، مولانا کے سوانح میں بعض رفقائے کار اور معاصرین سے کچھ الجھاؤ بھی رہا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ اس کشمکش کے تاریخی اظہار میں تعلقات کے شیشوں کو قلم کی بے اعتدالی سے ٹھیس نہ لگنے پائے اور کسی ناگوار واقعہ کے ذکر کے موقع پر بھی دامن کو راہ کے کانٹوں سے بچا کر نکالا جائے، تاہم نقائص اور عیوب، بشریت کا خاصہ ہیں، اس لیے کوئی سوانح نگار اپنی نسبت معصومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ کسی ایک فیصلہ کے متعلق سب کی رائیں ایک ہو سکتی ہیں، کیوں کہ محبت اور عقیدت کی نظر جہاں مخدوموں کی بہت سی خامیوں کے دیکھنے سے قاصر رہتی ہے، وہاں بدگمانوں کی نگاہیں سب سے پہلے ان ہی پر پڑتی ہیں اور ان کے تکرار و اعادہ میں ان کو ایسی لذت ملتی ہے کہ وہ ممکن کمالات سے بھی اغماض برت جاتی ہیں، لیکن یہ دونوں باتیں درحقیقت نفسیاتِ فطرت کے مطابق ہیں اور اس میں معتقد و منتقد دونوں معذور ہیں:

فمن الرضا عن کل عیب کلیلۃ ولکنّ عین السخط تبدی المساویا

(رضامندی کی آنکھ ہر عیب کے مشاہدہ سے قاصر رہتی ہے، لیکن ناراضی کی آنکھ برائیوں ہی کو ظاہر کرتی ہے۔

بہرحال شبلی شبلی تھے، جنیدؒ و شبلیؒ نہ تھے۔

عہد جدید کا معلم اول | مولانا کا رنگ ان قدیم علمائے دین کا نہ تھا، جن کا پاک مشغلہ صرف خانقاہوں میں رشد و ہدایت اور مدرسوں میں درس و تدریس ہے، اگر ایسا ہوتا تو ایسے بزرگوں کے تذکروں کے لکھنے کا جو پرانا دستور چلا آتا ہے، تذکرہ نگار کو اس سیدھے راستہ پر چلنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی، بلکہ یہ عہد جدید کے سب سے پہلے عالم کی زندگی کے سوانح ہیں، جن میں قدیم کے ساتھ ساتھ ایسے جدید رجحانات بھی پہلو بہ پہلو ہیں جو عہد قدیم کی مانوس نگاہوں میں کبھی کبھی کھٹک پیدا کر دیتے ہیں، کیوں کہ ان کے عہد میں ایک نئے دور کی بنیاد پڑی، اس لیے وہ قدیم و جدید کے ایک ایسے سنگم بنے جس میں دونوں دریاؤں کے دھارے آ کر مل گئے تھے، **مرج البحرین یلتقیان** اور اسی لیے ان کی زندگی کے کارنامے گزشتہ علماء دین کے کارناموں سے نسبۃً مختلف ہیں، وہ ہمارے قدیم اور مذہبی علوم کے عالم بھی تھے اور جدید علوم کے بہت سے آرا و خیالات سے واقف بھی تھے، قدیم علما کی صحبت بھی اٹھائی تھی اور جدید تعلیم کے ارکان اور جدید تعلیم یافتوں کی صحبت میں بھی رہے تھے، ساتھ ہی محقق فن بھی تھے، ادیب بھی تھے، شاعر بھی تھے، انشا پرداز بھی تھے، خطیب بھی تھے، مؤرخ بھی تھے، متکلم بھی تھے، مفکر بھی تھے، مصلح بھی تھے، سیاسی بھی تھے، ماہر تعلیم بھی تھے، اور نئے زمانہ کے اقتضا آت اور مطالبات کے مقابلہ میں بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے اور یہ سب گوناگوں رنگ ان کی زندگی کے مرقع میں نمایاں ہیں، جن کی تفصیل ان اورق میں نظر آئے گی۔

کتاب کے ضمنی مباحث | اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ ۹ سو صفحوں[1] کی کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانح عمری نہیں، بلکہ درحقیقت مسلمانانِ ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اسی سلسلہ میں بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی درج ہوئے ہیں جن کو اس عہد کے سمجھنے کے لیے جاننا ضروری تھا، شروع میں ایک مفصل دیباچہ ہے، جس میں دیارِ مشرق میں علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی تاریخ ہے، جو بڑی دیدہ ریزی سے یک جا ہوئی ہے۔

تصویر | رسم زمانہ کے مطابق عام لوگوں کو اس میں صاحب سوانح کی عکسی تصویر بھی ضروری معلوم ہوتی ہوگی، مگر لفظ و معنی کی رنگ آمیزی سے ان کی جو سچی اور اصلی تصویر اس پوری کتاب میں نظر آتی ہے، وہ اس فریب نظر والے گناہِ بےلذت رسمی تصویر سے زیادہ پائدار اور زیادہ قیمتی ہے، البتہ اس کی کوشش ہے کہ ان کی جسمانی فانی تصویر کے بجائے ان کے باقیات صالحات کاموں کی تصویر سے اوراق کو مزین کیا جائے، یعنی

---

[1] جس کی ضخامت کمپوزنگ کے سبب گھٹ کر تقریباً سات سو صفحات ہوگئی ہے۔

ان عمارتوں کی تصویریں دے دی جائیں جن میں ان کے اعمالِ صالحہ اور صدقات جاریہ مجسم ہیں۔

کتاب کا نام | کتاب کا نام بھی خود صاحبِ سوانح کا فیضِ انتخاب ہے، مولانا ابوالکلام کے نام والے اوپر کے خط میں ''حیاتِ شبلی'' خود ان کے قلم سے نکلا ہے اور پسند کے قابل ہے۔

محسن کی شکر گزاری | اس حیاتِ شبلی کو لکھ کر اگر میں یہ سمجھوں کہ اس طرح استاد مرحوم کے احسانات کے بار سے سبک دوش ہو گیا تو یہ ناشکری ہوگی کیوں کہ میری حقیر ذات پر ان کے جو احسانات ہیں وہ کیف وکم کے احاطہ سے باہر ہیں، اور ان کے تین سب سے بڑے احسانات تو ایسے ہیں، جن سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے، سب سے اول یہ کہ انہوں نے اس بے مایہ کو انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا اور اس قابل کیا کہ دو حرف لکھ پڑھ کر اپنی استقامت کے بہ موجب دین وملت کی کوئی خدمت بجالا سکے، دوسرا یہ کہ تعلیم سے فراغت کے بعد جو تعلیم کا سب سے نازک دور آتا ہے، اس میں اس کی ایسی دست گیری فرمائی کہ حصول علم اور شوق مطالعہ کے سوا کسی اور راہ میں بھٹکنے نہ دیا اور خاندان کے بزرگوں سے کہہ سن کر طبابت کے خاندانی پیشہ سے ہٹا کر علم وفن کے آستانہ پر لا کر کھڑا کر دیا اور سب سے آخر یہ کہ انہوں نے اپنی زندگی میں اور اپنی زندگی کے بعد بھی بہ شکل وصیت اس کو سرور کائنات، فخر موجودات، رحمت عالم، سید اولادِ اعظم محمد رسول اللہ ﷺ کی سرکار اقدس میں جہاں وہ سب سے آخر پہنچے تھے، سب سے اول پہنچایا، یعنی حضور انور ﷺ کی سیرت مبارکہ کے مطالعہ، جمع وتنقید اور تالیف وتحقیق کی خدمت ابتدا ہی میں سپرد فرمائی، جو الحمدللہ یہاں اس کے لیے سعادت کا ذریعہ ہے اور ان شاء اللہ وہاں اس کے لیے آخرت کا ذخیرہ ہوگی، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ قلم کی ہزار کج رویوں کے باوجود حجاز کے بہ جائے ترکستان جانے کی غلطی اس سے سرزد نہیں ہوئی اور ساری علمی وعملی کوتاہیوں کے باوجود بھی اسی سایۂ رحمت ﷺ کے دامن سے وہ ساری عمر لپٹا رہا، اور اس طرح سرکارِ مدینہ سے اس کو محبت کا وہ خزینہ عطا ہوا جس سے وہ بزرگوں کی نگاہِ قبول کے قابل ٹھہرا، اور تلافی مافات کی توفیق سے بہرہ ور رہا۔

ع حل ایں نکتہ ہم از روئے نگار آخر شد

ہیچ مداں سلیمان

۲۵ / محرم ۱۳۶۲ھ

۲ / فروری ۱۹۴۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

حیاتِ شبلی رحمۃ اللہ علیہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اللہ تعالیٰ نے اپنے دینِ حنیف کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اس وعدہ کا پورا ہونا بالکل یقینی ہے، لیکن اس کے یقینی ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اُس کے لیے ظاہری تدابیر کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ اس کی یہ تدبیر بھی فرماتا ہے کہ ہر زمانہ میں اس زمانہ کی ضرورت کے مطابق ایسے اشخاص پیدا فرماتا ہے جو اس ضرورت کو پورا کر کے دینِ الٰہی کی حفاظت کا کام انجام دیتے ہیں، یہاں تک کہ یہ کام کبھی کبھی ایسوں سے بھی لیا جاتا ہے جو اپنے ظاہری اعمال کے لحاظ سے اس کے مستحق بھی نہ تھے۔

دادِ او را قابلیت شرط نیست بلکہ شرط قابلیت دادِ اوست

ہر مسلمان سپاہی جنید و شبلی نہیں ہوتا، لیکن اس کا یہی ایک کام کہ خدا کی راہ میں اس نے اپنی جان کی بازی لگا دی، اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی جنت کا دروازہ اس کے لیے فوراً کھل جاتا ہے۔

پچھلی صدیوں میں جو کچھ پیش آیا اور ہر دور میں اسلام کی حفاظت، دشمنوں کی مدافعت اور وقت کی دینی ضرورت کے مطابق اشخاص جس طرح پیدا ہوتے رہے، ان کے حالات تاریخ کے صفحوں میں مذکور ہیں، خود ہندوستان میں دیکھیے کہ گو آلِ تیمور سے اسلام اور مسلمانوں کو بہت سے فائدے پہنچے، مگر ان کے بعض فرماں رواؤں کی کوتہ اندیشی سے دو رخنے بھی پیدا ہو گئے، ایک یہ کہ ایرانی امرا کو سلطنت میں اختیار حاصل ہو گیا، اور دوسرا یہ کہ ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے ان کی بہت سی مذہبی رسموں کو علی الاعلان

قبول کرلیا گیا، آخرانہی دونوں رخنوں سے وہ سیلاب آیا جس نے ان کو بھی ڈبودیا اور اسلام کی بنیادوں کو بھی درہم برہم کردینا چاہا، عین اس وقت سرہند و دہلی کے دو خانوادوں سے وہ اشخاص پیدا ہوئے جنھوں نے ان فتنوں کے منہ بند کیے اور اسلام کے قلعہ کو اس سرزمین میں ازسرنو محفوظ کیا، تیموریوں کا دور جب ختم ہوا اور سکھوں نے سر اٹھایا تو پھر دہلی اور رائے بریلی کے خانوادوں سے وہ اکابر اٹھے جنھوں نے پورے ہندوستان کو جگادیا اور ہر طرف اصلاح و دعوت اور تبلیغ دین کا ولولہ پیدا کردیا۔

انگریزوں کے برسرِعروج آتے ہی تین طرف سے حملوں کا آغاز ہوا، عیسائی مشنریوں نے اپنی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے قلعہ روئیں پر حملے شروع کردیے، دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ تحریک نے اپنے سابق مسلمان حکمرانوں سے نجات پا کر اُن پر حملہ کی جرأت پائی اور سب سے آخر میں یورپین علوم وفنون وتمدن کی ظاہری چمک دمک مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی، خدا نے عیسائیوں کے مقابلہ کے لیے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب (آگرہ) اور اس کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولانا رحم علی صاحب بنگلوری، مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی، مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری (سابق ناظم ندوۃ العلماء) وغیرہ اشخاص پیدا کیے، جنھوں نے عیسائیوں کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑادیے، اور خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا وجود تو ردِ عیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہیں اور کون باور کرسکتا تھا کہ اس وقت میں پادری فنڈر کے مقابلہ کے لیے ڈاکٹر وزیر خاں جیسا آدمی پیدا ہوگا جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف اور ان کی مذہبی تصنیفات کا ماہر کامل اور عبرانی و یونانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود انہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابل شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کردے گا۔

آریوں کے دیانند سرسوتی کے مقابلہ کے لیے خاص طور سے مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ کا ظہور بھی تائید غیبی ہی کا نشان تھا اور پھر جس طرح عقائد حقہ کی اشاعت اور ردِّ بدعات کا اہم کام مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ اور اس جماعت کے دیگر مقدس افراد کے ذریعہ انجام پایا، اس کے آثار باقیہ بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں، یورپ کی نئی نئی سائنس اور قوانین فطرت کے نئے نئے اسرار کے انکشاف نے جو شبہات پیدا کیے، ان کا اصلی جواب تو وہ علماء دے سکتے

تھے جو ہمارے قدیم متکلمین کی طرح قدیم فلسفہ میں ماہر تھے، اس زمانہ کے نئے علوم اور نئی تحقیقات سے واقف ہوتے، مگر بہر حال مالا یدرك كله لا يترك كله کہ اگر پورا نہ مل سکے تو ادھورا ہی سہی کے اصول کے مطابق ان ہی لوگوں میں سے جو گو نیم عالم تھے، لیکن انگریزوں سے دن رات ملتے تھے، اور ان کے علوم و خیالات سے کچھ کچھ واقف تھے، سرسید، مولوی چراغ علی اور مولوی کرامت علی صاحب جون پوری وغیرہ چند ایسے اشخاص کھڑے ہوئے، جنہوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق اس فرض کو ادا کرنا چاہا اور ان سے بہتوں کو ایک معنی کر فائدہ بھی پہنچا، لیکن چوں کہ وہ باقاعدہ عالم نہ تھے اور نہ علمائے حق کی صحبتوں سے مستفید تھے، انہوں نے اپنے کاموں میں جگہ جگہ غلطیاں کیں اور ایسی تاویلوں کے شکار ہوئے جو حقیقت سے بہ مراحل دور تھیں، ان کی غلطیوں کا سبب ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ وہ اپنے زمانہ کی طبیعی تحقیقات اور ان کے قیاسی نتائج کو یقینی اور قطعی مان کر مسائل شرعیہ کو ان کے مطابق کرنے لگے اور یہ وہی غلطی تھی جس میں بہ مقابلۂ فلسفۂ یونان تیسری اور چوتھی صدی میں باطنیہ فرقہ کے علما اور مصنفین مبتلا ہو چکے تھے، ان کا یہ کہنا تھا کہ علما و فلاسفہ جو کچھ کہتے ہیں وہی انبیاء اور رسُل علیہم السلام کہتے ہیں، اس لیے دونوں میں ایسی تطبیق دی جائے کہ انبیاء کا کلام کسی نہ کسی تاویل سے حکماء و فلاسفہ کے خیال کے مطابق ہو جائے، لیکن متکلمین اہل سنت نے یہ غلط راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ یہ کیا کہ انبیاء علیہم السلام نے جو کچھ فرمایا اس کو قطعی و یقینی مان کر حکماء و فلاسفہ کے ان مسائل کی جو قطعاً مخالف تھے، دلائل سے غلطی ثابت کی اور جو کسی قدر تصحیح سے صحیح ہو سکتے تھے، اس کی تاویل کر دی اور جو تمام تر مطابق تھے یا کم از کم مخالف نہ تھے یا انبیاء علیہم السلام نے ان سے نفیاً یا اثباتاً بحث ہی نہیں کی تھی، ان کی توثیق کی۔

اس سے آگے بڑھ کر ایک اور دور آیا جب یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں کی تصنیفات کو پڑھ کر اور ان کے علوم کو سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علوم و تاریخ و تمدن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ان کے یہ اعتراضات بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سرایت کرنے لگے، اس دور میں اسلام کی خدمت کی سعادت جس کے حصہ میں آئی وہ ہمارے ان اوراق کا ہیرو ہے۔

مولانا شبلی مرحوم کا کام متعدد وجوہ سے اہمیتِ خاص رکھتا ہے، مرحوم جن معترضین کے جواب کے لیے اٹھے وہ ان پڑھ مشنریوں میں نہ تھے اور نہ مناظرانہ یا الزامی جواب ان کے لیے کافی تھے، ان کے جواب دینے کے لیے ضرورت یہ تھی کہ ایک ایک کونہ سے نادر کتابوں کی تلاش اور ورق گردانی کی

جائے، ان کے بتائے ہوئے حوالوں کی غلطی اور کمزوری بتائی جائے اور اس کے بالمقابل اسلامی علوم و فنون اور تاریخ وتمدن کے شاندار واقعات اور اہم کارناموں کو ابنائے زمانہ کے سامنے لایا جائے، تاکہ اسلام کی تاریخی وتمدنی عظمت اور علمی جلالت سب کے سامنے آجائے جس سے قوم کے افسردہ دلوں میں از سرِ نو تازگی اور امنگ بھی پیدا ہو اور دشمنوں کو اپنے اعتراضات کی بے مائگی کا بھی اندازہ ہو۔

مرحوم کا مقصدِ زندگی اگر یہیں تک ختم ہو جاتا تو بھی کام نسبۃً ہلکا ہوتا، مگر اس سے آگے بڑھ کر انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دیا کہ وہ اپنے سامنے اور اپنے بعد بھی علما کا ایک گروہ ایسا چھوڑ جائیں جو اس نئے زمانہ میں اسلام کی اس نئی ضرورت کو پوری کرتا رہے، یہی دو چیزیں ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہیں، اور ان ہی کی تفصیل اس کتاب کی غرض وغایت ہے۔

اس دوسری غرض کے لیے انہوں نے ایسے پرزور مضامین لکھے اور تقریریں کیں، جن سے یہ ثابت ہو کہ ہماری عربی تعلیم کا پرانا نصاب اصلاح کا محتاج ہے اور ہمارے علماء کو زمانہ کی نئی ضرورتوں کا احساس ہونا چاہیے، شروع شروع میں ہر نئی تحریک کی طرح اس کی بھی مخالفت کی گئی اور شدید مخالفت کی گئی، مگر جب لکھنؤ میں دارالعلوم کی بنیاد ڈال دی گئی اور اس کے نتائج سامنے آئے تو رفتہ رفتہ مخالفت کی آواز دھیمی پڑتی گئی اور مولانا اور مولانا کے تلامذہ کے ہاتھوں حیدرآباد سے بھاول پور تک اور خاص طور سے صوبہ ہائے متحدہ اور بہار کے مدرسوں اور ڈھاکہ اور حیدرآباد کے مشرقی دینی شعبوں میں عظیم الشان اصلاحات ظہور پذیر ہوئیں، یہاں تک کہ اب صوبۂ متحدہ کی مقدس مذہبی درس گاہوں تک اس کے اثرات پہنچ رہے ہیں۔

مولانا مرحوم نے ندوۃ العلما کے وجود سے پہلے ہی اس کے متعلق سب سے پہلی آواز سفرنامۂ روم ومصر وشام میں ۱۸۹۲ء-۱۳۰۹ھ میں اٹھائی تھی اور ہندوستان کے ساتھ قسطنطنیہ اور مصر کے مدرسوں اور خاص طور سے جامع ازہر کے نصاب وطریق تعلیم وتربیت پر بڑی دل سوزی سے افسوس وحسرت کے آنسو گرائے، آنسو کے یہ قطرے بے اثر نہ رہے، اسی کے چند سال بعد ۱۸۹۹ء میں جامع ازہر کی اصلاح کی تحریک شروع ہوئی، اس کے متعلق سید رشید رضا اڈیٹر المنار مصر نے مسلسل مضامین لکھے، ۳۰ر جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ کے المنار میں اپنی اصلاحی تحریک کے سلسلہ میں دنیائے اسلام کے جن تین نام ور علما کے نام سنداً پیش کیے وہ یہ تھے، شیخ احمد جان روسی، شیخ شنقیطی مغربی (مراکش) اور شیخ شبلی نعمانی ہندی[1]،

[1] اخبار البشیر، اٹاوہ، دسمبر ۱۸۹۹ء۔

اس کے بعد اگر ۱۹۱۴ء کی تحریک جامعۂ مدینہ کی کام یاب ہو جاتی تو اصلاحِ مدارس کی یہ تحریک ساری دنیائے اسلام میں پھیل جاتی، مولانا اس ماحول میں جس کو ہندوستان میں تعلیم جدید نے پیدا کیا تھا، ۱۶ برس کے قریب رہے تھے، ان کو خوب معلوم ہو چکا تھا کہ سیلاب کا یہ بہاؤ کس رخ پر ہے، اور اس سیلاب میں ہمارے مذہبی علوم وفنون کا کیا حال ہوگا اور جو شکوک وشبہات اس تعلیم کی بہ دولت پیدا ہو رہے ہیں، ان کے جواب دینے کے لیے کس استعداد کے علماء کی ضرورت ہے، ساتھ ہی مصر وشام و ٹرکی کی سیاحت نے علماء کے جدید فرائض کی ضرورتوں کو ان پر آئینہ کر دیا تھا اور انہی وجوہ سے ان کو اپنی تحریک کی ضرورت کا وہ شدید احساس تھا جو دوسرے علما کو نہ تھا۔

اس اصلاحی تحریک کی دو دفعات پر مولانا کو بہ شدت اصرار تھا، ایک یہ کہ قدیم یونانی فلسفہ کی کتابیں نکال کر جدید فلسفہ کی کتابیں داخل کی جائیں، دوسری یہ کہ علما تعلیم یافتوں کی اصلاح، یورپ میں تبلیغ اور مستشرقین یورپ کے اعتراضات کے جواب اور غلطیوں کی اصلاح کے لیے انگریزی پڑھیں، اس سلسلہ میں دو واقعے مجھے یاد آئے، ایک دفعہ تنہائی تھی تو خاکسار نے عرض کیا کہ قدیم فلسفہ و منطق کی کتابوں کو نصاب سے خارج کرنے سے آپ کا مقصد کیا ہے، فرمایا یہ یونانی علوم نہ ہمارے مذہبی علوم ہیں اور نہ ہمارے مذہب کی فہم ومعرفت ان پر موقوف ہے، امام غزالی ﷫ نے اپنے زمانہ میں ان علوم کو علما کے نصاب میں اس لیے داخل کیا تا کہ ان یونانی علوم کے اثر سے جن کو اس زمانہ میں زیادہ تر باطنیوں نے پھیلا رکھا تھا، علمائے اسلام واقف ہو کر اس زمانہ کے الحاد کا مقابلہ کر سکیں، لیکن اب نہ وہ ملحد رہے نہ وہ یونانی علوم رہے، نہ ان کے ان مسائل کی صحت کا یقین عقل کے مدعیوں کو رہا، اس لیے ان کا اثر خود بہ خود زائل ہو گیا، اور اب ان سے اسلام کو کسی گزند کا خوف نہیں رہا، اب اس کی جگہ نئے علوم ہیں، نئے مسائل ہیں، نئی تحقیقات ہیں، اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے علما انہی چیزوں سے واقف ہو کر اسلام کی نئی مشکلات کا حل نکالیں اور نئے شبہات کے تحقیقی جواب دیں۔

مجھے مولانا کی اس رائے سے کہ دار العلوم کے تمام طلبہ کے لیے انگریزی لازمی کی جائے اتفاق نہ تھا، چنانچہ ایک دن موقع پا کر میں نے عرض کی کہ آپ مدرسہ میں انگریزی کو لازمی کیوں قرار دیتے ہیں، انہوں نے ایک آہ سرد کھینچی اور فرمایا دیکھ رہے ہو کہ نئی تعلیم کس تیزی سے پھیلتی جاتی ہے، اسی کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم اعلا مسلمان خاندانوں سے مٹتی جاتی ہے، اب نئے تعلیم یافتوں کی مذہبی

واقفیت کا مدار انگریزوں کی کتابوں اور اسلامی کتابوں کے ترجموں پر رہ جائے گا، اس وقت ہمارے مذہبی علوم کی کیا حالت ہوگی، اب بھی دیکھو، جب غیر مذہبی تعلیم یافتوں کو قرآن پاک کے سمجھنے کا شوق ہوتا ہے تو وہ اپنی اس پیاس کو سیل کے انگریزی ترجمہ سے بجھاتے ہیں، فقہ اسلامی کا مدار ہدایہ کے انگریزی ترجمہ پر رہ گیا ہے، کیا یہ کام ہمارے علما کا نہیں ہے۔

یہ خیالات ان کے بیسیوں مضامین اور متعدد تقریروں میں بار بار دہرائے گئے ہیں اور عباسیہ کے زمانہ میں علوم یونانی کی اشاعت اور علم کلام کی ایجاد سے اس کی اصلاح کی مثال برابر ان کے سامنے رہی، ایک تقریر میں وہ پوری تفصیل کے بعد فرماتے ہیں، علما کو اس بات کا مطلق خوف نہیں کرنا چاہیے کہ علوم جدیدہ مذہب اسلام کے برخلاف ہیں اور ان کی تعلیم سے عقائد مذہبی میں خلل آجاتا ہے، کیوں کہ جب امام غزالی کی طرح وہ ان علوم کو خود حاصل کریں گے تو ان کو وہ مسائل معلوم ہوجائیں گے، جن میں مذہبی مخالفت کا احتمال پیدا ہوسکتا ہے، اس صورت میں وہ ان مسائل کی تردید یا اسلام سے ان کی مطابقت بہ خوبی کرسکیں گے اور جدید تعلیم یافتوں کو مذہبی شکوک وشبہات سے محفوظ رکھ سکیں گے، صاف ظاہر ہے کہ جب تک ہماری قوم کے علما جدید فلسفہ اور جدید علوم کو بذاتِ خود حاصل نہ کریں، ناممکن ہے کہ وہ ان اعتراضات کا جواب دے سکیں جو یورپ کے ملاحدہ مذہب اسلام پر کرتے ہیں اور جن کا اثر ہماری قوم کے جدید تعلیم یافتوں پر پڑتا ہے۔'' (خطبات شبلی ص ۹۰)

اسی خیال کے بہ موجب انہوں نے خود سبقت کی اور اپنے بل بوتے کے مطابق قدیم علم کلام میں سے جدید علم کلام کے عناصر جمع کیے اور الغزالی، سوانح مولانائے روم، علم الکلام اور الکلام میں ان کو ترتیب دیا، مگر ان کتابوں میں دو قسم کی کمیاں محسوس ہوتی ہیں، ایک یہ کہ جدید علوم ومسائل سے ان کی واقفیت بھی محض سنی سنائی ہی تھی، یا ثانوی درجہ کی تھی، اس لیے وہ ان مقامات کی پوری تحدید نہ کرسکے، جہاں سے اسلامی مسائل پر زد پڑتی تھی، دوسری کمی یہ ہوئی کہ انہوں نے اسلام کے صحیح عقائد کو متکلمین و حکمائے اسلام کی کتابوں سے چن چن کر یک جا کیا، حالاں کہ ان کا اصلی سرچشمہ کتاب الٰہی اور سنت نبوی ﷺ تھی، اگر یہ دونوں چیزیں براہِ راست سامنے رکھی جاتیں تو منزل مقصود کا صحیح پتہ لگ جاتا، اخیر زمانہ میں علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تصنیفات کے مطالعہ نے یہ نقطۂ نظر ان کے سامنے کردیا تھا، مگر تصنیفی عمل کا وقت گزر چکا تھا، البتہ سیرتِ نبوی ﷺ کی تکمیل کا موقع ان کو ملتا تو ضرور وہ اس کی تلافی کرتے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور کہنی ہے کہ امام غزالی وغیرہ کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے یونانی تراجم کو براہِ راست درس میں داخل نہیں کیا، بلکہ ان علوم کو پڑھ کر انہوں نے خود یا دوسرے مسلمانوں نے ان علوم پر اسلامی طرز پر اپنی جو کتابیں لکھیں ان کو علما کے درس میں رکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے ان علوم کو خود مسلمان بنایا پھر ان کو مسلمانوں میں رواج دیا، مولانا کے سامنے بھی جیسا کہ اوپر کی تقریر میں ہے، یہی چیز تھی، مگر افسوس کہ اس پر عمل اب تک اس لیے نہ ہوسکا کہ ان علوم کو علما اب تک حاصل نہ کرسکے اور ان پر ان کی تصنیفات کا زمانہ تو بہ مراحل دور ہے، تاہم جو اصل نکتہ ہے وہ یہی ہے کہ پہلے ان جدید علوم کو مسلمان بنانا چاہیے، پھر ان کو مسلمانوں میں رواج دینا چاہیے، ورنہ بغیر اس کے وہی باطنیت اس زمانہ میں بھی پھیلے گی، جو امام غزالی سے پہلے پھیلی تھی، بلکہ میں کہتا ہوں کہ مختلف تحریکوں اور تصنیفوں کے ضمن میں وہ پھیل بھی رہی ہے۔

یورپ کے اس نئے دور میں علم کلام کا مرکز فلسفہ سے بہت کچھ ہٹ کر تاریخ کی طرف منتقل ہوگیا تھا، اس دور میں تاریخ نے وہ اہمیت پائی جو اس کو پہلے نصیب نہ تھی، یہاں تک کہ اس کو اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کا جز اور علمی تحقیقات کا بڑا شعبہ بنایا گیا اور خصوصیت کے ساتھ محکوم ملکوں کی درس گاہوں میں ان ملکوں کی تاریخ کو دھندلا کر کے دکھانا ضروری قرار دیا گیا اور اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ وہ اپنی نسلی وقومی برتری کا اعلان کریں اور اپنے مقابلہ میں اپنی محکوم قوموں کی تاریخ وتمدن کے روشن چہرہ پر نئے نئے طرز سے ایسی سیاہی پھیریں کہ ان کو خود اپنے اسلاف سے آپ نفرت آئے اور اہل یورپ کے کارناموں کے سامنے ان کو اپنے مذہبی وتمدنی وسیاسی وقومی کارنامے پھیکے نظر آئیں اور اس طرح ان کا مذہب جو ان کی تمام تحریکات کی روح ہے، ہمیشہ کے لیے مردہ ہوجائے۔

اس کام کے لیے سب سے پہلے انہوں نے خود سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کی ذاتِ پاک کو چنا اور اس کو اپنے ہر قسم کے اعتراضوں اور شبہوں کا مورد ٹھہرایا، اس کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلاطین اسلام رحمہم اللہ کو اپنے اعتراضوں کا نشانہ بنایا اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان بادشاہوں کی سلطنتوں کو طرح طرح سے ظالمانہ ثابت کرنے کے لیے سچ جھوٹ کسی سے دریغ نہیں کیا، اسلام کے اجتماعی، سیاسی اور تمدنی کارناموں کو اتنا بگاڑ کر دکھلانے لگے کہ خود مسلمان نئے تعلیم یافتوں کو اپنی تاریخ سے آپ گھن آنے لگی اور مسلمان بچے جب اسکولوں اور کالجوں میں زیر درس تاریخ کی کتابوں میں ایسی باتیں پڑھتے تھے، تو شرم سے گردن جھکا لیتے تھے، اس طرح مسلمانوں کو طرح طرح کے علمی و

سیاسی فریبوں سے خود اسلام سے برگشتہ کر دیا۔

چوں کہ ہندوستان، مصر، مراکش، الجزائر، تونس وغیرہ اسلامی ملکوں میں ان یورپ والوں سے پہلے مسلمانوں کی سلطنتیں تھیں، اس لیے ان کے تاریک پہلوؤں کو دکھلائے بغیر ان کے کارنامے چمک نہیں سکتے تھے، اس بنا پر مسلمان بادشاہوں اور ان کی سلطنتوں کو برا کہنا اور برا دکھلانا ان کے مصنفوں کا سب سے بڑا فرض ہو گیا تھا۔

ہندوستان میں دشمنوں کا یہ حملہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا، ہندوستان میں ان حملہ آوروں کے سب سے پہلے علم بردار ڈاکٹر اسپرنگر تھے جو اس زمانہ میں دلی کالج اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے سربراہ کار بھی تھے، ان کے بعد صوبہ یوپی کے سابق گورنر سر ولیم میور صاحب بھی آئے اور لوگ اسی طرح آتے رہے، انگلستان میں بھی یہ کام عمدگی سے انجام پا رہا تھا اور انگلستان کے سوا فرانس اور جرمنی میں جن کو مشرق کی شہنشاہی کا دعویٰ تھا، یہ کام پوری مستعدی سے جاری تھا، ڈاکٹر جے اے مولر، ڈاکٹر ویل، وان کریمر، برتھالی، سینٹ ہلیر، نولڈیکی، ولہاوسن، گولڈزیہر، رینان وغیرہ یورپ کے فضلا باری باری سے اس کام کو انجام دیتے رہے اور آخر میں انگلستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیوتھ صاحب اٹھے، یہاں تک کہ مصر و شام کے عیسائیوں نے بھی ان کی تقلید میں اس کام کو شروع کیا، جن میں سب سے زیادہ بدنام الہلال مصر کا اڈیٹر جرجی زیدان ہے۔

یہ لوگ مشنری نہ تھے اور نہ مناظرہ پیشہ عیسائی واعظ تھے، بلکہ ان کا شمار یورپ کے فضلا میں تھا، یہ اپنے اغراض فاسدہ کے زہر پر ہمیشہ علمی تحقیقات کا غلاف چڑھالیا کرتے تھے اور خود مسلمانوں ہی کی کتابوں سے کھوج کھوج کر اپنے کام کا سامان نکال لاتے تھے اور اس کے لیے سچ یہ ہے کہ وہ بڑی عرق ریزی کرتے تھے، نادر عربی کتابوں کی تلاش اور جستجو کرتے تھے، محنت کے ساتھ پڑھتے تھے اور ان مسالوں پر اپنی تصنیف و تحریر کی بنیاد ڈالتے تھے اور اب بھی وہ اپنے کاموں میں اسی طرح مصروف ہیں۔

ایسے ہوش مند حریفوں کے مقابلہ کے لیے ساری دنیائے اسلام میں سے جو شیر دل اسلام کی صف میں سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی رحمہ اللہ ہی تھے، جنہوں نے ان ہی کے طریقے سے ان ہی کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں کیوں کر

اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈالی۔

اس سلسلہ کا آغاز مولانا نے اپنی ''گزشتہ تعلیم'' سے کیا جس میں دکھایا کہ مسلمانوں نے علوم وفنون کو ترقی دے کر دوسری قوموں کی زبانوں سے کتابوں کو اپنی زبان میں ترجمہ اور دنیا کے ہر گوشہ میں وسیع درس گاہوں کو قائم کر کے دنیا کی ترقی میں کیا کارنامہ انجام دیا ہے، پھر آگے چل کر معلومات کے اضافہ کے بعد اس مضمون کو متعدد عنوانوں میں تقسیم کر دیا۔

مسلمان بادشاہوں کے خلاف ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بھی سب سے زیادہ نفرت انگیز پروپگنڈہ جزیہ کے نام سے جاری کیا جاتا تھا، یعنی وہ محصول جو مسلمان بادشاہ صرف اپنی غیر مسلم رعایا سے وصول کرتے تھے، اس کو مخالفین اس بات کے ثبوت میں پیش کرتے تھے کہ اسلامی سلطنتوں میں غیر مذہب پر ٹیکس تھا، یعنی کوئی غیر مسلم رعایا اس مذہبی ٹیکس کے ادا کیے بغیر کسی اسلامی سلطنت میں اپنی جان و مال کو محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی، اور اس میں شک نہیں کہ بعض فقہا نے یہی لکھا ہے کہ جزیہ غیر مسلم کو قتل نہ کیے جانے کا معاوضہ ہے جس کو وہ ادا کرتا ہے، لیکن یہ مسلک ان مسلمان قوموں کا نہ تھا، جن کو ہندوستان کی فرماں روائی نصیب ہوئی، مولانا نے بڑی تحقیق سے اس بات کو پایۂ ثبوت کو پہنچایا کہ جزیہ قتل کا نہیں بلکہ نصرت کا معاوضہ ہے، یعنی اسلامی ملکوں میں ان غیر مسلموں سے جو فوج میں بھرتی نہیں ہوتے تھے، اس لیے یہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا کہ وہ ان کی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کا معاوضہ تھا، تاکہ مسلمان سپاہی بیرونی حملہ آوروں سے ان کی جان و مال کی حفاظت کریں، اسی لیے جب خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں غیر مسلموں نے فوجی خدمت ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے اور مسلمانوں نے ان کی اس خدمت کو قبول کیا ہے تو وہ ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیے گئے ہیں، مولانا کا یہ مضمون شایع ہوا تو لوگوں کو ان کی اس اچھوتی تحقیق پر حیرت ہوگئی اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس کی اتنی خوشی ہوئی کہ مولانا کی یہ تنہا تحقیق ہی ان کے نزدیک ان کے کارنامۂ فضیلت کے لیے کافی تھی، مولانا کا تمام تر استدلال کتب فتوح و تاریخ سے تھا، اس لیے ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو اس کے ماننے میں اب بھی تامل ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فقہائے اسلام رحمہم اللہ گو اس بارہ میں مختلف ہیں کہ جزیہ بقاعلی الکفر یعنی غیر مسلم ہونے کا معاوضہ ہے (ہدایہ) قتل کا بدل ہے، یا قتال کا (فتاویٰ سراجی وفتح القدیر) یا اس بات کا کہ ان کو اسلامی ملک میں سکونت کی اجازت دی گئی ہے، (مبسوط ج ۱۰/ ۷۸) تاہم وہ ائمہ جن کی

نظر جزیہ کے ساتھ اہل ذمہ کے شرائطِ مصالحت اور اس کے مصارف پر ہے، انہوں نے صاف تصریح کر دی ہے کہ یہ فوجی خدمت سے استثنا کا معاوضہ ہے۔

پانچویں صدی کے فقہ حنفی کے مشہور امام سرخسی المتوفی ۴۹۰ھ مبسوط میں معترض کے اس اعتراض کے جواب میں کہ اگر جزیہ کفر کا معاوضہ ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمان دنیا کے چند خزف ریزوں کو لے کر کفر کی بقا کو انگیز کر سکتے ہیں، فرماتے ہیں:

ثم یاخذ المسلمون الجزیة منه خلفاً عن النصرة الّتی فاتت بإصراره علی الکفر، لان من هو من اهل دار الاسلام فعلیه القیام بنصرة الدار وابدانهم لا تصلح لهٰذه النصرة، لانهم یمیلون الی اهل الدار المعادیة فیشوشون علینا اهل الحرب، فیوخذ منهم المال، لیصرف الی الغزاة الذین یقومون بنصرة الدار، ولهٰذا یختلف باختلاف حاله فی الغنی والفقر، فانه معتبر باهل النصرة، والفقیر لو کان مسلماً کان ینصر الدار راجلًا و وسط الحال کان ینصر الدار راکباً والفائق فی الغنی یرکب و یرکب غلاماً فما کان خلفاً عن النصرة یتفاوت بتفاوت الحال ایضاً. (مبسوط سرخسی جلد ۱۰ صفحہ ۷۸ مصر)

پھر مسلمان ان ذمیوں سے ان کی اس ذاتی جسمانی امداد کے معاوضہ میں جس کے یہ ذمی اپنے غیر مسلم ہونے کی وجہ سے اہل نہیں ہیں، جزیہ لیتے ہیں، اس لیے کہ دارالاسلام کی مدافعت و مدد اس کے سب رہنے والوں پر یکساں واجب تھی اور چوں کہ ذمی جسمانی امداد کے قابل نہیں کیوں کہ وہ دل میں دشمنوں کی طرف طبعاً مائل ہیں تو اگر ان کو اسلامی فوج میں داخل کر لیا جائے تو وہ دشمنوں کو مدد پہنچائیں گے، اس لیے ان سے جسمانی مدد کے بدلہ مالی مدد لی جاتی ہے تاکہ ان کی امدادی رقم ان مسلمان غازیوں پر صرف کی جائے، جو دارالاسلام کی طرف سے لڑ رہے ہیں اور اسی لیے ان ذمیوں سے ان کی مالی حالت کی کمی اور زیادتی کے سبب سے ان کے جزیوں کی رقم بھی کم و بیش رکھی گئی ہے، کیوں کہ امداد کرنے والوں میں بھی اس حیثیت کی کمی بیشی کا اعتبار رکھا گیا ہے، کیوں کہ اگر مسلمان نادار ہو تو وہ صرف اپنی ذات سے پیادہ لڑائی کو تیار ہوگا اور متوسط الحال مسلمان گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے گا اور دولت مند مسلمان خود بھی سواری پر جائے گا اور اپنے غلام کو بھی اپنے ساتھ سوار کر کے لے جائے گا، انہی حالات کے مساوی ذمیوں سے بھی جزیہ کی رقم بہ تفاوت حال وصول کی جائے گی، یعنی جس طبقہ کا مسلمان سپاہی و غازی اپنے اوپر خرچ کرے گا، اس طبقہ کے ذمی سے اس کے مطابق جزیہ لیا جائے گا۔

اسی اعتراض و جواب کو سید محمود آلوسی (مفتی بغداد) اپنی مشہور و مقبول تفسیر روح المعانی میں نقل کر کے کہتے ہیں:

وقد يجاب بانها بدل عن النصرة للمقاتلة منا ولهذا تفاوتت لان كل من كان من اهل دارالاسلام يجب عليه النصرة للديار بالنفس والمال وحيث ان الكافر لا يصلح لها ميله الى دار الحرب اعتقاداً اقيمت الجزية الماخوذة المصروفة الى الغزاة بتمامها.(جلد عاشرص ۷۲)	اور اس کا جواب اس طرح دیا جاتا ہے کہ یہ جزیہ ہمارے (مسلمان) سپاہیوں کی جسمانی وذاتی امداد کا مالی معاوضہ ہے اور اسی سے اس کی مقدار حیثیت مالی کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، کیوں کہ دارالاسلام میں سب رہنے والوں پر دارالاسلام کی امداد جان و مال سے ضروری ہے اور اس کے بہ جائے غیر مسلم اس لیے کہ وہ طبعاً دارالحرب والوں کی طرف اعتقاداً میلان رکھتا ہے، جزیہ (مال معاوضہ) لیا جاتا ہے جو ان مسلمان سپاہیوں پر خرچ کیا جاتا ہے۔

علمائے احناف کا یہی مسلک ہے، چنانچہ ہدایہ کتاب الجزیہ اور اس کی شرح فتح القدیر میں یہ مسائل مذکور ہیں، اس باب میں مولانا کا احسان یہ ہے کہ انھوں نے امام سرخسی کے نظریہ کی تائید میں مغازی وفتوح کی کتابوں سے تائیدی واقعات یک جا کر دیے جس نے نظریہ کو فقہ کا ناقابل تردید مسئلہ بنا دیا، مخالفین اسلام کی طرف سے اس پر بڑا غلغلہ بلند تھا کہ اسلامی ملکوں میں غیر مسلم رعایا کو عام حقوقِ زندگی بھی حاصل نہیں، اتفاق سے اسی زمانہ میں آرمینیا کا واقعہ پیش آیا، یعنی ٹرکی نے آرمینیا کے عیسائیوں کی بغاوت کو جب بہ زور ختم کر دیا تو یورپ کے اصحاب قلم نے اسلامی ملکوں میں غیر مسلموں پر مظالم کے دردناک مرثیے چھاپے اور اس کا ذمہ دار اسلام کو قرار دیا، اس موقع پر مولانا نے آرمینیا کے مفروضہ مظالم کے اسباب الگ لکھے اور ''حقوق الذمیین'' لکھ کر یہ بتا دیا کہ اسلام نے اپنی غیر مسلم رعایا یعنی ذمیوں کو جو حقوق دیے ہیں وہ تمام تر عدل وانصاف پر مبنی ہیں، بلکہ اس کی بلندی تک یورپ کی سلطنتوں کے عدل کا پرِ پرواز ہنوز نہیں پہنچا ہے۔

اس مضمون نے مخالفوں کی آنکھیں بھی کھول دیں اور اس وقت سے برابر عیسائی اہل قلم اس کے جواب میں مصروف ہیں اور سب سے آخری کتاب اس کے جواب میں پروفیسر پادری اے ایس ٹرٹین (سابق پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی) کی کتاب ''غیر مسلم رعایا مسلمان خلفاء کے زیر حکومت''

(The Caliphs and Their non-muslim subjects) ۱۹۳۰ء ہے۔

عیسائی یورپ نے خلفائے راشدین اور خصوصاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک بہت بڑا الزام یہ قائم کیا تھا کہ انہوں نے اسکندریہ کے کتب خانہ کو جو دنیا کی صدیوں کی محنتوں کا خزانہ تھا، جلا کر خاک کر دیا اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اسلام علم کا دشمن ہے، گو اس پر بحث ہوسکتی ہے کہ ہر خرافات کا مجموعہ علمی خزانہ ہونے کا مستحق کہاں تک ہوسکتا ہے، تاہم مولانا شبلی آگے بڑھے اور تاریخی تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا کہ یہ الزام مسلمانوں پر سراسر غلط ہے، بلکہ خود عیسائیوں نے اپنے زمانہ میں صدیوں پہلے اس کو برباد کر دیا تھا، یہ تحقیق بھی بہت مقبول ہوئی اور اس کے بعد خود یورپین محقق مصنفوں نے اس الزام کی تردید کی ہے، شام کے جرجی زیدان نے مولانا کے مضمون کا جواب لکھا تو اللہ تعالیٰ نے راقم آثم کو توفیق بخشی کہ اس کا جواب لکھے، چنانچہ وہ الندوہ میں شایع ہوا۔

اسی جرجی زیدان نے قبۂ اسلام میں بیٹھ کر تمدن اسلامی کے نام سے متعدد جلدوں میں اسلامی عربی تمدن کی تاریخ لکھی اور اس میں بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے بہ ظاہر عرب خلفا کے محاسن اور درحقیقت ان کے معائب کا دفتر تیار کیا کہ نادان مسلمان اس کے شکر گزار ہوں، لیکن دانا دشمنوں نے اس کی اصل حقیقت کو سمجھ کر اس کی یہ قدردانی کی کہ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر مارگیولیوتھ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور مسلمان طالب علموں کے سامنے اس زہر آلود خوانِ کرم کو رکھنا طے ہوا، اس وقت ساری دنیائے اسلام اور علمائے اسلام میں سے مولانا ہی کا قلم نیام سے نکلا اور مصنف کے سارے اعتراضات کی صفوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا، ان کی یہ خدمت ایسی قیمتی ثابت ہوئی کہ مصر کے علما نے اس کی پوری قدر کی اور مولانا کی جلالتِ مرتبت کا اعتراف کیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف انگریز مورخوں نے سیاسی اغراض کی خاطر ہندوؤں پر عالم گیر کے مفروضہ مظالم کی یہ تشہیر کی کہ خود مسلمانوں کو بھی اس کا یقین آ گیا اور پھر ہندوؤں میں جدوناتھ سرکار جیسے محقق پیدا ہو گئے، جنہوں نے عالم گیر کو اس بنا پر کہ وہ اکبر کے بعد ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے تخیل کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتا تھا، ہر الزام کا مورد بنایا، اس وقت سارے ہندوستان میں صرف مولانا ہی کا قلم تھا، جو نیام سے باہر آیا اور تمام اعتراضات کے مفصل جوابات دیے، یہ اب تک اس باب میں بے مثال تصنیف ہے اور متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے، اسی طرح مسلمان

بادشاہوں کے علمی وتمدنی کارناموں کو پوری آب وتاب سے بڑی عرق ریزی اور جاں فشانی سے جمع کیا اور ان کو شایع کیا، اسلامی کتب خانے، اسلامی شفاخانے، ہندوستان پر اسلامی حکومت کے اثرات، تزک جہاں گیری وغیرہ اسی قسم کے مضامین ہیں، یہ کہنا بہت آسان ہے اور ایک حد تک سچ بھی ہے، یہ سلاطین مسلمان ضرور تھے، مگر اسلام یا اسلامی طرزِ حکومت کے تمام تر نمایندے نہ تھے، اس لیے ان پر اعتراضات کرنے سے اصل اسلام پر زد نہیں پڑتی، لیکن اسلام کے ۱۳۶۱ برسوں کے اندر مسلمان بادشاہوں اور اسلامی حکومتوں نے اپنے مسلمان ہونے کا کوئی پاک اثر اگر ظاہر نہیں کیا تو اسلام کی بے تاثیری کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی۔

اسلامی طرز حکومت کی صحیح تصویر کے لیے انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حیاتِ مبارکہ کا انتخاب کیا، اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تلاش ومحنت اور اپنی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے عہد حال کے اقتضا کے مطابق یہ تصویر ایسی عمدہ کھینچی کہ دیکھنے والوں کی زبان سے بے ساختہ سبحان اللہ اور ماشاء اللہ نکل گیا، انہوں نے دنیا کی تاریخوں کو چیلنج دیا کہ اس شبیہ مبارک کی مثال اگر اس کے مرقع میں ہے تو پیش کرے۔

آج کل کی سیاسی واقتصادی تحریکات کے انقلابی دور میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اسلام کا سیاسی واقتصادی نظام کیا ہے، ڈھونڈھنے والے ڈھونڈ رہے ہیں اور لکھنے والے لکھ رہے ہیں، لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ اس کام کا مسالہ ان کو کہاں سے ہاتھ آرہا ہے؟ الفاروق سے! اس سے یہ معلوم ہوگا کہ ان کی دور بین نگاہ نے اس ضرورت کا پہلے ہی احساس کرلیا تھا۔

الفاروق کی نسبت یہ کہنا سچ ہے کہ اس میں حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی روحانی زندگی کا خاکہ پوری طرح نہیں ابھارا گیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ خاکہ تو ہماری قدیم کتابوں میں بحمد اللہ پوری طرح موجود ہی ہے، مصنف نے اس گوشہ کو اجاگر کیا ہے، جو دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا اور جس کی ضرورت ان کے عہد میں بہت شدید تھی، چنانچہ یہ اعتراف ناگزیر ہے کہ الفاروق نے کتنے گرتوں کو تھام لیا اور کتنے دلوں میں اسلام کی صداقت کا بیج بو دیا، اسی طرح اس میں بعض اغلاط کا وجود اور بعض جوابی نظریوں کی کم زوری بھی مصنف کی بشریت کی حامل ہے۔ والعصمۃ للہ وحدہ۔

تاریخی مسائل کی تحقیقات کا جو پرداز یورپ نے قائم کیا ہے، اور یورپ کے مستشرقین جس

وسعت نظر، جستجو اور نادر کتابوں کے مطالعہ اور نامعلوم گوشوں سے اہم نتائج کی تلاش کرتے ہیں، مولانا نے اپنی اس تصنیف اور دوسری تصانیف اور اپنے تمام مضامین میں اس کا بہترین نمونہ پیش کیا، جن کی مدح وستائش کا اعتراف خود یورپ کے مستشرقین نے علی الاعلان کیا اور اس طرح اسلام کی سربلندی کا جھنڈا جس کو وہ جھکا دینا چاہتے تھے، مولانا کے دست و بازو نے اس کو علی حالہ بلند رکھا اور اس کے لیے وہ ساری دنیائے اسلام کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

عیسائی مدت سے کوشاں ہیں کہ وہ قرآن پاک کو محرف ثابت کرسکیں، اس کے لیے وہ طرح طرح کی تدلیس اور دسیسہ کاری کیا کرتے ہیں، جس سال انہوں نے وفات پائی ہے، اسی سال اپریل ۱۹۱۴ء میں لندن سے ایک غلغلہ بلند ہوا کہ کیمبرج یونیورسٹی کے لائبریرین ڈاکٹر منگانا نے لائبریری کے ایک گوشہ میں قرآن پاک کا ایک ایسا پرانا قلمی نسخہ پایا ہے جو موجودہ قرآن سے بہت مختلف ہے، ڈاکٹر منگانا نے اس کی پوری تشہیر کی، چنانچہ ۲۵ راپریل ۱۹۱۴ء کو ٹائمنر آف لندن نے اس پر ایک آرٹکل لکھا اور بڑے دعویٰ سے اس کا اعلان کیا، اس اعلان کے مقابلہ کے لیے بھی مولانا ہی کا قلم میدان میں آیا اور متعدد مضامین میں اس کا جواب دیا، اور اس تحقیق کا سارا تار و پود بکھیر دیا۔

اس زمانہ میں علما جو کچھ لکھتے تھے وہ عربی یا فارسی میں، مولانا نے بھی علی گڑھ آنے سے پہلے تک اسکات المعتدی عربی میں لکھی، فارسی نامے بڑی کوشش سے لکھتے تھے، صرف ایک رسالہ ''قرأۃ فاتحہ خلف الامام'' کے رد میں اردو میں لکھا، مگر اس کو اپنے نام سے نہیں چھپوایا، لیکن جس طرح ہمارے علمائے کرام نے زمانہ کی زبان بدلنے کے ساتھ عربی کی جگہ مفید عام تالیفات فارسی میں شروع کردیں اور پھر فارسی کا چلن بدلنے پر حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی و حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی و حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمہم اللہ تعالیٰ نے اردو میں تالیف شروع کی، مولانا نے بھی عربی اور فارسی کو چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ فرمائی اور اس زبان کو جس کی نسبت بہ طور معذرت سیرۃ النعمان میں یوں فرماتے ہیں ع ''حرف بہ اردو زدن آئین نہ بود'' اپنی نکتہ سنجیوں اور خوش بیانیوں سے یہ عروج بخشا کہ علمائے زمانہ کے لیے اس میں لکھنا پڑھنا مطلق عار نہ رہا اور بے شمار کتابیں ان کے قلم سے اس زبان میں تالیف پائیں، اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ اس میں بعض علمائے اسلام نے بھی کتابیں لکھیں جو اپنی ہدایت و افادیت اور مضامین کی بلندی و ندرت کے لحاظ سے قابل قدر ہیں، مگر

بیان کے اشکال، تعبیر کی دقت، علمی وفنی اصطلاحات کی کثرت اور فلسفیانہ طرزِ بیان کے تنوع کے سبب سے عوام تو عوام بہت سے خواص کے دسترس سے بھی وہ باہر ہیں، مولانا نے اپنے لیے بیان کی سہولت، عبارت کی روانی، ترتیب کی خوبی، عام فہم الفاظ کے انتخاب اور تشبیہ واستعارہ کی عمدگی سے وہ طرز نکالا کہ ان کی کتابیں ادب وانشا کا اعلیٰ نمونہ قرار پائیں اور تعلیم یافتہ تو تعلیم یافتہ حضرات علما کو بھی بالآخر اس کی تقلید سے چارہ نہ رہا اور اب تو وہ علمی ومذہبی علوم کی ٹکسالی زبان بن گئی ہے۔

اس موضوع پر ایک اور رُخ سے نظر کیجیے، اس وقت حضرات علما جس قسم کے مضامین پر رسائل تالیف فرما رہے تھے وہ دو تین موضوعوں سے باہر نہ تھے، تصوف وفقہ کے خلافی مسائل کی تحقیق یا فرق باطلہ کی تردید، مولانا نے جب اس میدان میں قدم رکھا، اس محدود رقبہ کو وسیع سے وسیع تر کر دیا، تاریخی، فقہی، تمدنی، ادبی، علمی، فلسفی، سیاسی غرض ہر نوعِ سخن میں وہ گل باری کی کہ ساری زمین قسم قسم کے پھولوں سے پر بہار ہو گئی اور اب اس کی تقلید میں علما کی تحریریں اور تالیفیں بحمد اللہ کہ اپنی وسعت روز بروز بڑھا رہی ہیں۔

اس موضوع کا ایک اور گوشہ بھی پردہ کشائی کا محتاج ہے، علمائے کرام کا بڑا مشغلہ اس عہد میں مناظرہ تھا، اور اس وقت کا علم کلام گویا یہی طرزِ سخن وری تھا، بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنی تالیفات کے لیے اس کوچہ کو اختیار نہیں کیا، مگر غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان کی ساری عمر اسی مولویانہ مناظرہ ہی میں گزر گئی، اس وقت خصوصیت کے ساتھ چار فریقوں میں مناظرے جاری تھے، حنفی اور اہل حدیث، سنی اور شیعہ، مسلمان اور عیسائی، مسلمان اور آریہ، اب ذرا مولانا کی تالیفات پر نظر ڈالیے، بہ قول انہی کے:

گرچہ سرو برگ سخن دیگرست   شمع ہمان ست ولگن دیگرست

انہوں نے مناظرہ کی بدنما شکل کو بدل دیا اور احقاقِ حق اور ازہاق باطل کے لیے زمانہ کے مطابق ایک اور دل نشین شکل پیدا کر دی، ان کی سب سے پہلی کتاب سیرۃ النعمان کا موضوع کیا حنفی اور اہل حدیث کا مناظرہ نہیں؟ ان کی دوسری کتاب الفاروق کیا شیعہ سنی مباحث کا فیصلہ نہیں؟ ان کی باقی کلامی وتاریخی کتابیں عیسائی مشنریوں اور مستشرقوں اور ہندو معترضوں کے جواب میں نہیں، لیکن بات یہ ہے کہ قدیم مناظرانہ قیل وقال کا طریق حریفانہ تعصبات، جوابی الزامات، بدنما طعن وطنز، سوء تعبیر اور ناسزا سب وشتم سے اتنا بدنما ہو گیا تھا کہ اس نے تاثیر وتاثر اور قبول حق کی ساری صلاحیت اپنے اندر

سے کھودی تھی، حالاں کہ احقاقِ حق اور ازہاقِ باطل ہمیشہ سے اہل حق کا شیوہ رہا ہے اور کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں رہ سکتا، اس لیے مولانا کی ژرف نگاہی نے لڑائی کے میدان کو نہیں، بلکہ جنگ کے نقشہ کو بدل دیا، انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ردِ الزام اور ردِ جواب کے بہ جائے اپنے ہی دعووں کو ایسے دل نشین، دل چسپ اور محققانہ طریق استدلال سے بیان کیا جائے کہ بیان کی ندرت، طریق تعبیر کی سنجیدگی اور دلائل کی قوت خصم کو جواب کے قابل ہی نہ رکھے، چنانچہ سیرۃ النعمان اور الفاروق اور الجزیہ وغیرہ کے جوابات میں جواب دینے والوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، مگر پھر بھی وہ اپنی جگہ پر رہیں اور ان سے بڑا فیض پہنچا اور علما نے بھی اس پرداز پر کتابیں لکھنی شروع کردیں، جو مفید حال ہیں۔

مولانا سے پہلے ہمارے علما پر مدرسیت اتنی چھاگئی تھی کہ ان کی نظر درسی کتابوں اور ان کے شروح وحواشی تک محدود ہوکر رہ گئی تھی، زیر درس کتابوں کے علاوہ کسی نئی کتاب کا دیکھنا، کسی اور علم وفن کی کتاب سے استفادہ، قلمی کتابوں کی تلاش اور نوادر کتب کے مطالعہ کا شوق عموماً ناپید تھا، مولانا کو اللہ تعالیٰ نے یہ ذوق فطری عنایت فرمایا، انہوں نے ہر علم وفن کی بہ کثرت کتابیں مطالعہ کیں، نوادرِ کتب بہ کثرت بہ ہم پہنچائے، کتب خانے چھانے، دنیا کے کونہ کونہ سے مطبوعات منگوائے، ادب، محاضرات، فتوح، تاریخ، رجال، فلسفہ، منطق، کلام کا بڑا سرمایہ جمع کیا اور اپنی تصنیفات اور مضامین میں ان کے حوالے دیے، نصاب تعلیم میں ان میں سے بعض کو داخل کیا، طلبہ اور علما کو ان کے مطالعہ کی ترغیب دی اور اپنے شاگردوں اور ہم نشینوں میں اس کا ذوق پیدا کیا، ندوہ کے ایک اجلاس میں علما کے فرائض پر تقریر کرتے ہوئے خاص طور سے ادھر توجہ دلائی، ان کو یہ دیکھ کر دلی تکلیف ہوتی تھی کہ یورپ کے مستشرقین جن کو اسلام سے کوئی واسطہ نہ تھا، وہ تو مسلمانوں کے علوم وفنون کی نادر کتابوں کی فراہمی، تصحیح، تحشیہ اور اشاعت میں ایسی جاں فشانیاں دکھارہے ہیں اور مسلمان علما جو ان علوم کے اصل وارث تھے، ان کو اپنے ان خزانوں کی خبر نہیں، چہ جائے کہ ان کی تلاش وتصحیح ومطالعہ واشاعت کی زحمت اٹھائیں، مولانا نے اسی شوق میں ایک دفعہ یہ ارادہ کیا کہ ان کی اشاعت کی خاطر ایک مجلس قائم کی جائے، اس کا اعلان بھی کیا، مگر خاطر خواہ جواب نہیں ملا، اسی سلسلہ میں دائرۃ المعارف حیدرآباد کو متوجہ کیا اور اس سے فائدہ پہنچا اور کہا جاسکتا ہے کہ ان کی یہ تحریک علما میں ناکام نہیں رہی۔

ان ہی دو غرضوں کے لیے دارالمصنفین کا خاکہ ان کے دماغ میں آیا تھا، جو ان کی زندگی کا

اخیر کارنامہ تھا، ان کو جب کوئی نئی قلمی کتاب ہاتھ آتی یا کوئی نادر کتاب چھپ کر آتی تو ان کی سرخوشی کا عجیب عالم ہوتا تھا، قلمی کتابوں کو ہر قیمت پر خریدنے کو تیار ہو جاتے تھے، اگر ہاتھ خالی ہوتا تو حیدرآباد وغیرہ سرکاری کتب خانوں کو اس کی طرف متوجہ کرتے، دوستوں کو اس کی خریداری کی ترغیب دیتے، جن میں سب سے پہلا نمبر ان کے حبیب مکرم مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا تھا، اور اس کی خبر دوستوں کو اور عزیز شاگردوں کو دیتے تھے، چنانچہ مکاتیب کے اوراق ان بشارتوں اور خوش خبریوں سے معمور ہیں۔

مولانا خود بھی اس علمی تبلیغ کو اپنی زندگی کا ایک اہم فرض سمجھتے تھے، چنانچہ وفات سے ڈیڑھ سال پہلے اپنے ایک عزیز شاگرد مولوی عبدالباری صاحب ندوی کو لکھتے ہیں:

> ''بھائی میں تو اب چراغ سحر ہو رہا ہوں، تم لوگ اب اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرو، میں اپنے عیوب کو سب سے بہتر جانتا ہوں، **المرء اعرف بنفسه**، لیکن صحیح علمی مذاق کا پھیلانا اپنا کام سمجھتا رہا، اگر اس میں ذرا بھی کامیابی ہوئی ہو تو مسلم گزٹ کے مصنوعی معائب کے قبول کرنے پر آمادہ ہوں''۔(۵)

مولانا کو اپنی اس علمی دعوت و تبلیغ اور ادبی تعلیم و تربیت میں کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کا فیصلہ ناظرین کے ہاتھ ہے، ان کی یہ کامیابی صرف ان کے حلقۂ تلمذ تک محدود نہیں، بلکہ دوسرے حلقوں کے علما اور تعلیم یافتہ بھی اس سے متاثر ہوئے اور برابر متاثر ہوتے جارہے ہیں، یہاں تک کہ ان کے طریقۂ تحریر، اسلوبِ تحقیق اور طرز تنقید کی تقلید سے اب کوئی حلقہ خالی نہیں رہا۔

وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ علما میں باہم ایسا رشتۂ اتحاد ہو اور بہ حیثیت ایک جماعت کے ان کا یہ علمی و مذہبی وقار ہو کہ سارے مسلمان ان کی پیروی کو اپنا شعار بنالیں اور ان کو پوری قوم پر پورا اختیار حاصل ہو اور حکومت وقت اس وقت ان کے سامنے سر جھکا دے گی، چنانچہ وہ اپنی اس تقریر میں جو علما کے فرائض پر ندوہ کے ایک اجلاس میں کی تھی، فرماتے ہیں:

> ''غرض اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ علما کو قوم پر اب بھی نہایت وسیع اختیارات حاصل ہوسکتے ہیں، ان اختیارات کے حاصل ہونے کی شاید علما کو ضرورت نہ ہو، لیکن قوم کو اس کی ضرورت اور سخت ضرورت ہے، کیوں کہ علما جب تک قوم کے اخلاق، قوم کے خیالات، قوم کے دل و دماغ، قوم کی معاشرت، قوم کا تمدن، غرض قومی زندگی کے تمام بڑے بڑے حصوں کو اپنے قبضۂ اختیار میں نہ لیں گے، قوم کی ہرگز ترقی نہیں ہوسکتی......اس وقت ندوہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اوقاف کے لاکھوں روپے جو متولیوں

کے ہاتھ سے نہایت بے دردی سے برباد ہو رہے ہیں، ندوہ کے ہاتھ میں دے دیے جائیں اور گورنمنٹ نہایت خوشی سے اس دعویٰ کو قبول کرے۔"

ندوہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ انگریزی مدارس میں عربی وفارسی کا نصاب تعلیم جو اس وقت ابتری کی حالت میں ہے، اس کی اصلاح کردی جائے اور گورنمنٹ کو اس دعویٰ پر بہت کچھ لحاظ ہوگا۔

ندوہ دعویٰ کرسکتا ہے جس طرح قدیم زمانہ میں عدالتِ صدر میں فقہی مسائل کے لیے قاضی ومفتی مقرر کیے جاتے تھے، وہ قاعدہ سرنو سے قائم کیا جائے۔

ندوہ کو اس وقت یہ قوت حاصل ہوگی کہ تمام جماعت اسلام اس کی ہدایتوں کی پابند ہو، اس کے فتووں کے آگے سر جھکائے، اس کے فیصلوں سے سرتابی نہ کرسکے۔

اس صورت میں ندوہ تمام قوم کو بیہودہ مراسم سے، خلاف شرع باتوں سے، ناجائز امور سے بہ زور روک سکتا اور جماعت اسلام کو نماز کا، روزہ کا، حج کا، زکوٰۃ کا بہ زور پابند کرسکتا ہے، یہ زور تلوار کا نہیں ہوگا، بلکہ اتباع سنت کا اور اتفاق باہمی کا ہوگا۔" (خطباتِ شبلی ص۳۳،۳۴)

مولانا کی نگاہ میں علما کے فرائض کتنے وسیع تھے، وہ خود اس وسعت پر عامل اور دوسروں کو بھی اس وسعت خدمت کی طرف دعوت دے رہے تھے، علما میں وہ پہلے شخص تھے جس نے وقت کی سیاسی باتوں میں دل چسپی لی، کانگریس کی حمایت کی، ہندو مسلم سیاسی مصالحت پر مضامین لکھے، مسلم لیگ کے زاویۂ نظر بدلنے کے لیے متعدد مضامین اور بیسیوں نظمیں لکھیں، احرار اسلام کی رہنمائی کی اور ان کی بے راہ روی پر ان کو ٹوکتے بھی رہے، ہندوستان میں عالم گیر اتحاد کے وہ داعی اول تھے، اوقاف اسلامی، وقف علی الاولاد، تعطیل جمعہ اور دوسرے اسلامی مسائل کو حکومت وقت کے سامنے پیش کرکے تحریک کو کام یابی کی حد تک پہنچایا اور عام مسلمانوں پر ان کا یہ بڑا احسان ہے، اس روشنی میں دیکھیے کہ اب آج کل جو حضرات علما میں سیاسی سرگرمی ہے، مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کا جوش ہے، ملکی مطالبات کے ساتھ ہم آہنگی ہے اور ہندو مسلم اختلافات کو دور کرنے کے لیے جو دوڑ بینی ہے، اور مختلف سیاسی گروہوں میں منقسم ہو کر بھی بہرحال سیاسی مسائل سے جو وابستگی ہے وہ کس کی پکار کا نتیجہ ہے۔

مولانا نے علما کے طبقہ میں جن نئے خیالات اور حالات کی پرورش کی اور ان کی جامد سطح میں جو حرکت پیدا کرنی چاہی، اس کا یہ مختصر خاکہ ہے، ان کے ذہن میں اس انقلاب کے لیے تدریج کی

ضرورت تھی، اور وہ اپنی تصنیفات میں اسی پر عمل پیرا تھے، چنانچہ ۱۹۰۳ء میں ایک دوست کو لکھتے ہیں:

"سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں علما وغیرہ کو جس سطح پر لانا چاہتا ہوں اس کے لیے زینے درکار ہیں، الغزالی پہلا زینہ ہے، دوسرا تاریخ علم کلام، پھر اصلی سطح یعنی علم کلام جدید ہے جو زیر تصنیف ہے۔...... غزالی میں اگر کھل کھیلتا تو علما برسوں بلکہ قرنوں کے لیے ہاتھ سے نکل جاتے اور مجھ کو ان سے کٹ کر الگ ہو جانا منظور نہیں بلکہ ع میں تو ڈوبا ہوں ولے یار کو بھی لے ڈوبوں گا۔" (مہدی ۱۳)

انہوں نے اپنے طرزِ عمل کی غلطی محسوس کی ہوگی، ایک زمانہ تک ان کو اس پر تعجب آتا رہا کہ سلف میں بھی بہت سے علما اور ائمہ گزرے ہیں، جن کے بہت سے خیالات اور نظری عقائد جمہور علما سے مختلف تھے، مثلاً وہ قدری تھے، یا مرجئی تھے، پھر بھی وہ مقبول تھے، اور لوگ ان کی قدر کرتے تھے، پھر وہ خود ہی مجھ سے اس کی وجہ ظاہر فرمانے لگے، کہ بات یہ ہے کہ ان بزرگوں کے یہ نظری خیالات ان کے زہد و عبادت و اتقا کے ساتھ تھے، اس لیے وہ مقبول تھے، اور یہاں یہ کیفیت نہیں، اس کے بعد وہ دور آیا جب ان کا خیال ادھر رجوع ہوا کہ اختلافِ خیال کے باوجود وہ علما میں کھپ سکتے ہیں اور ان کی تصنیفات کے اختلافی حصہ سے قطع نظر کر کے ان کے کارآمد حصوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، چنانچہ دس برس کے بعد مئی ۱۹۱۳ء میں ایک صاحب نے اس زمانہ میں جب بعض علما نے سرکارِ بھوپال میں یہ تحریک پیش کی تھی کہ سیرت کی امداد بند کر دی جائے، مولانا کو ازراہِ ہمدردی لکھا تھا کہ سیرت کی تصنیف میں روحانیت سے قطع نظر نہ ہو۔

مولانا اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"آج کل کے ریاکاروں نے دوسروں سے بدگمان کرنے کے لیے بہت سے الفاظ تراشے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فلاں شخص میں روحانیت نہیں، فلاں شخص عالم ہے، لیکن دین دار نہیں لیکن ان ہی دین داروں کو مہینوں دیکھا ہے کہ نمازِ فجر کبھی نصیب نہیں ہوئی، باوجود اس کے ان کی دین داری اور روحانیت میں ذرہ بھر فرق نہیں آتا۔"

یقین فرمایئے زمانہ کی خر بازاری دیکھ کر دنیا میں زندگی وبال معلوم ہوتی ہے، خواص تک عوام بن گئے ہیں، حق و باطل کی تمیز کا مادہ مسلوب ہو گیا ہے، مدینہ یونیورسٹی کے نصاب پر جو کچھ یہ حضرات لکھ رہے ہیں، کیا سچائی پر مبنی ہے، صرف یہ کاوش ہے کہ ان کا نام کیوں نہیں لیا گیا۔

قرآن شریف پر نقطے حجاج بن یوسف نے لگائے اور کسی نے یہ نہ کہا کہ حجاج پر قوم کو بھروسہ نہیں،

بلکہ وہی منقط قرآن آج تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے، موجودہ عمارت کعبہ بھی حجاج کی ہے۔

بلاغت کا پورا فن جس سے قرآن مجید میں ہر جگہ کام لیا جاتا ہے، حافظ، جاحظ، عبدالقاہر جرجانی، حکا کی کا بنایا ہوا ہے، سب معتزلی تھے، کسی نے نہیں کہا کہ ان پر قوم کو اعتماد نہیں، تفسیر کشاف تمام محدثین پڑھتے تھے، حالاں کہ اس میں اعتزال بھرا ہوا ہے، قوم میں جب نیک و بد کی تمیز ہوتی ہے، تو وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتی، اس کو خود بھروسا ہوتا ہے، کہ وہ خذ ما صفا کرلے گی، جب علم نہیں رہتا اور حسد اور رشک کے سوا کوئی جوہر نہیں موجود ہوتا تو لوگ اس قسم کی باتیں کہہ کر اپنا دل خوش کرتے ہیں اور لوگوں کو بدگمان بناتے ہیں۔

ارباب دیوبند نہایت زاہد اور متقشف ہیں اس کے ساتھ وسیع النظر بھی نہیں ہیں، تاہم چوں کہ مخلص ہیں، اس لیے شور وشر نہیں مچاتے، کوئی پوچھتا ہے تو جو جانتے ہیں بتا دیتے ہیں۔ (عبدالحکیم ۲)

لیکن ایک ہی سال کے بعد ۱۹ / مئی ۱۹۱۴ء کو جب منازعاتِ ندوہ کے سلسلہ میں دہلی کے بعض علما نے علم الکلام اور الکلام کی بعض عبارتوں کی بنا پر ان کی تکفیر کا فتویٰ دیا تو صاف اعلان فرمایا:

''میرے عقائد وہی ہیں جو حضرات حنفیہ کے عقائد ہیں، میں عقائد اسلام اور مسائل فقہیہ دونوں میں حنفی ہوں۔'' (دیکھئے زیر عنوان عقائد وخیالات ۸۲۵) (طبع قدیم)

اس اعلان کے ۶ ماہ بعد مولانا نے وفات پائی۔

یہاں پر ایک بات نوک زبان پر آئی جاتی ہے، مسلمانوں کو شکوک وشبہات اور الحاد و بے دینی سے بچانے کے لیے جو تدبیر ہمارے حکمائے متکلمین نے اختیار کی وہ بھی گو اپنی جگہ پر ایک چیز ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ محض علوم زمانہ کے ذریعہ مسلمانانِ زمانہ کو زمانہ کی غلطیوں سے بچا کر یقین و اذعان کی منزل مقصود تک پہنچانے کی یہ تدبیر نہیں، متکلمین کے علاج سے یہ ہوسکتا ہے کہ بیماری کے کچھ اثرات زائل ہو جائیں، لیکن اس سے صحت کا درجہ کبھی حاصل نہیں ہوسکتا، آنحضرت ﷺ کا ظہور جس زمانہ میں ہوا، روم ومصر وشام وایران میں یہ فلسفیانہ علوم اور الٰہیات کے یہ شکوک وشبہات پورے کے پورے موجود تھے، مگر اس کی اصلاح علم کلام کی ایجاد سے نہیں کی گئی، بلکہ قوت ایمان اور حسنِ عمل کی زندہ مثالوں نے ان کے شکوک وشبہات کے پردوں کو چاک کر دیا، تعلیم یافتگان نبوت جہاں پہنچے سیدھی سادی اور بے کج و پیچ خدائی منطق جو قرآن کی صورت میں تھی، اور اسوۂ رسول ﷺ جس کے وہ خود نمونہ تھے، یہ دو چراغ ان کے ہاتھ میں تھے، جن کو لے کر وہ آگے بڑھتے گئے اور تاریکی کا پردہ چاک

ہوتا گیا، صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کا دور آیا، ان کے زمانہ میں ہذیل، علاف، نظام اور جاحظ وغیرہ متکلمین بھی تھے، مگر تاریخ بتا سکتی ہے کہ اسلام کی ہدایت کا سرچشمہ کس رخ سے بہتا رہا اور دین و اخلاق کی خشک زمین کس سے سیراب ہوتی رہی، یہی صورت حال اس دور کے بعد بھی رہی، شیخ الرئیس بوعلی سینا اور حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ ایک زمانہ میں تھے، مگر روحانی ہدایت کہاں سے ملی اور حضرت ابوسعید کا حکیم مشرق بوعلی سینا کو یہ فرمانا اب بھی صادق ہے، "آنچہ تو می گوئی من می دانم و آنچہ می دانی من می بینم" دوسرے ملکوں کو چھوڑیئے" صرف اپنے ملک کو دیکھئے، یہاں خیالی اور شرح مواقف پر حاشیہ چڑھانے والوں نے کتنے دلوں کو منور کیا اور چشت وسہرورد کے خانوادوں نے اپنے نور باطن سے لاکھوں قلوب کو روشن کر دیا، بات یہ ہے کہ علم کلام صرف معترضوں کی زبان کو بند کرنا سکھاتا ہے، لیکن بند دلوں کو کھولنا، اس کا کام نہیں۔

اس تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ فن کلام بے کار و ہیچ ہے، ایسا سمجھنا غلطی ہے، ملت اسلامیہ ایک عالم گیر سلطنت ہے، اس میں ادنیٰ سپاہی سے لے کر امرا و وزرا تک کی یکساں ضرورت ہے، جس سلطنت میں وزیر ہی وزیر ہوں سپاہی نہ ہوں، وہ کب دشمنوں سے محفوظ رہ سکتی ہے، لیکن ہر ایک ملازم اور عہدہ دار کا ایک خاص مرتبہ اور درجہ ہے، ہر ایک اپنی اپنی استعداد اور موہبت کے مطابق مختلف عہدوں اور درجوں کے کام کے لائق بنائے گئے ہیں، وزرا ہیں جو سلطنت اور فرماں روائی کے فریضہ کو انجام دیتے ہیں، امرا ہیں جو رموزِ سلطنت کے مشیر اور کار پرداز ہیں، سپاہی ہیں جو ملک کے ہر سرحدی درہ اور دشمنوں کے حملوں کے مقامات کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی خدمت سلطنت کے انتظام اور اس کی حفاظت و بقا اور ترقی کے لیے ضروری ہے، ان میں سے اگر وزرا اور امرا یہ سمجھیں کہ سپاہیوں کی ضرورت نہیں تو سلطنت کے انتظام و حفاظت کے اسرار سے ناواقف ہیں اور اگر سپاہی یہ سمجھیں کہ سلطنت کے لیے وہی سب کچھ ہیں، وزرا اور امرا کی ضرورت نہیں تو وہ بھی اس سلطنت کے خیر خواہ نہیں، کہ وہ نہ ہوں تو ملک میں تباہی برپا ہو جائے، لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ مرکزی سلطنت کے مصالح و حکم کے واقف کار اور سلطنت کی پالیسی کے ذمہ دار اور اس کے کلی نفع وضرر کے نگراں وزرا اور امرا ہی ہیں، سپاہیوں کے متعلق صرف اتنے ہی حصہ کی حفاظت فرض اور اسی کے مصالح و حکم کی رعایت ان پر واجب ہے، جن کی حفاظت کا کام ان کے سپرد کیا گیا ہے۔

متکلمین کی مثال اس سلطنت کے مجاہد سپاہیوں[1] کی ہے جو دین کے معترضوں کے خطروں اور دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے علم وفن کی بساط بھر کوشش کرتے ہیں اور حضرات محدثین و فقہا و صوفیہ صافی کی مثال سلطنت کے وزرا اور امرا کی ہے، جن کے ہاتھ میں حکومت کی پالیسی، سلطنت کے مصالح وحکم کی نگرانی اور ساری سلطنت کے حسنِ انتظام اور اجرائے احکام کی طاقت ہوتی ہے، فوج کا ہر دستہ اپنی جگہ پر اپنے مفوضہ حصہ ملک کی فوجی حفاظت کا ذمہ دار ہے، مگر سلطنت کی پالیسی اور رموز مملکت اور ساری سلطنت کے حسن انتظام اور اجرائے احکام سے اس کو تعلق نہیں، اس سے آگے بڑھ کر اگر وہ یہ کہیں کہ ملت کے کلی مصالح وحکم کے وہ نگراں ہیں، تو وہ غلطی کریں گے اور اگر اسی طرح حضرات محدثین وفقہا یہ سمجھیں کہ دشمنوں سے حفاظت کے یہ فوجی دستے بے کار ہیں تو وہ بھی غلطی پر ہیں۔

اس مثال سے یہ بات اچھی طرح ذہن میں آجاتی ہے کہ ہمارے متکلمین نے اپنے مناظرانہ التزامات کے سلسلہ میں عقائد کا جو دفتر تیار کر رکھا ہے، اس کو ملت کے عقائد سے ذرا تعلق نہیں، وہ تو ان کے فنی مفروضات تھے، جن کو دشمنوں کے مقابلہ میں ان کو خاموش کرنے کے لیے انہوں نے کھڑے کر لیے تھے، اسی طرح حضرات محدثین وفقہا کو چاہیے کہ ان متکلمین کے ان فنی مفروضات پر اس وقت تک ان کو ملت کا باغی وطاغی ٹھہرا کر ان کو کافر نہ بنایا کریں، جب تک وہ یہ دعویٰ نہ کرنے لگے کہ ان مدافعانہ مناظروں میں ان کی زبان وقلم سے جو کچھ نکل رہا ہے وہی عین اسلام ہے اور اگر وہ ایسا دعویٰ کریں گے تو یہ سرحدی حفاظت کے بہ جائے جو ان کا فریضہ ہے، مرکزی سلطنت کے اساس و انتظامِ مملکت کے رموز و اسرار وقواعد واحکام میں مداخلت ہے، جس کا دوسرا نام طوائف الملوکی یا بغاوت ہے، اسی لیے یہ بات بہ طور اصول کے مان لی گئی ہے کہ لازم مذہب، مذہب نہیں، یعنی متکلمین کے آرا ونظریات سے جو غلط نتائج لازم آجائیں، وہ ان کا عقیدہ نہیں قرار دیا جائے گا۔

گم کردہ راہ متکلمین کو چھوڑ کر بحمد اللہ تمام متکلمین حق اس نکتہ سے بہ خوبی آگاہ تھے اور یہی سبب ہے کہ وہ اخیر عمر میں جب جنگجویانہ قوی میں افسردگی آتی ہے اور عقل کے بلند بانگ دعووں کی حقیقت سے ان کو آگہی ہوجاتی ہے تو دلائل و براہین عقلی کے بہ جائے وحی الٰہی اور تعلیم نبوی کی صداقت کے آگے سر جھکا دیتے ہیں اور پکارتے اٹھتے ہیں "اِنِّی وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا

---

[1] امام غزالی نے بھی احیاء العلوم میں یہی فرمایا ہے، اور ان کو حارث دین عن تخیلات المبتدعۃ کا خطاب دیا ہے، اور حج کے محافظ دستوں سے ان کو تشبیہ دی ہے، (باب العلم الذی ہو فرض کفایہ)۔

وَّمَآاَنَامِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. امام ابوحنیفہ ﷫ نے علم کلام ہی چھوڑ کر فقہ کا دامن پکڑا تھا، امام ابوالحسن اشعری نے چالیس برس کے اعتزال کے بعد بصرہ کے منبر پر کھڑے ہو کر قبول حق کا اعلان کیا، کہتے ہیں کہ جب امام غزالی ﷫ کا انتقال ہوا تو صحیح بخاری ان کے سینہ پر دھری تھی اور سبکی نے لکھا ہے کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم ان کی اخیر زندگی کا مشغلۂ حیات تھی، علامہ ابن تیمیہ ﷫، حافظ ابن قیم ﷫ اور ملا علی قاری[1] ﷫ نے متعدد حکما اور متکلموں کی نسبت لکھا کہ ان کا خاتمہ عقل کی کوتاہیوں کے اعتراف اور وحی نبوی کے عقیدہ کے اقرار پر ہوا، مرتے وقت امام جوینی کی زبان پر یہ تھا، ''میں اسلامی علوم کو چھوڑ کر عقل کے سمندر میں غوطے لگاتا رہا، اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو افسوس ہوتا، اب میں اپنی ماں کے عقیدہ پر مرتا ہوں'' یا یہ کہا کہ ''اب میں نیشاپور کی بڑھیوں کے عقیدہ پر مرتا ہوں'' اسی قسم کے اقوال علامہ آمدی شہرستانی اور خسرو شاہی وغیرہ متکلمین سے منقول ہیں۔

امام غزالی ﷫ نے احیاء العلوم میں اپنے ذاتی تحقیق و تجربہ کے بعد علم کلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ پڑھنے کے قابل ہے، مولانا شبلی مرحوم نے بھی الغزالی میں اس کو نقل کیا ہے[2] جو بلفظہٖ یہاں درج ہے:

''اکثر یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس (علم کلام) سے حقائق کھل جاتے ہیں اور ان کا پورا پورا علم ہو جاتا ہے، لیکن افسوس علم کلام اس بلند مقصد کے لیے کافی نہیں، بلکہ اس سے کشف حقیقت کے بجائے خبط اور گمراہی زیادہ بڑھتی ہے اور یہ بات اگر کوئی محدث (محض) یا ظاہر پرست کہتا تو تم کو خیال ہوتا کہ آدمی جس چیز کو نہیں جانتا اس کا دشمن ہو جاتا ہے، لیکن یہ بات وہ شخص (یعنی خود امام صاحب) کہتا ہے جس نے علم کلام کو اس حد تک حاصل کیا کہ متکلمین اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے، بلکہ اسی علم کلام ہی میں کمال حاصل کرنے کی غرض سے اور علوم سے جو اس فن سے مناسبت رکھتے تھے، واقفیت پیدا کی، یہ سب کر کے وہ علم کلام سے بے زار ہو گیا۔''

امام رازی نے اپنی کتاب اقسام اللذات میں لکھا ہے:

''میں نے کلام کے سارے مباحث اور فلسفہ کے سارے ابواب پر پوری طرح غور و خوض کر لیا تو میں نے دیکھ لیا کہ ان سے نہ بیمار تندرست ہوتا ہے اور نہ پیاسا سیراب اور میں نے پایا کہ منزل مقصود تک لے جانے والا سب سے قریب راستہ قرآن پاک کا راستہ ہے اور جس کو میری طرح ان علوم کا تجربہ ہو گیا، اس کو یہی معلوم ہو گا۔[3]''

---

[1] شرح فقہ اکبر ملا علی قاری ہند ص ۶، عقیدہ حمویہ کبری رسائل ابن تیمیہ مصر ص ۴۷۱، اجتماع الجیوش الاسلامیہ ہند و صواعق مرسلہ ابن قیم مصر ص ۹۔ [2] الغزالی ص ۱۴۳، مولانا نے اس کے لیے احیاء العلوم کے باب ذکر علوم کا حوالہ دیا ہے، مگر یہ بیان درحقیقت احیاء العلوم کی کتاب قواعد العقائد کی فصل ثانی میں ہے۔ [3] شرح حدیث النزول، ابن تیمیہ، ص ۱۰۵، امرتسر۔

حافظ ابن قیم نے اس کتاب سے کچھ اور فقرے نقل کیے ہیں۔

اب ہم کہتے ہیں کہ اے کاش ہم پیدا ہی نہ ہوتے اور اسی مقام پر میں نے کہا

نهـاية اقـدام العـقـول عـقـال — وغـاية سـعـي العـالـمين ضلال

عقلوں کے قدم کی انتہا کشودہ گرہ ہے — اور دنیا والوں کی کوششوں کی حد ناکامی ہے

ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا — سوى ان جمعنا فيه قيل و قال

ہم نے اپنی ساری عمر کی بحث سے سوا اس کے اور کچھ نہ کیا کہ لوگوں کے اقوال کا دفتر جمع کرلیا۔

واعلم ان بعد التوغل في هٰذه المضائق و التعمق في الاستكشاف عن اسرار هٰذه الحقائق رأيت الاصوب الاصلح في هٰذا الباب طريقة القرآن العظيم والفرقان الكريم، وهو ترك التعمق والاستدلال باقسام اجسام السمٰوت والارضين علىٰ وجود رب العالمين ثم المبالغة في التعظيم من غير خوض في التفاصيل[1]

اور جان لو کہ ان تنگ راہوں میں گھسنے اور ان حقایق کے اسرار دریافت کرنے کے لیے غور و فکر کے بعد مجھے اس باب میں صحیح و مناسب طریقہ قرآن پاک ہی کا نظر آیا اور وہ عقلی کرید کو چھوڑ دینا اور آسمان و زمین کے عجائبات سے اللہ کے وجود پر دلیل قائم کرنے کا طریقہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کا بدل اعتقاد تفصیلات میں پڑے بغیر۔

امام موصوف نے مرض الموت میں جس کا زمانہ ممتد رہا، ۲۱ محرم ۶۰۶ھ کو اپنے ایک شاگرد کو اپنا ایک وصیت نامہ لکھوایا تھا جس کو تذکرہ نویسوں نے بعینہٖ نقل کیا ہے، اس میں موصوف نے اپنی عمر بھر کی علمی تحقیقات اور کلامی مباحث کا آخری نتیجہ یہ پیش کیا ہے۔

ولقد اختبرت الطرق الكلامية والمناهج الفلسفية فما رأيت فائدة تساوي الفائدة التي وجدتها في القرآن العظيم۔ (طبقات الاطباء ابن ابی اصیبعہ ص ۴۷)

میں نے تمام کلامی اور فلسفیانہ طریقوں کو آزما لیا تو میں نے ان کا فائدہ اس فائدہ کے برابر نہیں پایا، جس کو میں نے قرآن عظیم میں پایا۔

اور اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ میں محض اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم کا امیدوار ہو کر مر رہا ہوں، اس وصیت نامہ کے آٹھ مہینے دس دن کے بعد یکم شوال ۶۰۶ھ کو انہوں نے وفات پائی۔

---

[1] اجتماع الجیوش الاسلامیہ، ص ۱۲۰، امرتسر۔

غرض یہ احوال جس طرح دوسروں کو پیش آئے، اس حیات نامہ کے ہیرو کو بھی پیش آئے، اور آخر اس کو یہ کہنا پڑا:

فلسفی سرِّ حقیقت نتوانست کشود   گشت رازِ دگر آں راز کہ افشا می کرد

۱۹۱۰ء سے جب وہ ہر طرف سے سمٹ کر سرکارِ رسالت ﷺ کے آستانہ پر حاضری کے لیے بے تاب ہو رہے تھے، اُن کی ساری ذہنی توجہ دوسرے علمی و کلامی مباحث سے ہٹ کر صرف اسی ایک مرکز پر مجتمع ہوگئی تھی، ان کے پاس نہ اب ابن رشد، غزالی و رازی و بوعلی سینا کا گزر رہے، نہ تاریخ و کلام و فلسفہ کا نام ہے، شب و روز اور کتبِ احادیث و سیرت کا مطالعہ، تعلیماتِ نبوی کی ترتیب، اخلاقِ نبوی کی تحریر، سوانح نبوی کی تلاش اور سیرت نبوی کی نادر کتابوں کی جستجو، جہاں بیٹھتے، کھری چارپائی ہو یا چٹائی ہو، ہر طرف حدیث کی کتابوں اور سیرت کے نسخوں کا ڈھیر ہوتا اور انہی درباریوں کی ہم نشینی میں ان کا سارا وقت گزر جاتا اور خوش ہوتے کہ اب وہ ہیں اور دربارِ رسالت ﷺ کا آستانہ (مکاتیب اول عبدالحکیم۔۳) چنانچہ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے یہی ایک خیال ان پر چھا رہا تھا، یہی ان کی مجلس کی گفتگو تھی، اسی کے لیے خط و کتابت تھی، اُس زمانہ سے لے کر اخیر عمر تک ان کے سارے خطوط و مکاتیب کو پڑھ ڈالیے، ان میں تین باتیں آپ کو ملیں گی، ندوہ کی اصلاح، اسلام کی اشاعت و حفاظت اور سیرت نبوی ﷺ، یہاں تک کہ دمِ نزع بھی آخر لفظ جوان کی زبان سے نکلا وہ سیرت ہے۔

سیرت کی حیثیت ان کی نظر میں ایک کتاب کی نہ تھی بلکہ وقت کے علم کلام کی سب سے بڑی ضرورت کا نام ان کی اصطلاح میں سیرت تھا، فرماتے ہیں:

> ''اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے۔ (مقدمہ سیرت)

اس بنا پر ان کی اصطلاح میں سیرت کلمۂ اسلام کے دوسرے جزو یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی پوری تفسیر و تشریح کا نام تھا، اور یہی ان کی اخیر زندگی کا کارنامہ تھا اور اُسی کو وہ سرمایۂ سعادتِ دارین سمجھتے تھے۔ (مکاتیب، اول حصہ، خانواہ)

کیا ان کے اس کام کی مقبولیت کا اندازہ اس سے نہیں کیا جا سکتا کہ ادھر اُن کے قلم نے سیرۃ کی تصنیف کا اعلان کیا اور ادھر مسلمانوں کی زبانوں سے بہ یک دفعہ لبیک کی صدا بلند ہوئی، اور امداد کی نذر لے کر خود ایک والیۂ ملک آگے بڑھی اور اب جدھر سنو سیرت سیرت کا لفظ ہر مسلمان کی زبان پر تھا، پھر اس کی دوہری مقبولیت کا نشان دیکھیے، وہ زبان جس میں ان کے اعلان سے پہلے صرف میلاد نامہ کی قسم کے رسالوں اور ایک آدھ کتاب تواریخ حبیب الٰہ کی پرانی طرز کی سیرت کے سوا کوئی ایک کتاب بھی موجود نہ تھی، صرف پیروی کی برکت سے پچیس برس کے اندر سیرت پاک کے موضوع پر چھوٹی بڑی ہزاروں کتابوں کے دفتر سے معمور ہوگئی، اس کوشش میں مقدس علما بھی شریک ہو گئے، نئے تعلیم یافتہ اہل قلم بھی، گم کردہ راہ مدّعی اسلام فرقے بھی۔ ذالك فضل الله يوتيه من يشاء۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''اسلام ایک ابر کرم تھا اور سطحِ خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا، لیکن فیض بہ قدرِ استعداد پہنچا، جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی، اسی قدر زیادہ فیض یاب ہوئی۔''

ہندوستان کی یہ فضائے بسیط بھی ابر کرم سے محروم نہ رہی، ہجرت کی پہلی صدی کا خاتمہ تھا کہ اس ابر کرم کے چھینٹوں نے اس کے سمندروں کے کناروں اور پہاڑوں کے دامنوں کو سرسبز و شاداب کر دیا، بحر ہند کے سواحل ملیبار و مدراس سے لے کر گجرات و کاٹھیاواڑ تک مسلمانوں کی نو آبادیاں قائم ہوگئیں، دوسری طرف سندھ کی وادی اس کی فوجِ ظفر موج سے معمور ہوگئی، تیسری صدی کا خاتمہ تھا کہ غزنی میں ترکوں کی ایک نوجوان تازہ دم قوم نے جو ابھی ابھی اسلام کے نام سے آشنا ہوئی تھی، اپنی سلطنت کی طرح ڈالی، اس کا پہلا بانی الپ تگین اور اس کا جانشین سبکتگین ہوا اور اس کے تخت و تاج کا وارث وہ نام ور ہوا، جس کے حملوں نے ہمالیہ کے پہاڑوں سے لے کر بحر ہند کے کناروں تک تہلکہ برپا کر دیا۔

سلطان محمود نے ہندوستان کی سرزمین کو اسلام کے نعروں سے پُر شور کر دیا اور غزنی سے لے کر پنجاب تک یک لخت اسلام کی حکومت قائم کر دی، چھٹی صدی میں غوری آئے تو انہوں نے اور ان کے غلام افسروں نے سارے ہندوستان کو اسلام کے زیرنگیں کر دیا، وہ دن ہے اور آج کا دن ہے کہ یہ ملک اسلام کے مقبوضات میں ہے، جس میں نو کرور، توحید کے حلقہ بہ گوش اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

خلجی اور تغلق عہد کے علمائے خراسان جس طرح ہندوستان کو خراسان و ماوراءالنہر و عراق و عجم کے تیغ آزماؤں نے فتح کیا تھا، اُسی طرح اُس کے دل و دماغ کو انہی ملکوں کے اربابِ کمال نے اپنا باج گذار بنایا، قطار در قطار علما، بخارا، بلخ، سمرقند، خوارزم، عراق اور ایران کے شہروں سے ہندوستان چلے آرہے تھے، اُس زمانہ میں ان اطراف سے آنے والوں کو ہندوستان کا سب سے پہلا شہر ملتان پڑتا تھا، اس لیے ان باکمالوں نے اپنا پہلا پڑاؤ ملتان اور سندھ کے شہر بھکر وغیرہ میں ڈالا، ملتان اور سندھ کے بعد ان کی دوسری منزل لاہور اور اس کے آس پاس کے شہر سیالکوٹ وغیرہ میں ہوتی، سلطان شمس الدین ایلتمش نے جب

۶۰۲ھ میں دلی کو اسلام کا دارالسلطنت بنایا تو ہر طرف سے باکمال علما سمٹ سمٹ کر دلی میں جمع ہونے لگے۔

غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ-۶۸۵ھ) کے زمانہ میں شمس الدین خوارزمی، شمس الدین قوشجی، برہان الدین بزاز، نجم الدین دمشقی، کمال الدین زاہد وغیرہ بیسیوں اربابِ کمال تھے جن کے علم وفضل کی رونق سے دلی، بغداد اور قرطبہ کی برابری کر رہی تھی۔

علاء الدین خلجی (۶۹۶ھ-۷۱۶ھ) کے زمانہ میں ظہیر الدین بھکری، فرید الدین شافعی، حمید الدین مخلص، شمس الدین یحییٰ، محی الدین کاشانی، فخر الدین ہانسوی، وجیہ الدین رازی، تاج الدین مقدم وغیرہ چھیالیس علما دلی میں ایسے تھے جن کی نسبت ضیاء برنی جیسے مورخ کا بیان ہے کہ دنیا میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

محمد شاہ تغلق ۷۲۵ھ-۷۵۲ھ) کے زمانہ میں معین الدین عمرانی، قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی دہلوی، مولانا خواجگی، شیخ احمد تھانیسری جیسے باکمال تھے، جن کے دامنِ تربیت میں شہاب الدین دولت آبادی جون پوری پرورش پا کر ملک العلما بن کر نکلے[1]۔

ہندوستان کے مغربی علاقوں میں علم اوپر کی سطروں میں زمانوں کی ترتیب اور علما کی وطنیت کی نسبت پر ایک نظر ڈال لینے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ پہلے اگر بلخ، بخارا، کاشان، قوشج (ترکستان) رے اور دمشق کے علما کے نام تھے، تو اب ملتان، بھکر، ہانسی، دلی، تھانیسر وغیرہ کے نام ساتھ ساتھ ملتے جاتے ہیں، ملتان تو اب بھی مشہور شہر ہے، بھکر سندھ میں ہے، ہانسی پنجاب کے موجودہ ضلع حصار میں اب ایک قصبہ ہے اور تھانیسر پانی پت کے پاس ہے۔

مورخ ضیا برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں سلطان علاء الدین خلجی (۶۹۶ھ-۷۱۶ھ) کے زمانہ کے علما کے حالات پر چند صفحے لکھے ہیں، وہ آج بھی پڑھنے کے لائق ہیں، "در تمامی عصر علائی در دارالملک دہلی علمائے بودند کہ آنچناں استاداں کہ ہر یکے علامۂ وقت ودر بخارا ودر سمرقند وبغداد ومصر وخوارزم و دمشق وتبریز وسفاہان ورے وروم ودر ربع مسکوں نہ باشد، ودر ہر علمے کہ فرض کنند از منقولات ومعقولات و تفسیر وفقہ واصولِ فقہ ومعقولات واصول دین ونحو ولفظ ولغت ومعانی وبدیع وبیان وکلام ومنطق موئے می شگافند وہر سالے چندیں طالبانِ علم ازاں استاداں برآمدہ بدرجۂ افادت می رسیدند، ومستحق جواب دادن فتوی

[1] مضمون "اسلامی نظام درس" مولانا سید عبدالحی مرحوم، الندوہ، فروری ۱۹۰۹ء۔

می شدند و بعضے ازاں استاداں در فنون علم و کمالاتِ علوم بدرجۂ غزالی و رازی رسیدہ بودند، چنانچہ قاضی فخر الدین ناقلہ و قاضی شرف الدین سرباہی و مولانا نصیر الدین غنی و مولانا تاج الدین مقدم و مولانا ظہیر الدین لنگ و قاضی مغیث الدین بیانہ و مولانا رکن الدین سنامی و مولانا تاج الدین کلاہی و مولانا ظہیر الدین بھکری و قاضی محی الدین کاشانی و مولانا کمال الدین کولی و مولانا وجیہ الدین پایلی و مولانا منہاج الدین قاضی و مولانا نظام الدین کلاہی و مولانا نصیر الدین کرہ و مولانا نصیر الدین صابونی و مولانا علاء الدین تاجر و مولانا کریم الدین جوہری و مولانا حجت ملتانی قدیم و مولانا حمید الدین مخلص و مولانا برہان الدین بھکری و مولانا افتخار الدین برنی و مولانا حسام الدین سرخ و مولانا وحید الدین ملہور و مولانا علاء الدین کرک و مولانا حسام الدین شادی و مولانا حمید الدین بنیانی و مولانا شہاب الدین ملتانی و مولانا فخر الدین ہانسوی و مولانا فخر الدین سقاقل و مولانا صلاح الدین سترکی و قاضی زین الدین ناقلہ و مولانا وجیہ الدین رازی و مولانا علاء الدین صدر الشریعہ و مولانا میرآن ماریکلہ و مولانا نجیب الدین ساری و مولانا شمس الدین قم و مولانا صدر الدین گندھک و مولانا علاء الدین لاہوری و مولانا شمس الدین یحیٰ و قاضی شمس الدین گازرونی و مولانا صدر الدین تادی و مولانا معین الدین لونی و مولانا افتخار الدین رازی و مولانا معز الدین اندیہنی و مولانا نجم الدین انتشار و چہل و شش استاد مذکور کہ من القابِ اسامی ایشاں نوشتہ ام آنانند کہ من در پیش بعضے تلمذ کردہ ام و بخدمت بعضے رسیدہ و بیشترے را در مسند اوقات و در محافل و مجالس دیدہ، و بسیاران از شاگرداں مولائی شرف الدین یونجی واستادانِ یکدگر کہ من القاب ایشان نیاوردہ ام، در عہد علائی بر صدر حیات بودہ اند و دایم سبق می گفتند در آخر عہد علائی مولانا علم الدین بنیسۂ شیخ بہاء الدین زکریا[1] کہ جہانِ علم و عالم دانش بود در دہلی، رسیدہ و اگر من خواہم کہ دریں تاریخ جملہ استادان و متعلمانے کہ در محل استاذی رسیدہ بودند ذکر کنم بہ تطویل انجامد و از غرض باز مانم و افسوس ہزار افسوس کہ قدر و قیمت بزرگی بہ فضل آں استادان سلطان علاء الدین نہ دانست کہ یک حق از صد حقوقِ ایشاں نہ گزاردہ و نہ معاصرانِ عہد دانستند کہ خاکِ قدم آنچناں استادان را در چشم جہاں بیں خود کشند و نہ من کہ مؤلف ام دراں ایام خبرے از جلال و کمال ایشاں ادراک کردم و امروز کہ قرنی بیشتر گزشتہ کہ آں عدیم المثالاں بہ جوار رحمت رب العالمین پیوستہ اند و بہ درگاہِ قرب حضرت بے نیازی ترقی کردہ بعد از ایشاں نہ ہمچو ایشاں و نہ ہزار دم بجز ذات ایشاں مرا نہ دیگرے را نظر آمدہ، بعضے کہ قدر و قیمت

---

[1] ملتانی۔

ایشاں دریافتہ ام کہ اگر درکمالاتِ علوم وتفنن ہر یکے مجلدے بہ نویسم مقصر باشم دوران ایام کہ استاداں کہ ہر یکے ابویوسف قاضی ومحمد شیبانی عہد وعصر خویش بودند برصدر حیات افادت می کردند اگر مفتی طمطراقِ استاذی برسر کردہ از خراسان و ماوراء النہر وخوارزم ویا از شہرے دیگر و در دہلی برسیدی وکمالاتِ علوم بزرگانِ مذکور را مشاہدہ کردی سبق درست گرفتے وبہ تلمذ پیش ایشاں بہ زانوے ادب درآمدی واگر درحیات آں استاداں تصنیفی جدید ہر علمے کہ فرض کنند از بخارا وسمرقند وخوارزم وعراق درشہر آوردندی کہ اگر استادانِ شہر ما آں تصنیف را استحسان واعتباری کردندی معتبر شدی والا مہجور ماندے، ومقصود از ذکر ایشاں درتاریخ علائی آں است کہ چہ عصرے وعہدے بود کہ دراں عہد وعصر چندیں متفنیانِ نفائس علوم برصدر حیات درافادتِ علوم مشغول باشد و چگونہ آں عصر مستثنائے عصر وآں شہر مستثنائے شہرہائے ربع مسکوں نہ باشد (فیروز شاہی برنی ص ۳۵۲،۳۵۵ کلکتہ)

علم کا قافلہ پورب کو ان بزرگوں کی نسبت وطنی پر غور کی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں ایک طرف اگر کاشان، قاین، رے، گازرون وغیرہ کے نام ور تھے تو ان کے پہلو بہ پہلو اب ملتان اور بھکر (سندھ) کے ساتھ لاہور، سنام (پٹیالہ) بیانہ (ریاست بھرت پور) ہانسی (پنجاب) دلی، اندریہ پت (دہلی کے پاس) کڑہ (الہ آباد کے پاس) کول (علی گڑھ) پائل[1] سترکھ (بارہ بنکی اودھ) کے مشاہیر بھی کھڑے نظر آتے ہیں، یعنی علم کا قدم اب پچھم سے بڑھ کر پورب کی طرف اٹھ رہا ہے، ان بزرگوں کی عظمت وجلالت یہ تھی کہ مورخ ان میں سے ایک ایک کو غزالی ورازی کا ہم سر بتاتا ہے، جن کی توثیق وسند سے بخارا وسمرقند وخوارزم اور عراق کے اماموں کی تصنیفیں اعتبار ومرتبہ پاتی تھیں۔

بدایوں غرض خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں جیسے جیسے اسلام کا قدم پورب کی سمت میں بڑھتا جاتا تھا، علم کی روشنی بھی آگے کو بڑھتی جارہی تھی، اسلام کے علم وفضل کا موکب جب دہلی سے آگے نکلا تو اس کی پہلی منزل بدایوں معلوم ہوتی ہے، حضرت سلطان الاولیا نظام الدین بدایونی دہلوی علیہ الرحمۃ وہ سیاحِ معرفت ہیں جنہوں نے بدایوں اور دلی کی منزلوں کو ملادیا، اس زمانہ میں اس سرزمین کے دوسرے نام ور مولانا علاء الدین اصولی بدایونی (استاذ نظام الاولیا) قاضی جمال بدایونی ملتانی، رکن الدین بدایونی، خواجہ بخشی بدایونی وغیرہ ہیں، خواجہ بخشی بدایونی وہ ہیں جنہوں نے طوطی نامہ لکھ کر کاغذ کے طوطی اڑائے ہیں، تصوف میں ان کی دو کتابیں ''سلک السلوک'' اور ''کلیات وجزئیات'' ہمارے کتب خانہ میں ہیں۔

---

[1] پائل ریاست پٹیالہ (پنجاب) میں ہے، بارہ بنکی میں غلط لکھ گیا ہے۔

کٹرہ بدایوں کے بعد گنگا کے دہانہ پر کٹرہ اب بھی ایک قصبہ ہے، مگر اس زمانہ میں وہ سلطنت کے مشرقی حصہ کا ایک مرکزی شہر تھا، سلطان فیروز شاہ خلجی کے قتل اور سلطان علاء الدین خلجی کی تخت نشینی کا وہ سانحہ جس پر تاریخ اب بھی انگشت بہ دنداں ہے، اسی شہر میں دریا کنارے گزرا تھا، عہد علائی میں مولانا نصیر الدین کڑہ کا نام پڑھ چکے اور ان کے بعد مولانا مطہر کڑہ کا نام آتا ہے، جن کے فارسی دیوان کے دو نسخے ابھی لکھنؤ اور علی گڑھ کو ہاتھ آئے ہیں، یہ حضرت نصیر الدین اودھی چراغ دہلی ﷫ کے مرید تھے۔[1]

اودھ بدایوں اور کڑہ سے ملا ہوا وہ صوبہ جس کو اودھ کہتے ہیں، یہ اصل میں اس شہر کا نام تھا، جس کو رام اور لچھمن کے مولد بننے کا فخر حاصل ہے، جو اب بھی فیض آباد کے پاس اجودھیا کے نام سے مشہور ہے، مسلمانوں نے اس کو اپنے تلفظ میں اودھ کیا اور ایک پورے صوبہ کا نام رکھا۔

دلی جس زمانہ میں حضرت نظام الدین سلطان الاولیا﷫ کے نور سے جگمگا رہی تھی، اس کی کرنیں چھن چھن کر اودھ کے خطہ کو روشن کر رہی تھیں، اس مطلعِ خورشید سے جو سب سے پہلا آفتاب طلوع ہوا، اس کا نام شمس الدین یحیٰ الاودی ہے، یہ اودھ کے تھے، اسی لیے اودھی کہلاتے ہیں، اسی زمانہ میں اسی تیرہ و تار دیار میں ایک ایسا چراغ بھی جلا جس سے خود دلی روشن ہوئی، اس کا نام شیخ نصیر الدین محمود اودھی چراغ دہلی ہے۔

ان سے پہلے مولانا فرید الدین کا نام آتا ہے، جو مذہب کے شافعی اور اودھ کے شیخ الاسلام تھے، مولانا فرید الدین اودھی اور ظہیر الدین بھکری کے شاگرد شمس الدین یحیٰ اودھی ہیں اور شمس الدین اودھی کے شاگرد شیخ نصیر الدین اودھی چراغ دہلی ﷫ ہیں، اس چراغ سے اور بہت سے چراغ جلے، جن سے اودھ کا خطہ چشمۂ نور بنا۔

سید محمد کرمانی سیر الاولیا میں جو حضرت نظام الدین اولیا﷫ کے حال میں سب سے پہلی اور پرانی تالیف ہے لکھتے ہیں ''مولانا علاء الدین نیلی کہ خلیفۂ سلطان المشائخ بود...... در کشفِ غوامضِ کشاف و مفتاح مثل نہ داشت و در مجلس مولانا فرید الدین شافعی کہ شیخ الاسلام اودھ بود قاری کشاف خدمت مولانا علاء الدین (نیلی اودھی) بود و خدمت مولانا شمس الدین یحیٰ و علمائے اودھ سامع بودند'' (صفحہ ۲۷۵)

---

[1] اخبار الاخبار، ص ۷۸۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نظام الدین سلطان الاولیا کے عہد میں شیخ الاسلام اودھ کی درس گاہ میں اودھ کے علما کا ایک انبوہ درس وتدریس میں مصروف تھا جن میں سے تین نے خاص امتیاز پایا۔

۱- شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی المتوفی ۷۴۷ھ

۲- نصیرالدین محمود چراغ دہلی اودھی المتوفی ۷۵۷ھ

۳- شیخ علاء الدین نیلی اودھی المتوفی ۷۶۲ھ

اہل تذکرہ نے ان بزرگوں کو اودھ کی خاک سے نسبت دی ہے، مگر یہ نہیں معلوم کہ اودھ کی کس خاص سرزمین کو ان کی پیدائش گاہ بننے کا فخر حاصل ہے، حضرت سلطان المشائخ کے خلفا میں اودھ کے قصبہ گوپامئو (ہردوئی) کے رہنے والے ایک بزرگ شیخ مبارک تھے اودھ کے علما جب دلی سے اپنے وطن کو جانے لگتے تو حضرت سلطان المشائخ کا حکم ہوتا کہ راستہ میں ان سے ملتے جائیں، سیر الاولیا کی عبارت یہ ہے ''یارانِ اودھ چنانکہ مولانا شمس الدین یحییٰ وشیخ نصیرالدین محمود ومولانا علاء الدین نیلی و عزیزانِ دیگر چوں از خدمتِ سلطان المشائخ باز می گشتند فرمان می شد چوں در گوپامئو برسید خواجہ مبارک را بہ بینید'' (ص ۳۱۰) اس سے معلوم ہوا کہ یہ بزرگ وار گوپامئو (ہردوئی) ادھر ہی کے کسی مقام کے رہنے والے تھے، اودھ سے اصل مقصود تو اجودھیا ہے، اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ اس زمانہ میں بڑا شہر تھا، ایک خان اس کا حاکم (مقطع) تھا (۱۹۰) وہاں بعض بزرگوں کے مقبرے بھی ہیں جن میں سے ایک شیخ جمال گوجری المتوفی ۸۵۸ھ ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اجودھیا کے آس پاس اسلامی آبادیاں تھیں، ان میں سے ایک مشہور آبادی کا نام کچھوچھہ ہے جس کو حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی المتوفی ۸۰۸ھ کی خواب گاہ بننے کی عزت حاصل ہے۔

قنوج اور کڑہ دلی اور ممالک پورب کے درمیان دریائے گنگا حائل تھا، اس کی ایک سرحد قنوج (فرخ آباد) اور دوسری کڑہ (الہ آباد) تھی، ممالک پورب کے دونوں بازوؤں پر یہ دو شہر آباد تھے، ان دونوں کو عبور کرنے سے پورب کی سرحد شروع ہو جاتی تھی، قنوج سے لکھنؤ کی سمت سے گورکھپور اور ترہٹ اور پورنیہ ہو کر بنگال اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ کڑہ سے پار ہو کر جون پور کی طرف سے پٹنہ سے آگے بڑھ کر بنگال، یہی دونوں راستے آج بھی ہیں، ایک پر، ای، آئی، ریلوے ہے اور دوسری پر بی این ڈبلو۔[1]

[1] خلجی اور تغلق بادشاہوں کے سفر بنگالہ (لکھنوتی) کی منزلیں تاریخوں میں پڑھیے۔

ظفرآباد اور جون پور | سلطان غیاث الدین تغلق کے نئے دور سے ہندوستان کے مغربی اور مشرقی حصوں میں اتصال بڑھتا گیا، سلطان خود بنگال تک گیا اور آیا، اس کے چند بیٹوں میں سے ایک کا نام ظفرخاں اور دوسرے کا فخر الدین جونا تھا پہلے کے نام پر غیاث الدین نے ظفرآباد اور دوسرے کے نام پر بعد کو فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ-۷۹۰ھ) نے جون پور آباد کیا[1]، یہ آبادی ۷۶۱ھ سے پہلے ہو چکی تھی[2] کیوں کہ اس سال سلطان فیروز شاہ نے بنگال سے لوٹ کر جون پور میں قیام کیا تھا[3]۔

غرض آٹھویں صدی کے وسط سے پورب میں اودھ سے آگے بڑھ کر جون پور و ظفرآباد کے حلقہ میں اسلامی نوآبادیوں نے وسعت پائی، ۷۹۶ھ میں خواجہ جہاں[4] نے دہلی سے سلطان الشرق کا خطاب پا کر جون پور کو اپنا مرکز بنایا، اس سلطان الشرق کی ولایت کی حدیں کہاں سے کہاں تک تھیں، اس کا پتہ مبارک شاہی کے ان لفظوں سے ملے گا "درعرصۂ جون پوررفت بہ آہستگی اقطاعِ قنوج وکڑہ (الٰہ آباد) اودھ و سندیہ (سندیلہ؟) ودل مئو وبہرائچ و بہار وترہٹ را در قبض وتصرف خود آورد" (ص ۱۵۷، کلکتہ) اس سے معلوم ہوا قنوج، بہرائچ اور الٰہ آباد سے لے کر بہار اور ترہٹ (مظفر پور اور دربھنگہ وغیرہ) تک اس ملک پورب کی وسعت تھی، آٹھویں صدی کے پوربی بزرگوں میں حسب ذیل نام تذکروں میں ملتے ہیں، بدر الدین اودھی، تاج الدین کڑہ، جلال الدین اودھی، شیخ دانیال سترکھ (بارہ بنکی) رکن الدین کڑہ، رُکن الدین ظفرآبادی (جون پور) رکن الدین بہاری، مخدوم شرف الدین بہاری، زین الدین دیوہ (بارہ بنکی) قاضی سماء الدین بجنور (لکھنؤ) صلاح الدین سترکھ (بارہ بنکی) علاء الدین اودھی، علاء الدین سندیلوی، قاضی فخر الدین سترکھ، شیخ مبارک گوپامئو (اودھ) شیخ محمد معروف امیٹھی (اودھ) منہاج الدین بہاری وغیرہ[5]۔

ملک پورب (مشرق) | خواجہ جہاں نے ۸۰۲ھ میں انتقال کیا اور اس کے بیٹے مبارک شاہ شرقی نے اُس کی جگہ خود مختارانہ جلوس کیا، یعنی نویں صدی ہجری کے آغاز سے پورب کی آزاد و خود مختار سلطنت کی بنیاد پڑی، مبارک شاہ ۸۰۴ھ میں مرگیا، اور اب اس کی جگہ پر ابراہیم شاہ شرقی بیٹھا جو اس خاندان کا سب سے بڑا نام ور فرماں روا گزرا ہے، اس نے جون پور میں چالیس برس حکومت کر کے ۸۴۴ھ میں وفات پائی اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں لاہور، ملتان اور دلی سے علم کا مرکز منتقل ہو کر پورب کے اطراف

---

[1] آئینِ اکبری، جلد ۲، ص ۹۷، نول کشور [2] مبارک شاہی، ص ۱۲۸، کلکتہ [3] فرشتہ میں ۷۷۶ ہجری ہے۔ [4] [5] یہ نام نزہۃ الخواطر مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم جزء مایۃ ثامنہ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد سے چنے گئے ہیں۔

میں آیا، گویا اس حکومت نے اس کے بعد صرف چالیس برس کی اور زندگی پائی یعنی ۸۸۳ھ میں بہلول لودی کے ہاتھ سے یہ مٹ گئی اور یہ زمانہ بھی شرقی بادشاہوں کی جنگ جوئی اور دلی کے لودھی بادشاہوں کے دست برد سے امن اور چین سے نہیں گزرا، تاہم علم وفن کی جو شمعیں روشن تھیں وہ سیاسی حوادث کی ان آندھیوں سے نہ بجھیں، بلکہ ان کی روشنی روز بہ روز اور تیز ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ تیموریوں کے عہد میں یہ خطہ اور سراپا نور بن گیا، شاہ جہاں فخر یہ کہا کرتا تھا کہ "پورب شیراز ماست" علامہ آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان میں لکھا ہے کہ پورب کی وسعت میں تین صوبے تھے، صوبہ الہ آباد، صوبہ اودھ اور صوبہ عظیم آباد۔

مغلوں سے پہلے اودھ اور جون پور ایک ساتھ بولے جاتے تھے اور قنوج سے لے کر بہار کی سرحد تک ایک صوبہ کی حیثیت سے ایک حاکم کے ماتحت تھا جس میں اودھ اور جون پور دونوں شامل تھے اور دوسرا صوبہ کڑا یعنی الہ آباد کا تھا، جس میں گنگا کے اس پار کا علاقہ موجودہ کان پور سے لے کر کڑہ، مانک پور، فتح پور، موجودہ رائے بریلی، سلون وغیرہ سے گزرتا ہوا غازی پور تک چلا جاتا تھا، صوبہ عظیم آباد موجودہ بہار کا صوبہ ہے۔

صوبہ الہ آباد واودھ یہاں ہم کو صرف صوبہ الہ آباد اور صوبۂ اودھ سے غرض ہے، متنبّی کا مشہور مصرع ہے۔ مصائب قوم عند قوم فوائد یعنی ایک کی مصیبت دوسرے کی مسرت کا ذریعہ ہوتی ہے، جس زمانہ میں خراسان وایران تاتاریوں کے حملہ سے زیروزبر ہو رہے تھے، ہندوستان میں خلجیوں کا زمانہ تھا اور امن کا دور دورہ، ساتویں صدی کے آخری سال گزر رہے تھے، دو بزرگ ایک صفی الدین جو حضرت امام ابوحنیفہ ؒ کی اولاد سے تھے اور دوسرے شمس الدین زاولی اپنے اہل وعیال کے ساتھ ہندوستان آئے اور دلی میں سکونت اختیار کی[1] صفی الدین کے پوتے نظام الدین اور شمس الدین کے بیٹے شہاب الدین نے علمائے دہلی کے سامنے زانوے ادب تہ کیے اور نام ور ہو کر دلی میں ہنگامۂ درس بلند کیا اور شہاب الدین ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نام سے سربلند ہوئے۔

جون پور دلی بگڑ کر پورب کئی دفعہ آباد ہوا ہے، دو آبادیاں تو آنکھوں کے سامنے ہیں، دلی پر جب نادر شاہ درّانی، احمد شاہ ابدالی، مرہٹوں اور جاٹوں کی چڑھائی ہوئی تو کتنے باکمال لکھنو اور عظیم آباد کو چلے آئے، پھر ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب انگریزوں نے دلی کو تباہ کیا تو پھر دلی بگڑ کر پورب آباد ہوا، اسی

---

[1] تاریخ علمائے ہند، ص ۶، ۹، ۱۲۔

طرح اس سے پہلے نویں صدی ہجری کے شروع میں جب تیمور نے پنجاب اور دلی کو غارت کیا تو اربابِ فضل وکمال نے پورب کا رُخ کیا، اُس وقت خوش قسمتی سے پورب میں ایک خود مختار مشرقی حکومت کی بنیاد پڑ رہی تھی، شیخ نظام الدین اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے پورب کی سمت حرکت کی اور جون پور آ کر رختِ اقامت ڈالا، بادشاہ وقت نے بیش از بیش قدر دانی کی۔

قاضی شہاب الدین نے شیخ نظام الدین کو اپنی دامادی میں قبول کیا، ان کے تین لڑکے ہوئے، صفی الدین، فخر الدین اور رضی الدین تینوں نے اپنے نانا کے درس وکمال سے فیض پایا، شیخ صفی الدین نے درس وافادہ کا بازار گرم کیا، عربی صرف ونحو کی مشہور ابتدائی فارسی کتاب دستور المبتدی ان ہی کی تصنیف ہے، شیخ صفی الدین اسی زمانہ میں رودولی جا کر سید اشرف جہاں گیر سمنانی کچھوچھوی سے جوان دنوں وہاں مقیم تھے، مرید ہوئے، شیخ رضی الدین رودولی کے قاضی مقرر ہوئے، ان بھائیوں کی اولادوں نے ردولی ہی میں سکونت اختیار کی، جن کے سلسلہ میں اب تک نعمانی شیوخ کی آبادی اس قصبہ میں قائم ہے، شیخ صفی الدین نے ۸۱۹ھ میں وفات پائی، شیخ صفی کے ایک بیٹے ابوالمکارم اسماعیل المتوفی ۸۶۰ھ تھے، یہ وہی ہیں جن کے لیے صفی نے دستور المبتدی لکھی اور انہی کے بیٹے مشہور بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے جون پور کو اپنے فیوض و برکات کا مرکز بنایا اور یہیں ۸۴۹ھ میں وفات پا کر سلطان ابراہیم شرقی کی جامع مسجد کے پاس جس کا نام مسجد اٹالہ ہے، دفن ہوئے۔

یہ پورب کی سرزمین میں علم کی پہلی کاشت تھی، قاضی شہاب الدین دولت آبادی یہ پودا دلی سے لائے تھے، دلی میں انہوں نے مولانا خواجگی اور قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی سے جن کا عربی قصیدہ لامیہ مشہور روزگار ہے، تحصیل علم کی جون پور کی مسند پر جب آ کر وہ بیٹھے تو ان کے فیض کمال سے مشرق کی ساری سرزمین لہلہا اُٹھی، کڑہ سے لے کر غازی پور تک یک ساں فیض جاری ہوا۔

اودھ | صوبہ اودھ کا پرانا مرکز تو اجودھیا تھا، اجودھیا کے پاس ہی ایک گاؤں تھا جو بعد کو فیض آباد مشہور ہوا، حضرت شاہ ابوالعباس المتوفی ۷۰۳ھ اور شیخ بہاء الدین اکبر المتوفی ۷۸۸ھ اور شیخ سراج الدین چشتی المتوفی ۸۹۹ھ وغیرہ بہت سے بزرگ یہاں آرام کر رہے ہیں، اودھ کی نوابی کے زمانہ میں نواب شجاع الدولہ نے اس کو اس صوبہ کا دارالسلطنت بنایا، ۱۱۹۴ھ میں نواب آصف الدولہ المتوفی ۱۲۱۲ھ کے عہد میں سلطنت کا مرکز فیض آباد سے لکھنؤ کو منتقل ہوا، مگر لکھنؤ کی علمی مرکزیت اس سے صدیوں پہلے قائم ہو چکی تھی۔

لکھنؤ | لکھنؤ پہلے گومتی کے کنارے ایک گاؤں تھا، چوں کہ قنوج اور جون پور کے بیچ میں وہ ایک منزل تھی، اس لیے رفتہ رفتہ اس کی آبادی بڑھنے لگی، تاریخوں میں سب سے پہلے اس کا نام میری تلاش میں تیمور کے حملہ کے بعد ۸۰۳ھ میں ملتا ہے، تیمور کی واپسی کے بعد جب ملک میں طوائف الملوکی کا دور ہوا اور ظفر خاں نے گجرات میں خواجہ جہاں کے بیٹے مبارک شاہ نے قنوج واودھ وکڑہ اور جون پور میں اور خضر خاں نے لاہور ودیپال پور وملتان میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کیں تو ملو اقبال خاں نے دوآبہ میں اپنی ریاست جمانی چاہی، مبارک شاہ نے پورب میں اس کے پاؤں جمنے نہ دیے، اس سلسلہ میں لکھنؤ کا نام پہلی دفعہ سننے میں آتا ہے، فرشتہ میں ہے "ملو اقبال خان بہ قنوج رفتہ خواست کہ بہ جونپور و لکھنؤ درآید" (ص ۱۵۹ نول کشور) اس سے معلوم ہوا کہ جون پور کے بعد لکھنؤ کی مرکزیت اس زمانہ میں توجہ کے قابل ہو چکی تھی، اسلام کی بہت سی آبادیاں ان نفوس قدسیہ کی یادگار ہیں جو آبادیوں سے نفور ویرانوں اور سنسان میدانوں کی تلاش میں رہتے تھے، لکھنؤ کی ابتدائی اسلامی آبادی کا سُراغ بھی اسی اثر کا پتہ دیتا ہے۔

مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری جو سلاطینِ تغلق کے زمانہ میں تھے، اور جنھوں نے ۷۸۵ھ میں وفات پائی ہے ان کے مرید وخلیفہ شیخ قوام الدین تھے، محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ "مقبرۂ او در لکھنؤ است یزار و متبرک بہ"[1] ۸۴۰ھ میں وفات پائی، ان کے مرید وخلیفہ شیخ سارنگ تھے، جنھوں نے ۸۴۷ھ میں رحلت کی، ان دونوں بزرگوں کا فیض مخدوم شیخ میناؒ ہیں جن کا مزار لکھنؤ میں (موجودہ میڈیکل کالج کے پاس) ہے، مخدوم شیخ میناؒ نے ۸۸۴ھ میں انتقال فرمایا۔

ایک پتہ اس سے پہلے کا بھی چلتا ہے، کہتے ہیں کہ سمرقند کے کوئی بزرگ ہندوستان آکر گومتی کے کنارے لکھنؤ آکر بسے تھے، تاتاریوں کے فتنہ کے زمانہ میں (ساتویں صدی) شیخ ضیاء الدین کرمانی کرمان سے ہندوستان آئے اور شیخ موصوف سے ملنے کے لیے وہ لکھنؤ وارد ہوئے اور یہیں کے ہو رہے ان کے پرپوتے شیخ اعظم لکھنوی ہیں جو بڑے عالم ہوئے ہیں، ان کی اولاد اب تک لکھنؤ، دیوہ اور اناؤ میں آباد ہے،[2] شیخ اعظم پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے لکھنؤ کو علم وفضل کا مرکز بنایا وہ اس تحفہ کو جون پور سے لائے۔

تیموری حملہ کے زمانہ میں جو لوگ دلی سے جون پور گئے تھے، ان میں سے قاضی عبد المقتدر دہلوی کے پوتے شیخ ابوالفتح بھی تھے جو اپنے دادا ہی کی طرح مشہور فقیہ وشاعر ومدرس تھے اور قاضی

---

[1] تاریخ علمائے ہند، ص ۱۴۶ [2] ایضاً، ص ۲۳۔

شہاب الدین کے معاصر وہم استاد تھے، ۸۵۸ھ میں وفات پائی[1]، ان کے دامن تربیت میں شیخ اعظم پل کر جوان ہوئے اور لکھنؤ میں جا کر مسند درس بچھائی[2]، شیخ اعظم کے تلامذہ شیخ ضیا لکھنوی اور شیخ سعدالدین خیرآبادی المتوفی ۸۸۲ھ ہیں، شیخ کا مزار خیرآباد میں اب بھی مرجع خلایق ہے۔

لکھنؤ کے مرکز کا ایک اور تیسرا خاندان شیخ سماء الدین لکھنوی کا ہے، ان کے صاحب زادہ شیخ الاسلام سعداللہ فراز کندوری ہیں، ۸۲۹ھ میں وفات پائی، ان کے جانشین اور صاحب زدائے شیخ امین الدین لکھنوی ہیں، اس گھر میں ظاہر و باطن دونوں کے فضل وکمال کی شمعیں روشن تھیں، ہمارے کتب خانہ میں شیخ امین کے مکتوبات اوران کے رسالہ موعظۃ المسترشدین کے نہایت پرانے نسخے ہیں، ان کے دوسرے فرزند شیخ سعدالدین لکھنوی ہیں جنہوں نے ۸۸۱ھ میں وفات پائی، تاریخ علمائے ہند کا بیان ہے "مدام بہ درس وافادۂ علوم دینیہ اشتغال داشت ودر مدرسۂ وے طلبۂ مستعد رجوع می کردند"[3]، شیخ امین الدین کے صاحب زادہ شیخ حامد تھے، جن کے نام مکتوبات میں متعدد خط ہیں، اس نسخہ کے آخر میں اس خاندان کے ایک یادگار نے اپنا حسب ذیل نام ونسب لکھا ہے، شیخ الاسلام شیخ پیارہ بن شیخ حامد بن شیخ امین الدین بن شیخ الاسلام شیخ سعداللہ بن زائر الحرمین الشریفین، شیخ سماء الدین بن بندگی، حضرت مخدوم قاضی فخرالدین بملوی؟۔

لکھنؤ کے پاس کسمنڈی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، یہاں ایک بزرگ شیخ عبدالقادر بن شیخ سلطان جومولانا قطب الدین محدث بن مولانا خضر محدث کی اولاد سے تھے، پیدا ہوئے، انہوں نے لاہور جا کر علم کا فیض حاصل کیا اور لکھنؤ آ کر درس وافادہ کی نہر بہائی، جو چالیس برس تک جاری رہی، لکھنؤ کے اطراف میں ان کے ذریعہ بڑا علم پھیلا، ان کا زمانہ گیارہویں صدی ہجری کا وسط ہے، ان کے شاگردوں میں سب سے مشہور نام شاہ پیر محمد صاحب ﷫ کا ہے، جن کی نسبت سے لکھنؤ میں اب تک گومتی کے کنارے شاہ پیر محمد صاحب کا ٹیلہ اور مسجد مشہور ہے، ۱۰۸۰ء میں وفات پائی، ان کا اصل وطن جون پور کے ضلع کا مشہور قصبہ منڈیاہو ہے، مگر عمر لکھنؤ میں گزری اور یہیں دفن ہوئے، شاہ پیر محمد صاحب کے شاگرد وخلیفہ شیخ محمد آفاق لکھنوی، محمد رضا لکھنوی اور میر محمد شفیع دہلوی ہیں، شیخ محمد آفاق لکھنوی دراصل پٹنہ کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے[4]، تقدیر لکھنؤ لے آئی اور اپنے پیر کے پائینتی آسودہ ہیں۔

---

[1] اخبار الاخیار، ص ۱۶۴ [2] تاریخ علمائے ہند، ص ۲۳ [3] ایضاً، ص ۷۵ [4] ایضاً، ص ۱۸۲۔

موجودہ اعظم گڑھ اور غازی پور کے بیچ میں ایک مشہور قصبہ گھوسی ہے جو اس وقت اعظم گڑھ[1] کے ضلع میں ہے، یہاں کی خاک سے ایک نامور شیخ عطاء اللہ گھوسی اٹھے، ان کے صاحب زادہ شیخ غلام نقشبند گھوسی ہوئے، میر محمد شفیع بھی عطاء اللہ کے شاگرد تھے، شیخ غلام نقشبند نے پہلے اپنے والد سے پھر میر شفیع سے اور آخر میں سند فراغ شاہ پیر محمد صاحب سے حاصل کی اور شیخ غلام نقشبند لکھنوی کے نام سے مشہور روزگار ہوئے اور یہ رتبہ پایا کہ بڑے بڑے جلیل القدر علما ان کی شاگردی پر نازاں ہوئے، شاہ عالم بہادر شاہ ان کی ملاقات کا مشتاق ہوا، ۱۱۲۶ھ میں وفات پائی اور لکھنؤ کی خاک میں ہمیشہ کے لیے آرام کیا[2]۔

فرنگی محل اب آخر میں اس مقدس خانوادہ کا ذکر ہے جو لکھنؤ کے افق پر ایسا چمکا جس کے آگے سارے ستارے ماند پڑ گئے اور نظر آنے لگا کہ لکھنؤ کے علمی مطلع پر ان کے سوا کوئی ستارہ کبھی چمکا ہی نہ تھا، یہ خاندان اصل میں سہالی میں آباد تھا، یہ انصار کرام کا خاندان تھا، جس کا ایک حصہ پانی پت میں رہ گیا تھا، جس میں مولانا حالی اور دیگر نامور پیدا ہوئے، دوسرا حصہ اودھ آکر سہالی میں آباد ہوا، ملا قطب الدین شہید سہالوی اس خاندان کے پہلے نامور ہیں، اس خاندان کا علمی سلسلہ بہت دور سے چلتا ہے۔

میر فتح اللہ شیرازی میر فتح اللہ شیرازی اکبر کے زمانہ میں معقولات کا دفتر لے کر ہندوستان وارد ہوئے اور ۹۹۰ھ میں اکبر شاہ تک پہنچے، اکبر نے بڑی قدر کی ۹۹۷ھ میں یہ پھول کشمیر میں ہمیشہ کے لیے مرجھا گیا اور وہیں خاک میں مل گیا، ہندوستان میں متاخرین علمائے ایران کی معقولی کتابوں کا رواج میر مذکور ہی کے ذریعہ پھیلا، میر آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں لکھتے ہیں "تصانیف علمائے متاخرین ولایت مثل محقق دوانی و میر صدر الدین و میر غیاث الدین منصور و میرزا جان میر بہ ہندوستان آورد، و در حلقۂ درس انداخت وجم غفیر از حاشیہ محفل میر استفادہ کردند، واز ان عہد معقولات را رواجِ دیگر پیدا شد" (صفحہ ۲/ ۲۳۸)

ملا عبدالسلام لاہوری میر فتح اللہ شیرازی کے دامن تربیت میں جن باکمالوں نے پرورش پائی ان میں ایک ملا عبدالسلام لاہوری ہیں، ساٹھ برس تک درس و تدریس کا ہنگامہ گرم رکھا، ۱۰۳۷ھ میں نوے سال کی عمر میں وفات[3] پائی۔

ملا عبدالسلام دیوہ اودھ میں (موجودہ بارہ بنکی کے ضلع میں) دیوہ ایک مشہور قصبہ ہے، اس سرزمین نے ملا عبدالسلام لاہوری کے ہم نام ملا عبدالسلام دیوہ کو پیدا کیا، ملا صاحب پورب میں ایک حد تک پڑھ

---

[1] مگر اب ضلع مئو میں شامل ہے۔ [2] مآثر الکرام، ص ۲۱۶ [3] ایضاً، ص ۲/ ۲۳۶۔

پڑھا کر لاہور گئے اور ملا عبدالسلام لاہوری کے درس میں بیٹھے اور نام ور بن کر اٹھے، گو شاہ جہاں نے فوج میں محکمۂ افتا کا منصب ان کو دیا تھا، مگر لاہور کی آب و ہوا ان کو آخر پھر وہیں کھینچ لے گئی اور وہاں جم کر ایسے بیٹھے کہ پھر نہ اٹھے، یہی وہ بزرگ ہیں جن کے ذریعہ معقولات کا رواج ہندوستان کے مشرق و مغرب میں شروع ہوا۔

ملا دانیال چوراسی ملا سے دیوہ کے کئی شاگرد مشہور ہوئے، پچھم میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور پورب میں ملا دانیال چوراسی (الہ آباد) شیخ محب اللہ الہ آبادی اور شیخ آصف الہ آبادی، ملا دانیال چوراسی کے شاگرد، ملا قطب الدین سہالوی تھے۔

شیخ محب اللہ الہ آبادی خیر آباد کے مشہور قصبہ کے پاس صدر پور ایک مقام ہے، وہاں ایک فاروقی خاندان آباد تھا، اس خاندان میں ایک بزرگ شیخ محبّ اللہ پیدا ہوئے، جنہوں نے لاہور جا کر ملا عبدالسلام دیوی سے کسبِ کمال کیا اور واپس آ کر الہ آباد کو اپنے فیضِ تربیت کا مرکز بنایا، ان کو ہندوستان کا محی الدین ابن عربی کہا جائے تو بجا ہے، اسی لیے ابن عربی کو اگر شیخ اکبر کہا جاتا ہے تو ان کو شیخ کبیر، اسی خاندان کے آخری یادگار مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی تھے۔

قاضی گھاسی شیخ محبّ اللہ الہ آبادی کے شاگردوں میں کئی اصحاب باکمال ہوئے جن میں سے قاضی گھاسی الہ آبادی، میر سید کبیر قنوجی اور میر سید محمدی فیاض امروہوی کے نام[1] معلوم ہیں، شیخ نے ۱۰۵۸ھ میں وفات پائی۔

قاضی گھاسی الہ آبادی کے زمرۂ تلامذہ میں ملا قطب الدین سہالوی بھی داخل ہیں، ملا صاحب نے قاضی صاحب کے ہاتھ پر بیعت بھی کی، اس سلسلہ سے ملا قطب الدین فرنگی محل لکھنؤ اور دائرۂ شاہ محبّ اللہ الہ آباد کے سنگم یا مجمع البحرین ہیں۔

شیخ آصف الہ آبادی قاضی محمد آصف الہ آبادی ملا عبدالسلام دیوہ کے ممتاز شاگرد، اصل میں خیر آباد کے پاس کے گاؤں صدر پور کے رہنے والے تھے اور الہ آباد میں قاضی تھے، ان کے شاگرد شیخ محمد افضل الہ آبادی ہوئے۔

شیخ محمد افضل الہ آبادی غازی پور کے ضلع میں سید پور شرفا کا مشہور قصبہ ہے، اس قصبہ میں وہ نام ور بزرگ پیدا ہوئے جن کو دنیا شیخ محمد افضل الہ آبادی کے نام سے جانتی ہے، الہ آباد کے بارہ دائروں میں ایک

[1] تاریخ علما ہند، ص ۱۷۵۔

دائرہ اسی نقطۂ فضیلت کی کشش سے پیدا ہوا ہے، انہوں نے قاضی آصف الہ آبادی اور ملا نورالدین جون پوری سے فیض پایا، شیخ کو اپنے زمانہ میں قبول خاص و عام حاصل ہوا، ۱۱۲۴ھ میں وفات پائی، مزار الہ آباد میں ہے۔

شیخ افضل کے تلامذہ میں ایک ان کے صاحب زادہ شیخ محمد یحیٰ خوب اللہ المتوفی ۱۱۴۴ھ ہیں اور شاہ خوب اللہ کے جانشین شاہ محمد فاخر الہ آبادی المتوفی ۱۱۶۴ھ اور شیخ محمد ناصر ہیں، اس سلسلۂ فیض نے پورب کے اضلاع کو سرسبز و شاداب کیا، اور ظاہر و باطن کے برکات[1] سے بھر دیا۔

ملا قطب الدین سہالوی | ملا قطب الدین سہالوی نے جیسا کہ اوپر گذرا، شیخ دانیال چوراسی اور قاضی گھاسی الہ آبادی سے کسب فیض کیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ شہر تو شہر، ہمارے قصبات تک دار العلم تھے، ملا قطب الدین سہالوی نے سہالی میں اپنی درس گاہ ترتیب دی، اور جوق در جوق طلبہ دیار و اطراف سے آنے لگے، یہاں تک کہ زمین داری کے ایک جھگڑے میں سہالی کے عثمانی شیوخ اور بینتی پور کے خان زادوں کے ہاتھوں سے شہادت پائی، اُن کے مشہور تلامذہ ملا قطب الدین شمس آبادی، حافظ امان اللہ بنارسی، قاضی شہاب الدین گوپاموی، حاجی صبغۃ اللہ[2] خیرآبادی محدث اور مولوی اسماعیل اورنگ آبادی وغیرہ ہیں۔

ملا قطب الدین شمس آبادی | ملا صاحب کے مطلع درس سے جو پہلا آفتاب چمکا وہ سید قطب الدین شمس آبادی ہیں، سید موصوف اصل میں امیٹھی کے رہنے والے تھے جو اودھ کا مشہور قصبہ ہے، تعلیم سے فراغت کے بعد اس قطب نے امیٹھی کے بہ جائے شمس آباد کو اپنا مرکز بنایا، یہ شمس آباد ضلع فرخ آباد میں قنوج کے پاس ہے، آزاد لکھتے ہیں ”در شمس آباد مسند افادہ گستر و جم غفیر را بہ اضافہ دانش و بینش مرتبۂ کمال و تکمیل کرامت نمود، (مآثر الکرام صفحہ ۲۱۰) شمس آباد کا یہ آفتاب ۱۱۲۱ھ میں غروب ہو گیا۔

ملا محب اللہ بہاری | اس ”جم غفیر“ میں جو ملا شمس آبادی کی دانش گاہ سے مرتبۂ کمال کو پہنچے ایک نام ور ٹھیٹھ پورب سے آ کر شامل ہوئے، یعنی بہار کے ایک گاؤں کڑا محبّ علی پور سے، دنیا ان کو قاضی محبّ اللہ بہاری مصنفِ سلّم و مسلّم کے نام سے پہچانتی ہے، تکمیل کے بعد یہ لکھنؤ کے قاضی مقرر ہوئے، یہ عالم گیر کا زمانہ تھا، محمد معظم شاہ عالم اول کے زمانہ میں ہندوستان کے صدر جہاں مقرر ہوئے، ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی اور شیخ فریدالدین طویلہ بخش کے مزار کے احاطہ میں بہار کے محلّہ چاند پورہ میں دفن ہوئے، بعض

---

[1] میر آزاد نے مآثر الکرام جلد اول میں زائر کے حال میں اس خاندان کا تذکرہ کیا ہے۔ [2] میر آزاد نے مآثر الکرام میں ان کو قطب الدین شمس آبادی کا شاگرد لکھا ہے، عرب جا کر شیخ طاہر فتنی اور ابراہیم کردی محدثین مکہ معظمہ سے حدیث پڑھی۔

صاحبوں نے ملا محب اللہ بہاری کو خود ملا قطب الدین سہالوی کا شاگرد بتایا ہے[1]۔

حافظ امان اللہ بنارسی | قاضی محب اللہ بہاری کے ایک اور معاصر امامِ وقت تھے، ان کا نام حافظ امان اللہ ابن نور اللہ بن حسین ہے، بنارس وطن تھا، ملا قطب الدین سہالوی اور دوسرے مشاہیر زمانہ سے درس لے کر فارغ ہوئے، تو عالمگیر نے ان کو لکھنؤ میں مفتی کا منصب دیا، حافظ صاحب کا یہ مرتبہ تھا کہ ملا محمود جون پوری نے ملا باقر داماد استرابادی کے خلاف جو رسالہ لکھا تھا، حافظ صاحب نے دونوں کے درمیان محاکمہ لکھا ہے، شاہ خوب اللہ الہ آبادی کے وہ ایسے مرید تھے جس پر خود پیر کو فخر تھا، ۱۱۳۳ھ میں بنارس میں وفات پائی، ان کی خانقاہ، مدرسہ اور مسجد بنارس میں اب تک یادگار ہے، اور میں نے اس کی زیارت کی ہے۔

ملا نظام الدین فرنگی محلی | ملا قطب الدین کی شہادت کے بعد شاہ عالمگیر نے ان کی اولاد کو لکھنؤ میں شاہی مقبوضات میں سے ایک بڑا مکان مرحمت کیا، جس میں کبھی ایک فرنگی سوداگر رہا کرتا تھا اور اسی مناسبت سے وہ فرنگی محل کہلاتا تھا، یہی وہ فرنگی محل ہے جو آگے چل کر پورب کا سب سے بڑا دارالعلوم بنا۔

ملا قطب الدین کے کئی صاحب زادے تھے، مگر ان میں سب سے نامور ملا نظام الدین ہوئے جن کی نسبت سے عربی کا درسِ نظامی مشہور ہے، موصوف کا سب سے پہلا چشمۂ فیض خود ان کے والد ماجد کا آغوشِ تربیت ہے، باپ کی شہادت کے بعد پورب کے متعدد علما کے فیوض و برکات کو اپنے دامن میں سمیٹا، اپنے والد کے شاگردوں ملا قطب الدین شمس آبادی اور حافظ امان اللہ بنارسی سے پڑھا اور آخری تکمیل شیخ غلام نقش بندی لکھنوی سے کی، ان تمام نسبتوں پر اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ملا نظام الدین کی ذاتِ گرامی میں پورب کے تمام مستند سلسلے آ کر جمع ہو گئے، یہی سبب ہے کہ پورب کا گوشہ گوشہ ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوا، میر آزاد بلگرامی جو ملا صاحب کے ہم عصر ہیں، اپنے تذکرہ مآثر الکرام میں لکھتے ہیں، ''وتمام عمر بتدریس وتصنیف اشتغال ورزید واعتبار واشتہار عظیم یافت، امروز علمائے اکثر قطر ہندوستان تلمذ بہ مولوی دارند، وکلاہِ گوشۂ تفاخری شکنند، وکسے کہ سلسلۂ تلمذ بادمی رساند بین الفضلا علم امتیازی افراز د و مردم بسیار را دیدہ شد کہ تحصیل جاہائے دیگر کردہ اند، وبرائے اعتبار خاتمۂ فراغ از مولوی گرفتند'' ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی، ابدی آرام گاہ لکھنؤ ہے۔

مدرسین فرنگی محل | ملا نظام الدین کے زمانہ سے لے کر تقریباً ڈیڑھ سو سال تک یعنی خاتمۃ العلما مولانا

---

[1] حاشیہ شرح ملا حسن از مولوی عبدالحکیم لکھنوی، معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاروں کو قطبین یعنی ملا قطب الدین سہالوی اور ملا قطب الدین شمس آبادی میں جو دونوں استاد و شاگرد ہیں، التباس ہو گیا ہے۔

عبدالحیؒ فرنگی محلی المتوفی ۱۳۰۴ھ تک یہ چشمۂ فیض یکساں جاری رہا اور اب بھی اس کی برکتوں کا سلسلہ بحمداللہ قائم ہے۔

ملا نظام الدین کے مشہور صاحب زادہ ملا عبدالعلی ہیں، جن کے دم سے یہ چشمۂ فیض بڑھ کر دریائے فیض بن گیا، دنیا نے ان کو بحر العلوم کہہ کر پکارا، یہ دریا لکھنؤ سے نکل کر بریلی اور رام پور سے ہوتا ہوا خلیج بنگال کے پاس بوہار پہنچا، اور وہاں سے مدراس ہو کر بحر ہند کے کناروں سے مل گیا، مدراس میں ۱۲۳۵ھ میں وفات پائی۔

ملا قطب الدین سہالوی کے فرزندوں اور فرزندوں کے فرزندوں میں بڑے بڑے نام ور پیدا ہوئے، جن کے ناموں سے تذکرے بھرے پڑے ہیں، ان میں سے ملا کمال الدین، ملا حسن، ملا مبین وغیرہ مشاہیر روزگار ہیں، اور ان میں سے ہر ایک خود ایک مستقل سلسلہ کا بانی ہے۔

ملا کمال الدین اور ملا حمد اللہ | ملا بحر العلوم کے علاوہ ملا نظام الدین کے دو اور باکمال شاگرد ہیں، ایک ملا کمال الدین فرنگی محلی المتوفی ۱۱۷۵ھ اور دوسرے ملا حمد اللہ سندیلہ المتوفی ۱۱۶۰ھ یہ ملا حمد اللہ وہی ہیں جن کی کتاب حمد اللہ مشہور ہے، انہوں نے سندیلہ میں اپنی درس گاہ جمائی جس سے بہت سے نام ور پیدا ہوئے۔

ملا باب اللہ جون پوری اور ملا غلام یحییٰ بہاری | ملا حمد اللہ کے ایک نام ور شاگرد ملا باب اللہ جون پوری ہیں اور ملا باب اللہ کے شاگرد ملا غلام یحییٰ بہاری ہیں جن کا حاشیہ ''غلام یحییٰ بر میر زاہد'' درس نظامی میں لیاقت کی آخری منزل ہے، اکبر ثانی[1] ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور بہار میں مخدوم شرف الدین کے احاطۂ مزار میں دفن ہوئے، ۱۱۸۶ھ[2] سال وفات ہے۔

سلسلہ خیر آباد | ملا کمال الدین کے ایک مشہور شاگرد ملا محمد اعلم سندیلہ ہیں، فضل و کمال کا یہی وہ نخل بارور ہے جس سے خیر آباد کی وہ شاخ نکلی ہے جو پھیل کر خود ایک مستقل سلسلہ بن گئی ہے، اور جو سلسلہ خیر آباد کے نام سے مشہور ہے، ملا محمد اعلم قصبہ سندیلہ کے شیوخ فاروقی میں ہیں، ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی کے دو شاگردوں ملا حمد اللہ سندیلوی اور ملا کمال الدین فرنگی محلی سے کسب فیض کیا، اور طلبہ کو اپنی تصنیف و تدریس کی دولت سے مالا مال کیا، اور بارہویں صدی کے آخر میں ۲۳ محرم ۱۱۹۸ھ کو اس دنیا کو الوداع کہا، ملا محمد اعلم کے

[1] تاریخ علمائے ہند، ص ۱۵۹ میں ۱۱۲۸ھ لکھا ہے، یہ صریحاً غلط ہے کیوں کہ وہ حضرت مرزا جان جاناں علیہ الرحمہ کے مرید تھے اور مرزا صاحب ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے ایک رسالہ پر تقریظ لکھی ہے، بہ ظاہر وہ سترہ برس کی عمر میں مرشد نہیں بن سکتے تھے اور نہ تقریظ لکھ سکتے تھے، مرزا صاحب نے خود اپنے ایک خط میں ان کا واقعہ ارتحال نقل فرمایا ہے، اور تاریخ ۱۱۸۶ھ لکھی ہے، (کلمات طیبات خطوط مرزا صاحب، ص ۷۰) [2] یہ گاؤں نگرنہسہ ضلع پٹنہ کے قریب ہے۔

شاگردوں میں ان کے بھانجے مولوی سید عبدالواجد خیرآبادی کامل ہوئے اور بعضوں کا بیان ہے کہ ملا محمد اعلم کے شاگرد ملا ارشد تھے، اور ملا ارشد کے شاگرد مولوی عبدالواجد خیرآبادی، ملا عبدالواجد سے ملا نظام العالم اور ملا نظام العالم سے مولانا فضل امام خیرآبادی نے پڑھا، مولانا دہلی میں انگریزوں کی طرف سے صدر الصدور تھے، بچوں کا فارسی ابتدائی رسالہ آمدنامہ[1] اُن ہی کی آمد طبع کا نتیجہ ہے، ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی۔

مرحوم کے جانشین، صاحب زادہ اور شاگرد مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی تھے، جن کے دم عیسوی نے معقولات میں وہ روح پھونکی کہ ابن سینائے وقت مشہور ہوئے، دیار واطراف سے طلبہ نے ان کی طرف رجوع کیا اور منطق وفلسفہ کو نئے طور سے ملک میں رواج دیا، شروح وحواشی کی بڑی بڑی کتابیں جو متاخرین کی نتائج طبع تھیں، داخل درس ہوئیں، فلسفہ میں ہدیہ سعیدیہ وغیرہ کتابیں عربی طلبہ کی تعلیم کے لیے لکھیں اور مقبول عام ہوئیں، غدر کے ہنگامہ میں گرفتار ہو کر جزیرہ انڈمان بھیجے گئے اور وہیں ۱۲۷۸ھ میں وفات پائی۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کے تلامذہ در تلامذہ نے سارے ملک میں پھیل کر علوم معقول کو بڑی رونق دی، اور وہ بڑے باکمال مدرس ثابت ہوئے، ان بزرگوں میں سے تین ارباب کمال کی درس گاہوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی، مولانا عبدالحق خیرآبادی خلف الصدق مولانا فضل حق خیرآبادی مولانا برکات احمد بہاری، ٹونکی مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری جون پوری، مولانا عبدالحق خیرآبادی نے رؤسائے رام پور کی قدردانی سے رام پور کو اپنے فضل وکمال سے منور کیا، مولانا برکات احمد صاحب صوبہ بہار میں ضلع مونگیر کے ایک گاؤں کے تھے، ان کے والد حکیم دائم علی صاحب ٹونک جا کر رہ گئے تھے، مولانا برکات احمد صاحب نے رئیس ٹونک کی قدرشناسی سے ٹونک کو علم وفن کا مرجع بنایا، مولانا ہدایت اللہ خاں رام پور سے جون پور آئے اور مدرسہ شیخ امام بخش میں علم وفضل کی مجلس آراستہ کی، ان میں سے ہر ایک کی درس گاہ سے سیکڑوں علما تعلیم پاکر نکلے۔

فرنگی محل کا اخیر دور اس اخیر زمانہ میں بھی فرنگی محل کے دار العلم میں فضل وکمال کی بیسیوں بساطیں بچھی رہیں، ان ہی میں سے مفتی یوسف صاحب فرنگی محلی کی درسگاہ ہے، مفتی صاحب مفتی محمد اصغر بن مفتی احمد ابوالرحم صاحب فرنگی محلی کے صاحب زادہ اور جانشین تھے، ان کے والد مفتی محمد اصغر صاحب ملا قطب الدین سہالوی شہید کے صاحب زادہ ملا محمد سعید کے سلسلہ میں تھے، اور لکھنؤ میں نوابی کے زمانہ میں سرکار اودھ کے مفتی تھے، والد کے بعد اُن کی جگہ یہ مفتی ہوئے، روز وشب طلبہ کو درس اور ساتھ ہی منصب افتا کی خدمت

[1] مشہور شایع شدہ آمد نامہ نہیں۔

انجام دیتے، جب ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ کی بساط الٹی تو علم کا یہ مرکز جون پور کے مدرسۂ امام بخش میں منتقل ہوگیا، یہاں سے وہ حج و زیارت کو حجاز تشریف لے گئے اور وہیں ۱۲۸۶ھ میں ابدی نیند سو گئے۔

مفتی احمد ابوالرحم کے دوسرے صاحب زادہ کا نام مولوی اکبر تھا، ان کے بیٹے مولوی امین اللہ اور ان کے بیٹے مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی تھے، مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی نے اپنے والد اور اپنے خاندان کے دوسرے علماء، مفتی ظہور اللہ، مفتی محمد اصغر، مولوی نعمت اللہ اور خصوصاً مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی سے کسب فیض کیا اور یہ شہرت حاصل کی کہ علما نے ان کے سامنے زانوے ادب تہ کیا، ۱۲۶۰ھ میں نواب ذوالفقار بہادر نواب باندا کی طلب پر باندا گئے اور کئی برس رہے، وہاں سے واپس آکر جون پور کے مدرسۂ امام بخش میں مدرس ہوئے اور نو سال تک جون پور ان کی شمعِ وجود سے پرنور رہا، ۱۲۸۴ھ میں ایک عالم کو شمائم علم سے معطّر فرما کر حیدر آباد میں وفات پائی۔

ان ہی کے صاحب زادہ مولانا عبدالحیؒ صاحب فرنگی محلی لکھنوی ہیں، زیادہ تر علم کی دولت اپنے والد ماجد سے وراثت میں پائی، باندا میں ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے، دس برس کی عمر میں حافظ ہو کر سب سے پہلے جون پور کی جامع مسجد میں تراویح پڑھائی، سترہ برس کے سن میں تعلیم سے فراغت اور درس و تدریس شروع کیا، کتابیں لکھیں، بزرگوں کی کتابوں پر حاشیے لکھے، فقہ و حدیث و اصول کی معرکۃ الآرا کتابیں چھپوائیں، علما سے مناظرے کیے، ان کی شہرت ہندوستان کی چار دیواری سے نکل کر اطراف عالم میں پھیلی اور سینکڑوں علمائے اعلام ان کی درس گاہ سے کامل ہو کر اٹھے اور ملک ملک میں پھیلے، ۱۳۰۴ھ میں چالیس برس کی عمر میں عالم جاودانی کا سفر کیا، علما کو مولانا کی ناگہانی وفات کا وہ صدمہ ہوا کہ شمس العلما مولانا سعید عظیم آبادی نے یہ تاریخ وفات کہی ع شد فرنگی محل زعلم تہی

مولانا عبدالحیؒ صاحب کے بعد فرنگی محل میں مولانا محمد نعیم صاحب کی ہستی یادگارِ سلف تھی، یہ ملا بحر العلوم کے پوتے اور اپنے والد مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔

اخیر زمانہ میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی اسی محفل کے چراغ سحر تھے۔

علمائے جون پور پورب کے دوسرے علمی مرکز جون پور کا نام بار بار آیا ہے، مگر ابھی تک وہاں کے اربابِ کمال کی داستان تشنۂ بیان ہے، تیموری حملہ کے بعد ۸۰۹ھ میں جب جون پور میں شرقی سلطنت کا تخت بچھا تو اسی کے ساتھ ساتھ یہاں علم و فضل کی مسند بھی بچھی، اس مسند کے سب سے پہلے مسند آرا

ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی اوران کے معاصرین ہیں، لیکن اس سے چند سال پہلے جون پور سے چند میل کے فاصلہ پر پورب کی طرف ظفر آباد نام قصبہ آباد ہو چکا تھا۔

علمائے ظفر آباد | یہ پہلے گزر چکا ہے کہ ظفر آباد شہزادہ ظفر خاں کے نام پر بسا تھا، مگر یہ اس قصبہ کی شاہانہ تاریخ ہے، اسلامی آبادی یہاں اس سے بہت پہلے قائم ہو چکی تھی، کہتے ہیں کہ سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۸۹ھ میں جب قنوج کی فتح کے بعد بنارس کا قصد کیا تو شاہی فوج کے ساتھ ملا مرتضی کوفی ایک مرد مجاہد بھی شریک تھا، اس وقت ظفر آباد کے مقام پر راجہ اودے پال نام ایک راجہ تھا، اس مجاہد نے راجہ سے مقابلہ کیا اور شہید ہوا، یہیں دفن ہوا، بعد کو مسجد بن گئی، ''صحن شہیداں'' کے نام سے مشہور ہوئی اور اس وقت یہ مزار موضع شمس خاں پور کے رقبہ میں داخل ہے[1]۔

مخدوم شیخ صدر الدین چراغِ ہند نام ایک بزرگ ملتان میں، ۶۹۰ھ میں پیدا ہوئے تھے، شیخ رکن الدین ملتانی المتوفی ۷۳۵ھ کے مرید تھے، شیخ رکن الدین کا یہ رتبہ تھا کہ بادشاہ وقت ان کے ہر اشارہ کی تعمیل کو عزت سمجھتے تھے[2]، شیخ صدر الدین پیر کے حکم سے پورب کی ولایت پر مامور ہو کر ظفر آباد میں قیام پذیر ہوئے، مشہور ہے کہ غیاث الدین تغلق نے ان سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا تھا اور ان کے لیے ظفر آباد میں محل بنوایا تھا، جو ''چراغِ ہند کے محل'' کے نام سے اب تک مشہور ہے، اس عمارت پر فارسی کا یہ کتبہ منقوش ہے[3]:

بہ عہد ملک ذو القرنین ثانی	بنائے شرع را از عدل بانی
غیاث الدین و دنیا بو المظفر	سلیماں خاتم و جمشید افسر
شہِ آفاق تغلق شاہِ اعظم	کہ بروی شد جہاں داری مسلّم
بر آمد ایں حصارِ چرخ ایواں	کہ در رفعت گزشت از فرق کیواں
دوشنبہ بست (و) ہشتم روز بودہ	ربیع الاول ماہ ستودہ
ہمایوں ساعت و در وقت مسعود	زہجرت سال ہفصد بست و یک بود
مظفر شد چو شد معمور ایں شہر	ظفر آباد نامش بودہ در دہر ۷۲۱ھ

اس کتبہ سے یہ پوری طرح ظاہر ہوا کہ ۲۸؍ ربیع الاول ۷۲۱ھ میں سلطان غیاث الدین تغلق نے اس کو بسایا تھا[4]۔

---

[1] تجلی نور، تاریخ جون پور، ص ۲۹ [2] فرشتہ، ذکر حضرت رکن الدین [3] شاہان شرقی کی یادگاریں (انگریزی) خان بہادر فصیح الدین مرحوم، کلکٹر جون پور، ص ۱۰۵ [4] اس مقام پر فرشتہ ص ۱۲۹ اور مبارک شاہی ص ۹۲ کی اس غلطی کو دور کرنا ہے کہ انہوں نے غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی کی تاریخ یکم شعبان ۷۲۱ھ لکھی ہے، مگر اس کتبہ کی بنا پر یہ تاریخ غلط ہے اور صحیح وہ ہے جو فیروز شاہی ص ۴۲۵ میں ضیا برنی نے اور تاریخ بدایونی ص ۲۲۱ میں ملا بدایونی نے لکھی ہے یعنی ۷۲۰ھ۔

چنانچہ اسی کے بعد سے ظفرآباد کا نام تاریخوں میں آتا ہے، تاتاریوں کے حملہ کے زمانہ میں ایک بزرگ مع اپنے صاحب زادوں کے ہندوستان میں وارد ہوئے، بعد کو ان کے ایک صاحب زادہ سید تاج الدین کڑہ کے ناظم مقرر ہوئے اور دوسرے صاحب زادہ مخدوم اسد الدین نے پورب میں ظفرآباد کو اپنے قدوم سے سرفراز کیا اور ''مخدوم آفتابِ ہند ظفرآبادی'' کے لقب سے شہرت حاصل کی، اور ۷۹۳ھ میں وفات پائی، ان کا مزار اور ان کی اولاد اب تک ظفرآباد میں ہے۔

تاج الدین کے بیٹے ظہیر الدین نے شعر و ادب میں نام پیدا کیا اور دلی جا کر تغلق کے دربار میں پہلے شاعروں کی صف میں داخل ہوئے، پھر میر منشی مقرر ہوئے اور آخر میں ترکِ منصب کر کے حضرت نظام الاولیا کے حلقہ میں آئے، دیوان فارسی اور تصوف میں رموز المعانی[1] یادگار چھوڑا۔

پورب میں علمی ترقی کے چار دور | پورب میں درحقیقت علمی ترقی کے چار دور ہیں، ایک سلطنت شرقی کا عہد[2] دوسرا لودیوں کا تیسرا تیموری سلاطین اور خصوصیت سے شاہ جہاں اور عالمگیر کا زمانہ اور چوتھا اودھ کی نوابی کے ختم پر۔

شرقی سلطنت کا دور | پہلا دور ۸۰۴ھ سے شروع ہو کر ۸۸۱ھ پر ختم ہوتا ہے اور اس دور کا طلائی عہد سلطان ابراہیم شرقی اور اُس کے بیٹے سلطان محمود شرقی کا زمانہ ہے۔

یہ عہد حکومت نہ صرف پورب بلکہ پورے ہندوستان میں علم و فن کی بہار کا زمانہ تھا، قنوج سے لے کر پٹنہ تک گاؤں گاؤں میں شرفا کی آبادیاں قائم ہو رہی تھیں، قصبوں میں قاضیوں، مفتیوں اور شیوخِ وقت کو جاگیریں اور معافیاں دی جا رہی تھیں اور ہر جگہ علم و فضل کی مسندیں بچھی تھیں، اور طلبہ کے قافلے اس سرے سے اُس سرے تک علم کی طلب اور تحصیل میں آ جا رہے تھے، آج بھی ان اطراف میں شرفا کے جو خاندان آباد ہیں، ان کے بزرگ اسی عہد کی یادگار ہیں اور جس کے ہاتھ میں جو کچھ ہے وہ انہی شرقی بادشاہوں کا فیض ہے یا پھر آخر میں سلطان عالمگیر کے عطیے ہیں، سادات اور صدیقی، فاروقی اور انصاری شیوخ کی نوآبادیاں قنوج سے لے کر جون پور سے گزر کر غازی پور تک پھیلی تھیں، خانقاہیں اللہ والوں سے اور درس گاہیں

---

[1] تجلی نور، نور الدین ظفرآبادی، جلد دوم، ص ۹ [2] سلاطین شرق کے نام اور زمانے یہ ہیں:

۱- سلطان الشرق خواجہ جہاں	۷۹۶ھ-۸۰۲ھ	۴- سلطان محمود شرقی	۸۴۴ھ-۸۶۲ھ
۲- مبارک شاہ شرقی	۸۰۲ھ-۸۰۴ھ	۵- سلطان محمد شاہ شرقی	۸۶۲ھ-۸۶۲ھ
۳- سلطان ابراہیم شرقی	۸۰۴ھ-۸۴۴ھ	۶- سلطان حسین شاہ شرقی	۸۶۲ھ-۸۸۱ھ

علم کے طلب گاروں سے بھری پڑی تھیں، شرقی سلطنت کے فروغ نے ظفر آباد اور جون پور کے در و دیوار کو پرنور بنا دیا تھا، علما اور اہل ہنر دور دراز ملکوں سے کھنچے چلے آتے تھے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

۱- نور الدین ابی محمد بن مخدوم سید اسد الدین المتوفی ۸۲۶ھ۔

۲- قطب الدین ابوالغیب بن نور الدین ابی محمد شاگرد قاضی شہاب الدین دولت آبادی، ۸۶۹ھ میں وفات پائی۔

۳- ملا بہرام خطیب جامع مسجد ظفر آباد المتوفی ۸۳۹ھ۔

۴- قاضی تاج الدین ناصحی ظفر آباد المتوفی ۸۳۱ھ۔

۵- قاضی نصیر الدین گنبدی قاضیِ جون پور، شاگرد قاضی عبدالمقتدر دہلوی المتوفی ۸۱۷ھ۔

۶- ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی، دنیا بادشاہانِ اسلام کی اس علمی قدر دانی کو یاد رکھے تو اچھا ہے کہ ملک العلما جب ایک سخت مرض میں مبتلا ہوئے تو سلطان ابراہیم شرقی ان کی عیادت کو آیا، مزاج پرسی کے بعد پانی کا ایک پیالہ لے کر مولانا کے سر پر پھرا کر یہ دعا مانگی، کہ خداوند یہ بلا ان سے دور کر کے اس کے بدلہ میں میری جان صدقہ میں قبول فرما آخر دونوں آگے پیچھے ۸۴۰ھ میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

۷- ملا شیخ عبدالملک عادل فاروقی بن نواب عماد الملک وزیر سلطنت شرقی، شاگرد قاضی شہاب الدین دولت آبادی المتوفی ۸۹۷ھ۔

۸- ملا علاء الدین عطا ملک برادر شیخ عبدالملک شاگرد قاضی شہاب دولت آبادی، قاضی صاحب نے اپنی فارسی شرح کافیہ میں اپنے شاگرد کا ذکر کیا ہے کہ اسی کے پاسِ خاطر سے یہ لکھی گئی۔

۹- شاہ ابوالفتح جون پوری نبیرہ قاضی عبدالمقتدر دہلوی، المتوفی ۸۵۸ھ۔

۱۰- شیخ محمد عیسیٰ جون پوری شاگرد قاضی دولت آبادی۔

۱۱- قاضی سماء الدین قتلغ خاں وزیر سلطان شرقی المتوفی ۸۸۳ھ۔

یہی وہ زمانہ ہے جب ظفر آباد اور جون پور کے بعد فیض آباد کے اطراف اور لکھنؤ میں علما اور مشائخ اپنی درس گاہیں اور خانقاہیں اور شرفا اپنے گھرانے آباد کر رہے تھے، چنانچہ لکھنؤ میں شیخ الاسلام شیخ سعد اللہ فراز کندوری المتوفی ۸۲۹ھ، شیخ قوام الدین المتوفی ۸۴۰ھ، شیخ سارنگ المتوفی ۸۴۷ھ، شیخ محمد اعظم

لکھنوی، شیخ سعد الدین لکھنوی المتوفی ۸۸۱ھ، شیخ ضیا لکھنوی، شاہ ضیا المتوفی ۸۴۰ھ، خیرآباد میں، شیخ سعد الدین خیر آبادی المتوفی ۸۸۳ھ، رودولی میں مخدوم احمد عبدالحق المتوفی ۸۳۷ھ، شیخ امین الدین المتوفی ۸۳۷ھ، شیخ صفی الدین ان کے بھائی قاضی رضی الدین اور بیٹے شیخ ابوالمکارم اسماعیل المتوفی ۸۶۰ھ کچھوچھ (فیض آباد) مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی المتوفی ۸۰۸ھ، دریاباد میں شیخ محمد مخدوم آب کش المتوفی ۸۴۰ھ اور اجودھیا میں شیخ سراج الدین چشتی المتوفی ۸۹۹ھ تعلیم و ارشاد کی مسندوں پر جلوہ آرا تھے۔

مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانیؒ کے مکتوبات میں ایک خط قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نام ملتا ہے، جس میں سلطان ابراہیم شرقی سے کسی سفارشِ خیر کا تذکرہ ہے[1]، شیخ سعد الدین لکھنوی اور سلطان شرقی کے وزیر سماء الدین قتلغ خاں کے درمیان دوستی کے تعلقات مستحکم تھے، شیخ کے صاحب زادہ شیخ امین الدین لکھنوی کے مکتوبات[2] میں ایک خط وزیر موصوف کے نام موجود ہے، جس میں شیخ سعد الدین لکھنوی کی وفات کا پورا حال لکھا ہے، سماء الدین قتلغ خاں گو وزیر تھے، مگر اپنے زمانہ کے مشہور علما میں تھے۔

لودیوں کا زمانہ اگرچہ سلطان حسین شرقی کی نالائقی اور غرور و نخوت سے ۸۸۳ھ میں سلطان بہلول لودی کے ہاتھ سے شرقی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا، مگر خوش قسمتی سے اس وقت لودیوں[3] کا جو خاندان دلی کے تخت پر فرماں روا تھا وہ علم و فن اور فضل و کمال کا پورا قدر شناس تھا، ان کے زمانہ میں ہندوستان نے علم و تہذیب اور صنعت و زراعت کے کاموں میں بڑی ترقی کی، بلکہ شرقی بادشاہوں نے اس سرزمین میں تہذیب و تمدن کے جو پودے لگائے تھے وہ لودیوں کے عہد میں پوری طرح بارآور ہوئے۔

غازی پور میں پھول اور پھل لگائے گئے، سکندر پور (بلیا) سلطان سکندر لودی کی آب یاری سے چنبیلی (وہاں کے قلعہ کی چنبیلی اب تک مشہور ہے) اور گلابوں کا تختہ بن گیا، جون پوران پھولوں کے تیلوں اور عطروں سے مشامِ جاں کو معطر کرنے لگا اور اب تک کر رہا ہے، یہی عطر بیزی علمی میدانوں میں بھی ہوئی یعنی علم و فن کے گلستانوں میں نئے سرے سے بہار آئی، تیموری بادِ صرصر نے جن پودوں کو مرجھا دیا تھا، ان میں دوبارہ جان پڑی اور دلی سے لے کر جون پور تک علم کے قافلے پھر آنے جانے لگے، ہندوؤں میں فارسی تعلیم کا رواج بھی اسی زمانہ سے شروع ہوا۔

---

[1] اخبار الاخیار، ص ۱۵۷ [2] نسخہ دار المصنفین [3] لودی پٹھانوں کی سلطنت ۸۵۵ھ سے ۹۳۲ھ تک دلی میں قائم رہی، ۹۳۲ھ میں بابر نے آکر لودیوں کا خاتمہ کیا اور تیموری سلطنت کی بنیاد کھڑی کی، لودی سلطانوں کے نام اور زمانے یہ ہیں:

۱- سلطان بہلول لودی، ۸۵۵ھ-۸۹۴ھ، ۲- سلطان سکندر لودی، ۸۹۴ھ-۹۲۳ھ، ۳- سلطان ابراہیم لودی، ۹۲۳ھ-۹۳۲ھ۔

لودیوں کے خاندان میں سکندر لودی کا زمانہ سب سے بہتر تھا، غرض اس نے اطراف ودیار سے علما کو جمع کیا اور نئے سرے سے علم کو فروغ دیا[1]، خود شاعر تھا، اور گل رخ تخلص کرتا تھا، اس کے عہد کے مشہور شاعر شیخ جمالی ہیں، جنہوں نے ملکوں کی سیاحت کی تھی اور ملا جامی کی صحبت سے جام فیض پیا تھا، اسی زمانہ میں دو بھائی ملتان سے ادھر آنکلے، شیخ عبداللہ تلنبی اور شیخ عزیز اللہ تلنبی[2]، پہلے نے دہلی کو اور دوسرے نے سنبھل (مراد آباد) کو اپنا مرکز بنایا، ملا بدایونی لکھتے ہیں "واز جملہ علمائے کبار درزمانِ سلطانِ سکندر شیخ عبداللہ تلنبی در دہلی و شیخ عزیز اللہ تلنبی در سنبھل بودند، وایں ہردو عزیز ہنگامِ خرابی ملتان بہ ہندوستان آمدہ علم معقول رادراں دیار رواج دادند، وقبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ وشرح صحائف از علم منطق وکلام در ہند شایع نہ بود[3]" ملا بدایونی اپنے بزرگوں سے سن کر کہتے ہیں کہ ایک شیخ عبداللہ کی درس گاہ سے میاں لادن جمال خاں دہلوی، میاں شیخ گوالیاری اور میران سید جلال بدایونی وغیرہ جیسے چالیس علمائے تبحر پڑھ کر نکلے[4]، سلطان لودی خود درس میں شریک ہوتا اور اس خیال سے کہ سلسلۂ درس میں شاہی آداب وتکلفات سے خلل نہ پڑے، چپکے سے صفِ پائیں میں آکر بیٹھ جاتا تھا اور آخر میں سلام مسنون کر کے رخصت ہو جاتا تھا[5]۔

شیخ عبداللہ نے ۹۲۲ھ میں وفات پائی۔

پورب میں ان دونوں عزیزوں کی درس گاہ سے دو کامل نکلے، ایک میاں حاتم سنبھلی المتوفی ۹۶۸ھ اور دوسرے ملا الٰہ داد جون پوری المتوفی ۹۶۲ھ، پہلے کی نسبت ملا بدایونی نے لکھا ہے کہ انہوں نے عمر میں تیس دفعہ سے زیادہ مفتاح کا اور چالیس دفعہ سے زیادہ مطول کا درس دیا، اور دوسرے کی نسبت لکھا ہے کہ انہوں نے فقہ میں ہدایہ کی، نحو میں کافیہ کی شرحیں اور تفسیر مدارک پر حاشیہ لکھا۔

مولانا الٰہ داد جون پوری اس عہد میں وہی حیثیت رکھتے تھے، جو شرقیوں کے زمانہ میں قاضی دولت آبادی کی تھی، پورب مولانا الٰہ داد کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں سے معمور ہو رہا تھا، جون پور کے محلہ رضوی خاں میں مولانا کی درس گاہ تھی، مگر اب نشان تک نہیں، ان کے صاحب زادے شیخ بھکاری جون پوری تھے، سلطان سکندر کا عہد پایا تھا۔

---

[1] دیباچہ اخبار الاخیار، شیخ دہلوی، ص ۹ مطبوعہ احمدی مطبع دہلی، ۱۲۷۰ھ [2] یہ تلنبہ ملتان میں ایک گاؤں تھا۔

[3] تاریخ بدایونی ذکر سکندر لودی [4] ایضاً [5] ایضاً۔

سکندر لودی کے زمانہ میں عرب سے ایک اور خضر طریقت کا ورود ہندوستان میں ہوا، یہ سید رفیع الدین محدث شیرازی ہیں، یہ معقولات میں محقق جلال الدین دوّانی کے اور حدیث میں حافظ شمس الدین سخاوی کے شاگرد تھے، ۹۵۴ھ میں وفات پائی، ان کی ذات معقول ومنقول دونوں کا مرج البحرین تھی۔

ان بزرگوں کے علاوہ پورب کی زمین اس زمانہ میں حسب معمول اکابر کے وجود سے فیض یاب تھی۔

۱- شیخ معروف چشتی جون پوری مرید مولانا الٰہ داد جون پوری۔

۲- شیخ دانیال جونپوری استاد سید محمد جون پوری۔

۳- شاہ پھن غازی پوری میر عدل غازی پور المتوفی ۹۰۵ھ۔

۴- سید محمد جون پوری المتوفی ۹۱۰ھ۔

۵- شیخ حسن بن طاہر بہاری جون پوری المتوفی ۹۰۹ھ دہلی میں مزار ہے۔

۶- شیخ محمد حسن بن شیخ حسن جون پوری المتوفی ۹۴۴ھ دہلی میں دفن ہوئے۔

۷- قاضی صلاح الدین خلیل جون پوری، نبیرۂ قاضی نظام الدین کیکلانی۔

تیموریوں کا زمانہ ۹۳۲ھ سے تیموری سلاطین کا دور شروع ہوا، علم وفن نے ملک میں وسعت پائی، سلاطین اور امرا کی قدردانی نے ہر جگہ علم کے بازار کو رونق پر رونق دی، اس عہد میں سید عبدالاول جون پوری ذکر کے قابل ہیں، جو شاید ہندوستان میں سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے صحیح بخاری کی شرح فیض الباری لکھی، قاضی صلاح الدین خلیل کے شاگرد تھے اور غالباً حدیث کا فیض گجرات اور عرب کے سفر سے لائے، بیرم خان خاناں کی دعوت پر دہلی آئے اور آخر وہیں کی خاک ان کی ابدی خواب گاہ ہوئی، ۹۶۸ھ وفات کی تاریخ ہے[1]۔

دوسرے بزرگ ملا یوسف مشہور بہ قاضی خاں ظفر آبادی ہیں، شیخ حسن بن طاہر سے فیض علم پایا، ہمایوں نے ہر چند چاہا کہ وہ اس کی نذر قبول فرمائیں، مگر دست قناعت شرمندۂ احسان نہ ہوسکا، ۹۷۷ھ وفات کا سال ہے۔

---

[1] تجلی نور، ص ۴۳۔

تیموری عہد کا شباب شاہ جہاں کا زمانہ ہے، پورب کی سرزمین اس زمانہ میں علم وفن کے ستاروں کی کثرت سے آسمان بنی ہوئی تھی، ان ستاروں میں آفتاب کی حیثیت استادالملک ملامحمد افضل جون پوری کو حاصل تھی، ان کے پدر بزرگ وارد ماوند سے چل کر ہندوستان آئے اور ہندوستان میں بھی یہ سعادت خطۂ پورب کو حاصل ہوئی، وہ رودولی میں مفتی مقرر ہوئے، ۹۷۷ھ میں یہیں ملامحمد افضل کی پیدائش ہوئی، اپنے والد ماجد سے ابتدائی کتابیں پڑھ کر پچھم کا رُخ کیا، دہلی پہنچ کر ملا شیخ حسین شاکر، ملا طاہر لاہوری سے فن کی کتابیں پڑھیں اور حدیث کا درس ملّا ابوحنیفہ شاگرد مخدوم الملک و حکیم علی گیلانی سے لیا، علوم وفنون کی تکمیل کے بعد جون پور کو اپنے فیض و برکات کا مرکز بنایا، اس درس گاہ کے فیض نے جون پور کو دارالعلم بنادیا اور شاہ جہاں کی زبان سے وہ فقرہ کہلوادیا جو ابد تک یادگار رہے گا،

"پورب شیرازِ ماست"

اس مطلع علم سے جو علمائے وقت چمکے ان میں دو آفتاب و ماہتاب ایسے ہیں جن کے علم کی روشنی کبھی ماند نہ ہوگی، ایک دیوان عبدالرشید المتوفی ۱۰۸۳ھ اور دوسرے ملامحمود جون پوری المتوفی ۱۰۶۲ھ، استاد اکثر کہا کرتے تھے کہ علامہ تفتازانی اور علامہ جُرجانی کے بعد دو ایسے علمائے وقت کبھی اکٹھا نہیں ہوئے[1]، دیوان عبدالرشید وہ ہیں جنہوں نے فن مناظرہ میں رشیدیہ لکھی جو ہمارے نصابِ درس میں داخل ہے، شاہ جہاں کے بار بار اصرار پر بھی خلوت خانۂ قناعت سے باہر قدم نہیں رکھا، ملامحمود نے دنیا کو فلسفہ میں شمسِ بازغہ اور بلاغت میں فرائد جیسی کتابیں دیں، پہلے شاہ جہاں کے دربار میں تھے، پھر ایک درویش (ملا میر لاہوری) کا طعنہ سُن کر جون پور میں درس گاہ جما کر ایسے بیٹھے کہ پھر نہ اٹھے۔

استادالملک کے دوسرے شاگرد ملا ضیاء الدین محدث[2] شیخ چندن محدث اور ملا شیخ احمد زین زاہد المتوفی ۹۶۳ھ ہیں، استادالملک کی نسبی نسل آگے نہیں چلی، البتہ ان کے بھائی شیخ محمود ان کے بیٹے شیخ خاندان کے بیٹے ملا محمد یوسف، ان کے پوتے شیخ احمد اور ان کے بیٹے قاضی سلطان قلی خاں، قاضی کوڑہ جہان آباد وغیرہ ایک دوسرے کے بعد دیے سے دیا جلاتے رہے۔

عہدِ شاہ جہانی و عالم گیری میں قاضی محمد حسین جون پوری (جو فتاوی عالم گیری کے مرتبین میں سے ایک ہیں) ملامحمود ثانی جون پوری شاگرد دانش مند خاں، شیخ محمد ماہ جون پوری، شیخ شمس الدین جون پوری،

[1] تجلی نور، ص۴۹ [2] ایضاً، ص۵۲۔

ملا نورالدین جون پوری اور آخری دور میں ملا باب اللہ جون پوری، شیخ محمد افضل سید پوری (غازی پوری) الہ آبادی علم وفن کے نام ور فرماں روا گزرے۔

عالم گیر کے زمانہ میں سہالی کا آفتاب بلند ہوا، یعنی ملا قطب الدین، ملا نظام الدین، ملا کمال الدین اور ان کے اساتذہ اور معاصرین شیخ محب اللہ صدر پوری الہ آبادی، قاضی آصف صدر پوری الہ آبادی، ملا حمد اللہ سندیلوی، ملا امان اللہ بنارسی، ملا قطب الدین شمس آبادی، ملا محب اللہ بہاری وغیرہ ممتاز ہوئے جن کے بہ دولت اودھ کے حدود سے لے کر بہار کی اخیر سرحد تک علم وفن اور فضل وکمال کی بہار پُر بہار تھی۔

غرض اس وقت شاہ جہاں اور عالم گیر کی فیاضی اور علمی قدر دانی کے بہ دولت قصبہ قصبہ اور دیہات دیہات تک میں علما اور مدرسین پھیلے تھے، بادشاہوں کی طرف سے ان کو جاگیریں اور معافیاں ملی تھیں، جس کے سبب سے وہ بے نیاز ہو کر علم وفن کی خدمت میں لگے تھے، ان میں کچھ ایسے مستغنی بھی تھے، جنھوں نے یہ دردِ سر نہیں خریدا اور اپنا سارا کاروبار خدا کے لیے کرتے رہے، اس زمانہ میں اور اس کے بعد جب جگہ جگہ نوابیاں قائم ہوگئی تھیں، پورب کے جو قصبے اپنی مردم خیزی میں نام ور ہوئے، ان کے نام ترتیب سے یہ ہیں، بدایوں، امروہہ، سنبھل، مرادآباد، رام پور، بریلی، شاہ جہاں پور، فرخ آباد، قنوج، شمس آباد، سندیلہ، بلگرام، خیرآباد، صدرپور، ملیح آباد، کاکوری، نصیرآباد، (رائے بریلی) لکھنو، مالک پور، سلون، الہ آباد اور خاص پورب میں جون پور، غازی پور، سید پور، گھوسی، بھیرا، چریاکوٹ، شمس پور، متوپور وغیرہ۔

جون پور کے مدرسے | ملک العلما شہاب الدین دولت آبادی کے عہد سے لے کر اخیر زمانہ تک جون پور میں جو درس گاہیں علمائے مدرسین کے زیر اہتمام عہد بہ عہد قائم ہوتی رہیں، ریاض[1] جون پور کے مصنف نے اپنی کتاب کے آخر میں حسب ذیل فہرست دی ہے اور لکھا ہے کہ محمد شاہ کے زمانہ تک وہ قائم تھیں۔

۱- مدرسۂ ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی المتوفی ۸۴۹ھ
۲- مدرسۂ مولانا الہ داد المتوفی ۹۲۳ھ
۳- مدرسۂ ملا محمود صاحب شمس بازغہ المتوفی ۱۰۶۲ھ
۴- مدرسۂ ملا عبدالباقی
۵- مدرسۂ ملا نورالدین
۶- مدرسۂ مفتی سید مبارک
۷- مدرسۂ ملا محمد حفیظ

---

[1] مولفہ سید محمد مہدی جون پوری، مطبوعہ ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۱ء۔

۸- مدرسۂ ملا شیخ حامد

۹- مدرسۂ ملا شیخ محمد ماہ

۱۰- مدرسۂ ملا معمور، اکبر سے محمد شاہ تک

۱۱- مدرسۂ ملا محمد اعلیٰ، اکبر سے محمد شاہ تک

تجلی نور تاریخ جون پور کی تلاش سے چند مدرسوں کے نام اور معلوم ہوئے ہیں:

۱۲- مدرسۂ میر محمد ملیح

۱۳- مدرسۂ ملا صدر جہاں ۱۱۹۰ھ

۱۴- مدرسۂ ملا شمس الدین ۱۱۹۰ھ

۱۵- مدرسۂ حافظ غلام شاہ

۱۶- مدرسۂ میر محمد عسکری، ۱۱۱۹ھ

۱۷- مدرسۂ مولوی ثناء اللہ

۱۸- مدرسۂ مولوی عطاء اللہ

۱۹- مدرسۂ سید ضیاء الدین خاں

۲۰- مدرسۂ معین الدین حکاک

۲۱- مدرسۂ استاد الملک المتوفی ۱۰۶۲ھ

۲۲- مدرسۂ شیخ رکن الدین المتوفی ۱۱۲۱ھ

۲۳- مدرسۂ ملا عبد الباری خضری ۱۰۳۶ھ

۲۴- مدرسۂ خانقاہ مداریہ، ملا مداری المتوفی ۱۰۷۶ھ

۲۵- مدرسۂ ملا شمس پور المتوفی ۱۰۴۷ھ

۲۶- مدرسۂ ملا شیخ محمد صادق المتوفی ۱۰۶۴ھ

۲۷- مدرسۂ ملا خلیل المتوفی ۱۰۷۹ھ

۲۸- مدرسۂ ملا باب اللہ

۲۹- مدرسۂ ملا جمیل المتوفی ۱۱۲۳ھ

اودھ کی نوابی کا زمانہ تیموریوں کے اخیر دور میں لکھنؤ میں شیوخ نے طاقت پالی تھی، عالم گیر کے زمانہ میں فدائی خاں یہاں کے حاکم تھے، ان کے بعد شیوخ میں سے نواب ابوالمکارم خاں نے جن کے نام سے لکھنؤ میں مکارم نگر کا محلّہ آباد ہے، لکھنؤ کی حکومت پائی، مگر رعایا ان کی سخت گیری سے چیخ اٹھی، یہی وہ وقت ہے کہ محمد شاہ کے زمانہ میں برہان الملک[1] سعادت خاں (المتوفی ۱۱۵۱ھ نے) ۱۱۳۶ھ میں اودھ کی

[1] نوابان اودھ کا سلسلہ حکومت یہ ہے:

۱- برہان الملک سعادت خاں	۱۱۳۶ھ-۱۱۵۲ھ ۱۷۲۳ء-۱۷۳۹ء	۶- نواب غازی الدین حیدر	۱۲۲۹ھ-۱۲۴۳ھ ۱۸۱۴ء-۱۸۲۷ء
۲- ابوالمنصور خان صفدر جنگ	۱۱۵۲ھ-۱۱۶۷ھ	۷- نصیر الدین حیدر	۱۲۴۳ھ-۱۲۵۳ھ ۱۸۲۷ء-۱۸۳۷ء
۳- نواب شجاع الدولہ	۱۱۶۷ھ-۱۱۸۸ھ	۸- محمد علی شاہ	۱۲۵۳ھ-۱۲۵۸ھ ۱۸۳۷ء-۱۸۴۲ء
۴- آصف الدولہ یحییٰ خاں	۱۱۸۸ھ-۱۲۱۲ھ	۹- امجد علی شاہ	۱۲۵۸ھ-۱۲۶۳ھ ۱۸۴۲ء-۱۸۴۶ء
۵- نواب سعادت علی خاں	۱۲۱۲ھ-۱۲۲۹ھ ۱۷۹۷ء-۱۸۱۴ء	۱۰- واجد علی شاہ	۱۲۶۳ھ-۱۲۷۶ھ ۱۸۴۶ء-۱۸۵۹ء

صوبہ داری پائی، وہ مذہباً شیعہ تھا، اس نے اپنے صوبہ میں بہت سے علمی خاندانوں کی جاگیریں، معافیاں اور وظیفے ضبط کر لیے، نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر خاندان جو درس و تدریس اور علم کی اشاعت میں مصروف تھے، نوکری اور سپاہ گری کی خدمت پر مجبور ہوئے، برہان الملک کے بعد اس کا بھانجا اور داماد صفدر جنگ صوبہ دار ہوا، ۱۱۵۹ھ میں الٰہ آباد کا صوبہ بھی اسی کے سپرد ہوا، جس میں جون پور وغیرہ قصبات داخل تھے، نواب نے یہاں کے علما اور شرفا کی جاگیریں اور معافیاں بھی ضبط کیں اور اہل علم کے خاندان تباہ حال ہو گئے، میر آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں لکھتے ہیں ''بر ملتفتان ایں اوراق و حقایق جویانِ انفس و آفاق جلوہ پیرا باد کہ سرزمین پورب از قدیم الایام معدن علم و علماست سید محمد کرمانی صاحب سیر الاولیا کہ مرید سلطان المشائخ نظام الدین دہلوی است قدس سرہ می گوید کہ مولانا فرید الدین شافعی شیخ الاسلام اودھ بود، مولانا علاء الدین نیلی اودی پیش شیخ الاسلام قاری کشاف بود، و مولانا شمس الدین یحیٰ و دیگر علمائے اودھ سامع بودند'' ترجمہ مولانا شمس الدین یحیٰ در اوائل ایں فصل گذشت اگر چہ جمیع صوبہ جاتِ ہندیہ وجود حاملان علوم تفاخر دارند، سیما حصار پایۂ تختِ خلافت کہ بہ واسطۂ مرجعیت صاحب کمالاں ہر قسم در آنجا فراہم می آیند، و از تراکم افکار و اجتماع عقولِ اہل ہر عصر کمالاتِ نفسِ ناطقہ را چہ علم عقلی و نقلی چہ غیر آں بہ پایہ بالاتر می رسانند، اما صوبۂ اودھ و الٰہ آباد خصوصیتے دارد کہ در ہیچ صوبہ نہ تواں یافت، چہ تمام صوبہ اودھ و اکثر صوبہ الٰہ آباد بہ فاصلۂ پنج کردہ نہایت دہ کردہ تخمیناً آبادیِ شرفا و نجباست کہ از سلاطین و حکام وظائف و زمین مدد معاش داشتہ اند، و مساجد و مدارس و خانقاہات بنا نہادہ و مدرسانِ عصر در ہر جا ابوابِ علم بہ روئے دانش پژوہاں کشادہ، و صلائے اطلبوا العلم در دادہ و طلبۂ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند، و ہر جا موافقت دست بہم داد بہ تحصیل مشغول می شوند، و صاحبِ توفیقاں ہر معمورہ طلبۂ علم را نگاہ می دارند و خدمت ایں جماعت را سعادتِ عظمٰی می دانند، صاحبقرانِ ثانی شاہ جہاں انار اللہ برہانہ می گفت ''پورب شیراز مملکت ما است'' و تا حدود ۱۱۳۰ھ ثلاثین و مایۃ و الف ہنگام علم و علماء دریں گل زمین گرمی داشت'' تا آنکہ برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبۂ اودھ شد، و اکثر بلاد عمدہ صوبۂ الٰہ آباد نیز مثل دار الخیر جون پور و بنارس و غازی پور و کڑہ مانک پور و کوڑہ جہان آباد وغیرہا ضمیمۂ حکومت گردید و وظائف و سیور غالات خانوادہ ہائے قدیم و جدید یک قلم ضبط شد، و کارِ شرفاء و نجبا بہ پریشانی کشید، و اضطرار معاش مردم آنجا را از کسب علم با

زداشتہ در پیشۂ سپاہ گری انداخت ورواج تدریس وتحصیل باں درجہ نہ ماند، مدار سے کہ از عہد قدیم معدنِ علم وفضل بود یک قلم خراب افتادوانجمن ہائے ارباب کمال بیشتر برہم خوردإِنَّا لله وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ وبعدارتحال برہان الملک نوبت حکومت بہ خواہرزادۂ اوابوالمنصور خاں صفدر جنگ رسیدو وظائف واقطاعات، بہ دستور زیر ضبط ماندودراواخرعہد محمد شاہ ۱۱۵۹ھ تسع وخمسین ومایۃ والف صوبہ داری، الہ آباد نیز بہ صفدر جنگ مقرر شدو تتمۂ وظائف آں صوبہ کہ تا حال از آفتِ ضبط محفوظ ماندہ بود بہ ضبط در آمدودرعہد احمد شاہ صفدر جنگ، بہ پایۂ وزارت اعلیٰ صعودنمود، ونائب صوبہ کار برار باب وظائف تنگ و ترگرفت، وتاحین تحریرکتاب ایں دیار پامالِ حوادثِ روزگاراست، لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا ، باوجودایں خرابیہارواجِ علم خصوص معقولات بہ کیفیتے کہ آنجاں است درقلمروہندوستان ہیچ جانیست، ہنوزعلمائے فحول جلوہ طرازند، وبہ وصول اقصیٰ مراتب کمال ممتاز مصرع

''باصد جہاں کدورت بازایں خرابہ جائے است'' (ماثر الکرام آزاد صفحہ۲۲۱)

بنگالی مورخ مسٹرلا اپنی کتاب ''ترقی تعلیم ہند بہ عہد مسلمانان'' میں لکھتا ہے:

''تذکرۃ العلما اور سیر الملوک میں جن کے اقتباسات تذکرہ میں موجود ہیں، اس شہر کے متعلق دل چسپ تفصیلات ہیں، جن سے نہ صرف وہاں کے علماء اور طلبہ کی نجی زندگی، بلکہ دوسرے حالات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ جب سے اس شہر کی بنیاد ڈالی گئی، ہندوستان کے تمام حصے خصوصاً صوبۂ اودھ اور الہ آباد کے لوگ یہاں تحصیل علم کے لیے جمع ہوتے تھے، سلطان ابراہیم شرقی کے عہد میں یہ شہر اس کا پایۂ تخت ہوا، اس وقت یہاں سیکڑوں مدرسے اور مسجدیں تھیں، طلبہ اور اساتذہ کو جاگیریں ملتی تھیں تاکہ وہ تمام مادی ضرورتوں سے بے فکر ہوکر علم وفن میں مشغول رہیں، ہمایوں کی حکومت میں بھی جون پور علم وفن کے مرکز کی حیثیت سے مشہور رہا، اس کی شہرت جہاں گیر اور شاہ جہاں کے زمانہ میں بھی قائم رہی، شاہ جہاں نے تو اس کو شیرازِ ہند کا نام عطا کیا، بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ کے عہد تک یہ دستور تھا کہ دہلی کے فرماں روا جون پور کے حاکم کے پاس برابر فرامین بھیجا کرتے تھے کہ وہ شہر کے اساتذہ اور طلبہ کی طرف سے اپنے فرائض میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں، جون پور کے واقعہ نگار ہر مدرسہ کی روداد احتیاط سے مرتب کیا کرتے تھے، اگر روداد سے کسی مدرسہ کی کوئی احتیاج معلوم ہوتی تو امداد دی جاتی، شہزادے اور امراجب اس شہر سے گزرتے تو یہاں کے مدرسوں کا معائنہ کرتے اور سلاطین دہلی کو

خوش کرنے کے لیے ان کو عطیے دیتے، ۱۱۴۷ھ/ ۱۷۳۵ء میں نواب سعادت خاں نیشاپوری اودھ، بنارس اور جون پور کا صوبہ دار مقرر ہوا، ایک بار وہ اس شہر میں آیا، لیکن یہاں کے علماء اس سے ملنے نہیں آئے، جس سے اس نے اپنی اہانت محسوس کی، انتقاماً اُس نے ان کی تمام جاگیریں اور وظائف ضبط کر لینے کا حکم جاری کر دیا، حکم کی تعمیل ہوئی، جس کے بعد جون پور پر ادبار آ گیا، طلبہ اور اساتذہ منتشر اور مدرسے خالی ہو گئے، ۱۱۸۷ھ (۱۷۷۴ء) میں نواب آصف الدولہ نے مختار الدولہ کی مرضی کے مطابق ان جاگیروں کو واپس کرنے کا حکم دیا، لیکن ایلچ خاں نے احتجاج کیا، اُسی زمانہ میں جون پور انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا۔ (پرموشن آف محمڈن لرننگ از ان، ان لا ۴۱-۱۰۲،۳)

اس کے بعد ارکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے حوالہ سے وہ کہتا ہے:

''وارن ہیسٹینگز نے شاید اس شہر کا معائنہ کیا تھا، سرائر کوٹ تو اس شہر میں ضرور آیا، ۱۷۸۸ء میں ڈنکن کی آمد کا ذکر روداد (PROCEEDINGS) کی ان جلدوں میں موجود ہیں، جو بنارس کے کلکٹر اور کمشنر کے کاغذات کی الماریوں میں سڑ گل رہی ہیں، وہ اس شہر کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتا ہے، اس کے زوال پر افسوس کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں کے علوم و فنون کا مرکز اور اربابِ علم کا مستقر تھا، اسی لیے اُس کو ہندوستان کا شیراز کہتے تھے۔''

یہاں کے مدارس کی گزشتہ شہرت کے قصوں کے سوا اور کوئی نشان باقی نہیں رہا ہے، لیکن مسٹر ڈنکن کے مذکورۂ بالا بیان کے علاوہ اور بھی بہتر اسباب موجود ہیں، جس کی بنا پر ہم اس شہر کو ہندوستان کا شیراز یا ازمنۂ وسطیٰ کا پیرس کہہ سکتے ہیں، فیروز شاہ نے اپنے بھائی کی شہرت اور عظمت کے مطابق اس کو علوم و فنون کا مرکز بنانا چاہا، جون پور کے ہر حکم راں نے فنون کی سرپرستی کرنا اپنے لیے باعث افتخار سمجھا، چودھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں شاہی پایۂ تخت میں جب ہنگامے شروع ہوئے، تو شہر کے علما اور فضلا منتشر ہو گئے، اسی زمانہ میں جون پور کی پُر امن اور پُر سکون فضا میں علوم و فنون کا فروغ ہوا، محمد شاہ کے عہد میں بھی جون پور میں مشہور مدارس تھے، اب ان کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں، ان مدارس میں سے ایک کے بانی کا انتقال پندرہویں صدی کے وسط میں اور دوسرے کا سترہویں صدی کے وسط میں ہوا، یہاں صرف مدارس کے علوم ہی کا فروغ نہیں ہوا، بلکہ ابراہیم اور حسین کی مساجد فن تعمیر کی ترقی کی بھی شہادت دیتی ہیں۔ (ارکیالوجیکل سروے آف انڈیا، جلد اول (جون پور کی شرقی تعمیرات) از فوہرر (۱۸۸۹ء ص ۲۱، ۲۲)

بہ ہر حال ان سیاسی و مذہبی حوادث کے طوفان میں بھی علم و فضل کی وہ شمعیں روشن رہیں جن کی روشنی شاہانہ عنایتوں کے چشمۂ نور سے مستعار نہ تھی، اس زمانہ میں پورب کا خطہ اور خصوصیت کے ساتھ جون پور اور غازی پور کے اطراف میں ایسی ممتاز ہستیاں تھیں، جن کے بوریائے فقر کی بلندی مسندِ شاہی سے کم نہ تھی، جیسے مولانا محمد احسن چریاکوٹی شاگرد ملا نظام الدین فرنگی محلی، شاہ ابوالغوث گرم دیوان ساکن بھیرا (اعظم گڑھ) المتوفی ١١٧٨ھ و مولانا شاہ محمد علی بھیروی نبیرۂ شاہ ابوالغوث گرم دیوان (اعظم گڑھ) شاگرد ملا بحر العلوم، ملا باب اللہ جون پوری شاگرد ملا حمد اللہ سندیلوی، شاہ نثار علی جون پوری المتوفی ١٢١٥ھ شاگرد شاہ ولی اللہ دہلوی، مولوی کرامت اللہ چریاکوٹی شاگرد میر عسکری جون پوری و ملا حمد اللہ سندیلوی، شاہ محمد افضل غازی پوری الہ آبادی، المتوفی ١١٢٤ھ، ملا محمد ماہ دیوگامی (اعظم گڑھ) شاگرد ملا رکن الدین بہریابادی و دیوان عبدالرشید جون پوری، قاضی خوب اللہ جون پوری المتوفی ١١٠٠ھ، قاضی حسن سعید خاں جون پوری المتوفی ١١٥٧ھ، مولانا میر محمد عسکری شیعی المتوفی ١١١٩ھ، مولوی عبدالقادر سوگھر پوری، اعظم گڑھ، المتوفی ١٢١٢ھ، مولانا غلام حسین جون پوری مصنف جامع بہادر خانی المتوفی ١٢٠٥ھ، ملا ابوالخیر بن قاضی ثناء اللہ (ساکن اٹاوہ پرگنہ منڈیاہو، ضلع جون پور) وغیرہ

دلی کے آخری خانوادۂ علم کا اثر پورب پر آخری زمانہ میں جب دلی میں تیموریوں کا چراغ گل ہو رہا تھا، رشد و ہدایت کا ایک نیا آفتاب طلوع ہوا، جس کی روشنی سے سارا ہندوستان جگمگا اٹھا اور دلوں میں علم و فن کی خدمت کا نیا ولولہ پیدا ہوا، دلی کے خانوادہ میں اس وقت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ١١٧٦ھ کے صاحب زادہ شاہ عبدالعزیز صاحب المتوفی ١٢٣٩ھ اور ان کے بھائیوں اور عزیزوں کا دور تھا، دور دور سے طلبہ دلی آتے تھے اور عقل اور نقل کے چشموں سے سیراب ہو کر واپس جاتے تھے، شاہ ولی اللہ صاحب کا خانوادہ شاہ عبدالرحیم صاحب کے ذریعہ معقولات میں میر زاہد ہروی کا اور حدیث میں شاہ ولی اللہ صاحب کے واسطہ سے مدینہ منورہ کے علما اور محدثین سے فیض یاب تھا اور مرج البحرین کا یہی رنگ نکھر کر ان کے اخلاف میں نمایاں تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب ١٢٤٢ھ، شاہ رفیع الدین صاحب ١٢٤٩ھ، شاہ عبدالغنی صاحب اور ان کے اخلاف میں شاہ محمد اسحاق صاحب المتوفی ١٢٦٢ھ نواسۂ شاہ عبدالعزیز صاحب اور مجددی خاندان کے ایک اور بزرگ شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی کے دم سے نئی رونق پیدا ہوئی، اور وقت آیا کہ ہندوستان میں اسلام کا چہرہ ان

تمام بدعات وخرافات کے داغ سے پاک ہو جو جہالت اور غیر قوموں کے میل جول سے پیدا ہو گیا تھا، تیرہویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں شاہ صاحب کے خاندان میں دو نئے مجتہد الوقت پیدا ہوئے، مولانا اسماعیل صاحب شہید دہلوی (۱۲۴۳ھ) اور مولانا عبدالحیٔ صاحب دہلوی، مولانا شاہ اسماعیل شاہ ولی اللہ صاحب کے پوتے اور شاہ عبدالغنی صاحب کے بیٹے تھے، اور شاہ عبدالحیٔ صاحب المتوفی ۱۲۴۳ھ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے داماد اور امام الزماں مولانا سید احمد شہید رائے بریلوی کے مرید اور داعی تھے۔

اس دو آتشہ تحریک نے جو عوام میں وہابیت کے نام سے مشہور ہے، مسلمانوں میں مراسم شرک، غیر شرعی رسم ورواج اور بدعات کے مٹانے میں بڑا کام کیا، ان بزرگوں کے شاگرد اور شاگرد کے شاگرد سارے ملک میں پھیل رہے تھے، جس سے پورب کا خطہ خاص طور سے متاثر تھا، خاص جون پور اور اس کے اطراف میں متعدد بزرگ اس نیک کام میں لگے ہوئے تھے۔

۱-مولوی سید کرامت علی جون پوری نے اپنے لیے بنگال کے علاقہ کو پسند کیا اور یہ کہنا بے جا نہیں کہ بنگال میں اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی اصلاح کا کام ان سے بڑھ کر کسی نے انجام نہیں دیا، اردو فقہ میں مفتاح الجنۃ ان کی مشہور کتاب ہے، ۱۲۹۰ھ میں وفات پائی، اس خاندان کے اخلاف نسلاً بعد نسلٍ اب تک اس فرض کو کسی نہ کسی طرح انجام دے رہے ہیں۔

۲- مولانا محمد فصیح صاحب غازی پوری جو شاہ افضل سید پوری غازی پوری الہ آبادی کے پڑ پوتے تھے، بنارس میں حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ اور مولانا اسماعیل شہید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فیض حاصل کیا، بہار، بنارس اور اعظم گڑھ وغیرہ میں ان کے ذریعہ دین کی خدمت ہوئی، ۱۲۸۵ھ میں وفات پائی، شاہ امانت اللہ صاحب فصیحی غازی پوری، ان کے بیٹے اور شاہ ابوالخیر صاحب فصیحی غازی پوری ان کے پوتے تھے۔

۳- مولانا سخاوت علی صاحب جون پوری، منڈیاہو ضلع جون پور کے رہنے والے تھے، حضرت شیخ محمد کوفی ظفر آبادی کی اولاد میں تھے، مولانا فضل رسول صاحب بدایونی اور مولانا احمد اللہ انامی شاگرد مولانا شاہ اسحاق دہلوی اور دوسرے بزرگوں سے پڑھا اور آخر مولانا اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحیٔ صاحب دہلوی سے علوم کی تکمیل کی کچھ دنوں باندہ میں نواب باندہ کے ہاں رہے، آخر جون پور

آ کر طرحِ اقامت ڈالی اور درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا، کچھ دنوں کے بعد حجاز تشریف لے گئے اور وہیں حج وزیارت کے بعد ۱۲۴۷ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذاتِ بابرکات سے پورب کے خطہ میں بڑا فیض پھیلایا، سینکڑوں علما آپ کے درس سے کامل ہوکر نکلے اور دور دور تک دین کے اثر کو وسیع کیا، بدعات کو مٹایا اور علمِ دین کو رواج بخشا، اس بابرکت فیض سے اعظم گڑھ کے اس طبقہ میں بھی جس میں اب تک عربی اور مذہبی تعلیم کا رواج نہ تھا (یعنی اعظم گڑھ کی نومسلم برادری) عربی تعلیم کا خیال پیدا ہوا اور آپ ہی کی تحریک سے جون پور میں منشی امام بخش صاحب نے مدرسہ کی بنیاد ڈالی، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

ان کے مشاہیر تلامذہ میں حسب ذیل نام قابلِ ذکر ہیں، مولانا خواجہ احمد نصیر آبادی، مولانا رجب علی جون پوری، مولانا کرامت علی جون پوری، مولانا شیخ محمد مچھلی شہری، مولانا سید محمد یعقوب دیسوی بہاری، مولانا مصطفیٰ شیر بہاری[1]، مدرس مدرسۂ خانقاہ سہسرام، مولانا شجاعت حسین بہاری، مولانا ولی محمد صاحب سکروری (اعظم گڑھ) مولانا محمد عمر غازی پوری، مولانا فیض اللہ مئوی اعظم گڑھی، (استاذ مولانا شبلی مرحوم) مولانا رحیم اللہ ساکن بستی وغیرہ۔

اہل حدیث اور خالص حنفی دہلی کے اس خانوادہ کے فیض تعلیم سے دو اہم سلسلے چلتے ہیں، ہندوستان میں اب تک ترکستان وخراسان کے اثر سے صرف فقہ حنفی کا رواج تھا، عرب سے خال خال شافعی آتے تھے، مگر ان کا اثر سواحل تک محدود تھا، اکبر اور جہاں گیر کے زمانہ میں جب سمندر کی طرف سے عربوں کی آمد ورفت کا دروازہ کھلا تو ہندوستان اور عرب میں علمی تعلقات کا آغاز ہوا، چنانچہ شیخ بہلول حضرت مجدد الف ثانی کے شیخ الحدیث[2] اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی اس فیض کو وہیں سے لائے، اس سے حنفیت کے غلو کے ساتھ حدیث وسنت کی پیروی کا خیال دلوں میں پیدا ہوا، شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے جب عرب کا سفر کیا اور مختلف مذاہب کے علما سے فیض پایا تو ان کا مشرب زیادہ وسیع ہوگیا، عملاً گو حنفی ہی رہے، مگر نظری اور علمی حیثیت سے وہ مجتہدانہ شان رکھتے تھے، اس شان کا علانیہ جلوہ ان کی مسوّی ومصفّٰی شروح موطا میں نظر آتا ہے، بانکی پور کے مشہور کتب خانہ میں صحیح بخاری کا ایک قلمی نسخہ ہے، جس پر شاہ صاحب کے ہاتھ کی ایک تحریر ہے، جس میں انہوں نے اپنے کو عملاً حنفی اور علماً

---

[1] یہ خاکسار کے دادا کے بھائی تھے۔ [2] زبدۃ المقامات۔

وتدریساً حنفی وشافعی لکھا ہے، اور اپنی بعض تالیفات میں قرأت فاتحہ خلف الامام اور رفع یدین کو ترجیح دی ہے، جو فقہ حنفی کے خلاف ہے۔

شاہ صاحب کے بعد یہ رنگ اور نکھر گیا، مولانا شاہ اسحاق صاحب، مولانا شاہ عبدالغنی صاحب، مولانا شاہ اسماعیل صاحب اور مولانا عبدالحیؒ صاحب دہلوی نے ردّ بدعت اور توحید خالص کی اشاعت میں جو جد و جہد فرمائی، اس نے دلوں میں سنت کی پیروی کا عقیدہ راسخ کر دیا، ان کے شاگردوں میں یہ دونوں رنگ الگ الگ ہو گئے، شاہ اسحاق صاحب کے نامور شاگردوں میں مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی مہاجر اور مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری ہیں، مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی کے ممتاز شاگرد مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہما اللہ (بانی مدرسہ دیوبند) ہیں اور پورب میں مولانا شاہ اسماعیل صاحب کے شاگرد مولانا سخاوت علی جون پوری وغیرہ ہیں، اس سلسلہ میں ردِّ بدعت اور توحید خالص کے جذبہ کے ساتھ حنفیت کی تقلید کا رنگ نمایاں رہا، مولانا شاہ اسحاق صاحب کے ایک دوسرے شاگرد مولانا سید نذیر حسین[1] صاحب بہاری دہلوی ہیں، اس دوسرے سلسلہ میں توحید خالص اور ردِّ بدعت کے ساتھ فقہ حنفی کی تقلید کے بہ جائے بہ راہِ راست کتب حدیث سے بہ قدر فہم استفادہ اور اس کے مطابق عمل کا جذبہ نمایاں ہوا اور اسی سلسلہ کا نام اہل حدیث مشہور ہوا۔

---

[1] مولانا سید نذیر حسین صاحب کی مولانا شاہ اسحٰق صاحب کی شاگردی کا مسئلہ بھی اہل حدیث واحناف میں مابہ النزاع بن گیا ہے، احناف انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو شاہ صاحب سے بے پڑھے صرف تبرکاً اجازہ حاصل تھا، اور اہل حدیث ان کو حضرت شاہ صاحب کا باقاعدہ شاگرد بتاتے ہیں، مجھے نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے مسودات میں مولانا نذیر حسین کے حالات کا مسودہ ملا، جس میں بہ تصریح مذکور ہے کہ ۱۲۴۹ھ میں شاہ صاحب کے درس حدیث میں وہ داخل ہوئے، عبارت یہ ہے، "ودرہمیں سال (سنۃ الف وماتین وتسع واربعین) حدیث شریف از مولانا محمد اسحٰق مرحوم ومغفور شروع فرمودند وصحیح بخاری وصحیح مسلم بہ شراکت مولوی محمد گل کابلی ومولوی عبید اللہ سندھی ومولوی نور اللہ سروانی وحافظ محمد فاضل سورتی وغیرہم حرفاً حرفاً خواندند وہدایہ وجامع صغیر بہ معیت مولوی بہاء الدین دکھنی وجد امجد قاضی محفوظ اللہ پانی پتی ونواب قطب الدین خاں دہلوی وقاری اکرام اللہ وغیرہم، وکنز العمال ملا علی متقی علیحدہ شراع فرمودند ودوسہ جز خواندند وسنن ابی داؤد وجامع ترمذی ونسائی وابن ماجہ وموطا امام مالک بتمامہا بر مولانا ممدوح عرض نمودند واجازۃ از شیخ الآفاق حاصل نمودہ، البتہ شاہ صاحب سے سند واجازت تحریری انہوں نے ۲ رشوال ۱۲۵۸ھ کو حاصل کی ہے، جب شاہ صاحب ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز جا رہے تھے۔

تیسرا فریق وہ تھا جو شدت کے ساتھ اپنی قدیم روش پر قائم رہا اور اپنے کو اہل السنۃ کہتا رہا، اس گروہ کے پیشوا زیادہ تر بریلی اور بدایوں کے علما تھے۔

مولانا سید نذیر حسین صاحب ﷫ کے ذریعہ سے اہل حدیث کے سلسلہ کو بڑی ترقی ہوئی، موصوف کے شاگردوں کا بڑا حلقہ تھا، انہوں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر اپنے طریقہ کی اشاعت کی، اُن کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں، پنجاب میں مولانا عبداللہ غزنوی، مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا محمد حسین بٹالوی اور مولانا عبدالمنان وزیرآبادی وغیرہ پورب کے خطہ میں مولانا امیر حسن سہسوانی، مولانا بشیر صاحب قنوجی، مولانا عبداللہ صاحب مئوی غازی پوری، مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی عظیم آبادی، مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی، مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی (دربھنگہ) مولانا سلامت اللہ صاحب جیراجپوری، اعظم گڑھی، اعظم گڑھ کے ضلع پر خصوصیت کے ساتھ مولانا فیض اللہ صاحب مئوی شاگرد مولانا سخاوت علی صاحب جون پوری، مولانا عبداللہ غازی پوری اور مولانا سلامت اللہ جیراج پوری کا زیادہ اثر پڑا، ملک میں اس سرے سے اس سرے تک ان تینوں فریقوں میں مدتوں مناظرہ کا بازار گرم رہا، یہی وہ مذہبی ماحول ہے جس میں مولانا شبلی مرحوم کی تعلیم وتربیت کا آغاز ہوا۔

پورب کے دو نئے مدرسے انگریزی عہد میں جب انگریزی عمل داری شروع ہوئی تو پورب میں پھر سے نئے مدرسوں کی بنیاد پڑی، جن میں سے بعض بعض نے بڑی شہرت پائی، ان میں سے دو ذکر کے قابل ہیں، مدرسۂ اسلامیہ امام بخش جون پور، اور مدرسۂ چشمۂ رحمت غازی پور۔

مدرسۂ اسلامیہ امام بخش جون پور جون پور میں منشی امام بخش ایک رئیس تھے، انگریزوں کی شروع عمل داری میں جب سررشتہ داری بڑی اہمیت رکھتی تھی، وہ غازی پور میں فوج داری کے سررشتہ دار تھے، اس سے بڑی نیک نامی اور دولت پیدا کی، مولانا سخاوت علی صاحب کی تحریک سے غالباً ۱۲۶۷ھ میں انہوں نے جون پور میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی[1]، ۱۲۷۸ھ میں انہوں نے اپنی تمام املاک کا چوتھائی حصہ وقف کر دیا اور بقیہ جائیداد اپنے بیٹے مولوی حیدر حسین صاحب وکیل ہائی کورٹ کے سپرد کر کے ہجرت کے قصد سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے، وہاں ایک ہی سال کے بعد ۱۲۷۹ھ میں وفات پائی، ان ہی مولوی حیدر حسین کے فرزند وجانشین نواب عبدالمجید خاں بیرسٹر مرحوم تھے، اور اب ان کے صاحب زادے اب سر محمد یوسف

[1] القول الجلی فی تذکرہ سخاوت علی۔

ہیں، مولوی حیدر حسین خاں نے اپنے والد کی وفات کے چودہ برس بعد ۱۲۹۲ھ میں انتقال کیا[۱]، مولوی حیدر حسین صاحب کے زمانہ میں پانچ سو ماہانہ مدرسہ کے مصارف کے لیے دیے جاتے تھے، مدرسہ میں دو مدرس تھے اور سو کے قریب طالب علم پڑھتے تھے[۲]۔

اس مدرسہ میں صدر مدرسی کی خدمت کے لیے مولانا سخاوت علی صاحب نے ۱۲۶۷ھ میں فرنگی محل کے نام ور عالم مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلی کا انتخاب کیا جو باندہ میں مولانا کے ساتھ رہتے تھے، اور جنہوں نے بہت کچھ مولانا سے کسب فیض کیا تھا[۳]، موصوف نو برس تک یہاں مدرس رہے، مولانا عبدالحیؒ صاحب مرحوم فرنگی محلی کا ابتدائی زمانہ بھی یہیں گزرا، ۱۲۷۶ھ میں مولانا عبدالحلیم صاحب لکھنؤ جا کر ۱۲۷۷ھ میں حیدرآباد گئے، اُن کی جگہ پر مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی جو مولانا عبدالحلیم صاحب کے استاد تھے، مدرسہ میں آئے، موصوف کے زمانہ میں مدرسہ کی دھوم دور دور پہنچی اور لایق و مستعد طلبہ کا ہجوم ہوا، ان ہی میں مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی ہیں جنہوں نے یہیں مفتی صاحب سے علوم و فنون کے سبق لئے اور مشہور روزگار ہوئے، مفتی صاحب نے چند روز کے بعد حجاز کا سفر کیا اور وہیں ۱۲۸۶ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی[۴]، موصوف کے حواشی بر ملاحسن و میرزاہد کے چند نسخے دارالمصنفین میں ہیں، جن میں سے ایک پر مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلی کے دست خط بتاریخ ۱۲۷۳ھ ثبت ہیں۔

---

[۱] مثنوی تذکرہ مہدی، ص ۹۵ جون پور [۲] ریاض جون پور، ص ۵۰ [۳] القول الجلی، فی تذکرہ مولانا سخاوت علی

[۴] مولانا فاروق صاحب نے ۱۲۸۶ھ میں اپنے استاد کی مدح میں ایک مثنوی لکھی تھی اور ان کی خدمت میں پیش کی تھی، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

دلم در شوق زلفش نالہ ساز است — چہ می نالم غم زلفش دراز است

آگے چل کر ہے:

جناب اوستاد کعبۂ جاہ — دلیل راہ مردان حق آگاہ

چہ یوسف مصر معنی را عزیزے — نیرزد ملک جم پیشش بہ چیزے

ادب گیرد بہ بستانش ارسطو — بہ پیشش بو علی تہ کرد زانو

تاریخ علمائے ہند، ص ۲۰۹۔

اس مدرسہ کے آخری نامور مدرس مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب رام پوری شاگرد مولانا فضل حق خیر آبادی تھے، جن کے فضل وکمال کے آوازہ سے ابھی تک ہندوستان پرشور ہے، ۱۸۷۰ء میں مدرس ہوئے، ان کے لایق شاگردوں میں مولانا شیر علی صاحب، مولانا احسن صاحب بہاری، مولانا سلیمان اشرف صاحب بہاری، مولانا لطف الرحمٰن صاحب بردوانی وغیرہ تھے، مولانا شبلی نے بھی چند روز ان سے پڑھا تھا اور ان سے راہ ورسم رکھتے تھے، ۱۹۰۸ء میں وفات پائی۔

مولوی لطف الرحمٰن صاحب بردوانی ۱۸۸۲ء میں مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے تھے، جب یہ خبر مولانا شبلی کو معلوم ہوئی تو اپنے ایک شاگرد کو جو جون پور میں پڑھتا تھا اور جس نے یہ خبر دی تھی، لکھا "از نامہ ات بحال مدرسہ دلم بہ درد آمد کہ سپہر دوں لطف الرحمٰن وغیرہ را بہ کارِ تعلیم وتعلّم گماشتہ است، آوخ از دست فلک کہ ہماں جائے از افادتِ مفتی محمد یوسف صاحب اکنوں ایں شعر برزبان حال وارد"

از ہجوم چند در ویرانۂ ما جا نماند — آں قدر آباد شد آخر کہ ما می خواستم

(۵رنومبر ۱۸۸۲ء)

مدرسۂ چشمۂ رحمت غازی پور | فرنگی محل کے آسمان کا ایک ستارہ غازی پور میں طلوع ہوا، نام مولانا رحمت اللہ صاحب تھا، جو چار واسطوں سے ملّا قطب الدین سہالوی کے سلسلۂ اولاد میں تھے، اپنے چچا ملّا ظہور اللہ سے تعلیم پا کر غازی پور میں قیام کیا اور چشمۂ رحمت کے نام سے وہاں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور درس وتدریس میں مصروف ہوئے، ۱۳۰۵ھ میں وفات پائی، مشہور اردو شاعر شمشاد لکھنوی فرنگی محلی، المتوفی ۱۹۱۷ء یہیں کے استاد تھے، جن کا ذکر مکاتیب شبلی کے ایک نامہ فارسی میں ہے، اس مدرسہ کے دوسرے مشہور استاد مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی اور مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری (شاگرد مولانا رحمت اللہ صاحب فرنگی محلی ومفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی ومولانا فاروق صاحب چریا کوٹی ومولانا نذیر حسین صاحب دہلوی) ہیں، ایک زمانہ میں اس مدرسہ کی بڑی دھوم تھی، پورب کے اچھے اچھے طلبہ نے یہاں پڑھ کر فراغ حاصل کیا اور فروغ پایا، مدرسہ اب تک چل رہا ہے، مگر اب اس کی شہرت اگلی سی نہیں۔

اعظم گڑھ اور اس کے اطراف

اعظم گڑھ ایک نئی آبادی ہے، البتہ اس کے اکثر مردم خیز قصبات پرانے ہیں اور پہلے وہ جون پور میں شمار ہوتے تھے، اس لیے موجودہ ضلع اعظم گڑھ کے اکثر اگلے مشاہیر جون پوری مشہور ہوئے، اس زمانہ میں سرکار جون پور کی وسعت آج کل سے مختلف تھی۔

سرکارِ جون پور کا رقبہ اس موقع پر ایک اصطلاحی غلطی کا دور کرنا ضروری ہے، مغلوں کے زمانہ میں سرکاروں کی جو تقسیم تھی، وہ موجودہ انگریزی تقسیم سے بالکل الگ تھی، آئینِ اکبری کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں سرکار جون پور کا رقبہ موجودہ فیض آباد کی سرحد سے لے کر موجودہ غازی پور کے حدود تک پھیلا تھا، جس کو آج کل اضلاعِ مشرقی کہتے ہیں، سرکار جون پور اس زمانہ میں ۴۱ محال یعنی پرگنوں پر منقسم تھی، ان پرگنوں کے قصبوں کے جو نام آئینِ اکبری میں گنائے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ پورا ضلع اعظم گڑھ اور موجودہ ضلع بلیا کا پرگنہ سکندر پور، غازی پور کے پرگنے شادی آباد اور بھتری اور فیض آباد کے پرگنے چاندی پور، بڑہڑ، ٹانڈہ اور سرہرپور سب سرکار جون پور میں داخل تھے، یہی سبب ہے کہ ان مقامات کے اکابر اور مشاہیر باہر کی دنیا میں جون پوری ہو کر رونما ہوئے۔

اعظم گڑھ اعظم گڑھ کا ضلع گو انگریزی عہد میں پیدا ہوا ہے، مگر اس کا نام ونشان بہت پہلے سے ملتا ہے، اعظم گڑھ کے کھلے ہوئے دو حصے ہیں، ایک حصہ میں اکثر راجپوتوں یا دوسرے نومسلموں کی آبادی ہے، دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ خاندان آباد ہیں جن کے آباو اسلاف دوسرے اسلامی ملکوں یا شہروں سے ہجرت کر کے یہاں آئے، یا آباد ہوئے، اس دیار کی زبان میں ان بزرگوں کو ملکی کہا جاتا ہے۔

اعظم گڑھ کے نومسلم خاندان نومسلم خاندانوں میں جو وقتاً فوقتاً اسلام کے خلعت سے سرفراز ہوتے رہے، دو قومیں پیدا ہوئیں، ایک وہ لوگ جو اپنی اصل ونسل میں بالکل خالص رہے، ان میں قابل ذکر اعظم گڑھ کے راجاؤں اور سدھاری متصل اعظم گڑھ کے بابوؤں کے خاندان ہیں، اور جو اب تک اسی طرح بے میل مسلمان راج پوت ہیں، دوسری قوم وہ ہے جو مغلوں، پٹھانوں، شیوخ اور دوسرے خاندانوں میں شادی بیاہ کرنے لگی، ان کو عرف عام میں عام طور پر روتارہ کہتے ہیں، جو حقیقت میں اصل ہندی لفظ راوت کی خرابی ہے، یہ راوت لفظ پہلے راج پوتوں کے لیے بولا جاتا تھا اور اب بھی کہیں

کہیں بولا جاتا ہے، امیر خسرو دہلوی قران السعدین میں کہتے ہیں ع راوتِ ژوپیں زن وخاراشگاف
(ص ۲۶ مطبوعہ علی گڑھ) مرہٹی میں راوت سوار سپاہی کو کہتے ہیں، اور وہ بہت سے خاندانوں کا سرنام ہے۔

اعظم گڑھ | گڈھ ہندی لفظ ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں، ہندوستان کے اکثر وہ شہر جن کے نام کا آخری جز گڑھ ہے، ان کی آبادی کا آغاز درحقیقت کسی فوجی آبادی سے ہوا، یعنی کسی زمین دار یا رئیس نے اپنے اور اپنی رعایا کے لیے کوئی گڑھ بنایا اور اس کو اپنے نام کی طرف منسوب کر دیا، اعظم گڑھ بھی اسی قسم کا شہر ہے، راجہ اعظم جن کے نام کی طرف یہ نسبت ہے، اعظم گڑھ کے مسلمان راج پوت راجاؤں میں سے تھے، اس راجہ کا خاندان یہاں اب بھی موجود ہے، اور اس کا قلعہ عرف عام میں کوٹ (قلعہ) کہلاتا ہے اور اس کے آس پاس کی آبادی کا نام محلّہ کوٹ ہے۔

اعظم گڑھ کا بانی | روایت یہ ہے کہ جہاں گیر کے زمانہ میں اس خاندان کا مورث اعلیٰ آگرہ جا کر مسلمان ہو گیا، جہاں گیر نے اس کی بڑی قدر کی اور دولت خاں کے خطاب سے اس کو سرفراز کیا اور چوبیس پرگنوں کی ریاست بھی عطا کی، یہ ۲۴ پرگنے زیادہ تر موجودہ اعظم گڑھ میں واقع تھے، تزک جہاں گیری کے سال چہارم میں دولت خاں نام ایک امیر کا ذکر موجود ہے، شہنشاہ لکھتا ہے ''دولت خاں بفوجداری صوبہ الہ آباد وسرکار جون پور تعین یافتہ بود آمدہ ملازمت نمود بر منصب او کہ ہزاری بود پانصدی افزودہ شد''
(تزک جہاں گیری جشن ہفتمیں نوروز)

اس خاندان میں ایک شاہی فرمان بہ طور یادگار باقی تھا، جس کی نقل شروع انگریزی عمل داری میں شامل مسل ہو کر ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں محفوظ ہے، اس فرمان کی اصل عبارت یہ ہے:

''دریں وقت میمنت اقتران فرمان والا شان واجب الاذعان صادر شدہ کہ ابھمن سنگھ زمین دار مینہ نگر، نظام آباد از بندہ مقبول بارگاہ والا جاہ بدین اسلام در آمدہ نظر بر استحقاق بہ خطاب راجہ نادر دولت خاں ممتاز شدہ بست ودو پرگنہ از صوبہ الہ آباد ابتداء نیسیاں خریف سنا تو ئیل حسب الضمن مرحمت فرمودیم باید کہ فرزندانِ نامدار کامدار والا تبار وزرائے ذوی الاقتدار وحکام کرام وعمال کفایت فرجام ومتصدیان مہمات دیوانی ومتکفلان معاملات سلطانی وجاگیرداران حال واستقبال ابداً موبداً دراستقرار واستمرار ایں حکم مقدس ومعلی کوشیدہ بر زمین داری پرگنات بہ خطاب مذکورہ نسلاً بعد نسل وبطناً بعد بطنٍ خالداً ومخلداً بحال وبرقرار داشتہ بہ زرہائے مشخص مال واجب سرکار مبلغ یک لک وبست وپنج ہزار روپیہ نانکسار بر قبولیت

مجرا دادہ باشند کہ مع سرحد وسردیہہ وغیرہ ابواب زمین داری صرف معیشت خود پرواز دواز تصادم تغیر وتبدل این امر مقدس مصون ومحروس دانستہ سند مجدد نہ طلبند از یرلیغ کرامت تبلیغ والا انحراف نہ دارند" (یازدہم شہر ربیع الآخر سنہ چہارم جلوس فقط)

پشت پر ضمنی عبارت یہ ہے "بر کتاب حسب ضمنی بست و دو پرگنہ نافکار یک لک ۲۵ ہزار پرگنہ نظام آباد، پرگنہ کوڑیہ، پرگنہ تلہنی، پرگنہ گوپال پور، پرگنہ سگڑی، پرگنہ محمد آباد گوہنہ، پرگنہ گھوسی، پرگنہ چکسیر، پرگنہ نتھوپور، پرگنہ چریا کوٹ، پرگنہ قریات متھوپور، پرگنہ بلہا بانس، پرگنہ دیوگاؤں، پرگنہ مئو ناتھ بھنجن، پرگنہ شادی آباد، پرگنہ بہری آباد، پرگنہ پچوتر، پرگنہ سید پور بھتری، پرگنہ ظہور آباد، پرگنہ بھوداؤں، ابواب زمین داری سی صد و یک روپیہ"۔

یہ جن پرگنوں کے نام لکھے ہیں ان میں سے اکثر اب اعظم گڑھ میں اور کچھ غازی پور میں ہیں۔

راجہ دولت خاں مینہ نگر میں لا ولد فوت ہوگئے، وہیں ان کی قبر ہے، وہ اپنے بعد اپنے ہندو بھتیجے ہربنس کو ریاست کا مالک بنا گئے تھے، آگے کے سلسلہ میں ایک نام وربکر ماجیت نامی ہوا جس نے پھر اسلام قبول کیا، اس کے دو بیٹے ہوئے، اعظم خاں، اور عظمت خاں، اعظم خاں نے ۱۶۶۵ء میں اعظم گڑھ کی بنیاد ڈالی اور عظمت خاں نے اپنے نام سے عظمت گڑھ بسایا جو اب تک اسی نام سے اسی ضلع میں آباد ہے۔

جب سرکار جون پور میں اودھ کی نوابی قائم ہوئی تو اعظم گڑھ کے راجوں اور اودھ کے نوابوں میں کئی دفعہ لڑائیاں ہوئیں۔

عظمت خاں کے بیٹے مہابت خاں بڑے دبدبہ کے راجہ ہوئے، مدھوبن پرگنہ گھوسی سے لے کر پرگنہ اترولیا، ضلع گورکھپور تک ان کی حکومت قائم ہوئی، آخر نواب سعادت علی خاں سے لڑ کر گورکھپور میں قید ہوئے، جہاں ۱۷۳۱ء میں وہ فوت ہوگئے، ان کے بیٹے ارادت خاں نے صفدر جنگ نواب اودھ کے مقابلہ میں نواب احمد خاں بنگش والی فرخ آباد کی مدد کی۔

۱۷۶۵ء میں ارادت خاں کی جگہ اس کا بیٹا جہان خاں ریاست کا مالک بنا، لیکن ارادت خان کے رہتے ہی جہان خاں کے چچا جہاں گیر خاں کے بیٹے اعظم خاں ثانی نے ریاست پر قبضہ کرنا چاہا اور آخر ناکام رہ کر جون پور میں پناہ لی، جہاں خاں اور نواب اودھ کے عامل نظام آباد کے درمیان ۱۷۶۱ء میں لڑائی ہوئی، جس میں دونوں مارے گئے، اور فضل علی خان حاکم غازی پور نے اس پر قبضہ کرلیا۔

محمد آباد گوہنہ (ضلع اعظم گڑھ) میں حضرت غلام فرید صاحب فاروقی ایک فاضل اجل اور خدارسیدہ بزرگ تھے، جب فضل علی خاں نے اعظم گڑھ پر قبضہ کیا تو موصوف کو بڑی تمناؤں سے لکھا کہ آپ تشریف لائیں اور اس خطہ کی حکومت قبول فرمائیں، انہوں نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا۔

بیچارہ خر آرزوے دُم کرد نایافتہ دم دو گوش گم کرد

آخر فضل علی خاں تین برس کے بعد غازی پور اور اعظم گڑھ دونوں سے الگ کر دیے گئے[1]۔

شجاع الدولہ نے جب ۱۷۶۴ء میں بکسر میں انگریزوں کے مقابلہ میں شکست کھائی تو اعظم خاں ثانی نے اپنی موروثی جائداد پر قبضہ کرلیا، یہ اعظم خاں ہندی کا شاعر تھا، "سنگار درپن" اس کی ہندی کی تصنیف ہے، ۱۷۷۱ء میں وفات پائی، اس کے درباری شاعر برجو مصرا نے اعظم خاں کی تعریف میں اعظم خانی ستاسائی لکھی، جس کے صلہ میں شاعر نے ۱۱۷۹ھ/۱۷۷۱ء میں راجہ کے بھائی جہاں یار خاں سے ۵۲ بیگہہ زمین انعام میں پائی، اس کے کچھ دنوں کے بعد نواب اودھ کے وزیر ایلچ خاں نے اس علاقہ کو جہاں یار خاں سے چھین کر نوابی میں شامل کرلیا، اور یہ اودھ کی حکومت کا ایک چکلہ (ضلع) بن گیا[2] اور نواب کی طرف سے ایک عامل رہنے لگا، نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں یہاں مرزا عطا بیگ خاں کابلی عامل تھے، لکھنؤ اور جون پور کے بیچ میں اعظم گڑھ کا علاقہ پڑتا تھا، اس لیے اعظم گڑھ کے عامل اس راستہ کی حفاظت کرتے تھے[3]، ۱۸۰۱ء تک یہ چکلہ دار یا عامل اس علاقہ پر حکومت کرتے رہے، نواب غازی الدین حیدر کے زمانہ کا ایک تاریخی پتھر اس وقت لکھنؤ کے عجائب خانہ میں رکھا ہے، اس میں حکومت کے تمام شہروں کے درمیان کا فاصلہ ریاضی کے قاعدہ سے کھدا ہے، اس میں لکھنؤ اور الہ آباد کے بعد تیسرا نام اعظم گڑھ کا ہے۔

---

[1] تجلی نور، ص ۹۶ میں تین برس کا تعین گزیٹیر میں ہے۔ [2] اعظم گڑھ ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۱۹۳۵ء، ص ۳۹ [3] محمد علی تمنا خلف خواجہ عبداللہ تائید عظیم آبادی اس زمانہ کے ایک نہایت مشہور و ممتاز ادیب و شاعر و مورخ تھے، ریاض المنشآت ان کے خطوط کا مجموعہ ہے، جس میں دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، مرشد آباد وغیرہ کے امرا اور رؤسا اور دوسرے ممتاز اشخاص کے نام خطوط ہیں، اس مجموعہ میں میرزا عطا بیگ خاں عامل اعظم گڑھ کے نام بھی ایک خط ہے، اس مجموعہ سے ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ امیر الدولہ نواب علی ابراہیم خاں عظیم آبادی نے اردو و فارسی کے جو تذکرے صحف ابراہیم وغیرہ لکھے ہیں وہ درحقیقت اسی مجموعہ کے مولف محمد علی تمنا کی محنت ہے، اس مجموعہ کا قلمی نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں ہے، اور حبیب گنج میں بھی ہے۔

۱۸۰۱ء میں جب یہ علاقہ انگریزی عمل داری میں شامل ہوا تو جہان خاں کے بیٹے نادر خاں کو جو یہاں کے عاملوں سے برسرِ پیکار رہتا تھا، تین سو ماہوار کی پنشن اور بارہ گاؤں کی زمین داری دے کر ضلع میں امن وامان قائم کیا، جہان خاں نے ۱۸۲۶ء میں انتقال کیا، ان کی جگہ ان کے بیٹے مبارک خاں نے لی، جن کو راجہ کا موروثی خطاب دوبارہ ملا، مبارک خاں نے ۱۸۵۸ء میں وفات پائی اور ان کے صاحب زادہ راجہ سلامت خاں مسند نشین ہوئے، راجہ صاحب گورنمنٹ اور عام پبلک میں نہایت مقبول تھے، مولانا شبلی مرحوم انہی کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے اور اکثر ان کا نام عزت سے لیتے تھے، ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔

اعظم گڑھ کے بعض مردم خیز قصبات اور دیہات | شاہ گنج سے جو شاہ عالم کے نام سے آباد ہے اور جو جون پور میں شامل ہے، دو فرلانگ آگے سے اعظم گڑھ کا ضلع شروع ہوجاتا ہے، شاہ گنج سے چند میل دور بہ سمت مشرق سرائے میر آتا ہے، جس نے حضرت میر[1] عاشقاں علیہ الرحمۃ کی نسبت سے سرائے میر کا نام پایا ہے، یہاں ان کا مزار اب تک یادگار ہے اور اب اس کی شہرت کا ذریعہ وہ مدرسہ اسلامیہ ہے جس کا نام مدرستہ الاصلاح ہے، جس کو ۱۹۰۸ء میں یہاں کے مسلمانوں نے قائم کیا تھا اور جس سے مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کو تعلق خاص رہا ہے۔

سرائے میر سے دس میل بہ جانب مشرق نظام آباد کا قصبہ ہے، یہ بہت سے علما و اہل اللہ کا مولد و مسکن رہا ہے، سنا ہے کہ دیوان عبدالرشید صاحب رشید یہ کا اصل وطن یہی تھا، حضرت میر عاشقاںؒ کے پیر حضرت شاہ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ شاہ قدن یہیں مدفون ہیں۔

سرائے میر سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر بینہ نگر ایک مقام ہے جو یہاں کی پرانی آبادی ہے اور جس میں پرانے قلعہ کے آثار اب تک نظر آتے ہیں، دوسری پرانی آبادی ماہل کی ہے، جہاں پرانے اشراف سکونت پذیر ہیں، سرائے میر سے متصل پھریہا نام ایک گاؤں ہے جہاں انصار کا ایک گھرانا آباد ہے، یہی گاؤں مولانا شبلی کا نانہال اور مولانا حمید الدین صاحب کا وطن ہے۔

اس کے بعد اعظم گڑھ کا شہر آتا ہے، اس کی مشرقی سمت میں دوسرے مشہور مواضعات اور قصبے ہیں، ان میں سب سے پرانا گھوسی کا قصبہ ہے، جہاں کے مولانا غلام نقشبند تھے، جو لکھنؤ میں قیام کے باعث لکھنوی مشہور ہوئے اور آج سے چالیس پچاس سال پہلے یہاں مولوی عبدالقادر صاحب نام ایک

---

[1] علی بن قوام نا۔ ۹۵۰ھ میں وفات پائی۔ ''س''

مشہور عالم اور زمین دار تھے، جن کو امامت کا دعویٰ تھا اور ہمیشہ گاڑھے کا عمامہ باندھتے اور گاڑھے کی عبا اور کپڑے پہنتے تھے اور اسی لیے ان کی شان میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلوی نے جو اعظم گڑھ میں زمانہ تک مہتمم بندوبست رہے تھے، عربی کا ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا آدھا مصرعہ مولانا شبلی مرحوم کی زبانی مجھے یاد رہ گیا ہے، ع تعمّم تقمّص وانتطق او تسربل موصوف کے پاس ایک عمدہ کتاب خانہ تھا، جواب بھی ان کے صاحب زادہ کے پاس ہے۔

انہی اطراف میں اعظم گڑھ کا دوسرا مشہور قصبہ چریا کوٹ ہے، قدیم آبادی ہے، ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس کا نام لیا ہے اور اس میں شیوخ اور راجپوتوں کی آبادی بتائی ہے، یہ غازی پور اور اعظم گڑھ کے بیچ میں واقع ہے، عباسی شیوخ جن کو قضا کی خدمت سپرد تھی، یہاں آباد تھے، اسی خاندان سے مولانا قاضی علی اکبر اور ان کے صاحب زادے مولانا عنایت رسول اور مولانا فاروق تھے، اعظم گڑھ اور چریا کوٹ کے بیچ میں مئو ناتھ بھنجن واقع ہے، جس کا حوالہ اعظم گڑھ کے راجاؤں کے شاہی فرمان میں ہے، کہتے ہیں کہ یہ قصبہ شہزادی جہاں آرا بنت شاہ جہاں کی جاگیر میں تھا، اسی لیے اس کا شاہی نام جہان آباد[1] رکھا گیا تھا، شہزادی نے اپنے شوق سے یہاں کپڑے بننے کے کاریگروں کو جمع کیا اور ایک جامع مسجد بنوائی جس کے چاروں طرف طلبہ کے حجرے تھے، اس قصبہ نے کپڑے کی کمال صنعت وحرفت کے ساتھ علم وفن کی خدمت بھی انجام دی، قدیم شاہی مسجد میں اب بھی ایک نیا مدرسہ مفتاح العلوم قائم ہے اور اس کے پرانے حجروں کی جگہ اب نئے حجرے بن رہے ہیں، اس قصبہ میں کثرت سے علماء پیدا ہوئے اور اب بھی ہیں، مولانا عبداللہ صاحب غازی پور کا اصل وطن یہی ہے۔

مئو اور اعظم گڑھ کے بیچ میں محمد آباد گوہنہ نام مشہور قصبہ ہے، حضرت مولانا غلام فرید صاحب جن کا ذکر اوپر گزرا، یہیں کے باشندے تھے، انگریزی عہد میں یہاں کے شرفا نے تعلیم پا کر اعلیٰ انگریزی عہدے حاصل کیے جن میں قابل ذکر ڈپٹی محمد کریم صاحب ہیں، جو علی گڑھ میں تقرر کے زمانہ میں سرسید کے رفقا میں تھے، اور دوسرا خاندان جسٹس سید عبدالرؤف صاحب کا ہے، اسی قصبہ سے متصل ولید پور کا قصبہ ہے، جہاں کے مولانا محمد کامل تھے، جو ۱۸۵۸ھ میں جون پور میں منصف مقرر ہوئے، اور بعد کو بستی وغیرہ اضلاع میں اس خدمت پر مامور ہوئے، ساتھ ہی صوفی کامل بھی تھے، مریدی کا بڑا حلقہ تھا، مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی کی پہلی شادی ولید پور میں انہی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔

---

[1] یہ نام ان فرامین میں ہے جو اس قصبہ کے لوگوں کے قبضہ میں اب تک موجود ہیں۔

محمد آباد کے قریب مبارک پور نام بڑا قصبہ ہے جو پرانے زمانہ سے پارچہ بافی کا مرکز ہے اور جہاں پچھلے زمانہ میں چند نامور علما پیدا ہوئے ہیں۔

حسب ونسب ومولد | اعظم گڑھ کی دوسری سمت میں ایک پرگنہ سگڑی ہے، یہ بھی قدیم آبادی ہے، آئین اکبری میں اس کا نام ہے اور اس کو راج پوتوں کا مسکن بتایا ہے، چناں چہ اب بھی اس علاقہ میں راج پوت آباد ہیں، اسی پرگنہ میں بندول کا قصبہ ہے، جس کو مولانا شبلی کے مولد بننے کا فخر حاصل ہے، مولانا نے اپنے اس مولد کی تعریف میں تفریحاً یہ شعر کہے ہیں:

فضل بندول اگر تو نہ شناسی — آدمی نیستی تو نسناسی
نہ تواں یافت ہیچ جائے چو او — خرم و سبز و دلکشائے چو او
ہست از غایت فرح بسرشت — مرغزارے مگر زباغ بہشت

مولانا کی پیدائش سے پہلے چاہے یہ بیان مبالغہ سے خالی نہ ہو مگر ان کی پیدائش کے بعد تو یہ یقیناً مبالغہ سے خالی ہے، اسی کے قریب بالکل ملی ہوئی خانقاہ نام قدیم شرفا کی ایک آبادی ہے، یہی وہ مقام ہے جو ڈپٹی خلیل صاحب اور ان کے صاحب زادہ جسٹس محمد خلیل صاحب (جج ہائی کورٹ الہ آباد) کا اصل مسکن ہے، اسی کے قریب جیراج پور بھی ایک آبادی ہے، جس میں متعدد علماء پیدا ہوئے جن میں سے ایک مولانا سلامت اللہ صاحب ہیں۔

خانقاہ میں غالباً صوفیائے کرام کا کوئی خاندان آباد تھا، جس کے سبب سے وہ خانقاہ کے نام سے مشہور ہوا، یہی وہ جگہ ہے جس کی مسجد کا ذکر مولانا کے قصیدۂ کشمیریہ میں ہے اور جس کے لیے اپنی جائداد متروکہ کے ایک حصہ کی وصیت اس میں لکھی تھی۔

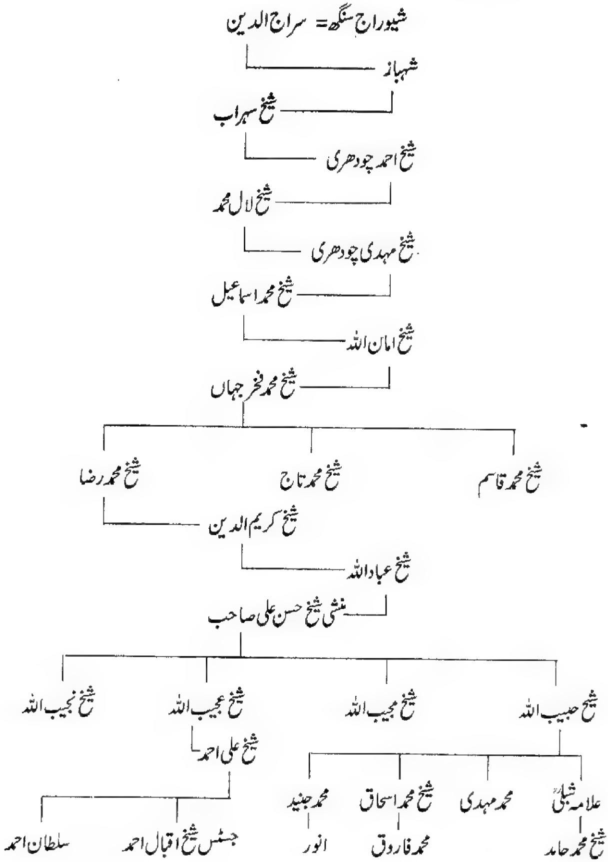
خاصہ بر مسجد پارینہ کہ در خانقہ است — کہ ز بے مہریِ ما خستہ و بے برگ ونواست

نسب | بندول میں بھی راجپوتوں ہی کی آبادی تھی، جس کے مورث اعلیٰ آج سے چار سو برس پیش تر مسلمان ہوئے تھے، اسی خاندان میں مولانا شبلی مرحوم کی پیدائش ہوئی، کیا عجیب بات ہے کہ ایک ہندی نژاد راج پوت آگے بڑھ کر اس قابل ہوا کہ رسول مطلبی وہاشمی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مدارج ومعارف سے دنیا کو آشنا کرے، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی سطوت وعظمت کا دلوں میں سکہ بٹھائے، نعمان بن ثابت کوفی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے فقہ وقانون کے مصالح وحکم کو نیا جلوہ دے، فصحائے عرب وایران کی نکتہ سنجیوں

کی شناسانہ داد دے اور غزالی و رازی اور مولانائے روم کے اسرارِ حقیقت کو برملا فاش کرے، ڈاکٹر اقبال نے جو خود بھی ایک ہندی نژاد برہمن تھے، کیا خوب کہا ہے:

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی ۔۔۔ برہمن زادۂ دانائے رمزِ روم و تبریز است

مولانا کا خاندانی سلسلہ وہی نومسلم راج پوتوں کا ہے، جو راوت کہلاتے ہیں، شجرۂ نسب یہ ہے:



قبول اسلام خاندان کے مورثِ اعلیٰ شیوراج سنگھ کے قبول اسلام کی خاندانی روایت یہ ہے:

"ایک روز شدید گرمی کے موسم میں صبح کو نہار منہ علاقۂ زمین داری پر کسی ضرورت سے جانا پڑا، اتفاقاً دیر ہوگئی، دوپہر کو کئی میل کی مسافت دھوپ میں طے کرکے مکان پر پہنچے، بھوک پیاس سے بے تاب ہورہے تھے، گھوڑے سے اترتے ہی سیدھے چوکے چلے گئے، یہ خیال نہیں رہا کہ جوتیاں اتاردیں، ان کی بڑی بھاوج جو چوکے میں کھانے کا انتظار کررہی تھیں اور جیسا کہ ہندو مستورات کا دستور ہے، اب تک بے آب ودانہ تھیں، بگڑ کر بولیں" کیا نرے ترک ہی ہوگئے جوتے پہنے چوکے میں چلے آئے اور سارا کھانا بھرسٹ کرڈالا" ایک راج پوت پر ایک عورت کے یہ چبھتے ہوئے طعنہ نے وہ کام کیا جو سینکڑوں علما کے بحث ومناظرہ اور وعظ وتبلیغ سے ممکن نہ تھا، شیوراج سنگھ نے بھاوج کا فقرہ سنا تو کہا مجھے ترک ہونے کا طعنہ دیتی ہو تو میں سچ مچ ترک ہوا جاتا ہوں، چنانچہ اسی وقت گھر سے نکلے اور موضع خانقاہ کی مسجد میں جاکر نہ صرف اپنی جسمانی پیاس بجھائی بلکہ دینِ حق کے آبِ حیات سے بھی سیراب ہوئے اور سراج الدین اسلامی نام قرار پایا، خاندان کی دوسری شاخ بدستور ہندو ہی رہی اور اب تک یہ لوگ بندول کے قریب دھرسن نامی ایک موضع میں آباد ہیں"[1] یہ تو خاندانی روایت ہے، لیکن قرینہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شوراج سنگھ خانقاہ کے کسی بزرگ کی صحبت اور تلقینات سے دل ہی دل میں متاثر ہورہے تھے اور آہستہ آہستہ ہندو دھرم کی بندشوں سے آزاد ہوئے جارہے تھے، اسی سلسلہ میں یہ واقعہ پیش آیا، اس سے بھاوج کا طعنہ بھی بیجا تھا اور دفعتہً شیوراج سنگھ نے خانقاہ کی مسجد کی راہ بھی اسی لیے لی، یہ واقعہ شاہانِ شرقی کے زمانہ کا ہے۔

خاندانی حالات سراج الدین نے قبول اسلام کے بعد اپنا حصۂ زمین داری الگ کرلیا، بعد کو اس خاندان نے مزید رسوخ حاصل کیا، یعنی اس کو آس پاس کے مواضعات کی چودھرائی کا منصب مل گیا جو اثر واقتدار کے لحاظ سے آج کل کی تحصیل داری سے کچھ اونچا تھا، یہ منصب مدت تک اس خاندان میں قائم رہا، سراج الدین کے پوتے سہراب نے دنیاوی عزت کے علاوہ مذہبی اعزاز بھی حاصل کیا یعنی اپنی باطنی کیفیت میں یہ ترقی کی کہ ان کے مرشد نے ان کو بیعت کی اجازت دی اور شیخ کے معزز لقب سے سرفراز کیا، اسی لیے نومسلم راج پوتوں کے عام دستور کے خلاف یہ لوگ خان کے بہ جائے شیخ کہلاتے ہیں۔

ننہال انصاری شاید اسی لیے نومسلم راج پوتوں کے عام دستور کے خلاف ان لوگوں نے شادی بیاہ

---

[1] سیرت شبلی، از مولوی اقبال احمد خاں سہیل، ایم، اے، ایم، ایل، اے، مندرجہ الاصلاح نومبر ۱۹۳۶ء، ص ۵۱، ۵۲۔

میں صرف اپنے ہی خاندان تک محدود رہنے کی پابندی نہیں کی، بلکہ دوسرے مسلمان شرفا کے خاندان میں بھی شادیاں کیں، چناں چہ مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب کی شادی انصاری شیوخ کے گھرانے میں ہوئی جو پھر یہاں میں آباد ہیں، شیخ صاحب کے خسر اور مولانا کے نانا کا نام حاجی قربان قنبر انصاری تھا۔

بزرگوں کے حالات مولانا کے جداعلیٰ شیخ کریم الدین صاحب گورکھپور کے ابتدائی انتظام کے زمانہ میں بندوبست کے محکمہ میں ملازم تھے اور اپنی ذاتی آمدنی سے ''بڑھاوا حسام الدین پور نام'' ایک علاقہ خریدا جس میں دس بارہ گاؤں تھے، یہ علاقہ اب تک اسی خاندان کے قبضہ میں چلا آتا ہے۔

مولانا کے دادا منشی حسن علی مرحوم اور ان کے بھائی منشی وارث علی عدالت کلکٹری اعظم گڑھ میں مختار تھے، اور مولانا کے نانا شیخ قربان قنبر انصاری انگریزی تسلط کے ابتدائی زمانہ میں اعظم گڑھ کے ایک مشہور وکیل تھے، مولانا سے سنا تھا کہ وہ شاعری بھی کرتے تھے، ان کے اشعار بھی سناتے تھے، جو شاید اہل بیت رضی اللہ عنہم کی منقبت میں تھے، مولانا حمید الدین مرحوم مصنف نظام القرآن ہی شیخ قربان قنبر انصاری کے پوتے ہیں۔

شیخ حبیب اللہ مولانا کے دادا نے چار اولاد چھوڑیں، حبیب اللہ، مجیب اللہ، عجیب اللہ، نجیب اللہ، مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ تھے، انہوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد فارسی پڑھی اور اس میں خاص ذوق پیدا کیا، چنانچہ مولانا نے شعرالعجم میں ان کے اس حسن ذوق کی ایک مثال لکھی ہے، فرماتے ہیں:

''میرا طالب علمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن ایک صحبت میں کسی نے کلیم کا یہ شعر پڑھا:

سر بہ بستاں چو دہد جلوۂ یغمائی را   اول از سرو کند جامۂ رعنائی را

والد مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے، میں نے کہا کپڑا اتارنے کو جامہ کشیدن بھی کہتے ہیں، اس لیے شاعر اگر ''کند'' کے بہ جائے ''کشد'' کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا، جامہ کندن گو صحیح ہے لیکن فصیح نہیں، سب چپ ہوگئے، والد مرحوم نے ذرا سوچ کر کہا کہ ''نہیں یہی لفظ (کند) شعر کی جان ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق باغ میں جب غارت گری کی شان دکھاتا ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا لباس اتار لیتا ہے، لباس اتارنے کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اتار کر رکھ دے یا اس کا نوکر اتارے، دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اتروائے جائیں یا نچوائے جائیں، فارسی میں ان کے لیے دو مختلف لفظ ہیں، جامہ کشیدن اور جامہ کندن، چوں کہ یہاں مقصود یہ

ہے کہ معشوق ذلت کے طور پر سروکا کپڑا اتار لیتا ہے، اس لیے یہاں جامہ کندن کا لفظ جامہ کشیدن سے زیادہ موزوں ہے، تمام حاضرین نے اس توجیہ کی بے ساختہ تحسین کی[۱]۔''

اس زمانہ میں فارسی اور ابتدائی عربی تعلیم کے بعد لوگ قانون کا امتحان دیتے تھے، چوں کہ شیخ صاحب کے گھر میں زمین داری اور مقدمات وقانون عدالت کا چرچا تھا، اس لیے الہ آباد ہائی کورٹ کی وکالت حاصل کی اور اس پیشہ میں ان کو ایسا فروغ ہوا کہ ضلع کے چوٹی کے وکیلوں میں سمجھے جاتے تھے۔

ان کی جوانی تھی کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا، دوسرے شہروں کی طرح اعظم گڑھ میں بھی شورش پیدا ہوئی، جیل خانہ کو توڑ کر قیدیوں کو رہا کیا گیا، اس زمانہ میں یہاں وینلیس صاحب کلکٹر تھے، ان کے ساتھ مل کر شیخ صاحب نے اپنے پرگنہ سگڑی میں امن وامان قائم کیا، اس کے بعد ۱۸۹۳ء میں گاؤ کشی کا جو مشہور ہنگامہ اعظم گڑھ میں ہوا اس میں بھی امن وامان قائم کرنے میں گورنمنٹ کو مدد دی، اس کے ایک سال بعد ۱۸۹۴ء میں شہر میں بہت بڑا سیلاب آیا، جس سے شہر خطرہ میں تھا، اس وقت حکام کے ساتھ مل کر شہر اور دریا کے بیچ میں ایک بند بندھوانے میں بڑی مدد دی۔

اسی طرح شہر اور ضلع کے پبلک کاموں میں وہ ہمیشہ شریک اعظم رہے، اس زمانہ میں میونسپلٹی کے صدر (چیرمین) ضلع کے حکام ہوتے تھے، اور ان کی ماتحتی میں شہر کے معززین آنریری سکریٹری ہو کر عملاً تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے، شیخ صاحب جب تک ان کی صحت کام دیتی رہی، اس خدمت کو اعزازی طور سے انجام دیتے رہے، فیض فطرت نے فراخ دستی کے ساتھ فراخ دلی بھی عطا کی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ شیخ صاحب گورنمنٹ اور پبلک دونوں کی نگاہ میں محترم تھے، اس زمانہ کی سیاست میں ہندو مسلمان کی تفریق نہ تھی، اس لیے وہ ہندو مسلمان ہر ایک کے کام آتے تھے اور ہر ایک ان کی عزت کرتا تھا۔

اس زمانہ میں نیل کا کاروبار بہت ترقی پر تھا، شرقی اضلاع میں کثرت سے نیل کی کاشت ہوتی تھی، اور چمپارن و گورکھپور سے لے کر اعظم گڑھ تک نیل کی کھیتی کھڑی اور نیل کی کوٹھیاں جاری تھیں، شیخ حبیب اللہ صاحب کی بھی نیل کی کوٹھیاں تھیں، جن سے سال میں خاطر خواہ فائدہ ہوتا تھا، مولانا شبلی مرحوم کے مکاتیب میں کہیں کہیں اس کا ذکر ہے[۲]، اس زمانہ میں زمین دار دیسی شکر بھی بناتے تھے، اور اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، شیخ صاحب نے بھی دیسی شکر کے کارخانے قائم کیے تھے، بزرگوں کے موروثی علاقہ

---

[۱] شعر العجم، جلد چہارم، ص ۱۸ [۲] مکاتیب شبلی اول سمیع ۱۳ اور دوم نامہ فارسی نمبر ۱۴۔

میں اپنی ذاتی آمدنی سے خرید کر بہت کچھ اضافہ کیا تھا، چنانچہ گھاگھرہ کے کنارے دیوارہ کا علاقہ جو اس خاندان کی ملکیت میں ہے، ان ہی کا حاصل کیا ہوا ہے، وکالت و زمین داری اور نیل اور شکر کی تجارت سے ان کی تقریباً تیس ہزار سال کی آمدنی تھی اور سرکار کو چھ ہزار سال کی مال گذاری دیتے تھے۔

غرض علمی قابلیت، قانونی لیاقت، اخلاقی شرافت، دنیاوی وجاہت، ہر دل عزیزی، دولت و ثروت اور سعادت مند اولاد ہر طرح کی نعمت شیخ صاحب کے حصہ میں آئی تھی، مذہبی مذاق بھی رکھتے تھے، چنانچہ مولوی محمد کامل صاحب کے ولید پور کے مرید و خلیفہ الٰہی شاہؒ صاحب (ساکن سبرہد ضلع جون پور) کے مرید تھے۔

شیخ صاحب کے دوسرے بھائیوں نے فارسی کی تعلیم پائی تھی اور اپنے زمانہ کے مذاق کے مطابق فارسی کا ذوق بھی رکھتے تھے، چنانچہ مکاتیب میں مولانا کا ایک فارسی خط ان کے ایک چچا کے نام جو غالباً شیخ عجیب اللہ ہیں موجود ہے[۲]، جس میں پوری انشا پردازی صرف کی گئی ہے، شیخ عجیب اللہ صاحب کے نام ایک اردو خط بھی مکاتیب[۳] میں ہے، اس میں بھی شاعرانہ تکلفات ہیں اور ان کو علی گڑھ آنے کی دعوت اور بعض علمی اطلاعات درج ہیں، انہی شیخ عجیب اللہ صاحب کے پوتے جسٹس محمد اقبال ہائی کورٹ الٰہ آباد کے جج ہیں۔

شیخ حبیب اللہ صاحب کو اپنے بھائیوں کے ساتھ غیر معمولی محبت تھی، چنانچہ انہوں نے جائدادیں حاصل کیں وہ صرف اپنے نام نہیں رکھیں بلکہ برابر برابر سب بھائیوں کو بانٹ دیں۔

والدہ ماجدہ مولانا کی والدہ جو حاجی قربان قنبر انصاری مرحوم کی صاحب زادی تھیں، نہایت نیک اور دین دار بی بی تھیں، تہجد تک ناغہ نہیں کرتی تھیں، مولانا اکثر اپنی والدہ مرحومہ کی نیکیوں کا ذکر فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان کو سحر خیزی کی عادت ان ہی کے حسن تربیت سے پڑی، شیخ صاحب نے غیر کفو میں جو شادی کر لی تھی، اس سے وہ بہت دل گیر رہا کرتی تھیں اور آخر اسی غم میں ۱۸۸۶ء سے پہلے وفات[۴] پائی، مولانا نے مولوی اسحاق مرحوم کے مرثیہ میں دو چار شعر اور لکھے جن کو بعد میں کاٹ دیا تھا، انہی میں ایک بند کا مصرعہ یہ تھا ع ماتم مادر دل گیر بھی دیکھا میں نے

---

[۱] مکاتیب دوم نامہ فارسی ۱۲ میں ان کا ذکر ہے۔ [۲] مکاتیب دوم نامہائے فارسی ۳ [۳] مکاتیب اول [۴] مولانا نے ۲۸ جنوری ۱۸۸۶ء کو اپنے ایک عزیز کو جن کی والدہ کا ابھی انتقال ہوا تھا، ایک تعزیت کا خط لکھا ہے جس میں اپنی ماں کی وفات کے سانحہ پر احساس غم کا تذکرہ کیا ہے۔

اور ان کی یادگار میں اپنے نیشنل اسکول میں جو آج کل شبلی جارج ہائی اسکول اعظم گڑھ ہے ۱۳۱۶ھ-۱۸۹۸ء میں صدر المنازل کے نام سے ایک ہال بنوایا ہے[1]۔

اولاد | شیخ حبیب اللہ صاحب مرحوم کے ان کی ان بیوی سے چار بیٹے ہوئے اور ایک بیٹی، بیٹی جوان ہو کر شادی کے بعد شیخ صاحب کے سامنے ہی مر چکی تھی، بیٹوں میں سب سے بڑے علامہ مرحوم تھے، ان سے چھوٹے مسٹر مہدی حسن مرحوم تھے، ان کی غیر معمولی ذہانت وطباعی اور خردانہ اطاعت و پاسِ ادب کا اعتراف مولانا کو ہمیشہ رہا اور مولانا کو بھی ان سے مخصوص محبت تھی، چنانچہ جب اپریل ۱۸۸۵ء میں وہ انگلینڈ کو روانہ ہوئے اور شیخ صاحب مرحوم نے اس تقریب میں ایک جلسہ منعقد کیا تو مولانا مرحوم نے ایک نہایت لطیف نظم لکھی، جس کا خاتمہ اس مشہور دعائیہ مصرع پر تھا، ع "بہ سلامت روی و باز آئی" اس نظم کے صرف دو شعر اقبال سہیل صاحب کو یاد رہ گئے:

خار در دیدۂ عدو شکنی — حاسداں را جگر گداز آئی

ما بہ نادیدہ دررہت باشیم — کہ تو ناگہ ز در فراز آئی

مسٹر مہدی حسن مرحوم نے بی اے تک ولایت ہی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیرسٹری پاس کی، اس نواح میں چوں کہ یہ نیا واقعہ تھا اور شیخ صاحب مرحوم نے بڑے (امنگ) اور حوصلہ مندی سے ان کی تعلیم دلائی تھی، اس لیے ۸/اکتوبر ۱۸۸۸ء کو ان کی واپسی پر بڑی دھوم دھام سے ان کا استقبال کیا گیا تھا، اور اس تقریب میں ایسا عظیم الشان جشن منایا گیا کہ سات روز تک مسلسل اہل شہر کی دعوت کی گئی،

---

[1] اس ہال پر حسب ذیل کتبہ لکھا ہے:

هو الله

ایں ایوان دل کشا کہ صدر المنازل ایں مدرسہ ہست

از زرعطیہ خاص

مولوی محمد شبلی صاحب

المخاطب بہ

شمس العلماء

سکریٹری ایں مدرسہ وفیلو آف یونیورسٹی، الہ آباد

بہ یادگار

والدہ مرحومہ ایشاں تغمد اللہ بغفرانہ

بہ ماہ دسمبر ۱۸۹۸ء شعبان ۱۳۱۶ھ

تعمیر یافت

جو اعظم گڑھ کی تاریخ میں پہلا اور غالباً آخری واقعہ تھا، افسوس کہ یہ ہنگامہ سرور زمانہ کی نظر بد سے بچ نہ سکا اور جو توقعات مسٹر مہدی حسن کی غیر معمولی قابلیت سے وابستہ تھیں، پوری نہ ہو سکیں، ولایت ہی میں ان کی صحت خراب ہو چلی تھی، جو مراجعت کے بعد بھی سنبھل نہ سکی، مجبوراً اپنی حیثیت سے اتر کر ۱۸۹۲ء میں ان کو منصفی قبول کرنی پڑی اور چند سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۹۷ء میں اعزہ کو داغِ مفارقت[1] دے گئے، مرحوم کی یادگار ایک صاحب زادی تھیں، جو مولانا کے ماموں زاد بھائی حاجی شیخ محمد صاحب سے بیاہی تھیں، وہ بھی ۱۹۲۷ء میں مکہ معظمہ میں لاولد فوت ہوئیں۔

مولانا کے منجھلے بھائی مولوی شیخ محمد اسحاق مرحوم الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک کامیاب وکیل تھے، اور قابلیت قانونی کے علاوہ اپنی پختہ مغزی اور وسعت خلق کی بنا پر نہایت ممدوح رہے، مگر انہوں نے بھی جوانی میں اگست ۱۹۱۴ء میں وفات پائی، مرحوم نے ایک بیٹا عزیزی محمد فاروق سلمہ اور دو صاحب زادیاں یادگار چھوڑیں، بڑی صاحب زادی آنریبل جسٹس اقبال احمد سے اور چھوٹی مولانا حمید الدین صاحب کے چھوٹے صاحب زادے محمد عباد سے بیاہی تھیں، چھوٹی نے چند سال ہوئے اور بڑی نے اسی سال ۱۹۳۹ء میں وفات پائی۔

مولوی محمد اسحاق مرحوم کی جواں مرگی کا حادثہ مولانا مرحوم کے لیے ناقابل برداشت تھا، جس کا شاہدِ حال ان کے مرثیہ کا ایک ایک شعر ہے، اور آخر یہ کانٹا ان کی جان لے کر نکلا۔

مولانا کے سب سے چھوٹے بھائی مولوی محمد جنید نعمانی مرحوم جو تقریباً مولانا کے صاحب زادے حاجی محمد حامد صاحب کے ہم عمر تھے، کچھ دنوں اعظم گڑھ وکالت کرنے کے بعد منصفی پر چلے گئے اور تقریباً پچپن برس کی عمر میں جب کہ وہ بہ مقام کان پور سب جج تھے، دہلی میں جہاں وہ بہ غرض علاج گئے تھے، ۱۹۳۳ء میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے، یہی وہ جنید ہیں جن کی نسبت مولانا نے مولوی اسحاق کے مرثیہ میں یہ لکھا تھا:

ع ''خوش و خرم رہے چھوٹا یہ مرا بھائی جنید''

مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ مرحوم نے ایک اور شادی غیر کفو میں کی تھی، جن سے ایک صاحب زادے محمد مرحوم تھے، یہ بھی اپنے بھائیوں کی طرح قابل اور ہونہار تھے اور گریجویٹ ہو چکے تھے،

---

[1] تاریخ وفات ۲۹/جون ۱۸۹۷ء ہے، دیکھئے (تسنیم ۴۱)۔

مگر جس روز ڈپٹی کلکٹری میں ان کے انتخاب کی اطلاع آئی، اسی دن چند گھنٹے دو دن کی علالت میں وفات پا چکے تھے، مہدی مرحوم کی وفات کے بعد شیخ صاحب کو اپنی اولاد کو یہ دوسرا داغ بھی دیکھنا مقدر تھا، ایسے سعادت مند اور کام یاب بیٹے کی مرگ ناگہاں وہ بھی عین عنفوان شباب میں انتہائی جاں کاہ حادثہ تھا۔

مرحوم نے ایک بچہ مظفر حسین اپنی یادگار چھوڑا، اس حادثہ کے بعد قدرتی طور پر شیخ صاحب مرحوم کی تمام دل بستگی اور بزرگانہ محبت کا مرکز یہی بچہ تھا، ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے اور ہر طرح کی ناز برداریاں کرتے، چنانچہ مولانا مرحوم نے اپنے پدر بزرگ وار کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں بھی اس کی جانب اشارہ ہے۔

میسند ایں کہ بیکس و بے خانماں شود ہاں آں قدر بماں کہ مظفر جواں شود

ولادت | مولانا شبلی مرحوم کی ولادت ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق مئی[1] ۱۸۵۷ء میں عین اس ہنگامہ خیز زمانہ میں ہوئی جو عام طور سے غدر کے نام سے مشہور ہے اور یہ بھی عجیب اتفاق کہ عین اس دن ولادت ہوئی جس دن ضلع اعظم گڑھ کے باغیوں کی ایک جماعت نے ڈسٹرکٹ جیل کے پھاٹک کو توڑ ڈالا اور بہت سے قیدیوں کو نکال لے گئے۔

نام | والدین نے بچہ کا محمد شبلی نام رکھا، عجب نہیں کہ نام شیخ صاحب نے اپنے صوفیانہ ذوق سے رکھا ہو، چھوٹے کا نام جنید رکھا تھا، وہ بھی اسی ذوق کا پتہ دیتا ہے، شبلی مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ شبلی بغدادی المتوفی ۳۳۴ھ کا نام مشہور ہے، مگر درحقیقت یہ نام نہیں، ان کا نام ابوبکر دلف بن مجدد بتایا جاتا ہے اور شبلی ان کے وطن شبلیہ (واقع اشروسنہ ترکستان) کی طرف منسوب[2] ہے، یہ نسبت ان پر ایسی غالب آئی کہ اس نے نام کی جگہ لے لی۔

ابتدائی تحریروں میں مولانا اپنا نام محمد شبلی ہی لکھتے تھے، بعد کو صرف شبلی کر دیا اور نام کے ساتھ نعمانی لکھنے لگے،

لطیفہ: مولانا شروانی صاحب فرماتے ہیں میرے بڑے پھوپھا عنایت اللہ خاں صاحب رئیس بھیکن پور سرسید کے ابتدائی ہم درد مخلصوں میں تھے، ان کی عنایت کی یادگاریں اب بھی یونی ورسٹی میں قائم ہیں، علامہ شبلی کے تقرر کے ابتدائی دور میں جب موصوف نے شبلی وجنید نام سنے تو کہا کیا یہ بغداد سے آئے ہیں۔

---

1 مئی کے بجائے اب ۳؍جون کی تاریخ محقق ہو چکی ہے۔ 2 انساب صمعانی۔

''نعمانی'' کی اس نسبت سے بعض لوگوں کو یہ دھوکہ ہوا کہ وہ امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کی اولاد سے ہیں، یا وہ اپنے کو ان کے خاندان کی طرف منسوب کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ دونوں خیال غلط ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مولانا ابتدا میں سخت حنفی تھے اور حنفی کہلانا اپنے لیے موجب فخر سمجھتے تھے اور طبیعت جدت پسند تھی، اس لیے حنفی کے بہ جائے اپنے آپ کو نعمانی کہا، بلکہ یہ نسبت انہوں نے خود سے اختیار نہیں کی، ان کے استاذ مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی نے ان کا لقب نعمانی رکھ دیا تھا، مولانا فاروق مرحوم بھی سخت غالی حنفی تھے اور ان دنوں مولانا عبداللہ صاحب (مئوی ثم غازیپوری) کے سبب سے جو اسی ضلع کے رہنے والے تھے، مقلد و غیر مقلد کی صدائیں ان اطراف میں بلند تھیں اور احناف اہل حدیث میں معرکے برپا تھے، اور طرفین میں مناظرے اور رسالہ بازی جاری تھی، اسی ماحول میں استاذ نے اپنے شاگرد کو نعمانی کہہ کر پکارا جو بعد کو شاگرد کے نام کا جز بن گیا۔

مولانا نے ابتدائے جوانی میں اردو میں اپنا تخلص تسنیم رکھا تھا، فارسی میں شبلی اکثر اور ایک آدھ غزل میں نعمانی بھی رکھا ہے۔

بہ خواریؔ کہ زکوئے تو رفت نعمانی گماں برم کہ ازیں پس دگر نمی آید

دو غزلوں میں پورا نام ہی تخلص میں ڈال دیا ہے،

اے شبلی نعمانی ایں پردہ دری از چیست اینہا کہ زخود گفتی من نیز خبر دارم

ہم زفیضِ شبلی نعمانی است ایں کہ در ہر شیوہ یکتا بودہ ام

اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ تبدیلی صرف وزن کے سبب سے ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ نعمانی ان کا تخلص تھا۔

بچپن | مولانا مرحوم کا بچپن بہت ناز و نعم میں گذرا، فطرۃً ذہین تھے اور حافظہ بھی قوی تھا، بہت ہی بچپنے کی بعض باتیں سناتے تھے، ایک دفعہ کا اسی عمر کا ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ چاندنی رات تھی، صحن میں لیٹے تھے اور لوگ اٹھا کر ان کو سائے بان میں لے جانا چاہتے تھے اور یہ نہیں جاتے تھے، کسی نے کہا اٹھو اٹھو پانی برسے گا، فوراً جواب دیا، واہ چاند تو نکلا ہے پانی کیسے برسے گا، لوگ اس پر ہنس پڑے، مگر اس ذہانت کے ساتھ ان کی اس طفلانہ سادگی کا قصہ بھی سنئے، ہر جمعرات کو مولانا کا ایک پیسہ مقرر تھا، ہر جمعرات کو اس کا انتظار رہتا تھا، شیخ صاحب کا ایک پرانا ملازم ان کو دیکھ بھال کرتا تھا، وہی پیسہ دیا کرتا

تھا، مولانا اگر کبھی پہلے پیسہ مانگ لیتے اور ضد کرتے تو وہ پیسہ کو آگ پر رکھ دیتا اور کہتا کہ ابھی پیسہ بن رہا ہے اور آخر وہ بن کر جمعرات ہی کو ملتا۔

تعلیم وتربیت مولانا کی والدہ مذہبی تھیں اور خود شیخ صاحب بھی اس زمانہ تک نئے زمانہ کی آب وہوا سے نا آشنا تھے، اس لیے اپنی پہلی اولاد کو خدا کا نام لے کر علم دین کی خدمت کے لیے وقف کیا، بعد میں سرسید مرحوم کی جو بنارس اور غازی پور وغیرہ مشرقی اضلاع میں بہت دنوں تک حاکم عدالت رہے، تقریر وتحریر کے اثر سے بہت کچھ متاثر ہو گئے تھے، اسی لیے اپنے دوسرے بچوں کو اعلیٰ انگریزی تعلیم دلوائی۔

شیخ صاحب مرحوم نے قدیم رواج کے مطابق بڑی دھوم دھام سے اپنے بڑے بیٹے کا مکتب کیا، قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں حاصل کی، ان کے گاؤں کے قریب جیراجپور کے ایک بزرگ حکیم عبداللہ صاحب المتوفی ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۹۰ء تھے جو مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی اور مولوی سید نذیر حسین صاحب دہلوی کے شاگرد تھے، وہی پہلے معلم مقرر ہوئے، چنانچہ مولانا نے ابتدائی تعلیم ان ہی سے پائی اور کچھ دنوں مولوی شکر اللہ صاحب المتوفی ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء سے جو سرحد ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے اور مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی کے شاگرد تھے، پڑھا۔

فطری آثارِ کمال مولوی عبداللہ صاحب موصوف بیان فرماتے تھے کہ مولوی شبلی میں بچپن ہی سے آثار کمال پائے جاتے تھے، ایک رات کو میں سو رہا تھا، قریب ایک بجے کا وقت تھا، یک بہ یک میری آنکھیں کھل گئیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی شبلی ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں، پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک قطعۂ تاریخ لکھ رہے ہیں، حالاں کہ ان کا یہ بچپن تھا، مولوی محمد عمر صاحب بزرگانِ قدیم کی ایک عمدہ یادگار تھے، وہ مولانا مرحوم کے ہم خاندان ہونے کے علاوہ ان کے بچپن کے دوست تھے، وہ بر سبیل تذکرہ ایک روز فرماتے تھے کہ مولانا میں ادبی مذاق بھی بچپن ہی سے تھا، اس زمانہ میں جب وہ محض مبتدی تھے، کوئی اچھی نظم دیکھتے تو اس کے پڑھنے کے لیے بے تاب ہو جاتے اور کوئی اچھا شعر سنتے تو ان کو وجد آجاتا۔

وہ خود مجھ سے فرماتے تھے کہ بچپن میں وہ فرصت کے اوقات شہر کے ایک کتب فروش کی دوکان پر بسر کرتے تھے، کتابیں الٹتے پلٹتے اور شعرا کے دیوان پڑھتے اور مناسبتِ طبع سے ان کے اچھے اشعار یاد رہ جاتے تھے[1]۔

---

[1] مضمون مولوی محبوب الرحمٰن صاحب کلیم بی، اے، وکیل اعظم گڑھ، معارف جلد سوم ۱۹۱۸ء۔

مدرسہ عربیہ اعظم گڑھ | شیخ صاحب اور شہر کے دوسرے اہل استطاعت اصحاب نے مل کر اعظم گڑھ میں علوم عربیہ کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جس میں پہلے تھوڑے عرصہ تک مولانا سخاوت علی جون پوری مرحوم کے شاگرد خاص مولوی فیض اللہ صاحب مرحوم مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، مولانا نے اسی مدرسہ میں مولوی صاحب موصوف سے عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں۔

مولانا علی عباس صاحب چریا کوٹی سے تلمذ | تذکرہ علمائے حال میں جو ۱۸۹۷ء میں مولانا کے علم اور مشورہ سے لکھا گیا[۲] مولانا کے استادوں میں ایک نام مولانا علی عباس[۳] صاحب چریا کوٹی کا لکھا ہے، مولوی علی عباس صاحب چریا کوٹی بن شیخ امام علی، ماں کی طرف سے ملا باب اللہ جون پوری کی اولاد سے تھے، بڑے منطقی مناظرہ پسند اور عربی کے شاعر و ادیب تھے، ۱۳۰۲ھ میں وفات پائی۔

مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب جون پور | مولوی عبدالحلیم صاحب شررؔ نے جو مولانا کی جوانی کے دوست تھے، مولانا کے حال میں لکھا ہے کہ مولانا نے مدرسہ حنفیہ امام بخش جون پور میں غالباً مولوی ہدایت اللہ خاں صاحب رام پوری سے جو سلسلۂ خیر آباد کے نام ور مدرس تھے، چند روز پڑھا تھا، مولانا کے مکاتیب فارسی میں بھی اس مدرسہ کے چند حوالے آئے ہیں، جن سے اس مدرسہ سے ان کے تعلق کا پتہ چلتا ہے۔

لیکن درحقیقت مولانا کی تعلیم کا حقیقی سلسلہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے، جب وہ مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔

مولانا فاروق صاحب | مولانا محمد فاروق صاحب[۴] چریا کوٹی ان دنوں چشمۂ رحمت غازی پور میں

---

[۱] یہ مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ کے باشندے تھے، آخر میں مطب کرنے لگے تھے اور اسی تعلق سے دانا پور پٹنہ میں رہتے تھے اور وہیں ۱۳ ربیع الاول ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء میں وفات پائی، ان ہی کے صاحب زادہ مولوی ابوالمکارم محمد علی مئوی تھے، جو مولوی سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے اور جنہوں نے مختلف مسائل پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے ہیں، ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء میں وہ بھی وفات پا چکے۔ [۲] مولفہ مولانا محمد ادریس صاحب نگرامی مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ [۳] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۴ [۴] مولانا محمد فاروق عباسی اور مولانا عنایت رسول عباسی چریا کوٹی اس زمانہ کے مشاہیر علما میں تھے، یہ دونوں قاضی علی اکبر ابن قاضی عطا رسول چریا کوٹی کے صاحب زادے تھے اور معقول و منقول و ریاضی ہر قسم کے علوم سے مالا مال تھے، مولانا عنایت رسول صاحب ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے تھے، علوم معقول و ریاضی و حساب و ہیئت مولوی احمد علی چریا کوٹی سے اور علوم منقول ملا فضل رسول صاحب بدایونی المتوفی ۱۲۸۹ھ سے جو دو واسطوں سے ملا بحر العلوم کے شاگرد تھے، حاصل کیا اور حدیث مولانا حیدر علی رام پوری شاگرد شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی سے ٹونک جا کر پڑھی، واپس آ کر عبرانی پڑھنے کا شوق ہوا تو اس زمانہ میں کلکتہ جا کر یہودیوں سے عبرانی پڑھی اور تورات و انجیل و زبور اور دوسرے صحف بنی اسرائیل پر عبور پایا، آخر وطن آ کر قیام کیا، ۱۳۲۰ھ میں وفات پائی، سید احمد خاں مرحوم بنارس و غازی پور کے قیام کے زمانہ میں ان کے علم و فضل سے واقف ہوئے اور توراۃ و انجیل و زبور کے مباحث کے حل کرنے میں ان سے پوری مدد لی، اور بعض بعض مسائل پر ان سے رسالے لکھوائے، سرسید کے مطبوعہ خطوط میں ان کے نام بھی چند خط موجود ہیں۔ مولانا محمد فاروق صاحب (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مدرس تھے، ان کی تعلیم وتدریس کا شہرہ دور دور پھیلا تھا اور شیخ صاحب سے خصوصیت یہ تھی کہ وہ ان کے پیر الٰہی شاہ صاحب (ساکن سبرہد ضلع اعظم گڑھ) کے پیر مولانا کامل صاحب ولید پوری کے داماد تھے، اس لیے شیخ صاحب نے مولانا کو ان ہی کے پاس غازی پور بھیج دیا، غازی پور میں گنگا کے کنارے قدیم شرفا کا ایک محلّہ ہے، جس کو میاں پورہ کہتے ہیں، یہاں شاہ جنید صاحب ایک بزرگ کا خاندان آباد ہے، جو شاہ صاحبوں کا خاندان کہلاتا ہے، شاہ منیر عالم وغیرہ اس خاندان کے مشہور افراد ہیں، مورثِ اول شاہ جنید کی بنوائی ہوئی مسجد کا لبِ دریا نہایت دل کش منظر ہے، اسی کے قریب اس خاندان کا مکان ہے، مولانا شبلی مرحوم غازی پور میں اسی مکان کی کوٹھری میں رہتے تھے، خاک سار جب غازی پور گیا تھا، تو یہ کوٹھری اسے دکھائی گئی تھی۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) نے اپنے بڑے بھائی مولانا عنایت رسول سے پڑھا، علاوہ ازیں ہیئت کا فن مولانا رحمت اللہ صاحب فرنگی محلی (بانی چشمہ رحمت غازی پور) سے ہدایہ اور اصول فقہ، مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی سے اور حاشیہ زاہدیہ بر شرح ملا جلال مولوی ابوالحسن صاحب منطقی سے اور بعض علوم ملا نعمت اللہ صاحب فرنگی محلی سے پڑھے، علوم معقول ومنقول وریاضی وادبیات جملہ علوم پر ان کو عبور کامل حاصل تھا، یہاں تک کہ موسیقی کے فن میں بھی ان کو دست رس حاصل تھی، ان کے طرز تعلیم کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ کتاب سے علاحدہ ہو کر نفس مسئلہ کی ایسی تعلیم دیتے تھے کہ اس کا ہر گوشہ طالب علم کے سامنے روشن ہو جاتا تھا، مختلف مدرسوں میں وہ مدرس رہے، سب سے پہلے وہ چشمہ رحمت غازی پور میں مدرس ہوئے، پھر اعظم گڑھ کے مدرسہ میں آئے، کان پور کے کسی مدرسہ میں بھی مدرسی کی، سہسرام کے مدرسہ خانقاہ میں جواب بھی قائم ہے، کچھ دنوں رہے، الٰہ آباد کے مدرسہ احیاء العلوم میں بھی قیام رہا، ۱۳۱۱ھ میں جب ندوۃ العلما نے لکھنؤ میں اپنا دار العلوم قائم کیا تو موصوف اس میں مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، خاک سار کو وہیں آپ سے استفادہ کا موقع ملا، اس کے بعد ۱۹۰۴ء میں جب مولانا شبلی نعمانی مرحوم دار العلوم ندوہ کے معتمد مقرر ہوئے، موصوف نے ترک ملازمت کر کے بلیا میں وکالت شروع کی اور بعض شایق انگریز حکام کو عربی پڑھائی، آخر میں ۱۹۰۹ء میں مولانا شبلی مرحوم نے ان کو پھر دار العلوم میں ادیب اول کے عہدہ پر بلایا، چند روز رہ کر غازی پور گئے تھے کہ اسباب وسامان یہاں لے آئیں کہ وہیں ۲۸/اکتوبر ۱۹۰۹ء مطابق رمضان ۱۳۲۷ھ کو وفات پائی۔

مولانا فاروق صاحب کو علوم عربیہ کے علاوہ فارسی نظم ونثر میں بھی یدطولیٰ حاصل تھا اور اس زمانہ کے کمالات کے مطابق صنایع وبدایع کا خاص شوق رکھتے تھے، مثلاً غیر منقوط قصاید اور خطبے، مولانا کی تصنیفات میں سے عربی وفارسی نظم ونثر کے بعض رسائل یادگار ہیں، مثلاً منظومۂ نحویہ، فارسی خالق باری، کشف الاقناع عن وجوہ الامتاع اور تطلیقات ثلاثہ کی بحث پر ایک رسالہ جس کا قلمی نسخہ خود ان کے ہاتھ کا لکھا میرے پاس ہے، اردو شاعری بھی کرتے تھے، چنانچہ ان کے دو اردو مسدس چھپے ہیں، ایک مسدس فاروقی جس میں اعظم گڑھ کے ۱۸۹۳ء کے ہنگامہ گاؤ کشی کا واقعہ نظم کیا ہے اور دوسرا مسدس عوالی ہے، جو مسدس حالی کے جواب میں ہے، جسمانی یادگار محل اولیٰ یعنی مولانا کامل صاحب ولید پوری کی صاحب زادی سے دو صاحب زادے ہیں، شمس العلما مولانا محمد امین صاحب اور مولانا محمد مبین صاحب کیفی چریاکوٹی، دوسری شادی غازی پور میں کی تھی جس سے کئی صاحب زادے ہوئے مگر ان میں سے عربی تعلیم صرف ایک نے پائی، یعنی محمد یسین مرحوم نے، ان تینوں نے جو کچھ پڑھا اپنے والد مرحوم ہی سے پڑھا۔

استاد کی نسبت شاگرد کا بیان اکتوبر ۱۹۰۹ء کے الندوہ میں مولانا شبلی مرحوم نے اپنے استاد کی نسبت جو کچھ لکھا ہے، اس سے زیادہ معتبر بیان ان کے متعلق کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، لکھتے ہیں:

''مولانائے موصوف چریا کوٹ کے رہنے والے تھے، جو اعظم گڑھ کے ضلع میں ایک مردم خیز قصبہ ہے، انہوں نے اپنے بڑے بھائی مولوی عنایت رسول صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب فرنگی محلی اور مولوی نعمت اللہ صاحب فرنگی محلی سے تمام علوم وفنون کی تکمیل کی تھی، علم ادب اگرچہ بہ طور خود حاصل کیا تھا، تاہم بہت بڑے ادیب اور ناظم وناثر تھے۔''

مزاج میں سخت وارستگی، بے پروائی اور بے تکلفی تھی، اس لیے ایک جگہ قیام نہیں کر سکتے تھے، نہ کوئی کام باقاعدہ انجام دے سکتے تھے، اسی وجہ سے کوئی بڑی خدمت یا عہدہ نہ حاصل کر سکے، نہ اس کی ان کو پروا تھی، علمی ذوق اس قدر غالب تھا کہ سخت سے سخت دنیاوی کشمکشوں میں بھی تعلیم وتعلم کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا تھا، بے قاعدگی کی وجہ سے کوئی مستقل تصنیف نہیں کی، چھوٹے چھوٹے دو چار رسالے لکھے اور وہ بھی ناتمام رہ گئے، تمام مسائل علمیہ میں مجتہدانہ رائے رکھتے تھے اور جب کوئی کتاب پڑھاتے تھے، تو عموماً مصنف کی غلطیوں اور فروگذاشتوں سے تعرض کرتے تھے۔

میں نے معقولات کی تمام کتابیں مثلاً میر زاہد، ملا جلال مع میر زاہد، حمد اللہ، شرح مطالع صدرا، شمس بازغہ انہی سے پڑھیں اور میری تمام تر کاینات انہی کے افادات ہیں، فارسی کا مذاق بھی انہی کا فیض ہے، اکثر اساتذہ کے اشعار پڑھتے اور اُن کے ضمن میں شاعری کے نکتے بتاتے۔

چوں کہ ان کی کوئی علمی تصنیف شایع نہیں ہوئی، اس لیے ہم چند اشعار درج کرتے ہیں، کہ ''مشتے نمونہ از خروارے''

رسیدی در بودی دین ودل در جنبش چشمے — بہ یک گردش چو جامِ بادہ کارم ساختی رفتی
بہ گلشن آمدی وغنچہ را در خوں جگر کردی — نسیم آسا سمند ناز بر گل تاختی رفتی

نہ دارد دل دگر تابِ طپیدن — نگاہ خویش را رحم آشنا کن
نہ دارد چشمِ من تابِ جمالت — بیا چوں مرد مک در دیدہ جا کن

زمانہ گر زخطِ حکم تو بہ پیچد سر — دو رشتۂ شب و روزش بہ تن شود زنار

مولانا فاروق مرحوم منطق کی تعلیم صرف نظری ہی نہیں بلکہ عملی بھی دیتے تھے، یعنی نسب اربعہ

قضایا اور اشکال سب کی باقاعدہ مشق کراتے تھے اور اس کے لیے شرح مطالع کا درس خاص طور سے دیتے تھے، چنانچہ مولانا شبلی مرحوم کو بھی ان کی مشق کرائی تھی اور اس کا درس دیا تھا، دارالعلوم میں مولانا فاروق صاحب نے ہماری جماعت کو بھی تہذیب اسی اصول سے پڑھائی تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا شبلی اپنی تحریر و تقریر میں منطقی ترتیب کے خوگر اور مناظروں میں مشاق ہو گئے تھے اور منطق اور فن مناظرہ کے اصول سے ان کا ہر قدم اٹھتا تھا اور پڑتا تھا۔

استاد و شاگرد میں اتحاد مذاق کی متعدد جہتیں جمع ہو گئی تھیں، اسی اتحادِ مذاق نے استاد و شاگرد کے معنوی ربط کو اور زیادہ قوی کر دیا اور بالآخر جس طرح استاد کی کشش شاگرد کو غازی پور کھینچ کر لے گئی تھی، اب شاگرد کی کشش استاد کو اعظم گڑھ کھینچ لائی، یہ واقعہ غالباً ۱۲۹۰ھ کے پس و پیش کا ہے، اسی مدرسہ میں جو شیخ صاحب نے قائم کیا تھا، مولانا فاروق صاحب مدرس اوّل ہوئے، باہر سے بھی کچھ طلبہ کھینچ کر آئے، جن میں سے صرف ایک کا نام مجھے معلوم ہے، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم جو ڈاکٹر انصاری کے مختصر نام سے معروف تھے اور جو یوسف پور ضلع غازی پور کے رہنے والے تھے، ان کے بڑے بھائی مولوی حکیم عبدالوہاب صاحب جو ''حکیم نابینا'' کے نام سے شہرت رکھتے ہیں، اسی زمانہ میں مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ اسی مدرسہ میں مولانا فاروق صاحب سے پڑھتے تھے، شاید ۱۹۲۳ء میں حکیم صاحب سے بمبئی میں میری ملاقات ہوئی تھی تو وہ اس واقعہ کا ذکر کرتے تھے اور اس مدرسہ کا حال پوچھتے تھے[1]۔

مولانا شبلی جیسا طباع تلمیذ اور مولانا فاروق کا سا متبحر استاد فیضِ تربیت نے سونے پر سُہاگہ کا کام کیا، چند ہی دنوں میں یہ جوہرِ قابل ایسا چمکا کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں اور ہونہار شاگرد استاد کے لیے مایۂ ناز بن گیا، چنانچہ مولانا فاروق صاحب اسی زمانہ میں اکثر فخر یہ فرمایا کرتے تھے، اَنَــا اَسَــدٌ وَاَنْتَ شِبْلِیْ (میں شیر ہوں اور تو بچۂ شیر) اس میں شبلی کی تلمیح قابلِ توجہ ہے۔

فلسفہ کی تعلیم پر استاد نے پوری ہمت صرف کی تھی اور شاگرد نے بھی پوری محنت سے حاصل کی تھی، ایک خط میں خود لکھتے ہیں، میں نے فلسفہ بڑی محنت اور تدقیق سے پڑھا اور مدتوں اس میں منہمک رہا (شروانی-۲۳) اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے علمِ کلام کی مہارت اور دل چسپی میں اس فن کی مہارت نے خاص طور سے مدد دی۔

---

[1] افسوس کہ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ مطابق مئی ۱۹۴۱ء میں دلی میں وفات پائی۔

مولانا کو سالہا سال کے بعد بھی جب فلسفہ کا مشغلہ چھوٹ گیا تھا، فلسفیانہ مباحث پر اتنا عبور حاصل تھا کہ ۱۹۰۵ء میں ہمارے درجہ میں شمس بازغہ کا سبق شروع ہوا اور اس اہتمام سے شروع ہوا کہ ہمارے استاد مولانا حفیظ اللہ صاحب پوری تیاری سے اس کو پڑھاتے تھے اور مولانا درجہ میں آکر اس پر اعتراض وارد فرماتے تھے اور دونوں میں دیر تک ردوقدح جاری رہتی تھی اور ہم لوگ محوِ تماشا رہتے تھے،

ہمارے عزیز دوست مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی ان دنوں ٹونک میں سلسلۂ خیر آباد کے مشہور مدرس مولانا حکیم ابوالبرکات سے فلسفہ پڑھتے تھے، جب وہ چھٹیوں میں گھر جاتے تو راستہ میں لکھنؤ میں ہم لوگوں کے پاس ٹھہر جاتے، مولانا کا قیام اس زمانہ میں ندوہ ہی میں تھا، مولوی مناظر احسن صاحب ان کے پاس دو ایک دفعہ ملنے گئے تو سلسلۂ خیر آباد کے تعلق سے ان سے بعض فلسفیانہ مسائل امتحاناً پوچھے اور اس کے بعد ان پر ایسی اچھی بحث فرمائی کہ مولوی مناظر احسن صاحب اب تک اس کی مدح فرماتے ہیں۔

مدرسہ اسلامیہ اعظم گڑھ کی ویرانی کا منظر مولانا نے قریب قریب درجۂ فراغ تک اسی مدرسہ میں مولانا فاروق صاحب سے تعلیم پائی، یہ مدرسہ اعظم گڑھ کی موجودہ آبادی سے دکھن طرف پرانی تحصیل سے متصل واقع تھا، اب یہاں کوئی آبادی باقی نہیں رہی ہے اور یہ سارا حصہ کھیت ہو گیا ہے، مولوی اقبال احمد صاحب سہیل راوی ہیں کہ مولانا مرحوم آخر عمر تک جب کبھی اعظم گڑھ آتے تو اکثر اس موقع پر تشریف لے جاتے اور تاثر کی جو کیفیت اس وقت مولانا پر ہوتی، وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، زبانِ قلم اس کی صحیح مصوری سے عاجز ہے، ایک مرتبہ وہ بھی ساتھ تھے، شام کا وقت تھا اور غالباً جنوری یا فروری کا مہینہ، سرسبز و شاداب کھیت لہلہارہے تھے، بہار کا ولولہ انگیز موسم، شام کا سہانا وقت، کھیتوں کی طراوت بخش ہریاول ایک ایسا روح پرور سماں تھا کہ مغموم سے مغموم دل بھی تھوڑی دیر کے لیے باغ باغ ہو جاتا، مگر مولانا تھے کہ چلتے چلتے دفعۃً ایک کھیت کی مینڈ پر رک گئے، آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے اور اپنے دل گداز لہجہ میں یہ اشعار ترنم فرماتے رہے:

جائیکہ بود آں دلستاں در بوستاں با دوستاں
شد زاغ و کرگس را مکاں شد مرغ و ماہی را وطن

از فرّ یار خرگہی ایواں ہمی بینم تہی
و ز قدّ آں سروِ سہی خالی ہمی بینم چمن

بر جائے رطل و جام مے گوراں نہادستند پے
بر جائے چنگ و نائے و نے آواز زاغ است و زغن

جب ذرا سکون ہوا تو ارشاد فرمایا میری نگاہوں میں تو وہ سماں پھر رہا ہے، جب اسی مقام پر مولانا فاروق مرحوم شرحِ مطالعہ کا درس دیا کرتے تھے، آج یہ عالم ہے کہ در و دیوار کے نشان تک باقی نہیں رہے۔

قفا نبك من ذكرىٰ حبيب و منزل

رام پور اور لاہور کے تعلیمی سفر ۱۲۹۱ھ و ۱۲۹۲ھ علامۂ مرحوم نے درسیات کی تکمیل اگرچہ مولانا فاروق ہی سے کر لی تھی، لیکن ان کے ذوقِ علمی نے ان کو دوسرے خرمنوں کی خوشہ چینی پر آمادہ کیا، ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ادب، فقہ اور حدیث کے جو اساتذہ اپنے اپنے فن میں یگانۂ عصر سمجھے جاتے، ان سے بھی استفادہ کرنے کا شوق دامن گیر ہوا، مولانا کے والد مرحوم اس کو غیر ضروری سمجھتے تھے، علاوہ بریں وہ بلا ضرورتِ شدید اپنے نور دیدہ کو آنکھ سے اوجھل کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے، مگر مولانا کی والدہ نے جو بہت باہمت خاتون تھیں، مولانا کی بے تابیٔ شوق کو ناکام دیکھنا گوارا نہ کیا، ان ہی کی ہمت افزائی کا اثر تھا کہ بالآخر مولانا نے طلبِ علم کے شوق میں دیارِ وطن کی دل چسپیوں کو خیر باد کہا۔

اس زمانہ میں مدارس کا رواج کم تھا، زیادہ تر مشاہیر علما اپنی اپنی جگہ پر مسندِ درس و افادہ کو زینت دے رہے تھے، یہی آستانے اس وقت کی یونیورسٹیاں تھیں، لکھنؤ میں مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی مرحوم کے دم سے بہارِ علم تازہ تھی، سہارنپور میں مولانا احمد علی محدث اور دیوبند میں مولانا محمد قاسم کی بہ دولت خاتم المحدثین مولانا شاہ عبدالعزیز مرحوم کا سلسلۂ فیض جاری تھا، رام پور میں خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کی جوہر شناسیوں نے ہر فن کے اربابِ کمال یک جا کر دیے تھے، راقم نے خود استاذ مرحوم کی زبانی سنا ہے کہ اول اول ان کو مولانا عبدالحی فرنگی محلی مرحوم کی شہرتِ کمال لکھنؤ لے گئی، مگر علامہ مرحوم کچھ تو فطری جودتِ طبع اور کچھ فیضِ فاروقی کے بہ دولت نقد و اجتہاد کے خوگر تھے اور جہاں جاتے ان کی نظر پہلے اسی جوہر کی تلاش کرتی، اس لیے زانوئے ادب تہ کرنے سے پہلے ہی لکھنؤ سے قدم اٹھ گئے اور رام پور کا رخ کیا، یہاں اس وقت دو باکمال اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے، معقولات میں سلسلۂ خیر آباد کے خاتم مولانا عبدالحق خیر آبادی اور فقہ میں مولانا ارشاد حسین صاحب مجدّدی، ابتداءً مولانا کی خواہش تھی کہ دونوں سے استفادہ کریں، مگر ان بزرگ واروں میں معاصرانہ چشمک اس حد تک تھی کہ ایک کا شاگرد دوسرے کے حلقۂ درس میں باریاب نہ ہو سکتا تھا، مجبوراً مولانا کو انتخاب کرنا پڑا۔

مولانا ارشاد حسین رام پوری معقولات میں مولانا فاروق کے فیض سے خود علامہ مرحوم کی بصیرت

اتنی کافی ہوچکی تھی کہ جس پر کسی مزید اضافہ کی توقع محض امید موہوم تھی، اس لیے صرف مولانا ارشاد حسین[1] کے شرف تلمذ پر اکتفا کی، علامہ مرحوم کو حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کی وسعتِ نظر، اصابتِ رائے اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کا اعتراف ہمیشہ رہا اور اکثر بر سبیل تذکرہ ان کے کمالِ فہم و ادراک اور قوت تفقہ کے واقعات بیان فرماتے، مولانا ارشاد حسین نہایت متشدد حنفی تھے، مولوی نذیر حسین صاحب کی معیار الحق کے جواب میں انتصار الحق انہی نے لکھی ہے اور علامہ مرحوم کو بھی فقہ حنفی کی حمایت میں بہت غلو تھا، غالباً یہ بھی ایک وجہ انتخاب ہوئی ہو، بہر حال مولانا نے حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر فقہ واصول کی تعلیم حاصل کی، یہ تعلیم غالباً سال بھر جاری رہی۔

دیو بند کی حاضری اس زمانہ میں دیو بند کے مدرسہ میں مولانا کے چند ہم وطن اور ہم عمر دوست جیسے مرزا محمد سلیم جو بعد کو وکیل ہوئے، پڑھتے تھے، اس کشش سے وہ دیو بند گئے اور ایک مہینہ کے قریب رہے، تعلیم میں شرکت نہیں کی، مگر فرائض کا علم یہیں سیکھا، یا فرائض کا رسالہ یہیں پڑھا، مدرسہ دیو بند کے کتب خانہ سے بعض کتابیں اس زمانہ میں پڑھنے کو لی تھیں جن پر مولانا نے اپنا نام لکھا تھا، وہ کتابیں وہاں اب تک ہیں اور ان پر ان کا نام لکھا اب تک موجود ہے۔

مولانا فیض الحسن لاہور اس زمانہ میں مولانا فیض الحسن[2] سہارنپوری پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور اس پایہ کے ادیب تھے کہ خاکِ ہند نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو، طلب علم کی

---

[1] مولانا ارشاد حسین صاحب حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں تھے، کتب معقول لکھنؤ میں پڑھی تھیں، اور باقی علوم ملا نواب صاحب افغانی سے جو اس عہد کے بڑے باکمال عالم تھے، حاصل کیے تھے، شاہ احمد سعید مجددی دہلوی کے مرید تھے، ظاہر و باطن دونوں آراستہ تھے، نواب کلب علی خاں مرحوم ان کی بڑی عزت کرتے تھے، ۸؍ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۱ھ میں وفات پائی، تفصیل کے لیے دیکھئے تذکرہ کاملان رام پور، حافظ احمد علی خاں شوق، ص ۳۰۔ [2] مولانا فیض الحسن صاحب سہارن پوری سلسلہ خیر آباد کے حلقہ زریں مولانا فضل حق خیر آبادی کے شاگرد تھے، مولانا خیر آبادی معقولات اور ادب عربی دونوں کے استاد تھے، عربی قصاید ان کی یادگار ہیں، موصوف نے ۱۲۷۸ھ میں قید فرنگ میں جزیرہ انڈمان میں وفات پائی، مولانا فیض الحسن صاحب کا بڑا فیض یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے عربی ادب میں انقلاب پیدا کر دیا اور متاخرین سے ہٹا کر طلبہ کو قدیم شعرائے ادب کی طرف متوجہ کیا، حماسہ کا درس ان ہی نے رائج کیا، اور حماسہ کی شرح فیضی کے نام سے ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء میں لکھی، ان کا عربی دیوان ان کے شاگرد مولانا حمید الدین صاحب نے ۱۳۳۴ھ میں حیدر آباد میں چھپوا دیا ہے، اور خود مولانا فضل حق صاحب نے یہ فیض حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی سے حاصل کیا تھا، حضرت شاہ صاحب عربی کے ایسے ادیب و شاعر تھے کہ خود عربی کے اہل زبان ان کا لوہا مانتے تھے۔

تشنگی نے اس چشمۂ فیض سے بھی شاد کام ہونا چاہا اور سفرِ پنجاب کے لیے کمر بستہ ہوگئے، اولاً مولانا کے والد اتنے لمبے سفر کی اجازت دینا نہیں چاہتے تھے، دوسرے اب وہ یہ چاہتے تھے کہ تعلیم ختم ہوچکی اب وکالت کے امتحان کی تیاری کریں، مگر آخر کار مولانا کے عزم و استقلال کو یہاں بھی فتح ہوئی اور صرف پچیس ۲۵ روپیہ زادِراہ لے کر لاہور چل کھڑے ہوئے، ان دنوں اعظم گڑھ تک ریل نہ تھی، اعظم گڑھ سے جون پور تک تین روپیہ کا یکہ کرایہ کیا، اس پر آئے، جون پور سے سہارن پور تک سات روپے کا اور سہارن پور سے لاہور تک پانچ روپے کا ٹکٹ لیا، طبیعت چوں کہ ہمیشہ خوددار اور غیور تھی، اس لیے عربی کے عام طالب علموں کی طرح خانۂ خدا میں ناخواندہ مہمان بن کر جاگیر کی روٹیوں سے شکم سیری گوارا نہ کر سکے، ایک روپیہ مہینہ کے کرایہ کا ایک چھوٹا سا مکان یا کمرہ لیا اور آٹھ دس روپے میں دو مہینے کسی نان بائی کی دوکان سے کھانے کا بندوبست کیا اور اتنے زمانہ تک تنگ دستی کی تکلیف کو ہنسی خوشی جھیل لیا، مگر والد بزرگ وار کو اس لیے زحمت نہ دی کہ وہ اس سفر پر دل سے راضی نہ تھے۔

یہ پوری داستان خود مولانا کی زبان سے سنئے، دو مہینوں کے بعد جب ہاتھ بالکل خالی ہوگیا تو مجبوراً اپنے والد ماجد کو لکھا، ''مرا دو ماہ می گذرد کہ ترکِ وطن کردہ ام و بہ بے بانگاں بسر بردہ ام بست و پنج روپیہ عنایت شدہ بود سہ روپیہ کرایہ یکہ از اعظم گڑھ تا جون پور رفت ہفت روپیہ صرف ریل تا بہ سہارن پور شدہ بود پنج روپیہ از آنجا تا بہ لاہور، دہ روپیہ باقی ماند، اول کہ دریں جا رسیدیم در یک روپیہ بہ حوائج ضروریہ کہ در وقت قیام جائے پیش می آید صرف شد۔

مکانے بہ کرایہ یک روپیہ گرفتم، دو ماہ را دو روپیہ کرایہ می شود، آنچہ باقی می ماند بہ صرف طعام آمد، اگر انصاف رود بہ چنداں کفایت بسر بردہ ام کہ بیش از و متصور نیست چوں مزاج عالی اندکے برہمی داشت از تکلیف ارسال صرف باز ماندم، اکنوں کار مشکل افتادہ است، دیگر چہ گویم (مکاتیب نامہ فارسی ا)

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلب علم کی راہ میں دل دادگانِ کمال کو کیا کیا صعوبتیں اٹھانی پڑتی ہیں، اسی سلسلہ میں طریقِ درس کی داستان بھی سننے کے قابل ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے بزرگوں میں علمی شغف کتنا تھا، موجودہ دور کے آرام طلب طالب علم اور عیش پسند استاد اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

مولانا فیض الحسن مرحوم کالج میں ملازم تھے، اس لیے زیادہ وقت وہیں صرف ہوجاتا، بقیہ وقت

بھی خالی نہ تھا، کیوں کہ متعدد ایسے اشخاص اس وقت استفادہ کررہے تھے، جن کا کالج سے کوئی تعلق نہ تھا، اور ہر ایک کے اوقات مقرر تھے، اس ماحول میں اگر کوئی اور استاد ہوتا تو مولانا شبلی جیسے فارغ التحصیل طالب علم کو درس دینے سے یقیناً انکار کرتا اور مولانا کے بہ جائے کوئی دوسرا طالب علم اسی استعداد کا ہوتا، جس کو ان ہی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا، تو ہرگز غریب الوطنی کی زحمت برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا، مگر ایک طرف تو مولانا شبلی کا عزمِ راسخ بےنیلِ مرام واپس آنے کی اجازت نہیں دیتا تھا، دوسری جانب مولانا فیض الحسن کا ذوقِ افاضہ ایسے مشتاق و مستعد طالب علم کو محروم دیکھنا گوارا نہ کرتا تھا، آخر کار یہ طے ہوا کہ مکان سے کالج تک کی مسافت طے کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے، اسی میں مولانا ادبیات کا درس لیا کریں، یعنی آنے جانے میں معلم یا متعلم کا جو قدم بھی اٹھے، وہ بھی افادہ و استفادۂ علم سے خالی نہ ہو۔

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نہ داشت دانہ می چیدم من آں روزے کہ خرمن داشتم

اسی تعلیم کے زمانہ میں تعطیل ہوئی اور مولانا فیض الحسن صاحب دو ماہ کے لیے سہارن پور اپنے وطن تشریف لے گئے تو اس خیال سے کہ ناغہ نہ ہو شاگرد نے بھی ساتھ ہی سفر کا ارادہ کیا، اپنے والد کو لکھتے ہیں:

''حضرت استاذ بہ وطن خویش یعنی سہارنپور تشریف خواہند برد این قدر ناغہ نتواں کرد، مراہم عزم سہارنپور است دیگر ہرانچہ مرضی باشد'' مولانا کے لیے مولانا فیض الحسن صاحب کی یہ صحبت بہت موثر ثابت ہوئی، اور واقعہ یہ ہے کہ اسی درس نے مولانا میں عربی علم ادب کا صحیح مذاق حدّ کمال کو پہنچایا، مولانا فاروق مرحوم نکتہ آفرینی کے دل دادہ تھے اور وہ متاخرین شعرائے عرب کو جن کا سرخیل متنبّی ہے، شعرائے جاہلیت پر ترجیح دیتے تھے، مولانا شبلی مرحوم کا بھی ابتدائی مذاق غالبًا یہی رہا ہوگا، مگر لاہور آئے تو دنیا بدل گئی، شعرائے جاہلیت کی تاثیر میں ڈوبی ہوئی سادہ اور سچی شاعری اور شستہ اور رفتہ زبان دل میں اتر گئی، یہاں تک کہ مولانا نے حماسہ گویا حفظ کرڈالا اور آخر عمر تک بلا ناغہ صبح کو حماسہ کے اشعار گنگنایا کرتے تھے۔

جمہرۃ العرب شعرائے جاہلیت کے قصائد کی دوسری کتاب تھی، جو مولانا فیض الحسن صاحب کے ذریعہ سے ان تک پہنچی اور پڑھی اور اس کو استاد سے مانگ کر ساتھ لائے اور مولانا فاروق صاحب کو دیکھنے کو دی، ایک خط میں لکھتے ہیں ''نامہائے حضرت مولانا فیض الحسن پے در پے می رسند، جمہرۃ العرب از مولوی فاروق صاحب طلب دارد وبہ من بنویس'' (نامہ فارسی-۲۳)

مولانا کو سادہ عربی نگاری کا شوق جاحظ کی کتابوں سے پیدا ہوا تھا جو انہیں علی گڑھ آنے کے بعد ملیں، مگر پھر بھی اس کا تخم مولانا فیض الحسن صاحب ہی کی صحبت میں پڑ چکا تھا، چنانچہ اسی زمانہ کا ان کا ایک عربی خط مجھے ملا ہے، جو آگے نقل ہوگا۔

مولانا فیض الحسن صاحب کا سب سے بڑا فیض قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کی نکتہ شناسی تھی، مولانا فیض الحسن صاحب اسی اصول سے قرآن پاک کا بامحاورہ اردو ترجمہ اپنے خاص طالب علموں کو پڑھاتے اور فصاحت و بلاغت کے نکتے بتاتے تھے، مولانا شبلی مرحوم میں یہ ذوق اخیر تک رہا، ندوہ کے ایک جلسہ کی تقریر میں جو چھپی ہوئی ہے ادھر اشارے ہیں، حیدرآباد میں اس موضوع پر پوری تقریر فرمائی، دارالعلوم ندوہ میں آکر چند طالب علموں کو جن میں یہ خاکسار بھی تھا، قرآن پاک کے اعجازی نکتوں پر متعدد درس دیے۔

غرض اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مولانا فیض الحسن صاحب کے قلیل المدت درس کا نقش علامہ مرحوم پر کس قدر گہرا پڑا تھا، یہی وجہ تھی کہ استاذ مرحوم کو اپنے اساتذہ میں سے مولانا فیض الحسن صاحب کے ساتھ مخصوص شیفتگی تھی، مولانا کے ان جذبات کی ہلکی سی جھلک اس مرثیہ میں صاف طور پر نمایاں ہے، جو مولانا فیض الحسن مرحوم کی وفات پر خاص عالمِ تاثیر میں لکھا ہے، اس مرثیہ کا پہلا بند ان اشعار سے شروع ہوتا ہے۔

دریں آشوبِ غم عذرم بنہ گر نالہ زن گریم — جہانے را جگر خوں شد ہمی تنہا نہ من گریم
بہ تحسین صبوری چند بفریبی مرا ناصح — دمے بگذار تا در ماتمِ فیض الحسن گریم
بہ مرگش علم و فن در نالہ با من ہم نوا باشد — ہنر بر خویشتن گرید چو من بر خویشتن گریم
گہے بے خود بہ برہم گشتن بزمِ ہنر نالم — گہے بے خویش بر روز سیاہِ علم و فن گریم

آگے چل کر دوسرے بند میں فرماتے ہیں:

نہ گویم من تو خود انصاف دہ تا از کہ می آید — عرب را زندہ کردن و آنگہ از ہندوستاں بودن
بہ آئین دری بر جادۂ پیشینیان رفتن — بہ آہنگِ حجازی یادگارِ پاستاں بودن

مولانا فیض الحسن صاحب نے ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء میں وفات پائی، سید سجاد حیدر صاحب (علیگ) بیان کرتے تھے کہ مولانا کو اس سانحہ کا حال کالج میں عین درس میں معلوم ہوا، سننے کے ساتھ آنکھیں ڈبڈبا

آئیں اور ہم طالب علموں سے کہا کہ چلے جاؤ، اور اسی اثر میں ان کا وہ مرثیہ لکھا جو ان کے کلیات میں ہے۔

مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری سے تعلیم حدیث اس زمانہ کا دستور تھا کہ جب طلبہ ہر قسم کے علوم وفنون سے فراغت پا لیتے تھے تب حدیث پڑھتے تھے، اسی اصول پر مولانا نے دوسرے تمام علوم سے فراغت پا کر حدیث کی طرف توجہ فرمائی اور جس طرح انہوں نے دوسرے فنون کی تعلیم کے لیے ان ہی اساتذہ کا انتخاب کیا جو اس فن میں یگانہ تھے، اسی طرح حدیث کے لیے بھی انہوں نے اس زمانہ کے سب سے نامور محدث کا انتخاب کیا، مولانا اپنے شیخ حدیث کو اکثر ہمارے مولانا کہا کرتے تھے۔

مولانا احمد علی سہارن پوری اپنے زمانہ میں علم حدیث کے امام مانے جاتے تھے، پہلے ہندوستان میں مولانا شیخ وجیہ الدین صدیقی سہارن پوری اور مولانا عبدالحئی (تلمیذ مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی سے) حدیث پڑھی، پھر ۱۲۶۱ھ میں مکہ مکرمہ جا کر حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی مہاجر سے دوبارہ پڑھی اور سند واجازت حاصل کی، اُس زمانہ میں علمائے احناف میں موصوف سے بڑھ کر علمِ حدیث کا کوئی عالم ہندوستان میں نہ تھا، علاوہ درس وتدریس سے مولانا سہارن پوری کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ حدیث کی قلمی کتابوں کو سخت محنت سے صحیح کر کے چھاپ کر عام کیا، چنانچہ ۱۲۶۵ھ میں جامع ترمذی اور ۱۲۶۷ھ میں صحیح بخاری شایع کی، مولانا شبلی مرحوم فرماتے تھے کہ استاذ مرحوم نے بیس برس کامل بخاری کی تصحیح وتحشیہ میں بسر کیے، اس زمانہ کے اکثر بڑے بڑے علمائے احناف محدث سہارن پوری کے شاگرد تھے، اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ عمل اور عمل کے ساتھ دولت کی برکت بھی عطا فرمائی تھی، پہلے کتابوں کی تصحیح وطباعت کی، پھر دوسری تجارتوں میں مصروف ہوئے، بایں ہمہ مولانا شبلی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ وہ بے حد منکسر، متواضع اور نیک تھے، کبھی مسجد میں امامت نہیں کی، چپکے سے مسجد میں جاتے اور جماعت میں شامل ہو کر واپس آجاتے، بازار سے سودا خرید کر خود لاتے تھے، مولوی شبلی صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ ایک دفعہ بازار میں مولانا کو میں نے دیکھا تو پیچھے پیچھے ساتھ ہو لیا کہ سودا میں لے لوں، مگر مولانا کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے اور خود اپنے ہاتھ سے لے کر گھر واپس آئے۔

۷؍ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ کو سہارن پور میں وفات پائی۔

اللہ تعالیٰ نے دنیاوی مال ودولت سے بھی متمتع فرمایا تھا، حج سے واپس آ کر دہلی میں مطبع قائم کیا اور کتبِ حدیث کی طبع واشاعت فرمائی، اس کام میں اللہ تعالیٰ نے برکت دی، مگر ۱۸۵۷ء کے غدر

میں سب کچھ لٹ گیا دو برس تک اپنے مکان ہی میں بیٹھ کر درس دیتے رہے، پھر شیخ الٰہی بخش صاحب رئیس کمپ میرٹھ کی طرف سے کلکتہ جا کر کاروبار جاری کیا، جس سے آپ کو پانچ سو ماہوار کی آمدنی تھی، اس زمانہ میں بھی شیخ صاحب کی اجازت سے صبح سے ۹ بجے تک مسجد حافظ جمال الدین صاحب میں جا کر درس دیتے تھے، تقریباً دس برس کلکتہ میں قیام رہا، اس کے بعد جب آپ کی عمر ساٹھ برس کی ہوئی تو استعفا دے کر کلکتہ سے چلے آئے اور پھر وطن میں بیٹھ کر ہمہ تن درس حدیث میں مصروف ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے آپ کے درس میں بھی برکت بخشی اور سیکڑوں علما اس فیض سے سرفراز ہوئے۔

آپ کی سندِ حدیث کو ہم یہاں تبرکاً اس غرض سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا شبلی کی سند بھی اپنے استاد سے اسی سلسلہ میں ہوسکتی تھی[1]۔

سندِ حدیث بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی سیدِ المرسلین وعلی اٰلہٖ وصحبہ اجمعین، اما بعد فیقول العبد الضعیف محمد اسحٰق عفی عنه ان الشیخ الناسك الحافظ احمد علی السهارنفوری قد حصّل قراء ۃ کتب الحدیث وسمعها عندی فی مکۃ المعظمة زاد اللّٰه شرفا و تکریماً بهذا التفصیل، إنّ الحافظ الموصوف قرء طرفاً من الصحیح البخاری وطرفاً سمع بقراء ۃ الغیر علی وکتاب تیسیر الاصول والجامع لابی عیسیٰ الترمذی و شمائله وکتاب النسائی وابن ماجة القزوینی والمؤطا للامام محمد بن الحسن الشیبانی ومسند ابی حنیفة من روایة الخصکفی والعدد لمحمد بن محمد الجزری صاحب الحصن الحصین قرأه علیّ من اولها الی آخرها بلا مشارکة الغیر فی القراء ۃ وکتاب الصحیح لمسلم وسنن ابی داؤد ایضاً اسندهما علی بتمامها قراءۃً وسماعة ومسند الدارمی قرأ علی قدراً معتداوشیئاً من الجامع الصغیر للسیوطی ومشکوٰۃ المصابیح والحصن الحصین والحرب الاعظم والورد الافخم لعلی القاری وایضاً سمع بقراء ۃ الغیر علی شرح النخبة فی اصول الحدیث و قرأ علی من التفاسیر شیئاً من المعالم للبغوی والبیضاوی والجلالین وجامع البیان وتفسیر الرحمانی وحصل لی الاجازۃ والقراء ۃ والسماعة من الشیخ الاجل والحبر الابجل الذی فاق بین الاقران بالتمییز اعنی الشیخ عبدالعزیز رحمه اللّٰه تعالیٰ وحصل له الاجازۃوالقراء ۃ والسماعة

[1] یہ سند اور مولانا احمد علی صاحب کے حالات میں نے ان کے صاحب زادہ مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارن پوری مرحوم سے خط لکھ کر منگوائے تھے۔ ''س''

من والده الشيخ ولی الله بن الشيخ عبدالرحيم الدهلوی واسانيد اکثر الكتب موجودة فی تصانيفه وقد اجزت الحافظ الناسك الشيخ احمد علی لقراء ة الكتب المذكورة ان يشتغل بها ويعلم المستفيدين بالشروط المعتبرة عند اهل الحديث والله المستعان وعليه التكلان وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

محمد اسحاق ۱۲۵۸ھ

طالب علمی میں مناظروں کا شوق مولانا کی تعلیم میں منطق کی عملی مشق کی جو کوشش مولانا فاروق صاحب نے فرمائی تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ وہ نہ صرف تحریر و تقریر بلکہ ہر مدعیانہ گفتگو میں منطقی ترتیب، استدلال اور اصول مناظرہ کو پیش نظر رکھتے تھے اور اس حیثیت سے ان کے عہد کے طالب علمانہ حلقوں میں ان کا نام خاص امتیاز رکھتا تھا، وہ جب طالب علموں کی کسی مجلس میں پہنچ جاتے کسی نہ کسی مسئلہ پر بحث چھڑ جاتی اور یہ اس زمانہ کا عام طرز تھا کہ طلبہ میں بات بات پر مناظرے ہوتے تھے، اس طرز میں ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ تیز اور ذہین طلبہ کی علمی مشق اس کے ذریعہ سے بڑھ جاتی تھی، مسائل زبانی یاد رکھنے کی عادت پڑتی تھی، باہمی منافست اور مسابقت میں طالب علم شروح و حواشی پڑھنے، سوال و جواب کرنے اور ہر روز کچھ آگے بڑھنے کے خوگر ہو جاتے تھے۔

مولوی حافظ شاہ تجمل حسین[۱] صاحب (دیسنوی بہاری) جو مؤلف کے ہم وطن اور رشتہ میں چچا تھے، وہ مولانا شبلی مرحوم کے ساتھی اور بعض بعض مدرسوں میں ان کے رفیق تھے، ایک دفعہ لکھنؤ میں میرے سامنے دونوں کی ملاقات ہوئی اور بے تکلفی کی طالب علمانہ زندگی شروع ہوگئی، مولانا نے حافظ صاحب

---

[۱] حافظ شاہ تجمل حسین صاحب مرحوم نے بڑے بڑے علما کی صحبت اٹھائی تھی، ان کے واقعات و حکایات دہراتے تھے تو سننے والے کو بڑا کیف آتا تھا، مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے مرید و خلیفہ تھے، بڑے باغ و بہار آدمی تھے، فکر و غم کبھی ان کے پاس نہ ہوتا تھا، باتیں بہت ظریفانہ کرتے تھے، ہر محفل اور ہر مجلس میں وہ دلچسپ ثابت ہوتے تھے، اونچے اونچے لوگوں سے ان کی ملاقاتیں تھیں، منشی امتیاز علی صاحب وزیر کے زمانہ میں بھوپال میں بہ ضمن علما ان کا وظیفہ تھا، اور وہیں رہتے تھے، وہ کبھی کسی سے رنجیدہ نہیں ہوتے تھے، اور کبھی کسی کی کڑی سے کڑی بات کا جواب نہیں دیتے تھے، ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتے تھے، مولانا شاہ فضل رحمٰن کی مدتوں صحبت اٹھائی تھی، ان کے حالات میں فیض رحمانی وغیرہ کئی کتابیں ہیں، "مولد ابی قاسم" سیرت میں ان کا چھوٹا سا رسالہ ہے، عمر بھر جہاں گردی میں بسر کی، اخیر عمر میں اپنے وطن (دیسنہ ضلع پٹنہ) میں بڑی عمر پا کر ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۴۲ھ کو وفات پائی اور وہیں وہاں کی مسجد کے پہلو میں دفن ہوئے، مکاتیب شبلی فارسی ۶ میں انہی حافظ تجمل حسین صاحب کا ذکر ہے۔

سے فرمایا کہ تم میرے شاگرد ہو میں نے تم کو قطبی (منطق کی ایک کتاب) پڑھائی تھی، حافظ صاحب نے جواب دیا تم مجھے قطبی پڑھاتے تھے کہ بڑا اخفش بنا کر اپنی منطق صاف کرتے تھے، پھر حافظ صاحب نے اپنا دوسرا احسان یاد دلایا کہ وہ یاد ہے جو سہارن پور کی جامع مسجد میں تم سے اور مفتی عبداللہ ٹونکی سے مناظرہ ہوا تھا اور پنجابی طلبہ ان کے ساتھ اور پوربی تمہارے ساتھ تھے اور آخر مناظرہ نے مجادلہ کی صورت اختیار کر لی اور ہم لوگ تم کو اپنی حفاظت میں لے کر قیام گاہ پر لوٹے وہ یہ کہہ رہے تھے اور مولانا مسکرا رہے تھے۔

مولانا نے خود بھی مکاتیب میں مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی کو اپنا ہم سبق لکھا ہے (شروانی-۹۱)

ہم سبقی سہارن پور میں ہوئی، جب وہ اور مولانا دونوں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری سے پڑھتے تھے، مفتی صاحب کے صاحب زادہ مفتی انوار الحق صاحب کی کتاب اثبات الوجود پر الندوہ (ستمبر ۱۹۱۰ء) میں لکھتے ہیں "وہ زمانہ یاد آ گیا جب ہم اور مولانا ے ممدوح (مفتی عبداللہ صاحب) ایک ساتھ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کے فیض سے خوشہ چینی کرتے تھے، سہارن پور جانے کے لیے جب مولانا گھر سے نکلے تو پہلی منزل لکھنو پڑی، یہاں ان کے بعض احباب فرنگی محل میں مولانا عبدالحی صاحب سے پڑھتے بھی تھے، وہ طالب علموں کے مجمع میں داروغہ حیدر[1] بخش کی مسجد میں جا کر ٹھہرے اور مناظرے شروع ہو گئے، مولانا نے جب اسکات المعتدی لکھی ہے تو اس کے جواب میں مولوی نور محمد صاحب ملتانی نے ۱۲۹۸ھ میں تذکرۃ المنتہی لکھی، اس کے دیباچہ میں مولانا کے متعلق عربی میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

---

[1] یہ مسجد لکھنؤ میں چوک کے بیچ میں اب بھی ہے، اوپر مسجد ہے نیچے دوکان ہے، مسجد میں ایک دو چھوٹے حجرے ہیں، یہ مسجد ایسی جگہ واقع ہے کہ اس کے ایک طرف فرنگی محل ہے جہاں عربی کے طلبا پڑھتے تھے اور دوسری طرف جھوائی ٹولہ ہے، جہاں طب پڑھنے والے پڑھتے ہیں، اس لیے یہاں علوم عربیہ اور فنون طبیہ کے طالب علموں کا ہمیشہ جمگھٹا رہتا تھا، کوٹھریوں میں طلبہ کا مختصر سامان رہتا تھا، صحن میں ان کا اٹھنا بیٹھنا اور سونا تھا، گو حالات بدل گئے ہیں مگر مسجد کی یہ خصوصیت اب بھی کسی قدر باقی ہے، طالب علمی میں سیکڑوں علمائے جید کے قیام کا شرف اس کو حاصل ہے۔

استاذی مولانا حفیظ اللہ صاحب سے معلوم ہوا کہ حیدر بخش مرحوم واجد علی شاہ کی کسی بیگم کی سرکار میں داروغگی کی خدمت پر دس پندرہ روپے کے ملازم تھے، داروغہ اس زمانہ میں نگراں کار کو کہتے تھے، اس زمانہ میں بیگمات جو پاپوش پہنتی تھیں ان میں موتی ٹکے رہتے تھے، یہ پاپوشیں پرانی ہونے پر داروغہ صاحب کو مل جاتی تھیں، وہ ان کے موتی الگ کر کے جوہریوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے، اور فراغت سے زندگی بسر کرتے تھے، اور اس سے بڑی دولت پیدا کر لی تھی، انہی نے یہ مسجد غالباً ۱۸۷۰ء کے قریب بنوائی تھی، اور مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی نے اس کا افتتاح اپنے وعظ سے فرمایا، مولوی حفیظ اللہ صاحب اسی زمانہ میں مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی سے پڑھنے کے لیے لکھنؤ تشریف لے گئے، اور مولانا عبدالحیٔ صاحب کی سفارش سے اس کا ایک حجرہ ان کو رہنے کے لیے ملا، فرماتے تھے کہ اس وقت وہ بالکل تازہ بنی ہوئی تھی۔

''مصنف اسکات المعدی جب اپنے رام پوری استاد (مولانا ارشاد حسین) کے پاس جارہا تھا تو لکھنؤ میں ٹھہرا، اور یہاں طالب علموں کی گرفت میں آ گیا تھا، طالب علموں سے مناظرہ کرتا تھا اور اس میں غیظ و غضب ظاہر کرتا تھا اور گفتگو میں بند ہو جاتا تھا تو جس کا حال طالب علموں کے مقابلہ میں ایسا ہو وہ علما کے مناظرے کے قابل ہے؟''

مولانا جب رام پور پہنچے تو یہ وہ زمانہ تھا جب رام پور میں مولانا عبدالحق خیرآبادی بن مولانا فضل حق خیرآبادی کے سبب سے معقولات کا بڑا شہرہ تھا، ہر طرف منطق اور فلسفہ کے پیچ در پیچ مباحث پر علما کی آستینیں چڑھی رہتی تھیں، یہی اثر وہاں کے طلبہ پر بھی تھا، مولانا رام پور پہنچے تو ہر طرف سے طالب علموں نے گھیر لیا، آخر ہر طرف سے سمٹ کر مولانا ارشاد حسین صاحب کے درس میں مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھتے ہیں کہ جب مولانا شبلی علی گڑھ سے جارہے تھے تو لکھنؤ ٹھہر گئے اور میں وہیں داروغہ حیدر بخش کی مسجد میں ان سے ملا تھا اور ان کے چہرہ سے محسوس کرتا تھا کہ یہاں کے طلبہ میں سے ہر ایک کو وہ وحشت و بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے، مگر باوجود اس وحشت کے طلبہ ہی میں سے تھے، جس وحشت و بدگمانی کا ذکر مولانا شرر فرماتے ہیں، وہ اسی مناظرانہ عادت کا اثر تھا۔

تکمیل | مولانا احمد علی صاحب کا آستانۂ علم مولانا کی آخری درس گاہ تھی، اس وقت سنن ترمذی کا درس ہو رہا تھا، کہ مولانا کے والد اور خاندان کے بعض اعزہ نے حج کا قصد کیا، مولانا کو بھی اس سفر کا شوق دامن گیر ہوا مگر ادھر حدیث رسول ﷺ کی کشش تھی اور ادھر روضہ رسول ﷺ کی، اس کشمکش میں مولانا نے خود اپنے شیخ کو اپنا رہبر بنایا اور ان سے مشورہ چاہا فرمایا کہ پڑھنا تو ہر وقت ہو سکتا ہے اور یہ سفر ہر وقت میسر نہیں آسکتا، چنانچہ مولانا نے بھی عزم سفر کیا اور سہارنپور سے بمبئی کو روانہ ہو گئے۔

اس وقت مولانا کی عمر ۱۹ برس کی تھی اور کل مدتِ تحصیل چودہ برس ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء سے تعلیم شروع اور ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں تمام ہوئی۔

سفر حج ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء | بمبئی سے حاجیوں کے اس مقدس قافلہ کے ساتھ مولانا بھی حجاز کو روانہ ہو گئے، اس واقعہ کا ذکر مولانا نے اپنے اس قصیدہ کے ایک شعر میں کیا ہے، جس میں انہوں نے ۱۸۹۲ء میں سفر قسطنطنیہ کے واقعات کو نظم کیا ہے۔

فارغ از حج و زیارت چو مرا کرد خدائے خواستم تا بسوئے روم شوم راہ سپر

۱؎ تذکرہ علمائے حال مولوی ادریس صاحب نگرامی، مطبوعہ نول کشور و انگریزی مضمون شاہ منیر عالم صاحب غازی پور شائع شدہ مسلم ریویو الہ آباد، اگست ۱۹۱۰ء، ص ۵۲۔

مولانا کے ایک شاگرد مولوی محمد عمر صاحب کی بیاض سے ایک مثنوی کے وہ چند شعر ملے ہیں، جن کو مولانا نے روضۂ اطہر کے سامنے پڑھا تھا:

اے بہ کرم کار جہاں کردہ ساز — ہر ہمہ را پیشِ تو روے نیاز

چو بہ درت آمدہ ام باامید — از کرمِ خویش مکن ناامید

چوں بہ درت آمدم امیدوار — سایۂ لطفے ز سرم بردار

اس مذہبی سفر میں مولانا کی علمی تگ ودو بھی جاری رہی، چنانچہ مدینہ منورہ میں جو کتب خانے ہیں، ان سب کی سیر کی، فرماتے تھے کہ فنون حدیث کا جو ذخیرہ وہاں دیکھا کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آیا، ابن عبدالبر کی کتاب التمہید کا جو موطا امام مالک کی شرح اور حدیث کی دائرۃ المعارف ہے، ایک مرتبہ ذکر آ گیا تو فرمایا ''میں نے مدینہ منورہ میں اس کا قلمی نسخہ دیکھا تھا۔''

اس سفر کے بعض عجیب اثر انگیز واقعات سنایا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ ایک صاحبِ حال ہندی حاجی کے والہانہ شوق کا یہ عالم تھا کہ برہنہ پا کوے یار کی منزلیں طے ہو رہی تھیں، تلوے کانٹوں سے چھلنی ہو رہے تھے، وہ چلتے چلتے تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئے تھے اور موچنے سے کانٹے نکال رہے تھے، مولانا بھی جا کر سامنے کھڑے ہو گئے، بیٹھنے کا اشارہ کیا اور نہایت پرسوز لہجے میں یہ شعر پڑھا:

آبلے روتے ہیں خوں، رنج بڑا ہوتا ہے — کوئی کانٹا جو کفِ پا سے جدا ہوتا ہے

اس سفر میں اہل عرب کی فیاضی، سادگی، غیرت مندی اور شریفانہ اخلاق کا بھی ان پر گہرا اثر پڑا تھا، چنانچہ مثال کے طور پر یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی میں اپنے شتربان کو کھانے کی کوئی چیز دیتا تو وہ ہرگز تنہا نہ کھاتے اور ھلمّوا کہہ کر آس پاس کے اور بدوؤں کو جمع کر لیتا اور سب کو تقسیم کر لینے کے بعد خود کھاتا، امتحاناً ایک مرتبہ اس کو صرف ایک بوٹی دی گئی جو کسی طرح قابل تقسیم نہ تھی، مگر شتربان نے اب بھی دوسرے ساتھیوں کو بلا کر ایک ایک ریشہ تقسیم کیا، تو مولانا نے اس سے پوچھا کہ آخر اس سے کیا نتیجہ ہوا، نہ تمھیں کو مزا ملا نہ تمہارے کسی ساتھی کو، شتربان نے اس کا جواب دیا، اس سے عرب کی شرافتِ قومی کا پتہ چلتا ہے، اس نے کہا یا شبلی ھذا عار علینا ان ناکل وحدنا (اے شبلی اکیلے کھا لینا ہمارے لیے عار ہے) مردانہ غیرت وخود داری اور شریفانہ عفو و درگذر کی مثالوں میں یہ واقعہ بیان فرماتے کہ ایک بار کسی منزل میں مولانا کے ساتھیوں نے ہانڈی چڑھا رکھی تھی، ایک بڈھا بدّو بار بار

ادھر سے گزرتا اور اس سے گرد اڑتی تھی، جو ہانڈی میں پڑتی تھی، مولانا کے ایک رفیق سفر نے بار بار منع کیا، مگر وہ نہ مانا، عاجز آ کر انہوں نے اس بدو کو ایک تھپڑ کھینچ مارا، بدو کے لیے یہ توہین ناقابل برداشت تھی، غصہ میں جو اس نے ایک آواز دی تو آس پاس کے تمام بدو جمع ہو گئے، یہ بڑھا بدو جوش انتقام میں بے تاب تھا، زمین سے تھوڑی سی خاک لے کر کفِ دست پر رکھتا اور پھونک مار کر اڑاتا کہ اس طرح تم کو برباد کر دوں گا، مولانا نے اس سے بہت لجاجت سے معافی مانگی تو معاف کیا، بہت ممکن ہے کہ علامہؒ مرحوم کے مندرجہ ذیل شعر کی مصوری اسی واقعہ سے ماخوذ ہے:

یا رَبی بر سید شبلی را کہ چوں بر باد رفت　　　　مشت خاکے در ہوا پیشش پریشاں کردہ ام

مولوی اقبال احمد صاحب سہیلؔ ناقل ہیں کہ غالباً ۱۸۹۹ء میں وہ علامہؒ مرحوم سے حماسہ پڑھتے تھے، ایک دن ابن زیابۃ التیمی کا یہ شعر سبق میں تھا:

الرمح لا املأ کفی بہ　　　　واللبد لا اتبع تزوالہ

نیزہ کو مٹھی بھر کر نہیں پکڑتا　　　　اور زین کے کھسکنے سے میں نہیں کھسکتا

اس شعر کی شرح میں مولانا نے حج کا ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک بدوی نے ان کو نیزہ بازی کا طریقہ عملاً سکھلایا، تب جا کر اس شعر کا مفہوم صحیح طور پر سمجھ میں آیا، فرمانے لگے کہ اہل عرب نیزے کے ڈانڈ کو مضبوط نہیں پکڑتے، بلکہ گرفت ڈھیلی رکھتے ہیں اور ہتھیلی اور انگلیوں سے جو حلقہ نیزہ کی گرفت کے لیے بناتے ہیں اس میں قصداً خلا چھوڑتے ہیں، اور نیزہ بازی کے وقت سارا زور بازو کی جنبش پر صرف کرتے ہیں تاکہ حریف کے جسم میں نیزے کی انی کافی حد تک پیوست ہو سکے، اسی طرح اصلی اور کتابی زبان کا فرق بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا کہ دورانِ حج میں جب مجھے عربی میں گفتگو کرنی پڑی تو نحو کی پوری پابندی کرتا اور گفتگو میں بھی اعراب کا پورا پورا لحاظ کرتا، یہ دیکھ کر جمال نے آخر ایک روز کہا کہ "یا شبلی انت نحوی" میں نے بہ وجہ ناواقفیت پہلے اس کو اپنی علمی لیاقت پر محمول کیا، مگر بعد کو پتہ چلا یہ تعریض تھی نہ کی تحسین۔

پہلا قومی کام ۱۸۷۷ء | جس زمانہ میں مولانا تعلیم سے فارغ ہوئے، دنیائے اسلام میں ایک بہت بڑی تحریک پھیل رہی تھی، وہ "اتحاد اسلامی" کی تحریک تھی، اس تحریک کے پہلے داعی سید جمال الدین افغانی مرحوم تھے، جنھوں نے آخر میں قسطنطنیہ میں قیام کر لیا تھا، یا قیام کرنے پر مجبور تھے، بہ ہر حال

سلطان عبدالحمید خاں نے جو "سلطان روم" کے نام سے اس زمانہ میں مشہور تھے، اس تحریک سے فائدہ اٹھایا اور دنیائے اسلام کی عظیم الشان سلطنت کے فرماں روا کی حیثیت سے ان کو ہر جگہ خلیفۂ اسلام اور امیر المومنین تسلیم کیا گیا اور ان کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا، جس وقت یہ تحریک اٹھی تو اس نے جس کی حریص نگاہیں آب نائے باسفورس کی زرّیں شاخوں پر ہمیشہ پڑتی رہتی تھی اور جس کی سلطنت میں تین کروڑ ترک مسلمان بستے تھے، جن سے وہ ڈرتا تھا، اس بات کا تہیہ کرلیا کہ وہ اس سلطنت کو مٹا کر دم لے گا، انگریز گو باسفورس کے ساحل پر روسیوں کا قبضہ برداشت نہیں کرسکتے تھے، لیکن دل سے چاہتے تھے کہ ترک کسی طرح مضبوط ہونے نہ پائیں، تاکہ کروڑوں مسلمان جو اس کی سلطنت میں بستے ہیں وہ ترک سلطان کے ایک اشارہ پر بغاوت کے لیے آمادہ نہ ہوجائیں، حالاں کہ یہ خیال سراب سے زیادہ بے حقیقت تھا۔

انہی حالات میں ۱۸۷۷ء میں روس اور روم (ترک) کی جنگ شروع ہوئی، اس جنگ نے اسلامی دنیا میں آگ سی لگا دی، ہر جگہ سلطان کی فتح ونصرت کی دعا مانگی جانے لگی، زخمیوں کے لیے چندے جمع کیے جانے لگے، اور سلطان کی حمایت میں بڑے زور وشور سے تقریریں ہونے لگیں، اور تحریریں لکھی جانے لگیں، مولانا شبلی مرحوم کا آغازِ شباب تھا، اس چنگاری نے ان کے تمام قوی کو مشتعل کردیا تھا، انہوں نے بڑی مستعدی سے اعظم گڑھ میں چندہ جمع کرنا شروع کیا اور ترکی سفیر بمبئی کے ذریعہ جن کا نام حسین حبیب آفندی تھا، قسطنطنیہ روانہ کیا، اپنے دوست حکیم محمد عمر صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں "چندۂ این شہر تا بہ دو ہزار وشش صد رسید، امید قوی است کہ از سہ ہزار بیشتر گردآید، .... سپاس ایزد کہ روسیانِ تبہ کار در روزِ پیکار کہ با عثمان پاشا کردہ بودند، ہشت ہزار طعمۂ جحیم شدند وبست و چہار ہزار زخمہائے گراں برداشتہ بر بستر خاک طپیدند، نسیم فتح وظفر بر پرچم علم سلطانی وزید، وبرادر شاہ گرینڈ ڈیوک نکلسن از بیم ضربت دلیران ترک از میاں رمید[1]"

سفر نامہ میں لکھتے ہیں "حسین حبیب آفندی جو کسی زمانہ میں بمبئی میں ٹرکش کانسل تھے، اور اب قسطنطنیہ میں پولیس کمشنر ہیں، وہ مجھ کو اس ذریعہ سے جانتے تھے کہ محاربۂ روس میں میں نے بہ حیثیت سکریٹری انجمن تین ہزار کی رقم ان کے ذریعہ سے قسطنطنیہ کو روانہ کی تھی" اسی سفر نامہ میں عثمان پاشا کا ذکر ایسے لفظوں میں کرتے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں جو ان کے سفر نامہ کی تاریخ ہے،

[1] مکاتیب شبلی فارسی۔

۱۸۷۷ء کی جنگِ پلونا کے شیر عثمان پاشا کے شجاعانہ کارناموں کی یاد ان کے دل میں کس طرح باقی تھی، یہ وہی نامور جنرل ہے جس نے پلونا میں ۲۴ ہزار روسی مجروح اور آٹھ ہزار تہِ تیغ کیے تھے جس کے مقابلہ میں شہنشاہ روس نے اپنی کل فوجی قوت صرف کر دی تھی اور خود سپہ سالار بن کر گیا تھا، جس نے باوجود فوج کی کمی اور رسد کی قلت کے روس کی مجموعی طاقت کا مدت تک مقابلہ کیا اور میدان جنگ میں زخمی ہو کر گرفتار ہوا تو خود شہنشاہ روس نے اس کے کمر میں تلوار باندھی اور مہینوں تک اپنا مہمان رکھا، یہ واقعات اسی زمانہ میں اخبارات کے ذریعہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو گئے تھے اور بچہ بچہ اس نامور بہادر کے نام سے واقف ہو گیا تھا، قسطنطنیہ میں اگرچہ کسی فوجی افسر سے نہیں ملا، لیکن یہ کیوں کر ممکن تھا کہ ایسے نادرۂ روزگار کے دیکھنے کا شوق دل میں نہ ہوتا[1]، مولانا مرحوم کے دل میں اسی زمانہ سے جس اتحادِ اسلامی کا جذبہ پیدا ہوا، واقعات بتائیں گے کہ اخیر اخیر وقت تک وہ ان کے دل سے نہیں نکلا، بلکہ وقتاً فوقتاً اور اندر ہی اندر جڑ پکڑتا گیا۔

ان ایام میں مولانا کے علمی اور ادبی مشاغل ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۲ء تک | مولانا ۱۸۸۲ء تک اعظم گڑھ اور اس کے اطراف میں رہے، کبھی وکالت کا امتحان دیا، کبھی ملازمت کی، کبھی نیل کی تجارت اور زمین داری کا کام دیکھا، مگر ان تمام بے اطمینانیوں اور ہنگاموں کے ساتھ ان کے علمی، ادبی، مذہبی اور قومی مشاغل ہر حال میں جاری رہے۔

تعلیم و تدریس کی خدمت ہمارے علما کی زندگی کا لازمی جز رہا ہے، خواہ کوئی وزارت کی کرسی پر ہوں یا قضا و افتا کی مسند پر یا اور کسی سرکاری خدمت پر کیوں کہ یہ مشاغل دنیا ان کو اپنے اصلی فرض سے غافل نہیں رکھتے تھے، چناں چہ فرنگی محل کے وہ اکثر علما جو نوابی کے زمانہ میں افتا کی خدمت پر مامور تھے، یہاں تک کہ مولانا کے استاذ الاستاذ مفتی محمد یوسف صاحب بھی جب تک لکھنؤ میں مفتی رہے، درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے رہے، یہی حال اس زمانہ کے دوسرے سرکاری عہدہ دار علما کا تھا، مثلاً مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی سررشتہ دار دہلی، مفتی عنایت احمد صاحب، مفتی صدر الدین صاحب دہلی، مفتی سعد اللہ صاحب مراد آبادی وغیرہ یہ سب لوگ اپنے سرکاری عہدوں کے ساتھ درس و تدریس میں مصروف تھے، مولانا کے استاذ مولوی محمد فاروق صاحب کبھی کبھی وکالت کیا کرتے تھے، ساتھ ہی وہیں مقدمات کے کاغذوں کے ساتھ طلبہ کے اسباق کی کتابیں بھی کھلی رہتی تھیں۔

---

[1] سفرنامہ غازی عثمان پاشا کی ملاقات۔

شاہ منیر عالم صاحب غازی پوری مرحوم نے اگست ۱۹۱۲ء کے مسلم ریویو الہ آبادی میں مولانا شبلی کے حالات پر انگریزی میں جو مضمون لکھا ہے اور جس کے واقعات خود مولانا کے بتائے ہوئے ہیں، اس میں لکھا ہے "تکمیل سے فراغت کے بعد انہوں نے دو برس درس و تدریس اور مناظرہ و تلقین میں بسر کیے"۔

اس زمانہ میں مولانا جن لوگوں کو پڑھاتے رہے، ان میں سب سے پہلا اور بڑا نام تو خود مولانا کے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کا ہے، جو عمر میں مولانا سے سات آٹھ برس چھوٹے تھے، دوسرے صاحب مولوی محمد سمیع صاحب مرحوم ہیں جو مولانا کے نہایت عزیز اور مطیع شاگرد تھے، ان کی کتابیں پوری نہیں ہوئیں، لیکن ان کا فارسی مذاق بہت اچھا تھا، وہ اسی زمانہ میں یعنی ۱۸۸۲ء میں عدالت میں نقل نویس ہوئے اور بعد کو ترقی کر کے ججی کے محافظ دفتر ہو گئے تھے۔[۱]

مولانا کے اکثر پرانے خطوط اور قصائد ان ہی کے پاس محفوظ تھے، تیسرے صاحب دینا پارہ (اعظم گڑھ) کے مولوی محمد عمر صاحب تھے، جو بعد کو جون پور کے مدرسہ میں چلے گئے، مولانا کی ابتدائی فارسی غزلیں اور نامے انہی سے ملے، اسی زمانہ میں اپنے دلی دوست و ہم وطن حکیم مولوی محمد عمر صاحب بندولی کو فارسی میں خط لکھتے ہیں، "دریں فرصت بہ ادب کار دارم، خود چیزے از ادب می خوانم، و دیوانِ حماسہ بہ دیگرے می آموزم۔"

معلوم نہیں یہ حماسہ کس کو پڑھاتے تھے، اکبر صاحب اور عثمان صاحب وغیرہ بعض دوسرے عزیزوں کو بھی اس زمانہ میں کچھ نہ کچھ پڑھایا کرتے تھے، ۱۰ر مارچ ۱۸۸۱ء کو اپنے ایک شاگرد مولوی محمد عمر صاحب دینا پاروی کو لکھتے ہیں "دریں روز ہا دکان کشادہ ام و تن بہ آموختن کساں دردادہ" (نامۂ فارسی۔۱۳)

اس زمانہ میں مولانا کا دوسرا شغل شعر و شاعری تھا، اس زمانہ کے بعض سربرآوردہ علما جیسے مفتی صدر الدین آزردہ جو غالب کے ہم عصر اور دوست تھے، فارسی کے ساتھ اردو کے بھی شاعر تھے، مولانا فیض الحسن صاحب عربی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے، مولانا فاروق صاحب خود بھی شاعر تھے اور نہ صرف شاعر تھے، بلکہ موسیقی کا فن بہت اچھا جانتے تھے، مولانا فرماتے تھے کہ مولوی صاحب اکثر رات کے تیسرے پہر اٹھا دیتے اور پوچھتے شبلی بھیرویں سنو گے؟ پھر گا کر بتاتے، قومی جلسوں میں مولانا شبلی مرحوم جس پُر اثر لے میں اپنے قصیدے پڑھتے تھے، فرماتے تھے کہ وہ بھی استاد ہی کا فیض تھا۔

---

[۱] استاد کی وفات کے دو برس بعد ۱۹۱۶ء میں وفات پائی۔

اس زمانہ میں عموماً فارسی غزلیں کہتے، فارسی قصیدے لکھتے، فارسی نامے بڑی محنت سے انشا کرتے اور اردو شاعری کا تو ان دنوں عام چرچا تھا، خود اعظم گڑھ میں مشاعرے کرتے، غزلیں پڑھی جاتیں، واہ واہ کا شور بلند ہوتا۔

ان کی اسی زمانہ کی ایک چیز رزمیۂ کابل وقندز ہے، ۵رصفر ۱۳۰۰ھ یعنی تقریباً ۱۸۸۲ء کی لکھی ہوئی، اس کی نقل ہمارے سامنے ہے، اعظم گڑھ میں کوئی انگریز تھا، جس نے محاربۂ کابل وقندھار میں شرکت کی تھی اور انگریزی شعر میں اس کا کچھ حال نظم کیا تھا، اس نے مولانا کے والد سے خواہش کی کہ اس کو کوئی اردو نظم میں ترجمہ کردے، یہ کام مولانا نے اپنے ذمہ لیا، اردو ترجمہ نثر میں سن لیتے اور اس کو نظم کرلیتے، شروع کے شعر یہ ہیں:

لو سنو تیغ و سناں کی داستاں — رایت وطبل و نشاں کی داستاں
پہلوانانِ جہاں کی داستاں — شاہ کے اعزاز و شاں کی داستاں

حکمرانِ بحر و کاں کی فتح ہے
قیصر ہندوستاں کی فتح ہے

والیٔ کابل نے جب کی سرکشی — ملک میں اپنے سفارت منع کی
غیر سے ڈالا تھا طرحِ آشتی — ہو چلا تھا کچھ خیالِ خود سری
روس پر تھا جو گمانِ اختیار — ہاتھ سے چھوٹی عنانِ اختیار
سنتے ہی فرمانِ دارائے جہاں — ہوگئی آراستہ فوجِ گراں
تھا رسالہ آٹھواں بنگال کا — ساتھ جس کے ہم ہوئے تھے رہ گزا

اس کے بعد انگریز افسروں کا اور سفر کی منزلوں کا اور واپسی کا تذکرہ ہے، جنرل بیپس اور ڈاکٹر رائٹ کے نام اس میں خصوصیت سے لئے گئے ہیں۔

اس زمانہ میں مولانا کا دوسرا کام غیر مقلدوں کا رد تھا، اس رد میں جو ان کو غلو تھا، اس کی پرورش میں ان کے استاد مولانا محمد فاروق صاحب کا خاص ہاتھ تھا، بندول اور جیراج پور دونوں گاؤں بالکل ملے جلے ہیں، بیچ میں شاید ایک میل سے بھی کم کا فصل ہو، بندول مولانا شبلی کا اور جیراج پور مولانا سلامت اللہ[1]

[1] مولانا سلامت اللہ صاحب حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری (استاذ جامعہ ملیہ دہلی) کے والد بزرگوار تھے، مولانا سلامت اللہ صاحب آخر میں نواب صدیق حسن خاں کی طلب پر بھوپال چلے گئے تھے، نواب صاحب نے وظیفہ کردیا تھا، اور بھوپال کے بعض مدرسوں کے اہتمام کی خدمت سپرد کردی تھی، ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں وفات پائی، ہمارے استاد مولانا حفیظ اللہ صاحب بھی ان کے ابتدائی شاگردوں میں ہیں۔

صاحب کا وطن تھا، مولانا سلامت اللہ صاحب نے پہلے جون پور کے مدرسہ میں جا کر مفتی محمد یوسف صاحب سے علوم کی تکمیل کی، پھر بنارس میں پڑھا اور پھر دہلی پہنچ کر مولانا سید نذیر حسین صاحب سے حدیث پڑھی اور اس کے بعد نہایت انہماک کے ساتھ اپنے وطن واپس آ کر ترکِ تقلید اور آمین بالجہر، رفع یدین اور قرأت فاتحہ خلف الامام وغیرہ مسائل کی اشاعت کے لیے وعظ و تبلیغ شروع کی، نتیجہ یہ ہوا کہ اعظم گڑھ کے اطراف میں تقلید و عدمِ تقلید اور ان فقہی مسائل کا شور مچ گیا۔

خود مولانا شبلی کے حقیقی ماموں اور مولانا حمید الدین صاحب کے عمِ محترم مولوی محمد سلیم صاحب جو پھریہا ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے اور مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی، قاضی شیخ محمد صاحب مچھلی شہری اور مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری کے شاگرد تھے، پورے غیر مقلد تھے (مکاتیب میں ان کا ذکر ہے ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء میں وفات پائی) ان کے سبب سے گویا یوں کہیے کہ خود مولانا شبلی کے خاندان میں آ کر تفرقہ پڑ گیا تھا۔

غرض یہ اسباب تھے جن کی بنا پر مولانا شبلی نے غیر مقلدین کے رد کے لیے کمر ہمت چست باندھی، سنا ہے کہ جب یہ سن پاتے کہ فلاں گاؤں میں کوئی غیر مقلد ہوا ہے یا آیا ہے تو گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچ جاتے اور مناظرہ کا چیلنج دیتے، مناظرانہ تقریروں کے علاوہ اس راہ میں تحریری خدمت بھی انجام دی، اپنے اور اپنے عزیزوں اور شاگردوں کے ناموں سے تحریریں اور رسالے لکھے، جن میں بعض چھپے اور بعض قلمی رہے، اُدھر سے مولانا سلامت اللہ صاحب اور رواں ضلع اعظم گڑھ کے مولوی اسد اللہ صاحب المتوفی ۱۳۳۹ھ جو مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری کے شاگرد تھے، مقابلہ کو نکلے، دونوں طرف سے رسالے لکھے گئے، مناظرے ہوئے، اشتہارات ہوئے اور وہ سب کچھ ہوا جو ہونا چاہیے۔

اس عہد میں مولانا شبلی مرحوم نے جو رسالے لکھے، ان میں سے صرف ایک کا مجھ کو علم ہے اور وہ ''ظل الغمام فی مسئلۃ القرأۃ خلف الامام'' ہے، یہ چالیس صفحوں کا اردو رسالہ ہے، جو ۱۲۹۲ھ میں کان پور کے مشہور مطبع نظامی میں چھپا تھا، یہ مولانا سلامت اللہ صاحب کے کسی رسالہ کے جواب میں ہے، اس میں پہلے اپنے مدعا یعنی ترکِ قرأت کو قرآن و حدیث سے ثابت کیا ہے اور آخر میں مخالف کے حدیث و فقہ کے حوالوں اور دلیلوں کی غلطی دکھائی ہے۔

اس رسالہ کا دیباچہ ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں:

''کیا عبرت کا مقام ہے، افسوس کا وقت ہے، زمانہ کا دور آخر ہے، اہل بزم اٹھتے جاتے ہیں، محفل برہم ہو چلی، سحر ہونے کو آئی، وہ روشن اور بزم افروز شمع اسلام سنبھالا لے رہی ہے، ادھر باد مخالف کے جھونکے چلنے لگے، اب تک تو خیر تھی کیوں کہ شمع ہنوز حمایت علما کی فانوس میں اغیاروں کے دستِ ستم سے محفوظ تھی، لیجیے اب اپنے بیگانے ہوگئے، خود محفل والوں میں سے حضرات غیر مقلدین چاروں طرف سے اُسے گل کرنے کو دوڑے، وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُجْرِمُوْنَ[1] ط

جمعیتِ اسلام برہم ہو چکی تھی، اعدانے دین کو بے کس و بے چارہ سمجھ کر دستِ تعدی دراز کر رکھا تھا، وقت یہ تھا کہ ہم سب ایک بنتے، دینی عزت کو دنیاوی جاہ و وقار کے ساتھ حاصل کرتے، ملحدوں کے تیر باراں اعتراضات کو استدلال و احتجاج کی سپر پر روکتے، جس طرح اسلام ہمیشہ مظفر و منصور رہتا آیا ہے، آج بھی اُس کے نقارۂ فتح وظفر کی صدا غنیم کے لشکر میں گونجتی، مگر بے دردوں کو اس سے کیا غرض انہوں نے نام و نمود کے پیچھے جمعیت اسلام کو وہ درہم برہم کیا کہ جماعت اسلامی کے تمام ارکان ہل گئے اور اس کی مضبوط و پائے دار بنا متزلزل ہوگئی، جمعہ جماعت میں تفرقہ پڑ گیا، سب و شتم سے گذر کر طعن و ضرب کی نوبت پہنچی، رفتہ رفتہ گورنمنٹ کو دخل دینا پڑا اور ہماری مذہبی نزاع جس میں علما اور مجتہدین کے فیصلے نا قابل تسلیم قرار دیے گئے تھے، اب احکام انگریزی نے فیصل کیے، فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ۔

غیر مقلدین اگر اپنے استنباطات کو صحیح سمجھتے تھے، سمجھتے اور اس پر کار بند ہوتے، مگر یہاں تو وہ مثل ہے

ع ''میں تو ڈوبا ہوں و لے تجھ کو بھی لے ڈوں گا''

اشتہار جاری ہوئے، رسالے چھپے، آخر اس پر دم لیا کہ ہم مذہب حنفی پر اعتراضات رکھتے ہیں، جو جواب دے وہ انعام لے، علمائے حنفیہ کو اوّل تو درس و تدریس و دیگر مشاغل علمی سے فرصت کہاں دوسرے وہ سمجھے کہ قلم اٹھایئے تو کس پر، جواب لکھئے تو کس کا؟ اس تمام فرقۂ جدیدہ میں دو ایک کے سوا کسی نے درس نظامیہ کی پوری کتابیں بھی نہیں پڑھیں، نہ کسی کا اعتداد علما میں ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا احمد علی محدّث مرحوم و جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدرسِ دیوبند و جناب مولانا محمد عبدالحیؒ صاحب وغیرہم کو بہت کم اس بارے میں لکھنے کا اتفاق ہوا، ادھر یہ بھی خیال کہ کس سے مقابلہ کیجیے، مسلمانوں سے:

---

[1] آیت قرآنی میں قصداً تبدیلی کر دی ہے۔ ''س''۔

رازِ معشوق نہ افشا ہو جائے ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

حضرات غیر مقلدین اس بے اتفاقی اور عدم اعتنا کو داخلِ عجز سمجھے اور بھی تیز ہوئے، خم ٹھوک میدانِ مناظرہ میں کود پڑے، مگر علمائے حنفیہ ان چھوٹی جوڑوں کے مقابل آنے کیوں لگے، تاہم اگر کسی عالم حنفی نے عنانِ التفات ایک ذرا ادھر پھیر دی تو مدتوں کے لیے فرصت ہوگئی، ایک انتصار الحق کا جواب مرپٹ کر الٹا سیدھا، آٹھ دس برس میں تیار ہوا، سو بھی کیا، کاغذ بادی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، ہر چند اس شور و فتنہ انگیزی پر بھی ہم کو خانہ جنگی سے احتراز رہا ہے، مگر صرف اس خیال سے کہ (شعر سعدی)

چو باسفلہ گوئی بہ لطف و خوشی فزوں گرودش کبر و گردن کشی

مناسب معلوم ہوا کہ تھوڑی سی دار و گیر کر دی جائے، اس پر بھی اگر باز نہ آئے تو پھر پوری خبر لی جائے۔

اصل مقصود

واضح ہو کہ اس فرقہ نو کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم قرآن و حدیث کے پیرو ہیں اور بہ مقابلۂ حدیث نبوی ﷺ کسی امام و مجتہد کے قول کو سند نہیں لاتے، اس رسالہ میں بہ ضمن مسائل قرأتِ فاتحہ خلف الامام دو باتوں کا ثابت کرنا منظور ہے، ایک یہ کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب قرآن و حدیث سے صاف صاف ثابت ہے، پس غیر مقلدوں کا یہ بیان کہ چوں کہ امام صاحب کا مذہب احادیث سے خلاف ہے، اس لیے ہم اس پر عمل نہیں کرتے، بالکل از راہِ فریب و مکر ہے، دوسرے یہ کہ حضراتِ غیر مقلدین حدیثوں میں کس قدر کذب و افترا کو کام میں لاتے ہیں اور عوام کو دامِ فریب میں پھنساتے ہیں، اے برادران اسلام اس رسالہ کو خوب غور و فکر سے دیکھو اور جب تمہیں ثابت ہو جاوے کہ یہ لوگ حدیثوں کی سند میں فریب اور کذب اختیار کرتے ہیں، تو ان سے بے زار ہو جاؤ اور پھر ان کے دامِ فریب میں نہ آؤ۔

امرِ اوّل واضح ہو کہ غیر مقلدین کا یہ دعویٰ ہے کہ "مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنا امام کے پیچھے واجب ہے، ہر نماز میں خواہ وہ سرّی ہو خواہ جہری، ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مقتدی کو کسی قسم کی نماز میں قرأت فاتحہ کرنا مستحب بھی نہیں اور واجب کا تو کیا مذکور، اب ہم وہ دلائل پیش کرتے ہیں، جس سے ہمارا مدعا ثابت اور ان کا دعویٰ باطل ہوتا ہے۔"

اس مقدمہ کو میں نے یہاں اس غرض سے نقل کیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ علی گڑھ جانے سے پہلے ہی مولانا کے قلم میں اردو انشا پردازی کا کتنا زور تھا، نیز یہ کہ دماغ اور تحریر کا سلجھاؤ سرسید کی

ملاقات اور ادبی تاثر سے پہلے بھی کس قدر تھا، دعویٰ اور دلیل کی ترتیب اور الجھے ہوئے مسئلوں کو سلجھا کر کہنے کا سلیقہ ان میں فطری تھا، تیسری بات اس سے ان کا وہ تاثر ظاہر ہوتا ہے، جو اس نازک زمانہ میں باہمی فرقہ آرائیوں سے ان کے دل کو پہنچتا تھا۔

احناف میں مولانا ابوالحسنات عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی ''قرأت خلف الامام'' کے مسئلہ میں ایک معتدل روش رکھتے تھے، یعنی ان کو اس مسئلہ میں وہ غلو نہ تھا، جو اس زمانہ کے دوسرے علمائے احناف کو تھا، مولانا موصوف نے ۱۲۹۴ھ میں ''امام الکلام فی ما یتعلق بالقرأۃ خلف الامام'' کے نام سے ایک مفصل کتاب بہ طور محاکمہ کے لکھی تھی اور اس میں فقہائے اربعہ کے مسلک کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا اور نتیجہ یہ نکالا تھا کہ ائمہ احناف کے نزدیک امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا متفق علیہ مسئلہ نہیں ہے، جیسا کہ سمجھا جاتا ہے، بلکہ بعض پڑھنے کے بھی قائل ہیں اور کم از کم یہ کہ مقتدی پر فاتحہ کا پڑھنا نہ حرام ہے نہ مکروہ، بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ وہ شافعیوں کی طرح اس کا پڑھنا ہر حال میں واجب نہیں سمجھتے، آخر میں مولانا عبدالحیٔ صاحب نے اپنی تحقیق یہ ظاہر فرمائی ہے کہ جہری میں امام کے سکتات یعنی سورۂ فاتحہ پڑھنے میں جہاں جہاں امام چپ ہو اور سرّی میں عام طور سے مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھے۔

عام علمائے احناف کی طرح مولانا شبلی مرحوم کا یہ خیال تھا کہ امام کے پیچھے قرأت فاتحہ نہ صرف یہ کہ واجب نہیں بلکہ مکروہ ہے، اسی بنا پر ''اسکات المعتدی علی انصات المقتدی'' کے نام سے ۲۴ صفحوں کا ایک مختصر رسالہ عربی میں لکھا اور مشہور مطبع نظامی کان پور میں ۱۲۹۸ھ میں اس کو چھپوایا، اس کے چھپوانے کا خرچ ان کے چچا شیخ مجیب اللہ نے اپنے ذمہ لیا (نامۂ فارسی-۲۴) رسالہ چھپا اور شائع ہوا، اور لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، یہاں تک کہ ہندوستان سے نکل کر مصر وشام اور روم تک پہنچ گیا، ۱۳۰۹ھ-۱۸۹۲ء میں جب مولانا نے اسلامی ملکوں کا سفر کیا، تو اس رسالہ کے مصنف کی حیثیت سے بعض علما نے ان کی بڑی قدر کی تھی، مولانا نے اپنے سفر نامہ میں اس واقعہ کا خود ذکر کیا ہے۔ (ص ۳۶)

اس رسالہ میں مولانا شبلیؒ نے تین میں قال بعض العلما لکھ کر مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی کی تحقیق کا رد کیا تھا اور بین السطور میں مولانا عبدالحیٔ صاحب کے نام کی بھی تصریح کر دی تھی، لوگوں میں اس کا چرچا ہوا[1]، رسالہ کی زبان بہت ہی ادیبانہ ہے، دیباچہ میں مشکل الفاظ قصداً لائے گئے ہیں جو

---

[1] ایماضات کے مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے ''لکنہ لما کان ظن العوام انہ قد اصاب فی ما رام علی انہ لا یکاد ان یحوم حول المرام صرفت الیہ عنان العنایۃ'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے مولانا شبلیؒ کے رسالے کو پسند کیا تھا اور ان کی مقبولیت ہو چکی تھی۔

خاص مولانا فاروق صاحب کا ڈھنگ تھا۔

یہ رسالہ جب مولانا عبدالحئیؒ صاحب اور ان کے شاگردوں تک پہنچا تو انہوں نے اس کے جوابات لکھے اور چھپوائے، ان میں سے پہلا جوابی رسالہ مولانا عبدالحئیؒ صاحب کے شاگرد مولانا نور محمد صاحب ملتانی نے لکھا، رسالہ کا نام "تذکرۃ المنتھی فی ردّ اسکات المعتدی" ہے، ان ہی کا دوسرا مختصر رسالہ "الافادات فی ردّ الاسکات" ہے اور تیسرا "التنبیھات علی ھفوات الاسکات" ہے چوتھا رسالہ "الایماضات الی اغلاط مصنف الاسکات" حافظ ملا شعیب حنفی کابلی باجوری کا ہے، یہ مجموعہ ۱۲۹۸ھ میں مطبع انوار محمدی لکھنؤ میں چھپا، اس کے آخر میں حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری کے ایک شاگرد وعزیز کی مدحیہ تاریخ ہے گو خود مولانا عبدالحئیؒ صاحب نے اس رسالہ کا بہ راہِ راست جواب نہیں دیا، لیکن چند سال کے بعد انہوں نے اپنے رسالہ "امام الکلام" کو دوبارہ چھپوایا، تو غیث الغمام کے نام سے اس پر ایک حاشیہ بڑھایا، جس میں من جملہ اور دوسری باتوں کے مولانا سے تعرض کیے بغیر ان کے اعتراضوں کے جواب دیے ہیں۔

مولانا فرماتے تھے کہ ان ہی دنوں میں ایک دفعہ مولانا عبدالحئیؒ صاحب فرنگی محلی سے جا کر ملا تھا، تو مولانا ممدوح نے احناف کی باہمی خانہ جنگی پر افسوس ظاہر کیا، اور فرمایا کہ ہم آپس میں لڑتے ہیں اور اہل حدیث کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ وہ کس طرح آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے رہتے اور کام کرتے ہیں، مولانا شبلی مرحوم فرماتے تھے کہ:

"مولانا کا اشارہ میرے رسالہ کی طرف تھا، اس لیے مجھ ندامت ہوئی۔"

اس رسالہ میں بھی وہ دو باتیں جو ان کے فضل وکمال کا طرۂ امتیاز تھیں، موجود ہیں، ایک منطقیانہ ترتیب وحسن استدلال اور دوسری عربی انشا پردازی، اسی لیے جن لوگوں نے اس کے جواب لکھے، انہوں نے بھی اپنے جوابی رسالوں میں ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھا ہے، مولانا ان جوابی رسالوں کے جواب کے لیے بھی پوری طرح تیار تھے، نامۂ فارسی ۱۴ میں ۱۷/ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو لکھتے ہیں:

"انشاءاللہ در اندک زمانے از عہدۂ ردّ تذکرہ بدرمی آیم مردمان گویند کہ ایماضات ورسالۂ دیگر ہم از حافظ صاحب است، تا حال بر علم واستعداد حافظ صاحب اعتمادے داشتم، اکنوں آں ہم برخاست، انشاءاللہ در قریب وقتے بہ غازی پوری رسم ودریں اغلاط و یا لغزہائے مصنفِ تذکرہ وایماضات ہمہ باز خواہم گفت۔"

اس تذکرہ اور ایماضات سے اوپر کے وہی دونوں رسالے مقصود ہیں۔

اردو زبان وادب کی طرف گو ان دنوں مولانا کی توجہ بہت کم تھی، پھر بھی مولانا کے شباب کا یہ عہد وہ تھا جب لوگ ادھر متوجہ ہو چکے تھے اور ہر قسم کے اخبارات اور رسالے نکلنے لگے تھے، ۱۸۷۷ء سے منشی سجاد حسین صاحب مرحوم کا ظریفانہ اخبار اودھ پنچ نکلنا شروع ہو چکا تھا، اس زمانہ میں اس اخبار میں اچھے اچھے ادیب اور شاعر مضمون لکھا کرتے تھے، اخبار سیاسیات میں کانگریس کا حامی تھا اور سر سید کی مخالفت میں نہایت شوخ مضامین لکھا کرتا تھا، مولانا مرحوم اس اخبار کو ان دنوں بڑی دلچسپی سے پڑھا اور زبان کا لطف اٹھایا کرتے تھے، میر اکبر حسین (یعنی اکبر الہ آبادی) سے مولانا کی واقفیت اسی اخبار کے ذریعہ علی گڑھ جانے سے پہلے ہو چکی تھی اور اودھ پنچ میں ان کی چھپی ہوئی بعض نظمیں مولانا کو اخیر زمانہ تک یاد تھیں اور خود مجھے سنائی تھیں۔

اس زمانہ میں لکھنؤ سے اردو غزلیات کا ایک دل چسپ ماہوار گلدستہ پیام یار کے نام سے منشی نثار حسین نکالا کرتے تھے، چوک میں داروغہ حیدر بخش کی مسجد کے پاس ان کی دوکان[1] تھی اور مسجد کی سامنے والی گلی میں ان کا عطر کا کارخانہ تھا، اور اسی میں ان کے اس گلدستہ کا بھی دفتر تھا جو ہر مہینہ مشام روح کو

[1] مرزا محمد عسکری صاحب بی، اے (لکھنؤ) مترجم تاریخ ادب اردو جو مولانا کے پرانے ملنے والے تھے، اپنی اس کتاب کے حاشیہ میں لکھتے ہیں: ''منشی نثار حسین مرحوم اڈیٹر'' پیام یار'' مولانا کے ایک بے تکلف دوست تھے، ان کی چوک میں عطر کی دوکان تھی، جب مولانا لکھنؤ میں قیام کرتے تو سبزی منڈی میں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز کے مکان پر فروکش ہوتے اور سہ پہر کو منشی نثار حسین کی دوکان پر جو قریب ہی تھی، آبیٹھتے تھے، یہاں اکثر احباب کمال کا مجمع ہوتا تھا، جس میں مولوی عبدالحلیم شرر، شوق، قدوائی، للن صاحب خورشید، الو صاحب جلیس، سید شہنشاہ حسین رضوی وکیل مرحوم اور بے تکلف احباب جمع ہوتے اور گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے، وزیر تمبولی کی خوش ذائقہ گلوریوں اور حسین بخش ساقی کے معطر حقہ سے احباب کی ضیافت کی جاتی، کبھی کبھی پنڈت رتن ناتھ سرشار کوٹ پتلون ڈاٹے، عینک لگائے، آنکھیں مچکاتے اور ہنستے اس جلسہ میں شریک ہو جاتے، اور اپنی پرلطف باتوں سے سب کو محظوظ کرتے، ایک دن جب کہ یہ سب یاران طریقت جمع اور مولانا بھی تشریف فرما تھے، شاید چھٹیں یا ساتویں تاریخ محرم کی تھی، وقت ۷-۸ بجے شام، چوک میں بڑا مجمع تھا، تعزیے مع جلوس اور باجوں وغیرہ کے نکل رہے تھے، شور وغل اور مجمع کی کوئی حد نہ تھی، سب لوگ اس سیر میں مشغول، مگر مولانا دوکان کی کوٹھری میں بند کسی کتاب کے مطالعہ میں جو کسی کاتب سے لکھائی گئی تھی، اس قدر مشغول ومنہمک تھے کہ باوجود دوستوں کے سخت اصرار کے بھی سر اٹھا کر نہ دیکھا، اور اپنا کام کرتے رہے، یہاں تک کہ پوری کتاب اسی حالت میں تقریباً ۱۰-۱۱ بجے تک ختم کر دی، غالباً علی گڑھ کے ابتدائی قیام کا واقعہ ہے۔

اپنے کلام سے معطر کرتا تھا، مولانا اس کو بھی پڑھتے تھے اور شاید اسی تعلق سے ان ہی منشی نثار حسین صاحب کے ذریعہ سے مولانا کی مثنوی ''صبح امید'' اور ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' پہلی دفعہ چھپی۔

اس زمانہ کی بعض اردو غزلیں مکاتیب میں ملتی ہیں اور بعض پرانے شاگردوں کی بیاضوں میں نقل ہیں۔

کتابوں کا مطالعہ اور نادر کتابوں کی تلاش مولانا کا فطری ذوق تھا جو اس زمانہ میں بھی موجود تھا، اس زمانہ کا نقطۂ نظر کچھ اور تھا، فرماتے تھے کہ اعظم گڑھ میں کتابوں کی کوئی دکان تھی، مولانا اکثر اس میں چلے جاتے اور شام تک علمی کتابیں پڑھا کرتے، یا دواوین دیکھا کرتے، اس زمانہ کے خطوں میں بھی اس کا تذکرہ ہے، مولوی محمد عمر صاحب دیناپاری کو فارسی میں ۱۷ر مارچ ۱۸۸۱ء کو بستی سے جہاں وکالت کر رہے تھے جون پور لکھتے ہیں:

''درآنجا کتاب ہائے نایافت فراہم آرند'' (نامۂ فارسی-۳)

''ابن ابی حجلہ تلمسانی حنفی المتوفی ۷۷۶ھ کی ایک تالیف کا نام دیوان الصبابہ ہے، اس میں اس نے عرب عشاق کے واقعات اور عشق و محبت کی لطیف عربی نظمیں اور غزلیں جمع کی ہیں، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ مولانا شبلی کے پاس تھا، جو اس وقت دارالمصنفین میں ہے، اس دیوان کے اوراق میں مولانا کے دستِ خاص کا ایک عربی خط کسی کے نام لکھا ہوا رہ گیا ہے، اس نسخہ پر سعدالدین حیدر علوی ۱۲۳۹ھ کی مہر ہے اور آخر میں سعدالدین حیدر صاحب کی تحریر ہے کہ ''یہ نسخہ میرے ماموں سید محمد حسن خاں نے ۱۲۴۴ھ میں مجھے عنایت فرمایا، بہرحال اس دیوان کے اوراق میں مولانا شبلی مرحوم کی حسب ذیل عربی تحریر ہے۔

سَلام عَلَيكُم	سلام علیکم
هٰذا ديوان الصبابة يصل اليكم	یہ دیوان الصبابہ آپ کے پاس جارہا ہے، میں خود نہ
واما انی فلا يمكننی حضورلديكم لا	آسکوں گا، اس لیے نہیں کہ میں کسی غیر مفید شغل میں
لانی اشتغلت بامور غير طائلة وقعدت	مصروف ہوں اور میری ہمت بیٹھ گئی ہے اور میں نے عنان
همتی، وصرفت عذان العناية الى الدنيا	توجہ دنیائے دنی کی طرف موڑ دی ہے اور علم و ادب میں
الدنية وبرئت من تحصيل كمال العلم	حصولِ کمال کی کوششوں سے میں نے اپنی ذمہ داری اٹھا
والادب ذمتی فانی بحمد الله خلقت و	لی، میں بحمداللہ اس طرح بنا ہوں کہ فضل وکمال کے حصول کا

کسب الفضل سیط من دمی، فھو لا یفارقنی ان شاء اللّٰہ فی حالتی و جودی وعدمی ،بل لانی لملازمتی لھذہ العھدۃِ الرذیلۃ ادوم اتفکر فی حالتی فیزید ھمی ویزداد ملالتی وبیدکم الانصاف، ما ھذاالا الجور والاعتساف فصبر جمیل وھو حسبی و نعم الوکیل۔ (۱۲۔ش نعمانی)	جذبہ میرے خون میں ملا ہے، جوانشاءاللہ مجھ سے نہ جیتے نہ مرتے کبھی جدا ہوگا، بلکہ میرے نہ آنے کا سبب یہ ہے کہ میں نے جو یہ معمولی سی ملازمت کرلی ہے،اس کے سبب سے میں ہمیشہ اپنی نسبت سوچا کرتا ہوں، اس سے میرا حزن وملال بڑھ جاتا ہے، انصاف آپ کے ہاتھ میں ہے، اور میری نسبت اس کے سوا کچھ سمجھنا صریح ظلم ہے،صبر اس حالت میں خوب ہے، اور اللہ تعالیٰ مجھے بس ہے، اور کیسا کارساز ہے۔

یہ خط غالباً ۱۸۸۱ء یا ۱۸۸۲ء کا ہے، کیوں کہ مولوی محمد عمر صاحب کی بیاض دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''ش نعمانی'' کر کے دست خط وہ اسی زمانہ میں کرتے تھے،اس خط سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ ان کی عربی انشا اسی زمانہ میں کیسی صاف دل چسپ، فصیح اور خالص عربی میں ہونے لگی تھی اور جو ہندوستانیت اور متاخرین کے تکلفاتِ باردہ سے بالکل پاک ہے، دوسرے نادر کتابوں کے دیکھنے اور پڑھنے کے شوق کا اندازہ ہوتا ہے، تیسرے یہ کہ ان کا مرغِ ہمت اپنے لیے ہمیشہ بلند آشیانہ کا طالب تھا۔

اسی دورِ ابتلا میں ایک دوست کو لکھتے ہیں:

''نفسے چند کہ از پیش گاہِ یزدِ دانا ودیعت آوردہ ام سزائے آن است کہ سررشتہ اش بہ ایں چنیں کارہا بند باشد، دیگراں نہ دانم تا در سر چہ دارند من خود دریں خیال از کشمکش و آویزش فکر فارغ نشستہ ام کہ بایں ہمہ خوار یہا ہماں شبلی ام کہ بودہ ام واگرگاہے بختم یاوری کرد ہماں خواہم بود کہ ہستم'' (نامۂ فارسی ۱۲)

وکالت کی تعلیم ۱۸۷۹ء و ۱۸۸۰ء ہر باپ کی طرح مولانا کے والد بھی یہ چاہتے تھے کہ پڑھنا پڑھانا جوان کے نزدیک بے شغلی کا ایک کام تھا، چھوڑ کر وہ کسب معاش کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے لیے مولانا کے والد کی نگاہ میں وکالت کا پیشہ موزوں نظر آیا، کیوں کہ اعظم گڑھ میں اس وقت مولانا کے والد اور ماموں بڑے کام یاب وکیل تھے، اس لیے قدرتی طور پر مولانا کے والد نے یہی شاہ راہِ عمل ان کے لیے تجویز کی، مگر خود مولانا کی بلند فطرت اور مذاق سلیم کو یہ چیز کھٹکتی تھی، چنانچہ ایک دوست کو لکھتے ہیں:

''از تطاولِ دہر بہ حفظ قانون مشغول ہستم، بیلیم سروی ہم دریں کار اند'' (نامۂ فارسی ۸۰)

بایں ہمہ باپ کے حکم سے مجبور ہو کر بادلِ ناخواستہ قانون کی ورق گردانی شروع کی، ہرروز

کچھ قانونی دفعات یاد کر لیتے اور اپنے چھوٹے بھائی مہدی مرحوم کو جو اس زمانہ میں انگریزی پڑھ رہے تھے، سنا دیا کرتے، امتحان کا وقت آیا تو مولانا امتحان دینے کے لیے تیار نہ تھے، مگر والد کے اصرار سے امتحان کی فیس بھیجی گئی، اتفاق یہ کہ اتنی ہی تیاری پر مسٹر مہدی مرحوم کو بھی تفریحاً امتحانِ وکالت میں شرکت کا خیال پیدا ہوا اور فیس بھیج دی، حالاں کہ نہ ان کا ارادہ وکالت کا تھا نہ انہوں نے پوری تیاری کی تھی، صرف مولانا کے اسباق سن سن کر کچھ مسائل حافظہ میں رہ گئے تھے۔

مولانا کو غالباً اپنے جوابی پرچوں کی کم زوری کا احساس تھا، اس لیے امتحان دے کر وہ الہ آباد میں کالون صاحب سے جو ان کے والد کے دوست تھے اور جو ان دنوں اس امتحان کے ممتحن ہوا کرتے تھے، ملے لیکن جب ان سے یہ معلوم ہوا کہ وہ اس سال ممتحن نہیں تو ملول ہوئے، دیوانِ حافظ میں فال دیکھی تو یہ شعر نکلا:

آنچہ سعیست من اندر طلبت بنمودم   ایں قدر ہست کہ تغییر قضا نتواں کرد

اس شعر نے اور بھی افسردہ خاطر کیا اور لوگوں کا یہ طعن کہ انگریزی کے بغیر کوئی بڑی نوکری نہیں مل سکتی دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہا، اپنے بھائی مہدی مرحوم کو لکھتے ہیں:

"حیاک اللہ دی با کالون صاحب برخوردم از نام ونسب پرسید، ہمہ باز گفتم، بہ تعظیم تمام پیش آمد و معذرت خواست کہ امسال صحفِ اردو نگریستن نہ خواہم، دل زدہ بخانہ رسیدم واز دیوان غیب تفاول خواستم، ایں شعر برآمد"

آنچہ سعیست من اندر طلبت بنمودم   ایں قدر ہست کہ تغییر قضا نتواں کرد

ناامیدی را خیر مقدم گفتم و در پسِ زانوے حرماں نشستم، ہمانا در دل خواہی گفت کہ بایں ہمہ آزادی بہ بیتے دل بستن وکاسۂ آرزو بر سر پاش شکستن، یعنی چہ؟ مگر چہ تواں کرد کہ بسنگ آمد و فتح خانہ دل از تراکم افکار تنگ آمد، دوسہ سالے است کہ پائے طلب در دامن کشیدم و بچیزے نہ رسیدم، عزیزان گویند کہ بغیر از تعلم انگریزی نخواہی بسر بردو ایں خود چہ حرف است جمعے را بیں کہ ہیچ از انگریزی نخواندہ اند، و باز بمناصب جلیلہ می رسند، آخر در تحصیلداری وغیرہ او خود مشروط نیست، فی الجملہ ستیزۂ خرچ آویزش بخت برآنم آورد کہ لختے از عمر بہ بادیۂ پیمائی و ہرزہ درائی گذارم[1]" بہرحال نتیجہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا، مولانا امتحان

---

[1] مکاتیب نامہ ہائے فارسی، ۴۔

میں ناکام یاب رہے، اور عجیب بات یہ کہ مہدی حسن پاس ہو گئے، اس واقعہ سے مولانا کی غیرت کو سخت ٹھیس لگی اور تہیہ کر لیا کہ اب وکالت پاس کر ہی کے دم لیں گے، چنانچہ اس غرض کے لیے انہوں نے پہلے قانون کی ایک ایک کتاب کو بالاستیعاب پڑھ کر اصولی کلیات مرتب کیے اور دفعات کے جزئیات کو محفوظ رکھنے کے خیال سے چند مختصر اشارات وضع کیے، اس طرح پر ایک اپنا خلاصہ مرتب کیا، اس دماغی کاوش کی بہ دولت مسائلِ قانونی پر خود عبور ہو گیا، اور دوسرے سال ۱۸۸۰ء میں پاس ہو گئے، مولانا کا یہ خلاصہ اتنا کار آمد ثابت ہوا کہ اس کی مدد سے ان کے چند احباب بھی وکالت کے امتحان میں کام یاب ہوئے۔

اعظم گڑھ میں وکالت ۱۸۸۱ء کام یابی کے بعد اپنے والد کے اصرار سے وہ وکالت پر آمادہ ہوئے، مگر اس راہ میں ان کی ایمان داری اور سچائی کی بنا پر ہر قدم پر ان کو مشکلات کا سامنا ہوا، اُن کے یہ دن عجیب کشمکش میں گذرے، علی گڑھ جانے کے بعد ۱۶؍ جنوری ۱۸۸۴ء کو اپنی موجودہ چھوٹی نوکری سے گھبرا کر دوبارہ وکالت کا خیال کر کے کانپتے تھے، اپنے چچا کو ایک خط میں لکھتے ہیں "والد قبلہ را جز بوکالت روئے ورا ہے نیست و بایں آزادہ دلی اگر بوکالت نہ ساختہ باشم در نظرِ انصاف مرا دریں میانہ گنا ہے، نخواہد بود، در ظلِّ والد قبلہ ہستیم ہمچنیں خواہد بود، آہ! ازاں ہنگام کہ دولت روئے گرداند، وکار بدستِ من افتد و دران آشوب، و لے برجانے ندارم وخواست و ناخواست روے بوکالت آرم، وخویش را اندازہ نہ نہم، مرد ماں را بہ ہرزہ ولادت فریب دہم وایں خواری بخویش در پذیرم وہم بدین ذلت و خشکی حسد و شکم باز دہم" (۳) بہر حال مولانا نے والد کے کہنے سے ۱۸۸۱ء میں اعظم گڑھ میں وکالت شروع کی، مگر اس عزم وارادہ کے ساتھ کی کہ ایک حرف بھی حق وصداقت کے سوا زبان یا قلم سے نہ نکلے گا، ظاہر ہے کہ ضلع کی وکالت ان شرائط کے ساتھ نبھ نہیں سکتی تھی، چند دنوں کے تجربہ نے خود مولانا کے والد پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ اس ورع وتقویٰ کے ساتھ ان سے یہ وکالت کا پیشہ جو قدم قدم پر رنگ آمیزی کا محتاج ہے، چل نہیں سکتا۔

ملازمت ۱۸۸۲ء وکالت کے بعد پڑھے لکھے آدمیوں کا شغل ملازمت سمجھا جاتا ہے، اور اس زمانہ میں تو چھوٹی سے چھوٹی سرکاری ملازمت بھی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، نواب وقار الملک وغیرہ بہت سے مشہور اکابر قوم نے ان ہی معمولی ملازمتوں سے ترقی پائی تھی، شیخ صاحب کا خیال بھی قدرتی طور پر اسی جانب مائل ہوا اور مولانا کو عدالتِ کلکٹری میں قائم مقام نقل نویس کی ملازمت دلوادی، تنخواہ دس روپیے ماہ وار تھی، جس میں سے نو روپیے تو مکان سے کچہری تک کرایہ آمد ورفت میں اٹھ جاتے تھے،

اس کے بعد قرق امین کی اسامی عارضی طور پر خالی ہوئی تو اس کی بھی قائم مقامی کی اور امانت کے فرائض اس دیانت سے انجام دیے کہ اہل معاملہ کے ہاں پانی پینا تو بڑی چیز ہے ان کے سایۂ دیوار میں آرام کرنا بھی معصیت سمجھتے، گرمیوں کا موسم، رمضان کا مہینہ، تپتی ہوئی دوپہر اور جھلسا دینے والی دھوپ میں روزہ رکھے ہوئے، گاؤں گاؤں گھوڑے پر سوار پھرا کرتے تھے، افطار و سحر کا کوئی سامان نہ ہوتا، سائیس دال وچاول اُبال دیتا، اسی کو کھا لیتے، ان مصائب کو پھر بھی وکالت پر ترجیح دیتے۔

چناں چہ اپنے ایک عزیز کو اسی زمانہ میں ۲۵ر اگست ۱۸۸۲ء کو ایک خط لکھا ہے، جس میں فرماتے ہیں: ''ماہے دو در کارِ امانت روز از شب نشناختم و در راہِ طلب از غایتِ جدوجہد تاب وتواں در باختم غریب تر حالیست منکہ از آشفتہ سری وشوریدہ مزاجی تن بآمیزش کسے نمی دادم اکنوں از فرخی طالع و ہمایونی بخت کارم بخار وخس افتادہ است، مگر من وخدائے من کہ ایں ہمہ محنت پژدہی ونفس گذاری از اں دوست تر دارم کہ تر ہاتے چند درہم بافند ودروغ راست مانارا پیش کساں جلوہ ظہور وفروغ قبول دہند''، (نامہ فارسی-۲۰) مولانا مصیبتیں جھیل سکتے تھے اور محنت ودیانت کے ساتھ اپنے فرایض انجام دے سکتے تھے، مگر ان افسروں کی درباداری کا سلیقہ کہاں تھا، اور اس کے بغیر ملازمت اور وہ بھی ماتحتی کی ملتی کیوں کر، اور مل بھی جائے تو چلتی کے دن، چنانچہ امانت کے اس چند روزہ دوادوش کا انجام خود انہی کی زبانی سنیے، اسی خط میں فرماتے ہیں: ''وہر چند کہ دریں راہ پر خطر دو اسپہ تاختم ودر آنجا ایں کار سر کس و ناکس ساختم مگر بایں ہمہ بہ جائے نہ رسیدم وخواست وناخواست پائے ارادت در دامن قناعت کشیدم فرمانِ تقرر ہم نہ دادند تا بہ سند کار گذاری چہ رسد۔ (نامۂ فارسی-۲۰)

نیل کا کام ۱۸۸۲ء مولانا کے والد زمین داری کے ساتھ نیل سازی کی تجارت وسیع پیمانے پر کرتے تھے اور اپنے علاقہ میں نیل کے متعدد کارخانے (جو ان اطراف میں گودام کہے جاتے ہیں) کھول رکھے تھے، مولانا کی بے شغلی دیکھ کر ان کے والد نے اس کام کی نگرانی ان کے سپرد کی، صبر وشکر کے ساتھ کچھ دنوں یہ کام بھی سر انجام دیا، ایک دوست کو لکھتے ہیں: ''چو ازیں کشمکش فارغ نشستم دیگرے روئے داد، یعنی کارم بہ گودام ومتعلقاتِ او افتاد وہر چند آں چناں کارے سزائے ایں ہیچ کارہ نبود، مگر مرا از امتثالِ امرِ حضرت قبلہ گاہی چارہ نہ بود''۔ (نامۂ فارسی-۱۴)

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

بستی میں وکالت اخیر ۱۸۸۲ء اس زمانہ میں ضلع بستی میں مولوی محمد کامل صاحب ولید پوری منصف تھے، وہ اتفاق سے اعظم گڑھ آئے اور مولانا کو وکالت کے لیے اپنے ساتھ بستی لے گئے، چنانچہ ۱۸۸۲ء میں چند مہینے بستی میں وکالت کی۔

مولانا کا اپنی طالب علمانہ زندگی پر اپنا آپ تبصرہ خوش قسمتی سے ہم کو مولانا کا ایک خط جو ۲۳ر ستمبر ۱۹۱۲ء کو سید محمد فاروق صاحب شاہ پوری کے نام لکھا گیا تھا، مل گیا، مکتوب الیہ نے یہ خط معارف نومبر ۱۹۲۳ء میں چھپوایا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں ''علمی شوق والد اور گھر کی تربیت کا اثر تھا، خاندان میں علم کا چرچا تھا اور تمام بزرگ مصروف علم تھے، اس زمانہ کی طالب علمی بہت مشکل تھی، یکہ پر سفر کرتے تھے، پیدل بھی چلنا پڑتا تھا، یہ سب میں نے خوشی سے گوارا کیا، دو دفعہ والد کی اجازت کے بغیر چپکے نکل گیا، یہ خاص انتظام رہا، (اور اس میں میں منفرد تھا) کہ ہر فن مثلاً ادب، منطق، حدیث، اصول فقہ کے لیے ان ہی علما کے پاس دور دراز کا سفر کر کے گیا جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے، مثلاً حدیث کے لیے مولانا احمد علی سہارن پوری، ادب کے لیے مولانا فیض الحسن لاہور میں۔

والد اور تمام خاندان کی مرضی بلکہ حکم تھا کہ میں علمی مشاغل کو چھوڑ کر وکالت اور ملازمت کروں، چنانچہ مجبور ہو کر امتحان دیا اور کام یاب ہوا، چند روز وکالت کی، لیکن وکالت اور ملازمت سب چھوڑ دی اور علمی اشغال میں مصروف ہوا اور اس لیے معمولی معاوضہ پر اول علی گڑھ کی پروفیسری ۴۰ر روپے ماہ وار پر ... ملازمت تو اکثر علمی ہی اختیار کی، لیکن وکالت اور سرکاری ملازمت کے زمانہ میں بھی درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا اور یہ فطرت تھی'' مولانا ان چھوٹی چھوٹی ملازمتوں اور وکالت سے بعد و عدم مناسبت کے سبب تنگ دل رہتے تھے، بایں ہمہ ان کی بلند نظری اور علوے ہمت ان کو ان کے روشن مستقبل کی بشارت دیتی تھی، ۲۵ر اگست ۱۸۸۲ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں ''بایں ہمہ خوار یہا ہماں شبلی ام کہ بودہ ام واگر گاہے بختم یاد آوری کرد ہماں خواہم بود کہ ہستم''۔ (نامۂ فارسی-۲۰)

علی گڑھ کا سفر ۱۸۸۱ء اور سرسید سے ملاقات آخر وہ وقت بھی آ گیا جو اس پیشین گوئی کے پورے ہونے کے لیے مقرر تھا، علی گڑھ کی تحریک اس زمانہ میں سب سے پر زور تحریک تھی، اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو نئی تعلیم سے آراستہ کیا جائے، سرسید مرحوم چوں کہ مشرقی اضلاع میں بہت دنوں تک رہے تھے، اس لیے اس تحریک نے ان اطراف کے مسلمانوں میں کافی اثر پیدا کر لیا تھا، اور خود مولانا کے والد شیخ

حبیب اللہ صاحب اس کے زبردست حامی ہو گئے تھے، اس کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے منجھلے بیٹے مہدی حسن صاحب کو حافظ بنانے کے بعد اپریل ۱۸۷۶ء میں انگریزی پڑھانا شروع کیا اور ان کو علی گڑھ کالج کے اسکول میں تعلیم کے لیے بھیجا، جہاں وہ ۱۸۸۱ء تک رہے اور وہیں سے اس سال انٹرنس پاس کیا، اکتوبر ۱۸۸۱ء میں شیخ صاحب مولانا کو لے کر مہدی حسن مرحوم سے ملنے کے لیے علی گڑھ تشریف لے گئے، منادیٔ غیب نے آواز دی ''آمد آن یارے کہ ما می خواستیم'' مولانا گئے تو خالی ہاتھ نہیں گئے، سرسید کی مدح میں عربی کا ایک قصیدہ لے کر ساتھ گئے، سرسید نے اس قصیدہ کو دیکھا تو اس کے تیور، زبان اور طرز ادا کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور قصیدہ کو اپنے اخبار علی گڑھ گزٹ (مورخہ ۱۵/ اکتوبر ۱۸۸۱ء)[1] میں چھپوا دیا۔

المجد یصحب علما حیثما یصل — والعلم عن قومنا لازال یرتحل

بزرگی جہاں جاتی ہے، علم کو بھی ساتھ لے جاتی ہے، حالاں کہ علم ہماری قوم سے رخصت ہو رہا ہے۔

نالوا من الذّل ما لا نالہ احد — اذ لا یری فیھم علم و لا عمل

ہماری قوم کو وہ ذلت حاصل ہے جو کسی کو حاصل نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ ان میں نہ علم نظر آتا نہ عمل

ولا تزال تری ینشث شملھم — فی کُلّ یومٍ وقد ضاقت بھم حیل

ان کا شیرازہ برابر بکھر رہا ہے اور ان کے لیے تمام راستے بند ہو گئے ہیں۔

لا یرغبون الی ما کان ینفعھم — فجلّ صنعتھم للغی والخطل

مفید چیزوں کی طرف ان کا میلان بھی نہیں ہے، ان کا تمام تر کارنامہ گم راہی اور پریشان رائی ہے۔

تراھم الیوم فی کأبٍ و فی قلقٍ — فلا افاد فتیلا ما بہ اشتغلوا

آج تم ان کو رنج وغم میں مبتلا دیکھ رہے ہو ان کے مشاغل نے ان کو ذرہ بھر بھی فائدہ نہیں پہنچایا۔

لا ینتھون وقد ذاقو وبالھم — عن سوء صنعٍ فقد باؤا بما عموا

باوجودے کہ اپنی بداعمالیوں کا مزہ چکھ چکے لیکن ان سے باز نہیں آتے، نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے اعمال کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں۔

وھل یجازیھم الا بما اکتسبوا — من کان من عندہ الاحکام تنفصل

خدا جو معاملات کا فیصلہ کرتا ہے کیا اس کے سوا ان کو اور کوئی معاوضہ دے سکتا تھا

فمن سعی الیَوم فی اصلاح حالھم — فاللّٰہ جازیہ یوم یقطع الامل

پس جس شخص نے ان کی اصلاح کے لیے کوشش کی، خدا اس کو قیامت میں صلہ دے گا۔

---

[1] علی گڑھ گزٹ مورخہ ۱۵/ اکتوبر ۱۸۸۱ء جلد ۱۶، نمبر ۸، ص ۱۱۷۵۔

ان کنت تسئلنی من هذه صفته　　قلت الامام الهمام السید البطل

اگر تم مجھ سے پوچھو کہ وہ کون ہے؟ تو میں کہوں گا ، امام سردار، بہادر، سید،

هو الّذی فاق فی الآفاق منزلةً　　ونال ما لم تنله الاعصر الأول

وہ وہ ہے کہ تمام ملک میں بلند رتبہ ہوا، اور وہ بات حاصل کی جو قدما کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

من اقبل الدین والدنیا علیه معا　　والآن فی نجح ما قدر ام مشتغلٌ

جس کو ایک ساتھ دین و دنیا دونوں ملے اور اب تک اپنے مقاصد کی کام یابی میں مشغول ہے

نال المکارم من آبائه ومشیٰ　　فی المکرمات علی آثار ما فعلوا

اپنے آبا و اجداد سے فضائل حاصل کیے اور اس شاہ راہ میں ان کے نقش قدم پر چلا

فجدّہ سید الاعراب والعجم　　قد قال یا امتی لمّا دنا الاجل

اس کے دادا عرب وعجم کے سردار تھے، اور ان کی موت کا وقت آیا تو صرف اُمتی کا لفظ ان کی زبان سے نکلا۔

وهکذا صُنعُ هذا السید العلم　　یقول یا لهف قومی یسیء ما عملوا

اسی طرح اس نام ور سید نے کہا کہ افسوس میری قوم نے جو کچھ کیا، برا کیا،

یا خیر من سیط حب القوم من دمه　　احسن ولا تبتئس من سوء ما عملوا

اے ان لوگوں میں بہتر جن کے خون میں قوم کی محبت پیوست ہوگئی ہے، عمدہ کام کر اور جو برائیاں قوم نے کیں، ان سے غم زدہ نہ ہو۔

اَحسِنُ الیهمُ ولو جازوك سیّئةً　　ولا تبال بما قالوا وما فعلوا

ان کے ساتھ احسان کر، گو وہ تیرے ساتھ برائی کریں اور جو کچھ وہ کہیں اور جو کچھ کریں اس کی پروا نہ کر۔

اس قصیدہ میں اگر چہ فن کی بعض کم زوریاں ہیں لیکن اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے جب یہ طرز ہندوستان میں مفقود تھا اور متنبّی وغیرہ شعرائے متاخرین کے تتبع کے سوا ہندوستان کے علمائے ادب کے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا، ادب عربی کی یہ نئی شاہ راہ جو مولانا فیض الحسن صاحب کی رہ نمائی سے ان کو نظر آئی خاص توجہ کی مستحق ہے، اس قصیدہ میں صاف نظر آتا ہے کہ شاعر خالص عرب شعرا کے کلام کی نقل کرنا چاہتا ہے، قصیدہ میں سرسید کی طرف دو باتوں کی تعریف ہے، ایک ان کے حسب ونسب وسیادت کی اور دوسرے ان کے قومی کاموں کی، ان دونوں باتوں کے بیان میں کسی کا مداحانہ غلو اور پیشہ ور شاعروں کی طرح گدا گرانہ مذلّت وابتذال نہیں اور یہی چیز شاعر کی بلند خیالی، علوئے نفس اور مذہبی برتری کو ظاہر کرتی ہے۔

غالباً اس پہلی ملاقات میں ہلکا اثر سرسید کے دل و دماغ پر اس لیے بھی رہ گیا ہوگا کہ وہ مولانا کے استاد مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی سے پوری طرح واقف اور ان کے بھائی مولانا عنایت رسول صاحب چریا کوٹی کے فضل و کمال کے خوشہ چیں تھے۔

علی گڑھ کالج کا تعلق ۱۸۸۳ء اس واقعہ کے سال ڈیڑھ سال بعد کالج کے مشرقی زبانوں کے ایک معلّم کی ضرورت ہوئی، اس وقت اس دھندلی سی یاد کو تیز کرنے کا موقع آیا، مولانا فیض الحسن کی تصدیق و توثیق سے درخواست بھیجی اور بستی سے جہاں وہ وکالت کر رہے تھے لکھنؤ ہوتے ہوئے علی گڑھ گئے[1]، اس زمانہ میں محمد آباد اعظم گڑھ کے ڈپٹی محمد کریم صاحب وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے، مولانا علی گڑھ جا کر ڈپٹی صاحب کے یہاں مقیم ہوئے اور ڈپٹی صاحب کی وساطت سے سرسید کے عزیز دوست اور رفیق کار مولوی محمد سمیع اللہ خاں[2] سے ملے، انہوں نے کالج کی عربی و فارسی تعلیم کے لیے مولانا کا انتخاب کیا اور سرسید سے ملایا[3]۔

بہرحال دونوں کی پسند سے مولانا کا تقرر اسسٹنٹ عربک[4] پروفیسر کے عہدہ پر جنوری ۱۸۸۳ء

---

[1] مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے مولانا کی وفات پر جو مضمون دل گداز میں لکھا تھا، اس میں اس موقع پر لکھتے ہیں، علی گڑھ کالج کو عربی کے اچھے ادیب اور فاضل مدرس کی ضرورت ہوئی، انہوں (مولانا شبلی) نے مولوی فیض الحسن صاحب کی تصدیق و سفارش سے درخواست بھیجی، سید صاحب نے مولانا کی درخواست کو قبول کرلیا، چنانچہ مولانا بستی اور وہاں کے مشاغل کو چھوڑ کر لکھنؤ ہوتے ہوئے علی گڑھ گئے، میں اس وقت داروغہ حیدر بخش کی مسجد میں ان سے ملا تھا۔ [2] مولوی سمیع اللہ خاں دلی کے عمائد میں سے تھے، عربی کے فارغ التحصیل عالم، مفتی صدرالدین خاں آزردہ کے شاگرد، ان کی قانونی نکتہ سنجی مسلم تھی، اولاً ہائی کورٹ میں وکالت کی، نامور ہوئے، انگریزی داں وکلاء آئے تو یہ طبقہ ہٹا، سب ججیاں ان کو دی گئیں، مولوی صاحب کا باوجود دیوانی حاکم ہونے کے رعب اس قدر تھا کہ سارا ضلع مرعوب تھا، ایک بار پنڈت اجودھیا ناتھ کو بحث کرتے وقت سراجلاس ڈانٹا اور پنڈت نے معافی چاہی، بہت وجیہ اور شان دار، دارالسلطنت کے اعلیٰ شرفا کا نمونہ تھے، سرسید کے دست راست، آخر میں دونوں میں بعض مسائل پر سخت اختلاف ہوگیا اور وہ علی گڑھ سے علاحدہ ہوکر الہ آباد چلے آئے، اور یہاں الہ آباد یونیورسٹی کے قریب مسلم ہاسٹل کی عمارت بنوائی جواب تک یادگار ہے، ان کے صاحب زادہ نواب سربلند جنگ بہادر مرحوم تھے، (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی) [3] مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے مولانا کی وفات پر ۲۰ جنوری ۱۹۱۵ء کے علی گڑھ گزٹ میں اس موقع پر لکھا تھا، "نوجوانی میں علی گڑھ تشریف لائے، خاں بہادر محمد کریم اس زمانہ میں یہاں کے ڈپٹی کلکٹر تھے، ان کے توسل سے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم سے ملے، مولوی صاحب ممدوح کو خداوند تعالیٰ نے جوہر شناسی کا ملکہ بخشا تھا، کتنے آدمی ان کی جوہر شناسی کی بہ دولت کیا سے کیا ہوگئے، مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے ان کو کالج کی پروفیسری کے لیے انتخاب کرکے سرسید احمد خاں کے سامنے پیش کیا۔ [4] اس وقت کالج میں عربی پروفیسر مولوی محمد اکبر تھے۔

کی کسی آخری تاریخ میں چالیس روپے ماہ وار پر ہوگیا اور پہلی فروری ۱۸۸۳ء سے کالج کا کام شروع کیا، کالج میں ایف،اے اور بی،اے کے لڑکوں کو فارسی اور انٹرنس اور سکنڈ کے لڑکوں کو عربی پڑھانے[1] لگے، کالج کے فارسی کورس میں ان دنوں درہ نادرہ اور دیوانِ عرفی شامل تھا، یہی دونوں کتابیں پڑھانے کو ملیں[2]۔

بہر حال اس وقت چالیس روپے ماہ وار کی نوکری مولانا کے حساس دل کے لیے ایک چھپا زخم تھا، اسی زمانہ میں ایک دوست کو لکھتے ہیں: ''ایں جا کہ آرمیدہ ام وایں مذلّت برخویش پسندیدہ، نہ دانم کہ تا چرخ رادریں پردہ چہ نیرنگیہا است[3]''مولانا ایک دفعہ فرماتے تھے، کالج میں کوئی تقریب تھی، جس میں استادوں کی کرسیاں تنخواہ کی ترتیب سے بچھائی گئی تھیں، اس ترتیب سے مولانا کی کرسی سب سے پیچھے تھی، بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے، مگر آنکھ پُرنم ہوئے بغیر نہ رہی، بہر حال چوں کہ علمی شغل تھا اور علمی صحبت، اس لیے اس لذت کے لیے انہوں نے اس تلخی کو گوارا کیا، آگے چل کر مولانا کی تنخواہ سو روپے ماہ وار ہوگئی اور عربی کے پروفیسر ہوگئے اور قرآن پاک اور دینیات کا درس بھی دینے لگے، کالج کے علاوہ شہر کے بعض عربی کے طلبہ بھی کبھی کبھی آکر پڑھتے تھے، اس زمانہ میں علی گڑھ میں مولانا مفتی لطف اللہ صاحب کی درس گاہ عربی کے طلبہ کا مرجع عام بنی ہوئی تھی، ان سے جو لوگ پڑھنے آتے تھے، ان میں سے جس کو ادب کا شوق ہوتا وہ مولانا سے پڑھنے آتا تھا، مولانا ماجد علی صاحب جنھوں نے بعد کو بہ حیثیت مدرس کے شہرت حاصل کی، وہ مولانا کے ادب میں اسی زمانہ کے شاگرد ہوں گے، مکاتیب میں اتنا ہی ہے کہ ''مولوی ماجد علی میرے شاگرد ہیں، ادب مجھ سے پڑھے ہیں''۔ (شروانی-۹۱)

قیام | مولانا جنوری بھر ڈپٹی محمد کریم صاحب کے یہاں مہمان رہے، یکم فروری ۱۸۸۳ء کو شہر میں پانچ روپیہ ماہ وار کا ایک مکان لے کر اس میں اٹھ گئے، مولانا کے منجھلے بھائی مولوی محمد اسحاق مرحوم اور ان کے چچا زاد بھائی محمد عثمان صاحب اور ایک اور عزیز عبدالغفور صاحب تعلیم کی غرض سے ان کے ساتھ گئے تھے، چنانچہ یہ مختصر قافلہ اسی مکان میں جا کر مقیم ہوا۔

لیکن اس مکان سے کالج دور تھا، اس لیے آنے جانے کے لیے سواری کا انتظام کیا، مولانا اس

[1] مکاتیب فارسی، ص ۵ [2] ایضاً، ص ۲۵ [3] ایضاً

مکان میں کئی مہینے رہے، اس مکان کے قریب خواجہ محمد یوسف[1] صاحب وکیل علی گڑھ (والد خواجہ عبد المجید صاحب بیرسٹر) کا مکان بھی تھا، ۲۸/اپریل ۱۸۸۳ء کو اپنے عزیز شاگرد محمد سمیع صاحب کو ایک خط لکھا جو مکاتیب میں شامل ہے، اس خط سے اس مکان کی وضع، رہنے سہنے کا انداز اور اس زمانہ کے احباب اور مشاغل کا پتہ چلتا ہے۔

علی گڑھ کے ابتدائی مشاغل اور احباب عام قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی اپنا عزیز کہیں باہر ہوتا ہے تو احباب کو اس عزیز کے یاد آنے کے ساتھ ضرور یہ خیال ہوتا ہے کہ کس مکان میں ہوگا، کیسے بسر ہوتی ہوگی، کیا شغل ہوگا، دوست احباب کیسے ہوں گے، بھائی یہ خیال تمہیں ہو یا نہ ہو، مگر میں تمہاری طرف سے فرض کر کے اپنے طریق معاشرت کا خاکہ کھینچتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم عبارت کی رنگینی اور شان وشوکت کی تلاش تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دو گے اور سادے فقروں پر قناعت کرو گے، میں جس مکان میں رہتا ہوں، شہر کے کنارے پر ہے، یہ مکان ایک مختصر سا مگر خوش قطع مکان ہے، دکھن کی طرف ایک خوش نما محراب دار چھوٹا سا دالان ہے، اس میں خاص میں رہتا ہوں، ایک جانب پلنگ ہے اور زمین پر صاف اور پاکیزہ چاندنی کا فرش کھنچا ہوا ہے، صدر مقام کے دائیں جانب ٹرکی جانماز اور سامنے ایک رنگین اور ہلکا سا ڈسک رکھا ہوا ہے، دیوار میں لیمپ جڑا گیا ہے، جو شب کو دیر تک روشن رہتا ہے، اسی دالان کے متصل ایک جانب ایک حجرہ ہے جس میں مولوی عبد الغفور صاحب تشریف رکھتے ہیں، اسی دالان کے مقابل دوسری جانب ایک گول کمرہ ہے جو عزیزی اسحاق کی سکونت کی جگہ ہے اور جو کرسیوں اور میز سے آراستہ ہے، کمرہ کے متصل جو حجرہ ہے، وہ عزیزی محمد عثمان کے رہنے کی جگہ ہے۔

میرے مکان سے متصل خواجہ محمد یوسف کا مکان ہے اور وہیں ایک شاعر مشہور جو سارے شہر کے استاد اور واقعی سخن سنج اردو ہیں رہتے ہیں، مجھ سے اکثر ملتے ہیں اور قیس تخلص کرتے ہیں، خواجہ محمد یوسف سے لطف کی ملاقات ہوتی ہے۔

مولوی سمیع اللہ خاں سے بھی ملتا رہتا ہوں اور بفضلہ عمدہ طور سے ملتے ہیں، میر اکبر حسین صاحب منصف سے تو خوب چھنتی ہے، میرے فارسی اشعار بھی انہوں نے سنے اور داد دی، مدرسہ کے

---

[1] خواجہ محمد یوسف صاحب نے متوسطات تک عربی تعلیم پائی تھی، مولانا لطف اللہ صاحب کے شاگرد تھے، نیز مولوی سمیع اللہ خاں کے، قانون میں ان کا تفوق مسلم تھا، خصوصاً قوت جرح میں، سرسید کے ہوا خواہ ومعاون تھے، اختلاف کے بعد مولوی سمیع اللہ خاں کا ساتھ دیا۔ (حبیب الرحمٰن)۔

لڑکے بھی میری جماعت کے مہذب اور سخن فہم ہیں۔

افسوس کہ میرے قصیدہ کی متعدد کا پیاں نہیں، ایک پرچہ جو میرے پاس تھا وہ اس قدر سارے مدرسہ میں ہفتوں تک دست بہ دست پھرا کہ مل ول کر پرزے پرزے ہوگیا، اگر چہ بہت لوگوں نے اس کی نقلیں بھی کرلیں، مگر چھپا ہوتا تو خوب ہوتا۔

مرثیہ[۱] (جو تم دیکھ چکے ہوگے) جن لوگوں نے اس کی فارسی دیکھی ہے، از بس پسند فرمائی ہے، میرا اکبر حسین[۲] صاحب بھی ان میں داخل ہیں۔

یہاں ایک شخص عبدالحمید نامی اہلمد محکمۂ کلکٹری ہیں، یہ صاحب یوان ہیں اور کتابوں کے بڑے شائق ہیں، بہت سا حصہ ان کی تنخواہ کا کتابوں میں صرف ہوتا ہے، ان کو دعویٰ تھا کہ کوئی دیوان وغیرہ فارسی کا ایسا نہیں جو چھپا ہو اور میرے پاس نہ ہو، میں نے ان کو بہت سی کتابیں لکھوا دی ہیں اور وہ بہت جلد ان کو منگوانا چاہتے ہیں، یہ خوب آدمی ہیں، ان کے ذریعہ سے کتابیں دیکھنے کو خوب ملتی ہیں، یہ بے چارے فخریہ کتابیں بھیج دیا کرتے ہیں۔"

سرسید سے میل جول مولانا چوں کہ کالج کے احاطہ سے باہر رہتے تھے، اس لیے دونوں کو باہم ملنے جلنے کا موقع کم ملتا تھا، مگر جیسے جیسے یہ ایک دوسرے سے ملتے گئے، ایک دوسرے کی قدر پہچاننے لگے، مولانا کو سرسید کے کتب خانہ کی محبت تھی اور سرسید کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو عقلی مسائل کی گرہ کشائیوں میں ان کو مدد دے سکے، سرسید کے بنگلہ کے قریب ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا جس کا نشان اب بھی باقی ہے، سرسید نے مولانا کو اس میں جگہ دی اور وہ شہر سے اٹھ کر اس بنگلہ میں چلے آئے، یہاں آجانے کے بعد دونوں کی روزانہ ملاقات ضروری ہوگئی، اگر مولانا کسی دن نہ جاسکتے تو آدمی بھیج کر بلواتے، اور مختلف علمی اور قومی مذاکرے درمیان ہوتے۔

مولانا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ سید صاحب بوعلی سینا کی اشارات جو فلسفہ کی اہم کتاب ہے، دیکھ رہے تھے، کوئی الجھاؤ ایسا تھا جس کو وہ حل نہیں کر سکتے تھے، اتنے میں وہ جا پڑے، سید صاحب نے کہا خوب آئے، یہ مقام سمجھ میں نہیں آتا، مولانا فرماتے تھے کہ بلاقصد میری زبان سے نکل گیا کہ آپ سمجھ بھی نہیں سکتے تھے، کہنے کو تو کہہ دیا مگر بے حد شرمندگی ہوئی، سید صاحب چپ رہے، مولانا نے

---

۱ سالار جنگ اول کا مرثیہ مراد ہے، جو دیوان میں شامل نہ ہوا، مگر علی گڑھ گزٹ میں چھپا ہے۔ ۲ مشہور شاعر اکبر الٰہ آبادی مراد ہیں، وہ اس زمانہ میں علی گڑھ میں منصف تھے۔

کتاب کا مطلب سمجھایا، تو ان کے چہرے پر بشاشت آئی۔

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم جو مولانا کے پرانے دوست تھے، اور اس زمانہ میں جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے، مولانا شبلی کے پاس علی گڑھ جا کر کبھی کبھی مہمان ہوتے تھے، اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''علی گڑھ میں سید صاحب نے انہیں اپنی کوٹھی کے احاطہ کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں جگہ دی، جو سب سے الگ بالکل باہمہ اور بے ہمہ تھا، اور ایک خاموش مقام تھا، ان میں جستجو وتحقیق کا سچا مذاق دیکھ کر سید صاحب نے ان سے ربط ضبط بڑھایا، اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلا ناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی۔''

سید صاحب ہمیشہ اعتقادی وکلامی مسائل اور امور خانہ تحقیق کے غور وخوض میں رہتے اور تحقیق وتدقیق کے لیے انہیں اکثر حدیث وفقہ اور تاریخ وسیر کی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی، اس کام کو انہوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا اور مولوی شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی اور قابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی اور وسعت نظر کے مولانا قائل ہوتے جاتے تھے اُس سے زیادہ سید صاحب ان کی تلاش وجستجو اور جلبِ روایات کے معتقد ومعترف ہو گئے تھے، اس زمانہ میں مجھے بارہا مولانا شبلی کے پاس جا کے ٹھہرنے اور ان کے ذریعہ سے خود سید صاحب کا مہمان بن جانے اور دونوں کے ساتھ ہفتوں کھانا کھانے اور شریک صحبت رہنے کا موقع ملا، مولانا سے اور مجھ سے حد درجہ کی بے تکلفی تھی، اور میں اس بات کو ہر صحبت میں محسوس کرتا تھا کہ وہ اور سید صاحب دونوں کس قدر ایک دوسرے کے علمی کمالات کے معترف ہوتے جاتے ہیں، سید صاحب کے اعتراف کی تو یہ حالت تھی کہ کوئی کام بغیر ان کے مشورے کے نہ کرتے، اور مولانا شبلی کے اعتراف کا یہ ثبوت ہے کہ میرے علم میں ان کی سب سے پہلی نظم جو ان دنوں شایع ہوئی تھی ''صبح امید'' ہے، جس میں انہوں نے مسلمانوں کی غفلت اور سید صاحب کی برکت سے ان کے بیدار ہونے کو نہایت ہی پر لطف اور موثر الفاظ میں ظاہر کیا ہے اور اُسی زمانہ میں علی گڑھ کے ایک طالب علمانہ تھیٹر میں انہوں نے اپنی ایک قومی نظم سنائی تھی۔''

علی گڑھ میں ابتدائی مشاغل تعلیم وتدریس کے علاوہ علی گڑھ میں مولانا کے ابتدائی مشاغل شعرو شاعری تک محدود معلوم ہوتے ہیں، ان ہی لوگوں سے ان کو دل چسپی تھی جن کو شعر وسخن سے دل چسپی تھی، فارسی نامے اب بھی لکھے جاتے تھے، مگر اب قلم نے اردو خط کا بھی آغاز کر دیا، فارسی میں غزل اور قصیدے

اور اردو میں صرف غزل لکھتے تھے، ۲۸؍اپریل ۱۸۸۳ء کے مذکورۂ بالا خط سے ان کا شاعرانہ ذوق بالکل نمایاں ہے، اردو غزلیں بھی لکھ لکھ کر وطن کے عزیزوں اور دوستوں کو بھیجتے، مکاتیب جلد اول میں محمد سمیع صاحب کے خطوط میں کئی اردو غزلیں نظر آئیں گی، ان غزلوں میں کوئی خاص بات نہیں، ۱۸؍جنوری ۱۸۸۴ء کے خط ۵ میں لکھتے ہیں "آج کل تنہائی کی وجہ سے گھبراتا ہوں، مگر اتنا ہے کہ اس کی بہ دولت کبھی کبھی موزوں کر لیتا ہوں، رات بیٹھے بیٹھے ایک غزل لکھ ڈالی، دو تین شعر مزے کے ہیں، تمہیں بھیجتا ہوں۔"

پھر ۲۶؍جنوری ۱۸۸۴ء کے خط میں اپنی دو اردو غزلیں محمد سمیع صاحب کو اور ایک فارسی مولوی حمید الدین صاحب کو بھیجتے ہیں ۸؍فروری ۱۸۸۴ء کو پھر ایک اردو غزل محمد سمیع صاحب کو ان کے خط ۸ میں سنائی جا رہی ہے، اسی تاریخ کے خط میں ایک قصیدہ عیدیہ کے لکھے جانے کی بشارت ہے، جو ۱۸۸۳ء میں لکھا جا چکا تھا اور گزٹ میں چھپا تھا اور دیوان میں بھی شامل ہے، اسی خط میں اپنے فارسی دیوان کے مرتب کیے جانے کے خیال کا بھی اظہار ہے، ۲۷؍مارچ ۱۸۸۴ء کو یہ خیال اتنا غالب ہوتا ہے کہ اپنے استاد مولانا محمد فاروق صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ ان کے فارسی کلام کو دیکھ لیں، کیوں کہ وہ چھاپا جائے گا، اسی تاریخ کے خط میں ایک فارسی واسوخت اور ایک اردو نامہ لکھے جانے کی خبر دی ہے، فرماتے ہیں "قابل دید ہیں، خود اپنی زبان سے سناؤں گا" (سمیع-۱۰) ۲۴؍اپریل ۱۸۸۴ء کے خط (سمیع-۱۲) میں فرماتے ہیں: واسوخت فارسی کے پندرہ بند ہیں، یعنی ۹۵ شعر اور اسی قدر نامہ اردو کے حضرت استاد نے بھی واسوخت کو نہایت پسند کیا، میرا قصد تھا کہ صرف واسوخت اور نامہ سر دست چھپ جاتا، مگر روپیہ نہیں۔"

کالج میں مولانا کے شاعرانہ کمال کا شہرہ اب کالج مولانا کے شعر و سخن کے چرچوں سے چھکنے لگا، ان ہی دنوں اپریل ۱۸۸۴ء میں "حیران و فراوان" کے قافیہ اور "چہ کنم" کی ردیف میں علی حزیں کی غزل پر غزل لکھی، لڑکوں میں چرچا ہوا، کچھ نے کہا کہ استاد کی غزل پر غزل لکھنے سے کیا حاصل؟ آخر اس زمانہ کے دو مشہور فارسی شاعروں خواجہ عزیز الدین[1] مصنف قیصر نامہ پروفیسر کیننگ کالج لکھنو اور غالب کے شاگرد نیر دہلوی کو حکم مان کر مولانا اور حزیں دونوں کی غزلیں بہ حذفِ مقطع بھیجی گئیں، دونوں نے تسلیم کیا

[1] خواجہ صاحب کشمیری الاصل تھے، لکھنؤ میں اس زمانہ میں ان کی فارسی دانی کی دھوم تھی، ان کا فارسی کلیات چھپ گیا ہے، ان سے آگے چل کر مولانا کے عزیزانہ و بزرگانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے، مولانا لکھنؤ جاتے، ان سے ملتے، بلکہ ان کے پاس ٹھہرتے، اخیر زمانہ میں غالباً ۱۹۰۸ء میں ایک بار خاکسار بھی مولانا کی ہم راہی میں خواجہ صاحب کے یہاں گیا تھا، بڑے اہتمام سے انہوں نے کشمیری چائے پلائی تھی، ۸۵؍برس کی عمر پا کر ۱۹۱۵ء میں وفات پائی۔

کہ مولوی شبلی نے جو لکھا وہ اہل زبان کا کلام ہے، حضرت نیّر نے تو بہت تعریف کی اور لکھا کہ سلف کے کلام کا ہم پلہ ہے۔ (مکاتیب اول سمیع -۱۲)

مولانا کی یہ غزل دیوان میں نہیں، صرف دو شعر ہیں:

خودگرفتم کہ بہ زلفش نفروشم دل و دیں ۔۔۔ در بغاوت بردآن نرگس فتان چہ کنم

چاکے از دستِ جنون بہرۂ من باشد دگر ۔۔۔ ارمغانش نفرستم بہ گریباں چہ کنم

لیکن مولانا کے ایک پرانے شاگرد کے ذریعہ سے ہم کو یہ پوری غزل مل گئی ہے، مطلع یہ ہے:

گر کم عقل نہ گیرم من حیراں چہ کنم ۔۔۔ می دہد مغبچہ ام بادہ فراواں چہ کنم

یہ پوری غزل دوسرے موقع پر ہدیۂ ناظرین ہوگی۔

اسی واقعہ کا یا اسی قسم کے دوسرے واقعہ کا ذکر مولانا ذکاء اللہ صاحب نے اپنے اس تبصرہ میں کیا ہے، جو انہوں نے مولانا کے مجموعۂ نظم فارسی کے پہلے اڈیشن پر لکھا تھا اور جو ۸/ستمبر ۱۸۹۳ء کے علی گڑھ گزٹ میں چھپا تھا وہ لکھتے ہیں "مجھے ایک دفعہ کا ذکر خوب یاد ہے کہ انہوں نے (مولانا شبلی نے) اپنی غزل کے اور شیخ علی حزیں کی غزل کے اشعار ملا کر لکھے اور قدر شناسانِ سخن ذوالقدر خاں بہادر خواجہ غلام غوث صاحب اور جناب نواب ضیاء الدین خاں فردوس مکاں کے پاس اس درخواست سے بھیجے کہ جو اشعار غزل میں آپ کو زیادہ پسند آئیں اور اچھے معلوم ہوں، ان پر صاد لکھ کر میرے پاس عنایت فرمائیے، ان مبصران سخن نے مولوی صاحب کی استدعا کے موافق غزل کے اشعار پر صاد لکھ کر کے واپس بھیج دیا تو زیادہ تر صاد مولوی صاحب ہی کی غزل پر تھے، اس حوصلہ افزائی کا غالباً یہ اثر ہوا کہ مولانا نے حزیں کے تتبع میں اور بھی غزلیں لکھیں۔ (سمیع -۱۲)

مولانا کی ان شاعرانہ جولانیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کا کوئی جلسہ ہوتا اُس کے پروگرام میں مولانا کی نظم ایک ضروری چیز ہوگئی جس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

نیارنگ اب مولانا ایسی آب و ہوا میں تھے جہاں ہر طرف نئے خیالات، نئے جذبات، زمانہ کے نئے اثرات، قدیم و جدید کی آمیزش کے نئے انقلابات گرد و پیش تھے، ان اثرات اور جذبات کی نیرنگیوں میں حق و باطل اس طرح ملے تھے کہ ان کے علاحدہ کرنے کے لیے غیر معمولی بصیرت کی ضرورت تھی، بحمد اللہ کہ مولانا میں یہ بصیرت موجود تھی۔

جدید تعلیم پر مولانا کا پہلا تبصرہ اب تک جدید تعلیم کے محاسن ومعائب کی خبریں مولانا دور سے سنتے تھے اور اب اُن کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اپنے جانے کے چند ہی مہینوں کے بعد اپنے وطن میں ایک عزیز کو لکھتے ہیں: ''یہاں آ کر میرے تمام خیالات مضبوط ہوگئے، معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش بہ رائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی پیمائش گاہ ہے، ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت (اس زمانہ میں بی اے بڑی چیز تھی) یہ خیال دلاتے تھے وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کردیں گے، لاحول ولا...... وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے، سید صاحب نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے، صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی ہے[1]'' اس بے باکانہ اظہار وبیان سے معلوم ہوگا کہ نئی تعلیم کی ظاہری چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں اور حق وباطل کی تمیز کی پوری بصیرت ان میں موجود تھی۔

علی گڑھ کے اثرات، موضوع شعر میں تغیر بہر حال علی گڑھ تحریک کے بعض مفید اثرات کو انہوں نے بہت جلد قبول کرلیا، ان میں سے سب سے پہلی چیز ملت کی بربادی کا درد اور احساس ہے، ان کے وہ رنگین ترانے جو اب تک حسن وعشق کی جھوٹی کہانیوں سے لب ریز ہوتے تھے، اب قوم وملت کے عشق سے خوں افشاں ہونے لگے مسلمان کیا تھے اور کیا ہوگئے، یہ احساس اب ان کی قومی نظموں کا موضوع بن گیا، اسی سال ۱۸۸۳ء میں جو عید آئی وہ ان کو خون کے آنسو رلا گئی، ایک قصیدہ عیدیہ لکھا جس میں عید کی آمد کی خوشی، سامان اور دوگانہ عید کی کیفیت کے بعد ملت کے درد پر جو آنسو بہائے ہیں، ان کے چند قطرے یہ ہیں:

حیف کیں شور وطرب یک دو نفس بیش نماند ۔۔۔ چہ کند عید بدردے کہ بود صبر گداز
جمعِ اسلام چو باشد ہدفِ تیر بلا ۔۔۔ خود چو کج باخت بایشاں فلک عربدہ ساز
فرق نبود بحقیقت ز محرم تا عید ۔۔۔ آہ از فتنہ گری ہائے سپہرِ کج باز
خود ہماں جمع کہ می داشت بہم تیغ وقلم ۔۔۔ خود ہماں قوم کہ بودہ است بہ ہر پایہ فراز
اینک آں قوم بحالیست کہ نتواں گفتن ۔۔۔ خود بہ بیں تا بچہ انجام رسید آں آغاز
شرح ایں حادثہ از شبلی دل خستہ مخواہ ۔۔۔ شب بود کوتہ و افسانہ درازست دراز

---

[1] مکاتیب ج ۲ ۔ ۱۔

یہ اثر روز بہ روز تیز ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ۱۸۸۵ء میں مثنوی ''صبح امید'' لکھی جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی پردرد داستان کی شرح کے بعد سرسید کی نئی تحریک کی کام یابی پر ایک نئی صبح امید کے طلوع کی خوش خبری سنائی، مثنوی بار بار چھپی اور مقبول عام ہوئی۔

سرسید نے ایک بار نمایش گاہ کے موقع پر علی گڑھ میں ایک قومی تماشے کا جلسہ کیا، جس میں قوم کے حالِ زار کا پُر اثر منظر دکھایا، اس میں خود سرسید اور دوسرے اکابر نے تقریریں کیں اور نظمیں پڑھیں، مولانا نے اس میں اپنا وہ اردو مسدس پڑھا جو اسی مثنوی کے ساتھ چھپا ہے، انہوں نے اس مسدس کو اپنے پُر درد و پُر سوز لہجہ میں جب پڑھا تو سب کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں، تفصیل آگے آتی ہے[1]۔

بہر حال اس وقت سے مولانا کی نظموں کا موضوعِ سخن بدل گیا، کالج کے یونین میں، ایجوکیشنل کانفرنس میں اور ندوۃ العلما کے اجلاسوں میں وہ نظمیں پڑھیں کہ جب وہ پڑھی جاتی تھیں تو صدر سے لے کر پائیں تک سارا مجمع اثر میں ڈوب جاتا تھا، ان کی یہ نظمیں دیوان میں موجود ہیں اور ہر شخص آج بھی ان کو پڑھ کر ان کی تاثیر کا امتحان کر سکتا ہے۔

انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس | علی گڑھ تحریک کا دوسرا اثر ان پر یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم کی ضرورت ان پر الم نشرح ہو گئی، اپنے عزیزوں اور برادری کے لوگوں کو اس کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کا کام انہوں نے خود شروع کیا، ان کے مکاتیب میں ان کے عزیزوں کے نام کے خطوط انگریزی تعلیم کی طرف انہماک اور اس کے حصول کی تاکید سے بھرے ہوئے ہیں، علی گڑھ کے چار ہی مہینے کے قیام کے بعد انہوں نے یہ تہیہ کیا کہ اپنے شہر میں وہ انگریزی تعلیم کا ایک اسکول جاری کریں، چنانچہ ۲۰؍ جون ۱۸۸۳ء میں نیشنل اسکول کے نام سے ایک انگریزی مدرسہ شہر اعظم گڑھ میں قائم کیا، خود سکریٹری ہوئے اور عزیزوں کو ممبر بنایا، ان کے والد بزرگ وار اور دوسرے عزیزوں اور ہم دردوں نے اس کی امداد میں شرکت کی، اس کی عمارت اور تعمیر کے لیے اپنے خاندان کی ملکیت سے زمین دلوائی، اعزہ اور برادری کے لوگوں سے چندے لیے اور صرف ایک ماسٹر اور تین طالب علموں سے کام شروع ہوا، رفتہ رفتہ مدرسہ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ۱۸۸۷ء میں مڈل اسکول اور ۱۸۹۵ء میں ہائی اسکول ہو گیا، مولانا کے مکاتیب میں ان

---

[1] مولانا شروانی فرماتے ہیں: ''میں بھی اس تماشے میں بہ حیثیت تماشائی شریک تھا، علامہ کی پردرد آواز اب تک دل کے کانوں میں گونج رہی ہے۔'' ۱۲۔

کے عزیزوں کے نام کے خطوط میں اس اسکول کا جس کثرت سے ذکر ہے اور اس کی طرف اپنے عزیزوں کو جس شدت کے ساتھ ملتفت کیا ہے اس سے ان کے انہماک کا پتہ چلتا ہے، جو ان کو قوم میں انگریزی تعلیم کی اشاعت کے ساتھ پیدا ہو گیا تھا۔

برادری کے لوگوں کی سالانہ ترقی کی جانچ کے لیے موازنہ ''ترقی قومی'' کے نام سے ایک مجلس کی بنیاد ڈالی جس کی طرف سے ہر سال برادری کی تعلیمی ترقی کی روداد مرتب ہوتی اور لوگوں میں تقسیم ہوتی ہے، مولانا کے مکاتیب میں اس موازنہ قومی کا ذکر بار بار آیا ہے۔

ایک دوسرا اسکول اپنے گاؤں بندول میں قائم کیا جو غالباً ابتدائی تھا اور آگے نہ بڑھ سکا (سمیع-٦) شہر پٹنہ میں سرسید کے رفقا میں سے قاضی رضا حسین صاحب اور دوسرے اعیان شہر کی کوشش سے ''اینگلو عربک اسکول'' قائم ہوا تھا، جو اب تک قائم ہے، اس زمانہ میں مسلمانوں کا خاص مدرسہ ہونا اور اس میں آٹھ لڑکوں میں سے پانچ مسلمان لڑکوں کا انٹرنس پاس کرنا ایسا واقعہ تھا، جس پر خوشی کی جاتی تھی، چنانچہ ۸/ مئی ۱۸۸۷ء کو مولانا فخر و مسرت کے ساتھ اس کی اطلاع اپنے عزیزوں کو بھیجتے ہیں، ''اب کی پٹنہ محمڈن اسکول سے جو خاص مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے آٹھ لڑکے انٹرنس میں پاس ہوئے، جن میں پانچ مسلمان ہیں'' (سمیع-۲۲) مولانا کو انگریزی کی ضرورت کا احساس اتنا ہو گیا تھا کہ علما کے لیے بھی اس کا جاننا ضروری سمجھتے تھے، اس احساس ضرورت کا ایک دل چسپ واقعہ انہوں نے ۱۹۱۲ء میں ایک تقریر میں بیان فرمایا تھا، علما کے لیے انگریزی دانی کی ضرورت کے سلسلہ میں فرمایا ''جب میں ٹرکی سے واپس آیا تھا تو اتفاق سے گھر میں علالت تھی، ایک رات کو ۱۲/ بجے تار آیا، میں نے اس کو کھولا، دل میں دبدھا پیدا ہوا کہ کیا واقعہ ہے، خدا جانے کیسا تار ہے، خیر میں دوڑا ہوا سرسید مرحوم کے نواسہ کے پاس گیا، انہوں نے پڑھ کر سنایا کہ یہ تار نواب علی حسن خاں صاحب نے بھوپال سے بھیجا ہے، وہ آپ کو ٹرکی سے بہ خیریت واپس آنے پر مبارک باد دیتے ہیں، یہ حال ہم مولویوں کا ہے[1]'' اسی لیے وہ ندوہ کے نئے مدرسہ میں انگریزی کے پڑھانے پر بہ ضد تھے، چنانچہ دار العلوم ندوہ کے نصاب میں اس کے داخل کیے جانے کی تحریک ۱۸۹۹ء میں کی (شروانی ۲۱ و ۲۲) مگر کام یابی نہ ہوئی، آخر ان ہی کے اصرار سے ۱۹۰۳ء میں انگریزی ایک ضروری مضمون کی حیثیت سے شریک کی گئی، غالباً ۱۹۰۸ء کی بات ہے کہ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ عربی کے ہر طالب علم

[1] روداد ندوہ، اجلاس لکھنؤ ۱۹۱۲ء، ص ۱۵۶۔

کو انگریزی پڑھنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے، مثلاً جو لوگ فقیہ بننا چاہتے ہیں، ان کو انگریزی کیا کام آئے گی، فرمایا عجیب بات کہتے ہو، اگر فقہا انگریزی جانتے اور ہماری فقہ کو انگریزی میں منتقل کر سکتے تو ہدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیر مسلموں کے کیے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند نہ قرار پاتے، اصل یہ ہے کہ مولانا کو یہ احساس تھا کہ اگر وہ انگریزی جانتے ہوتے تو کیا کچھ اسلام کی خدمت کر سکتے تھے، اس لیے ''من نہ کردم شما حذر بکنید'' کے اصول پر وہ چاہتے تھے کہ اب علماء ایسے ہوں جو اس خدمت کو بجا لا سکیں۔

تاریخی ذوق اب تک مولانا کا تاریخی ذوق نمایاں نہ تھا، لیکن کالج پہنچنے کے ساتھ یکا یک ان کا تاریخی ذوق ابھر آتا ہے، مولانا کی طبیعت میں اس ذوق کا بیج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاہور میں ڈاکٹر لائیٹنر (G. W. LAITNER) کی کتاب سنینِ اسلام کے مطالعہ سے پڑا، ڈاکٹر لائیٹنر عربی و فارسی کے مشہور عالم اور نٹیل کالج لاہور کے بانی اور پرنسپل تھے، انہوں نے عربی کے طالب علموں کے لیے ۱۸۷۶ء میں سنینِ اسلام کے نام سے اردو میں اسلام اور عرب کی ایک مختصر سیاسی اور علمی تاریخ دو جلدوں میں لکھی تھی، اصل کتاب کی تالیف اور اضافہ میں مولانا فیض الحسن صاحب سہارن پوری پروفیسر اورنٹیل کالج اور مولوی غلام مصطفےٰ صاحب نے مدد دی تھی اور اس کی اردو زبان کے درست کرنے کا کام مولانا محمد حسین آزاد نے انجام دیا تھا، غالباً تاریخ کی پہلی کتاب تھی جو عربی خواں طالب علموں کے ہاتھوں میں آئی اور غالباً مولانا کو یہ کتاب ان کے لاہور ہی کے زمانہ قیام میں ہاتھ آئی، میں نے سنا ہے کہ مولانا اس کتاب میں مسلمان بادشاہوں کے حالات اور مسلمانوں کے علمی کمالات کے واقعات پڑھ پڑھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔

مولانا جب علی گڑھ پہنچے تو اس کتاب کی یاد ان کو پھر آئی، اس کا نسخہ مولانا سے ان کے بھائی مولوی حمید الدین صاحب نے لے لیا تھا، ۲۷/ مارچ ۱۸۸۴ء کو وہ اپنا نسخہ ان سے منگواتے ہیں (مکاتیب ۱۰۱-) اس سے پہلے ۲۶/ جنوری کو مولانا محمد حسین صاحب آزاد کو لکھواتے ہیں کہ کتاب کا ایک نسخہ الہ آباد ایک صاحب کے پاس بھیج دیا جائے، (مکاتیب ۶-) اس سے ایک سال پہلے ۱۸۸۳ء میں مولانا نے جو فارسی عیدیہ قصیدہ لکھا تھا، اس میں تاریخ اسلام کے بعض ممتاز شہروں اور نامور خاندانوں کے حوالے ہیں۔

اب تک مولانا کے تاریخی معلومات اسی قسم کی کتابوں کے ذریعہ سے تھے، جب وہ علی گڑھ پہنچے اور سرسید کے کتب خانہ میں عربی تاریخ و جغرافیہ کی وہ نادر کتابیں ان کو نظر آئیں جو یورپ یا مصر و شام اور قسطنطنیہ میں چھپی تھیں، تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور یہیں سے تاریخ اسلام کے مطالعہ کا نیا دور شروع ہوا۔

تصنیفی ذوق | مولانا میں تصنیفی ذوق تو پہلے سے موجود تھا، ان کی پہلی عربی تالیف اسکات المعتدی اور فقہ حنفی کے بعض دوسرے مناظرانہ رسالے چھپ چکے تھے، یہاں آکر ان کے تصنیفی ذوق کا محور بدل گیا، مولانا مجھ سے فرماتے بھی تھے اور مکاتیب میں اڈیٹر زمانہ کے ایک استفسارنامہ کے جواب میں بھی لکھتے ہیں: ''تصانیف کا شوق ابتداءً مجھ کو ان تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا تھا، جو یورپ میں چھپی ہیں اور ایک موقع پر مجھ کو بہت سی یک جا مل گئیں، جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔''

یہ یک جا کتابیں سرسید کا کتب خانہ تھا، فرماتے تھے کہ سرسید نے مجھے اپنے کتب خانہ کی کتابوں کے دیکھنے کی عام اجازت دے دی تھی، تو میرا یہ حال تھا کہ الماریوں کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہتا کبھی تھک کر زمین ہی پر اکڑوں بیٹھ جاتا، سرسید نے جو یہ کیفیت دیکھی تو سامنے کرسی رکھوادی، اس حکایت کی تصدیق مکاتیب سے بھی ہوتی ہے، ۱۹؍ستمبر ۱۸۸۳ء کو لکھتے ہیں: ''سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے، سید صاحب کے پاس تاریخ وجغرافیہ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کو میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے، مگر یہ سب کتابیں یورپ میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں'' (سمیع-۳) یورپ والوں کے طرز پر تاریخی واقعات کی ترتیب اور نتائج کے استنباط کا نمونہ مولانا کے سامنے گبن کے رومن امپائر کا اردو ترجمہ ہے جس کو سرسید نے اپنے لیے کرایا تھا، ایک خط میں ۱۹؍ستمبر ۱۸۸۳ء کو لکھتے ہیں ''گبن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپے کے صرف سے کرایا ہے، میرے مطالعہ میں ہے[1]'' (سمیع-۳) اس کے بعد دوسری کتاب جو ان کے ہاتھ میں آئی وہ مشہور عربی داں انگریز مسٹر پامر کی حیات ہارون الرشید ہے،

[1] تاریخ گبن کے ترجمہ کا یہ مسودہ کالج کی لائبریری میں تھا، جو سرسید کے بعد چوری ہوگیا، اور آخر مولانا حالی کو اس کا پتہ لگا، مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی نے وہ نسخہ لاکر مولانا حالی کے حوالہ کیا، مولانا حالی ایک خط میں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو لکھتے ہیں، ''۷۴۳ صفحہ کی ایک ضخیم جلد ہے، خفی قلم سے لکھی ہوئی ہے جس کے ترجمہ کی اجرت سید صاحب نے مولوی ابوالحسن صاحب کو جو حیدرآباد میں نوکر ہیں، ایک ہزار روپیہ دیا تھا، کالج کی مہریں جابجا لگی ہوئی ہیں، مگر چوٹے نے بعض کو جو حاشیہ پر تھیں، کتر کر وہاں اور کاغذ اس پر چپکا دیا ہے، اور اکثر جگہ پہلے مہر کی سرخی کو سیاہ قلم سے کاٹا ہے اور پھر کاغذ اس پر چپکا دیا ہے، مگر ہر ایک کی چپی چغلی کھاتی ہے، اس کے سوا اس مسودہ کے بہت سے آدمی پہچاننے والے موجود ہیں، بہر حال یہ مسودہ میرے قبضہ میں آگیا ہے، کہیئے تو محسن الملک کے پاس بھیج دوں، اور کہیئے آپ کے یا مزمل اللہ خاں صاحب کے پاس روانہ کردوں مگر مجھ کو آپ کی نگہداشت پر زیادہ اطمینان ہے، اس لیے میرا جی چاہتا ہے کہ آپ ہی کی خدمت میں بھیجوں۔ (مکتوبات حالی، جلد اول، ص ۱۴۳)

اس کا ترجمہ مولانا کے زیر نظر تھا، جس کی شہادت مولوی عبدالرزاق مصنف البرامکہ نے جو ان کے معاصر ہیں، دی ہے، مولانا نے المامون میں گبن کا کئی مقامات پر اور پامر صاحب کا ایک دو جگہ ذکر کیا ہے۔

تصنیف کی تیاری ان کتابوں کے مطالعہ سے مولانا کو پہلے پہل ایک مکمل اسلامی تاریخ کا خیال آیا اور پھر وہ گھٹ کر تاریخ بنی عباس تک محدود ہو گیا اور غالباً اس کے لیے ان کے سامنے سنینِ اسلام کا نقشہ تھا، چنانچہ اس دوران میں انہوں نے وطن سے سنینِ اسلام کا نسخہ منگوایا (مسیح-۱۰۱) اور اسی سال ۱۸۸۳ء میں تاریخ بنی عباس کا کام بڑی محنت سے شروع کیا (مسیح-۱) اور ۹ راپریل ۱۸۸۴ء کو خلیفہ معتصم کے حالات تک وہ پہنچ چکے تھے (مسیح-۱۱) لیکن یہ کام اتنا لمبا تھا کہ اس کو چھوڑ کر ہر خاندان کے ایک ایک ہیرو کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا اور اس کو نام ورفرماں روایانِ اسلام کے سلسلہ سے موسوم کیا۔

مثنوی صبحِ امید بہر حال ۱۸۸۷ء تک کا زمانہ انہوں نے کامل مطالعہ اور تصنیف کی تیاری میں گذارا، اس وقت تک ان کی جو چیز منظر عام پر آئی وہ ان کے فارسی قصائد تھے، ۱۸۸۵ء میں سب سے پہلے ان کی مثنوی صبحِ امید چھپ کر شائع ہوئی جس میں مسلمانوں کے ادبار اور تنزل کا افسانہ اور علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کا خوش آیند مرقع ہے، جس کو صبح امید سے انہوں نے تعبیر کیا تھا، مولانا نے گو بعد کو اس مثنوی کو اپنی تصنیفات سے خارج کر دیا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے یہ اب بھی تعریف کے قابل ہے۔

یورپ کی تحقیقات علمی سے آگاہی کالج پہلا مقام تھا جہاں اس وقت مشرق و مغرب کے اساتذہ یک جا تھے، اور ایک دوسرے کے خیالات و معلومات سے متاثر ہو رہے تھے، مولانا کو کالج آ کر سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ ان کو یورپ کے خیالات اور علمی تحقیقات سے آگاہی کا موقع ملا، اس کے لیے سب سے پہلا مسالہ تو سر سید کے کتب خانہ سے ان کو ہاتھ آیا، اس کے بعد خوش قسمتی سے اس وقت کالج میں پروفیسر آرنلڈ جیسا ایک انگریز عالم یہاں موجود تھا، پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی کے تعلقات کی دلچسپ داستان ایک ''شاہد عینی'' کی زبان سے سننے کے لائق ہے، مولانا شروانی لکھتے ہیں ''بڑی خوش قسمتی علامہ شبلی کی یہ تھی کہ اس عہد میں پروفیسر آرنلڈ سا علم دوست استاد کالج میں تھا، یہ دونوں دل دادگانِ علم باہم ملے اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں، پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا، یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں، قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض اور حملے ہیں۔ علامہ شبلی کی صداقت اور قوت دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب

نہیں ہوئے، بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا جو اصول عمدہ تھے، ان کو اخذ کیا، نہ صرف اخذ کیا بلکہ ان کو اپنی زندگی کا رہبر بنایا، نمایشی چیزوں کو رد کر دیا، پروفیسر آرنلڈ نے عربی کا استفادہ علامہ شبلی سے کیا اور یہ دیکھا کہ پرانی زمینوں میں بھی جواہر آب دار موجود ہیں، اگرچہ گرد آلود ہو کر نگاہوں سے پوشیدہ ہو گئے ہیں، اس واقفیت کا نتیجہ پروفیسر آرنلڈ کی بے نظیر تصنیف ''پریچنگ آف اسلام'' کی صورت میں عیاں ہوا، علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فرنچ بھی سیکھی، علامہ ممدوح کی زندگی کا یہ دور بہت کچھ سبق آموز اور ایک بڑے تعلیمی مسئلے کا حل کرنے والا ہے'' کالج میں پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی ایسے گھل مل گئے تھے کہ اجنبیت اور بے گانگی دور ہوگئی تھی، پروفیسر ممدوح روزانہ ان کو فرنچ پڑھانے ان کی اقامت گاہ پر آیا کرتے تھے اور وہ خود مولانا سے عربی پڑھتے تھے، اس سلسلہ میں تعلیم کے علاوہ دونوں ایک دوسرے کے خیالات اور معلومات سے بھی روزانہ واقف ہوتے تھے، مولانا اپنی مجلس میں پروفیسر صاحب کے بہت سے واقعات سنایا کرتے تھے، کہتے تھے کہ پڑھنے پڑھانے کا جو وقت انہوں نے مقرر کیا تھا اس میں ایک منٹ کا فرق کبھی نہیں پڑتا تھا، ایک دفعہ چند منٹ کی دیر ہوگئی تو اتنی معذرت کی کہ مجھے شرمندگی معلوم ہوئی اور کہنے لگے کہ یورپ میں وقت کی بڑی قیمت ہے، فرماتے تھے کہ آرنلڈ صاحب نے انگریزی میں لکھی ہوئی کوئی عربی گرامر لے کر چپکے چپکے از خود عربی صرف ونحو کے مسئلے پڑھنے شروع کیے، چند روز کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ دیکھئے میں عربی عبارت پڑھتا ہوں، کہیں غلطی تو نہیں ہوتی، اس کے بعد عبارت پڑھی ایسی صاف اور صحیح پڑھی کہ حیرت ہوگئی، پروفیسر صاحب کا ایک عربی خط مولانا کے پاس تھا، اور مجھے دکھایا تھا اس کی عربی کی تعریف کرتے تھے، اس کا ایک فقرہ مجھے اب تک یاد ہے، وخليلتي تقرأك السلام (میری بیوی آپ کو سلام کہتی ہے) یہ فصیح ترین عربی ہے، اس کے بہ جائے یہ مضمون اگر کوئی مولوی لکھتا تو شاید یہ لکھتا'' وزوجتي تسلّم عليك''۔

پروفیسر آرنلڈ[۱] اور مولانا کے ان ہی تعلقات کا اثر تھا کہ پروفیسر صاحب ۱۸۹۲ء میں جب

---

[۱] پروفیسر آرنلڈ کالج میں دس برس رہ کر فروری ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے لاہور گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر ہوگئے، وہیں انہوں نے عربی لغت میں ''سواء السبيل فى معرفة المعرب والدخيل'' لکھی، لاہور کے قیام میں ان کے سب سے لائق شاگرد ڈاکٹر اقبال ہوئے، ڈاکٹر اقبال اور مولانا میں تعلقات کی زنجیر وہی تھے، علی گڑھ سے ان کے رخصت ہوتے وقت کالج میں ایک الوداعی جلسہ ہوا تھا جس میں مولانا شبلی مرحوم نے حسب ذیل تقریر کی تھی، ''یہ یورپ کی تلوار نہیں جس نے دنیا کی تمام قوموں کو مغلوب اور حلقہ بہ گوش کر لیا ہے، بلکہ یورپین قوموں کی خوش اخلاقی ہے، جس نے تمام دلوں کو تسخیر کیا ہے، اور آرنلڈ اس خوش اخلاقی اور پسندیدہ خصال کی ایک زندہ تصویر ہے''۔ مولانا نے اس زمانہ کا جب وہ آرنلڈ صاحب سے فرنچ پڑھا کرتے تھے، ایک واقعہ بیان فرمایا ہے، جو انہوں نے آرنلڈ صاحب کے نیک اخلاق کی (بقیہ حاشیہ ص ۱۴۸ پر)

انگلستان جانے لگے تو مولانا بھی ان کے ساتھ قسطنطنیہ کے سفر کے لیے آمادہ ہوگئے اور آخر ان ہی کے ساتھ پورٹ سعید تک سفر کیا، اور وہاں سے آگے تنہا گئے اور ان ہی کے متعلق اپنے سفر روم کے قصیدہ میں یہ شعر لکھا ہے، ع "آرنلڈ آنکہ رفیق است وہم استاد مرا"

آرنلڈ اور شبلی کے سلسلۂ کلام کی دو حکایتیں مولانا کی زبان سے سنی ہوئی مجھے اور یاد ہیں، فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ کوئی یورپین فاضل علی گڑھ آکر مجھ سے ملا، اس کو فارسی ادب کا ذوق تھا، اس سے اس موضوع پر باتیں ہوئیں تو اس کی واقفیت بہت محدود معلوم ہوئی، دو سال کے بعد اس نے فارسی ادب

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۷) شہادت میں پیش کیا، یعنی آرنلڈ صاحب ہر روز صبح ۶ بجے میرے پاس مکان پر مجھے سبق پڑھانے کو تشریف لایا کرتے تھے، ایک دن چھ پر صرف پانچ منٹ زیادہ گزر گئے، اور میں دیکھتا کیا ہوں کہ مسٹر آرنلڈ سرپٹ بھاگے چلے آرہے ہیں، مکان پر پہنچتے ہی میرے سامنے عاجزانہ کھڑے ہو کر فرمانے لگے کہ "مولوی صاحب ہم آپ کا مجرم ہے، ہم نے آج دیر کی، آپ جو چاہیں مجھے سزا دیں" مولوی صاحب نے بڑے افسوس سے فرمایا کہ وہ اس نظم کو تیار نہ کر سکے جو ان کا ارادہ تھا کہ آرنلڈ صاحب کی جدائی پر لکھیں گے، لیکن اس نظم کے بہ جائے اس وقت صرف دو اشعار پڑھے اور وہ ہیں:

آرنلڈ آں کہ دریں شہر و دیار آمد و رفت — دلبرے بود کہ مارا بکنار آمد و رفت
آمد آں گونہ بہ کالج کہ بہ گلزار نسیم — رفت زانساں کہ تو گوئی کہ بہار آمد و رفت

لوگوں کو یہ شعر اس قدر پسند آئے کہ تین تین دفعہ پڑھوا کر سنے۔ (کالج میگزین فروری ۱۸۹۸ء ص ۷۱)

وہ لاہور سے ۱۹۰۴ء میں انگلستان واپس گئے، مولانا اس زمانہ میں حیدرآباد تھے، ان کو پہنچانے حیدرآباد سے بمبئی گئے، اور کوئی تحفہ دیا (حمید، ۲۵) انگلستان پہنچ کر وہ انڈیا آفس میں اسسٹنٹ لائبریرین مقرر ہوئے، اور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک وہ انگلستان میں ہندوستانی طالب علموں کے سرکاری مشیر ہوئے اور ۱۹۲۰ء سے آخر تک وہ لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

مولانا کی زبان سے پروفیسر آرنلڈ کا نام میں نے اتنی دفعہ سنا تھا کہ جب مجھے ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے سلسلہ میں انگلستان جانے کا اتفاق ہوا تو ان کی ملاقات کا شوق تھا، اتفاق یہ کہ وہ خود ملنے آئے اور مولانا شبلی کی نسبت سے بہت محبت سے ملے، وہ اس زمانہ میں انڈیا آفس کے مشرقی صیغہ میں ملازم تھے، ہندوستان میں سرسید اور ان کے دوستوں کے جو خیالات خلافت عثمانیہ کے بارہ میں تھے، اور مولانا شبلی نے جو مضمون علی گڑھ میگزین میں لکھا تھا، وہ ان سب سے واقف تھے، وہ بار بار آکر مجھے مولانا کے اس مضمون کی طرف متوجہ کرتے تھے، اور میں جواب دیتا تھا کہ اس کی حیثیت تاریخی ہے، مذہبی نہیں، اس زمانہ کے وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج کے سامنے جب ہمارے وفد نے اس مسئلہ کو پیش کیا تو وزیر اعظم کی امداد و مشورہ کے لیے پروفیسر صاحب بھی وہاں موجود تھے، ان کے ذریعہ سے مجھے انڈیا آفس کے کتب خانہ کے دیکھنے میں بڑی آسانی ہوئی۔

وہ ۱۹۳۰ء میں مصر کے جامعہ مصریہ میں مسلمانوں کے فنون لطیفہ پر لکچر دینے مصر آئے تھے، یہاں سے واپس جا کر ۹ رجون ۱۹۳۰ء کو اچانک انتقال کیا، (ان کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے معارف اپریل ۱۹۳۱ء) ان کی زندگی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ "پریچنگ آف اسلام" کی تصنیف اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی ترتیب میں شرکت ہے۔

پر کوئی کتاب لکھ کر میرے پاس بھیجی، جو بہت غنیمت تھی، مولانا فرماتے تھے کہ اس کو دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا، میں نے اپنے اس تعجب کا ذکر پروفیسر آرنلڈ سے کیا، انہوں نے پوچھا کہ آپ ان سے کب ملے تھے، فرمایا دوسال ہوئے جواب دیا، مولانا یورپ کا آدمی دوسال میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔

ایک دفعہ فرماتے تھے کہ میں نے آرنلڈ صاحب سے کہا کہ ہم لوگ اپنے استادوں کی جیسی عزت کرتے ہیں وہ آپ لوگ نہیں کرتے، آرنلڈ صاحب نے کہا "بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں علم ہر روز آگے کو بڑھ رہا ہے، اس لیے ہر شاگرد اپنے استاد سے کچھ زیادہ ہی جانتا ہے، اس لیے وہ اس کی رسمی عزت کہاں تک کرے۔"

یہ دونوں واقعے اس بات کا نمونہ ہیں کہ یورپ کے سیاسی لوگوں کو چھوڑ کر ان دنوں یورپ کے فضلا بھی اپنی قوم کی دماغی فضیلت اور ذہنی برتری کا سکہ کس طرح ایشیا والوں کے دلوں میں بٹھاتے تھے، حالاں کہ آرنلڈ صاحب کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ مجسم علم تھے اور علم کی خدمت کے سوا ان کا کوئی اور مطمح نظر نہ تھا، مولانا شبلی مرحوم نے سفرنامہ میں ان کا ایک واقعہ لکھا ہے، جس سے اُس کی تصدیق ہوگی، لکھتے ہیں "لیکن دوسرے ہی دن ایک پرخطر واقعہ پیش آیا، جس نے تھوڑی دیر تک مجھ کو سخت پریشان رکھا، ۱۰ رمئی کی صبح کو میں سوتے سے اٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا، میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے، انجن بالکل بے کار ہو گیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا، میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا، دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا، وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے، میں نے ان سے کہا کہ آپ کو کچھ خبر بھی ہے، بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے، میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں؟ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا کیا موقع ہے؟ فرمایا کہ جہاز کو اگر برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے اور ایسے قابل قدر وقت کو رایگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے، ان کے استقلال اور جرأت سے مجھ کو بھی اطمینان ہوا، آٹھ گھنٹہ کے بعد انجن درست ہوا اور بدستور چلنے لگا، مولانا کالج میں رہ کر کسی قدر انگریزی سے حرف شناس ہو گئے تھے اور معمولی عبارت سمجھ لیتے تھے، آرنلڈ صاحب سے انہوں نے فرنچ سیکھنی شروع کی، کیوں کہ اسلامی مباحث پر اکثر کتابیں فرنچ اور جرمن میں تھیں، اس لیے ان دو میں سے کسی ایک زبان کے جانے بغیر اسلامیات کے متعلق اہل یورپ کی تحقیقات

اور کاوشوں سے براہِ راست واقفیت ممکن نہ تھی، مولانا آرنلڈ صاحب سے موسیو سیدیو کی کتاب ''تمدنِ اسلام'' سبقاً پڑھتے تھے اور جس نسخہ میں پڑھتے تھے وہ تبرک دارالمصنّفین کے کتب خانہ میں اب تک موجود ہے۔

مولانا کو یورپین تصانیف اور مطبوعات سے جو واقفیت ہوئی، اس کا ایک دوسرا ذریعہ بھی تھا جس کا تعلق علی گڑھ سے نہیں بلکہ حیدرآباد سے ہے، مولوی سید علی بلگرامی جو عربی اور انگریزی کے علاوہ فرنچ اور جرمن وغیرہ بہت سی زبانیں جانتے تھے اور جو یورپ کے فضلا اور ان کی تصنیفات سے براہِ راست تعلقات رکھتے تھے اور ان کے کتب خانہ میں ان معلومات کا بڑا سرمایہ تھا، ان سے اور مولانا سے ملاقات گو ۱۸۹۱ء میں ہوئی، مگر تعارف کا آغاز المامون کی اشاعت سے ہو گیا تھا، یہ تعارف ملاقات کا اور ملاقات تعلقات کا ذریعہ بن گئی، مولوی سید علی صاحب بلگرامی نے مولانا کو یورپ کی مطبوعات کے بہت سے نسخے بھی نذر کیے تھے، جو مولانا کے ذاتی کتب خانہ میں تھے، اور جن کو بعد کو انہوں نے ندوہ میں وقف کر دیا اور اس وقت وہ وہاں موجود ہیں، فہرست ابن ندیم کا نسخہ اسی زمانہ میں مولانا کو ان ہی سے ملا تھا، سید علی بلگرامی نے اس کے یونانی ناموں کے صحیح تلفظ انگریزی میں اس کتاب پر اپنے قلم سے لکھے تھے، مولانا کا مضمون ''تراجم'' اسی نسخہ پر مبنی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولوی سید علی صاحب بلگرامی جب حیدرآباد سے الگ ہو کر ہردوئی میں رہنے لگے تھے تو مولانا سے ملنے لکھنؤ آئے، اسی زمانہ میں مولانا دارالعلوم ندوہ کے معتمد تھے، مدرسہ میں ان کی تقریر کا انتظام ہوا، اس تقریر میں انہوں نے فرمایا تھا ''اگر آپ کو یورپ کی کوئی زبان علم کی خاطر سیکھنا ہے تو فرنچ یا جرمن پڑھئے، انگریزی تو بنیوں کی زبان ہے''۔

مولانا نے کتب خانہ اسکندریہ کی تحقیق پر جو رسالہ لکھا تھا اس میں بعض یورپین مستشرقوں کے مضامین کا ترجمہ مولوی سید علی بلگرامی ہی نے کر کے دیا تھا، جو رسالہ مذکور کے ساتھ ان ہی کے نام سے چھپا ہے۔

علی گڑھ کی مرکزیت کے سبب سے یورپ میں اسلام اور تاریخ اسلام پر جو کتابیں لکھی جاتی تھیں، وہ فوراً وہاں پہنچ جاتی تھیں، مولانا ان کے مضامین سے واقفیت پیدا کرتے تھے اور قابل اعتراض باتوں کا جواب دیتے تھے۔

چنانچہ مسٹر پامر نے انگریزی کتاب ہارون الرشید کی لائف میں مسلمان بادشاہوں پر مذہبی تعصب کا جو الزام قائم کیا تھا، مولانا نے المامون میں ضمناً اس کا پورا جواب دیا ہے، اسی طرح پروفیسر شیڈون ایموز (Sheldon Amos) نے جو اس زمانہ میں لندن یونیورسٹی میں قانون کے پروفیسر تھے، اپنی کتاب ''رومن سول لا'' میں فقہ اسلامی کا رومن لا سے ماخوذ ہونا ثابت کیا تھا، مولانا نے سیرۃ النعمان کے ایک حاشیہ میں اس کا مدلل جواب لکھا ہے، ان کتابوں کا یا ان کے مفید مطلب ابواب کا ترجمہ ان کے شاگرد ان کے لیے کر دیا کرتے تھے۔

مصری مطبوعات کا سرمایہ | اسی سلسلہ میں کالج پہنچ کر مصر کی نئی عربی مطبوعات اور تصنیفات سے بھی مولانا کو آگاہی ہوئی، مصر کی حالت اس لحاظ سے ہندوستان سے بہتر تھی کہ وہ ہندوستان کی طرح انگریزوں کا پورا غلام نہ تھا اور نہ وہاں کے علمی حلقہ پر انگریزی کا تسلط تھا، یورپ کی قوموں اور زبانوں میں سے مصر کو سب سے پہلے فرانسیسی سے سابقہ پڑا، نپولین نے ۱۷۹۸ء میں جب مصر پر قبضہ کیا تو وہ قبضہ گو بہت جلد اٹھ گیا، مگر اس کا علمی و ادبی تسلط اس سرزمین سے نہیں اٹھا، اس لیے مصر کو یورپ کی زبانوں میں سے ''بنیوں کی انگریزی زبان'' سے واسطہ نہیں پڑا، بلکہ یورپ کی ایک ایسی زبان سے واسطہ پڑا جو سرتاپا علمی تھی، اور جس میں اسلامی معلومات و تحقیقات کا بڑا سرمایہ تھا، بہرحال مولانا مرحوم کے پاس مصر و شام کے مصنفوں اور ادیبوں کی کتابیں براہِ راست آتی تھیں اور وہ خود بھی وہاں سے ہر نئی کتاب جو مطبع سے چھپ کر نکلتی تھی، منگوایا کرتے تھے، جدید فلسفہ، جدید ہیئت، جدید طبیعیات اور عربی صرف و نحو و بلاغت پر نئی نئی طرز کی جو کتابیں لکھی جاتی تھیں، وہ ان کے پاس پہنچتی تھیں اور مولانا ان کے ذریعہ سے یورپ کی جدید تحقیقات سے واقفیت پیدا کرتے تھے، اسی طرح قدما کی تصانیف جو متاخرین کی کتابوں کا ماخذ ہیں اور جو متاخرین کی کج مج اور پیچیدہ منطقیانہ طرزِ تعبیر کے بہ جائے زیادہ واضح اور صاف ہیں، مولانا ان کے پورے قدرداں تھے، وہ جہاں سے مل سکتیں، ان کو منگواتے تھے اور پڑھتے تھے، قلمی ہوتیں تو ان کی نقلیں لیتے۔

عربی اخباروں اور رسالوں کا پڑھنا اور سمجھنا اس زمانہ میں ہر مولوی کا کام نہ تھا، تمام ہندوستان میں شاید مولانا پہلے شخص تھے، جنہوں نے ان کو پڑھنا اور سمجھنا شروع کیا، بلکہ الہلال وغیرہ مصر کے عربی رسالوں میں ان کے مضمون بھی چھپتے تھے، ایک خط میں وہ اپنے عربی اخباروں اور اپنے یہاں آنے والے رسالوں کے یہ نام لکھ کر بھیجتے ہیں، ثمرات الفنون، قسطنطنیہ، السلام، اطرابلس، المؤید

المنار، الہلال، المقتطف۔ (ریاض حسن خان-ا)

آگے بڑھ کر جب مولانا کے فضل وکمال کا شہرہ یورپ کے علما تک پہنچا تو انہوں نے بھی مولانا سے تعلقات پیدا کیے اور وہ یورپ کی مطبوعات ان کو کبھی کبھی ہدیہ بھیجتے تھے، چنانچہ ڈوزی کا مشہور عربی لغت انگلستان سے مسٹر تھارٹن (Thorton) نے اپریل ۱۸۹۸ء میں ہدیۃً بھیجا تھا، اس کتاب کے پہلے حصہ پر مولانا کی یہ یادگار تحریر ہے:

اھدی الیّ ھذا الکتاب مسٹر تھارٹن (Thorton) احد کبار الانکلیز فی عاصمۃ لندن شبلی نعمانی ۱۶/اپریل ۱۸۹۸ء، ۲۵/ذیقعدہ ۱۳۱۵ھ)

مولانا کی یہ بھی عادت تھی کہ جب انگریزی کی نئی کتابوں کے معلومات کی ضرورت ہوتی تو کتابیں منگوا کر عزیزوں اور دوستوں سے ان کے ترجمے سنتے، انگریزی داں دوستوں سے فرمائش کرتے کہ فلاں مقام یا بحث کا خلاصہ لکھ کر بھیجو، کبھی یہ لکھتے کہ اس مضمون کے متعلق نئے معلومات اگر تمہاری نظر سے گذرے ہوں تو مطلع کرو، چنانچہ مکاتیب میں ان کے خاص خاص دوستوں اور شاگردوں کے نام جو خطوط ہیں، ان میں یہ باتیں اکثر نظر آئیں گی۔

کالج پر مولانا کے اثرات محمڈن کالج علی گڑھ اپنے طرز کا پہلا کالج تھا جس میں انگریز، ہندو، مسلمان ہر قسم کے استاد اور شاگرد تھے، ایسے ماحول میں ایک پرانا بوریا نشین عالم جس نے کبھی انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا تھا، جس نے انگریزوں کی صحبت کبھی نہیں اٹھائی تھی، جو نئے تمدن وتہذیب کے سایہ میں کبھی نہیں بیٹھا تھا، یکا یک آیا اور اس پورے ماحول میں رہ کر اس طرح سب میں سما گیا کہ وہ کہیں سے بیگانہ نہیں ہونے پایا، یہ بجائے خود ایک کمال ہے اور کالج نے قدیم وجدید کی اس ہم آہنگی اور تعاون سے بڑا فائدہ اٹھایا اور وہ چپقلش اور کشاکش نہ ہونے پائی جس کا ہونا ایسے ماحول میں ضروری تھا۔

اس بزم میں گو دوسرے علما بھی شریک تھے، مگر وہ جہاں تھے، وہیں رہے، لیکن مولانا شبلی کا حال یہ تھا کہ وہ ہر محفل پر چھا رہے تھے اور ہر علمی بحث میں ان کا قول فیصل تھا، وہ اپنے فضل وکمال بنا پر بجائے اس کے کہ نئے علوم وفنون کے اہل کمال سے مرعوب اور اپنے علوم ان کی نگاہوں میں بے قدر ہوتے، انہوں نے نہ صرف اپنی بلکہ علمائے اسلام کی قدر ومنزلت کو بڑھا دیا اور اپنے قدیم علوم وفنون کے مرتبہ کو اتنا اونچا کیا کہ پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے انگریز پروفیسروں کو ان کی تحسین بلکہ تحصیل

پر مجبور کر دیا اور ایسے زمانہ میں جب کہ کالج میں ہر طرف سے نئے علوم، نئے مسائل اور نئی تحقیقات کی بارش ہو رہی تھی، ایک مولانا ہی کا وجود تھا جو اس مسلسل بارش کے طوفان میں اسلامی علم وفن کے منارہ کو اس مضبوطی سے اپنی جگہ پر جمائے ہوئے تھا کہ ان کو اس طوفان خیز سیلاب سے کوئی خطرہ نہ رہا۔

کالج کوئی پرانے طرز کا عربی کا مدرسہ نہ تھا، جہاں عربی شروح وحواشی کا درس دیا جاتا، وہ سرتاپا جدید علوم وفنون کے ہوش رُبا مناظر کا تماشا گاہ تھا، اس فضا میں طلبہ کے اندر اپنے پرانے علوم، فارسی ادب اور عربی زبان کا ذوق پیدا کر دینا مشکل کام تھا، مگر مولانا نے کالج میں اس مشکل کام کو ایسا انجام دیا کہ کئی ہونہار طلبہ نے ان علوم میں نام وری حاصل کی، مولوی حمید الدین صاحب، مولوی بہادر علی صاحب، مولوی داؤد بھائی وغیرہ اس کی مثالیں ہیں

مولانا نے آگے چل کر کالج کے طلبہ کو قرآن پاک کا درس دینا شروع کیا اور اس درس کو ایسا دل چسپ بنا دیا کہ طلبہ بڑی توجہ سے اس کو پڑھنے لگے اور ان میں قرآن پاک کا ذوق پیدا ہونے لگا، محمد علی مرحوم مجھ سے کہتے تھے کہ ''میرا قرآن پاک کا ذوق اسی زمانہ کی یادگار ہے'' سید سجاد حیدر صاحب کہتے ہیں کہ مولانا قرآن کے درس کے وقت قرآن پاک کے اصولِ بلاغت اور صنایع وبدایع کو بتاتے تھے اور ان صنائع کی مثالوں میں ایسے اچھے اچھے فارسی اشعار سناتے تھے کہ ہم وجد کرتے تھے۔

طلبہ میں ذاتِ پاک محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حسنِ عقیدت اور واقفیت پیدا کرنے کے لیے عربی میں سیرت کا ایک مختصر رسالہ بدء الاسلام لکھا اور وہ کالج کے نصاب تعلیم میں داخل ہوا اور شاید اب تک ہے، اسی سلسلہ میں مولانا نے کالج میں میلاد کی مجلسوں کی بنیاد ڈالی، شروع شروع میں یہ جلسہ خود اپنے بنگلہ پر کرتے تھے اور تھوڑے سے آدمی مدعو ہوتے تھے، نشست کرسی اور میز پر ہوتی اور مولانا خود سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے کسی پہلو پر تقریر فرماتے تھے، رفتہ رفتہ ان جلسوں سے دل چسپی بڑھنے لگی تو ۳۰؍ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو سیرت ومیلاد کا پہلا عام جلسہ نہایت شان وشوکت سے سالار منزل میں ہوا اور کچھ عرصہ بعد اسٹریچی ہال[1] میں ہونے لگا۔

انگریزی کے طالب علموں میں جہاں کی فضا ہی کچھ اور ہوتی ہے، مذہبی رنگ پیدا کرنا کتنا مشکل کام ہے، مگر مولانا نے کالج میں اس کام کو جس طرح انجام دیا اس کا بیان خود انہی کی زبان سے سنئے:

---

[1] کانفرنس گزٹ مورخہ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء از مضمون خاں صاحب میر ولایت حسین صاحب۔

''اس وقت مجھ سے نہ میری طبیعت کا حال پوچھئے، نہ کوئی اور واقعہ آپ سنئے اور میں دل سے اٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سناؤں، یوں تو مدرسۃ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں، مگر ان دنوں ہوا کا رخ ہی بدل گیا ہے، لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے جس کو وہ لجنۃ الصلوٰۃ کہتے ہیں، ایک بی اے سکریٹری ہے اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں، چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خواں لوگوں کو اس پُر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے، الصلوٰۃ خیرٌ من النوم پانچوں وقت کی نمازیں با جماعت ہوتی ہیں اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش سے بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں، مغرب کی نماز سبحان اللہ! کیا شان وشوکت سے ہوتی ہے کہ بس دل پھٹا پڑتا ہے، خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں اور چوں کہ وہ عامل بالحدیث ہیں، آمین زور سے کہتے ہیں، ان کے آمین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہے، میں بھی کبھی اسلام پر لکچر دیتا ہوں، مسجد بننے کی تیاری ہے، سید محمود صاحب کی سرگرمی نے اس کے پیمانۂ تعمیر کو نہایت وسیع کر دیا ہے، وہ مہتمم خاص ہیں اور تین ہزار چندہ خود دیں گے، میں نے بھی ۵۰/روپے دیے ہیں، سید محمود صاحب خود ہاتھ میں پھاوڑا لیں گے اور مسجد کی نیو کھودیں گے، لاگت کا تخمینہ ساٹھ ستر ہزار روپیہ ہے۔

مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوشِ مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا، اس جوشِ مسرت میں اور بھی لکھتا مگر مجھ کو میرے بھائی خصوصاً میاں اسحاق وعثمان یاد آ گئے اور میرا سارا جوش اس طرح ٹھنڈا ہو گیا، جس طرح طاؤس کا اپنے پاؤں دیکھنے سے۔

ان عزیزوں نے ترقی ولیاقت کا طرۂ فخر صرف لا مذہبی کو سمجھا ہے، حالاں کہ لیاقت بھی کچھ دنیا سے نرالی نہیں، خیر خدا توفیق دے۔'' (مکاتیب محمد عمر-۱)

مولانا نے کالج میں بیٹھ کر تالیف وتصنیف کا جو کام انجام دیا، اس نے کالج کے ماحول کو سرتاپا علمی رنگ میں رنگ دیا، اس زمانہ میں مولانا حالی بھی اکثر یہاں آتے جاتے رہتے تھے اور بھی دوسرے اہل علم کی آمد ورفت لگی رہتی تھی، اس کا مجموعی اثر اور بھی زیادہ تھا، طلبہ میں بھی لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا اور ان کی زندگیوں میں علمی رنگ نمایاں ہوا، مولوی عزیز مرزا مرحوم، خواجہ غلام الثقلین مرحوم اور مولوی عبدالحق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو (بہ شرطے کہ وہ مانیں) اسی آب وہوا کی پیداوار ہیں، جن طالب علموں میں تحریر وانشا کا ذوق تھا، وہ ذوق بھی مولانا کی تحریک سے ابھر کر نمایاں ہوا، اس سلسلہ میں

سید سجاد حیدر صاحب یلدرم مولوی سید محفوظ علی صاحب بدایونی اور شیخ محمد عنایت اللہ صاحب وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں، جن طالب علموں کو شعر و سخن کا چسکا تھا وہ مولانا کی سخن سنجیوں سے متاثر ہوئے، مولوی ظفر علی خاں، مولوی ہدایت اللہ صاحب (سی پی) اور چودھری خوشی محمد صاحب ناظر کی سخن وری، اگر تنہا مولانا کی نہیں تو مولانا شبلی اور مولانا حالی دونوں کی دو گونہ تاثیروں کی رہینِ منت ہے، ان صاحبوں میں سے جنھوں نے مولانا کے اس فیضِ اثر کو تسلیم کیا ہے، ایک قابل ذکر ہستی مولوی مسعود علی صاحب بی اے المتخلص بہ محوی کی ہے، جو حیدرآباد دکن میں پہلے جج تھے اور اب دارالترجمہ میں ہیں اور فارسی کے خوش مذاق شاعر ہیں، ان کا مجموعہ نظم فارسی نذرِ عقیدت کے نام سے ۱۳۵۶ھ میں شایع ہو چکا ہے، اس کے مقدمہ میں مولانا مرحوم کے فیضِ صحبت اور فیضِ تعلیم کا اعتراف فرمایا ہے، لکھتے ہیں: ''علی گڑھ کالج کے بی اے کلاس کے فارسی نصاب میں قاآنی کے چند قصائد داخل تھے، مولانا شبلی فارسی کے پروفیسر تھے، مولانا مرحوم ان نادر الوجود استادوں میں تھے، جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھا اور سمجھا دیتے بلکہ اس مضمون کے ساتھ شاگردوں میں حقیقی دل چسپی پیدا کرنے میں ملکہ رکھتے تھے، مولانا مرحوم مغفور کی دل چسپ صحبت اور شاگردی کا یہ اثر ہوا کہ ہم میں سے بعض طلبہ فارسی میں ٹوٹی پھوٹی نظم لکھنے لگے اور سب نے قاآنی ہی کا طرز اختیار کیا، کالج سے نکلنے کے بعد بعض ساتھی تو شعر گوئی کی علت سے پاک و صاف ہوگئے اور بعض نے فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ کی اور اچھے شعر کہنے لگے، مگر میں اس علت کے قدیم جراثیم اپنے دماغ سے نکالنے میں آج تک کامیاب نہ ہوسکا'' (دیباچہ-د) مولانا شروانی فرماتے ہیں: ''مجھ کو بھی اگر کچھ لکھنا آیا تو انہی صحبتوں کے اثر سے تاریخ وادب فارسی کا ذوق یہیں نشو ونما پذیر ہوا ہے اور جو طلبہ شاعر نہ بن سکے، وہ مولانا کے ترنم کی نقل اُتار کر ایسی نظم خوانی کرنے لگے کہ جس مجلس میں پڑھتے، اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہتے، مولانا شرر لکھتے ہیں: ''ان چیزوں نے انہیں فارسی اور اردو کا ایک مقبولِ عام شاعر ثابت کرنا شروع کر دیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک دقیقہ رس شاعر تھے اور اپنی نظموں کو ایسی نغمہ خیز دھن میں سنایا کرتے تھے کہ پبلک نے پسند کیا اور طلبہ نے اسے اختیار کرکے قومی نغمہ خوانی کی ایک مقبولِ عام دھن بنا کے سارے ہندوستان میں پھیلا دیا'' مولانا کی یہ شاعری کی قوت بھی کالج کی نام وری میں بہت کام آئی ہے، جتنے اکابر اور امرا یہاں اس زمانہ میں آئے، ان کو دردِ ملت سے آشنا اور کالج کی ہم دردی اور اعانت کی طرف ملتفت کرنے میں مولانا کی شاعری نہیں،

ساحری بڑا کام دیتی تھی، چنانچہ وہ اس کو کبھی غرناطہ، کبھی بغداد اور کبھی صفاہان بتاتے تھے اور مسلمانوں کی علمی ترقیوں کی امید گاہ ٹھہراتے تھے:

برسد بر درِ او ہر کہ بود طالبِ فن | آنکہ گو ہر طلبد جانب عماں گذرد
گر بدیں گونہ بود گرمی ہنگامۂ او | خود ز غرناطہ و بغداد و صفاہاں گذرد
ہر دم ایں مدرسہ لاریب وگرمی گردد | اندکے باش کہ ایں قطرہ گہری گردد
تا خود از دانش وفن نام ونشاں خواہد بود | بوئے ایں فیض بدیں گونہ رواں خواہد بود
تا ابد طالبِ فن روے بد و خواہد کرد | تا ابد قبلۂ دانش طلباں خواہد بود

ذاتی طور پر مولانا نے ہمیشہ امرا کی مدح سرائی کو عار سمجھا، لیکن قومی ضرورت کی بنا پر وہ اس ننگ کو گوارا کر کے فرمایشوں کی تعمیل کرتے تھے، مگر یہ بات اُن کو دل سے پسند نہ تھی، اس لیے یہ فرمایشی نظمیں ان کے فارسی کلیات میں جگہ نہ پاسکیں۔

ابھی مولانا کالج میں گئے ہی تھے کہ چند روز کے بعد فروری ۱۸۸۳ء میں حیدر آباد دکن کے مشہور مدبر مدارالمہام سر سالار جنگ اول نے انتقال کیا، سالار جنگ محسنین کالج کے قافلہ سالار تھے، اس لیے ان کی وفات کا سخت صدمہ ہوا اور کالج ان کے ماتم میں ایک روز بند ہوگیا۔ (مکاتیب فارسی-۲۵) اور اظہارِ غم کے لیے ایک خاص جلسہ ہوا، مولانا نے اس سانحہ پر فارسی میں مرثیہ لکھا تھا جس کو اس موقع پر پڑھ کر سنایا:

آہ ایں چہ غم بود کہ جہانے است نوحہ گر | ایں آہ چہ ماتم است کہ خوں شد دل وجگر
تنہا ہمیں نہ دولت و ملک است در خطر | ہم شرع را نماند کنوں معنی دگر
سالار جنگ مرد جہاں گشت دیدہ تر
شادی ز دل رمیدہ ودل زاں رمیدہ تر[1]

---

[1] اس بند کے بعد مرثیہ کے دوسرے اشعار حسب ذیل ہیں:

ہم ملک را پناہ و ہم اسلام را مدار | کز یمن او نظام ریاست شد استوار
آئین و رسم و داد ازو بود برقرار | بیداد بیں کہ گردش چرخ ستم شعار
آں را کنوں بخاک برابر گرفتہ است | ہر کس چو شمع ز آتش غم در گرفتہ است

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۷ پر)

یہ مرثیہ شاید اس لیے بھی کلیات میں جگہ نہ پا سکا کہ مولانا کے مخصوص انداز سے اس کا رنگ ہلکا اور مزہ پھیکا ہے، لیکن بہرحال اس کو مولانا سے نسبت ہے اور اس کا علی گڑھ سے دکن تک پورا اثر ہوا تھا، اس لیے یادگار کے طور پر حاشیہ میں یہ پورا مرثیہ نقل کر دیا جاتا ہے، یہ بہت ابتدائی کلام ہے، اس لیے صرف زبان اور شاعری کی حیثیت سے اس کو پڑھا جائے۔

مارچ ۱۸۸۶ء میں مدبر الملک وزیر الدولہ خلیفہ سید محمد حسن صاحب وزیر ریاست پٹیالہ کالج میں آئے تو مولانا نے کھانے کے بعد سید محمود کی فرمائش سے فارسی کے چند بند پڑھے جن میں پہلا بند یہ تھا:

اے دل ایں مایہ انتظار کہ بود　　آخر ایں مستی از خمار کہ بود
چشم شوقت بہ رہ گذار کہ بود　　ہوسِ سرمۂ غبار کہ بود

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۶)

آں کو فلک بہ درگہ او سر نہادہ است　　افسر بہ فرق خود زمہ و خور نہادہ است
چرخش کنوں بخاک برابر نہادہ است　　طرح جفائے تازہ ستمگر نہادہ است
تا ایں خبر بکوچہ و برزن فتادہ است　　کار جہاں بنالہ وشیون فتادہ است
ایں سرورے کہ مثل نبودش کسے بدہر　　آئینہ دار طلعت او بودہ ماہ و مہر
ہم دانشش نصیب و ہم از داوریش بہر　　شاہے چنیں نگر کہ بہ یک جنبش سپہر
در تنگ نائے تیرہ مغاک آرمیدہ است　　خورشید زیر پردہ خاک آرمیدہ است
امروز فرد در ہمہ کشور جز او کہ بود　　پشت و پناہ شرع پیمبر جز او کہ بود
زیب و طراز مسند افسر جز او کہ بود　　با آسماں بجاہ برادر جز او کہ بود
اکنوں اگر کنارہ ازیں خاک داں گرفت　　آوازہ اش محیط زمیں و زماں گرفت
آں کس کہ بود دولت و دیں در پناہ او　　آں کس کہ آسماں نہ رسیدے بجاہ او
اکنوں کہ گشت خلد بریں جلوہ گاہ او　　رحم است بر ریاست و روز سیاہ او
مرگ کسے کہ ثانی و ہمتا نہ داشتست　　دردے کہ بود ہیچ مداوا نہ داشتست
آں داور جہاں کہ بہ دانش یگانہ بود　　پاکیزہ مشربے کہ بہ عالم فسانہ بود
فرزانہ مہترے کہ مثل در زمانہ بود　　تا بنگریم تیر اجل زا نشانہ بود
خار است اینکہ بر ہمہ را در جگر نشست　　بار غم است اینکہ فلک را کمر شکست
در رفتنش اگر چہ جہانے بجاں بود　　اما ہر آنچہ خواستۂ آسماں بود
باشد ہماں چہ سود بود چہ زیاں بود　　اکنوں دعائے شبلی دل خستہ آں بود
کورا بود بہ رحمت پروردگار جائے　　خود زیر سایہ حرم کردگار جائے

ایں بہ بیں خانہ جلوہ گاہ کہ ہست
پردۂ دیدہ، فرشِ راہ کہ ہست

مولانا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''اس بند کے پڑھتے وقت عجیب سماں بندھ گیا تھا، حضار مجلس حقیقت میں بے تاب ہوگئے، سید محمود اٹھ اٹھ کر ہر بند کو کئی کئی بار پڑھواتے تھے، وزیر صاحب نے بڑھ کر کہا کہ ''افسوس ہے کہ ان شعروں میں آپ نے میرا ذکر کیا ہے، ورنہ میں اس کی پوری داد دیتا''۔ (مسیح -۲۰)

۱۸۹۵ء میں نواب اقبال الدولہ وقار الامراء مدار المہام حیدرآباد دکن کی علی گڑھ میں تشریف آوری کے موقع پر سرسید کی تحریک پر ایک قصیدہ[1] لکھا اور پڑھا، جس میں مسلمانوں کے ادبار، علی گڑھ تحریک اور کالج کی خصوصیات اور امیدوں کا دل چسپ اور موثر بیان تھا، یہ قصیدہ بھی کلیات میں شامل نہیں، مگر مطالعہ کے قابل ہے، کالج کی تعریف میں اوپر جو شعر نقل کیے گئے وہ اسی قصیدہ کے ہیں، یہ پورا قصیدہ آپ کو حاشیہ میں ملے گا۔

---

[1] قصیدۂ خیر مقدم نواب وقار الامراء بہادر

در جہاں چوں سخن از شوکت واز شاں گذرد — نام دستور دکن بر سر عنواں گذرد
صدر جم مرتبہ نواب وقار الامراء — آں کہ گردوں بدرش بندۂ فرماں گذرد
اے خوشا بخت کہ آں داور جمشید حشم — بسر مدرسہ با ایں سر و ساماں گذرد
ایں دبستاں بہ مثل تازہ گلستانے ہست — خواجہ ابریست کہ بر طرف گلستاں گذرد
گذر افتادہ ہما کوکبہ جاہش را — تشنہ بنگر کہ برو چشمۂ حیواں گذرد
ابر دیدی کہ گہر ریز رود بر سر خاک — موکب خواجہ بہ ما نیز بدیساں گذرد
بہ مثل واقعۂ مور و سلیماں باشد — گر حدیث از شرف و پایہ مہماں گذرد
داد را مدح تو اندازہ مانیست ولے — خوش بود از سخن از عالم احساں گذرد
یادگار کرم دولت آصف جاہی است — بہ نظر ہر چہ دریں منزل و ایواں گذرد
میوزیم کو شرف نسبت نامش دارد — جائے آنست کہ از طارم کیواں گذرد
خاص و عامی ہمہ از فیض کفش سیراب اند — ابرہم بر چمن و ہم بہ بیاباں گذرد
صاحبا! گوش بہ من دار کہ تا شرح و ہم — آں چہ بر ناز سیہ کاری دوراں گذرد
بود روزے کہ گراں پایگی رتبۂ ما — بیش ازاں بود کہ در وہم سخن داں گذرد
حالیا کار بآں بے سر و پائی بہ کشید — کہ بہ ما ہر کہ رسد برزدہ داماں گذرد
بگذرد از غم و آزار پیاپے بر ما — انچہ بر شیشہ ز اوفتادن سنداں گذرد
ہر چہ از بے کسی و ذلت و خواری بینی — خودعیاں است و مپرس آں کہ بہ پنہاں گذرد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۹ پر)

اسی طرح جب ۱۳۰۵ھ-۱۸۸۸ء میں نواب آسماں جاہ بہادر وزیر اعظم حیدر آباد دکن علی گڑھ آئے، تو مولانا نے سرسید کی فرمایش سے رودکی کے مشہور قصیدہ پر ایک قصیدہ لکھ کر پڑھا، خود مولانا نے شعرالعجم جلد اول میں رودکی کے بیان میں ایک حاشیہ دے کر لکھا ہے "جس زمانہ میں میں علی گڑھ میں پروفیسر تھا، آسماں جاہ (وزیر ریاست حیدر آباد دکن) علی گڑھ میں آئے، سرسید مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ سپاس نامہ کے بہ جائے کالج کی طرف سے قصیدہ پیش کیا جائے اور وہ تم لکھ دو، میں نے ایک خاص مناسبت سے اسی قصیدہ کو پیش نظر رکھا، ابتدا میں یہ تمہید تھی کہ لوگوں میں آسماں جاہ کی آمد کا چرچا ہے، پھر یہ اشعار تھے:

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۸)

گر نہ ایں مکتب وایں مدرسہ برپا می گشت — بیم آں بود کہ ایں درد ز درماں گذرد
ایں مسیحا نہ اگر بہر مداوا می خواست — بیم آں بود کہ رنجور خود از جاں گذرد
بہ رسد بر در او ہر کہ بود طالب فن — آنکہ گوہر طلبد جانب عماں گذرد
گر بدیں گونہ بود گرمی ہنگامہ او — خود ز غرناطہ و بغداد و صفاہاں گذرد
ہر دم ایں مدرسہ لاریب و گرمی گردد — اند کے باش کہ ایں قطرہ گہر می گردد
تا خود از دانش و فن نام و نشاں خواہد بود — جوئے ایں فیض بدیں گونہ رواں خواہد بود
تا ابد طالب فن روے بدو خواہد کرد — تا ابد قبلہ دانش طلباں خواہد بود
گر بدیں گو نہ بود مائدہ فیض دراز — یک جہاں زلّہ ربائے سر خواں خواہد بود
دوست افسانہ شادی بزباں خواہد راند — خصم را دیدہ حیرت نگراں خواہد بود
ہست چوں در کف قیصر و دارائے دکن — ایمن از فتنہ و آسیب زماں خواہد بود
ملک و ملت ہدف تیر حوادث بودہ است — آستانش حرم امن و اماں خواہد بود
آرزو ہاست در اندیشہ راز فضل خدائے — انچہ اندیشہ نمودیم ہماں خواہد بود
گر بہ آئین سلف بہرہ ربائیم ز علم — رخش اقبال دگر در تہ راں خواہد بود
باز در راہ طلب گرم بخیزیم ز جائے — خواب دوشینۂ ما چند گراں خواہد بود
می تواں غلغلہ اوج و ترقی انگیخت — تا بکے بر لب ما آہ و فغاں خواہد بود
بود آں ہم کہ بہ ما نیز گہ یار شود — چرخ تا چند بکام دگراں خواہد بود
ہاں بسنجی کہ نژاد عرب و آل لوے — ایں چنیں خستہ و رسوائے جہاں خواہد بود
آں چمن زار کہ پروردہ ابر کرم است — ہاں مندیش کہ تاراج خزاں خواہد بود
بس بود ایں کہ نہ داریم سر تاج و کلاہ — بخت زیں بیش چہ در فکر زماں خواہد بود
با ہمہ خستگی آں فطرت آبا باقی است — خاک گشتیم و ہنوز آں سر سودا باقی است

ہم چناں باشیم گرمِ گفتگو — قاصد از در ناگہاں آید ہمی
افگند شورِ مبارکباد و بس — ایں حدیثش بر زباں آید ہمی
آسماں جاہ از سوئے ملک دکن — جانبِ ہندوستاں آید ہمی

مولانا کا ذخیرۂ ادب جب تک زندہ ہے کالج کے وہ تاریخی مواقع اب بھی زندۂ روزگار ہیں اور رہیں گے۔

علاوہ ازیں مولانا کے پے در پے محققانہ مضامین، تعلیمی کانفرنس کے خطبے اور عالمانہ تصانیف نے نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر بھی کالج کا نام روشن کرنے میں بڑی مدد دی، اس زمانہ میں کالج ہر قسم کی علمی و ادبی تحریکات کا مرکز تھا، یہیں سے نئی کتابیں نکلتی تھیں، نئی تصنیفات شائع ہوتی تھیں اور نئے نئے محققانہ مضامین کی اشاعت ہوتی تھی، ہندوستان سے نکل کر روم، شام، مصر مولانا جہاں گئے علی گڑھ کالج کی شہرت کے دائرہ کو بڑھاتے چلے گئے، اس زمانہ میں ریاست بھوپال وغیرہ میں کالج کا نام اور اس کے ساتھ حسن ظن اور ریاست کی امداد کا خیال مولانا کی ان ہی تصنیفات کا نتیجہ ہے، اسی طرح حیدرآباد میں نواب عماد الدین سید حسین بلگرامی کو کالج کی طرف جس معجزانہ کارنامہ نے اپنی طرف متوجہ کیا وہ بھی مولانا کی یہی تصنیفات ہیں، اس کا ذکر سرسید کے ان خطوط میں ہے، جو انہوں نے نواب عماد الملک کو لکھے ہیں۔

مولانا نے اپنی تصانیف کے ذریعہ جو کالج کے زمانہ میں کیں، کالج کی صرف معنوی ترقی میں مدد نہیں کی، بلکہ جہاں تک ہو سکا انہوں نے اس زمانہ کی اپنی تمام تصنیفات کالج کے نذر کر کے اس کی مالی امداد میں بھی حصہ لیا، چنانچہ ان کی یہ فیاضی یاد رکھی جائے گی کہ کالج کے زمانۂ قیام تک انہوں نے اپنی تصانیف سے ایک حبہ کا بھی فائدہ نہیں اٹھایا، حالاں کہ ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ تین تین مہینوں میں ان کا پہلا اڈیشن ختم ہو جاتا تھا، ایک بار مولانا کے ایک دوست نے ایک کلب قائم کیا اور اس کے لیے ان سے ان کی تصنیفات ہدیۃً مانگیں تو ان کو افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑا "میں اپنی تصنیف نذر نہیں کر سکتا، میری تصنیفات جو اس وقت معرض بیع میں ہیں، المامون والجزیہ ہیں، یہ دونوں کتابیں سید صاحب نے کالج کے لیے چھاپی ہیں، مجھ کو حق تصنیف میں صرف ایک نسخہ عنایت ہوا تھا، وہ دے نہیں سکتا، اس وقت تک میں نے اپنی کسی تصنیف کو نہ خود چھاپا، نہ اس سے فائدہ اٹھایا" اس کی تصدیق خود سرسید کے ایک خط سے ہوتی ہے، جو انہوں نے ۲۰؍ مارچ ۱۸۸۹ء کو نواب عماد الملک بلگرامی کے نام لکھا ہے، لکھتے ہیں

''پچاس نسخے المامون کے میں نے خدمت عالی میں روانہ کیے ہیں'' گزشتہ تعلیم مسلمانان'' کے نسخے صرف معدودے چند رہ گئے ہیں، اس لیے وہ نہیں بھیج سکا، آپ نے جو کتابوں کو خرید فرمایا غالباً آپ کو خیال ہوگا کہ ایک اعانت مولوی شبلی کی ہے، مگر مولوی شبلی نے یہ کتابیں مع حق تصنیف وغیرہ کالج کے نذر کر دی ہیں، ان کی قیمت یا منافع سے ایک حبہ کا فائدہ انھوں نے حاصل نہیں کیا اور آیندہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں، صرف کالج کے فائدہ کے لیے لکھتے ہیں، اپنا ذاتی فائدہ ان کو مقصود نہیں، ایسے جاہل آدمی ہیں کہ انہوں نے چند نسخے المامون کے بلا قیمت اپنے دوستوں کو بھیجنا چاہے، میں نے ہر چند اصرار کیا کہ جس قدر تمہارا دل چاہے، لے لو، ہرگز نہ مانا، مجھ سے خرید لیں اور اپنے دوستوں کو بھیج دیں۔'' (خطوط سر سید ص ۱۳۸)

کالج میں عربی زبان کی ترقی اور طلبہ میں عربی تحریر وتقریر کا شوق دلانے کے لیے انہوں نے ایک لجنۃ الادب کی بنیاد ڈالی، اس لجنۃ الادب میں طلبہ بڑے شوق سے حصہ لیتے تھے، اور عربی کے طالب العلم عربی میں تحریریں پڑھتے تھے، نظمیں سناتے تھے اور تقریریں کرتے تھے، دوسری انجمن اخوان الصفا کے نام سے قائم تھی، جس میں اردو کے عام مضامین پڑھے جاتے اور تقریریں کی جاتیں تھیں، اس میں بھی مولانا کا حصہ تھا، ان ہی دونوں انجمنوں نے مل کر شمس العلما کے خطاب پر مولانا کو تہنیت دینے کے لیے ۱۹ / جنوری ۱۸۹۴ء کو جلسہ کیا تھا، جس میں تمام اکابر شریک تھے۔

یہاں طلبہ کی سب سے بڑی مجلس کا نام یونین تھا اور جواب بھی ہے، مولانا اس میں بھی حصہ لیتے اور طلبہ میں حسن تقریر کا سلیقہ پیدا کرتے تھے، یہ وہی یونین ہے، جس نے سفر روم ومصر وشام سے واپسی پر مولانا کے لیے ۶ / دسمبر ۱۸۹۲ء میں بزم دعوت ترتیب دی تھی اور جس میں مولانا نے یہ قصیدہ پڑھا تھا:

قاصدِ خوش خبر امروز نوا ساز آمد ... کز سفر یار سفر کردهٔ ما باز آمد

از سفر شبلی آزاده به کالج برسید ... یا مگر بلبلِ شیراز به شیراز آمد

کالج امروز بآں فرّ و وشان است که بود ... بزم را گرمیِ ہنگامہ ہمان است که بود

یونین آنکه بما شیوهٔ گفتار آموخت ... ہم بدانساں ہنر آموز بیان است که بود

ایک دفعہ ۱۹ / نومبر ۱۸۹۴ء میں یونین میں اس موضوع پر مباحثہ تھا کہ کیا ہمارا گزشتہ طرزِ تعلیم موجودہ طرزِ تعلیم سے بہتر تھا، مولانا نے اپنی ایک مدلل تقریر میں یہ بات ثابت کیا کہ بے شبہ مسلمانوں کا گزشتہ طرزِ تعلیم موجودہ طرزِ تعلیم سے بہتر تھا، یہ تقریر ایسی موثر ہوئی کہ طالب علموں نے عموماً مقرر کا

ساتھ دیا، یہاں تک کہ مسٹر سید محمود نے بھی ان سے موافقت کی۔ (سمیع-۴۷)

مولانا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ یونین میں یہ بحث تھی کہ جمہوری طرز حکومت بہتر ہے، یا شخصی؟ جلسہ میں سید صاحب بھی موجود تھے، مولانا نے جمہوری طرز حکومت کی تائید کی اور اس موضوع پر ایسی مدلل اور موثر تقریر کی کہ تمام طالب علموں نے ان کی موافقت میں رائے دی، یہ امر سید صاحب کے مذاقِ سیاست کے سراسر خلاف تھا، چنانچہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف تقریر کی بلکہ ایک مضمون بھی لکھا، تب جا کر کہیں ان کی طبیعت کی بھڑاس نکلی، سرسید نے اپنا یہ مضمون ایشیائی اسلامی طرز حکومت کے عنوان سے ۲۸ر جون ۱۸۹۲ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپوایا تھا۔

۱۸۹۲ء میں جب مولانا نے کتب خانہ اسکندریہ کا مضمون لکھا ہے اور اس سے چار برس پہلے ۱۸۸۹ء میں الجزیہ پر جو مضمون لکھا تھا، جس نے تحقیق کی دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی، تو سرسید کو خیال آیا کہ یورپ نے اسلام اور مسلمانوں کی نسبت جو تاریخی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں، ان کے جواب اور تصحیح کے لیے ایک مجلس بنائی جائے، چنانچہ ۱۸۹۲ء کے انسٹی ٹیوٹ میں سرسید نے اس کا اعلان کیا اور مولانا مرحوم کے یہ مضامین اس سلسلہ میں داخل کیے گئے اور مولانا کو اس صیغہ کا سکریٹری بنایا گیا، ان کے ان مضامین کے ترجمے انگریزی اور عربی میں بھی شایع کیے گئے، عربی میں خود مولانا نے اپنے قلم سے اپنے رسالہ الجزیہ کا ترجمہ کیا، اسی سلسلہ کا مولانا کا لکھا ہوا مشہور مقالہ ''حقوق الذمیین'' ہے۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ساتھ کالج کی طرف سے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میگزین کے نام سے ایک ضمنی رسالہ نکلتا تھا، جس میں کالج کے حالات، مجلسوں کی رودادیں، انجمنوں کی تقریریں اور اکابر کالج کے مضمون چھپتے تھے، ۱۸۹۴ء میں یہ مستقل علمی رسالہ بنا، اس نئے انتظام میں مولانا مرحوم نے اس کے اردو حصہ کی اڈیٹری قبول فرمائی اور اس کا مقصد خود مولانا کے الفاظ میں یہ قرار پایا: ''اس خیال سے اس کے منتظموں نے اس کو اور زیادہ وسعت دینی چاہی، تاکہ وہ بالکل ایک علمی میگزین بن جائے، جس میں کالج کی علمی خبروں کے علاوہ مسلمانوں کے علوم وفنون، تاریخ اور لٹریچر کے متعلق مفید اور پرزور مضامین لکھے جائیں، اس غرض سے اس کے ۲۴ صفحے اردو کے لیے مخصوص کر دیے گئے اور اس صیغہ کا اہتمام خاص میری سپردگی میں دیا گیا، میں اس رسالہ کے ترقی دینے میں حتی الامکان کوشش کروں گا'' مولانا کا خیال تھا کہ اسلامی سلطنتوں کے اہم تمدنی اور انتظامی صیغوں پر اس میں مضامین لکھے جائیں اور جب وہ معتدبہ حد تک پہنچ جائیں تو ان کو مستقل

کتابوں کی صورت میں شایع کیا جائے، چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا مضمون انہوں نے جولائی ۱۸۹۵ء کے میگزین میں اسلامی حکومتیں اور شفاخانے کے عنوان سے شایع کیا اور اس کے دیباچہ میں اس مقصد کی پوری توضیح کی، یہ رسالہ پوری طرح کامیاب ہوا اور اس میں مولانا شبلی کے علاوہ مولانا حالی اور مولانا ذکاءاللہ صاحب وغیرہ کے مضامین ماہ بہ ماہ چھپتے رہے، اس کے جون نمبر میں مولانا وہ خطبہ چھپا جو انہوں نے ۱۲/ اپریل ۱۸۹۵ء کو ندوۃ العلما کے دوسرے اجلاس میں ''علما کے فرائض'' پر دیا تھا، ۱۸۹۶ء میں ''حقوق الذمیین'' کا معرکۃ الآرا مضمون اسی کے اپریل اور مئی نمبر میں شایع ہوا، اس آخری نمبر میں قدیم اسلامی کتابوں کی اشاعت کی تجویز مولانا نے پیش فرمائی اور ندوۃ العلما کے تیسرے سالانہ جلسہ کی روداد اپنے قلم سے لکھ کر شایع کی ان کے علاوہ اس رسالہ میں ''املا اور صحت زبان'' اور ''سرسید اور اردو لٹریچر'' وغیرہ مضامین ان کے قلم سے نکلے غالباً اس رسالہ میں مولانا کا یہ آخری مضمون تھا جو جون ۱۸۹۸ء کے پرچہ میں نکلا، اس سے تین ماہ پہلے سرسید وفات پاچکے تھے اور کچھ روز کے بعد مولانا بھی علاحدہ ہوگئے۔ ع آں قدح بشکست وآں ساقی بماند

کانفرنس کی خدمت محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا نام پہلے سرسید نے ایجوکیشنل کانگریس رکھا تھا، چناں چہ ۱۸۸۹ء تک وہ تعلیمی کانگریس کہلاتی تھی (خطوط سرسید بہ نام عمادالملک ۱۳۵) مگر جب انڈین نیشنل کانگریس نے شہرت پائی تو پروفیسر ماریسن کے مشورہ سے کانگریس کے بدلہ یہ کانفرنس بن گئی، بہ ہر حال تعلیمی مجلس مولانا کے علی گڑھ جانے کے چند سال بعد ۱۸۸۶ء میں قائم ہوئی اور اس کا پہلا ابتدائی اجلاس ۲۷/ دسمبر ۱۸۸۶ء کو علی گڑھ میں ہوا جس میں کل ساٹھ ستر آدمی شریک تھے، اور مولوی سمیع اللہ خاں صدر نشین، اس اجلاس میں مولانا کی شرکت بعض رزولیوشنوں کی تحریک وتائید تک رہی، دوسرے اجلاس میں جو ۲۷/ دسمبر ۱۸۸۷ء کو لکھنؤ میں ہوا، مولانا نے اپنا مشہور مقالہ ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' لکھ کر پڑھا، جس سے مسلمانوں کی اپنی پچھلی تاریخ کا کارنامہ سن کر آنکھیں کھل گئیں، اس اجلاس کی اخیر تاریخ میں انہوں نے اپنا قصیدۂ عیدیہ جس کو وہ ۱۸۸۳ء میں لکھ چکے تھے، اپنے خاص انداز میں پڑھ کر سنایا، یہ قصیدہ کلیات میں شامل ہے، اس میں تشبیب کے موقع پر دوگانۂ عید کی کیفیت، نمازیوں کا ہجوم، اسلامی جوش کا سماں دکھایا ہے، پھر گریز کے موقع پر مسلمانوں کی موجودہ عبرت انگیز حالت کا نقشہ کھینچا ہے، مولانا نے جلسہ میں جب یہ قصیدہ پڑھا تو تمام حاضرین ایک عجیب اثر سے متاثر ہوگئے[1]، اسی لیے پہلی دفعہ یہ قصیدہ ''گزشتہ تعلیم'' کے ضمیمہ

[1] ضمیمہ گزشتہ تعلیم، مطبوعہ قومی پریس، لکھنؤ۔

کے طور پر چھپا ہے، اسی اجلاس میں سرسید نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ انگریزی کے جو چھوٹے اسکول جابجا قائم ہورہے ہیں، یہ قوم کے لیے مضر ہیں، اس پر مخالف وموافق تقریریں ہوئیں، مولانا نے بھی گویا مخالفت ہی میں تقریر کی اور سرسید کی تجویز بڑی اکثریت سے نامنظور ہوگئی۔

کانفرنس کا تیسرا اجلاس دسمبر ۱۸۸۸ء میں لاہور میں ہوا، اس میں غالباً مولانا نے شرکت نہیں کی، چوتھا اجلاس ۱۸۸۹ء میں پھر علی گڑھ میں ہوا، مولانا نے اس میں اپنا وہ ترکیب بند پڑھا جس کا مطلع ہے:

حیرتم می بردا اینک کہ بدیں زینت وساز چیست کیں بزم بآئین دگر بست طراز
باہمہ فرہ و فر باہمہ تمکین و شکوہ چارمیں مجلسِ تعلیم نہاوند کا آغاز

کانفرنس کے آسمان پر اس وقت مولانا حالی، مولانا نذیر احمد اور مولانا شبلی، تین آفتاب و ماہتاب جمع تھے، تینوں کا تذکرہ اس شان سے اس ترکیب بند کے دوسرے بند میں آیا ہے اور اپنا ذکر کس خاکساری لیکن کس خوب صورتی سے کیا ہے:

نگہ از مہر سوئے حالیِ آزادہ فگن واں نذیر احمد طوطیِ شکرخا بنگر
آں یکے رابلب، آں نغمۂ جاں سوز بہ بیں واں دگر را بکف آں دفتر انشا بنگر
پس ازاں پا بہ فرود آئی و بہ پائین بسیاط شبلی دل زدہ را زمزمہ پیرا بنگر

پانچواں اجلاس ۱۸۹۱ء میں الہ آباد میں ہوا، اس کانفرنس کے متعلق اپنے ایک عزیز کو لکھا، ''اب کی کانفرنس میں مجمع میں تو بہت نہ ہوگا، لیکن بڑے بڑے لائق آدمی جمع ہوں گے[1] اور اپنا جوہر کمال دکھائیں گے'' (سبح-۲۸) اس کانفرنس میں مولانا شریک ہوئے اور یہ تجویز پیش کی ''اس جلسہ کی یہ رائے ہے کہ اس مضمون پر ایک رسالہ لکھوایا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں جو علم یونان و مصر و ہندوستان و فارس سے حاصل کیے تھے، اُن پر کون سے مسائل اور علوم اضافہ کیے، اس رسالہ میں ہر ایک امر اور مسائل ومباحث کو بالتفصیل بہ حوالۂ اسناد ثابت کیا جائے۔''

اس تجویز کو پیش کرتے وقت انہوں نے اس پر ایک مختصر سی عالمانہ تقریر کی، جو کانفرنس کی اس سال کی روداد میں ہے، سرسید نے اس تحریک کی تائید کی اور کہا ''یہ ایسے عمدہ امر کی تحریک ہے جس کی بہت

[1] نواب محسن الملک حیدرآباد سے آکر اس میں شریک ہوئے تھے۔ ''شروانی''۔

بڑی ضرورت ہے تمام علمی مجلسیں اس امر کے دریافت کرنے کی محتاج ہیں، مگر بحث اس میں ہے کہ اس کے لکھے گا کون؟ ہمارے ہاں ایک مثل ہے ''جو بولے وہی گھی کو جاوے'' پس مولوی شبلی ہی اُس کو لکھیں گے، شبلی ہی لکھیں گے، تمام مجمع سے بالاتفاق یہی آواز آئی کہ مولوی شبلی ہی لکھیں گے، مولوی شبلی ہی لکھیں گے۔[1]''

اس تجویز کا خاکہ مولانا کے ذہن میں ۱۸۸۷ء ہی میں آچکا تھا، چنانچہ گزشتہ تعلیم کے ایک حاشیہ پر انہوں نے لکھا تھا ''اگر زمانہ نے مساعدت کی تو ان تمام باتوں کی تفصیل اور اس طرح پر جس سے صاف ظاہر ہو جائے کہ مسلمان کو جب یہ علوم ملے تو کیا تھے، اور ان کی کوششوں نے ہر ایک علم کو کس قدر آگے بڑھا دیا، ایک مستقل رسالہ میں لکھوں گا اور شاید اسی انجمن (کانفرنس) کے کسی دوسرے جلسہ میں پیش کرنے کا اتفاق ہو۔'' (صفحہ ۱۷) مگر مولانا کو اس کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ اس تجویز کی تعمیل میں کوئی مستقل کتاب لکھی، البتہ بعد کو الندوہ میں یونانی منطق اور یونانی فلسفہ کے مختلف مسئلوں پر متعدد مضامین لکھے۔

۱۸۹۲ء میں کانفرنس پہلی دفعہ دہلی میں ہو رہی تھی، مولانا نے ۲۴/ اکتوبر ۱۸۹۲ء کو اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ وہ اس میں شرکت نہیں کریں گے، فرماتے ہیں: ''دسمبر میں شاید آنے کا قصد اس لیے ہے کہ کانفرنس دہلی میں شریک ہو سکوں، لیکن میرا قصد خود شرکت کا نہیں ہے، کانفرنس غالباً اب کی پھیکی ہو گی، مولوی حشمت اللہ و میرزا حیرت کی بڑ بہت سن چکے، مولوی حالی صاحب کا کوئی پارٹ نہیں ہے، مولوی نذیر احمد صاحب بھی غالباً چپ رہیں، اور بولیں بھی تو ان کا طرز اجیرن ہو چکا۔'' (اسحاق-۴)

۱۸۹۳ء کی کانفرنس میں مولانا نے ایک اردو ترکیب بند لکھ کر پڑھا جس کے شروع کے شعر یہ ہیں:

بجا ہے آج اگر اس بزم میں یہ زیب وساماں ہیں — یہ ان کی بزم ہے جو یادگارِ نسل عدناں ہیں
خلیل اللہ سے مہماں نوازی جن کو پہنچی ہے — ہزاروں کوس سے آ کے وہ اس گھر میں مہماں ہیں

مولانا نے خلافِ معمول یہ قصیدہ اردو میں لکھا اور ترنم کے بغیر سادہ رنگ میں پڑھا، میں نے سنا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مولانا شبلی چوں کہ فارسی میں کہتے ہیں، جس میں ایک خاص قسم کی شان ہے اور پڑھتے بھی ترنم سے ہیں، جس سے سننے والوں پر خاص اثر پڑتا ہے، ورنہ فی نفسہ ان کی شاعری میں کوئی کمال نہیں، مولانا نے یہ سن کر اس دفعہ اپنا قصیدہ بھی اردو میں لکھا اور سنایا بھی سادہ طریقہ سے، مگر محفل پر رنگ وہی چھایا رہا، اس نظم کا مضمون بھی مولانا حالی کی نظموں سے ملتا جلتا ہے۔

---

[1] اردو کانفرنس، الہ آباد، ص ۱۹۱۔

سرسید کی وفات کے بعد بھی مولانا کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے، ۱۹۰۰ء میں نواب محسن الملک نے اصرار کیا کہ امسال رام پور کی کانفرنس میں وہ شریک ہوں (اسحاق-۱۷)۱۹۰۱ء میں خیال تھا کہ کلکتہ یونیورسٹی فارسی کو اپنے نصاب سے خارج کردینا چاہتی ہے، اس لیے اس سال کی کلکتہ کانفرنس میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ "بی اے کی ڈگری کے لیے فارسی بہ طور اختیاری مضمون کے قائم رہنا پسندیدہ امر ہے، اور یہ کہ نصابِ تعلیم جو ہندوستان کی یونی ورسٹیوں میں مروج ہے، اس میں اصلاح وترقی کی گنجایش ہے" مولانا نے اس تجویز کی تائید میں ایک نہایت پرزور اور مدلل تقریر کی جس میں انہوں نے مخالفین کے اس اعتراض کا کہ فارسی کلاسیکل زبان نہیں اور دوسری زبانوں کی طرح اس میں قوت متخیلہ کو ترتیب دینے کی قابلیت نہیں، اور نہ اس کے لٹریچر میں علوم وفنون اور حقیقی شاعری ہے، ایسی خوبی سے جواب دیا کہ لوگ حیران وششدر رہ گئے، انہوں نے بتایا کہ علوم وفنون کی وہ تمام شاخیں جو عربی میں ہیں، وہ فارسی میں بھی موجود ہیں، فلسفہ، منطق اور علم وادب کی مکمل تصانیف اس میں ہیں، اور مسلمانوں کے پچھلے عہد زریں کی تاریخ کی وہی تنہا سرمایہ دار رہی، پھر انہوں نے مسلمان بادشاہوں کی فارسی میں خودنوشت سوانح عمریوں کا تذکرہ کیا جس کا جواب کسی زبان میں موجود نہیں، اس کے بعد انہوں نے فارسی کی فلسفیانہ شاعری کو بڑی خوبی سے بیان کیا، ساتھ ہی ساتھ مثال کے طور پر فارسی کے بیسیوں اشعار پڑھ کر سنائے، سامعین کا یہ حال تھا کہ ہر طرف سناٹا چھایا تھا، اسی سلسلہ میں مولانا نے "ہفت بند کاشی" کے اشعار جب اپنے خاص انداز میں پڑھے ہیں تو کانفرنس مجلس ماتم بن گئی، اس وقت بنگال کے لفٹنٹ گورنر سراوڈبرن بھی اجلاس میں موجود تھے، انہوں نے اپنی انگریزی تقریر میں مولانا کی اس تقریر کا حوالہ دے کر کہا کہ "مجھ میں اتنی قابلیت نہیں کہ میں مولانا شبلی کی طرح پُرتاثیر تقریر کرسکوں[1]"۔

۱۹۰۲ء کی کانفرنس میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی اور مولانا اس کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے، ۱۹۰۴ء میں دہلی میں تاج پوشی کے موقع پر جو کانفرنس ہوئی اور جس کے صدر ہز ہائینس آغا خاں تھے، "اسلام کی بے تعصبی" پر ایک عالمانہ لکچر دیا، اس لکچر کو مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر البشیر نے جلسہ

---

[1] میں نے یہ واقعہ اس کانفرنس کے ایک شریک منشی محمد صدیق صاحب مختار دسنوی بہاری سے سنا جو میرے ہم وطن مخدوم تھے، اور سرسید کے معتقدوں اور ان کی تحریک کے پرانے حامیوں میں تھے، مولانا شروانی فرماتے ہیں، "میں بھی اس اجلاس میں شریک تھا، لفٹنٹ گورنر نے خاص طور پر مولانا شبلی سے درخواست کی تھی کہ وہ کلکتہ آئیں، اور مدرسہ عالیہ کو مفید بنانے کی کوشش کریں، مولانا نے وعدہ کیا مگر اسی زمانہ میں کلکتہ میں طاعون پھیلا، اس لیے نہ جا سکے۔

میں کسی نہ کسی طرح اپنے ہاتھ سے قلم بند کرلیا تھا اور بعد کو چھاپ کر شایع کیا، لیکن چوں کہ تقریر، ادھوری تھی اور مطالب بھی ناقص تھے، اس لیے مولانا نے اخباروں میں لکھا کہ یہ ان کی بعینہ تقریر نہیں۔

۱۹۰۶ء میں نواب سلیم اللہ خاں نواب ڈھاکہ اور محسن الملک کے اصرار سے ڈھاکہ کی کانفرنس میں شریک ہوئے اور میرزا شجاعت علی خاں کونسل ایران کی صدارت میں ۲۲؍دسمبر کو تاریخِ اسلام پر لکچر دیا۔ (ریاض حسن-۱۰)

اس کے علاوہ بھی کانفرنس کے مختلف جلسوں میں شریک ہوتے رہے اور اس کی دل چسپی کو بڑھاتے رہے، غالباً صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کے عہدِ نظامت میں کانفرنس سے ان کی دل چسپی بہت کم ہوگئی اور اُس کی جگہ ندوہ کے اجلاس نے لے لی۔

نینی تال کا سفر مئی ۱۸۸۷ء | مئی ۱۸۸۷ء کی گرمیوں میں سرسید نینی تال گئے تھے، یہ رمضان کا مہینہ تھا، مولانا بھی ان کے ساتھ نینی تال گئے اور سید صاحب کے ساتھ ایک کوٹھی میں ٹھہرے، چوں کہ کسی پہاڑی مقام کا یہ پہلا سفر تھا، اس لیے ایک خط میں پہاڑی منظر کی دل چسپ کیفیتیں لکھ کر بھیجیں، موقع کے لحاظ سے مولانا کا یہ خط اردو انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے، تمام راستہ قدرتِ الٰہی کی نیرنگی وعظمت کا مرقع ہے، عرض میں پانچ ہاتھ زمین چھوٹی ہوئی ہے، جس پر رستہ چلتا ہے، باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہے جس کی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے، دوسری جانب نہایت عمیق، ہول ناک غاروں کا سلسلہ ہے، اگر اس پہاڑ میں سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دارالسلطنت ہوتے۔''

ان قدرتی مناظر کی دل چسپیاں ایک طرف مگر ایک غیر معمولی ذہانت کے مالک کی نظر ان ظاہر داریوں سے ہٹ کر ان کی معنویت کی طرف منتقل ہونے سے باز نہیں رہ سکتی، ان پہاڑوں کا کاٹنا ان میں راستے بنانا، کج و پیچ بلکہ پُر پیچ راستوں سے اوپر چڑھنا اوران پر بڑے بڑے مکانات بنانا، پانی اور روشنی کا انتظام کرنا، ان باتوں کا ذہن انگریزوں کی بے روک ہمت اور پر جوش محنت کا نتیجہ پیدا کرتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ایک ترقی یافتہ قوم کا اصلی جوہر ہے، اس کے علاوہ انہوں نے دوسرا نتیجہ جو نکالا وہ ان ہی کے لفظوں میں یہ ہے ''یہاں جو کچھ آرام ہے وہ یہ ہے کہ کسی وقت یہاں آفتاب کی عمل داری نہیں ہونے پاتی، یہی بات ہے جس کے لیے انگریزوں نے لاکھوں کروروں روپے صرف کردیے ہیں، درحقیقت ہم کو

انگریزوں سے سبق سیکھنا چاہیے، کہ صحت سب چیزوں پر مقدم ہے، اور کوئی کام دنیا میں ناممکن نہیں، رمضان تو خوب گزرے گا، مجھ کو اگر دلچسپی ہے تو اسی سے" ایک دوسرے عزیز کو لکھتے ہیں" مجھ کو نینی تال میں کچھ دل چسپی نہیں، بس اتنا ہے کہ روزے یہاں گرمی نہیں دکھاتے۔" (سمیع-۲۲)

ان پہاڑوں پر جو لوگ گئے ہیں ان کو تجربہ ہے کہ یہ پہاڑی مقامات درحقیقت انگریزوں نے اپنی بے تکلف زندگی کے لیے بنائے تھے کہ وہ کھلے بندوہاں عیش ولطف اٹھا سکیں، اس لیے ہر چیز وہاں انہوں نے اپنے مذاق کی بنائی ہے، انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہندوستانیوں نے بھی وہاں جانا شروع کیا اور وہ انگریزوں کے لیے وہاں یارِ شاطر نہیں، بارِ خاطر بن گئے ہیں، اور جو ہندوستانی ان کے یارِ شاطر بنے وہ اپنے سے کھو گئے، اس حیثیت سے اس مقام کا جو اثر مولانا کی طبیعت پر پڑا وہ یہ تھا" مجھ ایسے ایشیائی خیال کے آدمی سے یہ امید رکھنا عبث ہے کہ میں اس کو فرحت زا بھی مان لوں گا، ہاں جو لوگ انگریزوں کی ہر ادا پر جان دیتے ہیں، اُن کا مذہب کیا پوچھنا ع ہر چہ پیدا در دلم غیر نیست (مکاتیب بنام شیخ حبیب اللہ)

اس سفر کا ایک تاریخی پہلو یہ ہے کہ مولانا کی سب سے پہلی تصنیف "مسلمان کی گزشتہ تعلیم" کا پہلا خاکہ مولانا کے ذہن میں یہیں آیا، یہ مئی کا مہینہ تھا اور دسمبر میں اجلاس لکھنؤ میں ہونے والا تھا، یہیں سے ۸/ مئی ۱۸۸۷ء کو مولانا نے اپنے ایک عزیز کو اس مضمون کی اطلاع دی۔ (سمیع-۲۲)

قصیدۂ بہاریہ جو ۱۸۸۸ء میں مکمل ہوا، بلکہ ناتمام ہی رہا، اس کا خیال بھی پہلے اسی بہارستان میں آیا تھا، اور اسی کے لیے کلیاتِ غالب کا نسخہ یہاں منگوایا تھا، تاکہ توارد نہ ہو۔

تصنیف کا آغاز

۱۸۸۳ء میں مولانا نے علی گڑھ میں قدم رکھا تھا، اس وقت سے لے کر اب تک وہاں ان کے جو کمالات ظاہر ہوئے تھے، وہ شاعری تک محدود تھے، مگر وہ اندر ہی اندر اسلام کی خدمت کا صحیح راستہ جو اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے موزوں ہو تلاش کر رہے تھے، بالآخر ان کو نظر آیا کہ یورپ کی چیرہ دستی کا جو رعب مسلمانوں پر چھا گیا ہے اور جس کے مقابلہ میں ان کو نہ صرف اپنا حال بلکہ ماضی تک تاریک نظر آتا ہے، اُس کو دور کیا جائے، اس وقت یورپ کے اہل قلم اور مصنفین کا یہ کارنامہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی تاریخ پر جو ناز تھا، اس کو مٹانے کے لیے اسلام سلاطینِ اسلام اور علومِ اسلامیہ کی طرح طرح کی برائیاں لکھ لکھ کر لوگوں میں پھیلا رہے تھے، تاکہ مسلمانوں کی نئی پودھ کو خود اپنی قوم سے نفرت ہونے لگے اور ان کے قومی غرور کو ایسا صدمہ پہنچے کہ ان کے دماغی قومی ہمیشہ کے لیے مضمحل ہو جائیں، چناں چہ ان کی تدبیر کارگر ہو چلی تھی اور مسلمانوں کو خود اپنی تاریخ سے گھن آنے لگی تھی اور یورپ کی ترقیوں کو دیکھ کر ان کو چکا چوندھ لگ رہی تھی، مولانا نے ان کی اس تدبیر کو سمجھا اور اسی کے مقابلہ کے لیے اپنے قلم کو جنبش دی۔

اِس سلسلہ میں مولانا نے اپنی پہلی تصنیف جس کا نام ''مسلمان کی گزشتہ تعلیم'' ہے، ۱۸۸۷ء میں لکھی، اس کی تقریب یوں پیدا ہوئی کہ اس سال لکھنؤ کے ممتاز وکیل منشی امتیاز علی صاحب (والد منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری) کی دعوت پر ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بڑے زور شور سے لکھنؤ میں ہونے والا تھا، اس لیے سرسید نے اپنے دائرہ کے مختلف اہل علم کو اسلامی تعلیم کے کسی نہ کسی پہلو پر لکھنے کی فرمائش کی (سرسید بہ نام عماد الملک ص ۱۳۶) مولانا نے ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' کا عنوان اپنے لیے پسند کیا، سرسید نے اس عنوان کا عام اعلان کیا، ۸ر مئی ۱۸۸۷ء کے ایک خط میں مولانا نینی تال سے لکھتے ہیں ''محمڈن تعلیمی مجلس اس سال لکھنؤ میں ہوگی، اشتہار میں شایع کیا گیا ہے کہ شبلی مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر ایک وسیع مضمون پڑھے گا، شاید یہ مضمون جی لگا کر لکھوں اور گراں مایہ لکھوں'' (سیح-۲۲) یہ گراں مایہ مضمون لکھا گیا اور ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۷ء کو قیصر باغ کی شاہی بارہ دری میں جو مقامِ اجلاس تھا، پڑھ کر سنایا گیا، مسلمانوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے کارناموں کی یہ پہلی آواز آئی، سارے ملک میں اس خطبہ کی دھوم مچ گئی، یہی وہ مطلع ہے جس سے علامہ شبلی کی شہرت کا آفتاب سب سے پہلی دفعہ طلوع ہوا، اس خطبہ میں مولانا نے تفصیل سے مسلمانوں کے طریقۂ

تعلیم اور اسلامی مدرسوں کے نام اور خصوصیات و حالات بیان کیے تھے، یہ ملک میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز تھی، اس لیے خطبہ ہی خطبہ نہ رہا، بلکہ الگ رسالہ کی صورت میں چھپا، اسی لیے مولانا نے اس کو اپنی سب سے پہلی تالیف قرار دیا ہے، مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھتے ہیں "اب سید صاحب کی توجہ دلانے سے وہ (یعنی مولانا) تاریخی تحقیق و تنقید میں مصروف تھے، جس کا سب سے پہلا نمونہ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر ان کا لکچر تھا، جسے انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے یا تیسرے اجلاس میں پیش کیا تھا، لکچر مسلمانوں کی نظر میں بالکل نئی اور دلچسپ چیز تھا، چنانچہ جب اس پر دلگداز میں ریویو ہوا ہے، تو کوئی نہ تھا کہ اس کے دیکھنے کا مشتاق نہ ہوگیا ہو، ۱۸۸۶ء میں نئی طرز کی پہلی سوانح عمری حیات سعدی مولانا حالی نے لکھی اور مولانا شبلی نے پسند کی، ایک خط میں ۱۰/ مارچ ۱۸۸۶ء کو لکھتے ہیں "ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفتہً بھیجی ہے، یہ شیخ سعدی کی نہایت دل چسپ محققانہ سوانح عمری ہے"۔ (سمیع-۱۵)

دوسری تصنیف المامون اس کے بعد اردو کی دوسری نئی طرز کی سوانح عمری المامون ہے، جو ۱۸۸۷ء میں نکلی، یہ مولانا کی پہلی مستقل تصنیف ہے جو ان کے نام ور فرماں روایانِ اسلام کی پہلی کڑی ہے، اس کو تاریخ بنی العباس کا نچوڑ کہنا چاہیے، یہ تصنیف ایسی مقبول ہوئی کہ مولانا فرماتے تھے کہ تین مہینے میں اس کا پہلا اڈیشن ختم ہوگیا اور دوبارہ چھپا۔

مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں: (گزشتہ تعلیم کے بعد) اسی نوعیت کی ان کی دوسری کتاب المامون تھی جو علی العموم پسند کی گئی اور اس کتاب نے پہلے پہل پبلک کو بتایا کہ مولانا شبلی کس قسم کے مصنف ہیں اور یہ کہ وہ آیندہ کیسے ثابت ہونے والے ہیں" المامون کی تصنیف کی تحریک میں مسٹر پامر کی کتاب ہارون الرشید کو بھی دخل ہے، جس کو پڑھ کر مولانا کے دل میں المامون لکھ کر مسٹر پامر کے زہر کے لیے تریاق کا خیال آیا۔

مولانا شروانی سے تعلقات المامون اہل علم کی نگاہوں میں اعتبار کے قابل ٹھہری، اس پر اخباروں میں بہت سے ریویو نکلے، ان میں سے قابل ذکر ریویو' اس زمانہ کے ایک خوش مذاق نوجوان رئیس عالم کے قلم سے نکلا تھا، جس کو ملک اب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام سے جانتا ہے، مولانا نے صرف اسی ریویو کا جواب ۲۱/ فروری ۱۸۸۹ء کے آزاد لکھنؤ میں اس کے اڈیٹر کے پے در پے اصرار پر دیا تھا، مگر کیا عجب یہ اختلاف تھا جس نے دونوں کو اتفاق کے ایسے مضبوط رشتہ میں جکڑ دیا جو ایک کے مرنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹا، مولانا شروانی لکھتے ہیں "علامہ مرحوم سے میری سب سے اول ملاقات اندازاً ۱۸۸۷ء میں

ہوئی، آغازِ تعارف اختلاف سے ہوا، کتاب المامون جب شایع ہوئی تو میں نے ریویو لکھا، بعض اہم مسائل پر اعتراض تھا، غالباً یہی ایک ریویو تھا، جس کا علامہ شبلی نے جواب لکھا، یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں مذکور تھا:

رسی آنکہ بدردِ من چو من خامہ گیری و حرف بنگاری

رام پور کے سرکاری کتب خانہ مدرسہ عالیہ میں ۱۸۸۸ء | رام پور سے مولانا کو پرانا تعلق تھا، ان کی طالب علمی کا زمانہ یہاں بھی گزرا تھا، ان کے استاد مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی اب تک زندہ تھے، اور ان سے نیازمندی کی وابستگی بھی تھی، اب اُن کے تعلق کو سرکاری حیثیت بھی حاصل ہوئی، اس زمانہ میں نواب کلب علی خاں والی رام پور کا انتقال ہو چکا تھا، ان کی جگہ نواب مشتاق علی خاں مسند نشیں تھے اور ریاست کا سارا نظم ونسق جنرل عظیم الدین خاں مرحوم مدارالمہام کے ہاتھ میں تھا، یہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اس زمانہ میں سرسید کی طرح جدید انگریزی طور طریق وتمدن کو اختیار کیا تھا، بڑی شان وشوکت اور دبدبہ وعظمت کے آدمی تھے، نجیب آباد کے خاندان کے تھے، سیر وشکار اور فنون جنگ میں بڑا نام پیدا کیا تھا، سرکار انگریزی میں ان کو بڑا اقتدار حاصل تھا، اور جنرل کے عہدہ سے ممتاز تھے، ساری ریاست میں ان کے قومی پنجہ اور مضبوط دست وبازو کی دھوم تھی، اور لوگ ان کے نام سے کانپتے تھے، موصوف نے اپنے زمانہ میں جو بڑے بڑے کام کیے، ان میں سے ایک مدرسۂ عالیہ رام پور کی تنظیم ہے، ہمارے استاد مولانا حفیظ اللہ صاحب[1] جو مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی کے ممتاز شاگردوں میں تھے، اس کے مدرس اول مقرر ہوئے۔

مولانا شبلی کے رسالہ "گزشتہ تعلیم" نے عربی مدرسوں میں اصلاح کا خیال پیدا کر دیا تھا اور اس بنا پر کہ تصنیف را مصنف نیکوکند بیاں خود مولانا سے اصلاح پسند حکام نے مشورہ چاہا، چنانچہ جنرل ممدوح نے اس مدرسہ میں سالانہ امتحان لینے اور مدرسہ کے متعلق رائے دینے کے لیے جن علما کو تکلیف دی تھی،

---

[1] مولانا حفیظ اللہ صاحب ۱۸۵۶ء کے آخر میں پیدا ہوئے، غدر ۱۸۵۷ء میں چھ ماہ کے تھے، اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندی قریب محمد آباد جائے سکونت ہے، فارسی تعلیم گھر پر حاصل کی تھی، اور اس کی تکمیل چشمہ رحمت غازی پور میں کی، عربی تعلیم بنارس جا کر شروع کی، جہاں مولوی سلامت اللہ صاحب جیراج پوری عربی کی اعلیٰ کتابیں اس وقت پڑھ رہے تھے، ایک سال کے بعد پھر وہاں سے غازی پور پہونچے، اور مولانا غلام جیلانی صاحب نامی ایک فاضل وقت سے جو مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلی (والد ماجد مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی) کے شاگرد تھے، متوسطات تک تعلیم پائی، اس کے بعد غالباً ۱۸۷۷ء میں وہ لکھنؤ جا کر فرنگی محل میں مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی کے حلقہ میں داخل ہوئے، اور وہیں علوم کی تکمیل کی، معقولات اور ریاضیات میں خاص طور سے کمال پیدا کیا، فراغت کے بعد استاد کے حسب الحکم کاکوری ضلع لکھنؤ کے مدرسہ میں مدرسی قبول کی، وہاں سے مولانا عبدالحیٔ صاحب کی سفارش پر وہ مدرسہ عالیہ رام پور میں صدر مدرس ہوئے۔ (بقیہ حاشیہ ص ۱۶۲ پر)

ان میں ایک مولانا شبلی مرحوم تھے، مولانا کی دلچسپی کی بڑی چیز وہاں کا کتب خانہ بھی تھا، المامون کی اشاعت نے اس راز کو بھی فاش کیا کہ مولانا کو نوادر کتب سے نہ صرف واقفیت بلکہ عشق ہے، اس لیے نوادر قلمی کتابوں کی قدر و قیمت اور ترتیب کے لیے وہی سب سے موزوں نظر آئے، چنانچہ جنرل صاحب موصوف نے ۱۸۸۸ء میں مولانا مرحوم سے اس کتب خانہ کی ترتیب و اصلاح و ترقی پر ایک مفصل رپورٹ لکھنے کی خواہش کی، چنانچہ مولانا نے تین روز رہ کر اور کتب خانہ کو ہر طرح دیکھ کر ایک رپورٹ ۱۴؍اکتوبر ۱۸۸۸ء کو لکھ کر پیش کی، اس میں المامون کی ترتیب، فہرست لکھنے کا طریقہ، کتابوں پر نمبر ڈالنے کی کیفیت، نوادر کے انتخاب اور حفاظت کے طریق اور دوسری ضروری ہدایتیں درج فرمائیں اور منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی مرحوم نے فہرست کا جو نمونہ بنایا تھا، اس کو کسی قدر اصلاح کے بعد پسند فرمایا اور اُسی طریق پر پورے کتب خانہ کی کتابوں کی از سرِ نو ترتیب کا مشورہ دیا، کتاب خانہ کی ترتیب میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ کتابیں حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی گئی تھیں، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کلیاتِ رند اور کتاب الخراج قاضی ابو یوسف دونوں ایک صف میں تھیں مختلف علمی رسائل کے مجموعے بے جوڑ رسالوں کے ساتھ مجلد تھے، نوادر کا انتخاب صرف خوش خطی اور حسن ظاہری کی بنا پر کیا گیا تھا اور اچھی اچھی کتابیں چھانٹ دی گئی تھیں، مولانا نے فن اور مطالب کے لحاظ اور دوسری معنوی خصوصیات کی بنا پر نوادر کے دوبارہ انتخاب کی رائے دی، کچھ دنوں بعد نواب مشتاق علی خاں کا انتقال ہوا اور کونسل قائم ہوئی اور جنرل صاحب موصوف کونسل کے صدر ہوئے، (اس وقت نواب حامد علی خان نابالغ تھے) تو مولانا شبلی مرحوم کی تجویز پر

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۱) اور مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی سے ان کے مناظرے رہے، زمانہ قیام رام پور میں منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی سے خاص تعلقات پیدا ہو گئے تھے، یہیں کے قیام کے زمانہ میں علم ہیئت کی کتاب تصریح پر نواب حامد علی خاں کے ابتدائی عہد میں حاشیہ لکھا جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے، وہ دس برس کے قریب رام پور میں رہے، دار العلوم ندوۃ العلما کے قیام کے بعد وہ دار العلوم میں صدر مدرس مقرر ہوئے، اور ۱۹۰۸ء تک برابر اس عہدہ پر قائم رہے، اس کے بعد وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں مدرس عربی ہوئے، اور شمس العلما کے خطاب سے مخاطب ہوئے ۱۹۲۱ء میں وہاں سے پنشن پا کر حجاز گئے اور فریضہ حج ادا کیا، واپسی کے بعد لوگوں کے اصرار سے پھر دار العلوم ندوہ کی صدر مدرسی قبول کی، اور کئی سال تک مفوضہ خدمت انجام دے کر ۱۹۳۰ء میں وطن واپس آئے جہاں اب تک بحمد اللہ صحیح و سالم ہیں۔

مولانا عبدالحیٔ صاحب مرحوم کی شاگردی کے باوجود آخر عمر میں وہ عامل بالحدیث ہو گئے ہیں، عدم تقلید کا میلان پہلے سے تھا، جو شاید عوائل عمر میں مولوی سلامت اللہ صاحب کی صحبت کا اثر ہو، غرض دس بارہ برس سے اب وہ عامل بالحدیث ہیں۔

مولانا کی توانائی قابل رشک تھی، اور اب بھی ہے، سیر و شکار و نفنگ اندازی کا شوق ہے، جو عجب نہیں کہ جنرل عظیم الدین خاں کا فیض ہو۔

پوری طرح عمل ہوا، فن وار رجسٹر بنائے گئے اور ۱۸۹۱ء میں کتب خانہ کے لیے ایک نئی عمارت کی بنیاد ڈالی گئی اور ۳۱ مارچ ۱۸۹۲ء کو اس کا باقاعدہ افتتاح ہوا، (دیباچۂ اول فہرست کتب خانہ رام پور) مگر افسوس کہ جنرل صاحب موصوف اس سے ایک سال پہلے اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے[1]۔

[1] جنرل موصوف کی موت بلکہ شہادت کا واقعہ بھی عجیب ہے، ۱۸۹۱ء کی بات ہے وہ رات کو ایک تقریب سے تنہا تم تم پر واپس آرہے تھے کہ چند آدمیوں نے ان پر طمنچہ سے ایک ساتھ فائر کیا، گولی ٹھیک نشانہ پر پڑی، اور اس پر بھی ان میں اتنا دم خم تھا کہ وہ چند قدم چل کر ایک دوست کے دروازے تک پہونچے، اور وہیں گر کر ٹھنڈے ہو گئے، اس واقعہ کا اثر سارے ملک پر پڑا، ایک عالم اور شاعر کا دل ایسے علم دوست مصلح کے سانحہ سے کیسے نہ متاثر ہوتا، چنانچہ مولانا نے ان کا مرثیہ لکھا جو ۲۷ اپریل ۱۸۹۱ء کے انسٹیوٹ گزٹ میں مولانا کے اس خط کے ساتھ چھپا ہے:

''جناب اڈیٹر صاحب! اگرچہ ہم خاک نشینوں کو ملکی ارکان سے بہت کم واسطہ رہتا ہے تاہم جو واقعہ عالم آشوب اور جاں گداز ہوتا ہے وہ کسی کو بے اثر نہیں چھوڑتا، اور اس قحط الرجال میں جنرل عظیم الدین خاں سے جو بہادرانہ اور ملکی قابلیتیں ظہور میں آئیں، ان کے لحاظ سے ان کی عبرت انگیز موت عجیب افسوس ناک حادثہ ہے، مجھ کو اس مرحوم سے کسی قسم کا واسطہ نہ تھا، لیکن ان کے مردانہ اوصاف اکثر سنے اور دیکھے تھے، اس خبر کے سننے سے نہایت قلق ہوا اور یقین ہو گیا کہ خدا ہی کو منظور ہے کہ ہماری قوم میں لائق لوگ نہ رہنے پائیں، اس رنج و قلق میں کچھ اشعار مرثیہ کے موزوں ہوئے ہیں، وہ آپ کی خدمت میں مرسل ہیں، امید ہے کہ اخبار کے کسی گوشہ میں جگہ دی جائے'':

مرثیہ کلیات میں شامل ہے، موقع کے لحاظ سے چند شعر یہ ہیں:

تا کے ز غم نہاں نہ گویم — گویند مگو چساں نہ گویم
در ماتم خاں اعظم الدین — جز قصہ خوں چکاں نہ گویم
در خاک شد آں امیر ذی جاہ — یا تہمتن او فتادہ در چاہ
مہماں یکے بہ شب شد وفات — تا باز رود بسوئے بنگاہ
کم حوصلگان سفلۂ چند — بودند نشستہ در کمیں گاہ
کالسکہ چو در مقابلہ آمد — آں کج روشان دوں بہ ناگاہ
یک بار برو کشاد دادند — شش تیر و یکے خطا نہ شد آہ
بر جبہۂ صبر چیں نیفگند — با آں ہمہ زخمہائے جانکاہ
بر خاک فتاد و باز برخاست — پس طے بہ نمود پارہ راہ
آسود دمے براہ وزاں پس — افسانہ عمر گشت کوتاہ
اے کشتہ ظلم ہاں خبر گیر — ایں نالۂ ما بگوش در گیر
بر خیز و بماں بہ رسم پیشیں — ہم تیغ بدست و ہم سپر گیر
ترکانہ کلہ بفرق بشکن — چار آئینہ و زرہ ببر گیر
آں رونق رام پور باز آں — آں آئینہ را دگر بہ زر گیر

کتاب خانۂ رام پور کے موجودہ ناظم مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا بیان ہے کہ مولانا کی اصلاحی تجویزوں پر عمل کیا گیا، کتابیں زبان اور فن پر منقسم ہوئیں، متعدد مجموعے بھی از سرِ نو مرتب کیے گئے۔

مولانا نے اس کے بعد بھی کئی دفعہ اس کتب خانہ کو دیکھا اور اس سے فائدہ اٹھایا، سب سے آخری بار ۶؍ اپریل ۱۹۱۴ء کو اُس کو ملاحظہ فرمایا اور اپنے ہاتھ سے اس پر چند سطریں لکھیں، جن میں اس کتب خانہ کی اہمیت کا اعتراف فرمایا[1]۔

مولانا نے کتب خانہ کی ترتیب اور فہرست کی تحریر پر جو رپورٹ لکھی ہے وہ آج معمولی بات معلوم ہوگی، مگر آج سے پچاس برس پہلے کا زمانہ سامنے لایئے، جب مشرقی کتب خانے نئی ترتیب سے آشنا نہ تھے اور علما کے سامنے اس کام کا کوئی نمونہ نہ تھا، اس کتب خانہ کی اس علمی ترتیب سے جو فیض علما اور اہل علم کو پہنچا اور پہنچ رہا ہے، وہ ان ہی جنرل مرحوم کی کوشش اور مولانا کے حسن تجویز کا فیض ہے۔

لطیفہ: آج کل مجھے (۱۹۴۰ء میں) رام پور جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کے بزرگوں کی زبان سے ایک دلچسپ حکایت سننے میں آئی، جس سے اُس زمانہ کا ماحول اور علما کے حسن اخلاق اور سادگی مزاج کی کیفیت معلوم ہوتی ہے، مولانا کسی تقریب سے رام پور میں وارد تھے، جنرل صاحب مرحوم نے اس حسن اتفاق سے فائدہ اٹھانا چاہا، چنانچہ ایک عام جلسہ کیا اور لوگوں کو شرکت کی دعوت دی، جس میں بعض علما بھی تشریف لائے، جلسہ میں جب مولانا تشریف لائے تو جنرل صاحب نے ان کی آمد پر چیرز دیے، اور ساتھ ہی سب نے تالیاں بجائیں، علمائے حاضرین میں سے ایک بزرگ نے اپنی پرانی تہذیب کے مطابق یہ سمجھا کہ لوگ اس طرح تالی پیٹ کر مولوی شبلی کی توہین کر رہے ہیں، انہوں نے چپکے سے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ”مولوی شبلی کیسے ہی بد دین سہی، مگر وہ ہمارے مہمان تھے، جنرل صاحب کو ان کی یہ توہین کرنی نہیں چاہیے تھی“ اب جب جنرل صاحب مقرر کے تعارف کو کھڑے ہوئے تو خود ان بزرگ نے تالیاں بجائیں اور اپنے ساتھ والوں سے بھی کہا کہ خوب تالیاں پیٹو، انہوں نے مہمان کی توہین کی ہے، ان کی بھی توہین کرو اور اس طرح مہمان کی توہین کا انتقام لے کر وہ ناراض ہو کر جلسہ سے اٹھے، اور اپنی پالکی پر بیٹھ کر واپس جانے لگے، جنرل صاحب کو ان کی ناراضی کا علم ہوا تو جا کر معذرت کی اور بتایا کہ ”یہ مہمان کی توہین نہیں، بلکہ اس کو شاباشی دی گئی ہے، قاعدہ ہے کہ جب کسی سے تعریف کے قابل کوئی بات ہوتی ہے، تو اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں،

[1] مولوی امتیاز علی صاحب عرشی نے مولانا کی روداد اور معائنہ کی دونوں تحریریں معارف اکتوبر ۱۹۳۴ء میں چھپوا دی ہیں۔

اب اگر ہر شخص اس کی پیٹھ ٹھونکے تو اس کی پیٹھ ہی زخمی ہو جائے، اس لیے اب یہ کرتے ہیں کہ اپنے ایک ہاتھ کو اُس کی پیٹھ فرض کرتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے اس کو ٹھونکتے ہیں، یہ تالی نہیں ہے'' اس تاویل سے ان نیک نہاد بزرگ کی تسکین ہوگئی اور جلسہ میں واپس تشریف لے آئے۔

تیسری تصنیف سیرۃ النعمان مولانا نے اس کے بعد جیسا کہ انہوں نے سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں لکھا ہے، ''الفاروق'' کی طرح ڈالی، مگر بعض وجوہ کی بنا پر اس کا کام تھوڑے دنوں کے لیے روک دیا اور سیرۃ النعمان کی طرف توجہ کی، ۱۸۸۹ء میں اس کی بنیاد پڑی اور اخیر سال یعنی دسمبر ۱۸۸۹ء میں اس کا پہلا حصہ ختم کر دیا[1] اور دوسرا حصہ جو بہت محنت سے لکھا گیا تھا، اس کا کام ۱۸۹۰ء میں شروع ہوا[2] اور اسی سال کے اخیر یعنی دسمبر ۱۸۹۰ء میں وہ بھی ختم ہوا[3]، ۱۸۹۱ء کے اخیر میں کتاب پہلی بار چھپی اور ۱۳ر جنوری ۱۸۹۲ء کو اس کے نسخے اعظم گڑھ بھیجے گئے[4]۔

---

[1] (سمیع-۲۵) [2] (محمد عمر-۲) [3] (سمیع-۲۸) [4] (سمیع-۲۹) مصنف نے یہ کتاب جس محنت سے لکھی ہے اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اثنائے مطالعہ میں جو بات سمجھ میں نہیں آئی، اس کے بارے میں اساتذۂ وقت سے انہوں نے استفسارات کیے، چنانچہ انہوں نے اپنے استاذ مولانا ارشاد حسین صاحب سے جو استفسار کیا تھا، اس کی نقل مع جواب مولانا ارشاد حسین صاحب کے مجموعہ فتاویٰ ارشادیہ میں نظر سے گزری، استاد شاگرد دونوں کے خطوں کو تبرکاً یہاں نقل کر دیتا ہوں۔

مولانا شبلی مرحوم کا خط اپنے استاد مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی کے نام اور ان کا جواب

مخدوم و مطاع ما دامت افضالہم۔ پس از ادائے مراسم تحیت و تسلیم آنکہ ملازمان عالی کو معلوم ہوگا کہ بہت جدوجہد سے امام ابوحنیفہؒ کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں جس کے لیے میں نے بہت سے مواد تاریخی فراہم کیے، اس وقت جو جزو زیر تحریر ہے، وہ ان کے فتاوے ہیں، عقود الجمان میں ان کے چند فتاوے مذکور ہیں، لیکن دو جگہ مجھ کو شک پیدا ہوا، اس لیے ان کو عرض کرتا ہوں کہ تشفی فرمائی جاوے، اصل عبارت لکھ کر شبہ لکھتا ہوں'' قال یا ابا حنیفۃ یا ابا الخطاب ما تقول فی رجل غاب عن اھلہ عواماً ونعی الیھا فظنت امراتہ انہ میت فتزوجت ثم قدم زوجھا الاول و قد ولدت ولدا فنفاالاول و ادعاہ الثانی، اکل واحد منھما قذ فھما ام الذی انکرالولد''

مجھے اس میں شبہ یہ ہے کہ دونوں زوجوں میں سے کسی نے اس کو زانیہ نہیں کہا، پھر قذف کے کیا معنی، باقی یہ امر کہ ولدیت کے ادعا اور انکار سے ضمناً قذف لازم آتا ہے، اس پر دو سوال ہیں، ۱-کیا ایسی دلالت التزامی سے قذف کا جرم قائم ہو سکتا ہے؟ ۲-وہ عورت درحقیقت زانیہ ہوئی یا نہیں، اگر ہوئی تو کیا واقعیت کا اظہار قذف میں داخل ہے؟ ایسا تفصیلی جواب عنایت ہو جو اصل مسئلہ کو حل کر دے اور امام صاحب کے اس سوال کی حقیقت کھول دے۔

دوسرا فتویٰ یہ لکھا کہ چند آدمی ایک جگہ بیٹھے تھے، ایک شخص پر سانپ آکر گرا، اس نے دوسرے پر پھینک دیا، اسی طرح تین چار آدمی تک نوبت پہنچی، آخر میں اس نے ایک شخص کو کاٹ لیا اور وہ مر گیا، امام صاحب نے فتویٰ دیا کہ اگر گرنے کے ساتھ سانپ نے کاٹا تو اخیر پھینکنے والے پر دیت لازم آئے گی، اور اگر وقفہ ہوا تو کسی پر نہیں، (بقیہ حاشیہ ص ۱۶۶ پر)

یہ کتاب درحقیقت مولانا کے اُسی ذوق وشوق کی دوسری شکل ہے، جو ان کو حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور فقہ حنفی سے ہمیشہ سے تھا، بہ قول مولانا کے ع شمع ہماں است لگن دیگر است، مولانا ایک خط میں لکھتے ہیں، اعظم گڑھ اور دیہات واطراف میں اس کتاب کے بہت سے نسخے شایع ہونے چاہئیں، حنفیوں کی مزید اطلاع کا باعث ہوگا، چند اشتہارات بھی بھیج دیے ہیں، کچہری کے عمال اور سوداگروں کو اس سے واقف ہونا چاہیے، (سمیع -۲۹) یہ کتاب بھی کالج کی طرف سے چھپی اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئی، یکم اپریل ۱۸۹۲ء کو لکھتے ہیں "سیرۃ النعمان کب کی ہو چکی، دوسری بار چھپ رہی ہے" (سمیع -۳۱)۔

گزشتہ تعلیم، المامون اور سیرۃ النعمان نے ملک میں مولانا کو کافی حد تک روشناس کر دیا تھا اور لوگ اس نادر روزگار کو جو اپنی قومی تاریخ کے ان قابل فخر کارناموں کو منظر عام پر لا رہا تھا، ایک نظر دیکھنے کے مشتاق ہو گئے تھے۔

حیدرآباد کا سفر ۱۸۹۱ء سرسید نے کالج کے چندہ کے لیے حیدرآباد کا پہلا سفر ۱۸۸۲ء میں کیا تھا، جب حیدرآباد میں سرسید کے دست وبازو نواب وقار الملک انتصار جنگ، نواب محسن الملک، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی معزز عہدوں پر مامور تھے، دوسرا سفر ۱۸۹۱ء میں اُس وقت کیا جب یہ اکابر سرکار نظام کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، اس سفر میں سرسید تنہا نہ تھے، بلکہ انہوں نے ایک وفد ترتیب دیا، جس میں ان کی تحریک کے بہت سے عمائد اور ارکان شریک تھے ان میں سے ایک مولانا شبلی بھی تھے۔

اس سفر میں مولانا شبلی کی ہمرہی اس حیثیت سے تعجب انگیز ہے کہ وہ کوئی ایسا سرکاری امتیاز یا شانِ ریاست نہیں رکھتے تھے جس کی بنا پر وہ اس وفد کے رشتہ میں منسلک ہو سکتے، مگر واقعہ یہ ہے کہ حیدرآباد میں اس وقت دو بلگرامی بھائی ایسے تھے جو علم کے حقیقی قدرداں اور شیدا تھے، یعنی مولوی سید علی بلگرامی اور نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، سرسید نے نومبر ۱۸۸۹ء میں نواب عماد الملک کو اپنی تعلیمی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۵) اس پر یہ شبہہ پیدا ہوا کہ جس شخص نے پھینکا، یہ اس کا اضطراری فعل تھا، اس اضطراری فعل پر وہ کیوں ماخوذ ہوا، فقہ میں اس کے متعلق کیا امر قرار دیا ہے، جواب جلد تر مرحمت ہو ورنہ میرا حرج ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفے از محمد ارشاد حسین عفی عنہ، مولوی صاحب محبی ومخلصی مولوی محمد شبلی صاحب وفقہم اللہ سبحانہ الرضاتہ، پس از سلام مسنون مطالعہ نمایند، رقیمہ کریمہ بورود مسعود باعث مسرت وکاشف مندرجہ شد، حال کم فرصتیہاے فقیران مخلص رامعلوم است، پس بقدر ضرورت جواب در رفع اشتباہ کلمہ چند نوشتم وتفصیل آں بروقت ملاقات وحصول فرصت موقوف است............الخ، یہ پورا جواب فتاوی ارشادیہ مطبوعہ میں مذکور ہے۔

کانفرنس کی رپورٹ بھیجی تو اس کے ساتھ مولانا کا رسالہ ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' بھی بھیجا اور ساتھ ہی خط میں یہ لکھا ''مولوی شبلی صاحب نے تاریخانہ مضمون ''گزشتہ تعلیم مسلمانان'' اختیار کیا، وہ رسالہ مرسل ہے، میں سمجھتا ہوں کہ نہایت عمدہ اور مفید چیز تیار ہوگئی'' (خطوط سرسید بہ نام عماد الملک ۲ ص ۱۳۶) اس کے بعد ان کے پاس المامون بھیجی گئی اور وہ بھی قدر و منزلت سے دیکھی گئی، ساتھ ہی الفاروق کی تالیف کا خیال بھی پیش کیا گیا، نواب عماد الملک مرحوم نے ان کی تصنیفات کی قدر کی، المامون کے پچاس ۵۰ نسخے منگوائے اور ان کی مدح و توصیف فرمائی، اس سلسلہ میں سرسید نے ۲۰ / مارچ ۱۸۸۹ء کو نواب عماد الملک کو ایک لمبا خط لکھا جس میں ارقام فرماتے ہیں ''ان کو (مولوی شبلی صاحب کو) آپ کی ملاقات کا نہایت شوق پیدا ہوا ہے، میرے دل میں کچھ خیالات خام سفر ہندوستان کے پیدا ہوئے ہیں، ان خیالاتِ خام کا جن میں غالباً امید کامیابی نہیں ہے، پھر کسی وقت ذکر کروں گا، مگر وہ خیالات پختہ ہوگئے ہیں، اثنائے سفر میں میرا ارادہ حیدر آباد آنے کا بھی ہے، اگر ممکن ہوا تو مولوی شبلی صاحب کو بھی حیدر آباد لاؤں گا، تاکہ آپ کو وہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں، اور جان لیں کہ آپ کون ہیں اور کیسے ہیں'' (ص ۱۲۸) مولوی عبد الحکیم صاحب شرر لکھتے ہیں کہ مولانا شبلی کے اس سفر میں شمولیت سے یہ خیال لوگوں میں پھیل گیا تھا کہ وہ سرسید کے گروہ کے ایک نام ور بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔''

مولانا شبلی مرحوم نے اپنے اس سفر کے حالات ایک فارسی قصیدہ میں ذکر کیے ہیں، جو ان کے کلیات فارسی میں چھپا ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علی گڑھ سے سرسید کے ساتھ نہیں چلے تھے، بلکہ وہ شاید اپنے وطن میں تھے، وہاں سے لکھنؤ اور کان پور ہوکر اس سفر کے لیے روانہ ہوئے، سرسید کا قافلہ اس سے پہلے چل چکا تھا، اس لیے راہ میں ملاقات نہیں ہوئی، اس سوءِ اتفاق سے مولانا پریشان خاطر تھے، اتفاق سے ریل میں دو اور معزز مسلمان مسافر ساتھ سوار ہوئے، جو مولانا کے غائبانہ مشتاق تھے، انہوں نے مولانا کا نام سنا تو بڑے تپاک سے ملے اور راستہ بھر خدمت کرتے رہے، مولانا جب بھوپال پہنچے تو معلوم ہوا کہ کل وہ قافلہ یہاں سے آگے کو روانہ ہوگیا، وہ آگے بڑھے اور آخر تین رات دن کے سفر کے بعد حیدر آباد پہنچے۔

حیدر آباد میں سرسید اور ان کے رفقا کی بڑی قدر و منزلت ہوئی، سرکاری مہمان خانہ میں اتارے گئے، احباب نے دعوتیں کیں، جلسے ہوئے، اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں نے جنھوں نے

ابھی ابھی اختیار پایا تھا، وفد کو حضوری کا شرف بخشا، اور ایک ہزار ماہوار کی پہلی شاہانہ امداد کو دو چند یعنی دو ہزار ماہانہ کرنے کا حکم فرمایا، نواب اقبال الدولہ وقار الامرا کی صدارت میں بشیر باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا، جس میں سرسید اور ان کے رفقا نے تقریریں کیں، مولانا حالی نے اپنا اردو اور مولانا شبلی نے اپنا مشہور فارسی قصیدہ پڑھا جس میں یہ تمام واقعات یعنی بادشاہ کے حضور میں پیش ہونا، وقار الامرا کا آگے بڑھ کر فرمان پڑھنا اور دو ہزار ماہوار کا حکم ہونا سب مذکور ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدہ کی تکمیل حضور میں پیشی کے بعد حیدر آباد میں کی گئی ہے، مولانا فرماتے تھے کہ حیدر آباد میں قیام گاہ کی چھت پر میں چلا گیا تھا اور منع کر دیا تھا کہ کوئی وہاں نہ آئے اور وہیں ٹہل ٹہل کر شعر کہہ رہا تھا کہ مولوی سید علی بلگرامی یہ کہتے ہوئے سیدھے پہنچ گئے کہ کسی کے روکے نہیں رُک سکتا، یہ اُن سے پہلی ملاقات تھی، یہ قصیدہ جب جلسہ میں پڑھا گیا تو ایک سماں بندھ گیا تھا، اس قصیدہ کے شروع میں اس دور دراز سفر کی غرض کی تمہید، پھر مسلمانوں کی تباہ حالی کی تصویر اور اس کے بعد علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کی تشریح ہے، آخر میں دربار میں پہنچنے اور باریاب ہونے کا کیسا اچھا مرقع کھینچا ہے:

پس بفرمودۂ دانش ز علی گڑھ آخر — کارواں شد سوئے اقلیمِ دکن راہ گرائے
بہ نیایش بہ درِ دولت سلطاں رفتیم — ہم بفرمانِ ادب پشت نمودیم دوتائے
از پسِ کرنش و تسلیم بہ آدابِ نیاز — عرض مطلب بنمودیم وستادیم بہ پائے
شاہ از لطف اشارت بہ نشستن فرمود — امر چوں فوقِ ادب بود نشستیم بہ جائے
پس ازاں معتمدِ شاہ عمادُ الدولہ — کہ دبیرے ست ہنر پرور و معنی پیرائے
بہ ادب آمد و توقیع ہمایوں بر خواند — ما ہمہ گوش برآوازش و او نکتہ سرائے
شہ بدستور گرانمایہ فرستاد پیام — کاینک آں مُبلغ پیشینہ دو چنداں فرمائے
بسکہ زیں مژدۂ جاں بخش بخود بالیدیم — غنچہ ساں در برِ ما تنگ ہمی گشت قبائے
چوں بما بیش زاندازۂ خواہش بخشید — بیش زاندازۂ خواہش دہدش اجر خدائے
شاہ تنہا نہ کرم کرد و نوازش فرمود — کہ شدیم از ہمہ اعیانِ دکن بہرہ ربائے
آسماں جاہ فلک پایہ بشیر الدولہ — بازوے دولت و دستور شہ و ملک آرائے
داں وقار الامرا زبدۂ اعیانِ دکن — آں ہنر پرور و دانا دل و فرخندہ لقائے

پایۂ ما بفزودند و کرم فرمودند | شکرِ ایں منت واحسان چہ تواں کردادائے
شاد گاں گشت قوانی وازیں چارہ نبود | خوشتر آن ست کہ اکنوں کنم آہنگِ دعائے
یارب آں باد کہ شہ باہمہ اعیان ووزیر | تا ابد باشد وگردوں بدرش ناصیہ سائے
بعد ازیں جملہ دعاہا کہ پذیراد خدا | خویش را گر بہ دعا یاد کنم ہست بہ جائے

یعنی از نسبتِ آں شاہِ گرامی باشم
شہ نظام ست و بہ زیبد کہ نظامی باشم

مقطع میں حضور نظام کے لقب شاہی کی مناسبت سے نظام اور نظامی کی کیسی اچھی مناسبت پیدا کی ہے۔

مولانا شبلی اپنی نظمیں جس دلکش انداز میں پڑھتے تھے، وہ بیحد مؤثر تھا، یہ قصیدہ پڑھا تو در و دیوار سے تحسین وآفرین کی صدا بلند ہوگئی، نواب وقار الامرا نے اپنے محل فلک نما میں مولانا حالی اور مولانا شبلی کو بلوا کر دوبارہ اُن کے قصیدے سنے اور بیحد متاثر ہوئے اور آخر حضور تک یہ روداد پہنچی، اور مولانا سے سنا ہے کہ خود اعلیٰ حضرت نے مولانا سے اس قصیدہ کو اپنے سامنے پڑھوا کر سننا چاہا، مگر ریاستوں میں ہر چیز سیاست اور سازش بن جاتی ہے، دراندازوں نے یہ زور لگایا کہ یہ تجویز عمل میں نہ آسکی۔

حیدر آباد سے واپسی کے وقت نواب سید علی حسن خاں مرحوم خلف نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اصرار سے چند روز یہ قافلہ بھوپال ٹھہرا اور کیوں کر ٹھہرا، اس کی تفصیل اس حیثیت سے خاص دلچسپی رکھتی ہے کہ اُس زمانہ میں بھوپال میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اثر سے سرسید اور علی گڑھ تحریک کی نہایت سخت مخالفت تھی، گو نواب صدیق حسن خان مرحوم کا اس سے ایک سال پہلے ۱۸۹۱ء میں انتقال ہو چکا تھا، مگر شاہ جہاں بیگم مرحومہ والیۂ بھوپال خود نواب صاحب مرحوم کے اثر سے سرسید کی تحریک کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتی تھیں، ایسی حالت میں سرسید اور اُن کے رفقا کا یہاں ٹھہرانا مشکل کام تھا، میں نے نواب علی حسن خاں مرحوم کے عزیز خاص خواجہ سید رشید الدین صاحب مودودی سے جو ان دنوں وہیں نور محل میں رہتے تھے، یہ پوری روداد اس طرح سُنی ہے۔

بھوپال میں قیام اس زمانہ میں بھوپال نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اثر سے علما وفضلا کا مرکز تھا، نواب صاحب مرحوم اور دوسرے علما کے نزدیک سرسید کا نام لینا بھی جرم تھا، اور والیۂ بھوپال نواب

شاہ جہاں بیگم مرحومہ بھی اسی خیال کی تھیں، نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے چھوٹے صاحب زادے حسام الملک صفی الدولہ نواب سید علی محمد حسن خاں صاحب کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی، لیکن وہ فطرت کی طرف سے مذاق سلیم لے کر آئے تھے، فارسی کے خود بھی شاعر تھے اور شعر و سخن کے قدرداں بھی تھے، پہلے پہل اسی تعلق سے مولانا شبلی کا نام ان کے کانوں تک پہنچا، اس کے بعد ۱۸۸۷ء میں مولانا کی گزشتہ تعلیم، ان کی نظر سے گذری اور اس کے بعد المامون ان تک پہنچی، ان کتابوں کو دیکھ کر اُن کی حالت ہی عجیب ہوئی، ان کتابوں کے متعدد نسخے چپکے چپکے ڈاک سے منگوائے جاتے اور قدر دانوں میں تقسیم ہوتے، اس کے ذریعہ سے کالج کے ساتھ اُن کی دل چسپی اور ہم دردی بڑھتی گئی، اب ۱۸۹۱ء میں جب سرسید کا قافلہ بھوپال سے گزرا اور حیدرآباد سے کام یاب واپس ہوا تو نواب صاحب ممدوح نے منشی محمد امتیاز علی صاحب کے ذریعہ سے جو اُس زمانہ میں بھوپال میں وزیر تھے، بیگم صاحبہ کو یہ سوجھایا کہ سرسید اپنے عقیدہ میں کیسے ہی ہوں، مگر چوں کہ بڑے بڑے انگریزی حکام سے ان کی دوستی ہے، اس لیے ریاست میں اُن کا مہمان ہونا انگریز حکام کی خوش نودی کا باعث ہوگا، اس رائے کو بیگم صاحبہ نے بھی پسند فرمایا اور واپسی میں سرسید اور ان کے رفقا کو بھوپال میں سرکاری مہمان بنا کر روک لیا گیا اور بیگم صاحبہ اُن سے ملنے پر راضی ہوئیں، ملاقات میں سرسید نے قوم کی بیکسی اور تباہی کی ایسی پُر درد تصویر کھینچی کہ وہ بے اختیار ہوگئیں اور کالج کو دس ہزار روپیہ اپنی طرف سے اور دس ہزار اپنے جاگیرداروں کی طرف سے عنایت کیا اور سرسید ہنسی خوشی علی گڑھ روانہ ہوئے۔

مولانا شبلی مرحوم یہاں نواب علی حسن خاں صاحب کے پاس ٹھہر گئے، اس وقت اُن کے علم و فضل کے یہ نئے مناظر علما میں اچنبھے کے ساتھ دیکھے جاتے تھے، شہر کے اکثر علما اور شعرا نے ان سے ملاقاتیں کیں، دن دن بھر یہ صحبت اتنی طول کھینچتی کہ مولانا گھبرا جاتے تھے، مولانا کی اور نواب صاحب کی یہی پہلی ملاقات ہے جو بڑھتے بڑھتے محبت اور قدرشناسی کی اخیر حد تک پہنچ گئی تھی اور جس کے کچھ شواہد مکاتیب شبلی میں نواب صاحب کے نام کے خطوط میں نظر آئیں گے۔

مولانا نے جو فارسی قصیدہ حیدرآباد دکن میں پڑھا تھا وہ پہلی بار اسی سفر میں اور اسی بھوپال میں صاف ہوا اور چھپا تھا۔

سلسلۂ علالت کا آغاز اور سفرِ کشمیر کا خیال اپریل ۱۸۹۲ء | علی گڑھ کی آب و ہوا مولانا کے

مزاج کے موافق نہ تھی، خصوصاً سر سید کے جس بنگلہ میں وہ رہنے لگے تھے، وہ نشیب میں تھا اور وہاں پانی مرتا تھا، اس لیے وہ جگہ ملیریائی تھی اور مولانا کو ملیریا کی شکایت پیدا ہوگئی جس کے حملے اخیر اخیر تک ہوتے رہے، اُس کا پہلا حملہ ۱۸۹۲ء میں شروع ہوا، چنانچہ یکم اپریل ۱۸۹۲ء کو وہ مولوی حمید الدین صاحب کے قلم سے لکھواتے ہیں "تین چار مہینے سے اکثر صحیح نہیں رہتا، آج پانچواں دن ہے کہ بہت سخت بخار آیا، ایک سو چھ درجہ پر حرارت تھی، چار دن تک یکساں حالت رہی، اور نہایت سخت تکلیف رہی...... کونین جو بہت سی کھلا دی ہے، تو کان سے بہت اونچا سننے لگا ہوں" (سمیع ۔۳۱) پھر ۵/ اپریل کو لکھواتے ہیں "بخار کے دورے ہو جاتے ہیں، آج ڈاکٹر نے بڑے سرو سامان سے بخار کے روکنے کے لیے تیاریاں کی ہیں، مگر دیکھئے میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے"۔ (سمیع ۔۳۳) ناممکن ہے کہ مولانا کی نگاہ میں کشمیر کی تعریف میں عرفی کا یہ شعر نہ ہو:

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید　　　گر مُرغ کباب است کہ بابال و پر آید

مولانا کو خیال ہوا کہ اس "سوختہ جانی" کی حالت میں کشمیر کا سفر کیوں نہ کیا جائے، چنانچہ ۵/ اپریل ۱۸۹۲ء کو اپنے ایک عزیز کو لکھواتے ہیں "میں انشاء اللہ اگر اچھا ہوگیا تو اسی مہینہ میں کشمیر جاؤں گا، اور ڈیڑھ دو مہینہ رہوں گا، اگر تم کشمیر تک چلو تو ضرور چلے آؤ، سفر کا خرچ جو تقریباً چالیس پچاس ہوگا تمہارے ذمہ، باقی اقامت کا خرچ میرے ذمہ، علاوہ میری ہمرہی و ہمدردی کے کشمیر کا دیکھنا کچھ کم نہیں، یہاں نہ دیکھا تو قیامت میں اگرچہ اس کا نمونہ دیکھنے میں آئے گا، مگر اصل و نقل میں پھر فرق ہے" (سمیع ۔۳۲) ذرا کشمیر کی بدمست آب و ہوا کا قیاس کیجیے کہ صرف اس کا تخیل ایک شاعر کو کتنا بدمست بنا سکتا ہے، اس کے پانچ دن بعد ۱۰/ اپریل کو ان ہی کو لکھتے ہیں "اپنے ارادہ سے جلد مطلع کرو، میں انشاء اللہ اسی مہینہ کے آخر میں روانہ ہو جاؤں گا،...... کشمیر میں جانے سے ممکن ہے کہ تمہارے ظاہری رنگ میں فرق آئے، یعنی نتواں شستن از زنگی سیاہی غلط ہو جائے[1]" یہ مزاج کی بہار بھی اسی علالت میں اسی کشتِ زعفران کے خیال کا اثر ہے، مگر بہرحال اس سفر کی فال اس سال نہ نکلی، تبدیل آب و ہوا کی، اس سے بہتر صورت نکل آئی، یعنی صحت کے بعد مئی ۱۸۹۲ء میں روم و شام کے سفر پر روانہ ہوگئے اور کشمیر کا سفر کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھا۔

سفر قسطنطنیہ مئی ۱۸۹۲ء | علمی شوق کے پورا کرنے کے لیے دور دراز مقامات کا سفر کرنا، اگرچہ

[1] یہ خط مکاتیب میں نہیں، مولوی سمیع مرحوم کا رنگ اچھا خاصہ سیاہ تھا۔

ہمارے اسلاف کا قدیم ترین شیوہ تھا، لیکن موجودہ علمی دور کے تنزل اور انحطاط میں یہ صرف ایک افسانہ ہی افسانہ رہ گیا تھا، جو ہمارے خون کے بہ جائے صرف ہماری علمی صحبتوں میں گرمی پیدا کرسکتا تھا۔

تنگنائے اعظم گڑھ سے نکل کر اگرچہ علی گڑھ میں مولانا کے پر پرواز کے لیے ایک وسیع فضا مل گئی تھی، تاہم کتابوں سے جو عشق ان کو پیدا ہو گیا تھا، اس کے لیے اس سے بھی زیادہ وسیع فضا کی ضرورت تھی۔

اب ان کو علمی تشنگی بجھانے کے لیے کنوؤں اور نہروں کا پانی نہیں سمندر درکار تھا، الفاروق جس کے لکھنے کے لیے وہ بے تاب تھے، اس کے لیے ہندوستان کے کتب خانے کافی نہ تھے، اس لیے مصر و شام اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں کے کنگھالنے کی حاجت تھی، اس ک علاوہ اُن کے دل میں گزشتہ شاہانہ اسلامی شان وشوکت کی واحد یادگار ترکی کے ساتھ جو عقیدت ومحبت تھی، اس نے بھی ان کو مجبور کیا کہ وہ عمر میں ایک دفعہ دیارِ محبوب کی سیر کرلیں۔

اپنے سفر نامہ کے دیباچہ میں وہ خود اپنے اس ذوق وشوق کا اقرار ان لفظوں میں کرتے ہیں ''قسطنطنیہ وغیرہ کا کوئی سیاح مل جاتا تو میں گھنٹوں وہاں کے حالات پوچھا کرتا'' انہوں نے مئی ۱۸۹۱ء میں قسطنطنیہ کے سفر کا ارادہ کیا اور اپنے ساتھ اپنے ایک عزیز کو بھی لے جانا چاہا، چنانچہ ان کو ایک خط میں لکھا کہ ''ہاں وہ ضروری امر جو اس خط لکھنے کا باعث ہے، یہ ہے کہ میں انشاء اللہ مئی ۱۸۹۱ء میں ضرور قسطنطنیہ روانہ ہو جاؤں گا اور غالباً چھ مہینے وہاں قیام کروں گا، میں چاہتا ہوں کہ تم ساتھ چلو، صرفِ راہ سے تم کو تعلق نہیں، تم کو بلا تنخواہ چھ مہینے کی رخصت بھی مل سکتی ہے، تم اس تجویز کے ہر پہلو پر غور کر کے مجھ کو جواب لکھو، میرا سفر ہر طرح قطعی ہو چکا ہے۔'' (سمیع) لیکن چند در چند اسباب سے اس سال یہ سفر ملتوی رہا، بلکہ یہ عزم ایک ضعیف سا خیال ہو کر رہ گیا، لیکن ۱۸۹۲ء میں اس سفر کی تکمیل کے چند قدرتی اسباب ایسے پیدا ہو گئے کہ دوبارہ اس خیال کو تحریک ہوئی، ان دنوں مولانا اکثر بیمار رہے، یہاں تک کہ علاج سے تنگ آ کر تبدیل آب وہوا کا ارادہ کیا اور مکان وغیرہ کے بندوبست کے لیے الموڑہ اور کشمیر میں دوستوں کو متعدد خطوط لکھے اور کشمیر کا خیال جیسا کہ گزر چکا، زیادہ غالب تھا، اسی اثنا میں معلوم ہوا کہ مسٹر آرنلڈ آج ہی کل میں ولایت جانے والے ہیں، اب دفعۃً مولانا کو خیال آیا کہ مصر وروم کا سفر، آب وہوا کی تبدیلی، مسٹر آرنلڈ کی رفاقت، خوش قسمتی سے یہ سامان جمع ہو گئے ہیں، اس موقع کو ہرگز

ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے، چنانچہ اسی وقت صاحب موصوف کے پاس تشریف لے گئے، انہوں نے نہایت خوشی ظاہر کی اور سفر کے ضروری کاموں میں کافی مدد دینے کا وعدہ کیا۔

اس وقت جہاز کی روانگی کو کل تین چار روز باقی رہ گئے تھے، اعزہ واحباب نے سنا تو سخت متعجب ہوئے اور اکثروں نے کہا کہ اس عجلت اور بے سروسامانی کے ساتھ اتنا لمبا سفر کون سی دانش مندی کی بات ہے؟ لیکن مولانا کا جواب صرف یہ تھا:

ع انچہ بادا باد من کشتی در آب انداختم

کالج میں گرمیوں کی تعطیل معمولاً تین مہینے کی ہوا کرتی تھی اور مولانا کو تین مہینے کی رخصت کا مزید حق حاصل تھا، اس طرح چھ مہینے کی رخصت لی اور ۲۶ر رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ مطابق ۲۶ر اپریل ۱۸۹۲ء کو علی گڑھ سے روانہ ہو گئے، جھانسی سے مسٹر آرنلڈ کا ساتھ ہوا اور بمبئی پہنچ کر حاجی رحمت اللہ بن داؤد کے باغ میں قیام کیا۔

بمبئی پہنچنے کے دوسرے ہی دن جہاز روانہ ہو گیا، پہلی مئی کی صبح کو نو بجے جہاز پر سوار ہوئے، ۱۲ بجے جہاز نے لنگر اٹھایا اور مولانا نے چھ مہینے کے لیے ہندوستان کو خیر آباد کہا۔

راستہ میں مسٹر آرنلڈ نے مولانا سے عربی پڑھنی شروع کی، اس سے جو وقت بچتا وہ دریائی سفر کے سیر تماشے میں صرف ہوتا۔

مناظر کی خوش آیند دلچسپی نے شاعر کے دل میں ایک خاص کیفیت پیدا کی، مولانا نے سفر کے حالات پر مشتمل ایک فارسی قصیدہ کہنا شروع کیا، جو سفر نامہ اور کلیات دونوں میں موجود ہے۔

۷ر مئی ۱۸۹۲ء کو جہاز عدن پہنچا، عدن میں مولانا کو مسافروں کی دلچسپی کی ایک بڑی چیز یہ نظر آئی کہ سمالی قوم کے بہت سے لڑکے ڈونگیوں پر سوار جہاز کے قریب آتے ہیں اور جہاز والوں سے انعام لینے کے لیے عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں، کچھ ناچتے گاتے ہیں اور کچھ آپس میں مل کر چند بے معنی الفاظ کہتے اور بغلیں بجاتے ہیں، ان کا بڑا کمال یہ ہے کہ لوگ دوانی چونی پیسے جو کچھ انعام دینا چاہتے ہیں، وہ سمندر میں پھینک دیتے ہیں اور وہ غوطے مار کر نکال لاتے ہیں، اکثر انگریز اس تماشے میں مصروف تھے اور مسٹر آرنلڈ کو بھی اس میں مزہ آتا تھا، مگر ایک دردمند دل تھا جو اس منظر کو دیکھ کر بے تاب ہو رہا تھا، یہ مولانا شبلی تھے، مؤرخ اسلام کے دل کو ٹھیس لگی کہ وہ عرب جو کبھی دنیا کے فاتح اور کشور کشا تھے آج اُن کی یہ

حالت ہے کہ وہ اپنے حریفوں کے سامنے مسخرگی کر کے پیٹ پالتے ہیں، یہ خیال آتا تھا کہ مولانا کی زبان سے بے اختیار "قم یا عمر" کے الفاظ نکل گئے، بعد کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ عرب نہیں سمالی ہیں تو تسکین ہوئی۔

۱۳ ارمئی کو جہاز سوئز پہنچا، خوانچہ اور پھیری والوں میں سے ایک نے مولانا کو ہندوستانی سمجھ کو اُردو میں گفتگو شروع کی، مولانا کو بڑا تعجب ہوا اور جب دریافت سے معلوم ہوا کہ اس نے کبھی ہندوستان کی صورت نہیں دیکھی تو اردو کی عالم گیری پر اُن کو اور بھی تعجب ہوا (مجھے بھی ۱۹۲۰ء میں یورپ جاتے ہوئے پورٹ سعید میں یہی اتفاق پیش آیا، جس ڈونگی پر بیٹھ کر جہاز سے ساحل پر آیا، اُس کا ملاح بے تکلف اردو بولتا تھا، حالاں کہ وہ یہاں کبھی نہیں آیا تھا، دریافت سے معلوم ہوا کہ ہندوستان سے جہاز ہر روز یہاں آتے جاتے رہتے ہیں، اُن ہی جہازیوں سے ملنے جلنے میں اُن سے یہ زبان سیکھ لی)۔

۱۴ ارمئی کو جہاز پورٹ سعید پہنچا، جہاز سے اتر کر جب مولانا نے ساحل پر قدم رکھا تو ہر چیز کو بڑے شوق اور حیرت کی نگاہ سے دیکھا، کیوں کہ یہ حرمین محترمین کے بعد پہلا موقع تھا کہ انہوں نے سلطنتِ اسلام کی آبادی دیکھی، یہاں سے مسٹر آرنلڈ الگ ہوئے، وہ یورپ کو روانہ ہوئے اور مولانا قسطنطنیہ کے جہاز پر سوار ہوئے، یہاں سے مولانا کی دلچسپی کا نیا سامان یہ پیدا ہوا کہ مسلمان اور شامی عرب مسافروں کی صورتیں جہاز میں نظر آنے لگیں، اتنے دنوں میں مسلمانوں کی صورت کو ترس گئے تھے۔

۱۵ ارمئی کو جہاز یافا پہنچا جو شام کا ساحلی شہر ہے اور ۱۶ ارمئی کو بیروت، گو وقت نہ تھا مگر ایک ایسے اہم شہر کے دیدار سے محرومی جس کو خیال کی آنکھوں سے وہ تاریخ کے صفحوں پر بارہا دیکھ چکے تھے، گوارا نہ ہوئی، اور ایک آدمی کو ساتھ لے کر شہر کی سیر کر آئے، ۱۷ ارمئی کو جہاز سائپرس پہنچا، جس کو عربی میں قبرص کہتے ہیں، قبرص وہ مقام تھا جو ایک اسلامی مؤرخ کی نگاہ میں دلچسپی کا بڑا سامان رکھتا تھا، مولانا اُس کے شہر لماسون میں اترے، سب سے پہلے جامع مسجد میں گئے، مسجد ہی سے متصل ایک اسلامی مکتب نظر آیا، اُس میں چلے گئے، وہاں کے مدرس سے جو ایک عالم تھے، ملے، اُس نے بڑی تعظیم وتکریم کی اور ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا، اُس نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، تو مولانا پر بے حد اثر ہوا، ان کو خیال آیا کہ کہاں وہ حجاز کا ریگستان اور کہاں بحرِ روم کا یہ دور دراز جزیرہ، اس مقدس کلام میں کیا تاثیر تھی، کہ مشرق سے مغرب تک برقی روبن کر دوڑ گئی۔

۱۸ ارمئی کو جہاز روڈس پہنچا اور تین چار گھنٹے ٹھہرا، یہ بھی ابتدائی اسلامی تاریخ کا دلچسپ

موضوع ہے، اسی لیے مولانا اُس کی سیر کے بہت مشتاق تھے، لیکن اتفاق سے رات کا وقت تھا اس لیے اس کی سیر سے محروم رہ گئے، ۲۰ رمئی کو صبح کے وقت ازمیر (سمرنا) پہنچے، اور یہاں جہاز دو روز تک مقیم رہا اور مولانا نے تفصیل کے ساتھ یہاں کی سیر کی، جمعہ کی نماز جامع حصار میں پڑھی، مسجد سے متصل ایک چھوٹا سا کتب خانہ تھا، نماز سے فارغ ہو کر اس کتب خانہ میں گئے، وہاں چند علما اور ترکی محکمہ تعلیم کے کچھ افسر بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور متعہ کے مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی، یہ لوگ فارسی سمجھتے تھے، ان کی اجازت سے مولانا نے اس مسئلہ پر ایسی عمدہ تقریر کی کہ سب نے پسند کی۔

یہاں سے ۲۱ رمئی کی شام کو روانہ ہو کر ۲۳ رمئی کو صبح کے وقت قسطنطنیہ پہنچے، اور قلیوں اور ملاحوں کی کشمکش سے رہائی حاصل ہونے کے بعد ایک کشتی میں بیٹھ کر کنارے آئے، اسی کشتی میں شیخ عبدالفتاح سے ان کی ملاقات ہوئی اور یہی اتفاقی ملاقات ان کی تمام کامیابیوں کا دیباچہ تھی، دونوں نے ساتھ سرائے میں جا کر قیام کیا، چھ سات دن تک اس سرائے میں رہے، پھر باب عالی کے پاس ایک اچھا مکان کرایہ پر لیا اور چند روز کے بعد دوسرا مکان لیا اور اخیر تک اُسی میں مقیم رہے۔

شیخ عبدالفتاح جن سے مولانا نے دوستی پیدا کی تھی، شام کے ایک خاندان سے تھے، جن کو ہندوستان سے بھی ایک طرح کا تعلق تھا، حضرت خالد نقشبندی جو خالد رومی کے نام سے بھی مشہور ہیں وہ ملک شام سے ہندوستان آ کر دہلی میں حضرت شاہ غلام علی علیہ الرحمہ کے مرید ہوئے تھے اور یہاں سے نقشبندی طریقہ کی تعلیم پا کر اپنے وطن واپس تشریف لے گئے اور ہندوستان کی اس دولت کو روم و شام میں جا کر لٹایا اور نقشبندیہ طریقہ کو جاری کیا، شیخ عبدالفتاح کا نام سن کر ان کی زیارت کے لیے شامی عربوں کا گروہ در گروہ آنا شروع ہوا اور اس ذریعہ سے مولانا کی ملاقات بھی ان سے ہونے لگی، انہی آنے والوں میں ایک نوجوان شامی عالم شیخ علی ظبیان تھے، ایک دن وہ شیخ عبدالفتاح سے ملنے آئے تو مولانا بھی پاس ہی بیٹھے تھے اور سامنے مولانا کی عربی تصنیف اسکات المعتدی رکھی تھی، شیخ علی ظبیان کی نظر اس پر پڑی تو کہا ''آہا یہ رسالہ مدت ہوئی میں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا اور انہوں نے اس کے مصنف کے بارے میں کہا تھا ''شکر اللہ مساعیہ'' شیخ علی ظبیان کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس رسالہ کے مصنف یہی ہیں تو اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے ملے اور نہایت لطف و مہربانی سے پیش آئے، مولانا کو اس بات سے کہ ان کی ایک معمولی سی تصنیف یہاں تک پہنچی اور لوگوں نے نگاہِ قبول سے دیکھا

نہایت مسرت ہوئی، شیخ علی ظبیان سے مولانا کے تعلقات روز بروز بڑھتے گئے اور وہ اس سفر میں اُن کے بہت مدد و معاون ثابت ہوئے، چند روز کے بعد انہوں نے مولانا سے منطق پڑھنی شروع کی، ان کے ساتھ فواد یک وغیرہ چند اور نو جوانوں نے بھی شرکت کی۔

کتب خانوں کی سیر اس سفر سے مولانا کا اصلی مقصد قدیم کتابوں کا مطالعہ تھا، قسطنطنیہ میں کتب خانے بہت دور دور واقع تھے، مولانا ایک ایک کتب خانہ اور ہر کتب خانہ کی ایک ایک نایاب کتاب جو ان کے مقصد سے تعلق رکھتی تھی، دیکھتے پھرتے تھے اور اس غرض سے ان کو روزانہ تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا تھا، لیکن یہ نہایت ہنسی خوشی کے ساتھ روزانہ یہ تکلیف اٹھاتے تھے اور نہایت سرگرمی کے ساتھ ان کتب خانوں کی سیر کرتے تھے، چنانچہ قسطنطنیہ سے ایک خط میں سید صاحب کو لکھتے ہیں ''اس وقت بلکہ زمانۂ قیام تک مطلق فرصت نہیں مل سکتی، ہر روز تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا ہے، بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتب خانے وغیرہ دور دور واقع ہیں۔'' (سرسید-۱۰)

یہاں جو کتابیں نظر سے گزریں، ان میں سے سرسید کو ان کے فلسفیانہ مذاق کے مطابق جن تصنیفات اور مصنفوں سے باخبر کیا ہے، اس کا تھوڑا سا حال سرسید کے نام کے خطوں میں ہے، ۲۲ رمئی کو وہ قسطنطنیہ پہنچے اور تین ہی روز کے بعد ۲۵ رمئی کو وہ انہیں خط لکھتے ہیں، سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ دو تین سو یا اس سے زیادہ روپے بھیج دیں کہ جو کتاب جس وقت ہاتھ آئے، لے لی جائے یا نقل و کتابت کا انتظام کیا جا سکے، کتابیں یہاں بہت ہیں اور نادر ہیں، لیکن کہاں تک لکھوائی جا سکتی ہیں، امام غزالی کی تصنیفیں یہاں موجود ہیں اور بو علی سینا کی تو شاید کل تصنیفات مل سکتی ہیں، امام غزالی کے خطوط بھی موجود ہیں......۔

معتزلہ کی کتابیں یہاں بھی نہیں......۔

پھر ۱۵ ارجون ۱۸۹۲ء کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں ''قلمی کتابیں یہاں نہیں ملیں، (یعنی خریدنے کے لیے نہیں ملیں) مصر میں کبھی کبھی ہاتھ آجاتی ہیں، صرف مطبوع کتابیں خریدی جا سکتی ہیں، لیکن ان کی تعداد بھی معتد بہ ہے، یہاں امام غزالی کی کتابیں اور رسالے موجود ہیں، مکاتبات[1] کا نسخہ بھی ہے، ابو علی سینا کی اس قدر تصنیفات ہیں کہ کہیں نہ ہوں گی، ارسطو وغیرہ کے اصلی ترجمے نہایت قدیم

[1] سرسید نے مکاتبات امام غزالی کا جو نسخہ شائع کیا ہے، وہ یہیں سے منگوایا گیا تھا۔

خط میں موجود ہیں، معتزلہ کی کتابیں البتہ ناپید ہیں، عبدالقاہر جرجانی کی تفسیر ہے، مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں......۔

۵؍جون ۱۸۹۲ء کو اپنے والد ماجد کے نام لکھتے ہیں ''کتابیں یہاں عجائب وغرائب ہیں لیکن حسرت کے سوا کچھ حاصل نہیں، نہ نقل ہوسکتیں، نہ حافظہ ان کے لیے کافی ہے، میں ہر روز دو تین میل پیادہ سفر کرتا ہوں، کیوں کہ کتب خانے دور دور واقع ہیں، ماموں صاحب سے فرما دیجئے کہ آج کل یہاں عینی بخاری کی شرح چھپ رہی ہے، نو جلدیں چھپ چکیں، نہایت عمدہ چھپ رہی ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ بعض تحقیقات ان میں ایسی ہیں جو فتح الباری میں نہیں مل سکتیں، قیمت ابھی متعین نہیں ہوئی، ایک مشترکہ کمپنی ڈیڑھ دو لاکھ کے سرمایہ کی ہے، جس نے عظیم الشان مطبع قائم کیا ہے، اسی میں یہ کتاب چھپ رہی ہے۔''

سفرنامہ میں مولانا نے یہاں کے کتب خانوں کے علمی سرمایہ پر جو رائیں ظاہر کی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ان کتب خانوں میں کیا کیا دیکھا، فرماتے ہیں ''میرا خیال تھا کہ دولت عباسیہ کے عہد میں یونانی ومصری کتابوں کے جو ترجمے ہوئے تھے، دنیا سے ناپید ہوگئے، لیکن یہاں آکر اس خیال کی غلطی ثابت ہوئی، اگرچہ جس کثرت سے ترجمے ہوئے تھے، اس کے اعتبار سے تو موجودہ سرمایہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے، تاہم جس قدر موجود ہے، یہ بھی غنیمت ہے'' اسی سلسلہ میں ابن سینا کی حکمت مشرقیہ کا ذکر کیا ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں ''مشہور حکما اور ائمۂ فن کی کتابیں جس کثرت سے یہاں موجود ہیں اور کہیں نہیں مل سکتیں، امام غزالی، بوعلی سینا، فخر رازی، فارابی کی وہ کم یاب تصنیفات جن کے نام صرف ابن خلکان وغیرہ کے ذریعہ معلوم ہیں، اکثر یہاں موجود ہیں، اسی سلسلہ میں مولانا نے تاریخ وادب کی حسب ذیل نادر کتابوں کا تذکرہ کیا، اسرار البلاغہ، دلائل الاعجاز جرجانی، البیان والتبیین للجاحظ، تذکرۂ ابن حمدون، معجم الادبا، یاقوت، کتاب الاشراف، بلاذری تاریخ کبیر امام بخاری، کتاب القضاۃ وکیع، تاریخ خطیب بغدادی، تاریخ الاسلام ذہبی، تاریخ الحکما قفطی، تجارب الامم ابن مسکویہ، منتظم ابن جوزی، مرآۃ الزمان، سبط ابن جوزی، مسالک الابصار ابن فضل اللہ، عقد الجمان، بدر الدین عینی، تاریخ دمشق ابن عساکر، رحلۃ ابن خلدون، نہایت الادب نویری، طبقات کبریٰ ابن سعد، طبقات الامم صاعد اندلسی، سیرۃ العمرین ابن جوزی، کتاب الصناعتین عسکری، شرح تبریزی بر حماسہ، دیوان ابونواس مکمل، سرقات المتنبی ابن عمید، مجموعۂ رسائل ابواسحاق وغیرہ۔

کیا زمانہ کی نیرنگی ہے جن نادر کتابوں کی خاطر مولانا نے یہ محنتِ شاقہ اٹھائی تھی، وہ انہی کے زمانہ سے چھپ کر عام ہونے لگی تھیں، اور اب تو شاید ان کی ان پسندیدہ کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہو جو نہ چھپی ہو، ایک منتظم اور تاریخ کبیر بخاری تھی، وہ بھی دائرۃ المعارف حیدرآباد میں چھپ رہی ہے، تاہم اس سے مولانا کے حسنِ انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے کہ ہر فن میں ان کی نگاہِ انتخاب اُسی پر جا کر رُکی، جو انتخاب کے قابل تھی اور وہ مولانا ہی تھے جنھوں نے ان کتابوں کے ناموں سے ہندوستان کو سب سے پہلے روشناس کیا۔

الفاروق کے لیے جن کتابوں سے معلومات اُن کو مل سکتے تھے، ان کو مطالعہ کیا، اور ان سے ضروری اقتباسات لکھ کر اپنے ساتھ لائے، جن میں طبقات ابن سعد، سیرۃ العمرین امام جوزی، انساب الاشراف بلاذری، اخبار القضاۃ محمد بن خلف اور محاسن الوسائل الی اخبار الاوائل وغیرہ کے حوالے الفاروق میں موجود ہیں اور مصنف نے الفاروق کے مقدمہ اور حاشیہ میں بھی اس کی تصریح کر دی ہے۔

مدارس کا معائنہ کتب خانوں کے بعد یہاں کے مدارس دیکھنے کی چیز تھے اور مولانا کو جو شوق و آرزو یہاں تک کھینچ کر لائی تھی اس میں اس چیز کا مرتبہ بھی کچھ کم نہ تھا، سفرنامہ میں فرماتے ہیں ''اس دور دراز سفر سے کتب خانوں کی سیر کے علاوہ اگر میرا کچھ اور مقصد ہو سکتا تھا تو یہاں کی طرز تعلیم اور ترقی تعلیم کا اندازہ کرنا تھا'' چنانچہ اسی لیے اس پر بہ نسبت اور باتوں کے زیادہ توجہ کی اور جہاں تک ہو سکا اس کے لیے کوشش اور محنت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، وہ چند بار سررشتہ کے دفتر میں گئے، تعلیم کے افسروں سے تحقیق طلب باتیں دریافت کیں، بڑے بڑے اسکول اور کالج خود جا کر دیکھے، ٹیچروں اور پروفیسروں سے ملے، کالجوں کی سالانہ رپورٹیں حاصل کیں، وہ ہندوستان کی ایک ایسی تعلیم گاہ میں تھے جو مسلمانوں کی نئی امیدوں کا مرکز تھی اور خود پرانی تعلیم کے مدرسوں کی پیداوار تھے، اس لیے دونوں کے حسن و قبح سے واقف تھے اور یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے کہ اس ملک میں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے، قدیم و جدید کو کس طرح پیوند دیا گیا ہے، لیکن جب یہاں پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ یہاں بھی قدیم، جدید کے درمیان وہی حد فاصل قائم ہے تو ان کے دل کو چوٹ لگی، ایک خط میں سرسید کو لکھتے ہیں، افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقۂ تعلیم تھا، اس میں یورپ کا ذرا پرتو نہیں، جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے، لیکن دونوں کے حدود جدا جدا رکھے گئے ہیں اور جب

تک یہ ڈانڈے نہیں ملیں گے اصلی ترقی نہ ہوسکے گی، یہی کمی ہمارے ملک میں ہے، جس کا رونا ہے"
نئے طریقہ کے جو اسکول اور کالج تھے، مولانا نے ان کو ایک ایک کر کے دیکھا، مکتب حربیہ (ملٹری کالج) مکتب الحقوق (لا کالج) مکتب الصنائع (ٹیکنیکل کالج) مکتب بحریہ، مکتب الزراعۃ (اگریکلچر کالج) مکتب سلطانیہ، مکتب ملکیہ (سول سروس کالج) وغیرہ میں گئے، وہاں طلبہ کے رہنے سہنے کے طریقوں کو غور سے دیکھا، ان کے بورڈنگ کے انتظام اور طور وطریق پر غائر نگاہ ڈالی اور ان میں جو باتیں قابل ذکر تھیں ان کو سفرنامہ میں ذکر کیا ہے، تاکہ وہ کالج میں رائج کی جائیں۔

اپنے والد ماجد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں "یہاں کے کالجوں کی ایک بات مجھ کو بہت پسند آئی، ہر کالج کا خاص لباس ہے اور کوٹ پر گریبان کے قریب کالج کا نام ہوتا ہے، مجھے یہ بات بہت پسند ہوئی ہمارے کالج میں یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا، سید صاحب قبلہ بغیر کسی پس وپیش کے کالج کا ایک خاص لباس قرار دیں تو بہت اچھا ہے" مولانا حالی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے اس تجویز کو پسند کیا اور اس کے رواج دینے کی کوشش کی، اس وقت کالج میں جو یونیفارم کا رواج ہے وہ اسی تجویز کی ادھوری تعمیل ہے، حیاتِ جاوید میں ہے "پھر محمڈن کالج کے بورڈروں کے لیے اس قاعدہ کے موافق جس پر قسطنطنیہ کی درسگاہوں میں عمل درآمد ہے، یونیفارم کا قاعدہ جاری کرنے کا ارادہ کیا، مگر بعض موانع کے سبب وہ قاعدہ جاری نہیں ہوسکا، لیکن محمڈن کالج کے طالب علم جو بورڈنگ ہوس میں آکر رہتے ہیں، بغیر کسی جبر کے اپنے سرچشموں کو دیکھ کر خود بخود ٹرکش لباس اختیار کر لیتے ہیں۔" (ج۲،ص۹۴)

اسی طرح مولانا سفرنامہ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں "ہر کالج میں غریب۔ طالب علموں کی متعدد تعداد ہے اور دولت مند ترکوں کی طرف سے ان کو اس قدر امداد دی جاتی ہے کہ وہ کالج کے تمام مصارف ادا کرسکتے ہیں، اس کا یہ اثر ہے کہ کالج کے احاطہ میں جا کر کوئی شخص کسی طرح تمیز نہیں کرسکتا کہ فلاں طالب علم غریب اور کم مقدور ہے، طلبہ کی یکساں حالت ان میں اتحاد اور قومیت کا نہایت قوی خیال پیدا کرتی ہے اور غربا کو اعلیٰ درجہ کی معاشرت کا حاصل ہونا اور ان میں حوصلہ مندی اور بلند نظری پیدا کرتا ہے، بورڈنگ کا یہ طریقہ دیکھ کر مجھ کو اپنا مدرسۃ العلوم یاد آتا تھا اور میں اس کے بورڈنگ کے اختلاف مراتب پر افسوس کرتا تھا، میں علانیہ کہتا ہوں کہ ہمارے قومی کالج میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تمام طالب علموں کا لباس، وضع، خوراک، مکان، فرنیچر، کلیۃً ایک کر دیا جائے اور جو مختلف سطحیں آج

کالج میں قائم ہیں، بالکل منادی جائیں، اگر نہیں تو کالج میں قومیت کی روح نہیں" (سفرنامہ-۶۰) مکتب ملکیہ یعنی سول سروس کے کالج میں جب وہ گئے ہیں تو اتفاق سے ظہر کی نماز کا وقت آ گیا، اس وقت کوٹ پتلون میں ملبوس نو جوان ترک فوراً نماز کی تیاری میں لگ گئے وہ سماں مولانا پر اثر کر گیا، لکھتے ہیں "اس اثنا میں ظہر کا وقت آ گیا، مسلمان لڑکوں نے نماز کی تیاری کی، عموماً کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے اور اس لباس میں ان کا ادب اور متانت کے ساتھ وضو کرنا اور وقار واحترام کے ساتھ قطار در قطار مسجد کو جانا میرے دل پر عجیب اثر کرتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر مذہبی اثر سے آزاد ہو کر ترقی کریں تو ایسی ترقی سے تنزلی ہزار درجہ بہتر ہے" (ص ۷۷) ترکی کے مصنفین اور ادبا سے بھی ملاقاتیں کیں اور جدید ترکی ادب کا جو سرمایہ پیدا ہوا تھا اس کا بھی اندازہ لگایا، یہاں کے بڑے بڑے اخبارات اور علمی رسائل دیکھے اور ان کی ظاہری شکل وصورت، چھاپہ کی خوبی، ٹائپ کی خوبصورتی، صفائی اور مضامین کے تنوع اور بلندی سے ان کو خوشی ہوئی، مگر یہ دیکھ کر افسوس کیا کہ حکومت نے سیاسیات کے میدان کو اتنا تنگ اور محدود کر دیا ہے کہ اس نمک کے بغیر وہاں کا ہر بہتر سے بہتر کھانا بھی بدمزہ ہو رہا ہے۔

یہاں ہر طرف ترکی زبان کا ماحول دیکھ کر مولانا نے ترکی پڑھنی شروع کی، چنانچہ اپنے والد کو لکھتے ہیں "ترکی پڑھنی میں نے شروع کر دی ہے، دیکھئے پوری بھی کر سکتا ہوں یا نہیں۔"

ملاّ محمد آفندی موصل کے رہنے والے ایک عرب تھے، جو فارسی اچھی طرح جانتے تھے، مولانا نے ان ہی سے ترکی سیکھنی شروع کی، مولانا نے گو سفرنامہ میں لکھا ہے کہ جو ٹوٹی پھوٹی ترکی میں نے ان سے سیکھی تھی وہ بھی اب محفوظ نہیں، مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ اتنی ترکی سیکھ گئے تھے کہ انہوں نے اپنے ایک استاذ زادہ مولانا محمد امین صاحب چریا کوٹی خلف مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی کو اس زبان میں اپنا شاگرد بنایا اور وہ بعد کو ترکی اچھی طرح سیکھ گئے، اخیر اخیر زمانہ تک مولانا کا یہ حال تھا کہ ترکی اخبار ہم لوگوں کے سامنے پڑھتے تھے اور عربی لفظوں کے سہارے سے اس کا کچھ حاصل نکال لیتے تھے۔

یہاں کے نئے طرز کے اسکولوں اور کالجوں کو دیکھ کر مولانا کو جو خوشی ہوئی، اسی قدر یہاں کے پرانے عربی مدرسوں کو دیکھ کر اُن کو تکلیف ہوئی، بلکہ یہاں تک ان کی رائے ہوئی کہ موجودہ (پرانی) تعلیم پستی کی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس کے مقابلہ میں ہمارے ہندوستان کی تعلیم غنیمت ہے، اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا، وہ اس قدیم تعلیم کی ابتری تھی۔ (سفرنامہ-۷۸)

قسطنطنیہ میں مولانا کے علم کے مطابق اس وقت عربی اور مذہبی علوم کے طالبان کے رہنے کے حجرے تنگ و تاریک صحن مختصر، مکانات بند بند، ذریعہ آمدنی زکوٰۃ و خیرات، بایں ہمہ مولانا نے ان مدرسوں کو دیکھ کر ترکوں کی اس علمی فیاضی کا اعتراف کیا کہ وہ ہر چند کم حیثیت سہی تاہم آج سینکڑوں علمی یادگاروں کا وجود تو ہے اور انصاف یہ ہے کہ یہ مدرسے جس زمانہ کی یادگار ہیں اس وقت کی تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ناموزوں بھی نہیں، ہمارے ہندوستان میں تو اس وسعت اور فراخی کے ساتھ کہ بہ جائے خود ایک اقلیم ہے، حکومتِ اسلام کی شش صد سالہ مدت کی ایک علمی یادگار بھی موجود نہیں۔ (سفرنامہ-ص۸۰)

اس تفاوتِ حال کا سبب تو ظاہر ہے کہ ترکوں کی اسلامی سلطنت باقی تھی اور ہندوستان کی مٹ چکی تھی، بہرحال یہ تو دل کے بہلانے کی باتیں ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ قدیم مدارس کی اس حالت کو دیکھ کر ان کو بڑا درد ہوا، آج ترکی میں جو مذہبی و تمدنی انقلاب برپا ہے، وہ حقیقت یہ ہے کہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری کا نتیجہ ہے اور ہر قدیم کو مٹا کر ہر جدید کی طلب کا جوشوق جنون کی حد تک مصطفیٰ کمال پاشا کے دور میں پیدا ہوا، وہ اسی کا نتیجہ ہے کہ قدیم و جدید تعلیم کے درمیان تطبیق کی کوشش اتنے زمانہ تک وہاں نہیں کی گئی، میں نے اپنے سفر افغانستان میں افغانستان کے وزرا اور امرا کی خدمت میں یہی عرض کیا تھا اور اسی نتیجہ میں ان کو ڈرایا تھا۔

مولانا کے دل کو ترکی میں جس دوسری چیز سے تکلیف پہنچی وہ یہ تھی کہ یہ ساری رونق، یہ ساری چہل پہل، یہ ساری ترقی جو کچھ تھی وہ سلطنت کے دم سے تھی، اس میں ترکی قوم کی کوشش و عمل اور جد وجہد کا کوئی حصہ نہ تھا، وہ اسی طرح سست وساکن اور بے خبر تھی، جیسی خود ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم، یہ دیکھ کر ان کے دل پر جو اثر ہوا، اس کو سفرنامہ میں ان لفظوں میں لکھتے ہیں:

> ''سیاسی قید و بند کا یہ بھی اثر ہے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں ابھی تک وہ زندہ دلی، آزاد خیالی، حوصلہ مندی، بلند نظری نہیں پیدا ہوئی جو نئی تعلیم کا لازمہ ہے، اس سے بڑھ کے افسوس یہ ہے کہ تمام کالج اور اسکول جن کا میں نے ذکر کیا، حکومت کی طرف سے ہیں، قوم نے ابھی تک اس کی طرف توجہ نہیں کی ہے، یعنی اتنے بڑے دارالسلطنت میں ایک بھی قومی کالج نہیں، کوئی گورنمنٹ گو کتنی ہی مقتدر اور دولت مند ہو، لیکن تمام ملک کی علمی ضرورتوں کی کفیل نہیں ہوسکتی، اگر ہو بھی تو چنداں مفید نہیں، جس قوم کی تمام ضرورتیں گورنمنٹ انجام دیا کرتی ہے، اس کی دماغی اور روحانی قوتیں مردہ اور بے کار ہو جاتی ہیں، (ص۶۴)

مولانا کی دوررس نظر نے ٹرکی کی جس بیماری کا اُن دنوں احساس کیا تھا، اسی کا علاج مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنی حکمت اور تدبیر سے کیا، یعنی ترکی سلطنت کو ترکی شہنشاہی سے نہیں، ترکی قوم کے ذریعہ سے زندہ کرنا، البتہ اس راہ میں مصطفےٰ کمال سے جو بے اعتدالی ہوئی، اس کا افسوس ہے۔

قسطنطنیہ کے سفر میں جو چیز انہوں نے سب سے زیادہ محسوس کی وہ محکوم اور حاکم کا تفاوت اور غلام اور آزاد قوموں کی ذہنیتوں کا فرق ہے، وہ خود ایک غلام ملک کے باشندے تھے اور اپنے ہم وطن مسلمانوں کی پست حوصلگی، بزدلی، خودغرضی اور تملق پیشگی کے مناظر دیکھ چکے تھے، ایک آزاد سرزمین پر قدم رکھتے ہی دنیا بالکل بدلی ہوئی نظر آئی اور زبوں حالی کا احساس اور قوی ہوگیا، تاہم جس اسلامی جاہ و جلال اور عظمت و جبروت کی داستانیں کتابوں میں پڑھی تھیں، اس کے بچے کھچے آثار کو بچشم خود دیکھ کر روحِ مضطرب کو جو سرمایۂ نشاط حاصل ہوتا اور دلِ بے تاب سے جوشِ سرور کی جو موجیں اُٹھتیں اس کا اظہار لفظوں کی قدرت سے باہر ہے، ہر جمعہ کو رسمِ سلامق کا دلفروز سماں اور عید کے موقع پر موکبِ سلطانی کا پرشکوہ منظر اس درجہ روح پرور تھا کہ مولانا پر تھوڑی دیر کے لیے ایک بے خودی سی چھا جاتی، مولانا نے ایک مختصر سی مثنوی میں موکب سلطانی کے دلکش نظارے کی مصوری کی ہے، جس کا ہر لفظ خوشی و مسرت کا ایک چھلکتا ساغر ہے، اپنے کیف و وارفتگی کو ان دو شعروں میں ادا کیا ہے:

بگذر ازیں حرف و مکرر مپرس — خوابِ خوشے دیدم و دیگر مپرس
تند مئے بود خرابم ہنوز — دیدۂ من باز و بخوابم ہنوز

مگر یہ کیفیت کیوں تھی، کیا محض اس لیے کہ دولت و ثروت اور جاہ اقتدار کے نظارے نے ان کو مرعوب کر دیا تھا؟ نہیں بلکہ اس لیے کہ اس جاہ و حشم کے آئینہ میں ان کو اسلام کی حیاتِ ملی کا تابناک چہرہ نظر آ رہا تھا، عیدگاہ میں جہاں سلطان کی آمد کا سماں دکھایا ہے، فرماتے ہیں:

غلغلہ برخاست کہ بادا نوید — مہر جہاں تابِ خلافت دمید
قاعدۂ دولت و دیں را مدار — آئینۂ رحمت پروردگار
شاہ فلک کوکبۂ عبدالحمید — ایدہٗ اللہ بنصرٍ مزید
فرۂ شاہی بہ جبین آشکار — حاشیہ بوساں بہ یمین و یسار

آگے چل کر دعائیہ اشعار میں ان کے جذبات اور نمایاں ہوجاتے ہیں:

جز تو کہ ہست اے شہ انجم سپاہ آنکہ بود شرعِ نبی را پناہ
تازگیِ بدر و حنین از تو ہست زیب و طرازِ حرمین از تو ہست
چرخ بداں مایہ کہ گردندہ است زندہ بماں کز تو جہاں زندہ است

یہ نظم دراصل نہ شخصی مدح تھی نہ ممدوح کو سنا کر صلہ حاصل کرنے کی غرض سے لکھی گئی تھی، بلکہ قومی حیات کی رجز خوانی تھی اور ملی تفاخر کا جوش تھا، جو بے ساختہ زبانِ قلم سے تراوش کرلیا ہے۔

رسمِ سلامتی دیکھنے کے بعد مولانا پر جو کیف طاری تھا، اُس کی تصویر ان کے سفرنامہ سے زیادہ ان کے ایک مکتوب میں ہے، جو مکاتیب میں شامل ہے، یہ خط چوں کہ عین اسی دن لکھا گیا ہے، اس لیے اس سے ان کے تاثرات کی پوری کیفیت معلوم ہوتی ہے، ۱۹؍جون ۱۸۹۲ء کے خط میں اپنے والد ماجد کو لکھتے ہیں:

قبلہ ام!

آج میں نے ''عجیب دل آویز'' خواب دیکھا ہے، ''عجیب'' اس لیے کہ دوپہر کا وقت تھا اور آنکھیں بیدار تھیں، اور ''دل آویزی'' کی کیفیت ہے کہ جاگے ہوئے مدت ہوچکی ہے اور اب تک آنکھوں میں وہی سماں پھر رہا ہے، مفصل سنئے، آج جمعہ کا دن تھا اور معمول کے موافق موکبِ سلطانی کا نظارہ گاہ تھا، میں بھی ہمہ تن شوق بن کر گیا، جامعہ حمیدیہ میں داخل ہوا، سلطان المعظم بڑی شوکت وشان سے آئے، لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا، کیوں کہ یہ سیر صرف ان لوگوں کو نصیب ہوسکتی ہے جو گزرگاہِ سلطانی پر پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور پھر نماز کے ختم ہونے تک جگہ سے حرکت نہیں کرسکتے۔

محل سلطانی سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر ایک نہایت پُر تکلف جامع مسجد ہے جو سلطان کے نام سے حمیدیہ مشہور ہے، اس گزرگاہ میں ایک مکان ہے اور دور دور ملکوں سے آئے ہوئے معزز سیاح یا عہدہ دار موکبِ ہمایونی کی سیر کرنا چاہتے ہیں، وہ کسی معزز شخص کے ذریعہ سے اجازت حاصل کرتے ہیں اور اُس مکان کی چھت پر بیٹھ کر یہ تماشا دیکھتے ہیں، اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے، کیوں کہ سواری کے وقت دور تک چاروں طرف فوج کا دائرہ ہوتا ہے اور کوئی شخص اُس کے اندر داخل نہیں ہوسکتا، حسین حبیب[1] آفندی (سابق سفیر بمبئی) نے مجھ کو اجازت دلانے کا وعدہ کیا تھا، مگر اتفاق سے وہ دیر میں آئے، اِدھر سواری

---

[1] جنگ روم وروس میں مولانا نے چندے ان ہی کے ذریعہ سے قسطنطنیہ بھیجے تھے، یہی ذریعہ تعارف تھا۔

کا وقت قریب آ گیا اور طرقوا اور دور باش کی صدائیں بلند ہونے لگیں، مجبوراً میں مسجد میں داخل ہوا اور صف اول میں جا کر بیٹھا، سلطان کی گاڑی زینہ تک آتی ہے، اور وہ اتر کر فوراً مسجد کے بالائی حصہ پر جہاں نہایت مقرب اور مخصوص لوگوں کے سوا کوئی نہیں جا سکتا، تشریف لے جاتے ہیں، وہاں ایک مقصورہ ہے جس کا دروازہ مسجد کے منبر کے بائیں طرف ہے، یہ سلطان کے نماز کی جگہ ہے، جب سلطان تشریف لاتے ہیں تو اطلسی پردے چھوڑ دیے جاتے ہیں، اور کوئی شخص اُن کو دیکھ نہیں سکتا، خطیب نے جب سلطان کے مقصورہ کی طرف نگاہ اٹھا کر بڑے جوش سے یہ کہا کہ **اللّٰھُمَّ انصر مولانا السلطان السلطان الغازی عبدالحمید خاں** تو میرے بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے اور دیر تک دل کا یہ حال تھا کہ اُمڈ چلا آتا تھا، خطیب نے پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم کا نام پڑھا اور سلطان کا نام آیا تو ایک زینہ اتر آیا تاکہ ظاہر ہو کہ سلطان اگرچہ آج ظل اللہ ہی تاہم ان کا رُتبہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کچھ نسبت نہیں رکھتا، نماز کے بعد حسین حبیب آفندی نے اتفاقاً مجھ کو دیکھ لیا اور مسجد کے صحن میں جہاں پاشا اور سرداران فوج حلقہ باندھے کھڑے تھے، لے جا کر کھڑا کر دیا اور لوگوں سے کہہ دیا کہ ان سے کوئی تعرض نہ کرے، سلطان مقصورہ سے اُتر کر زینہ کے قریب پردہ کے اوٹ میں بیٹھے اور فوجیں سامنے سے گزرنی شروع ہوئیں، دو گھنٹہ کامل ایک عجیب تماشا نظر آتا رہا، قریباً دس ہزار فوج تھی، مختلف رسالے اور ہر رسالے کے تمام ساز و اسلحہ جدا جدا تھے، میں کیا کہوں، ترکی جوانوں کی دلیرانہ صورتیں، چمکتے ہوئے اسلحہ، موزوں اور باقاعدہ رفتار گھوڑوں کی جست و خیز، پاشاؤں کا زرکار لباس، چمکاتے ہوئے تمغے عجیب سماں تھا، جو کسی طرح بیان نہیں کیا جا سکتا، اخیر میں دونوں شہزادے آئے، بڑے کی عمر نو دس برس کی ہے، لیکن جس شان و شوکت سے وہ گھوڑے پر سوار تھا، بڑے بڑے دلیروں کے وہ تیور نہیں ہو سکتے، فوجیں گزر چکیں تو سلطان گاڑی پر سوار ہوئے اور ہمارے سامنے سے گذرے، سواری مقابل آئی تو تمام حلقہ نے رکوع کے قریب جھک کر سلام کیا، سلطان دونوں ہاتھوں سے ان کا جواب دیتے تھے، حالاں کہ یہ معمولی چیز ہے اور ہر جمعہ کو ہوتی ہے، عید کے دن کہتے ہیں کہ قیامت کا سماں ہوتا ہے، خدا وہ دن بھی دکھلائے۔

خدا نے یہ دن بھی ان کو دکھایا، اس دن سلاملق نہ تھی، اس وجہ سے فوج کی تعداد کم تھی،

لیکن شان وشوکت، جاہ وجلال، جوش واثر سلاملق سے بھی کچھ بڑھ کر تھا، قریباً ۸ بجے فوجوں کی آمد شروع ہوئی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک تانتا بندھا رہا، اُس کے بعد بہت سی خالی گاڑیاں آئیں، لوگوں کو تعجب تھا کہ ان سے کیا مقصد ہے، یکا یک دور سے پیادہ صفیں نمودار ہوئیں، معلوم ہوا کہ تمام وزرا پاشا افسرانِ فوج اور بڑے بڑے عہدہ دارانِ ملکی سلطان کے جلو میں پیادہ پا آرہے ہیں، یہ صفیں سڑک کے دونوں جانب متصل آدھ میل تک تھیں، ان کی وضع اور لباس سے عجیب شان وشوکت کا اظہار ہوتا تھا، شانوں پر زرّیں پھول، دامن اور آستینوں پر کلابتوں کی تحریر، سینے مرصع اور طلائی تمغوں سے ڈھکے ہوئے، ان سب پر آفتاب کا عکس تمام میدان جگمگا اٹھا، یہ صف جاچکی تو سلطان کا جمالِ جہاں آرا نظر آیا، گھوڑے پر سوار تھے، لباس بالکل سادہ تھا، چند بڑے بڑے فوجی افسر رکاب میں تھے، گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا تھا اور ہر قدم پر اس زور سے بادشاہم چوق یشا (زندہ باد) کا نعرہ بلند ہوتا تھا کہ تمام میدان گونج اٹھتا تھا"۔ (سفرنامہ روم ومصر وشام)

مولانا عید کا یہ سماں دیکھ کر واپس آئے تو ان کا دل شاعرانہ جذبات سے معمور تھا، چاہا کہ جو تماشا انہوں نے دیکھا ہے وہ دوسروں کو بھی دکھائیں، مثنوی عیدیہ کے نام سے یہ نظم ان کے سفرنامہ اور کلیات میں درج ہے، اسی مثنوی کے وہ چند شعر ہیں جو اوپر گزر چکے۔

مولانا کا یہ سفر خالص علمی اور تعلیمی مقصدوں کے لیے تھا، ویسے ہی تائید غیبی نے اُن کی عزت افزائی کا ایک ایسا سامان پیدا کر دیا جس کے حصول کی کوشش کیا وہم وگمان بھی کسی غیر ملک کے آدمی کو نہیں ہوسکتا تھا اور جس کے عطا میں اعتراف کمال کے سوا دینے والے کی کوئی سیاسی مصلحت بھی نہیں ہوسکتی۔

جنگ روم وروس کی وجہ سے شیر پلونا غازی عثمان پاشا کا نام ان دنوں بچہ بچہ کی زبان پر تھا، اور اس جنگ سے جو ۱۸۷۷ء میں ہوئی تھی، مولانا کو جو دلچسپی تھی اس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، اس لیے قسطنطنیہ پہنچ کر اس نامور ترکی سپہ سالار کی زیارت کا شوق ان کے دل میں قدرتی طور پر پیدا ہوا، یہی کشش ان کو غازی موصوف کے درِ دولت تک کھینچ لے گئی[1]۔

پہلی ملاقات کے بعد پاشائے موصوف نے مولانا سے دوسری ملاقات کی خواہش کی، مولانا

---

[1] اس ملاقات کا پورا حال سفرنامہ میں موجود ہے، مگر ایک واقعہ ایسا ہے جو صرف سینہ بہ سینہ حاصل ہے، مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ "غازی عثمان پاشا کی ملاقات کا ایک واقعہ خود مولانا نے مجھ سے بیان کیا تھا، ملاقات کے وقت جب ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں تھا، مولانا نے غازی سے درخواست کی کہ جس ہاتھ سے آپ نے کفار کو قتل کیا تھا اس کے چومنے کی اجازت دیجیے، پاشا نے کہا کہ آپ کا ہاتھ چومنے کے قابل ہے، جس نے علمی خدمات انجام دی ہیں اور یہ کہہ کر مولانا کا ہاتھ چوم لیا۔"

نے دوسری باران سے ملاقات کی تو وہ پہلے سے بھی زیادہ تپاک سے ملے اور کہا کہ جب یہاں سے جائیے گا تو مجھ سے مل لیجیے گا، اسی اثنا میں انہوں نے مولانا کے لیے سلطان سے ''تمغہ مجیدی'' کے عطا ہونے کی درخواست کی تھی اور وہ منظور ہوگئی تھی، لیکن مولانا کو خود اس کی خبر نہ تھی، ایک دن دوپہر کے وقت مولانا اپنے مکان میں سو رہے تھے کہ ان کے ایک دوست دوڑے ہوئے آئے اور مولانا کو جگا کر کہا" یا شبلی واللہ لقد طلع لك النیشان" مولانا کو اس پر کسی قدر تعجب ہوا، لیکن قرات خانہ میں جا کر اخبار دیکھے تو یہ خبر صحیح نکلی، دوسرے دن تمام احباب مبارک باد دینے آئے اور مولانا نے اس خوشی میں ایک مختصر سا جلسۂ دعوت ترتیب دیا، دعوت کی صبح کو مولانا عثمان پاشا کی ملاقات کو گئے تو سب سے پہلے دربان نے کہا ''تمغۂ مجیدی مبارک'' پاشائے موصوف نے بھی ملاقات کے ساتھ ہی مبارک باد دی، تمغہ سامنے میز پر رکھا ہوا تھا، بکس سے نکال کر پہلے انہوں نے آنکھوں سے لگایا، پھر مولانا کے حوالہ کیا، مولانا سروقد کھڑے ہوگئے اور سلطان کو دعا دی، رخصت کے وقت پاشائے موصوف نے مولانا کو اپنی عکسی تصویر بھی عنایت کی، تمغہ کے ساتھ ایک فرمان بھی عطا ہوا جو سفرنامہ میں نقل ہے۔

اس تمغہ اور فرمان کے ملنے کی تاریخ ۱۴ رمحرم ۱۳۱۰ھ ہے، مولانا نے ہندوستان پہنچ کر اس تمغہ کو استعمال کرنا چاہا، لیکن گورنمنٹ انگریزی نے اپنے ۲رمئی ۱۸۸۶ء کے قانون کے مطابق اس کی اجازت نہیں دی۔

قسطنطنیہ سے روانگی قسطنطنیہ میں مولانا قریب قریب تین مہینے تک رہے، ان تین مہینوں کا ہر روز کسی نہ کسی کتب خانہ یا کالج یا مدرسہ کے دیکھنے میں صرف ہوا، جس کے تفصیلی حالات سفرنامہ میں مذکور ہیں، یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں، اس سے فراغت ہوگئی تو یہاں سے طبیعت ایسی اچاٹ ہوئی کہ قسطنطنیہ میں ہر سال صفر کی آٹھویں رات کو جو سلطان کی تخت نشینی کی رات ہے، بڑی دھوم دھام سے جشن ہوتا ہے، لیکن مولانا اس کا بھی انتظار نہ کر سکے اور ۲۶ رمحرم ۱۳۱۰ھ کو چل کھڑے ہوئے۔

بیروت ساتویں دن بیروت پہنچے اور ایک ہفتہ تک بیروت میں مقیم رہے، بیروت میں قیام کی اصلی وجہ شیخ طاہر جزائری کی ملاقات کا شوق تھا، یہ شیخ رہنے والے تو شمالی افریقہ کے کسی ملک کے تھے، مگر زیادہ تر یہ مصر اور شام میں رہتے تھے، یہ زندہ کتب خانہ تھے، قلمی کتابوں اور کتب خانوں کی نادر کتابوں کے نام ان کی نوکِ زبان تھے، ان کی یادداشت (کناشہ) میں ہر کتاب خانہ کے نوادرات کے نام

درج تھے، توجیہ النظر وغیرہ ان کی تصنیفات ہیں۔

بیروت خود بھی اس وقت شام میں شامی عرب عیسائیوں کی جدید علمی و ادبی تحریکوں کا مرکز تھا، علمی انجمنیں، ادبی مجلسیں اور نئے علم وفن کے کالج، اچھے اچھے عربی مطبعے قائم تھے، جن سے عربی ادب کی عمدہ عمدہ کتابیں چھپ کر شائع ہو رہی تھیں اور ان ہی مطبعوں سے عربی اخبار اور رسالے نکل رہے تھے، اور عربی زبان میں نئے علوم اور نئے خیالات کے لیے الفاظ بن رہے تھے، مولانا نے ان سب پر غائر نظر ڈالی اور وہاں کی علمی ترقیوں سے پوری واقفیت حاصل کی، جس کا پورا مرقع سفر نامہ میں موجود ہے۔

بیت المقدس بیروت سے مولانا کے شامی دوست شیخ علی ظبیان اپنے والد کے اصرار سے دمشق چلے گئے اور مولانا نے ۸ر صفر ۱۳۱۰ھ کی شام کو بیت المقدس کی راہ لی اور وہاں پہنچ کر وہاں کے ہندوستانی زاویہ میں قیام کیا اور وہاں کی مقدس عمارتوں کی زیارت اور وہاں کے مفتی شہر سید طاہر اور دوسرے علما و فضلا سے ملاقاتیں کیں اور بعض مجلسوں میں علمی مسائل پر گفتگو کی، یہاں سے فارغ ہو کر مصر کا رُخ کیا اور اسکندریہ سے ریل پر بیٹھ کر قاہرہ پہنچے۔

قاہرہ قاہرہ میں مولانا نے مصر کے قدیم تعلیمی مرکز جامع ازہر میں رواق الشامیین کے ایک حجرہ میں قیام کیا اور وہاں ایک مہینہ سے زیادہ مقیم رہے، چوں کہ قاہرہ قدیم و جدید دونوں قسم کی تعلیم کا مرکز ہے، اس لیے مولانا نے یہاں کے نظامِ تعلیم کو نہایت غور سے دیکھا اور اُن کو نظر آیا کہ جس مصیبت کا ہندوستان میں رونا ہے وہی قسطنطنیہ، بیروت اور مصر میں بھی موجود ہے، یعنی نئی تعلیم میں قومیت اور مذہبی پابندی کا اثر کم ہے اور پرانی تعلیم اس قابل نہیں کہ دنیا کی موجودہ ضرورتوں کا ساتھ دے سکے۔

مولانا کو صرف ایک کالج جس کا نام دار العلوم تھا، نظر آیا جو مولانا کے خیال میں دونوں ڈانڈوں کو ملانا چاہتا تھا، اگرچہ افسوس ہے کہ ابھی پورے طور کامیاب نہیں ہوا تھا، دار العلوم کے علاوہ مولانا نے متعدد مدرسے اور کالج مثلاً مدرسۃ الحقوق، مدرسۃ الترجمہ، مدرسۃ الطب وغیرہ دیکھے اور ان کے متعلق مفید و مستند معلومات حاصل کیں۔

مصر میں سب سے زیادہ مولانا کی دلچسپی کی جو چیز تھی، وہ جامع ازہر تھا، مولانا نے اسی میں قیام کیا تھا لیکن دورانِ قیام میں وہ جس نتیجہ پر پہنچے، اُس کا اظہار انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے "مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامع ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا، کسی چیز سے نہیں ہوا"

ایک ایسا دارالعلوم جس میں دنیا کے ہر حصہ کے مسلمان جمع ہوں جس کا سالانہ خرچ دو تین لاکھ سے کم نہ ہو، جس کے طالب علموں کی تعداد ۱۲ ہزار سے متجاوز ہو، اس کی تعلیم وتربیت سے کیا کچھ امید نہیں ہوسکتی تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کر چکا ہے اور کرتا جاتا ہے، تربیت ومعاشرت کا جو طریقہ ہے اور جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں، اس سے حوصلہ مندی، بلند نظری، جوش، ہمت غرض تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے، میں نے یہاں ایسے طلبہ دیکھے جن کے عزیز اور نہایت قریب عزیز (چچا ماموں وغیرہ) خود اسی شہر میں بڑے بڑے معزز عہدوں پر ہیں اور ان کی تمام ضروریات کے متکفل بھی ہیں، تاہم چوں کہ طلبہ از ہر میں رہتے ہیں، اس لیے ان کو عام بازار میں ہاتھ پھیلا کر روٹیاں لینے میں ذرا شرم نہیں آتی، طالب علموں کی دنائت اور پست حوصلگی کا یہ حال ہے کہ بازار میں پیسے کی ترکاری خریدتے ہیں تو کنجڑے کو قسم دلاتے جاتے ہیں کہ براس سیدنا الحسین یعنی تجھ کو امام حسینؓ کے سر کی قسم واجبی قیمت بتانا، کیا اس قسم کے تربیت یافتہ لوگوں سے یہ امید ہوسکتی ہے کہ وہ اسلام کی عظمت و شان بڑھائیں گے، ہمارے ملک میں اس قسم کے جو مدرسے ہیں، از ہر ان سے بھی گیا گزرا ہے، اس سے زیادہ افسوس تعلیم کی ابتری کا ہے، یہاں مستقل اور اصلی طور پر صرف فقہ اور نحو کی تعلیم ہوتی ہے اور دونوں کے لیے آٹھ آٹھ برس مقرر ہیں، منطق، فلسفہ، ریاضی اور دیگر علوم عقلیہ تو گویا درس میں داخل نہیں، اصولِ فقہ، تفسیر، حدیث، ادب، معانی و بیان کی تعلیم ہے، لیکن اس قدر کم ہے کہ اتنے بڑے دارالعلم کے کسی طرح شایانِ شان نہیں'' مدارس کے ساتھ مولانا کا ایک بڑا مطمحِ نظر کتب خانے تھے، مصر میں سب سے بڑا کتب خانہ خدیو یہ تھا، جو اب کتب خانہ مصریہ کہلاتا ہے، مولانا نے اس کو جا کر دیکھا اور فیصلہ کیا کہ ''ترتیب وخوش اسلوبی، زیب وزینت، حسنِ انتظام، خوبی عمارت میں قسطنطنیہ کے تمام کتب خانوں سے بہتر ہے'' اس وقت اس کتب خانہ میں ہر علم وفن کی چودہ ہزار سات سو پانچ عربی کتابیں موجود تھیں، (اب تو اس کی تعداد اس سے دوگنی سے بھی زیادہ ہوگئی ہے) مولانا نے اس کتب خانہ کو بڑی تفصیل سے دیکھا، اور ہر علم وفن کے نوادر کتب کی ایک فہرست مرتب کی، جو ان کے سفرنامہ میں موجود ہے، تاریخ وادب جن نادر کتابوں کو مولانا نے اس وقت چنا تھا ان میں سے اکثر آج کل چھپ چکی ہیں، البتہ تفسیر اور حدیث کی جن کتابوں کے نام لیے ہیں، ان میں سے اکثر اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔

مدارس اور کتب خانوں کے ساتھ مولانا نے مطابع، اخبارات، انجمن، کلب اور مصر کے عجائبات

وغیرہ دیکھے، مصر میں قدیم وجدید تعلیم ساتھ ساتھ جاری تھی اور دونوں تعلیم کے اکابر وہاں موجود تھے، مولانا اس موقع کو غنیمت جان کر دونوں سے ملے، نئے تعلیم یافتوں میں سے علی پاشا مبارک، علی پاشا ابراہیم، امین بک فکری اور احمد زکی سے اور پرانے تعلیم یافتوں میں سے شیخ حمزہ فتح اللہ اور شیخ محمد عبدہ، سے خاص طور پر ملے اور اُن سے عربی تعلیم اور عربی مدارس کے نظام پر گفتگو کی۔

مصر میں عربی زبان پر جو نئے انقلابات آئے اور نئے خیالات، نئی چیزوں اور نئی باتوں کے لیے جو نئے عربی لفظ بن گئے تھے، یہاں مولانا کو ان کی واقفیت کا پورا موقع ملا، اور غالباً ہندوستان کی عربی دنیا میں عربی کے نئے نئے الفاظ کی واقفیت کا پہلا براہِ راست ذریعہ مولانا ہی کی ذات تھی، مولانا نے اپنے سفر نامہ کے آخر میں بہت سے نئے الفاظ کی فہرست شامل کر دی ہے۔

صحت پر عمدہ اثر مولانا کے اس سفر کی ایک ضمنی غرض صحت کی بحالی تھی، بحمد اللہ کہ اس سفر میں یہ غرض بھی پوری ہوئی، مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ ”میں نے دیکھا کہ مراجعت کے بعد وہ خوب تن درست تھے، ایسی تن درستی پھر ان کو نصیب نہیں ہوئی[1]۔

واپسی اور سفر کے تاثرات اور نتائج مولانا کا یہ علمی سفر مصر میں تمام ہو گیا، وہ وہاں سے سیدھے ہندوستان تشریف لائے اخیر اپریل ۱۸۹۲ء سے ان کا سفر شروع ہوا تھا اور اسی سال کے شروع نومبر میں ختم ہوا، ان چھ مہینوں میں دنیائے اسلام کے ان ممتاز حصوں کو دیکھ کر جن کو اسلام کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے، مولانا کے حساس دل کو اسلام کی گزشتہ علمی یادگاروں کو دیکھ کر جہاں مسرت ہوئی، وہیں مسلمانوں کی موجودہ پست حالت کو دیکھ کر ان کو بڑا رنج ہوا، قسطنطنیہ میں مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر مولانا نے اپنے والد ماجد کو لکھا ”اگرچہ میری امیدیں مسلمانوں کی ترقی وقوت کی نسبت بالکل برباد ہو گئی ہیں، کیوں کہ یہاں کی حالت وہاں سے کچھ اچھی نہیں تاہم سفر بے شبہ ضروری تھا، جو اثر اس سفر سے میرے دل پر ہوا وہ ہزار کتابوں کے مطالعہ سے نہیں ہو سکتا، افسوس ہے ان لوگوں پر جن کی تمام عمر ایک مختصر سی چار دیواری میں بسر ہو جاتی ہے۔“

ان فقروں سے اندازہ ہو گا کہ کیا چیز ان کو ہندوستان سے کھینچ کر اس بحر و بر اور دشت وجبل میں لے گئی تھی، اُن کے نزدیک مسلمانوں کی ترقی کے لیے سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ مسلمانوں کی تعلیم کا ایسا

---

[1] مضمون انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ، ۱۷ رجنوری ۱۹۱۵ء۔

نصاب ترتیب دیا جائے جس میں ایک طرف یورپ کے تمام جدید علوم وفنون کی تعلیم ہو اور دوسری طرف خالص اسلامی علوم کی اور طریقۂ تربیت اور درس گاہوں کا ماحول تمام تر مذہبی ہو، اگر ساری قوم کی تعلیم کا یہ بندوبست نہ ہو تو کم از کم عربی درس گاہوں میں ایسی اصلاح کی جائے کہ یونان کے بوسیدہ علوم کا سارا دفتر ہٹ کر اس کی جگہ نئے علوم وفنون کی تعلیم لے لے اور خالص مذہبی علوم اپنی جگہ پر رہیں، اور نصاب میں متاخرین کی شروح وحواشی کے بدلے قدما کی اصلی کتابیں جوفن کی جان ہیں پڑھائی جائیں، درس گاہیں عالیشان، رہنے کے کمرے صاف ستھرے اور ترتیب ایسی ہو کہ طلبہ میں اولوالعزمی، حوصلہ مندی، بلند نظری اور خودداری پیدا ہو، لیکن یہ چیز ان کو نہ قسطنطنیہ میں ملی نہ شام میں اور نہ مصر میں، سفرنامہ میں لکھتے ہیں: ''اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کردیتا تھا وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی...... ہندوستان میں تو اس خیال سے صبر آجاتا تھا کہ جو چیز گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں نہ ہو، اس کی بے سروسامانی قدرتی بات ہے، لیکن قسطنطنیہ، شام اور مصر میں یہ حالت دیکھ کر سخت رنج ہوتا تھا۔ (ص ۸۷)

مولانا کا یہی احساس تھا جو ندوۃ العلما کے قیام کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلما کے نظام ودستور العمل کی شکل میں ظاہر ہوا، جس نے دارالعلوم کا یہ مرقع (مسودہ) جس کو سیاحِ روم وشام نے اپنے قلم سے کھینچا ہے، دیکھا ہے، اُس کو نظر آئے گا کہ روم وشام میں جو کچھ محسوس ہوا ہے، اس کی تصویر ہندوستان میں کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا نے اپنے سفرنامہ کے شروع میں اپنے اس سفر پر خود تبصرہ کیا ہے، جس سے بہتر تبصرہ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا، فرماتے ہیں: ''ٹرکی کے سفر سے جو اثر میرے دل پر ہوا، اس کا یہاں ظاہر کرنا چنداں ضروری نہیں، اس سفرنامہ کے پڑھنے سے خود اس کا پتہ لگ سکتا ہے، البتہ اس قدر کہنا ضرور ہے کہ سلطنت کی حیثیت سے اگر قطع نظر کی جائے تو مسلمانوں کی حالت وہاں بھی کچھ زیادہ مسرت اور اطمینان کے قابل نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بہت سی باتوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے قریب قریب ہے، صنعت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں، تجارت میں ان کا بہت کم حصہ ہے، معمولی دوکاندار تک یہودی یا عیسائی ہیں، پرانی تعلیم نہایت ابتر ہے اور ہوتی جاتی ہے، نئی تعلیم کے متعلق جو شکایت یہاں ہے، وہاں بھی ہے، پرانی تہذیب اور نئی تہذیب میں ابھی تک رقابت ہے اور دونوں سے مل کر کوئی مرکب مزاج پیدا نہیں ہوا ہے، پرانے خیال والے ابھی تک زمانہ کی رفتار سے بے خبر ہیں، نئے مذاق کے لوگ جس قدر کہتے ہیں، کرتے نہیں، ہمت،

غیرت، جوش، عزم، استقلال کے بہ جائے کل قوم پر (من حیث الاغلب) افسردگی سی چھائی ہوئی ہے، جو شخص جس حال میں ہے، اسی پر قانع ہے، موجودہ حالت تو یہ ہے لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا۔"

کالج میں خیر مقدم کالج کے ایک پروفیسر کا اپنی نوعیت کا یہ پہلا سفر تھا، اس لیے جب مولانا ہندوستان واپس آ کر کالج میں پہنچے تو واپسیِ سفر کی مبارک باد میں متعدد جلسے منعقد ہوئے، سب سے پہلے ۱۲ر نومبر ۱۸۹۲ء کی شام کو اسکول اسٹاف کی طرف سے مولانا کو ایک دعوت دی گئی، جس میں سرسید اور کالج کے پروفیسر بھی شریک تھے، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مولوی بہادر علی صاحب ایم اے نے ایک مختصر تقریر میں مولانا کے دور دراز سفر سے بخیریت واپس آنے کا شکرانہ ادا کیا اور مولانا کے علوئے ہمت اور سفر کی تکالیف کی ہنسی خوشی برداشت کی تعریف کی اور اُن کے ان احسانات کا ذکر کیا جو اُن کی تحقیقاتِ علمی سے قوم اور قومی کالج کے لیے متصور تھے، اور آخر میں مولانا کو "تمغۂ مجیدی" ملنے پر مبارکباد دی، ان کے بعد چودھری خوشی محمد خاں ناظر نے جو اُن دنوں وہاں فورتھ ایر کلاس میں پڑھ رہے تھے، مندرجہ ذیل نظم پڑھی:

باز وقتِ گرمیِ بزمِ سخن آید ہمی ۔۔۔ بلبلِ گم گشتہ در صحنِ چمن آید ہمی
زینتِ ہر بزم و زیبِ انجمن آید ہمی ۔۔۔ آں ادیب و شاعر و دستور ین آید ہمی
مورخ

واپس آئے سیرِ روم و شام، مصر و زنگ سے ۔۔۔ آشیاں بلبل کو لایا سینکڑوں فرسنگ سے
ہند سے جب روم کو بستر اٹھا کر چل دیے ۔۔۔ تپ کی شدت تھی مگر کونین کھا کر چل دیے
پنجۂ احباب سے دامن چھڑا کر چل دیے ۔۔۔ ایک فقرے سے ہمیں ڈھارس بندھا کر چل دیے
ہر چہ بادا باد من کشتی در آب انداختم ۔۔۔ خانہ بر موجِ سمندر چوں حباب انداختم

اس کے بعد ۶ر دسمبر ۱۸۹۲ء کو کالج اسٹاف کی طرف سے مولانا کو ایک شان دار ڈنر دیا گیا جس میں مولانا نے ایک ترکیب بند پڑھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:

قاصدِ خوش خبر امروز نوا ساز آمد ۔۔۔ کز سفر یارِ سفر کردۂ ما باز آمد
از سفر شبلی آزادہ بہ کالج بہ رسید ۔۔۔ یا مگر بلبلِ شیراز بشیراز آمد
دوستاں مژدہ کہ آں بلبلِ خویش لہجہ دگر ۔۔۔ اندریں تازہ چمن زمزمہ پرداز آمد
رفت ہر چند بسے بے سرو ساماں اما ۔۔۔ شکرِ ایزد کہ بایں برگ و بایں ساز آمد

پورا قصیدہ کلیات میں موجود ہے۔

سفر نامہ، کلیات اور رسائل

۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۷ء تک

سفر نامہ اس سفر سے واپسی کے بعد احباب کا تقاضا ہوا کہ سفر کی سوغات لائیے، یعنی سفر نامہ لکھیے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دورانِ سفر میں تو مولانا کو یہ خیال تھا کہ وہ اپنا سفر نامہ ترتیب دیں گے، چنانچہ ۲۵ر مئی ۱۸۹۲ء کو ایک خط میں سرسید کو لکھتے ہیں ''حالات دلچسپ ہیں اور سفر نامہ کے لیے بہت سامان مل جائے گا'' (سرسید-۱) لیکن واپسی کے بعد مولانا نے احباب کے اصرار کے باوجود اس خیال کو ترک کر دیا، ۲۴ر اکتوبر ۱۸۹۲ء کو اپنے بھائی مولوی اسحاق کو لکھتے ہیں ''سفر نامہ کے لیے عام اصرار ہے اور تمام اطراف سے مانگ آنی شروع ہوگئی ہے، لیکن میرا ارادہ اب تک لکھنے کا نہیں ہے، جس کے متعدد اسباب ہیں'' (اسحاق-۴) مولانا نے ان احباب کی تشریح نہیں کی، لیکن ان متعدد اسباب میں سے صرف ایک سبب کا ذکر سفر نامہ کے شروع میں کیا ہے، یعنی یہ کہ سفر نامہ کے لیے جس قسم کی اطلاعیں لازمی اور ضروری ہیں یعنی ملک کی حالت، انتظام کا طریقہ، عدالت کے اصول، تجارت کی کیفیت، عمارتوں کے نقشے، ان میں سے ایک چیز بھی اس سفر نامہ میں نہیں، البتہ معاشرت اور علمی حالت کے متعلق معتد بہ واقعات ہیں، اگر چہ وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ نہیں، جس قدر ہونے چاہئیں، غرض جو شخص سفر نامہ کو سفر نامہ کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے وہ اس کتاب سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتا، البتہ جن لوگوں کو اسلامی ممالک کے معمولی واقعات میں بھی مزہ آتا ہے، ان کی دعوت میں یہ ماحضر پیش ہے۔

لیکن ان اسباب میں سے جو اصلی سبب تھا، اس پر اب بھی پردہ پڑا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۷۷ء کی جنگ روم وروس کے زمانہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی دلچسپی ٹرکی کے ساتھ بڑھ رہی تھی، حالاں کہ اس جنگ میں انگریزوں نے ترکوں کا ساتھ دیا تھا اور انہی کے اشارے سے ہندوستان کے مسلمانوں نے ٹرکی کے لیے چندے کیے تھے اور بڑا جوش پھیلا تھا پھر بھی انگریزوں کو ہندوستانی مسلمانوں کی ٹرکی کے ساتھ یہ عقیدت دل سے پسند نہ آئی، اس کے بعد ۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی جنگ ہوئی جس میں انگریزوں کی ہمدردی سراسر یونانیوں کے ساتھ تھی، مگر کامیابی ترکوں کو نصیب ہوئی، اس کامیابی سے ہندوستان کے مسلمانوں کو غیر معمولی خوشی ہوئی، اور تمام ہندوستان میں دھوم دھام سے اس کی خوشی منائی

گئی، جس کے معنی یہ تھے کہ انگریزوں کا منہ چڑھایا گیا، اسی لیے سرسید نے جو ہر حال میں انگریزوں کو راضی رکھنا چاہتے تھے، مسلمانوں کی اس حرکت سے بہت ناراض ہوئے اور اس کے خلاف بہت سخت مضمون لکھا اور اس کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کے دلوں سے ٹرکی کی یہ عقیدت جاتی رہے اور اتحادِ اسلامی کی جو تحریک جڑ پکڑ رہی ہے وہ کم زور پڑ جائے۔

مولانا کا ٹرکی کا سفر خواہ کتنے ہی علمی پردہ میں چھپا ہو، پھر بھی اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ ہندوستان اور ٹرکی کے درمیان تعلقات کی پہلی کڑی تھی اور مولانا اسلامی ہندوستان کے پہلے سفیر تھے جو ٹرکی گئے۔

قسطنطنیہ کے قیام کے زمانہ میں اپنے جوش وخروش کو پوری طرح دبانے کے باوجود وہ شیر پلونا جنرل عثمان پاشا تک پہنچ ہی گئے، اور وہاں سے ''تمغہ مجیدی'' کا تحفہ ہندوستان لائے، اس واقعہ نے اندر ہی اندر انگریزی حکومت کے اربابِ بست وکشاد کو چراغ پا کر دیا، اب جب مولانا واپس آئے تو اسلامی ہندوستان کے سیاسی مصلحت شناسوں کے حق میں یہ سمجھا گیا کہ معلوم نہیں اس سفر نامہ میں کیا کیا زہر ہو اور اس کا اثر کالج کی زندگی پر جو ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی، کیسا پڑے۔

بہر حال جب یہ طے ہو گیا کہ اس سفر نامہ میں شہد ہی شہد رہے گا، کوئی زہریلی چیز نہ ہوگی، تو اس کے لکھنے کی اجازت ملی اور لکھا گیا، ۲۶ ؍مارچ ۱۸۹۳ء کو لکھتے ہیں ''میں آج کل محدود رہا، پھر بھی یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اس سفر نامہ نے مسلمانوں کے دلوں میں ٹرکی کی محبت کا نیا بیج نہیں بو دیا'' اور اسی لیے انگریزوں نے مولانا کے اس گناہ کو کبھی معاف نہیں کیا، جس کی تفصیل آگے کہیں آئے گی۔

مولانا کو خیال تھا کہ اس ادھ کٹے سفر نامہ سے لوگوں کو پوری دلچسپی نہیں ہوگی، اسی لیے اس کی مقبولیت کی طرف سے دل میں شبہ تھا، ۱۱ ؍اپریل ۱۸۹۲ء کو لکھتے ہیں ''معلوم نہیں اس سفر نامہ سے ملک کو کہاں تک دلچسپی ہوگی، اس کا اندازہ ہوتا تو اسی حساب سے جلدیں چھپتیں[1]'' اب تک مولانا کی ساری تصنیفات کالج نے اپنی طرف سے چھپوائی تھیں، مگر یہ سفر نامہ ان احتیاطوں کے باوجود بھی شاید اس بارگاہ میں پسندیدہ نہیں ٹھہرا، اس کا پہلا اڈیشن مفید عام آگرہ میں جو اس زمانہ کا اچھا مطبع تھا، ۱۸۹۴ء میں چھپا، مہدی افادی مرحوم کے ایک خط کے جواب میں ۲۷ ؍اکتوبر ۱۸۹۴ء کو لکھتے ہیں ''سفر نامہ میرے ہاں سے ملتا ہے، مگر میں آج سفر میں تھا، اب علی گڑھ پہنچا ہوں، لیکن سردست اس کی جلدیں یہاں نہیں رہیں، آگرہ کو لکھا

---

[1] سمیع ۳۵۔

ہے کہ جس وقت کتابیں آئیں گی، فوراً تعمیل ارشاد ہوگی، آپ تار وار نہ بھیجیں"۔ (مہدی افادی-۲) یہی وہ کتاب ہے جس سے کالج اور مولانا کی تصنیفات میں ھٰذا فراق بینی و بینك کا اصول جاری ہوا اور ع من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی کی پرانی شریعت منسوخ ہوئی۔

کلیاتِ فارسی ۱۸۹۳ء ابھی اس زمانہ کو کچھ زیادہ نہیں گزرے تھے، جب فارسی کا ایک دیوان اس عہد کے اہلِ ذوق کے سلسلۂ تصنیفات کی پہلی کڑی ہوئی تھی، اسی لیے مولانا کو اپنی فارسی نظموں کے جمع اور طبع کرنے کا خیال بہت دنوں سے تھا، مگر چوں کہ طبیعت میں ابھی جھجھک باقی تھی، اس لیے چاہا کہ سارا کلام استاد کی نظر سے گزر جائے، کالج میں جانے کے دوسرے ہی سال ۲۷/ مارچ ۱۸۸۴ء کو اپنے ایک عزیز کو لکھا "میں نے حضرت مولوی فاروق صاحب سے عرض کیا تھا کہ میرا فارسی کلام کس قدر چھاپا جائے گا، اس واسطے اگر آپ اُسے دیکھ لیں تو بہتر ہے، حضرت موصوف نے منظور فرمالیا ہے، میرے پاس جو کلام ہے میں بھیج دوں گا، مگر فارسی کے نامے اور غزلیں وغیرہ جو تمہارے پاس ہیں، نہایت جلد مولانا کے پاس اس نشان سے بھیج دو، بلیا، "عدالت منصفی"۔ مولانا کی شاعری کی تاریخ بہت پرانی ہے، وہ شروع میں فارسی میں شعر کہتے تھے، ان کے کلام کا ابتدائی حصہ ایک بیاض میں جمع تھا، مولانا نے غازی پور میں ایک جلد ساز کو وہ بیاض جلد باندھنے کو دی تھی، اور وہ وہاں سے غائب ہوگئی، لوگوں کو غازی پور کے ایک نوجوان فارسی شاعر ابوالقاسم عرشی مرحوم پر شبہ تھا، جو بعد کو حیدر آباد میں شعرا کے سلسلہ میں منسلک ہوگئے تھے، اور جوانی ہی میں وفات پائی، لوگ کہتے تھے کہ وہ انہی نظموں کو حیدر آباد میں اپنے نام سے سناتے پھرتے تھے[1]۔

پھر اسی قسم کا واقعہ ۱۸۸۷ء میں پیش آیا اور کسی نے مولانا کی بیاض کے آدھے حصہ پر ڈاکہ ڈالا، ۱۷/ جولائی ۱۸۸۷ء کو ایک عزیز کو لکھتے ہیں "میری بیاض کا تقریباً آدھا حصہ چوری ہوگیا، نہایت افسوس ہے"۔ (سمیع-۴۴) مولانا نے کالج میں آکر جو قصائد لکھے اور خصوصیت کے ساتھ سفرِ روم میں جو نظمیں لکھیں، اُس نے فارسی کے اہلِ ذوق میں آگ سی لگادی، اردو میں نئی شاعری کی بنیاد خواہ مولانا حالیؔ نے ڈالی ہو یا شمس العلما آزاد نے، مگر ہندوستان میں فارسی زبان میں نئی شاعری کی بنیاد بلاشبہ مولانا شبلی نے ڈالی اور اُس میں نئے خیالات، قومی احساسات اور مذہبی جذبات کا ایسا زور بھرا کہ صرف زبان کی چاشنی اور محاوروں کی صحت کے نشہ کی جگہ جیسا کہ اب تک وہ تھی، مسلمانوں کی قومی زندگی کے لیے آبِ حیات بن گئی۔

---

[1] یہ روایت میں نے جناب خواجہ سید رشید الدین صاحب (برادر نسبتی نواب سید علی حسن خاں) سے سنی جو مولانا کے پرانے دوست ہیں۔

مولانا کے دوست نواب سید علی حسن خاں صاحب نے جو خود بھی فارسی کے شاعر اور اس زبان کے جوہری تھے، مولانا کو لکھا کہ "وہ ان انمول موتیوں کا ہار اہل نظر کے بازار میں پیش کرنا چاہتے ہیں، یعنی وہ خود اس کو چھپوانا چاہتے ہیں" مولانا نے یہ سمجھ کر کہ شاید وہ اس طرح میری امداد کرنا چاہتے ہیں، ان کے اس خط کا برا مانا اور ان کو لکھا کہ "ہم لوگ اتنے سستے داموں نہیں بکتے" نواب صاحب نے دوبارہ لکھا کہ مقصود یہ نہیں ہے، بلکہ آپ کی متفرق نظموں کے جمع اور طبع کرنے کی تحریک کرتا ہوں[1]، مولانا نے ان کی اس تجویز کو پسند کیا، نواب صاحب نے ان کے کلام کا جو حصہ جمع کیا تھا، ان کے پاس بھیج دیا، کچھ اخباروں سے جمع ہوا، اپنے وطن میں ایک عزیز شاگرد کو ۲۶ / مارچ ۱۸۹۳ء کو یہ لکھا "میرا مجموعۂ نظم فارسی مطبع میں چھپنے کے لیے گیا اور امید ہے کہ جلد تیار ہو جائے" اخبار کے پرانے فائلوں اور بعض اور طریقوں سے جہاں تک ہو سکا، اشعار جمع کیے گئے، جس کے محرک بلکہ جامع نواب سید علی حسن خاں فرزند نواب صدیق حسن خاں مرحوم ہیں۔

میاں مہدی کے واپس آنے پر میں نے مشن اسکول کے جلسہ کے لیے ایک نظم لکھی تھی "آمدہ" اس کی ردیف ہے، اگر تم اس کو بہم پہنچا کر بھیج دو تو وہ بھی چھپ جائے، تمہارے ذریعہ سے اگر اس مجموعہ میں کچھ اضافہ ہو سکتا ہو تو اٹھا نہ رکھو، لیکن اس کے ساتھ جلدی شرط ہے، کیوں کہ عید تک چھپ کر شائع ہو جانا مقصود ہے" (سیج-۴۴) مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس سے کچھ سرمایہ نہیں نکلا، آمدہ والی نظم بھی دیوان میں شامل نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم بھی نہ مل سکی، مہدی مرحوم اکتوبر ۱۸۸۵ء میں ولایت گئے تھے، اسی لیے اسی زمانہ میں یہ نظم کہی گئی تھی[2]۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے قصداً اپنے کلام کا انتخاب بڑی بے دردی سے کیا اور صرف وہی نظمیں اور غزلوں کے وہی شعر لیے جو ان کے انتخاب میں آئے، جیسا کہ دیوان کے حصۂ تشبیب وغزل کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ "چہ کنم" والی غزل کے بھی دو ہی ایک شعر لیے،

---

[1] بہ روایت جناب خواجہ سید رشید الدین صاحب [2] اس نظم کے دو شعر مہدی مرحوم کی تعلیم کے سلسلہ میں اوپر لکھے گئے ہیں:

خار در دیدہ عدو شکنی حاسداں راج گر گداز آئی

ما بہ نا دیدہ در رہت باشیم کہ تو ناگہ ز در فراز آئی

عجب نہیں کہ اسی نظم کے چند اشعار کو خفیف ردوبدل کے ساتھ عطیہ فیضی بیگم کے سفر یورپ کے موقع پر ان کو لکھ کر بھیجے تھے جو خطوط شبلی میں موجود ہیں۔

اور خود دانسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ان کی چھپی ہوئی بعض نظمیں اس میں جگہ پا سکیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مدحیہ نظمیں جو صرف کالج کے خیال سے بعض امرا کے خیر مقدم یا مرثیہ میں لکھیں وہ چوں کہ طبعِ غیور پر بار تھیں، اس لیے ان کو بقائے دوام کا خلعت پہنانا نہ چاہا۔

بہر حال اس قطع و برید کے بعد ایک مختصر سا مجموعہ ''نظمِ شبلی'' مرتب ہوا، اور منشی رحمت اللہ صاحب رعدؔ کے نامی پریس سے جو اُن دنوں اپنی صفائی اور چھپائی کے حسن و خوبی میں ممتاز تھا، بڑے اہتمام سے چھپا اور اہلِ ذوق میں مقبول ہوا۔

رسائلِ شبلی ۱۸۹۲ء سے لے کر ۱۸۹۸ء تک مولانا کے قلم سے بہت سے محققانہ تاریخی مضامین نکلے اور ملک کے مشہور رسالوں میں چھپے، یہ مضامین زیادہ تر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن سے متعلق تھے، ان میں یا تو اسلام کے آئینہ سے اس گرد و غبار کو صاف کیا گیا ہے، جو یورپین تعصب کی آندھی نے اس پر ڈالا تھا یا مسلمانوں کے عہدِ زرّیں کے مرقع کی کوئی پرانی تصویر جو نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی، دوبارہ منظرِ عام پر لائی گئی ہے۔

یورپ نے تمام علمی دنیا میں یہ مشہور کر رکھا تھا کہ مسلمان اتنے وحشی اور جاہل تھے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں انہوں نے مصر اور اسکندریہ فتح کیا تو وہاں کے مشہور یونانی کتب خانہ کو جو بطلیموسیوں کے زمانہ سے وہاں قائم تھا، جلا کر خاک کر دیا اور دنیا گزشتہ انسانی دماغوں کے معلومات سے محروم رہ گئی، مولانا نے اس کی تردید میں ۱۸۹۲ء میں کتب خانہ اسکندریہ پر مضمون لکھا اور ثابت کیا کہ یہ مسلمانوں سے صدیوں پہلے برباد ہو چکا تھا اور مسلمانوں کے فتح مصر کے زمانہ میں اس کا وجود بھی نہ تھا، اس لیے یہ مسلمانوں پر سراسر افترا ہے اور اس افترا کا بانی چھٹی صدی ہجری کا ایک عیسائی مورخ ابوالفرج ملطی ہے، اس مضمون کے ساتھ مسٹر کریل وغیرہ بعض یوروپین مستشرقوں کے مضامین بھی ضمیمہ کے طور پر شایع ہوئے جن میں مسلمانوں کے سر سے اس الزام کی تردید کی گئی تھی، یہ مضمون اتنا جامع اور مدلل تھا کہ مخالفین تک کو بھی اس کے ماننے سے چارہ نہ رہا، اس مضمون کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی ہوا۔

مولانا کے اس مضمون کے بعد سے خود یورپ کے عیسائی فاضلوں نے اس الزام کی تردید میں بہت سے فاضلانہ مضامین لکھے ہیں، جن میں اکثر کے ترجمے الندوہ لکھنؤ، معارف اعظم گڑھ، اردو حیدرآباد وغیرہ میں شایع ہو چکے ہیں اور اب کوئی لکھا پڑھا آدمی اس الزام کو نہیں دُہراتا۔

اسی سال ۱۸۹۲ء میں حیدرآباد دکن کے مشہور علمی رسالہ ''حسن'' میں اسلامی کتب خانوں کی تاریخ پر مولانا کا محققانہ مضمون شایع ہوا اور معلوم ہوا کہ دنیا کے کس کس حصہ میں مسلمانوں نے علم وفن کی کتنی دولت جمع کی تھی، رسالہ کے دستور کے مطابق مولانا کو اس مضمون پر ایک اشرفی انعام ملی۔

۱۸۹۴ء میں علی گڑھ میگزین کی ایڈیٹری کی ذمہ داری جو مولانا کے سر ڈالی گئی اس سے مجبور ہو کر بھی مولانا کو اس زمانہ میں متعدد مضامین لکھنے پڑے، جن میں ایک ''اسلامی حکومتیں اور شفاخانہ'' والا مضمون ہے، جو جولائی ۱۸۹۵ء کے میگزین میں چھپا اور اسلامی سلطنتوں کے تمدنی شعبوں کے سلسلہ کا ایک حلقہ بنا۔

مسلمان بادشاہوں پر بڑا الزام تھا کہ انہوں نے اپنی غیر مسلم رعایا پر جزیہ کا ظالمانہ ٹیکس لگا کر بڑی توہین کی، ہندوستان کی تاریخوں میں بھی اُس کو بار بار دہرایا گیا ہے، تاکہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت بیٹھ جائے، مولانا نے رسالہ ''الجزیہ'' لکھ کر اس خوبی سے اس کی حقیقت واضح کی کہ علمی دنیا پر اس تحقیق سے حیرت چھا گئی، سرسید نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا اور خود مولانا نے اپنے قلم سے اس کا عربی میں ترجمہ کیا، اس طرح مشرق ومغرب دنیا کے دونوں حصوں میں یہ آواز پھیل گئی، یہاں تک کہ مصر کے مشہور اخباروں، رسالوں اور تصنیفوں میں اس کے خلاصے اور اقتباسات چھپے۔

۱۸۹۶ء کے شروع میں ٹرکی کے صوبہ آرمینیا میں بغاوت ہوئی، تو ترکوں نے اس کو بزور دبایا، اس پر یورپ کے اخباروں نے ایک طوفان برپا کر دیا کہ اسلام نے ہمیشہ اپنی غیر مسلم رعایا پر ایسا ہی ظلم کیا ہے، مولانا نے اس سلسلہ میں مسئلۂ آرمینیا پر ایک سیاسی مضمون ۲۱ رفروری ۱۸۹۶ء کے اخبار ''آزاد'' لکھنؤ میں چھپوایا جس میں ترکوں کے عدل وانصاف اور آرمینیا کے مسئلہ کی حقیقت ظاہر کی، ساتھ ہی اس عنوان پر کہ ''اسلام کے قانون میں ذمی (غیر مسلم) رعایا کے کیا حقوق ہیں''، ایک نہایت مفصل مضمون لکھا جو علی گڑھ میگزین کے مارچ اور اپریل ۱۸۹۶ء کے پرچوں میں چھپا اور شوق سے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

الغرض ۱۸۹۷ء تک اس قسم کے اہم مضامین کا ایک مجموعہ فراہم ہوا اور رسائل شبلی کے نام سے ملک میں شایع ہوا، مولانا کے قلم سے یکم فروری ۱۸۹۸ء کا لکھا ہوا، مقدمہ اس میں لگا ہوا ہے، جس سے یہ معلوم ہوگا کہ ان مضامین کے لکھنے کا کیا باعث ہوا، فرماتے:

''مسلمانوں کے اگلے کارناموں کا غلغلہ سب سے پہلے اس گروہ نے بلند کیا جو آج نیا گروہ

کہلاتا ہے، اگر چہ اس مقصد کے لیے ان بزرگوں کو تاریخی تحقیقات سے بالذات سروکار نہ تھا، لیکن چوں کہ قوم کو حوصلہ افزائی اور غیرت دلانے کے لیے اس سے زیادہ کوئی افسوں کارگر نہ تھا، کہ ''تمہارے اسلاف نے یہ یہ کارہائے نمایاں کیے تھے، تم کو بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلنا چاہیے'' اس لیے یہ بزرگ جب کبھی تقریر یا تحریر کے ذریعہ سے لوگوں کو گرمانا چاہتے تھے، تو خواہ مخواہ ان کو اسلاف کے کارناموں کا حوالہ دینا پڑتا تھا، رفتہ رفتہ اُن پُرفخر واقعات کی طرف زیادہ توجہ مبذول ہوتی گئی، یہاں تک کہ تاریخی تحقیقات کی ابتدا ہوئی اور بعض بعض اہل قلم نے خاص اس بحث پر جستہ جستہ مضامین لکھے لیکن چوں کہ یہ ان کا اصلی کام نہ تھا اس لیے جو کچھ ہوا وہ ایک سرسری کارروائی سے زیادہ نہ تھا۔''

اسی اثنا میں ۱۸۸۷ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کی تحریک سے میں نے ایک رسالہ لکھا جس میں یہ بحث تھی کہ مسلمانوں نے دنیا کی کیا کیا زبانیں سیکھیں اور غیر قوموں کے کون کون سے علوم وفنون کے ترجمے کیے، نیز یہ کہ مسلمانوں نے دنیا میں ہر جگہ کس قدر بڑے بڑے مدارس اور دارالعلوم تعمیر کیے، یہ رسالہ اگر چہ نا تمام تھا، یعنی پہلی بحث کا استقصا نہیں کیا گیا تھا، تاہم چوں کہ ہماری زبان میں اس وقت تک اس مضمون کے متعلق اس قدر سرمایہ بھی نہیں مہیا ہوا تھا، نہایت مقبول ہوا اور یونانی تراجم کی صدائیں تمام ملک میں گونج اٹھیں۔

قبول عام کی بنا پر مجھ کو خیال ہوا کہ قوم میں تاریخ کا صحیح مذاق پیدا ہو گیا ہے، جو قوم کی علمی ترقی کی جان ہے، لیکن واقعات سے ثابت ہوا کہ یہ محض دھوکا تھا، مقبولیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ قوم میں عموماً استخواں فروشی اور اسلاف پرستی کی خاصیت موجود ہے، اس لیے بزرگوں کی عظمت کی نسبت جو کچھ صحیح یا غلط کہا جاتا ہے خواہ مخواہ اس کو قبول ہو جاتا ہے۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ باوجود اس شور وغل کے جو اسلامی ترقیوں کی نسبت کیا جاتا ہے، تحقیقات میں کچھ اضافہ نہیں ہوا، بلکہ وہی چند واقعات ہیں جو سیکڑوں پیرایہ میں بار بار بیان کیے گئے ہیں، اور کہے جاتے ہیں، نئی تحقیقات کا کسی کو خیال تک نہیں آتا۔

قوم کی بدمذاقی کے خیال نے مجھ کو بالکل افسردہ کر دیا تھا، لیکن یورپ میں جو اورینٹل کانفرنس قائم ہے، اس کی کارروائیوں نے ایک نئی تحریک دل میں پیدا کی، اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ مشرقی قوموں کی (جس میں مسلمان بھی داخل ہیں) ہر قسم کی علمی وعملی ترقیوں کے حالات بہم پہنچائے، چنانچہ

پہلے سال جو اس کا اجلاس ہوا اس میں یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے علم وادب، فلسفہ اور صنائع کے متعلق ایک مبسوط مجموعہ تیار کیا جائے، کانفرنس کے سلسلہ سے الگ یورپ میں اور بھی بہت سے لوگ اپنے ذاتی شوق سے مسلمانوں کے متعلق ہر قسم کی تحقیقات میں مصروف ہیں، چنانچہ ایک جرمنی عالم نے نہایت تحقیقات کے ساتھ ایک مبسوط کتاب اس عنوان پر لکھی ہے، کہ مسلمانوں نے خاص علم طب کی کیا کیا کتابیں یونانی زبان سے ترجمہ کیں، یہ دیکھ کر مجھ کو خیال ہوا کہ جو کام اور قومیں کر رہی ہیں، وہ دراصل ہمارا کام ہے اور یہ بے غیرتی کی بات ہے کہ ہم اپنے کام میں دوسروں کا احسان اٹھائیں، اس خیال سے میں نے اس سلسلہ کو پھر شروع کیا اور مختلف عنوانوں پر مضامین لکھے۔''

مصر کے عیسائی مؤرخ جرجی زیدان نے ''تمدنِ اسلامی'' کے نام سے چار پانچ جلدوں میں اسلامی تمدن کی تاریخ لکھی ہے، اس کی تیسری جلد اسلامی علوم وفنون کی تاریخ پر ہے، بدگمانی نہیں کرتا، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی رسائل اس کے سامنے تھے، اور ان ہی کو دیکھ کر اسی رنگ سے واقعات کے حوالوں کی مدد سے جو رسائل کے حاشیوں پر لکھے ہوئے تھے، اُس نے یہ مرقع تیار کیا ہے۔

الفاروق کی تصنیف پر اختلاف رائے ۱۸۹۳ء مولانا نے الفاروق لکھنے کا ارادہ المامون کے بعد ہی کیا تھا، بلکہ کچھ لکھ بھی لیا تھا اور اس کی شہرت لوگوں میں پھیل چکی تھی، لیکن تاریخِ طبری جو اس کے لیے بہت ضروری کتاب تھی، وہ چھپ کر تمام نہیں ہوئی تھی، اس لیے کچھ دنوں کے لیے رُک جانا پڑا، سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں جو جنوری ۱۸۹۲ء میں شایع ہوئی وہ رقم طراز ہیں:

> ''المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتد بہ حصہ لکھ بھی لیا تھا، لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لیے اُس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا، اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں، حالاں کہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لیے ضروری ہیں، اور یورپ میں چھپ رہی ہیں، ابھی تک پوری چھپ کر نہیں آچکیں۔''

کوتاہ بینوں کی جن بدگمانیوں کی تردید اس بیان میں مولانا نے کرنی چاہی ہے، اُن میں سے کم از کم ایک بدگمانی بے اصل نہ تھی اور وہ کالج کی وہی مصلحت بینی تھی یعنی یہ کہ الفاروق کا وجود ایسا نہ ہو کہ کالج کے ہمدردوں میں سنّی اور شیعی کا فرق پیدا کردے، اُس زمانہ میں کالج کے ہمدردوں میں سب سے قابل تعظیم نام نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کا تھا، سرسید کا خیال تھا کہ چوں کہ وہ شیعہ ہیں اس

لیے یہ کتاب کالج سے ان کی بدمزگی کا سبب ہوگی، یہ بات اندر ہی اندر چل رہی تھی اور ہنوز فیصلہ نہیں ہو پایا تھا، لیکن مولانا نے اس کے لکھنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا، اس لیے وہ اس مصلحت پر کاربند ہونا نہیں چاہتے تھے، بالآخر یہ طے پایا کہ یہ مسئلہ خود نواب صاحب ممدوح کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

چنانچہ سرسید نے ان کو خط لکھا، ان کا جواب جیسا کہ مولانا نے مجھ سے فرمایا تھا، یہ آیا کہ اسلام نے ایک فاروق پیدا کیا ہے، اور حیف ہے کہ اس کی سوانح عمری بھی نہ لکھی جائے، اور ساتھ ہی مولانا شبلی کی تعریف وتحسین بھی کی[1]۔

اتفاق سے سرسید کے خطوط میں نواب عمادالملک کے نام ایک خط مل گیا، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نواب عمادالملک کو الفاروق کی تالیف سے جتنا اختلاف تھا، اس سے زیادہ خود سرسید ہی کو تھا، یہ خط کافی بڑا ہے، مگر پڑھنے کے لائق ہے، یہ خط ۲۰ / مارچ ۱۸۸۹ء کا ہے، ابتدائی تمہید کے بعد ہے:

"جناب مولوی شبلی صاحب کی نسبت جو فقرہ آپ نے تحریر فرمایا تھا، وہ میں نے ان کو سنایا ان پر چار حالتیں گزریں، جب تک میں پڑھتا رہا حیرت میں رہے اور تردد رہا کہ درحقیقت یہی الفاظ لکھے ہیں، پھر میں نے ان کو وہ خط دیا کہ اس فقرہ کو وہ خود پڑھ لیں، جب کہ انہوں نے دیکھ لیا کہ وہی الفاظ ہیں تو ان کو ندامت اور افتخار اور مسرت تین حالتیں ایک ساتھ جمع ہوگئیں، ندامت تو اس لیے تھی کہ وہ اپنے نزدیک اپنے تئیں اس لائق نہیں سمجھتے، جس طرح ان کی نسبت آپ نے اپنے خیالات ظاہر فرمائے، افتخار اس لیے تھا کہ آپ جیسے شخص نے ان کی تصنیفات کی اس قدر قدر فرمائی اور درحقیقت ان کا یہ فخر ناواجب نہ تھا، فلاں وہماں کی واہ واہ سے نہ ان کا دل خوش ہوسکتا اور نہ کچھ فخر ہوسکتا تھا، بلاشبہ آپ کی قدردانی باعث افتخار ہوسکتی ہے، مسرت ان کو بے انتہا اس لیے ہوئی کہ چوں کہ وہ آپ کی نیک طبیعت اور مزاج سے واقف نہ تھے، ان کو دل میں افسوس تھا کہ آپ ان کی پہلی تحریرات سے کسی قدر آزردہ خاطر ہیں، دفعۃً ان کا وہ خیال زائل ہوگیا اور بے انتہا مسرت ان کو ہوئی، میں نے آپ کا نام کسی قدر بے ادبی سے لیا، کیوں کہ اس وقت جو میرے دل

---

[1] اس کی تائید مولانا شروانی کے ایک بیان سے ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں، "مولانا جب سرسید کے روکنے سے الفاروق لکھنے کا مصمم ارادہ ترک نہ کرسکے تو سرسید نے عمادالملک کو لکھا کہ تم مولوی شبلی کو اس ارادے سے روکو،" انہوں نے جواب میں لکھا کہ "اسلام میں دین ودنیا کی جامع کامل ذات صرف عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ہے، لہٰذا ان کی سوانح لکھنے سے مولوی شبلی کو نہ روکیے۔" سرسید نے یہ خط مولانا کے سپرد کردیا کہ وقت پر کام آوے، یہ واقعہ خود سرسید نے مجھ سے بیان کیا تھا۔" "شروانی"

میں آیا، اسی طرح آپ کا نام لینا ادب تھا، میں نے کہا تم سید حسین کو نہیں جانتے، میں نے آج تک ان کا سا نیک دل اور پاک باطن، ظاہر و باطن، حاضر و غائب یکساں، سچا دوست اور ہمہ تن سچائی کسی کو نہیں دیکھا، رنج و کدورت کی ان کے دل میں خدا نے جگہ ہی پیدا نہیں کی، الفاروق کی نسبت جو آپ نے تحریر فرمایا وہ سب درست ہے، مگر اس کے ساتھ فیہ مافیہ بھی ہے، اگر کسی کا دل ایسا مضبوط ہو کہ اس فیہ مافیہ کو بھی صاف صاف مثل ایسے مورخ کے جو کچھ مذہب نہ رکھتا ہو، لکھے تو بلا شبہ نہایت عمدہ بات ہے، مگر کیا مولوی شبلی ایسا کریں گے، اگر نہ کریں گے تو کتاب ردی ہوگی، یہی حال العلی کا ہے، خلافت کی نسبت بہ حیثیت انتظام ملکی کیا لکھا جاوے اور کون لکھ سکتا ہے، میں تو ان صفات کو جو ذاتِ نبوی میں جمع تھیں، دو حصوں پر تقسیم کرتا ہوں، ایک سلطنت اور ایک قدوسیت، اول کی خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملی، دوسری کی خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ وائمہ اہل بیت کو، مگر یہ کہہ دینا تو آسان ہے، مگر کس کو جرأت ہے کہ اس کو لکھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب چیزوں کو غارت کر دیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو صرف بہ رائے نام بزرگ آدمی تھے، پس میری رائے میں ان کی نسبت کچھ لکھنا اور مورخانہ تحریرات کا زیر مشق بنانا نہایت نامناسب ہے، جو ہوا سو ہوا، جو گزرا سو گزرا۔''

ان باتوں کے باوجود الفاروق کے نام میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ لکھے جانے سے پہلے ہی ہندوستان کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک اس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر تھا، یہ دیکھ کر بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ مسلمانوں کی توجہ تام سے فوری فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے، چنانچہ سرسید ہی کے حلقہ کے ایک صاحب منشی سراج الدین صاحب بیرسٹر راولپنڈی نے ۱۸۹۳ء میں ''سیرۃ الفاروق' کے نام سے ایک کتاب لکھ کر بازار میں پیش کر دی، الفاروق کے مشتاقوں کو اس سے بڑی تکلیف پہنچی اور بعضوں نے اس کو منشی سراج الدین صاحب کی بدنیتی پر محمول کیا، اس موقع پر سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۰ر مارچ ۱۸۹۳ء میں لکھا ہے جس میں مولانا کی تعریف وتوصیف اور منشی سراج الدین صاحب کی اس حرکت پر افسوس کے بعد الفاروق کی تجویز کی مخالفت میں اپنی رائے بھی بے پردہ ظاہر کر دی ہے ''اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ ہمارے کالج کے پروفیسر مولوی محمد شبلی نعمانی نے اپنی تصانیف سے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے، المامون، سیرۃ النعمان، کتب خانہ اسکندریہ اور الجزیہ بے مثل اور بے نظیر کتابیں ہیں، اگر وہ نعوذ باللہ اپنے رسالہ الجزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہیں کہ ''فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ'' تو کچھ تعجب نہ ہوگا، جزیہ کا ایسا بے جا اور غلط الزام اسلام پر تھا جس کا آج تک

کسی نے ایسی عمدگی سے حل نہیں کیا تھا، ان جرہ الا علی اللہ باایں ہمہ انہوں نے مثل علمائے متقدمین باخدا الذین لا ینظرون الی الدنیا وحطامها بل ینظرون الی رحمة الله وبرکاته والی حالة القوم واصلاحها، کوئی ذاتی فائدہ ان کتابوں کی تصنیف سے نہیں اٹھانا چاہا بلکہ بالکلیہ مدرسۃ العلوم کو دے دیا، اور جب ان کی حالت معاش پر نظر کی جاوے تو ان کی یہ فیاضی بھی بہت زیادہ اور اعلیٰ درجہ کی باوقعت ہو جاتی ہے، ذالك فضل الله یوتیه من یشاء اور جب ایسے شخص نے جو کیا بحیثیت علم اور کیا بلحاظ عمدگی تالیف اور کیا بہ نظر طریقۂ ترتیب مضامین میں یادگار سلف ہے الفاروق لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور بہت کچھ اس کا سامان بھی جمع کیا تھا، جس کا جمع کرنا نہ آسان کام ہے، نہ ہر ایک شخص کا کام ہے، ہنوز بہت کچھ جمع کرنا باقی ہے، تو ہمارے دوست منشی سراج الدین احمد صاحب کو بلاشبہ مناسب نہ تھا کہ اسی مضمون پر کتاب لکھ ڈالتے، بلکہ اس رحمت کے منتظر رہتے جو خدا کو مولوی شبلی کے ہاتھ سے ملک کو پہنچانی تھی۔

ہیروز آف اسلام میں حضرت عمرؓ کی لائف کا لکھنا ایک بہت بڑا نازک کام ہے، ممکن ہے کہ ان کی لائف اس طرح لکھی جاوے جو انسانوں کے لیے باعث رحمت ہو، یا اس طرح پر لکھی جاوے کہ باعث آفت ہو، یا اس طرح پر پوری لکھی جاوے کہ دونوں فریق سنی وشیعہ کو بہ جز گمراہی کے اور کچھ حاصل نہ ہو۔

سب سے مقدم یہ بات ہے کہ اول اس کا لکھنے والا شیعہ اور سنی دونوں مذہبوں کی قید سے اپنے تئیں آزاد سمجھے اور سچا ہسٹورین بن کر ان کی لائف لکھے یا یہ کرے کہ ان امور کو جو دونوں فریق میں متنازعہ فیہ ہیں مطلق نہ چھیڑے اور ان واقعات اور حالات کو اور ان کی اس خصلت وانتظامی قوت کو اور اس برکت کو لکھے جو ان کے زمانۂ خلافت میں اسلامی دنیا کو پہنچی جن سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔

مشکل یہ ہے کہ کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں ہے کہ اُس کے ہر ایک فعل کو دو پہلو نیک اور بد سے تعبیر نہ کیا جاسکے، یہ مشکل اس وقت زیادہ ہو جاتی ہے جب کہ کسی اکابر دین کی جیسے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں، لائف لکھی جاوے، پس حضرت عمرؓ کا لائف لکھنا ایسا آسان کام نہیں تھا، جیسا کہ ہمارے دوست منشی سراج الدین احمد صاحب نے سمجھا، مگر ہم کو افسوس ہوتا ہے، جب بھلائی کا وہ خیال ظاہر کرتے ہیں بیشک ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے غلطی کی جو کام ان کو نہ

کرنا چاہیے تھا انہوں نے کیا، بلکہ وہ کام ان کے قابو سے باہر تھا، بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے مخدوم وحید العصر مولوی شبلی کے قابو سے بھی باہر ہے، مگر کسی بد نیتی یا طمع نفسانی کا الزام جو لوگ منشی سراج الدین احمد کی نسبت لگاتے ہیں، نہ ہم اس کو پسند کرتے ہیں اور نہ درست سمجھتے ہیں، فرض کرو کہ ایک مضمون پر ایک شخص نے کتاب کا ارادہ کیا، اس مضمون پر دوسرے شخص نے بھی کتاب لکھی، اس میں نقصان کیا ہوا، بلکہ جب دونوں کتابیں موجود ہوں گی تو لوگوں کو دونوں میں تمیز کرنے کا نہایت عمدہ موقع ملے گا اور یہ صادق آوے گا، **فتقبل من احدهما ولم يتقبل من الآخر** یہ سمجھنا کہ منشی سراج الدین کے سیرۃ الفاروق تحریر کرنے سے مولوی شبلی بے دل ہو گئے ہیں، اب نہ وہ ہیروز آف اسلام لکھیں گے اور نہ الفاروق، محض غلط خیال ہے، اگر اہل ملک مولوی شبلی کی تصانیف کو سمجھتے ہوں تو وہ یقین کریں گے کہ اگر ایک ہی مضمون پر دس شخص بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نرالی ہوگی، بس ان کو کیا پرواہ ہے کہ اور کسی نے بھی کچھ لکھا ہے۔

مگر ہم مولوی شبلی کی اس رائے کو کہ بزرگانِ دین کو بھی ہیروز آف اسلام میں داخل کر کے ان کی لائف لکھیں، ہرگز پسند نہیں کرتے اور نہ اُن سے متفق ہیں، وہ لوگ فادر آف اسلام ہیں، نہ ہیروز آف اسلام اور ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی الفاروق نہ لکھیں، ہم مولوی شبلی سے اصرار کر رہے ہیں کہ اپنا سفر نامہ ختم کرنے کے بعد ''الغزالی'' یعنی لائف امام غزالی کی لکھ دیں، جو نہایت دلچسپ اور بے حد مفید ہوگی، خدا ان کو توفیق دے کہ ہماری بات کو مانیں، اس کے بعد جو خدا کو منظور ہو وہ کریں، لیکن اگر اس کے بعد بھی انہوں نے الفاروق لکھی تو ہم اس وقت ان کو کہیں گے جو کہیں گے۔''

ان تمام حوصلہ شکن واقعات کے باوجود مولانا اپنے عزم سے باز نہ آئے، ۱۱/اپریل ۱۸۹۲ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں ''الفاروق انشاء اللہ تعالیٰ لکھوں گا لیکن وقت کی تعیین نہیں کرسکتا۔'' (سمیع - ۳۵)

آخر اگست ۱۸۹۴ء کو مصنف نے اس کتاب کے لکھنے کا قطعی فیصلہ کرلیا، مولانا نے یہ واقعات الفاروق کے دیباچہ میں لکھے ہیں ''الفاروق جس کا غلغلہ وجود میں آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں بلند ہو چکا ہے، اول اول اس کا نام زبانوں پر اس تقریب سے آیا کہ المامون طبع اول کے دیباچہ میں ضمناً اس کا ذکر آ گیا تھا، اس کے بعد اگرچہ مصنف کی طرف سے بالکل سکوت اختیار کیا گیا، تاہم نام میں کچھ ایسی دلچسپی تھی کہ خود بخود پھیلتا گیا، یہاں تک کہ اس کے ابتدائی اجزا ابھی تیار نہیں ہو چکے تھے کہ

تمام ملک میں اس سرے سے اس سرے تک الفاروق کا لفظ بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔

ادھر ایسے اسباب پیش آئے کہ الفاروق کا سلسلہ رک گیا اور اس کے بہ جائے دوسرے کام چھڑ گئے، چنانچہ اس اثنا میں متعدد تصنیفیں مصنف کے قلم سے نکلیں اور شایع ہوئیں، لیکن جو نگاہیں فاروق اعظمؓ کے کوکبۂ جلال کا انتظار کر رہی تھیں ان کو کسی دوسرے جلوہ سے سیری نہیں ہوسکتی تھی، سوءِ اتفاق یہ کہ الفاروق کی طرف بے دلی کے بعض ایسے اسباب پیدا ہوگئے تھے کہ میں نے اس تصنیف سے گویا ہاتھ اٹھا لیا تھا، لیکن ملک کی طرف سے تقاضا کی صدائیں رہ رہ کر اس قدر بلند ہوتی تھیں کہ میں مجبوراً قلم ہاتھ سے رکھ کر اٹھا لیتا تھا، بالآخر ۱۸/ اگست ۱۸۹۴ء کو میں نے ایک قطعی فیصلہ کرلیا اور مستقل اور مسلسل طریقے سے اس کام کو شروع کیا، ملازمت کے فرائض اور اتفاقی موانع وقتاً فوقتاً اب بھی سدِ راہ ہوتے رہے، یہاں تک کہ متعدد دفعہ کئی کئی مہینہ کا ناغہ پیش آگیا، لیکن چوں کہ کام کا سلسلہ مطلقاً بند نہیں ہوا، اس لیے کچھ نہ کچھ ہوتا گیا، یہاں تک کہ آج پورے چار برس کے بعد یہ منزل طے ہوئی اور قلم کے مسافر نے کچھ دنوں کے لیے آرام کیا۔

شکر کہ جمازہ بہ منزل رسید　　　زورقِ اندیشہ بہ ساحل رسید

شمس العلما کا خطاب جنوری ۱۸۹۴ء مولانا کی شہرت کا آفتاب اب نصف النہار کو پہنچ چکا تھا اور لوگوں کو یہ علانیہ نظر آرہا تھا کہ ہمارے ملک کے اس نادرۂ روزگار کی قدر افزائی سلطان روم تو فرمائیں اور انگریزی گورنمنٹ ان کی قدر شناسی کی توفیق نہ پائے، اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ سفر سے واپسی کے بعد انگریز حکام میں یہ بدگمانی پھیلی تھی کہ مولوی شبلی صاحب اتحادِ اسلامی کے مبلغ اور سلطانِ روم کے سفیر بن کر ہندوستان آئے ہیں، اس لیے ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ سلطانِ روم کے اس فرضی سفیر کو ممنونِ منت بنایا جائے، اس کے لیے ابتدا خود سرسید کی طرف سے ہوئی، ڈپٹی سید زین الدین صاحب (علی گڑھ) کا (جو اس وقت کالج کے اونچے درجہ کے طالب علم ہوں گے) یہ بیان ہے کہ سرسید نے ان ہی سے انگریزی میں ایک چٹھی لکھوا کر گورنمنٹ میں بھیجی کہ مولانا شبلی جیسے فاضل کی قدر دانی تر کی گورنمنٹ تو اتنی کرے کہ تمغۂ مجیدی عطا فرمائے اور انگریزی گورنمنٹ بڑے افسوس کی بات ہے اس فرض سے غافل رہے، اس کے بعد جو ہوا وہ یہ ہے کہ گورنمنٹ نے جنوری ۱۸۹۴ء کو مولانا کو شمس العلما کا خطاب دینے کا اعلان کیا۔

مولانا کو شمس العلما کا خطاب ملنا کوئی ایسا اہم واقعہ نہ تھا جس کا خاص طور سے ذکر کیا جاتا

لیکن چوں کہ سرسید کے کالج میں اس کے کسی پروفیسر کو سرکاری خطاب ملنے کا پہلا واقعہ تھا اور سرسید کے رفقا میں اس خطاب کی پہلی نظیر تھی[۱]، اس لیے اس سے اپنے مقاصد کے اشتہار کا کام لیا گیا، اس وقت تک یہ خطاب نااہلوں کو نہیں ملتا تھا، اس لیے لوگوں کی نگاہوں میں اس کی اچھی خاصی وقعت بھی تھی، پھر مولانا کو جس سن و سال میں یہ خطاب ملا یعنی ۳۶-۳۷ سال کی عمر میں، ان کے پیش رؤں اور ہم عصروں میں اتنی کم عمر میں کسی کو نہیں ملا تھا، ان مختلف اسباب نے مل کر اس کو ایک خاص اہم واقعہ بنا دیا اور اس لیے تبریک و تہنیت کے بڑے بڑے جلسے ہوئے جن میں ملک کے اکابر نے تقریریں کیں، معززین نے مختلف گوشوں سے مبارک باد کے تار اور خط بھیجے اور اخباروں نے تہنیت کے مضامین لکھے۔

کالج میں اخوان الصفا اور لجنۃ الادب دو علمی مجلسیں تھیں اور مولانا ان دونوں کے رکن رکین تھے اس لیے ان دونوں نے مل کر ۱۹ر جنوری ۱۸۹۴ء کو ایک بہت بڑا جلسہ ترتیب دیا، جس میں کالج کے تمام سر برآوردہ اکابر سرسید، سید محمود، نواب محسن الملک، مولانا حالی، نواب مزمل اللہ خاں...... پرنسپل پروفیسر آرنلڈ (سکریٹری اخوان الصفا اور جسٹس) سید کرامت حسین جو اس وقت وہاں قانون کے پروفیسر اور مجلس اخوان الصفا کے رکن اور لجنۃ الادب کے صدر تھے، شریک تھے۔

حاضرین کی متفقہ خواہش سے نواب محسن الملک اس جلسہ[۲] کے صدر قرار دیے گئے اور انہوں نے کھڑے ہو کر حسب ذیل تقریر کی۔

''جناب سرسید و سید محمود صاحب و حاضرین! جو خوشی اس وقت جلسہ میں شریک ہونے اور اس صحبت کے دیکھنے سے ہوئی اس کا اظہار مشکل ہے، صاحبو! آپ جانتے ہیں کہ دوستوں کا جمع ہونا، احباب کا ملنا، خود ایک ایسی دل خوش کن چیز ہے کہ اس سے بڑھ کر دوسری چیز اس دنیا میں خیال نہیں کی جاتی، پھر جب کہ وہ ایسے مقصود کے لیے ہو جس کے واسطے ہم اس وقت جمع ہوئے ہیں یعنی اپنے ایک معزز دوست کے خطاب پانے اور جو اعزاز گورنمنٹ نے اسے بخشا ہے، اس پر مبارک باد دینے کے لیے تو اس خوشی کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

صاحبو! اس وقت اس جلسہ میں دو قسم کے لوگ شریک ہیں، ایک طالب علم جن کو مولانا شبلی صاحب کی شاگردی کا فخر ہے، دوسرے اور احباب جن کو مولوی صاحب موصوف کی دوستی کی عزت حاصل ہے، اگرچہ بہ ظاہر دوسرے قسم کے لوگوں میں ہوں مگر اے صاحبو! درحقیقت میں پہلے طبقہ میں داخل ہوں، اور اس لیے

---

[۱] مولانا نظیر احمد صاحب کو یہ خطاب ۱۸۹۷ء میں اور مولانا حالی کو اس سے بھی بہت بعد ملا۔ [۲] اس جلسہ کی یہ پوری روداد اس زمانہ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی تھی، اسی سے ہم نے نقل کیا ہے۔

میں اس وقت اپنے آپ کو ایک طالب علم سمجھ کر اپنے اور عزیز طالب علموں کی طرح اس خوشی میں شریک ہوا ہوں، اے میرے عزیزو! طالب علم کے لیے ضروری نہیں کہ وہ نو عمر اور نو جوان ہو، نہ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ بغل میں کتاب دبا کر مدرسہ میں پڑھنے کے لیے حاضر ہوتا ہو، بلکہ طالب علم وہ ہے جسے علم کا شوق ہو، اور جو علم کا طالب ہو، پس اے میرے عزیزو! میں کسی سے علم کی طلب اور علم کے حاصل کرنے کے شوق میں کم نہیں ہوں، بلکہ جس قدر میری عمر زیادہ ہے، اسی قدر تحصیل کے شوق میں تم سے بڑھ کر ہوں، اس لیے میں تمہارے فرقہ میں داخل ہوں، مجھے امید ہے کہ تم میرے اس دعویٰ کو تسلیم کرو گے اور اپنی جماعت میں داخل کرنے سے انکار نہ کرو گے، اے میرے عزیزو! مولانا شبلی صاحب صرف تمہارے ہی استاد نہیں ہیں، بلکہ درحقیقت مجھ پر بھی ان کو استادی کا حق ہے، اگر تم نے چند قاعدے صرف ونحو کے ان سے سیکھے یا چند ابتدائی کتابیں ان سے پڑھی ہیں تو میں نے ان کی تصنیف و تالیف اور تقریر و تحریر سے بڑے فائدے حاصل کیے ہیں، کوئی روز ایسا نہیں ہوتا کہ ان کی صحبت سے کسی نہ کسی قسم کا علمی فائدہ مجھے نہ ہوتا ہو، یا ان کی باتوں سے کچھ نہ کچھ میری معلومات میں ترقی نہ ہوتی ہو، اس لیے اے میرے عزیز طالب علمو! نہ صرف بہ حیثیت ایک دوست ہونے کے بلکہ بہ حیثیت ایک طالب علم ہونے کے میں اس جلسہ میں شریک ہوا ہوں اور میں مولانا شبلی صاحب کو اس معزز خطاب کے پانے پر جو گورنمنٹ نے ان کو دیا ہے، مبارکباد دیتا ہوں، اے میرے عزیزو! اور اے میرے دوستو! درحقیقت میں نے اس مبارک باد دینے میں ذرا جلدی کی، درحقیقت مجھے اول اپنی گورنمنٹ کو مبارک باد دینی چاہیے، جس نے ایسے مستحق شخص کو خطاب دینے سے دراصل اس خطاب کو عزت بخشی جو ہمارے مولانا کو اُس نے دیا ہے اور اپنے امتیاز کی اس قوت کو ثابت کیا جو اس انتخاب میں اس نے ظاہر کی ہے، درحقیقت مولانا مولوی شبلی صاحب کا خطاب دینا وضع الشیء فی محلہ ہے، اس لیے سب سے پہلے چاہیے کہ میں گورنمنٹ کو مبارک باد دوں، اس کے بعد قوم اس مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس میں ایسے لوگ ابھی موجود ہیں جو درحقیقت علم کے آفتاب ہیں اور جن کو شمس العلما کہنا ایک امر واقعی ہے پھر مدرستہ العلوم کو مبارک باد دینا چاہیے کہ اس میں ایسے کامل اور قابل استاد جمع ہیں، جن کو گورنمنٹ ایسے معزز خطاب کا مستحق سمجھتی ہے، اور جن کے علم کی روشنی دور دور پھیل رہی ہے، پس فی نفسہٖ گورنمنٹ اور قوم اور کالج مبارک باد کا مستحق ہے اور مولانا کو مبارک باد دینا تو ایک امر رسمی اور صرف رسم ظاہری کی تکمیل ہے، وہ فی ذاتہٖ ہمیشہ سے علم کے آفتاب تھے اور گورنمنٹ ان کو خطاب دیتی یا نہ دیتی وہ سب کے نزدیک شمس العلما تھے، صاحبو! جس طرح آفتاب اس بات کا محتاج نہیں ہے کہ کوئی اسے آفتاب کہے، بلکہ آفتاب کا اقرار کرنے والا خود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ تیرہ چشم نہیں ہے، اور نہ اس کی آنکھ بند ہے، بلکہ اس میں بینائی کی قوت اور دیکھنے کی طاقت

بے کسی قسم کے خلل اور عارضہ کے موجود ہے، اسی طرح ہمارے مولانا مولوی شبلی صاحب کو خطاب دینے سے گورنمنٹ نے ثابت کر دیا کہ وہ علم وکمال کی قدر کرنے والی اور اہلِ علم کو پہچاننے والی اور استحقاق پر لحاظ رکھنے والی ہے، صاحبو! مولانا شبلی صاحب کی ذاتی خوبیوں اور ان کے علمی کمالات کا ذکر کرنا فضول ہے، جن کو ان سے ملنے کی عزت حاصل ہے وہ ان کی ان صفات کا اندازہ کر سکتے ہیں، جو خدا نے کوٹ کوٹ کر ان میں بھرے ہیں اور جن کو ان کی تالیفات وتصنیفات کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی نظر کیسی غائر اور ان کا علم کیسا وسیع، ان کے خیالات کیسے بلند، ان کا ذہن کیسا تیز، ان کی تحریر کیسی پر زور، ان کا بیان کیسا صاف اور ان کی تخلیق کیسی عالمانہ ہے، وہ ہمارے زمانہ کے پہلے مصنف ہیں جنہوں نے اپنی تالیفات میں فصاحت بیان اور سلاست عبارت اور لٹریچر کی تمام خوبیوں کے ساتھ اعتدال اور بے تعصبی اور انصاف کا لحاظ رکھا اور شاعرانہ خیالات اور ایشیائی مذاق کے موافق مبالغہ، استعارہ اور عبارت آرائی اور تصنع کے بغیر بلاغت سے فلسفیانہ طرز پر سوانح عمری اور لائف کے لکھنے کا طریقہ جاری کیا اور واقعات تاریخی کے تحقیق کرنے اور محققانہ طور پر واقعات اور معاملات پر رائے دینے اور نتائج کے اسباب بیان کرنے اور اخبار و روایات کے صدق وکذب کے دریافت کرنے کا راستہ بتایا اور ایسے زمانہ میں جب کہ ہماری قوم کا مذاق بگڑا ہوا ہے اور ایسے وقت میں جب کہ سوائے افسانوں اور ناولوں کے کسی اور قسم کی کتابوں کی قدر نہیں ہے، ہمارے مولانا منجملہ ان دو تین مصنفین کے ہیں، جن کی تالیفات کی نہایت قدر کی گئی، اور جن کو قوم نے نہایت شوق سے دیکھا اور جس سے مسلمانوں نے بہت فائدہ اٹھایا اور جس نے ان کے دلوں میں ایک نیا مذاق پیدا کیا اور جس نے مشاہیر روزگار کے حالاتِ زندگی کے لکھنے کا طریقہ اور اس کا مقصود بتایا اور ہمارے مردہ لٹریچر میں بلکہ ہمارے مردہ خیالات میں ایک نئی جان ڈالی فللّٰہ درّہ وعلی اللّٰہ اجرہ۔

صاحبو! ہمارے دوست مولانا مولوی شبلی صاحب نے نہ صرف ہم مسلمانوں پر اپنی عمدہ تالیفات سے احسان کیا ہے بلکہ درحقیقت اسلام بھی ان کا ممنون ہے اور خدائے ذوالجلال کی رضامندی حاصل کرنے کا بھی انہوں نے نہایت عمدہ کام کیا ہے، وہ ان چند اعتراضوں کا دور کرنا ہے جو مذہب اسلام کے مخالف ہمارے مذہب پر کرتے تھے اور جن سے ہمارا مذہب، انسانیت، انصاف، علم اور تہذیب کے مخالف خیال کیا جاتا تھا، وہ جزیہ اور اسکندریہ کے کتب خانہ کا جلانا تھا کہ برسوں سے یہ الزام ہم پر لگایا جاتا ہے اور کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی، لوگوں نے جزیہ کو کفر کا ٹیکس قرار دے رکھا تھا اور اسکندریہ کے کتب خانہ کو جلانے سے پیشوایانِ اسلام کو علم کا دشمن مشہور کر دیا تھا، اس ذی ہمت، عالی دماغ محقق نے جو مدرسۃ العلوم کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا حکیمانہ زندگی بسر کر رہا تھا، ان دونوں چیزوں کی حقیقت ظاہر کرنے

میں اپنی تحقیق کی ایک عجیب خداداد قوت ظاہر کی اور چند اوراق کے لکھنے اور مشتہر کرنے سے ایک عالم کو حیرت میں ڈال دیا، اور یورپ کے بڑے بڑے محققوں کی آنکھوں پر سے غلطی کا پردہ اٹھا دیا اور ان دونوں اعتراضوں کو اس خوبی سے مذہب اسلام پر سے دور کر دیا کہ تمام دنیا حیران رہ گئی، حقیقت میں یہ کام ہمارے مولانا نے ایسا کیا ہے کہ خود اسلام اس کی داد دیتا ہے اور خدا اس پر آفریں کرتا ہے۔

میرے نزدیک صرف وہ چند صفحے جو میرے معزز دوست نے جزیہ اور اسکندریہ کے کتب خانہ پر لکھے ہیں، ایسے ہیں کہ اگر کوئی کام مسلمانوں کے فائدہ کا انہوں نے نہ کیا ہوتا اور سوائے ان کے کوئی دوسری تحریر ان کی نہ ہوتی تو وہی چند صفحے ان کی فضیلت، لیاقت اور علم پر شاہد اور مسلمانوں کے فخر اور عزت کے لیے کافی اور ان کے شمس العلما ہونے کے شاہد تھے، صاحبو! ہماری قوم میں ہزاروں عالم گزرے اور اب بھی خدا کی مہربانی سے سیکڑوں موجود ہیں، مگر ہم تو اس کے قائل ہیں جو کچھ کر دکھائے اور اپنے علم و فضل سے مسلمانوں یا اسلام کو فائدہ پہنچادے:

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اے میرے عزیزو! اور اے میرے مدرسۃ العلوم کے طالب علمو! نہایت خوش نصیب ہو کہ ایسے استاد تم کو ملے ہیں اور ایسے آفتاب کی روشنی تم کو پہنچتی ہے، تم اس زمانہ کو غنیمت سمجھو جب کہ تم کالج میں ہو اور ایسے استادوں کی صحبت و تعلیم سے فائدہ حاصل کر رہے ہو، اس وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور اپنے استاد کے قدم بہ قدم چلنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہ رکھو تمہارے سامنے ایک عمدہ نمونہ موجود ہے، تمہارے دلوں کو منور کرنے کے لیے ایک آفتاب روشن ہے، تم ایسا وقت ہاتھوں سے نہ دو اور اپنے استاد کے خصائل اور صفت سیکھنے اور علم کے حاصل کرنے اور پھر اسے کام میں لانے کی کوشش کرو تا کہ ہم اپنی قوم میں نہ صرف ایک آفتاب کو دیکھیں بلکہ ہمارے چاروں طرف سینکڑوں چاند اور ستارے نظر پڑیں، خدا کرے کہ ہمارا یہ آفتاب مدت تک روشن رہے اور اس کا سایہ تم پر پڑے۔''

نواب محسن الملک کی اس فصیح و بلیغ تقریر کے بعد مولوی بہادر علی صاحب ایم اے نے اپنے عربی لہجہ میں مولوی داؤد بھائی صاحب ممبر لجنۃ الادب اور اخوان الصفا کا عربی قصیدہ پڑھا:

حمد لمن جعل النجوم دراریا	اس کا شکر جس نے تاروں کو روشن اور سورج
والشمس نورا للحنادس ماحیا	کو روشنی بنایا جو تاریکیوں کو مٹا دیتی ہے،
اشرقت شمسا من سماء معالم	تو نشانیوں کے آسمان سے سورج ہو کر چمکا

لتمدّ اقمار العلاء معالیا	تا کہ بلندی کے چاندوں کو اور بلندی میں بڑھادے
اضحیٰ بفیضك روض علمٍ ناضراً	تیرے فیض سے علم کا چمن شاداب ہوگیا
من بعد ان قد کان دهراً زاویا	اس کے بعد کہ وہ ایک زمانہ تک مرجھایا ہوا تھا
لا غروَ لو ادعوك روح زماننا	کوئی شبہ نہیں اگر میں تجھ کو اپنے زمانہ کی روح کہہ کر پکاروں
تحیي لعلم الدین عظماً بالیاً	جو علم دین کی بوسیدہ ہڈی میں پھر زندگی پیدا کررہی ہے۔
علّامةٌ مستنبط من آیة القرآن	علامہ ہے جو قرآن پاک کی آیت سے چھپا بھید
سرّاً خافیاً ومعانیاً	اور معنوں کا پتہ لگاتا ہے
حیناً یحبّر فی العلوم رسائلاً	کبھی وہ علوم کے رسالے نقش کرتا ہے
حیناً یشیّد للفنون مبانیا	اور کبھی فنون کی عمارتیں بلند کرتا ہے
وهو الّذی شرح المهیمنُ صدره	یہ وہ ہے جس کے سینہ کو خدا نے کھول دیا ہے
فغدالابناء المعارف تالیاً	تو وہ اگلے اہل علم کا پیرو ہوگیا
للّٰه دَرُّ مدرّسٍ تدریسه	ایسا اچھا مدرس ہے کہ اُس کا درس
سیلٌ اتیٰ وقد یغشّی وادیا	ایک سیلاب ہے جو وادی میں چھا جاتا ہے
سَحبان وقتٍ لا یُشَق غباره	اپنے وقت کا سحبان جس کے گرد تک کوئی نہیں پہنچ سکتا
من کان للفرد الوحید مجاریا	کون فردِ فرید کا مقابل ہوسکتا ہے
قُسّ الفصاحة لا یُنال مقامه	فصاحت میں قس بن ساعدہ ہے جس کے رتبہ کو کوئی نہیں پہنچ سکتا
من کان للشمس المنیرة ثانیاً	اس روشنی بخشنے والے آفتاب کا ثانی کون ہے
ان قال فی العربیّ شعراً فاق	اگر وہ عربی میں شعر کہے تو حسانؓ سے بڑھ جائے
حسّاناً وفی العجمی فاق قانیا	اور اگر فارسی میں کہے تو قاآنی سے آگے نکل جائے،
قد یخلب الالبابَ سحر بیانه	اُس کے حسن بیان کا جادو عقل کو لے لیتا ہے
اذ ما تصدیٰ خاطباً او شادیاً	جب وہ خطیب ہوکر یا شاعر ہوکر نغمہ سرا ہو
هو حصرم الاخبار غیر مساجل	وہ تاریخ کا اتھاہ سمندر ہے
یعطی الوریٰ مرجانة لآلیا	جو لوگوں کو مرجان اور موتی دیتا ہے

اس کے بعد نذیر احمد صاحب بی اے نے عربی زبان میں حسب ذیل تقریر کی:

یـا اَیُّهـا السَّـادة الکرام یشقُّ علیَّ ان اقرع
أذانکـم بـعـد اذ فـرغـنـا من تنقل الفواکه
الشّهیّة والالـوان اللطیفة وکیف یمکن لی
ان اَعُـدَّ فـضـائـلَ مـولانا المکرم واحصیٰ
مـحـامـده مـالـی ان اقول انه سحبان فی
الـفـصـاحة ومـالـی ان اقول انـه قُسٌّ فی
البـلاغة ومـا لـی ان اقـول انـه قـآنی فی
سلاسة لسانه ولطافة نظمه، بل انشد هٰذا
الشعر للمتنبی اذ قال:
''خـذ مـا تـراه ودع شیـئـاً سمعت بـه
فی طـلـعة الشمس ما یغنیك عن زحلٍ ''
تـفـتخـر اللجنة الادبیة بأن اعظم ارکانها
بل بـانیها لُقّب بشمس العلما تهنئه الآن
بهٰـذا الاعـزاز والاکـرام، اختـم کـلامی
بتشـکـر الســادة الذین شرّفونا بقدومهم
والـذین کرّمونا باللطف والاحسان، وانّ
اللّٰه لا یضیع اجر المحسنین۔

معزز حضرات! میرے لیے یہ امر تکلیف دہ
ہے کہ اس کے بعد کہ ہم لوگ خوش مزہ میووں
اور عمدہ ناشتوں سے پیٹ بھر چکے ہیں، آپ
کی سمع خراشی کریں اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم
مولانا کے فضائل گنائیں اور ان کے محامد شمار
کریں، میں کیسے یہ کہوں کہ وہ فصاحت
میں سحبان، بلاغت میں قس اور سلاست زبان
اور لطافت نظم میں قاآنی نہیں، بلکہ میں متنبی کا
یہ شعر پڑھ دیتا ہوں:
''جو دیکھتے ہو اس کو قبول کرو اور جو سنتے ہو اس کو
چھوڑو، آفتاب نکل آنے کے بعد زحل کی ضرورت کیا ہے''
لجنۃ الادب فخر کرتی ہے کہ اس کے سب سے بڑے
رکن، بلکہ بانی کو شمس العلما کا لقب دیا گیا ہے، وہ ان کو
ان کے اس اعزاز پر مبارکباد دیتی ہے، ہم ان معزز
حاضرین کے شکریہ پر جنہوں نے اس جلسہ میں شرکت
کی اور تشریف لائے، اپنی تقریر کو ختم کرتے ہیں، اللہ
تعالیٰ نیکی کرنے والوں کی نیکی کو برباد نہیں کرتا۔

اس تقریر کے بعد ولایت اللہ[۱] صاحب طالب علم بی اے کلاس نے مولانا کی مدح میں ایک اُردو نظم پڑھی جو حسب ذیل ہے:

آج یہ کیوں نظر آتے ہیں خوشی کے ساماں | در و دیوار سے آثار مسرت ہیں عیاں

---

۱ یہ صاحب سی پی کے تھے، طالب علمی سے فراغت کے بعد وہاں کے معزز عہدہ پر ممتاز تھے، پنشن پا کر اب یہ سنٹرل اسمبلی کے ممبر ہیں، اسی سلسلہ میں ان سے دہلی میں ملا ہوں، ان کو شاعری کا ذوق اب تک ہے، میر اکبر حسین صاحب کے رنگ میں بھی اچھا کہتے ہیں، بہت سے اشعار انہوں نے سنائے، مولانا شبلی صاحب کی شاگردی کا ذکر کیا، اب ان کا مجموعہ کلام اس سال شائع ہوا ہے، اس میں بھی بہ تصحیح یہ قصیدہ موجود ہے۔

زیب و زینت نہیں کچھ ایک جگہ پر موقوف	ساری دنیا نظر آتی ہے مجھے باغِ جناں
دیکھنے والوں کی آنکھوں میں کھپا جاتا ہے	دل کو بھاتا ہے بہت آج کے دن کا یہ سماں
دیکھ کر سبزہ کی ہر سمت بہار دلکش	فرشِ اطلس کا مجھے ہوتا ہے ہر لحظہ گماں
جس طرف جائیے غنچے ہیں تبسم کرتے	باغِ عالم میں جدھر دیکھئے گل ہیں خنداں
باغ ہو دشت ہو صحرا ہو غرض کچھ بھی ہو	نقشہ خلد ہی پاتا ہوں میں جاتا ہوں جہاں
دھوم صحرا میں ہے جنگل میں ہے برپا منگل	آج ویرانہ کا معدوم ہے دنیا سے نشاں
سب کے منہ سے ہیں بلند آج خوشی کے نعرے	شاد و خرم نظر آتا ہے ہر اک پیر و جواں
دست قدرت نے گہربار جو ہونا چاہا	ابر آیا دُر شہوار سے بھر کر داماں
نہ رہی شکل وہ دنیا کی و ما فیہا کی	کچھ سے کچھ کر گئی ایک بارش ابر باراں
دشت و صحرا ہوئے گلزار، بہار آ پہنچی	رحمتِ پاک سے سرسبز ہوا باغِ جناں
سر کے بل آ گئے ہی بڑھتی تھی نگاہِ پُر شوق	اک تماشا پہ تھیں سو جان سے آنکھیں قرباں
سخت حیرت تھی خدایا یہ خوشی ہے کیسی	جا رہا تھا میں اسی فکر میں غلطاں پیچاں
ناگہاں کان میں آواز یہ آئی میرے	باعث غور ہے کیا کیوں ہوئے ایسے حیراں
خیر ہے فکر یہ کیسی ہے؟ تعجب کیسا؟	مہرباں ہوش میں آؤ ہو تم اس وقت کہاں
جشن نو روز ہے اک دھوم مچی ہے ہر سو	واں کے چلنے کا بھی کچھ تم نے کیا ہے ساماں
یہ صدا کان سے پہنچی جو اتر کر دل میں	ہو گیا مجھ پہ عیاں صاف یہ سب رازِ نہاں
دیکھنے کو جو بہت میری طبیعت چاہی	ساتھ سب لوگوں کے اس سمت ہوا میں بھی رواں
لیے جاتا تھا مجھے شوق وہاں ہاتھوں ہاتھ	جا رہا تھا میں نہایت خوش و خرم شاداں
چشم مشتاق جسے ڈھونڈ رہی تھی ہر سو	مجھ کو دکھلائی دیا دور سے ناگہ وہ مکاں
خوش نما دل کش و دل چسپ تھی جس کی تعمیر	جس کی صورت سے نمایاں تھی بہت شوکت و شاں
پاس جا کر جو نظر کی تو وہاں پائے بہم	ہند کے جملہ اراکین و مشیر و اعیاں
عقل و دانش کو ہوئی جن سے کہ زینت حاصل	عزت و شان کی جن سے کہ بڑھی عزت و شاں
عدل سے جن کے ممالک ہوئے معمور تمام	جن کے ہاتھوں سے یہ سرسبز ہوا ہندوستاں
پائی یہ نشو و نما علم و ہنر نے جس سے	ہے بجا جن کو اگر کہیے کہ ہیں ہند کی جاں

۱؎ اتفاق سے عین جلسہ کے دن بارش ہونے لگی تھی۔

ناگہاں ایک خموشی ہوئی سب پر طاری
جب کہ دربار میں نافذ ہوا شاہی فرماں

بہرِ تعظیم کھڑے ہوگئے حضار تمام
ہوگیا پھر ہمہ تن گوش ہر اک پیر و جواں

سن کے کچھ پھول گئے مارے خوشی کے احباب
دل سے مت پوچھئے کچھ فرطِ مسرت کا بیاں

ہوئے شمس العلما آج جناب شبلی
ہوگیا چار سو اس مژدہ کا فوراً اعلاں

فخر کرتا ہے بہت جن پہ علی گڑھ کالج
بلکہ یوں کہئے کہ ہے ہند بھی جن پر نازاں

مصر اور شام خجل ہیں عربی سُن کے اگر
فلسفہ دیکھ کے شرمندہ ہو ملکِ یوناں

فارسی کی جو بھنک کان میں پڑ جائے اگر
پھر کبھی نام نہ لے شرم سے اپنا ایراں

تم کو شمس العلما کا یہ مبارک ہو خطاب
جب تلک شمس رہے اوجِ سما پر رخشاں

پس دعا ہے یہ ولایت کی ہمیشہ یا رب
یہ لقب پھولے پھلے آپ کے زیرِ داماں

سبز و شاداب یہ جب تک کہ رہے باغ علوم
شمس کی طرح رہیں آپ بھی سر بر تاباں

اس کے بعد ممتاز حسین[1] طالب العلم سکنڈ ایر کلاس اور ممبران اخوان الصفا اور لجنۃ الادب نے عربی میں تقریر کی، جس کی فصاحت و بلاغت کی سب نے داد دی، پھر مولوی حمید الدین[2] صاحب ممبر اخوان الصفا ولجنۃ الادب نے اپنا یہ عربی قصیدہ پڑھا:

یا خیر من یسمو الی العلیاء
کالشمس بازغۃً بوسط سماء

اے ان سب میں بہتر جو بلندی کی طرف اونچے ہوتے ہیں
آسمان کے وسط میں آفتاب کی طرح درخشاں ہوکر

قد کنت قدماً للمعالی سامیا
اورثتہ عن شیمۃ الآباء

تو پہلے سے بلندی کی طرف بڑھ رہا تھا
تو نے اپنے اسلاف سے یہ وراثت میں پایا

فلئن سموت الی المکارم والعلیٰ
فلقد نشأت بعزۃ قعساء

تو اگر تو عزت کے مقام اور بلندی کی طرف بڑھا تو
کوئی تعجب نہیں کیوں کہ تو نے عزت میں پرورش پائی۔

لا غروَ نصل السیف ان یك صارماً
او یستھلّ البرق بالألاء

کوئی تعجب کی بات نہیں اگر تلوار کی دھار
کاٹ رکھتی ہو یا بجلی روشنی لے کر چمکے

فلانت بالعزمات سیفٌ صارم
ولانت برقٌ لامعٌ بذکاء

کیوں کہ تو اپنے پختہ عزم میں شمشیر براں ہے
اور تو ذکاوت میں برق لامع

[1] ممتاز حسین صاحب مرحوم بیرسٹر جن کے نام سے لکھنؤ میں ممتاز دار الیتمیٰ ہے، جس کو مرحوم نے قائم کیا تھا۔ [2] مولانا حمید الدین صاحب مرحوم صاحب تفسیر نظام القرآن مولانا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد جو اس وقت کالج میں زیر تعلیم تھے۔

لاذت بجانبك العلوم فانها — لولا تصنها اٴذنت بفناء
علوم نے تیری پناہ چاہی کیوں کہ — اگر تو ان کو نہ بچاتا تو وہ فنا ہو چکے تھے۔

قد امحلت ارض العلوم واصبحت — عرصاتها کسمائق البیداء
علم و فن کی سرزمین خشک ہوگئی تھی — اور اس کے میدان صحرا بن گئے تھے

لعبت بها هوجُ الریاح تنوبها — من کل عاصفةٍ من النکباء
اس کے چاروں طرف سے آندھیاں اس سے کھیل رہی تھیں — اور مصیبت کا طوفان اس پر آ رہا تھا

فظللت تمطرها بسحٍ واکف — صوب الربیع بدیمة هطلاء
تو تو ابر باراں بن کر اس میں برسا — بہار کی بارش موسلا دھار

فربت ریاض العلم منك نوّرت — مهتزة بغصونها الخضراء
تو علم کی کیاریاں تجھ سے پروان چڑھیں اور — ان کی سبز شاخوں میں جھوم کر شگوفے نکلے

علمتنا سبل الرشاد وانّما — کنا کخابط لیلةٍ لیلاء
تو نے ہم کو ہدایت کا راستہ بتایا — حالاں کہ ہم ایسے تھے جیسے کوئی اندھیری رات

کنا بمهجلة یخاف بها الردیٰ — فهدیتنا المحجة بیضاء
ہم ایسے خوفناک مقام میں تھے جس میں ہلاکت کا ڈر تھا — تو تو ہم کو کھلے صاف راستہ پر لے آیا

ولأسئلنّ الله طول بقاء کم — فی کل بکرتنا وکلّ عشاء
اور ہم اللہ سے آپ کی زندگی کی — ہر صبح اور شام دعا مانگیں گے

واهنّئنّکم بما اعطیتم — من خیر ما وجدوا من الاسماء
اور آپ کو اس کی مبارک باد دیتے ہیں کہ آپ کو انہوں نے — اپنے نزدیک سب سے بہتر لقب سے ملقب کیا

ان کان تلك الشمس شمس سمائها — فلصرت شمس العلم والعلماء
اگر یہ آفتاب اپنے آسمان کا سورج ہے — تو تو علم اور علما کا آفتاب ہے

اذ انت شمس والعلوم سمائکم — فالشمس شمسی والسماء سمائی
جب آپ آفتاب ہیں اور علم و فن آپ کا آسمان ہے — تو آفتاب ہمارا آفتاب ہے اور آسمان ہمارا آسمان ہے

اس کے بعد خواجہ غلام الثقلین اور محمود صاحب نے اردو میں تقریریں کیں، پھر ظفر علی خاں[1] صاحب ممبر اخوان الصفا نے فارسی میں یہ قصیدہ پڑھا، یہ قصیدہ گو ان کا ابتدائی کلام ہے مگر سالے کہ نکوست از بہارش پیداست:

[1] مولانا ظفر علی خاں، ایڈیٹرز مین دار، لاہور۔

سحر گاہاں دلم پامالِ غم بود و پریشانی — مکدر مطلع خاطر بد از اندوہ پنہائی
گہے بر بے سرو سامانی خود نالہ می کردم — گہے خواندم حدیث گردشِ ایامِ طولانی
گہے بر کردۂ خود انفعالم دست می دادی — گہے کردہ نظر بر معصیت خوردم پشیمانی
چو موجِ غم زسر بگذشت گشتم عازمِ گلشن — کہ درمانِ دلِ زارم شود زانساں بآسانی
شگفتہ غنچۂ دل شد ز فرطِ فرحت و بہجت — عروسِ دہر را پیرایۂ دیدم چو نورانی
گل و بلبل بہم محوِ ادا و عشوہ و غمزہ — چو زلفِ مہوشاں گیسوئے سنبل در پریشانی
خرامِ نازکبک و رقص سرود خندۂ گلہا — دلم برد و شدہ روحم نثار صنعِ یزدانی
دمیدہ لالۂ حمرا کنارے جوئے کوثروش — ہمی شد از جمالش غرقِ خوں لعلِ بدخشانی
وزید از گلستاں بادِ صبا آہستہ آہستہ — مشامِ جاں معطر شد ز بوئے مستِ ریحانی
گلاب و نسترن شبّو و نسریں نرگس و سوسن — بہ ہر یک عشوۂ خاصے بداز اندازِ ارزانی
ز شبنم لالہ داغِ خود بہ اندازِ نکو شستہ — شمیم یاسمین و یاسمن در عنبر افشانی
ہزاراں مرغِ خوش الحاں نشستہ بر سرِ اغصاں — بصورت دلربا بودند محوِ تہنیت خوانی
مہ نوکشتیِ بہرِ نثار نقرہ پر کردہ — کواکب بر فلک مصروف ہر سو در دُر افشانی
چو ایں نظارہ را دیدم بجیب فکر سر بردم — کہ بہرِ کیست ایں آرایش و تزئینِ لاثانی
دریں اثنا مرا از ہاتفِ غیبی ندا آمد — نمی دانی مگر تو اے غریقِ بحرِ حیرانی
کہ فخرِ قوم و مولانائے شبلی را پئے علمش — خطابے شد عطا واللہ زفیضِ جودِ سلطانی
زمیں ہم آسماں ہم چہرہ افروزند بہرِ او — معطر باغِ دہر است از پئے شبلی نعمانی
بحمد اللہ کہ درِ درجِ حکمت را پس از عمرے — ز عدلِ خسروی شد گرم بازارِ درخشانی
نہ یارائے ثنائے تو قلم رانے زبانم را — قطار عالماں انجم، میانش شمس تابانی
کنندائے کانِ معنی علم و فضل و دانش و حکمت — بیک پا ایستادہ بر خیانت پاستاں بانی
زمینِ شعر از فیضت پر از گلہائے بوقلموں — سخن را دادۂ سرمایہ اے بحرِ سخندانی
کند پہنائے مضمونِ لطیف و خوش بیکدم طے — سمندِ کلکِ تو ہر گہ شود سرگرمِ جولانی
براتے دادہ از فکرِ خود عرفی و صائب را — کجا ہم پایہ ات باشند خاقانی و قاآنی
بہاراں تحفۂ باشد ز گلزارِ کمالِ تو — ز بحرِ عقل و فہمت رشحۂ ابریست نیسانی

خداوند کریمت لحنِ داؤدی عطا کردہ | کنی تسخیر دلہا چوں کنی ترتیلِ قرآنی
نوائے نغمہائے شکّریں تا خیز از گلبن | صدائے بلبل آید تا ز شاخِ سرو بستانی
زچشم زخمِ دوراں درسلامت باشی وایمن | معین و یاور و ناصر ترا تائید ربانی

اس کے ختم ہونے کے بعد لالہ بہاری لال صاحب مشتاق دہلوی شاگرد مرزا غالب مرحوم نے[1] جومولانا حالی کے ساتھ تشریف لائے تھے، ایک ظریفانہ تقریر کی اور اپنے کو ہندو ہونے کے سبب سے ''آفتاب پرست'' ثابت کر کے شمس العلما مولانا شبلی کا اپنے کو قدرداں ٹھہرایا، سب سے آخر میں مولانا حالی نے اپنا عربی قصیدہ پیش کیا جو حسب ذیل ہے اور جس کا عنوان تھا ''من الحبیب الی الحبیب'' یعنی ''ایک حبیب کی طرف سے دوسرے حبیب کو ہدیہ''۔

یـا وحیـداً مـن الکـرام فـریـدا | وعـزیـزاً کـمثل علـقٍ نـفـیـس
اے بڑے آدمیوں میں یکتا اور یگانہ | اور نادر الوجود مثل نفیس و نادر چیز کے
انـت اولـی بـان تـلـقّب شمساً | بل بـأن یـجعلوك شمس الشموس
تو اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ تجھ کو آفتاب کا لقب دیا جائے | بلکہ اس بات کا کہ تجھ کو آفتابوں کا آفتاب قرار دیا جائے
انـت شـمـس الهدیٰ ولست بشمس | یـعـتـریـهـا الـخـنـوس بعد خنوس
تو ہدایت کا آفتاب ہے اور وہ آفتاب نہیں | جس کو غروب پر غروب لاحق ہوتا ہے
انـت طهّـرت ذیـل دیـن مبیـن | لـوّثـتـه الـلـئـام بـالتـدلیـس
تو نے دین مبین کے دامن کو پاک کیا | جس کو کمینوں نے فریب دہی سے آلودہ کر دیا تھا
ثـم دافـعـت عـن امـامٍ تـقـی | کـان بـعـد الـنبی خیر رئیس
پھر تو نے اس امام[2] پاک کی طرف سے مدافعت کی | جو پیغمبر خدا کے بعد سب سے بڑا سردار تھا
وعـن الـحـق قـد کشفت غطاء | بـعـد مـا اغلقوہ بـالتلبیس
اور تو نے حق سے پردہ اٹھایا | بعد اس کے کہ لوگوں نے اس کو دھوکہ سے پردہ میں چھپا دیا تھا
سـرت فـی الارض بـرّاً و بحـراً | لـلـمـعـالی ولا لأمر خسیس
تو نے دنیا کے بحر و بر کی سیر کی | اعلیٰ مقاصد کے لیے نہ کسی ذلیل غرض کے لیے

---

[1] لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی نے ۱۹۰۸ء میں وفات پائی (مکتوب حالی، جلد اول، ص ۱۶۹) [2] امام پاک سے عمر رضی اللہ عنہ مراد ہیں جن کی طرف اسکندریہ کے کتب خانہ جلانے کی نسبت کی جاتی تھی، اور مدافعت سے اس کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کے رفع الزام کی طرف اشارہ ہے۔

قـلّـدوك الـتـزام مـدرس قـوم — فيـه يـرجىٰ لهم كمال الـنـفـوس

تجھ کو قومی مدرسہ کی خدمت سپرد کی گئی — جس میں کہ نفوس کی تکمیل کی امید کی جاتی ہے

فتـقـلّـدت والـتـزمـت لـزومـاً — خـدمة الـمسـلـمـيـن بـالـتـدريـس

تو نے اس خدمت کو قبول کیا — اور درس وتدریس سے ان کی خدمت کا فرض ادا کیا

قـمـت بـالـدرس والـدراسة فيهم — فـارغـاً عـن ريـاسة و رئيـس

تو تعلیم اور درس میں مشغول ہوا — ریاست اور رئیسوں سے بے پروا ہو کر

وجـعـلـت الـكـمـال غـاية همّ — واتـخـذت الـكـتـاب خير جليـس

اور تو نے کمال کو اپنا انتہائے مقصد قرار دیا — اور کتاب کو عمدہ ہم نشیں بنایا

فـعـلـى الـقـوم لازمـاً لك حـق — كـلّهـم مـن وجـوهـهـم وروٴس

پس قوم میں جس قدر اکابر و اعیان ہیں — سب پر تیرا لازمی حق ہے

صـانك الله عـن مـكـاره حتى — صرت كـالقـلـب آمنا في الخميس

خدا تجھ کو مکروہات سے بچائے — یہاں تک کہ تو اس طرح محفوظ رہے جس طرح فوج میں قلب کا حصہ

سب سے اخیر میں مولانا کھڑے ہوئے اور سب کے جواب میں یہ شکریہ آمیز تقریر فرمائی، اس تقریر پر اس حیثیت سے نظر رہے کہ بادۂ مدح وتوصیف کے اتنے پے درپے پیالوں کے بعد بھی ان کا دماغ برجا ہے اور اس شاہی خطاب کی وہ وہی حقیت سمجھتے ہیں جو اس کی حقیقت ہے:

''آپ نے جس مہربانی اور محبت سے عطیۂ خطاب کی تقریب میں مجھ کو ایوننگ پارٹی میں مدعو کیا ہے اور جس جوش اور خلوص سے آپ نے اس موقع پر مجھ کو اس خطاب پر مبارک باد دی ہے میں نہایت سچے دل سے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں، حقیقت میں میرے لیے اس سے زیادہ فخر اور عزت کا کیا موقع ہوسکتا ہے کہ لجنۃ الادب کا جو اپنی قسم کی تمام ہندوستان میں ایک مجلس ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ اُس مقدس زبان میں ہم کو اسپیچ اور لکچر دینا سکھائے، جو ہماری مذہبی اور قومی زبان ہے، جس کے ممبروں میں مولوی بہادر علی صاحب ایم اے اور کیپے، ایم اے ڈبل ایم اے داؤد بھائی صاحب جیسے ادیب، مزمل اللہ خاں صاحب رئیس، جناب حاجی اسمٰعیل خاں صاحب ممبر کونسل، جناب سید کرامت حسین صاحب بیرسٹرایٹ لا، مولوی خلیل احمد صاحب ایم اے گر، اور اس کے آنریری ممبروں میں ہمارے مخدوم مولانا

الطاف حسین صاحب حالی، داخل ہیں، میرے خطاب کی نسبت مبارک بادی دینا ایک ایسا فخر اور ایک ایسی عزت ہے جس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔

اسی طرح اخوان الصفا کی مجلس جو مسلمانوں کی اُس قدیم مجلس کے نمونہ پر قائم کی گئی ہے، جو چوتھی صدی میں قائم ہوئی تھی، جس کے سکریٹری میرے استاد اور ہمارے کالج کے فرشتہ خصال پروفیسر مسٹر آرنلڈ ہیں اور جس کے ممبر نہایت پاکیزہ اخلاق اور لایق و فائق اشخاص ہیں، ایسی مجلس کا مجھ کو مبارک باد دینا بڑی سے بڑی عزت اور بڑے سے بڑا شرف ہے۔

اے حضرات! اگرچہ میں انگریزی گورنمنٹ کی نہایت قدر اور عزت کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس کے تمام احکام اور قاعدے سیاست اور انتظام کے اعلیٰ اصول پر مبنی ہیں اور اس بنا پر اس خطاب کی بھی جو گورنمنٹ نے مہربانی سے مجھ کو عطا کیا ہے، نہایت قدر اور منزلت کرتا ہوں، لیکن میں آپ کو کافی یقین دلاتا ہوں کہ میں اس خطاب کی جو قوم کی طرف سے دیا جائے گورنمنٹ کے خطاب سے کچھ کم عزت نہیں کرتا، اور یہ میرے لیے کچھ بے جابات نہیں، بلکہ اُس زمانہ میں بھی جب کہ خود مسلمانوں کی حکومت تھی، مسلمانوں نے ہمیشہ سلطنت کے خطابات کی بہ نسبت قومی خطاب کی زیادہ عزت کی، اسی کا اثر ہے کہ سلطنت عباسیہ اور دوسری سلطنتوں کے عطا کیے ہوئے خطاب بالکل معدوم ہو گئے اور قوم کے عطا کیے ہوئے خطابات یعنی "حجۃ الاسلام" امام غزالی کے لیے، "امام" فخر الدین رازی کے لیے "علم الہدیٰ" شریف مرتضی کے لیے آج بھی باقی اور قائم ہیں، پس جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ گورنمنٹ نے جو خطاب کے عطا کرنے کی عزت مجھ کو دی ہے، اس کو آپ لوگ جو قوم کے صحیح قائم مقام ہیں پسند کرتے ہیں اور بہ جا سمجھتے ہیں تو اس سے بڑھ کر میرے لیے فخر اور خوشی کا کیا موقع ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ۶ رجنوری کو اگر گورنمنٹ کے حضور سے مجھ کو یہ خطاب ملا تھا تو آج ۱۹ رجنوری کو مجھ کو قوم کے دربار سے یہ خطاب ملا ہے

ع اینکہ می بینم بہ بیداری است یا رب یا بہ خواب

اے حضرات! جس طرح میں نہایت سچے دل سے آپ صاحبوں کی مہربانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، میرا فرض ہے کہ نہایت سچے دل سے گورنمنٹ کی اس پالیسی کی نسبت احسان مندی کا اظہار کروں جو اس نے اس خطاب کے دیے جانے کی نسبت اختیار کی ہے۔

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ جب کسی ملک میں انقلابِ حکومت ہوتا ہے تو نئی حکومت پرانی

حکومت کے تمام آثار کو، علوم کو، فنون کو، تمدن کو مٹا دینا چاہتی ہے، قال اللّٰہ تعالیٰ اِنَّ[1] الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا اَعِزَّةَ اَهْلِهَا اَذِلَّةً وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ لیکن انگریزی حکومت نے یہ خلاف اس کے پرانی حکومت یعنی اسلامی حکومت اور نہ صرف اسلامی حکومت بلکہ ہندوؤں کی حکومت کے آثار کو بھی محفوظ رکھنا چاہا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی نے جو کام کیا ہے وہ آپ کو معلوم ہے، قدیم عمارتوں کی نسبت جو کچھ اہتمام گورنمنٹ کو ہے، وہ مخفی نہیں، اسی طرح گورنمنٹ نے اس خطاب کے سسٹم کو قائم کرنے سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ قدیم تعلیم اور قدیم علوم کی ویسی ہی عزت کرتی ہے جس طرح کہ انگریزی تعلیم کی۔

حضرات اگرچہ کسی ایسے شخص کو جو علم کی خدمت کرنا چاہتا ہے، کسی قسم کے خطاب کی خواہش کرنی یا خطابات کو اپنی خدمت کا صلہ سمجھنا ایک قسم کی تنگ حوصلگی ہے اور اسی بنا پر ہمارے قدیم بزرگوں میں سے بہتوں نے اس قسم کے خطابات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، تاہم کچھ شبہ نہیں کہ اس قسم کے اعزاز سے لوگوں کے حوصلے بڑھتے ہیں اور ان کی ہمت بندھتی ہے، ہم کو گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں اس بات کا موقع حاصل ہے کہ ہم اپنے قدیم علوم، قدیم زبان، قدیم تہذیب کو محفوظ رکھیں اور اگر ہم کو ایسا کرنے کے لیے قدر دانی اور ظاہری اعزاز کی تمنا اور آرزو ہے تو گورنمنٹ ہماری قدر دانی اور عزت افزائی کے لیے اسی طرح موجود ہے، جس طرح اسلامی عہد میں اسلامی حکومت، مولوی عبدالحق[2] صاحب خیرآبادی، مفتی میر عباسی صاحب مرحوم، مولوی حامد حسین صاحب مرحوم اگر اسلامی حکومت کے زمانہ میں موجود ہوتے تو ان کو اسی قسم کے اعزاز کی توقع ہو سکتی تھی، جو انگریزی گورنمنٹ نے ان کو عطا کیا۔

حضرات! جب کہ میں اس موقع پر آپ کے اور گورنمنٹ کے احسانات کا شکریہ ادا کر رہا ہوں تو نہایت ناسپاسی ہوگی، اگر میں اس چیز کا ذکر نہ کروں جو ان تمام احسانات کا اصلی سرچشمہ ہے، یعنی ہمارا یہ قومی کالج۔''

اس جلسہ کے بعد ۱۷ فروری روز شنبہ کو اسٹریچی ہال میں لیڈیز یورپین افسران روسائے علی گڑھ اور طلبائے کالج کا ایک اور عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں سرکاری طور پر رسمِ خلعت وعطائے خطاب ادا کی گئی اور مسٹر ہونگٹن کمشنر قسمت میرٹھ نے مولانا کو اپنے ہاتھ سے عمامہ، عبا اور تمغہ حوالہ کیا، سرسید نے مولانا کو

---

[1] بے شبہ جب بادشاہ کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو ویران اور اس کے معزز باشندوں کو ذلیل کر دیتے ہیں، اور ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ (قرآن پاک میں ملکہ سبا کا قول نقل ہوا ہے۔)''س'' [2] ان صاحبوں کو شمس العلما کے خطاب ملے تھے، مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی، مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی کے نامور جانشین وفرزند، مفتی میر عباس صاحب لکھنؤ کے مشہور ادیب اور مولوی حامد حسین صاحب لکھنؤ کے مشہور اثنا عشری عالم ومجتہد، اور مولوی ناصر حسین صاحب، مجتہد لکھنؤ کے والد۔

الگ لے جا کر یہ خلعت پہنایا، مولانا خلعت کو زیب تن کر کے وسط ہال میں کھڑے ہوئے، اس وقت مسٹر ہونگٹن نے ان کو مخاطب کر کے ایک تقریر کی جس میں وہ تمام خیالات یک جا ہیں جو اس عطائے خطاب کے باعث اور اس وقت مسٹر بک پرنسپل اور سرسید مرحوم کے دل و دماغ پر چھائے تھے، اس لیے وہ آج بھی غور سے پڑھے جانے کے لایق ہے، انہوں نے کہا "مولوی محمد شبلی نعمانی! مجھے اس امر کی نہایت خوشی ہے کہ یہ سند اور خلعت گورنمنٹ آف انڈیا و صوبہ جات ہذا کی طرف سے ایسے وقت میں آئے کہ مجھ کو اس مسرت اور خصوصیت حاصل کرنے کا موقع ملا کہ میں بذاتِ خود اس رسم میں شریک ہوں، جو اس عطیہ خطاب کی غرض سے کی گئی ہے، جس کے لیے یہ سند اور خلعت ثبوت اور علامت ہیں۔

اس خطاب کی تاریخ لارڈ ڈفرن کی اس عبارت سے معلوم ہوتی ہے جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ کیوں کر ۱۸۸۷ء میں قائم کیا گیا، ہز اکسلنسی وائسرائے اور گورنر جنرل نے اس امر پر توجہ فرمائی تھی کہ اب تک کوئی ایسا مناسب ذریعہ موجود نہیں جس سے ہم ان ہندوؤں اور مسلمان اشخاص کی اعلیٰ لیاقت کی قدر شناسی کر سکیں جو ہز مجسٹی حضور پر نور قیصرۂ ہند کی وفادار رعایا ہیں اور نیز ان کو اس امر کی خواہش تھی کہ جشن جوبلی کی یادگار قائم رکھی جائے، پس انہوں نے ایک نئے خطاب کی تجویز کی جو ان ہندو اور مسلمان اشخاص کو عطا کیے جائیں، جنہوں نے علومِ مشرقی کی ترقی میں کارہائے نمایاں کیے ہوں۔

ہز اکسلنسی وائسرائے اور گورنر جنرل نے ہدایت فرمائی .... کہ یہ خطاب مسلمانوں کے لیے شمس العلما ہوگا، یہ خطاب شخص مخاطب کے نام کے اول میں اضافہ کیا جائے گا.......... خطاب شمس العلما کے ساتھ ایک خلعت بھی عطا کی جاوے گی، جس میں ایک عمامہ اور ایک عبا ہوگی، جن اشخاص کو شمس العلما کا خطاب عطا ہوگا وہ دربار میں ان اشخاص سے متصل دوسرے درجہ پر بیٹھیں گے جن کو نواب کا خطاب ملا ہوگا۔

شمس العلما مولوی شبلی نعمانی! اس رسمِ خلعت کے انجام دینے پر اس سند کے نذر کرنے کے ساتھ جس پر ایسے قابل اور عالی دماغ اور راست رو وائسرائے اور گورنر جنرل کا طغرا ہے، جس سے بہتر ہندوستان کی خوش قسمتی کے حصہ میں نہیں آیا، میں (آپ کے لیے) یہ چاہتا ہوں کہ آپ کی عمر دراز ہو، نہ صرف اس لیے کہ اس سزاوار عظمت سے لطف حاصل کیجیے، بلکہ اس واسطے کہ جس طرح ترقی علومِ مشرقی میں آپ نے ایسے کارہائے نمایاں کیے ہیں جس سے یہ امتیاز حاصل کیا، اسی طرح اس سے بھی زیادہ

نمایاں خدمت اپنی قوم اور انگلش قوم کے واسطے کرتے رہیے، جس کے ساتھ ساتھ عروج کرنا آپ کی قوم کے لیے مقدر ہے اور اپنے پرزور اثر کو جو آپ کی ممتاز لیاقت سے پیدا ہوتا ہے، اس معزز امر کے استحکام اور وسعت کی طرف مائل رکھئے، جس کو آپ کے پرنسپل دل پسند الفاظ (برٹش کی وفاداری، انگلش کے ساتھ دوستی اور جوش، سلف ہلپ کے بلند اور روز افزوں خیالات) کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، یہی تین باتیں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ میں ایسی ہیں جن کو ان کی علامت اور اثر قدیم اور اس کی روح کہہ سکتے ہیں اور جو اپنی مثال اور اثر سے ہندوستان بلکہ دنیا پر اس سچے اصول کا اظہار کر رہی ہیں جس سے ایک قومی مگر زوال یافتہ قوم اپنی تلف کردہ عظمت کی بنیاد ایسے انداز پر ڈال سکتی ہے جو اس کے لیے باعث عزت اور اس کے فرماں رواؤں کے لیے باعث ہم دردی و اعانت ہو سکے، (اس کالج اور اس کے پیارے اور لایق ادب بانی کی نسبت) میں دل سے یہ چاہتا ہوں کہ یہ کالج ایسی مستقل ترقی کے ساتھ استحکام کے مدارج حاصل کرتا جائے کہ اس کے بانی کی درخشاں زندگی کے افق پر کالج کے آیندہ حالات کے خیال سے پریشانی کا ابر نہ چھائے اور اُس کے آخری ایام مسرت کے روشن افق پر بسر ہوں، جہاں فرحت بخش امید کا جلوہ ہے اور جہاں سے کام یابی کا میدان سامنے نظر آتا ہے، جہاں اس کی آنکھیں ارض موعود کو دیکھ کر جس کی جانب وہ اپنی قوم کی رہ بری کرتے ہیں، اس طرح پر روشن ہوں جیسا کہ قومِ بنی اسرائیل کے اس بڑے فدائی کی چشم تیز میں ہو رہی تھی، جس نے اپنی زندگی کو اس بات پر صرف کر دیا تھا کہ قوم کو کشورِ غلامی سے باہر نکالے۔"

یہ تقریر اور اس تقریب کی کارروائی اس زمانہ کے پانیر الہ آباد اواسط فروری ۱۸۹۴ء میں چھپی تھی، جس میں ایک دفعہ چھپ جانا اس عہد کے ہر عزت طلب کی انتہائی آرزو تھی، بہ قول اکبر

ع "بہرِ خدا ہمیں بھی ذرا چھاپ دیجئے"

اس مسرت کے علاوہ جو اراکین وطلبائے کالج نے اس خطاب کے عطا ہونے پر ظاہر کی تھی، تمام ملک کی طرف سے اس پر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا، اخبارات نے مضامین لکھے اور اکثر بزرگانِ قوم نے بہ ذریعہ خط مولانا کو مبارک باد دی، ان سب کے جواب میں مولانا نے حسب ذیل شکریہ آمیز تحریر شایع کی، جس کا حرف حرف اپنے لکھنے والے کے حوصلۂ بلند اور ہمت عالی کا شاہد ہے، اور جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس پورے سیاسی ڈرامہ میں جو اسٹیجوں پر کھیلا گیا، اس کی نظر حقیقت کی بلند سطح سے نیچے

نہیں اتری" عطائے خطاب کی تقریب میں اکثر بزرگانِ قوم نے مبارک بادی کے جو خطوط لکھے اور میرے رتبہ اور حالت سے بہ درجہا بڑھ کر جن الفاظ میں قدردانی کا اظہار کیا، ان کا اثر اگرچہ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ میں "ایاز قدر خود بشناس" کا مقولہ بھول جاتا، تاہم کچھ شبہ نہیں کہ وہ تحریریں میرے دائمی شرف وعزت کی باعث ہیں اور میں ان بزرگوں کا جس قدر شکریہ ادا کروں کم ہے، مسلمانوں کے عہد حکومت میں اور آج بھی جہاں اسلامی حکومت ہے وہاں کے حکومت کے عطا کردہ خطابات سے قومی خطابات کی عزت زیادہ کی جاتی ہے، اس لحاظ سے میری اس عزت افزائی کی نسبت ان بزرگانِ قوم کی طرف سے پسندیدگی اور خوشی کا اظہار جو ہماری قوم کے جائز قائم مقام ہیں، اور جن میں افتخار الدولہ فخر الملک صاحب زادہ محمد عبید اللہ خاں بہادر فیروز جنگ سی ایس آئی، نائب ریاست ٹونک، سردار محمد حیات خان بہادر سی ایس آئی، نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خان صاحب، نواب وقار الملک، مولوی مشتاق حسین، مولوی سید اکبر حسین صاحب جج، حاجی محمد اسمٰعیل خاں کے مبارک نام شامل ہیں، سب سے بڑی عزت ہے، جو مجھ کو عطا کی جاسکتی ہے۔

علی الخصوص لسان الملک فخر قوم اور مخدوم قوم مولانا الطاف حسین صاحب حالی دام مجدہٗ کی نظم جو جناب موصوف نے اس موقع پر لکھی ہے، میرے لیے تمغائے فخر اور سند عزت ہے، بے شبہ یہ وہ بڑی سے بڑی عزت ہے جو مجھ کو حاصل ہوسکتی تھی اور جس کے حاصل ہونے پر مجھ کو اور کسی عزت کی خواہش نہیں ہوسکتی۔"

تماشائے عبرت فروری ۱۸۹۴ء مولانا شبلی مرحوم کے "قومی مسدس" کی تمہید میں اس قومی تماشا گاہ کا ذکر ہے، اس کا واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ میں ایک سالانہ نمایش ہوتی ہے، جس میں ضلع کے اکثر رؤسا، بڑے ساز وسامان سے شریک ہوتے ہیں، ان کے خیمے ڈیرے لگتے ہیں، سرسید نے ان میں سے مسلمان رئیسوں کو کالج کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ایک قومی تماشا گاہ کی طرح ڈالی، لوگوں نے اس کو سنجیدگی کے خلاف سمجھ کر اس کی مخالفت کی، مگر سرسید نے یہ کہہ کر کہ قوم کے لیے سب کچھ گوارا ہے، ۶ رفروری ۱۸۹۴ء کی رات کو علی گڑھ کی نمایش گاہ میں چند خیمے کھڑے کیے، اور ایک اسٹیج ترتیب دیا، اس میں سب سے پہلے نواب حاجی اسماعیل خاں جو عرب اور ٹرکی میں رہ چکے تھے، کپتان کی وردی میں باہر آئے، ان کے ساتھ چند سپاہی تھے، ان سے عربی، فارسی، ترکی، انگریزی میں باتیں کیں، پھر سرسید صاحب آئے اور کپتان سے گفتگو کر کے ایک دل پذیر لیکچر دیا اور آخر میں حافظ کی پوری غزل پڑھی:

ساقیا برخیز و درده جام را خاک برسر کن غمِ ایام را

اس کے بعد چار انگریز پروفیسر آئے اور انہوں نے ساتھ مل کر ایک انگریزی گیت گایا، پھر آغا کمال الدین سنجر طہرانی نے اپنا فارسی قصیدہ:

اے پیروانِ دینِ حنیفِ پیمبری فریاد از ستیزۂ ایں چرخِ چنبری

بڑی شان سے پڑھا، اس کے بعد آغا محمد حسین نے جو مشہور سیاح تھے اور افغانستان، کوہستان مصر اور سوڈان میں کچھ دن رہے تھے، بدوی شیخ کی صورت میں آ کر عربی گیت گایا، اس کے بعد خواجہ محمد یوسف صاحب وکیل نے آ کر تقریر کی اور اپنی اردو مثنوی سنائی، پھر پروفیسر آرنلڈ نے آ کر ایک انگریزی نظم پڑھی، ان سب کے بعد مولانا شبلی صاحب سبز عبا پہنے اور رنگین عمامہ باندھے[1] اسٹیج پر آئے اور اپنا قومی مسدس جو اسی موقع کے لیے تصنیف کیا تھا پڑھا ان کے دل میں خود قومی درد تھا، آواز درد انگیز تھی، مسدس کا مضمون بھی ویسا ہی قومی درد سے بھرا تھا، سب نے مل کر لوگوں کے دلوں پر جو اثر کیا، اس کو ان ہی لوگوں کا دل جانتا ہے، جو اس وقت موجود تھے، یاقوت خاں طالب علم نے مولانا شبلی کا ایک اُردو قصیدہ پڑھا:

بزمِ احباب ہے پر جوش ہے جلسہ کیسا جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشہ کیسا

یہ عبرت کا تماشا تو گزر گیا، مگر مولانا کا یہ مسدس آج بھی عبرت کا تماشا دکھا رہا ہے۔ (تاریخ مدرسۃ العلوم مسلمانان، مرتبہ سید افتخار عالم صفحہ ۸۳،۷۲)

لاہور کا سفر ۱۸۹۵ء "انجمن حمایت الاسلام" لاہور کی مشہور انجمن ہے، اکثر اکابر اس کے سالانہ جلسوں میں شریک ہوتے رہے ہیں، مارچ ۱۸۹۵ء میں اس کے سالانہ اجلاس میں سید صاحب اور ان کے دیگر رفقا نے شرکت کی، اسی سلسلہ میں مولانا بھی تشریف لے گئے تھے، یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ انہوں نے اس جلسہ میں کس موضوع پر تقریر کی۔ (مکاتیب شبلی، اضافہ طبع دوم ۴۳)

الٰہ آباد یونی ورسٹی کا تعلق ۱۸۹۵ء اسی سال الٰہ آباد یونی ورسٹی نے مولانا کو اپنی فیکلٹی آف آرٹس (شعبۂ فنون) اور بورڈ آف اسٹڈی (شعبۂ تدریس) کا ممبر بنایا اور وہ الٰہ آباد یونی ورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے، مولانا ۱۵؍مارچ ۱۸۹۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"رمضان کے بعد ایک مطول یادداشت کورسوں کے متعلق تیار کروں گا"۔

---

[1] یادِ ایام، مولوی عبدالرزاق صاحب کان پوری۔

معلوم نہیں یہ یادداشت کیا تھی اور کیسی تھی، مگر مولانا کے واقف کار سوانح نگار[1] لکھتے ہیں:

''الہ آباد یونی ورسٹی کے قیام کے وقت ایف اے اور بی اے کے امتحانات میں فارسی کورس نہایت آسان بنایا گیا تھا، ایک عرصہ تک جب طلبہ آسانی کے ساتھ اس میں کام یاب ہوتے رہے، تو یونی ورسٹی کے ایک گروہ نے فارسی کورس کے آسان ہونے کی شکایت کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی یونی ورسٹی کی تعلیم میں ایک مضمون ہونے کے ناقابل سمجھی گئی، لیکن عین وقت پر مولانا نے نہایت قابلیت سے ایک کورس تیار کیا، جس کا معیار اس قدر بلند تھا کہ فارسی کا وقار قائم رہ گیا اور اس کا اخراج ملتوی ہوگیا۔'' (صفحہ ۳۳ و ۳۴)

اس کورس کے نثر کے حصہ میں پہلے نظام الملک طوسی کے سیاست نامہ کے ۲۲۵ صفحے ہیں، پھر ۱۰۰ صفحوں میں ابوالفضل کی آئین اکبری کا ایک ٹکڑا ہے، جس میں شعرائے اکبری کا تذکرہ بھی شامل ہے، اس کے بعد خالص نظم ہے، نظم میں پہلے شاہ نامہ فردوسی کے ۹۹ صفحے ہیں، اس کے بعد شعرائے متاخرین میں سے قاآنی کے قصائد کے پچاس ۵۰ صفحے ہیں، پھر قدما میں منوچہری کے قصائد و مسمطات و اشعار کے ۹۱ صفحے ہیں۔

اس کورس کی نثر میں چند باتوں کا خیال رکھا گیا ہے، ایک تو یہ کہ وہ خالص فارسی ہو، دوسری یہ کہ وہ روزمرہ کی باتوں کی تحریر کا سلیقہ سکھائے اور تیسری یہ کہ اس سے مسلمانوں کے آئین حکومت اور تمدن کا نقشہ کھنچ جائے اور متقدم اور ایک متاخر نثر دونوں کا نمونہ پیش نظر ہو جائے، نظم میں بھی صحیفۂ ایران یعنی شاہ نامۂ فردوسی ہے، پھر غزنوی دور کے مشہور قصیدہ گو منوچہری امغانی کا کلام ہے، جس میں ایک خاص قسم کی روانی اور انسجام ہے اور متاخرین میں قاآنی کا نمونہ ہے، جو قاچاری دور کا سب سے بہتر قصیدہ گو تھا اور جس میں لفظوں کی ایسی جادوگری ہے جو شاید ناموزوں طبع کو بھی موزوں بنا دے۔

یہ کورس سالہا سال تک شاید ۱۹۰۳ء تک یا اس کے بعد بھی چلتا رہا، مولانا جب تک کالج میں رہے، سو روپے سال اس کی آمدنی سے کالج کو دیتے رہے۔

قدیم کتابوں کی اشاعت کی تجویز ۱۸۹۶ء

مستشرقین کی کوششوں سے اس زمانہ میں یورپ کے مختلف ملکوں سے عربی زبان کی نہایت نادر اور قدیم کتابیں چھپ چھپ کر شائع ہو رہی تھیں، اس کو دیکھ کر مولانا کا جی بار بار چاہتا تھا کہ کاش مسلمانوں میں بھی علما کا ایک چھوٹا سا گروہ ایسا ہوتا جو اپنے بزرگوں کے ان کارناموں کو کتب خانوں کے گوشوں سے نکال کر منظر عام پر لاتا اور اس طرح اسلام اور مسلمانوں کا نام اونچا ہوتا اور دنیا کو معلوم ہوتا کہ مسلمانوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا کیا کیا ہے۔

[1] مرتبہ محمد مہدی، نائب مہتمم صیغہ تاریخ بھوپال شائع شدہ بشیر سیر یزاتاوہ، ۱۹۲۵ء۔

یہ خیال ان کے دماغ میں سب سے پہلی بار ٹرکی اور مصر و شام کے سفر میں آیا، جب نہایت کثرت سے ان کی نگاہ کے سامنے سے اسلاف کے یہ نادر کارنامے گزرے، چنانچہ سفر نامہ میں جو ۱۸۹۲ء میں لکھا گیا ہے اپنی اس آرزو کو ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے، میں نے کتب خانوں کے بیان میں جو تفصیل کی وہ ایک خاص غرض سے کی، اور میں چاہتا ہوں کو قوم کو اس کی طرف متوجہ کروں، یورپ میں اس قسم کی متعدد انجمنیں قائم ہیں، جن کا مقصد قدیم عمدہ کتابوں کا بہم پہنچانا اور ان کو چھاپ کر شایع کرنا ہے، ان ہی انجمنوں کی بہ دولت عربی زبان کی وہ قدیم اور نادر الوجود کتابیں ہم کو میسر آئی ہیں جن کے دست یاب ہونے کا خیال بھی نہیں آتا تھا، یہی انجمنیں ہیں جنھوں نے تاریخ کبیر ابوجعفر جریر طبری کا کامل نسخہ بہ ہم پہنچایا اور اس کی بہت سی جلدیں چھاپ کر شایع کیں، حالاں کہ مصر و روم کے علما اس نایاب تاریخی خزانہ سے بالکل ناامید ہو چکے تھے اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے تو یقین دلا دیا تھا کہ وہ دنیا سے ناپید ہوگئی، بے شبہ یورپ کا یہ بہت بڑا احسان ہے اور ہم کو اس کا علانیہ اقرار کرنا چاہیے، بزرگانِ قوم سے میری درخواست ہے کہ وہ اس قسم کی ایک عظیم الشان انجمن بنائیں، عام چندے سے کافی سرمایہ جمع کیا جائے، قابل اور لایق مصنفین کتابوں کے انتخاب کے لیے ممبر مقرر ہوں، قسطنطنیہ اور مصر سے کتابیں نقل کرا کر منگائی جائیں اور چھاپ کر شایع کی جائیں، یہ کام بہ ظاہر عظیم الشان اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے غیر ممکن معلوم ہوتا ہے، لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے، اگر چار کرور مسلمانوں میں سے ۱۰۰ مسلمان بھی آمادہ ہو جائیں اور ایک قلیل مقدار چندے کی دینا گوارا کریں تو اس کام کا انجام پانا کچھ مشکل نہیں۔

حیدرآباد میں دائرۃ المعارف الدکنیہ کے نام سے جو انجمن قائم ہے اور جس کے ایک معزز ممبر نواب اقبال یار جنگ بہادر ہیں، ہم کو امید ہے کہ وہ ہماری گزارش پر توجہ کرے گی، ہم شکر گزاری کے ساتھ ان علمی فیاضیوں کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن ہم کو اس سے زیادہ فیاضیوں کی ضرورت ہے اور ہم کو امید ہے کہ دائرۃ المعارف اور زیادہ توجہ اور اہتمام سے اس مقصد پر متوجہ ہوگی۔"

چند سال کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس خیالی آرزو نے اس حد تک ترقی کی کہ اس کو عملی شکل دینا چاہا، چنانچہ مئی ۱۸۹۶ء کی منتقلی میں حسب ذیل تجویز کا اعلان کیا:

"یہ امر مسلّم ہے کہ مسلمانوں نے کسی زمانہ میں تمام علوم و فنون کو نہایت ترقی دی تھی اور ہر فن میں

اپنے خاص اجتہاد اور تحقیقات کے نتائج قلم بند کیے تھے، لیکن رفتہ رفتہ علمی مذاق کو اس قدر تنزل ہوتا گیا کہ آج جو تالیفات و تصنیفات عام طور سے رائج ہیں، اکثر وہ ہیں جن میں ایجاد و جدت کی جھلک تک نہیں پائی جاتی، قدما کی تصنیفات جن میں ہر جگہ اجتہاد و ذاتی تحقیقات سے کام لیا گیا ہے، عموماً متروک ہیں، خال خال کوئی قلمی نسخہ کسی بڑے کتب خانہ میں پایا بھی جاتا ہے تو ہر شخص کو وہاں تک دست رس نہیں اور اس وجہ سے گویا ان کا عدم و وجود برابر ہے۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ مثلاً فقہ حنفی کا تمام تر دارومدار امام محمد کی روایات اور تصنیفات پر ہے جن کو اصطلاحِ فقہ میں ظاہر الروایہ کہتے ہیں، لیکن ان میں سے بہ جز جامع صغیر کے جو نہایت مختصر اور سب سے چھوٹی ہے، ایک کتاب بھی موجود نہیں، یہاں تک کہ قسطنطنیہ اور مصر کے عظیم الشان کتب خانے بھی ان سے خالی ہیں، اسی طرح فلسفہ اور منطق میں مسلمانوں کو جن نام وروں پر ناز ہوسکتا ہے وہ یعقوب کندی، فارابی، ابن رشد ہیں، لیکن ان کی تصنیفات اس قدر نایاب ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہے، قرآن مجید کے اعجاز و فصاحت و بلاغت پر جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں سے تمام ہندوستان میں ایک کتاب بھی موجود نہیں، تاریخ کی قدیم اور نادر تصنیفات تو گویا ہمارے ملک میں سرے سے آئی ہی نہیں، بعض قدیم کتابیں جو یورپ میں چھپی ہیں، لیکن قطع نظر ان کے گراں قیمت ہونے کے ہر شخص کو بہم نہیں پہنچ سکتیں، ان واقعات کی بنا پر مجھ کو یہ خیال آیا کہ ایک مجلس قائم کی جائے جو اس مفید اور اہم کام کو انجام دے، اگر چہ حیدر آباد کی مجلس دائرۃ المعارف کا بھی یہی موضوع ہے، لیکن جو تجربہ اس کے ابتدائی قیام سے اس وقت تک ہوا ہے، اس کے لحاظ سے یہ کہنا ناموزوں نہیں کہ وہ اس درد کی پوری دوا نہیں۔

ملک میں عربی زبان کی جو کساد بازاری ہے، اس کے لحاظ سے اگر چہ یہ تجویز فی الجملہ بے محل معلوم ہوتی ہے، لیکن ۵ کروڑ مسلمانوں میں سے دو چار سو ایسے شائق ضرور نکل آئیں گے جو معمولی قیمت پر کتاب کو خرید لیں اور اگر اتنا بھی ہوا تو ہم اس کام کے شروع کرنے پر آمادہ ہیں، بالفعل یہ تجویز ہے کہ اس مجلس میں تین قسم کے ممبر قرار دیے جائیں۔

(۱) وہ لوگ جو ۱۰ سالانہ چندہ دینا منظور فرمائیں اور یہی لوگ اراکین مجلس قرار دیے جائیں گے، اور ان کو امور انتظامی مجلس میں رائے دینے کا حق حاصل ہوگا اور نیز جو کتاب یا کتابیں چھاپی جائیں گی، گو کہ ان کی قیمت ان کے چندۂ ممبری سے زائد ہو، ان کو دی جائیں گی۔

(۲) وہ اہل علم جو اس کام میں اپنی رائے اور واقفیت و تلاش سے امداد دیں اور اس قسم کی کتابیں بہم پہنچائیں، ان کو یہ حق حاصل ہوگا کہ مجلس ان کو تمام تجویزات اور حالات سے وقتاً فوقتاً مطلع کرتی رہے گی اور ایک یا دو نسخہ کتاب مطبوعہ کا ان کو نذر کرے گی۔

(۳) وہ لوگ جو یہ منظور کریں کہ کتاب کے چھپنے پر ایک نسخہ قیمت معینہ پر خرید لیں گے، ان بزرگوں کا نام ایک رجسٹر میں درج کر لیا جائے اور جو کتاب چھپے گی اس کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں ویلیو پی ایبل بھیج دیا جائے گا۔

یہ بتا دینا بھی ضرور ہے کہ سر دست جن کتابوں کا شایع کرنا پیش نظر ہے وہ پانچ روپیہ قیمت سے زیادہ کی نہیں، اس غرض کے لیے جو کتابیں ہیں اس وقت تک ہم بہم پہنچا چکے ہیں، یا جو نہایت جلد بہم پہنچ سکتی ہیں، حسب ذیل ہیں:

اعجاز القرآن، امام باقلانی، طبقات الشعرا، لابن قتیبہ، مناقب الشافعی للامام الرازی، مجموعۂ رسائل فارابی جس میں ۱۵ رسالے شامل ہیں، تلخیص المقال ابن رشد مطبوعۂ یورپ، عمدہ لابن رشیق القیروانی، تاریخ صغیر امام بخاری۔

ہم کو ملک کے تمام بزرگوں سے امید ہے کہ وہ اس تجویز کی بابت ہم سے خط و کتابت فرمائیں گے اور ہم کو مطلع فرمائیں گے کہ ان کو تین قسم کے ممبروں میں سے کس قسم کا ممبر ہونا منظور ہے اور یہ کہ ان کے نزدیک کتب مذکورۂ بالا میں سے اول کس کتاب کو شایع کرنا زیادہ مناسب ہے۔

مگر یہ تجویز عمل میں نہ آسکی، تاہم اس کا یہ فائدہ ہوا کہ لوگوں کی توجہ ان نادر کتابوں کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوئی، تاریخ صغیر امام بخاری اور رسائل فارابی تو ہندوستان ہی میں چھپے، باقی طبقات الشعراء ابن قتیبہ، اعجاز القرآن باقلانی، عمدہ ابن رشیق قیروانی، تلخیص المقال ابن رشد وغیرہ مصر سے چھپ کر نکلیں۔

"دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن" نواب عماد الملک مرحوم، ملا عبدالقیوم مرحوم اور مولانا انوار اللہ خاں صاحب کی کوششوں سے سرکار نظام کی امداد سے تقریباً ۱۸۹۰ء میں حیدر آباد دکن میں قائم ہوا تھا جس کا مقصد عربی کی قدیم و نادر کتابوں کی اشاعت تھی، مگر وہ ان دنوں زیادہ تر مذہبی کتابوں کی اشاعت میں مصروف تھا، مولانا کی بار بار کی چھیڑ چھاڑ سے اس نے ادھر توجہ کی اور اگست ۱۸۹۴ء میں

دائرۃ کی طرف سے مولانا سے خواہش کی گئی کہ وہ دائرہ کے کاموں کے لیے ایک نقشہ تیار کردیں، چنانچہ نومبر ۱۸۹۴ء کو مولانا نے ایک مفصل خاکہ بنا کر بھیج دیا، جس میں علوم قرآن کی بعض نادر کتابوں کے پتے اور خصوصیات لکھے، یہ تمام خط و کتابت مولوی سید ہاشم صاحب ندوی کے بہ دولت معارف مئی ۱۹۳۰ء میں چھپ چکی ہے، بحمد اللہ دائرہ آج تک برابر اپنے کاموں میں پوری طرح مصروف ہے۔

قدیم حنفی فقہ کی جن بنیادی کتابوں کی طرف مولانا نے توجہ دلائی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے بھی اسی سرزمین دکن کے ایک مخلص قندھاری عالم کو توفیق بخشی، جس نے بڑی محنت اور ایثار سے حیدرآباد میں ''احیاء المعارف النعمانیہ'' کے نام سے ایک مجلس قائم کی ہے اور اس وقت تک ہندومصرو شام اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں سے متعدد نادر کتابیں بہم پہنچا کر تحشیہ و تصحیح کے ساتھ شایع کی ہیں جزاهم الله خير الجزاء اس طرح جو تجویز ایک دردمند دل سے نکلی تھی وہ دردمند دلوں کو متاثر کرگئی۔

حیدرآباد کا دوسرا سفر اور عطائے وظیفہ ۱۸۹۶ء | مولانا علی گڑھ کی کشمکش سے گھبرا کر یک سوئی اختیار کرنا چاہتے تھے، مگر حالات موزوں نہ تھے، والد بزرگ وار پر بار ڈالنا نہیں چاہتے تھے، اور کوئی دوسری صورت سامنے نہ تھی، لیکن خوش قسمتی سے حیدرآباد میں اس وقت نواب وقار الامرا بہادر کی وزارت تھی اور مولوی سید علی بلگرامی کو جن سے مولانا کے خاص روابط تھے، نواب صاحب کے یہاں خاص رسوخ حاصل تھا، موصوف نے ان کو حیدرآباد بلایا، وہاں چار پانچ ہفتے جا کر رہے، نواب صاحب ممدوح کی سفارش سے اعلیٰ حضرت نظام الملک میر محبوب علی خاں نے از راہِ قدردانی سو روپے ماہوار کا وظیفہ ۳ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ سے منظور فرمایا اور یہ شرط کی کہ آیندہ سے مولانا کی تمام تصنیفات سلسلہ آصفیہ میں شامل ہوں، اس وظیفہ کے ساتھ حسب ذیل فرمان عنایت ہوا، مولوی شبلی صاحب جو اس وقت علی گڑھ کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر ہیں، چار ہفتہ سے بلدہ میں مقیم ہیں، مولوی صاحب ایک نہایت قابل اور لائق شخص ہیں اور تصنیف میں ایک خاص مذاق رکھتے ہیں، ان کی قدردانی گورنمنٹ انگریزی اور گورنمنٹ روم سے بھی بہ عطائے خطاب و تمغہ ہوئی ہے، اب ان کی تمنا یہ ہے کہ اپنے پورے وقت کو تصنیف کے کام میں صرف کریں اور معمولی درس و تدریس کو ترک کردیں، مولوی صاحب موصوف کو تصنیف کے کام میں فارغ البالی کے ساتھ مصروف کرنا ایک قومی کام ہے اور اس وقت کوئی عالم ہندوستان میں ایسا نہیں ہے جو پرانے ذخیروں سے اس طرح کام لے چوں کہ سرکار

سے ایسے شخص کی اعانت ضرور ہے، لہٰذا سرکار نے بالفعل سو روپیہ کلدار ماہوار جاری کرنے کے لیے منظوری صادر فرمائی ہے اور یہ بھی حکم دیا ہے کہ ان کی تصنیفات کے دیکھنے کے بعد اضافہ کیا جاوے گا، جو کتابیں مولوی صاحب موصوف تصنیف کریں گے، وہ سرکارِ آصفیہ کے نام سے مشتہر ہوں گی، پس حسب الحکم سرکار تاریخ حکم سے جو ۳ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ ہے، سو روپیہ کلدار ماہوار شمس العلما مولوی شبلی صاحب کے نام جاری کیا جاوے، ایک مثنیٰ اس کا مولوی شبلی صاحب کو دیا جاتا ہے۔

یہ قدر دانی تو سرکار کی طرف سے ہوئی، دارالسلطنت کے امرا اور اکابر اور اہل علم نے بھی قدر دانی میں کمی نہیں کی، چنانچہ مولوی عزیز مرزا[۱] مرحوم، مولوی مسعود علی صاحب بی اے محوی (حال مترجم دارالترجمہ) مولوی عبدالغنی صاحب وارثی بہاری مددگار محاسب سرکار عالی اور مولوی محمد جامع صاحب مددگار معتمد عدالت کی کوششوں سے ۱۱ ربیع الاول کو کاسماپولیٹن ہوٹل میں (جس کو اب محسن الملک کی کوٹھی کہتے ہیں) ایک کامیاب جلسہ ہوا، مولوی خدا بخش خاں مرحوم جن کی پٹنہ میں لائبریری مشہور ہے اور جو ان دنوں وہاں کی عدالت عالیہ یعنی ہائی کورٹ میں میر مجلس (چیف جسٹس تھے) جلسہ کے صدر تھے۔

جلسہ میں پہلے مولوی عزیز مرحوم نے ایک "سپاسنامہ" مولانا کی خدمت میں پیش کیا، اس سپاس نامہ[۲] پر بعض بڑے بڑے امرا جیسے رکن الملک خاں دوراں، ترآب جنگ، عماد نواز جنگ جہاں گیر یار جنگ، تفضّل یار جنگ، حیدر یار جنگ، حسن یار جنگ، انتظام جنگ، بعض اکابر علما جیسے سید شاہ عبدالرحیم قادری، مولوی حکیم عبدالرحمٰن صاحب سہارنپوری (خلف مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری) مولوی وحیدالدین صاحب مدرس دارالعلوم اور بعض وکلائے ہائی کورٹ، جیسے محمد سلیمان بیرسٹرایٹ لا، سید ابوالقاسم وکیل ہائی کورٹ، فدا حسین خاں وکیل ہائی کورٹ، محمد عبدالباقی صاحب ہائی کورٹ بعض اور معززین جیسے سید محمد مہدی خاں، میر نثار حسین سید لطف علی، محمد زماں خاں، نصیرالزماں، سرفراز حسین وغیرہ کے دستخط ہیں، بعض صاحبوں کے دستخط پڑھے نہیں گئے، سپاس نامہ یہ ہے۔

---

۱ یہ تفصیلی حالات آئندہ نظم کے سلسلہ میں جناب مولوی نصیرالدین ہاشمی نے معارف کے لیے لکھ کر بھیجے تھے، اور جو معارف اکتوبر ۱۹۲۵ء میں چھپے، اسی قسم کی اطلاع منشی ظفرالملک صاحب علوی، اڈیٹر الناظر نے جو ان دنوں حیدرآباد میں تھے، اور نواب اکبر یار جنگ بہادر (سابق معتمد عدالت سرکار عالی) نے ہم کو بھیجی تھی۔ ۲ یہ اصل سپاس نامہ اس وقت تک دارالمصنفین میں موجود ہے اور میرے پیش نظر ہے۔

بہ خدمت فیض درجت جناب فضیلت انتساب شمس العلما مولوی محمد شبلی نعمانی صاحب تمغۂ مجیدیہ دام افضالکم

عالی جناب!

ہم لوگ جنہیں آپ کے ہم وقت ہونے کا افتخار حاصل ہے، اس موقع پر جب کہ آپ شہر فرخندہ بنیاد حیدر آباد میں تشریف فرما ہوئے ہیں، آپ کے خیر مقدم کے لیے حاضر ہوئے ہیں اور ان احسانوں کو یاد کر کے جو آپ نے قوم اور ملک پر اپنی عالم گیر تصنیفات کے ذریعہ سے کیے ہیں، شکر گزاری کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، آپ کی پُر جوش مثنوی ''صبح امید'' نے سب سے پہلے ایک نئے مگر دل ربا انداز سے قومی ترقی کے آفتاب کے طلوع ہونے کی خوش خبری سنائی اور ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' نے ہمارے علمی عروج اور دماغی ترقی کی خوش گوار داستان سنا کر ہمارے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ جب ہمارے اجداد نے اس تاریکی کے زمانہ میں کچھ کیا تو ہم اس روشن زمانہ میں کیا کچھ نہیں کر سکتے، آپ کی مورخانہ تحقیق نے مامون الرشید کے حالات اس خوبی سے جمع کیے کہ اسلامی سلطنت کی عظمت و جبروت اور دربار خلفا کی شان و شوکت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا اور وہ اسباب جن کے لحاظ سے اس زمانہ میں مسلمان دوسری قوموں سے میدانِ تہذیب و شایستگی میں آگے تھے، خود بہ خود ظاہر ہو گئے، آپ نے سیرۃ النعمان میں نہ صرف ایک ایسے پیشوائے مذہبی کے متبرک حالات سے ہم کو آشنا کیا جس کی بے لوث زندگی بعد میں آنے والوں کے لیے ایک عمدہ نمونہ تھی، بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ شریعت غرائے مصطفوی جس طرح نجاتِ اخروی کے لحاظ سے صراط مستقیم ہے، اسی طرح دنیاوی معاملات کے لیے بھی ایک عمدہ دستور العمل ہے اور یورپین مصنفوں کا یہ خیال کہ وہ رومن جورس پروڈنس کی ممنونِ احسان ہے، راستی سے کس قدر بعید ہے، آپ نے کتب خانۂ اسکندریہ کے متعلق نہایت عالمانہ تحقیق سے کام لے کر اس دھبہ سے اسلام کے دامنِ عزت کو بالکل پاک و صاف کر دیا، جو عیسوی تعصب نے ایسے اصرار سے لگایا تھا کہ ایڈورڈ گبن جیسے نام ور مؤرخ کی پر جوش کوششیں بھی اس کو نہ مٹا سکیں، آپ نے یورپین نکتہ چینوں کے مقابلہ میں قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ جزیہ کی بنیاد مذہبی تعصب نہ تھی بلکہ وہ ایک فوجی ٹیکس تھا، جس کی ضرورت اس زمانہ میں بھی مسلّم ہے، اور حال میں جب ارمنی سازشوں کی بہ دولت یورپ میں دریائے تعصب ایسا جوش زن ہوا کہ خود اسلام کو بنی نوع انسان کے حق میں قہر الٰہی سمجھنے لگے، تو یہ آپ ہی کی باریک نظر اور پر زور قلم تھا کہ

جس نے حقوق الذمیین کی تشریح کر کے بتادیا کہ جیسے فیاضانہ اصولِ شریعت اسلامیہ میں مفتوحین سے برتاؤ کے متعلق قائم کیے گئے ہیں، ان کی نظیر دنیا کی تاریخ میں بہت مشکل سے مل سکتی ہے، آپ نے در اصل تاریخ سے اس کی بوسیدہ ہڈیوں میں روحِ تازہ پھونک کر ایک ایسا کام لیا ہے جو ہمارے خیال میں بھی نہ تھا اور اس لحاظ سے اردو لٹریچر ہمیشہ آپ کا ممنونِ احسان رہے گا، آپ نے صرف اپنے قلم اور دماغ ہی سے امت مرحومہ کی حمایت نہیں کی ہے، بلکہ آپ کے علمی ذوق اور اسلامی جوش نے ایک دور دراز سفر اختیار کیا اور وہاں سے ایک ایسا بیش بہا تحفہ ساتھ لائے جس نے ہمارے ذخیرۂ معلومات میں معتد بہ اضافہ کرنے کے علاوہ ہماری قومی ہمدردی کو وسیع کر کے ترکی سے ہمارے رابطۂ اتحاد کو اور بھی مضبوط کر دیا، اگرچہ سلطان المعظم اور سرکار عظمت مدار اور خود ہی ہماری سرکار ابد پائدار نے آپ کی بے لوث کوششوں کی قدردانی میں غفلت نہیں کی ہے، لیکن آپ جیسے بزرگوں کی اصلی قدردانی وہی ہے، جو پبلک کی طرف سے ہو، آپ کی تصنیفات سے ہم حیدرآبادی بھی اسی طرح مستفیض ہوئے ہیں جس طرح کہ ہندوستان کے دوسرے خطہ کے لوگ ہو سکتے ہیں، اور اس لیے ہم پھر اس موقع پر اپنی دلی احسان مندی کا اظہار کر کے خدا سے دعا کرتے ہیں کہ آپ مدت دراز تک اسلام اور قوم کی خدمت گزاری کے لیے زندہ و برقرار اور ہمارے لیے باعثِ افتخار ہیں، آمین ثم آمین، فقط۔"

اس سپاس نامہ کے پڑھے جانے کے بعد مولانا کھڑے ہوئے انہوں نے پہلے اس سپاس نامہ کے جواب میں دو بندوں کا ایک یہ فارسی ترکیب بند[1] اپنے خاص پر اثر لہجہ میں پڑھا:

اے دکن ایکہ جہاں را سر و سودا باتست — اے کہ مجموعۂ صد یاس و تمنا باتست
اے کہ صد نقش زہر پردہ بر انگیختہ — اے کہ صد جلوہ گری ہائے تماشا باتست
زاہد استی کہ سرِ صدق و صفا ہست ترا — شاہد استی کہ دلآویز اداہا باتست
سازِ نیرنگی و صد نغمۂ رنگیں داری — لوحِ از زنگی و صد پیکرِ زیبا باتست
یادگارِ حشم ویلم و سلجوق استی — مایۂ دولتِ بغداد و بخارا باتست
داستاں ہائے عزیزاں ہمہ از برداری — خبر از قافلۂ یثرب و بطحا باتست

---

[1] یہ ترکیب بند ہمارے پاس پورا نہ تھا، اور کلیات میں بھی نہ شامل ہو سکا، مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی (حیدرآباد دکن) کے ہم ممنون ہیں کہ انہوں نے ۱۹۲۵ء میں اس کو ہمارے پاس بھیجا۔

آں پراگندہ نژادِ عرب و نسلِ عجم | یعنی آں دفترِ اسلام مجزا با تست
گرچہ شیرازۂ امت ہمہ ابتر شدہ است | آں ورق ہائے پراگندہ بیک جا با تست
گرچہ زاں میکدہ اکنوں اثرے نیست بہ جائے | جرعۂ چند ازاں شیشہ و مینا با تست
گرچہ آں تازہ چمن رفت بتاراجِ خزاں | باز ہم بوئے خوشے زاں گلِ رعنا با تست

گرمیِ صحبتِ آں میکدہ سرجوشِ تو ہست
مصر و غرناطہ و بغداد در آغوشِ تو ہست

اے بزرگانِ گراں پایہ و ارکانِ دکن | اے ہمہ شمعِ فروزندۂ ایوانِ دکن
ہر سرِ موئے من امروز زبانے شدہ است | بہ سپاس آوری منتِ اعیانِ دکن
پائے تا سر ہمہ در بند کرم ہائے شماست | می تواں خواندنم از جملہ اسیرانِ دکن
با غریبے چو منے ایں ہمہ الطاف و کرم | چہ کنم! گر نہ شوم بندۂ احسانِ دکن
ہم زگیرائیِ اخلاقِ دل آویز بود | کہ بود رومی و شامی ہمہ مہمانِ دکن
بوئے خُلق است کہ دل می بردم ورنہ مرا | نتواند کہ فریبد گل و ریحانِ دکن
یارب آں باد کہ ایں تخت گہِ دولت و دیں | سبز و خرم بود از فیضِ سلیمانِ دکن
میر محبوب علی خان نظام آصف جاہ | تاجدارِ دکن و قیصر و خاقانِ دکن
صدر جم مرتبہ نواب وقار الامرا | آنکہ صد پایہ فزود از شرفش شانِ دکن
واں دگر صدر نشینان و عزیزانِ وطن | کہ بود از دمِ شاں زینتِ ایوانِ دکن

ہمہ را بزمِ طرب با سرو ساماں باشد
شبلی خستہ ہم از حاشیہ بوساں باشد

یہ ترکیب بند لوگوں کو اس قدر پسند آیا کہ بہت سے لوگوں نے اس کو حفظ کر لیا اور آج (۱۹۲۵ء) اس کو مزہ لے کر دہراتے ہیں[1]، بعض خوش وقت شاعروں نے اس کا جواب لکھا، قصیدہ کے بعد مولانا نے اعجاز القرآن کے موضوع پر دل آویز تقریر فرمائی، جلسہ میں اہل علم کا کافی مجمع تھا، اس لیے وہ بہت لطف اندوز ہوئے۔

---

[1] یہ بیان بھی ہاشمی صاحب ہی کا ہے، جنہوں نے شرکائے جلسہ کی زبانی سن کر لکھا ہوگا۔

مولانا کے اس سفر سے بعض ارکان کالج کو یہ خیال ہو چکا تھا کہ وہ کالج چھوڑنا چاہتے ہیں، چنانچہ اس سفر کا حال سن کر نواب محسن الملک نے مولانا شبلی کو ایک خط لکھا، یہ خط تو نہیں ملا، لیکن مولانا نے اس کا جو جواب دیا وہ مکاتیب میں داخل ہے، یہ خط معاملہ پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے، غالباً نواب صاحب نے مقصد سفر کے بھانپنے کے لیے یہ لکھا تھا کہ آپ شاید اپنے نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے چندہ کے لیے حیدرآباد گئے ہیں، مولانا ۱۵ر ستمبر ۱۸۹۶ء کو حیدرآباد سے ان کو جواب دیتے ہیں۔

جناب من!

آپ کا خط پڑھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی، آپ لوگ مجھ کو اس قدر بھولا اور سادہ دل سمجھتے ہیں، اسکول کے لیے میرا یہاں رہنا مفید ہوتا تو کیا رہ جاتا، لیکن یہاں کا روپیہ ہمیشہ یہیں خرچ ہوتا ہے، باہر نہیں جاتا، مجھ کو سرِ دست ماہ وار سے زیادہ نہیں مل سکتے اور یہی یہاں کا خرچ ہے، پھر جس قدر تنخواہ بڑھتی ہے، خرچ بڑھ جاتا ہے، البتہ اگر یہاں کی سوسائٹی میں مبتذل، بدحیثیت، بے وقعت ہو کر رہوں تو پس انداز ہو سکتا ہے، باقی وہاں کے لیے یہاں کے لوگوں سے چندہ یہ کس قدر حماقت کا خیال ہے۔

مولوی صاحب روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں، میں کچھ ابراہیم ادہم اور بایزید نہیں ہوں، میرا تو رُواں رُواں دنیا کی خواہشوں سے جکڑا ہوا ہے، لیکن دنیا کو سلیقہ کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں، مجھ سے جوڑ توڑ، سازش، درباداری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہیں ہو سکتی اور بغیر اس کے کامیابی معلوم،

اس لیے میں نے گوشۂ عافیت پسند کیا۔

یہاں مجھ سے میری خواہش کا استفسار ہوا، میں نے کہا موجودہ آمدنی کے ساتھ کالج کے تعلق سے آزادی، چنانچہ اسی قدر ماہ وار کا منصب مقرر ہو گیا، الفاروق کے بعد غالباً ۱۵۰ یا ۲۰۰ روپے ہو جائے، روبکار میں بھی اضافہ کا وعدہ درج کر دیا گیا ہے، گو مقدار کی تعیین نہیں، بس میری تنہا زندگی کو یہ بہت ہے، تاہل کا ارادہ نہیں، زیادہ دھوم دھام کی خواہش نہیں، بے زحمت خدا نے اس قدر دیا تو لاکھ لاکھ شکر ہے، اور یوں تو ع کاسۂ چشم حریصاں الخ...... رہا قوم کی خدمت کرنی، اس کی تدبیر یہ نہیں کہ جھوٹی سفارش کر کے دو چار کو نوکری دلا دی جائے اس کو اس قابل بنانا چاہیے کہ وہ خود اپنی سفارش کر سکیں۔

اس خط کا تیور ذرا تیکھا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ بعض ارکانِ کالج کے طرزِ عمل سے ان کی

ناراضی کس حد تک تھی۔

مولانا کا یہ خیال کہ الفاروق کے بعد ان کے منصب میں ترقی ہو جائے گی، درست نہیں نکلا، آخر ۱۹۱۳ء میں نواب عماد الملک مرحوم کی سفارش سے حضور نظام میر عثمان علی خاں کے عہد میں یہ توقع پوری ہوئی، اعلیٰ حضرت نے دوسو کا اضافہ فرما کر تین سو کر دیے، اس کے بعد مولانا جئے ہی کے دن، آخر یہ رقم دار المصنّفین کے کام آئی۔

مولانا سے انگریزوں کی سیاسی بدگمانی اس زمانہ میں ''پین اسلامزم'' کا ہوا سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سلطان عبد الحمید خاں اس کے مرکز اور دنیائے اسلام کے ہر حصہ میں ان کے نائب موجود ہیں، جو اس تحریک کو چلا رہے ہیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ یورپ کے برخلاف تمام دنیا کے مسلمانوں کو متحد ہو کر کے ان کو اسی طرح بغاوت پر آمادہ کرنا ہے، جس طرح یورپ کی سلطنتیں ٹرکی کی عیسائی رعایا کو اُبھار کر بغاوت پر آمادہ کر رہی ہیں۔

سفر روم سے واپسی کے بعد انگریز حکام میں مولانا کی طرف سے یہ بدگمانی پھیلی کہ وہ اسی ''پین اسلامزم'' (اتحاد اسلامی کی تحریک) کے داعی اور سلطان عبد الحمید خاں کے سفیر بن کر ہندوستان واپس آئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس وقت تک ہندوستان میں ترکوں کے متعلق جو معلومات پھیلے تھے، وہ زیادہ تر عیسائی مضمون نگاروں اور یورپین اہل قلم کے پھیلائے ہوئے تھے، جن میں بڑا حصہ تعصب کی رنگ آمیزی کا تھا، اس سفر نامہ نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ٹرکی کے متعلق بہ راہِ راست معلومات کا سرمایہ بہم پہنچایا اور ان کے اخلاق و معاشرت اور علمی وفنی ترقیوں سے آگاہ کیا اور اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کو مصنف کی ہزار احتیاطوں کے باوجود ٹرکی سے مربوط ہونے کے لیے تعلقات کی ایک نئی زنجیر پیدا کر دی، انگریز حکام نے ع اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

اتفاق دیکھئے کہ اُسی زمانہ میں کالج میں کوئی جلسہ تھا جس میں مولانا نے اردو کا ایک وہ قصیدہ پڑھا جس کا مطلع تھا:

بزمِ احباب ہے پُر جوش ہے جلسا کیسا
جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشا کیسا

اس میں ایک شعر تھا:

نو جوانو! یہ حریفوں کو دکھا دینا ہے
اپنی قوت کو کیا قوم نے یک جا کیسا

اس شعر کو پڑھتے وقت حریفوں کے لفظ پر بے اختیار انگلی ان انگریزوں کی طرف اٹھ گئی جو جلسہ میں بیٹھے تھے، سمجھانے والوں نے ان کو سمجھایا کہ یہ اشارہ انگریزوں کی طرف تھا، اور یہ طالب علموں کی بغاوت کا سبق تھا، ایک انگریز نے دوسرے سے کہا اور بات عام ہوگئی، مولانا فرماتے تھے کہ اسی زمانہ میں وہ علی گڑھ سے آتے ہوئے ریل کی کسی بے ترتیبی سے فیض آباد اتر گئے اور وہاں کے ڈاک بنگلہ میں ٹھہر گئے، بنگلہ کے خانساماں نے مولانا کا نام سنا تو ملنے آیا، مولانا نے پوچھا کیسے آئے تو اس نے کہا کہ کچھ صاحب لوگ یہاں آئے تھے، وہ آپ کا نام لے کر کچھ یوں ہی کہہ رہے تھے، اسی سے دیکھنے کو جی چاہا۔

کالج میں مولانا کی سیاسی رائے کئی دفعہ یونین کے جلسوں میں ظاہر ہو چکی تھی، وہ شخصی سلطنت کو مضر سمجھتے تھے اور جمہوریت کے حامی تھے، اسی عرصہ میں کانگریس کا غلغلہ اٹھا تو وہ اس تحریک کے مداحوں میں نکلے، ابھی یہ آواز دبنے نہیں پائی تھی کہ ۱۸۹۳ء کے اخیر میں ندوۃ العلما کی آواز اٹھی اور اس زور سے اٹھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان میں مولویوں کی حکومت قائم ہو جائے گی، مولانا اس صدا پر لبیک کہنے والوں میں سب سے آگے تھے، ان سب باتوں نے مل ملا کر اُن کے خلاف بدگمانیوں کا اچھا خاصہ مسالہ اکٹھا کر دیا، یہی واقعہ آگے چل کر دوسرے واقعات کے ساتھ مل کر مولانا کے کالج چھوڑنے کا منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب ہوا، سید محمود کے بعد نواب محسن الملک جب سکریٹری ہوئے تو انہوں نے لفٹنٹ گورنر سے مل کر مولانا کی نسبت گورنمنٹ کو جو شکوک تھے، ان کے رفع کرنے کی کوشش کی۔

یہ بدگمانی اتنے دنوں تک قائم رہی کہ جولائی ۱۹۱۱ء میں گورنمنٹ نے شملہ میں جو ایک اورنٹیل کانفرنس بلائی تھی اور جس کے ایک ممبر مولانا بھی تھے، اس میں غالباً مسٹر برن چیف سکریٹری گورنمنٹ یو پی نے جو اردو فارسی اچھی خاصی جانتے تھے، ان سے پوچھا کہ ''انگریزی'' گورنمنٹ کے متعلق مسلمانوں کی رائے شرعی حیثیت سے کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا ''مسلمانوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ ہر ہفتہ جمعہ میں السلطان ظل الله فی الارض پڑھتے ہیں، برن صاحب نے کہا اس سے مراد تو سلطان ٹرکی ہیں''۔

یہ واقعہ مولانا نے مجھ سے ذکر فرمایا تھا اور کہتے تھے کہ دیکھو اب بھی یہ کانٹا ان کے دل سے نہیں نکلا۔

مولانا کے ساتھ ان ہی دنوں خفیہ جاسوس بھی لگائے گئے، سلطان سے جو تمغۂ مجیدی انہیں ملا تھا، وہ نشانِ محبت بھی چوری گیا، خدا جانے یہ چوری سیاسی تھی یا اخلاقی، مگر تولہ بھر چاندی کی قیمت ہی کیا تھی؟

یہی زمانہ ہے جب سرسید کے مشورہ سے مولانا نے خلافت پر ایک مسلسل مضمون لکھا جس میں ترکوں کی خلافت کی مذہبی حیثیت سے انکار کیا تھا، یہ مضمون علی گڑھ میگزین میں چھپا، مگر چوں کہ یہ آورد تھا، آمد نہ تھا، اس لیے وہ ناتمام ہی رہا، ۱۹۲۰ء میں جب میں رکنِ وفدِ خلافت کی حیثیت سے لندن گیا تھا تو پروفیسر آرنلڈ اکثر اس مضمون کو یاد دلاتے تھے، میں کہتا تھا کہ مولانا نے لکھا نہیں، لکھوایا گیا تھا، بہ ہر حال انگریزوں کی یہ بدگمانی بڑھتی ہی رہی، یہاں تک کہ طرابلس، بلقان اور کان پور کے زمانہ میں وہ واقعہ بن کر نمودار ہوئی۔

کشمکش اور اختلاف ہمارے ناظرین اس کتاب کو جس ترتیب سے پڑھتے آ رہے ہیں، اس سے ان کو پتہ لگ رہا ہوگا کہ اب جیسے جیسے دن گزر رہا ہے، سید اور شبلی میں وہ اگلا سا ارتباط اور وہ پہلا سا اعتراف نہیں رہا ہے اور اب وہ موقع آ رہا ہے کہ ان کو سرسید کے حلقہ سے علانیہ باہر آ جانا پڑے۔

اس اختلافِ حال اور کشمکش کے اسباب گو حیاتِ جاوید میں جگہ نہ پا سکے، مگر وہ تاریخ کے اوراق سے گم نہیں ہوئے، ضرورت ہے کہ جہاں تک حیاتِ شبلی کا تعلق ہے، ان اسباب پر ایک نظر ڈال لی جائے اور گو خود مولانا نے کہیں تصریح نہیں کی، مگر ان کی تحریروں کے پردے سے اب بھی روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی ہے، اگر ہم ان شعاعوں کو یک جا کر لیں تو ان اسباب پر دن کی سی روشنی پڑنے لگے گی۔

سرسید میں ساری خوبیوں کے ساتھ ایک بڑی کم زوری یہ تھی کہ وہ اپنے ہم نشینوں سے آمنا و صدقنا کے سوا کوئی اختلافِ رائے برداشت نہیں کر سکتے تھے[1]، اسی کا نتیجہ ان کی اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کی جو ان کے دلی دوست اور معاون تھے، وہ لڑائی ہے جس میں سرسید نے فرانس چل کر ڈوئل تک لڑنے کا چیلنج دے دیا تھا اور بات اتنی تھی کہ مولوی سمیع اللہ صاحب کالج میں مسلمان بچوں کی تربیت کا کام انگریزوں کے ہاتھوں میں نہیں دینا چاہتے تھے، اور سرسید نے تعلیم و تربیت دونوں انہی کے سپرد کر دی تھی، کالج میں مسٹر بک پرنسپل کی ہمہ گیر حکومت، ٹرسٹیز بل کی منظوری اور سید محمود کی جانشینی کے مسئلوں میں ان کے بڑے بڑے دوست ان سے الگ ہو گئے اور اس اختلاف کے صلہ میں سرسید کی زبان سے وہ کچھ سنا جس کی توقع ان سے نہیں ہو سکتی تھی۔

---

[1] حیاتِ جاوید، جلد اول، ص ۲۹۰ میں مولانا حالی نے دبے لفظوں میں اس کا اقرار کیا ہے، لکھا ہے کہ ''اس میں شک نہیں کہ سید احمد خاں بالکل ایک ڈپاٹک طبیعت کے آدمی تھے، اس خصلت کو چاہو ان کے برے کاموں کی بنیاد سمجھو، اور چاہو ان کے اخلاقی عیوب میں شمار کرو، بہ ہر حال یہ خصلت ان میں ضرور تھی''۔

سرسید پر مولانا نے سب سے پہلی تنقید اپنی سب سے پہلی تصنیف ''گزشتہ تعلیم'' میں کی، رسالہ کے بیچ میں تراجم کا بیان ختم کر کے ایک ''ریمارک'' کے نیچے لکھا تھا جس کا حاصل یہ ہے کہ عربوں نے عربی زبان میں دنیا کے علوم کا ترجمہ کر کے اپنے زمانہ میں جو ترقی کی اس قیاس پر آج عمل نہیں کیا جا سکتا، سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے بانیوں کو عربی کے اس واقعہ سے دھوکا ہوا، اور وہ یہ سمجھے کہ جس طرح ہمارے اسلاف نے ترجموں کے ذریعہ سے علوم کو ترقی دی، ہم بھی یورپ کے علوم وفنون کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے اپنے علوم اور قوم کو ترقی دیں گے، یہ خیال غلط تھا، کیوں کہ ان ترجموں کے لیے لاکھوں روپے درکار ہیں، جو خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں ممکن تھا اور اب غیر ممکن ہے، دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں علوم محدود تھے اور ترقی رُک چکی تھی، جس قدر کتابیں ترجمہ کر لی گئی تھیں، یونانیوں کے علوم پر گویا احاطہ کر لیا گیا تھا اور اس زمانہ میں علوم کی ترقی کی انتہا ہے اور نہ کتابوں کے شمار کی حد ہے، تیسری بات یہ کہ اس زمانہ میں عربی اسلامی ملکوں میں حکمراں زبان تھی اور اردو حکمراں زبان نہیں اور دنیا میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں کہ قوم نے اس زبان میں علوم وفنون کو ترقی دی ہو، جو ان پر حکومت کرنے والی نہ ہو، آخر میں تھا، مگر ہم کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ خود سید احمد خاں صاحب نے جو ''سائنٹفک سوسائٹی'' کے بانی ہیں، متعدد تحریروں میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے یہ ہلکا سا اعتراض جس کی معذرت بھی کر دی گئی تھی، سرسید کو پسند نہیں آیا تھا، کیوں کہ مولانا حالی نے حیاتِ جاوید میں اس سرسری سی بات کے جواب دینے کی ضرورت محسوس فرمائی اور حاشیہ کا ایک پورا صفحہ اس کے لیے نذر کیا اور بتایا کہ یہ خیال خود سرسید کی تحریروں سے ماخوذ ہے، مولانا شبلی کا آپ پیدا کیا ہوا نہیں، پھر دکھایا ہے کہ آج کل رعایا اپنی طاقت سے وہ کام کر رہی ہے جو کل تک صرف سلاطین ہی کر سکتے تھے اور یہ بھی فرمایا کہ اگر تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں کہ کسی غیر حکمراں زبان میں علوم وفنون کو ترقی دی گئی ہو تو ضرور نہیں کہ آیندہ بھی نہ ہو[۱]۔

یقیناً مولانا حالی کا بیان صداقت پر مبنی ہے اور جامعۂ عثمانیہ کے وجود نے ہمارے اکابر کے ان مخلصانہ جھگڑوں کا خاتمہ کر دیا ہے، اتفاق دیکھئے کہ حیدرآباد میں اُردو حکمراں زبان کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس نے خلفائے عباسیہ ہی کی طرح اردو تراجم پر روپیہ بہایا اور اس لیے مولانا حالی اور مولانا شبلی دونوں کے

---

[۱] حیاتِ جاوید، جلد دوم، ص ۳۴۸ (نامی پریس کان پور)

شرائط کے مطابق اس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ علوم وفنون کی ترقی کا باعث بنے اور کیا عجیب بات ہے کہ یہ تجویز مولانا شبلی کی اس تحریر کے پینتیس برس بعد خود مولانا شبلی ہی کی تحریک سے عالم وجود میں آئی اور اُن کے شاگرد رشید و برادر عزیز مولانا حمید الدین صاحب کے ذریعہ سے تجویز نے عمل کا پیرایہ اختیار کیا۔

مگر سرسید اور مولانا شبلی کے بیانوں میں ایک ذرا فرق ہے، سرسید نے اپنی تعلیمی شہادت میں یہ تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان میں حکمراں زبان انگریزی ہے، اس لیے ہندوستان میں انگریزی ہی کے ذریعہ تعلیم ممکن ہے اور مولانا شبلی نے یہ نہیں کہا، بلکہ یہیں تک کہہ کر رہ گئے کہ حکمراں زبان ہی کے ذریعہ قوم میں علوم وفنون کی ترقی ممکن ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کوئی قوم اپنی زبان کو علوم وفنون کی زبان بنانا چاہتی ہے، تو اس کو چاہیے کہ پہلے اپنی زبان کو حکمراں زبان بنائے اور آج واقعات کی روشنی میں ہماری زبان حکمراں زبان بننے کی کوشش کر رہی ہے، وہ علوم وفنون کے خزانوں سے بھر رہی ہے۔

بہر حال یہ ایک ضمنی بحث تھی، مقصود یہ ہے کہ سرسید پر تنقید کے لیے مولانا شبلی کی زبان کالج میں آنے کے چند سال بعد ہی کھل چکی تھی۔

اس کے بعد دوسرا سبب مذہبی اختلاف ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید کی صحبت میں مولانا میں جو پہلے ہی سے علوم عقلیہ سے دلچسپی رکھتے تھے، مذہبی عقل پسندی آگئی تھی اور عقل ونقل کی تطبیق کا ذوق پیدا ہوگیا تھا اور اشاعرہ کے بہت سے مسائل کی خامیاں یا غلطیاں ان کو نظر آنے لگی تھیں، مگر یہ قطعاً غلط ہے کہ وہ معتزلی بن گئے تھے، بلکہ یہ ہے کہ وہ شدید حنفی تھے، اور اسی اصول پر وہ علم کلام کی طرف جھکے تو ماتریدیت پر آ کر رکے، بہر حال یہ بحث اپنے موقع پر آئے گی۔

لیکن اس عقلیت پسندی کے باوجود وہ ماشاء اللہ دینیات پر عبور رکھتے تھے اور کلام ومحاوراتِ عرب کے پوری طرح ماہر تھے، اس لیے سید صاحب اپنی تفسیر اور اپنے مضامین میں جو تاویلات کیا کرتے تھے ان کے لیے وہ مولانا سے جس قسم کے معلومات چاہتے تھے، وہ گو ان کے لیے مہیا کر دیتے تھے مگر وہ خود ان کی اس قسم کی تاویلات کو پسند نہیں کرتے تھے[1]، اسی لیے مولانا نے ان کو آہستہ آہستہ عقل پسندی کی آزاد شاہ راہ سے ہٹا کر امام غزالی، رازی، ابن سینا اور قاضی ابن رشد کی تصنیفات سے آشنا اور معتزلہ کے

---

[1] مولانا حالی اپنے مضمون "سرسید اور مذہب" مندرجہ علی گڑھ میگزین (مئی ۱۸۹۸ء) ص ۱۳۴ میں فرماتے ہیں، "مگر اسی کے ساتھ بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں، جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیسے ایسے تاویلات بارد پر اطمینان ہوگیا، اور کیوں کر ایسی فاش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئیں"۔

خیالات سے باخبر کیا، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سرسید کی آزاد خیالی جس کی وسعت کی کوئی حد نہ تھی، آخر میں حکما و متکلمینِ اسلام کے خیالات تک محدود ہو کر رہ گئی۔

ایک دفعہ مولانا فرماتے تھے کہ ''سید صاحب جنات کی حقیقت پر ایک رسالہ لکھ رہے تھے (وہ رسالہ چھپ بھی گیا ہے) اتفاق سے اُسی زمانہ میں امام باقلانی کی اعجاز القرآن آئی، ان میں جنوں کے اشعار ہیں اور جاہلی شعرا کے ایسے اشعار ہیں جن میں یہ بیان ہے کہ جنوں سے ہماری دوستی ہے، وہ ہمارے پاس آتے ہیں اور ہمارے ساتھ کھاتے ہیں، وغیرہ مولانا نے سرسید سے اس کا ذکر کیا تو بولے کہ یہ اشعار ہمارے بڑے کام کے ہیں، ہم کو دیجئے لیکن سرسید ان اشعار کو اس کام میں لائے کہ کلامِ عرب میں جنوں کے معنی دہقانی، صحرائی یا جنگلی انسان کے ہیں، حالاں کہ مولانا کا یہ منشا نہ تھا، وہ جنات کے مستقل وجود کے قائل تھے، ابن تیمیہ کے مضمون میں فرماتے ہیں، جن کے وجود سے انکار نہیں لیکن جن یوں صورت بدل کر لوگوں کے پاس آیا جایا نہیں کرتے۔

سرسید کا بڑا کارنامہ خرقِ عادت کا انکار ہے اور اسی کے لیے دور از کار تاویلوں پر سارا زور ہے، مولانا اس کے متعلق الکلام میں ایک موقع پر لکھتے ہیں ''قرآن مجید میں اس قسم کے جو واقعات منقول ہیں، فرقۂ جدیدہ (؟) ان کی عموماً تاویل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی مذکور نہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ قرآن مجید بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس قسم کے واقعات مذکور ہونے سے انکار نہیں ہوسکتا، بے شبہ اشاعرہ کی افراط بچوں کی وہم پرستی کے درجہ تک پہنچ گئی ہے، لیکن انکار محض بھی کچھ کم ہٹ دھرمی نہیں، ہمارے زمانہ کے لوگوں نے جو تاویلیں کی ہیں، ہم اس سے بہ خوبی واقف ہیں، بے شبہ یہ تاویلیں نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے کافی ہیں، جو بے چارے عربی زبان اور اس کے طرز و اسلوب سے نا آشنا ہیں، مگر ماہر عربیت کے سامنے یہ تلمیع[1] کیا کام دے سکتی ہے۔''

اسی تصادم سے بچنے کے لیے سرسید کی زندگی بھر مولانا نے عقائد پر کوئی کتاب کیا، کوئی رسالہ یا مضمون تک نہیں لکھا، سرسید اپنے تہذیب الاخلاق کے لیے تقاضا کرتے، تو ٹال جاتے، بہت مجبور کیا تو آخر میں ''المعتزلہ والاعتزال'' کے نام سے ایک تاریخی مضمون شروع کیا، جو یکم محرم ۱۳۱۳ھ مطابق جولائی ۱۸۹۵ء کے پرچہ میں چھپا اور اس کو بھی ناتمام چھوڑ دیا، جس کو مولوی وحید الدین سلیم نے ۱۳ / شوال ۱۳۱۳ھ

---

[1] ملمع سازی۔

کے پرچہ میں ''مشاہیر معتزلہ'' کے عنوان سے جس طرح اُن سے بنا پورا کیا، اس مضمون میں بھی مولانا نے اپنے چھپانے کا اتنا اہتمام کیا کہ صاف صاف اپنا نام شبلی نعمانی لکھنے کے بہ جائے شبلی کی جگہ ''الاسدی'' اور نعمانی کی جگہ ''الاعظمی'' [1] لکھا۔

اسی طرح بعض فقہی مسائل کا حال تھا، سرسید عیسائیوں کی گردن مڑوڑ کر ماری ہوئی مرغی کو اس بنا پر حلال سمجھتے تھے کہ اہل کتاب کے ذبح کا یہ موجودہ طریقہ ہے، اور اہل کتاب کا ذبیحہ اسلام میں حلال ہے، سرسید نے اپنے اس مسلک کی تائید میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے، حالاں کہ گو اس میں شبہ نہیں کہ اہل کتاب کا کھانا (طعام) اور ذبیحہ حلال ہے، مگر اس شرط کے ساتھ ہے کہ محرمات اسلام میں سے نہ ہو، اور دم گھٹ کر مرا ہوا یا دم گھوٹ کر مارا ہوا جانور قرآن پاک کی تصریح ''والمنخنقة'' کے مطابق اسی طرح حرام ہے جیسے سور جس کو سرسید بھی حرام کہتے ہیں اور اس کا کھانا حرام بتاتے ہیں۔

مولانا کو سفر روم میں جہاز پر یہ موقع پیش آیا تو لکھتے ہیں ''چوں کہ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جہاز پر پرند جانور ذبح نہیں کیے جاتے اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے اپنے سفرنامہ میں تجربہ سے اس کی تصدیق بھی کی ہے، میں نے دو تین روز تک پرند کے گوشت کھانے سے پرہیز کیا، مسٹر آرنلڈ نے مجھ سے اس کا سبب پوچھا میں نے کہا ہمارے مذہب میں منخنقة حرام ہے، بولے کہ اس جہاز پر جانور ذبح کیے جاتے ہیں، گردن مڑوڑ کر مارے نہیں جاتے، چوں کہ شرعاً ان کی تنہا شہادت کافی نہ تھی، میں خود گیا اور اس کی تصدیق کی، ذبح کرنے والا عیسائی تھا وہ ذبح کرتے وقت کچھ پڑھتا نہ تھا، صرف گردن پر چھری پھیر دیتا تھا، اگر چہ حنفیوں کے یہاں یہ ذبیحہ حلال نہیں، لیکن اس مسئلہ میں چند دنوں کے لیے میں شافعی بن گیا تھا جن کے ہاں ہر طرح کا ذبیحہ جائز ہے۔'' (سفرنامہ، ص ۱۵)

ایک دفعہ سرسید نے مولانا سے پوچھا کہ ہمارے کالج میں ان تاکیدوں کے باوجود لڑکے نماز کے پابند کیوں نہیں ہوتے، فرمایا اس لیے کہ وہ آپ کو پڑھتے نہیں دیکھتے، آپ شام کو کالج کی تعمیرات دیکھنے مسجد کے سامنے آتے ہیں، مغرب کی اذان اور نماز ہو جاتی ہے اور آپ شریک نہیں ہوتے وہ سمجھتے ہیں کہ آپ نماز نہیں پڑھتے، انہیں کیا معلوم کہ سلسل البول کی وجہ سے کپڑے اتارنے پڑتے ہیں، اور آپ دو نمازیں ملا کر (جمع بین الصلوٰتین) پڑھتے ہیں۔

---

[1] شبلی کے معنی بچہ شیر کے ہیں، اس کا ترجمہ الاسدی اور نعمانی امام اعظم کی طرف نسبت تھی تو اس کو اعظمی کر دیا۔

ایک بات سے دوسری بات پیدا ہوتی چلی گئی، سرسید اپنی تفسیر کا ترجمہ عربی میں کرانا چاہتے تھے اور اس کے لیے ان کی نظر بار بار مولانا شبلی پر پڑتی تھی، مولانا سے جب اس کا ذکر آیا تو انہوں نے اپنی مصروفیتوں کا عذر کیا، اس کے بعد مولانا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب فراہی پر نگاہ پڑی جو اس زمانہ میں عربی کی تکمیل کے بعد کالج میں پڑھتے تھے اور جنہوں نے سرسید کے حکم سے طبقات ابن سعد کے ایک حصہ کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، مگر مولانا حمید الدین صاحب نے انکار کیا اور جب سرسید نے بہ اصرار اس کی وجہ پوچھی تو صاف کہہ دیا کہ وہ اس باطل کی اشاعت میں تعاون علی الاثم کے گناہ میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے، مولانا حمید الدین کی اس صاف گوئی سے گو مولانا شبلی کا کوئی تعلق نہ تھا، مگر سرسید کی بدگمانی میں اس سے اضافہ ہوا۔

سرسید دعاؤں کی قبولیت کے قائل نہ تھے اور اس لیے قبولیت کے لیے دعا مانگنے کو فعل عبث قرار دیتے تھے، اس مسئلہ پر تہذیب الاخلاق میں ان کے مضامین اور ان کے اور نواب محسن الملک کے سوال و جواب چھپ رہے تھے، اُسی زمانہ میں علی گڑھ کے ایک ہندو بزرگ جو اچھے پڑھے لکھے تھے صوفیانہ خیال کے آدمی تھے، اعظم گڑھ میں پوسٹ ماسٹر تھے، انہوں نے سرسید کے مضمون ''الدعا والاستجابہ'' کی تردید میں ایک دل نشیں رسالہ شایع کیا، جس پر نواب وقار الملک نے نہایت عمدہ ریویو لکھا اور اس ریویو کے سلسلہ میں اس پر افسوس کیا کہ سرسید جو نہ صرف مسلمان اور مسلمانوں کے لیڈر ہیں، بلکہ خانوادۂ رسالت کے چشم و چراغ ہیں، وہ تو دعا کو جو بندہ اور خدا میں ربط کا واحد ذریعہ ہے، غیر ضروری اور فضول بتائیں اور ایک ہندو جس کو کافر کہا جاتا ہے، اس کی حمایت کو کھڑا ہو، اس رسالہ کی قوت استدلال اور انداز بیان سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ اس کے مصنف دراصل مولانا شبلی ہیں، اور اس شبہ کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اعظم گڑھ میں لکھا گیا جو مولانا کا وطن تھا اور وہ پوسٹ ماسٹر صاحب مولانا کے واقف کار اور شناسا[1] بھی تھے۔

ان واقعات کے ساتھ الفاروق کی تصنیف میں جو اختلاف رائے پیدا تھا، وہ بھی شمار کے لائق ہے، ایک کے نزدیک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ صرف رسول کی حکومت و سلطنت کے نمایندہ تھے اور دوسرے کے نزدیک وہ ع آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری کے مصداق تھے، اس سلسلہ میں سرسید نے

---

[1] یہ دونوں روایتیں مولوی اقبال احمد خان سہیل، ایم، اے (علیگ) کی تحریر مندرجہ الاصلاح سرائے میر سے لی گئی ہیں، جو سالہا سال علی گڑھ میں رہ چکے ہیں اور مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین دونوں کے شاگرد تھے، اور مولانا حمید الدین صاحب کے ساتھ کئی سال رہے تھے۔

خلفائے راشدین کی نسبت اپنے نج کے خط اور اخباری مضمون میں جو رائے ظاہر کی مولانا جیسے شیفتۂ اصحاب رسول ﷺ کے لیے اس کا برداشت کرنا آسان نہ تھا، اسی لیے انہوں نے الفاروق پوری محنت سے لکھی اور سرسید کے اعتراض واختلاف اور ناراضی کی کوئی پروانہ کی۔

مسلمانوں کی موجودہ بیماریوں کا علاج ایک (سرسید) کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں[1]، اور دوسرے (مولانا شبلی) کے نزدیک یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد و اخلاق کی حفاظت اور بقا کے ساتھ ساتھ نئے زمانہ کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہے کہ مولانا نے ندوہ کے کسی جلسہ میں یا کہیں اور ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں، آگے بڑھتے جائیں، لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے جائیں، پیچھے ہٹتے جائیں یہاں تک کہ صحابہ کی صف سے جا کر مل جائیں' سرسید کو ان کی اس تقریر پر بڑا غصہ آیا، کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو اس قسم کی نصیحتیں اس راستہ سے پیچھے ہٹا دیں گی جس پر وہ لے جانا چاہتے ہیں، چنانچہ اس کے خلاف انہوں نے سخت مضمون لکھا۔

سرسید کا نیک نیتی سے یہ خیال تھا کہ کالج کے طلبہ میں بلند ہمتی اور بلند خیالی پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ انگریزی طور وطریق اور وضع وقطع اختیار کریں، تاکہ ان میں حاکمانہ روح پیدا ہو، مگر یہ خیال کرتے وقت ان کے ذہن سے یہ بات اتر گئی کہ شیر کی کھال اوڑھ کر کوئی شیر نہیں بن سکتا، دوسرا نقصان اس کا یہ ہوا کہ حاکم قوم سے ملنے کے جنون میں وہ اپنی ہی قوم سے دور سے دور تر ہوتے گئے، تیسری بات یہ ہوئی کہ حاکم قوم کے طور وطریق کی نقالی میں ان کی زندگی کا سروسامان اتنا گراں ہو گیا کہ قوم کے کام کے نہیں رہے اور وہ تعلیم جو قوم کی دولت مندی کی خاطر ان کو دی گئی تھی وہ اس نقالی کی بہ دولت تنگ دستی کا ذریعہ بن گئی، جس کی وجہ سے وہ قوم کی امداد واعانت کے قابل نہ رہے اور نہ وہ ایثار کی کوئی خدمت انجام دے سکے۔

مولانا شبلی مرحوم سرسید کے اس خیال کے تمام تر مخالف تھے، مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو ان کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں "افسوس ہے کہ مجھ کو اصولی امر میں اختلاف ہے، میں تیس برس سے مسلمانوں کی حالت پر غور کر رہا ہوں، خوب دیکھا، اصلی ترقی کا مانع وہی گراں زندگی ہے جو سید صاحب سکھا گئے۔ (مسعود-۳۳)

---

[1] [illegible]

یہ مولانا کے اخیر خطوں میں سے ہے، جس کے بارہ تیرہ دن کے بعد انہوں نے وفات پائی۔

یہی سبب ہے کہ سرسید کی وفات پر ان کی زندگی کے کارناموں پر جب مختلف مضامین کا لکھا جانا طے ہوا، اور اس سلسلہ میں سرسید اور مذہب کا عنوان مولانا شبلی کے لیے تجویز ہوا، تو انہوں نے اس سے انکار کیا، آخر لوگوں کے اصرار[1] سے مجبور ہوکر ''سرسید اور اردو لٹریچر'' کا دوسرا عنوان لیا اور پہلے عنوان پر مولانا حالی نے لکھا، یہ دونوں مضمون ایک ساتھ علی گڑھ میگزین کے مئی ۱۸۹۸ء کے نمبر میں شایع ہوئے ہیں، مولانا حالی کا یہ مضمون غالباً حیاتِ جاوید کے مباحث کا خلاصہ ہے، جس کو وہ اس وقت لکھ رہے تھے۔

خود سرسید کی سوانح عمری لکھنے کا مسئلہ بھی ایک اختلافی مسئلہ بن گیا تھا، اخیر عمر میں سرسید کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی[2] جائے، وہ چاہتے تھے کہ یہ کام مولانا شبلی کریں، کیوں کہ وہ پاس رہتے تھے، مولانا اس سے پہلو بچاتے تھے، چنانچہ اس بارے میں جتنی بالواسطہ تحریکیں کی گئیں ان کو مولانا بہ لطائف الحیل ٹالتے گئے، اسی اثنا میں سرسید کے نام نواب اسماعیل خاں صاحب رئیس دتاولی (علی گڑھ) کا ایک خط مکہ معظمہ سے آیا کہ انہوں نے خواب دیکھا ہے کہ مولوی شبلی صاحب آپ کی لائف لکھ رہے ہیں، مولانا کو یہ خط دکھایا گیا، مگر اس ''مقدس خواب'' کی تعبیر بھی صحیح نہیں نکلی، اس کے بعد سرسید مرحوم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مولانا کو بلا کر اپنے کچھ حالات نوٹ کراتے رہے، مولانا اس کو بجنسہٖ لکھتے رہے[3]، جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو یہ قرعۂ فال مولانا حالی مرحوم کے نام نکلا، اور انہوں نے ۱۸۹۳ء سے اس کو انجام دینا شروع کر دیا۔

عربی تعلیم کی ترقی و اصلاح کا مسئلہ دوسرا باب ہے جس میں دونوں کو اختلاف تھا، سرسید جدید انگریزی تعلیم کے علاوہ مسلمانوں میں ہر ایسی تعلیم کے شیوع کو جوان کو ادھر سے ہٹائے، مسلمانوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے، اسی لیے پنجاب میں ۱۸۸۱ء میں مشرقی تعلیم کا جو نظام بن رہا تھا، انہوں نے اس کی اتنی مخالفت کی کہ اُس کے پرزے اڑ گئے، اسی طرح ۱۸۸۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں مشرقی امتحانات کے اجرا پر ایسی ہی مخالفت کی، چنانچہ ایک زمانہ میں دیسی زبان میں تعلیم کی تحریک کر چکنے کے بعد وہ اس کے سخت مخالف ہو گئے کہ اس سے بھی ان کے خیال میں انگریزی کی تعلیم کو نقصان پہنچتا، بہ ہر حال ان کو مشرقی علوم اور عربی تعلیم سے اس لیے دل چسپی نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روکیں گے۔

---

[1] اس اصرار کی یہ تصریح مولانا نے خود اس مضمون کے اخیر میں کی ہے۔ [2] حیات جاوید میں مولانا حالی نے بھی ان کی اخیر عمر کی اس خواہش کا ذکر کیا ہے۔ دیباچہ ص ۱۳، کان پور [3] یہ واقعہ اقبال صاحب سہیل نے مولانا سے سنا تھا۔

مولانا کا عقیدہ تھا کہ اگر مشرقی علوم اور عربی تعلیم نہ رہی تو پھر مسلمان مسلمان رہیں گے کہاں؟ جن کی ترقی کے لیے یہ جدوجہد ہورہی ہے، سفرنامہ میں قدیم عربی تعلیم کی ابتری اور اس کی ترقی واصلاح کے سلسلہ میں مولانا ۱۸۹۲ء میں بے قابو ہوکر لکھتے ہیں، یہ مسئلہ آج کل ہندوستان میں بھی چھڑا ہوا ہے، اور تعلیم قدیم کی ابتری پر عموماً رنج اور افسوس کیا جاتا ہے لیکن میرا افسوس دوسری قسم کا افسوس تھا، ہمارے ملک کے نئے تعلیم یافتہ پرانی تعلیم پر جو رنج وافسوس ظاہر کرتے ہیں، وہ درحقیقت رنج نہیں بلکہ استہزا اور شماتت ہے، میں اگرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں، تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی ''قومیت[1]'' قائم رکھنے کے لیے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے''۔(سفرنامہ، صفحہ ۷۸)

۱۸۹۴ء میں جب ندوۃ العلما قائم ہوا تو وہ مولانا کی عین تمنا کے مطابق تھا، اس لیے انہوں نے اس صدا پر نہ صرف یہ کہ لبیک کہا، بلکہ اس وقت سے وہ ان کی زندگی کا مقصد بن گیا، کالج میں مولانا کی زندگی کا یہ رُخ اچھی نظروں سے نہیں دیکھا گیا[2]، شاید ۱۸۹۶ء میں جب مولانا کو حیدرآباد میں وظیفہ ملا ہے تو فطرۃً ان کو خوشی ہوئی کہ اب وہ کالج کے حلقہ سے آزاد ہوکر اپنے مذاق کا کام کریں گے، اسی جذبہ میں انہوں نے ایک فارسی قصیدہ کہا تھا جس کا قافیہ ادب طلب اور ردیف است تھی اس میں ایک مصرع یہ تھا:

زیں سپس ندوہ وتدریسِ علومِ عرب است[3]

یہ قصیدہ کالج کے احاطہ میں قابل اعتراض ٹھہرا اور مولوی سید علی بلگرامی کے مشورہ سے مولانا نے اس کو ضایع کردیا۔

---

[1] سرسید کی نئی تحریک میں قومیت نے مذہب کی جگہ لے لی تھی، اس لیے یہی لفظ قلم سے نکلا ہے۔''س'' [2] سرسید نے ۱۸۸۷ء میں اپنی کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں اوقاف کی آمدنی سے عربی تعلیم کے قیام کی تجویز منظور کی تھی۔

[3] یہ پورا واقعہ اور یہ مصرعہ مولانا کی زندگی ہی میں مولوی غلام محمد صاحب شملوی مرحوم وکیل ندوۃ العلما کی زبانی میں نے سنا تھا، مرحوم بڑے محنتی اور عملی کارکن اور خوش تقریر اور پرجوش مقرر تھے، انہوں نے اپنی جوانی میں ترک دنیا اور فقر اختیار کرلیا تھا، گیروا کپڑا پہنتے تھے، جنگل میں رہتے تھے، اور جنگل کی جڑی بوٹیاں کھاتے تھے، ندوہ کا شوروغل سن کر اس کے بریلی کے جلسہ میں شریک ہوئے، اور ایسے متاثر ہوئے کہ جوگ چھوڑ کر ندوہ کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا، اور آخر ساری عمر ندوہ کی خدمت میں بسر کردی، ۱۹۳۴ء میں شملہ میں وفات پائی، اس واقعہ کی دوسری روایت مولوی ریاض حسن خاں صاحب رئیس مظفر پور سے سنی جو اس کی تائید میں تھی۔

اختلافات کے قصیدہ کا آخری بند سیاسی اختلاف ہے، سرسید وہ سرسید جنہوں نے اسباب بغاوت ہند لکھا جو آگرہ کی نمایش میں ہندوستانیوں کی عزت کے لیے انگریزوں سے لڑ گئے، جنہوں نے متعدد دفعہ گورنمنٹ کی تجویزوں کی شدید سے شدید مخالفت کی، ۱۸۸۵ء میں جب کانگریس کا وجود ہوا تو وہ اس کے سخت مخالف بن گئے اور ایک سال بعد اپنی تعلیمی کانگریس قائم کی، جس کے دوسرے سالانہ اجلاس لکھنؤ منعقدہ ۱۸۸۷ء میں اس کی مخالفت میں نہایت پرجوش تقریر کی اور آخر ۱۸۸۸ء میں کانگریس کے مقابلہ کے لیے ایک پیٹریاٹک ایسوسی ایشن الگ بنائی، جس میں تمام رئیسوں، تعلقہ داروں اور دیسی ریاستوں کو ملا کر کانگریس کے مقابلہ کے لیے ایک محاذِ جنگ قائم کیا، پھر ۱۸۹۳ء میں مسٹر بک کے ساتھ مل کر محمڈن اینگلو اورنٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی۔

مولانا شبلی مرحوم شاید خلافت راشدہ کے اصول انتخاب کی بنا پر یا فطرۃً جمہوریت پسند تھے، اور سرسید شخصی حکومت کو پسند کرتے تھے، حالاں کہ دوسری طرف وہ اپنے کو مذہباً مسلمان اور نسلاً عرب ہونے کی بنا پر ریڈیکل کہتے تھے، کہیں آپ اوپر پڑھ آئے ہیں کہ کالج میں طلبہ کی ایک مجلس میں ایک دفعہ شخصی اور جمہوری طرز سلطنت پر مباحثہ تھا، مولانا نے جمہوری طرز سلطنت کی تائید کی اور اس پر خلفائے راشدین ﷺ کے واقعات اور اصولِ انتخاب سے استدلال کیا تھا، یہ تقریر نہایت کام یاب ہوئی اور طلبہ مولانا کے زور بیان سے بہت متاثر ہوئے، حاضرین میں سرسید مرحوم بھی تھے، انہوں نے اس کی مخالفت کی اور اس پر طبیعت سیر نہیں ہوئی تو مولانا کے دلائل کے رد میں ایک چھوٹا مضمون لکھا جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ۲۸ر جون ۱۸۹۲ء عیسوی کے پرچہ میں ''ایشیائی اور اسلامی طرز حکومت'' کے عنوان سے مولانا کے سفرِ ٹرکی کے لیے روانہ ہو جانے کے بعد چھپا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے یہ تقریر اپریل ۱۸۹۲ء سے پہلے اسی کے کسی قریب زمانہ میں کی ہوگی۔

اس واقعہ سے دونوں کی طبیعتوں کا سیاسی اختلاف مذاق معلوم ہوتا ہے، اسی لیے مولانا سرسید کی ان کوششوں کو جو وہ نیشنل کانگریس کی مخالفت میں کر رہے تھے، پسند نہیں کرتے تھے، اور وہ دل سے کانگریس کے اصولوں کے حامی تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس مسئلہ میں دونوں کی راہیں بالکل الگ رہیں اور اگرچہ مولانا نے کبھی سیاست کے عملی کوچہ میں قدم نہیں رکھا، مگر اخیر تک ان کی سیاسی رائے یہی رہی۔

۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی جو لڑائی ہوئی اور اس میں ترکوں کو انگریزوں کی مرضی کے خلاف جو فتح عظیم ہوئی اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو پرجوش بنا دیا تھا، سارے ہندوستان میں اُس کی خوشی منائی گئی اور بمبئی کے مسلمانوں نے چراغاں کیا، سرسید کو اس سے بڑی تکلیف پہنچی اور اس جوش مسرت کے خلاف دو نہایت سخت مضمون لکھے[1] جو اتحاد اسلامی کے حامی مسلمانوں کو تیر کی طرح آکر لگے اور انہوں نے سرسید کی اس انگریز دوستی پر سخت اعتراضات کیے۔

سرسید کے حلقہ میں رہ کر اتنا بڑا اختلاف کوئی معمولی جرم نہ تھا، جس کو سرسید تو بخش بھی سکتے تھے مگر ان کے بعض حامیوں نے اس کو کبھی نہیں بخشا، چنانچہ مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر البشیر جو اس زمانہ میں سرسید کی مخالفت سے تائب ہو کر ان کے نہ صرف بڑے حامی بن چکے تھے، بلکہ وہ ان کو مجتہد اعظم ماننے لگے تھے اور اسی لیے وہ مولانا شبلی سے ناراض رہنے لگے تھے اور اپنے اخبار میں ان سے بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ وہ اس مجتہد اعظم پر ایمان لائیں اور اسی لیے وہ ندوہ اور عربی تعلیم کے سخت مخالف[2] ہو رہے تھے، اور کانگریس سے بھی ان کو اُس زمانہ میں اسی لیے شدید اختلاف تھا، مولانا کا خیال تھا کہ سرسید کی سیاسی رائے میں جو انقلاب ہوا وہ ان کی ذاتی رائے نہ تھی، بلکہ کالج کے پرنسپل مسٹر بک نے اپنی زبردست شاطرانہ چال سے سرسید کے دل میں یہ بٹھا دیا تھا کہ کانگریس کی مخالفت اور انگریزوں کی دوستی ہی میں دراصل کالج کا اور مسلمانوں کا فائدہ ہے، اور وہ اس کے اس سحر میں ایسے مسحور ہو گئے تھے کہ اس کے بعد اُن کی اپنی رائے فنا ہو گئی تھی اور اب وہ جو کچھ دیکھتے تھے، مسٹر بک اور انگریز اسٹاف کی آنکھوں سے دیکھتے تھے، اور جو کچھ سنتے تھے وہ ان ہی کے کانوں سے سنتے تھے، مولانا نے اپنے مشہور مضمون ''پولیٹکل کروٹ'' میں اس تفصیل کو کس قدر ادیبانہ و معجزانہ اعجاز میں ادا کیا ہے'' وہ پرزور دست و قلم جس نے ''اسبابِ بغاوت ہند'' لکھا تھا اور اس وقت لکھا تھا جب کورٹ مارشل لا کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے، وہ بہادر جس نے پنجاب یونی ورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اڑا دی تھیں اور جو کچھ اس نے ان تین آرٹیکلوں میں لکھا کانگریس کا لٹریچر حقوق طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پرزور لٹریچر نہیں پیدا کر سکتا، وہ جاں باز جو آگرہ کے دربار سے اس لیے برہم ہو کر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور

---

[1] سرسید کے آخری مضامین میں ''یونان اور ترک'' اور ''سلطان اور ہندوستان کے مسلمان'' کے عنوان سے یہ مضمون پڑھیے۔ [2] مثال کے طور پر مقالات شبلی جلد ہشتم میں ندوہ اور البشیر کا مضمون پڑھیے۔

انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہ تھیں، وہ انصاف پرست جس نے بنگالیوں کی نسبت کہا تھا" میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں صرف بنگالی ایسی قوم ہیں جن پر ہم واجبی طور پر فخر کر سکتے ہیں، اور صرف ان ہی کی بہ دولت ہے کہ علم آزادی اور حب الوطنی کو ہمارے ملک میں ترقی ہوئی، میں صحیح طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالیقین ہندوستان کی تمام قوموں کے سرتاج ہیں۔" (دیکھو تقریر پریسیڈنٹ مسلم لیگ بہ مقام ناگ پور)

حالات اور گردوپیش[1] کے واقعات نے اس کو اس پر مجبور کیا کہ ان نے تمام اسلامی پبلک کو پالیٹکس سے روک دیا، یہ کیوں ہوا، کن اسباب سے ہوا؟ کس چیز نے یہ اختلاف حالت پیدا کر دیا؟ ان سوالات کا جواب دینا آج غیر ضروری بلکہ مضر ہے"۔

اس کے بعد مولانا نے اس مضمون میں سرسید کی لکھنؤ والی اس مشہور سیاسی تقریر کی ہر دلیل کا جواب دیا ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اسی تقریر کا اثر تھا کہ مسلمان کانگریس سے باز رہے اور جس کو ایک خاص حلقہ میں اتنا پسند کیا گیا کہ مسٹر بک نے پوری تقریر کو تار پر ولایت بھجوایا۔

سرسید نے یہ تقریر ۱۸۸۷ء میں کی تھی اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مولانا ان کی اس سیاسی پالیسی کو ابتدا ہی سے صحیح نہیں سمجھتے تھے، اور اُن کی رائے تھی کہ علی گڑھ کالج کو مسٹر بک کے ہاتھوں غلط نصب العین کے قالب[2] میں ڈھالا جا رہا ہے۔

مولانا مرحوم اپنے ایک خط میں جو ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء میں ایک صاحب کو اپنے حالات وسوانح کے استفسار میں لکھا تھا، لکھتے ہیں" رائے میں ہمیشہ آزاد رہا، سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا، لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ ان سے مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا رہا اور سرسید سے بارہا بحثیں[3] رہیں"۔

یہ اختلاف بھی کالج سے مولانا کی دل برداشتگی کا سبب ہوا، ایک نہایت ثقہ اور معتبر بزرگ (مولانا شروانی) جو مولانا کے بڑے گہرے دوست ساتھ ہی سرسید کی تحریک کے پرانے حامی، اور اس کی جلوت وخلوت کے تمام اسرار سے واقف ہیں، مولانا کے اوراقِ حیات کے ایک مسودہ پر جس میں مولانا کی دل برداشتگی کی تفصیلات تھیں اپنے قلم سے یہ ارقام فرمایا" دل برداشتگی کی وجہ سیاسی آرا کا اختلاف بھی تھا، مولوی شبلی صاحب اب جدید سیاسی تحریک کے حامی ہو چکے تھے"۔

---

[1] یہ مسٹر بک کی طرف اشارہ ہے۔ [2] یہ پوری تفصیل مضمون "مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ" میں ملاحظہ فرمایئے جس کو مولانا نے ۱۹۱۱ء میں تنسیخ تقسیم بنگال کے موقع پر لکھا تھا۔ [3] معارف اعظم گڑھ بابت ماہ نومبر ۱۹۲۳ء، ص ۳۹۴۔

اسی سلسلہ کی ایک نئی کڑی ندوۃ العلما کی شرکت کا سبب بن گئی، یہ مجلس اس زور شور سے اٹھی تھی کہ حکام کو خیال ہو گیا کہ اس سے مسلمانوں میں بغاوت پھیل جائے گی، بعض غرض مندوں نے اپنی ذاتی کاوشوں سے اس کو یہ رنگ دے کر لفٹنٹ گورنر تک پہنچایا اور لفٹنٹ گورنر نے بھی مولانا کا علی گڑھ میں رہنا مناسب نہیں سمجھا۔[1]

ندوۃ العلما

یعنی

علما کی مذہبی و تعلیمی اصلاح کی تحریک میں شرکت

دلی کا خانوادہ دلی میں اسلامی حکومت کا آفتاب جب ڈوب رہا تھا تو اسی کے مطلع سے اسلام کا ایک اور آفتاب طلوع ہو رہا تھا، یہ شاہ ولی اللہ دہلوی کا خانوادہ تھا، سچ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی پیشین گوئی کے مطابق اس کے بعد جس کو ملا اور جو کچھ ملا اسی دروازہ سے ملا، ہندوستان میں ردِ بدعات کا ولولہ، ترجمۂ قرآن پاک کا ذوق، صحاح ستہ کا درس، شاہ اسمٰعیل اور مولانا سید احمد بریلوی کا جذبہ جہاد، فرقہ باطلہ کی تردید کا شوق، دیوبند کی تحریک، ان میں سے کون چیز ہے جس کا سررشتہ اس مرکز سے وابستہ نہ ہو۔

مولوی بزرگ علی مارہرہ ضلع ایٹہ کے مردم خیز قصبہ میں ایک بزرگ مولوی بزرگ علی صاحب پیدا ہوئے، جوانی میں تحصیل علم کی اور آخر دہلی جا کر اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے، جو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ کی درس گاہوں سے بہ رہا تھا، اُس زمانہ کے علما کے دستور کے مطابق چند روز آگرہ اور کلکتہ میں درس دینے کے بعد علی گڑھ میں جس کا پرانا نام کول تھا، انگریزی حکومت میں بادلِ ناخواستہ منصفی کا عہدہ قبول کیا، مگر اس عہدہ کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا اور اسی سلسلہ میں وہاں کی جامع مسجد میں بانی مسجد نواب ثابت خاں نے محمد شاہ کے زمانہ میں جو مدرسہ قائم کیا تھا، اُس کو دوبارہ زندہ کیا اور کچھ دنوں کے بعد منصفی کے عہدہ سے استعفا دے دیا، اس زمانہ میں ان علما کا جو انگریزی تسلط سے پیچ و تاب میں تھے، ٹونک مرکز بن رہا تھا، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے پراگندہ قافلہ کے مسافر بھی یہیں پناہ گزیں تھے، بہ ہر حال نواب وزیر الدولہ مرحوم والی ٹونک کے اصرار پر ریاست میں قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کیا اور وہیں ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی۔

---

[1] مکاتیب شبلی بہ نام مولانا شروانی (۴۱)۔

اس زمانہ میں ہندوستان کی غیر متوقع حکومت پا کر عیسائی حاکموں اور پادریوں کا ولولہ یہ تھا کہ وہ بالآخر ہندوستان کو عیسائی بنالیں گے، علمائے اسلام اس کے مقابلہ کے لیے اٹھے، ان میں سے کئی بزرگوں کے مبارک ناموں اور کاموں سے ہماری واقفیت ہے، اسی مقدس سلسلہ کی ایک کڑی مولانا بزرگ علی ہیں، ردِّ نصاریٰ میں متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے بشارات کا قلمی نسخہ حبیب گنج کے کتب خانہ میں ہے۔

مفتی عنایت احمد | مولانا بزرگ علی کے آغوش میں جو ہونہار پل کر بڑھے ان میں دیوہ ضلع بارہ بنکی کے ایک سعادت مند مفتی عنایت احمد صاحب تھے، مفتی صاحب ابتدائی کتابیں دوسرے علما سے پڑھ کر دلی گئے اور شاہ اسحاق صاحب سے حدیث کا درس لیا اور وہاں سے آ کر علی گڑھ کول میں مولوی بزرگ علی صاحب سے تکمیل کی اور وہیں مدرس ہوگئے، ایک سال کے بعد وہ وہیں مفتی اور منصف مقرر ہوئے، یہاں پلکھنہ ضلع علی گڑھ ایک قریہ سے ایک صاحب زادہ آ کر درس میں داخل ہوئے، جن کو آگے چل کر دنیا نے استاذ العلما مفتی لطف اللہ صاحب کے نام سے جانا، مفتی عنایت احمد صاحب بدل کر بریلی پہنچے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوگیا، اس ہنگامہ کی پاداش میں بالزام بغاوت جن علمائے اعلام کو قید وجلا وطنی کی سزا دی گئی، ان میں ایک یہ بھی تھے، چنانچہ نظر بند کر کے جزیرۂ انڈمان بھیج دیے گئے، مگر کیا عجیب بات ہے کہ دریائے شور کے ساحل پر بھی یہ چشمۂ شیریں اسی طرح بہتا رہا، چنانچہ وہاں کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے صرف میں علم الصیغہ اور سیرت میں تواریخ حبیب الٰہ اور جغرافیہ میں ترجمۂ تقویم البلدان مشہور ہیں، آخر یہی تصنیفات رہائی کا ذریعہ بنیں، اور ۱۲۷۷ھ میں رہا ہو کر ہندوستان آئے اور پھر چشمۂ فیض اسی طرح جاری تھا۔

کان پور میں علم | اس زمانہ میں کان پور نیا نیا آباد تھا، اودھ کی نوابی کے زمانہ میں گنگا کے کنارے یہ انگریزی فوج کا کیمپ تھا کیمپ کے تعلق سے تاجر اور سوداگر آ کر آباد ہوئے کیمپ سے کمپو ہوا اور کمپو سے کان پور، مسلمانوں کی اس تباہ حالی میں کان پور کے مسلمان سوداگروں کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی جنھوں نے اپنی بابرکت اور نیک کمائیوں کو دین کی نصرت میں لگایا، مفتی عنایت احمد صاحب نے کان پور میں مستقل قیام فرمایا اور اسی سال ۱۲۷۷ھ میں مدرسۂ فیض عام جاری کیا، دو برس کے بعد اپنی جگہ اپنے دو شاگردوں کو جن میں سے ایک مولوی لطف اللہ صاحب تھے، جانشین بنا کر حج کو روانہ ہوئے، جہاز جدہ کے قریب پہنچ کر ایک پہاڑ سے ٹکرایا اور ڈوب گیا، مفتی صاحب بحالت نماز واحرام غرق وشہید ہوئے، شاگردوں نے مدرسہ

کے کام کو سنبھالا اور مدرسہ کو بڑی رونق دی، اسی مدرسہ کا فیض تھا جو بالآخر ندوۃ العلما کی شکل میں نمایاں ہوا۔

مفتی لطف اللہ صاحب مفتی لطف اللہ صاحب ۷ برس کان پور میں رہنے کے بعد علی گڑھ واپس آئے اور یہاں سے اس مدرسہ میں جس کو ان کے استاذ الاستاذ مولوی بزرگ علی صاحب نے زندہ کیا تھا، مدرس ہوئے، علی گڑھ میں درس کا فیض ۱۲۸۵ھ سے ۱۳۱۲ھ-۱۸۹۵ء تک ستائیس برس مسلسل جاری رہا، ہر سمت سے علم وفن کے طلب گاروں کے قافلے علی گڑھ کا رُخ کر رہے تھے، ستائیس برس کی مدت میں سیکڑوں عالم اس درس گاہ سے اُٹھے اور ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلے، اُس عہد کا مشکل سے کوئی نام ور عالم ہوگا جس کی دستارِ کمال کا طرۂ امتیاز اس باکمال کا تلمذ نہ ہو، جن اکابر کے نام معلوم ہیں، ان میں سے چند کے نام ملاحظہ طلب ہیں، مولوی عبدالغنی صاحب (استاذ اول مولانا شروانی) مولوی احمد حسن صاحب کان پوری، مولوی سید محمد علی (ناظم اول ندوۃ العلما) مولوی مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی، مولوی عبدالحق صاحب حقانی مفسر تفسیر حقانی دہلی، مولوی سید ظہور الاسلام صاحب فتح پوری، وقار نواز جنگ مولوی وحید الزماں خاں، مولوی فضل حق صاحب رام پوری، مولوی مفتی عبداللطیف (استاذ جامعہ عثمانیہ) مولوی نور محمد صاحب پنجابی مدرس مدرسہ اسلامیہ فتح پور، مولوی ماجد علی صاحب جون پوری (مشہور مدرس) مولوی پیر مہر علی صاحب سجادہ نشین گولڑہ ضلع راولپنڈی، قاضی سعد الدین صاحب کشمیری، مولوی سیف الرحمٰن صاحب ولایتی، مولوی لطف الرحمٰن صاحب بردوانی اور خاتمۃ التلامذہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں وغیرہ سیکڑوں اربابِ کمال ہیں۔

حضرت مفتی لطف اللہ صاحب کی دو اور خصوصیتیں قابلِ ذکر ہیں، ایک یہ کہ انہوں نے عمر بھر کسی کی تکفیر نہیں کی، دوسری یہ کہ کان پور کے قیام ہی کے زمانہ میں انگریزی سے اتنے حرف شناس ہو گئے تھے کہ تار وار پڑھ لیتے تھے، اس کے یہ معنی ہیں کہ دارالعلوم ندوہ جو بننے والا تھا اس کی صورت مثالی پہلے ہی ذاتِ گرامی میں جمع تھی۔

مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب اس سلسلہ کا رابطۂ عقیدت ایک اور روحانی مرکز سے بندھا تھا، جس کا نام نامی حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب مجددی گنج مرادآبادی تھا (گنج مرادآباد کان پور کے پاس ایک قصبہ ہے) یہ فیض بھی دہلی کے اسی خانوادہ سے آیا تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی سے شرف تلمذ اور حضرت شاہ محمد آفاق صاحب مجددی سے شرف بیعت حاصل

تھا، تیرہویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں یہ ذات گرامی سارے ہندوستان کی روحانی عقیدت کا مرکز تھی، سنت سنیہ، فقر وغنا، نور ومعرفت کی تمام خوبیاں اس ایک ہستی میں جمع ہوگئی تھیں، مفتی صاحب کے اکثر تلامذہ گنج مرادآباد کے فیضِ ارادت سے سرفراز تھے۔

مشرق ومغرب کے یہی دونوں مطلع تھے، جن سے ندوۃ العلما کا آفتاب طلوع ہوا۔

انقلاب وحوادث کے جو طوفان ملک میں اٹھ رہے تھے، ان سے حساس مسلمانوں کے دل مضطر تھے، مدارس اور مکاتب کا پرانا سلسلہ ٹوٹ رہا تھا، انگریزی اسکول اور کالج میں مسلمان لڑکے کھنچ رہے تھے، سلطنت کے اثر سے عیسائیت کا چرچا تھا، مشنریوں کے جال ہر جگہ پھیلے تھے، ان کے یتیم خانے ہر جگہ قائم تھے، مسلمانوں اور عیسائیوں میں مناظروں کی گرم بازاری تھی، دونوں طرف سے رسالے لکھے جارہے تھے، یورپ کے نئے خیالات سیلاب کی طرح امڈے چلے آرہے تھے، عام علما زیادہ تر پڑھنے پڑھانے میں مصروف، کچھ معمولی معمولی چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھے تھے اور خواص تقلید وعدم تقلید، قرأت فاتحہ، آمین بالجہر اور رفع یدین کے مسئلوں میں ایسے گتھے تھے کہ مناظرہ، مجادلہ اور مجادلہ مقاتلہ بن گیا تھا، خدا کے گھر لڑائی کے میدان بن گئے تھے، ایک دوسرے کی تفسیق اور تکفیر پر بڑی بڑی مہریں ہورہی تھیں، مدرسوں میں پرانا فرسودہ طریقۂ درس جاری تھا، جو زمانہ کے انقلاب سے بے کار اور نئے زمانے کے لیے قوم کے نئے رہبر اور رہنما پیدا کرنے سے قاصر ہورہا تھا۔

فیضِ عام کا فیض یہ صورتِ حال تھی کہ حسن اتفاق سے اس خوش قسمت مدرسۂ فیضِ عام کان پور کی چٹائی پر مدرسۂ مذکور کے چند فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کے موقع پر چند نفوس قدسیہ اس صورتِ حال پر غور فرمارہے تھے، یہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء تھا، اس مجمع میں جو باکمال نفوس جلوہ افروز تھے، ان کے متبرک ناموں پر ایک نگاہ آج بھی بتاسکتی ہے کہ وہ کس پایہ کے تھے، حالاں کہ ان میں سے بعض کا اس وقت عنفوانِ شباب تھا۔

۱- استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب علی گڑھ

۲- مولانا حافظ شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی

۳- مولانا محمد اشرف علی تھانوی مدرس مدرسۂ جامع العلوم کان پور

۴- مولانا محمد خلیل احمد صاحب مدرس دوم مدرسۂ دیوبند (بعدہٗ مدرسِ اعلا مدرسہ مظاہر العلوم

سہارن پور)

۵-مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری (جو اسی سال مدرسہ سے فارغ ہوئے تھے)

۶-مولانا نور محمد صاحب پنجابی مدرس مدرسۂ اسلامیہ فتح پور (بڑے متقی اور صاحب کمال بزرگ تھے، میں نے زیارت کی تھی)

۷-مولانا احمد حسن کان پوری مدرس اول مدرسۂ فیض عام کان پور، (محشی مثنوی مولانائے روم)

۸-مولانا سید محمد علی صاحب (ناظم اول ندوۃ العلما)

۹-مولانا محمود حسن صاحب مدرس اول مدرسہ دیو بند (شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ)

۱۰-مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری

۱۱-مولانا حکیم سید محمد ظہور الاسلام صاحب فتح پوری (نہایت متقی و دین دار، ان کی زیارت سے میری آنکھیں شاد ہوئیں)

۱۲-مولانا عبد الغنی صاحب، مئو رشید آبادی

۱۳-مولانا حکیم فخر الحسن صاحب گنگوہی

۱۴-مولانا سید شاہ حافظ تجمل حسین صاحب دیسنوی (خلیفۂ حضرت شاہ فضل رحمان صاحب گنج مراد آبادی، میرے رشتہ کے چچا تھے، ندوہ میں تعلیم کے لیے میرا آنا ان ہی کی تحریک کا نتیجہ تھا)

یہ اسلامی ہندوستان کے گزشتہ دور کے وہ نام نامی ہیں جن پر اُس دور کو پورا فخر و ناز ہے، اس منتخب جلسہ میں یہ طے پایا کہ باہمی مشورہ سے علما کی ایک مجلس قائم کی جائے اور آئندہ سال مدرسۂ فیض عام کے سالانہ جلسہ کے موقع پر تمام ہندوستان کے علما کو اس کے لیے عام دعوت دی جائے، اس مجلس کا نام ندوۃ العلما قرار پایا اور اشتہارات و اخبارات کے ذریعہ سے آئندہ جلسہ کا اعلان کیا گیا اور ایک صاحب اس غرض سے مقرر کیے گئے کہ وہ تمام ہندوستان کا معائنہ کر کے اگلے جلسہ میں اپنی رپورٹ پیش کریں، مولانا سید محمد علی صاحب جو مولانا لطف اللہ صاحب کے شاگرد رشید اور حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب کے مرید و خلیفہ، ردنصاریٰ میں متعدد کتابوں کے مصنف اور ردنصاریٰ میں ''تحفۂ محمدیہ ﷺ''[1] نام ایک رسالہ نکال رہے تھے، اس نئی مجلس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے۔

---

[1] اس رسالہ کے اڈیٹر میرے حقیقی پھوپھی زاد بھائی مولوی محمد احسن صاحب استھانوی تھے، عزیزی مولوی سید محمد ہاشم صاحب ندوی کے پدر بزرگوار، مجھے بھی اپنے ساتھ دار العلوم لائے تھے۔

ندوۃ العلما عام ملک میں جب ندوۃ العلما کے مقاصد اور اس کے آیندہ اجلاس کا اعلان ہوا تو تمام مسلمانوں میں ایک نئے جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی، علما ہر طرف سے آ آ کر شریک ہونے لگے، اس صدا پر سب سے پہلے لبیک کہنے والوں میں ایک نام اُس کا بھی تھا جو ہندوستان کے علاوہ روم و شام و مصر کے مدرسوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا تھا اور اس کے دل میں رہ کر ان مدرسوں کی زبوں حالی، ابتری اور ضروریاتِ زمانہ سے بے خبری کا درد اٹھتا تھا، جس کے مضمونوں، تقریروں اور تصنیفوں میں اس کا یہ احساس ہر دفعہ نئے رنگ میں ظاہر ہوتا تھا۔

ندوہ کا پہلا اجلاس ندوۃ العلما کا پہلا اجلاس ۱۵، ۱۶، ۱۷ شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲، ۲۳، ۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء میں اسی کان پور میں اور اسی مدرسۂ فیض عام میں ہوا، پہلے دن ۱۵/شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲/اپریل ۱۸۹۴ء کو صبح کے وقت مدرسہ کے چودہ فارغ التحصیل طالب علموں کی دستار بندی کا جلسہ ہوا، حضرت مولانا لطف اللہ صاحب اس جلسہ کے صدر ہوئے، صدارت کی تحریک مولانا عبداللہ صاحب ناظمِ دینیات محمڈن کالج علی گڑھ (داماد مولانا محمد قاسم صاحب بانی مدرسہ دیوبند) اور تائید مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے فرمائی، مولوی بشیر الدین اڈیٹر نجم الاخبار اٹاوہ نے (جو ان دنوں سرسید کے مخالفوں میں تھے، اور اب ''البشیر'' کے اڈیٹر ہیں) مدرسہ کی سالانہ کارروائی پڑھ کر سنائی، اس کے بعد مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے سورۂ جمعہ کا وعظ اس خوبی سے کہا کہ حاضرین پر وجد طاری تھا۔

ندوۃ العلما ندوۃ العلما کا اجلاس اُسی دن ۳ بجے سہ پہر سے شروع ہوا، شمس العلما مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی نے مولانا لطف اللہ صاحب کی صدارت کی تحریک کی اور مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے تائید کی، اس اجلاس کی روح پرور کیفیت کا بیان ایک معتبر و ثقہ شریکِ مجلس کی زبان سے سنئے، شوال ۱۳۱۱ھ میں پہلا اجلاس ہوا، یہ اجلاس اپنی شان اور اجتماع میں خود اپنی نظیر تھا، ایک شان یہ تھی کہ ہر فرقہ کے صنادید علما شریک جلسہ تھے، علمائے حنفی کے علاوہ اہل حدیث میں سے مولوی ابراہیم آروی، مولوی محمد حسین بٹالوی، شیعہ مجتہدین میں مولوی غلام الحسنین کنتوری شریکِ جلسہ تھے، یہ مشاہدہ تھا کہ تمام علما بلاتخصیص فرقہ صدر نشین کی تعظیم و تکریم میں یکساں سرگرم تھے، کرسیِ صدارت حضرت کے جمال و کمال دونوں پر نازاں تھی، اسی موقع پر جو رسالہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے پیش کیا تھا، اس

میں مفتی عنایت احمد صاحب، مولوی لطف اللہ صاحب اور مولوی احمد حسن کی بڑے شان دار الفاظ میں مدح وثنا کی تھی (استاذ العلما ص۴۲ و۴۳، از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی)

اس کے بعد مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے ندوۃ العلما کے اغراض اور عربی تعلیم کے موجودہ نقائص پر ایک بسیط اور مدلل تقریر فرمائی، یہ تقریر آج بھی اسی طرح حقائق سے لبریز اور صورت حال کے لحاظ سے تازہ ہے، بعد ازیں مولانا شبلی مرحوم نے ندوۃ العلما کا دستور العمل پیش کیا مگر مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کی تحریک سے یہ دستور العمل علما کی ایک مجلس کے سپرد ہوا، عصر کے بعد مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے دینی ودنیوی ترقی اور مذہبی تعلیم پر وعظ فرمایا۔

دوسرے دن ۱۶ رشوال کی صبح کو مولانا شبلی صاحب کی تحریک اور مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کی تائید سے مولانا سید محمد شاہ صاحب محدث رام پوری (راقم کی آنکھیں رام پور کے اتفاقی سفر میں ان کی زیارت سے مشرف ہوئیں، اُس وقت موصوف کے ہاتھ میں دیوان علی کا قلمی نسخہ تھا اور وہ اس کو صاف کر رہے تھے) صدر نشین ہوئے، سب سے پہلے مولانا عبدالحق صاحب حقانی نے ندوۃ العلما کے مقاصد پر ایک پرزور تقریر کی، پھر مولانا ابراہیم صاحب آروی نے دل پذیر وعظ فرمایا۔

۱۷ رشوال کی رات کو مغرب کے بعد دستور العمل پر غور کرنے کے لیے جلسۂ خاص ہوا، اس جلسہ میں تیس جید علما شریک تھے، کچھ اور اہل الرائے معززین بھی تھے، شمس العلما مولوی شبلی صاحب ایک دفعہ پڑھ کر سناتے تھے اور بعد غور وبحث کے وہ منظور ہوتی تھی، اس طرح تمام دستور العمل منظور ہوا جو درجِ روداد ہے۔

تیسرا جلسہ ۱۷ رشوال مطابق ۲۴ راپریل کی صبح کو ہوا، مولانا لطف اللہ صاحب صدارت کی کرسی پر تھے، شمس العلما مولوی شبلی صاحب نعمانی نے اٹھ کر کہا کہ آج کے جلسہ میں حسب ذیل تجویزوں کا پیش اوران پر غور وبحث ہونا قرار پایا ہے:

پہلی تجویز: موجودہ طریقۂ تعلیم قابل اصلاح ہے۔

دوسری تجویز: اس امر کی کوشش کی جائے کہ مدارس اسلامیہ کے مہتمم ہر سال ندوۃ العلما کے اجلاس میں شریک ہوں یا اپنے کسی مدرس یا وکیل کو بھیجیں۔

تیسری تجویز: اس امر میں سعی کی جائے کی مدارسِ اسلامیہ جو کثرت سے جابجا قائم ہیں،

ان کو ایک سلسلہ میں مربوط کرنے کے لیے دو تین بڑے بڑے مدرسے مثل مدرسۂ دیو بند، مدرسہ فیضِ عام کان پور، مدرسہ احمدیہ[1] آرہ وغیرہ بہ طور دار العلوم کے قرار دیے جائیں اور چھوٹے چھوٹے مدرسے ان کی شاخیں قرار دی جائیں اور ان چھوٹے چھوٹے مدرسوں کی تمام کارروائی ان دار العلوموں کی نگرانی میں رہے۔

چوتھی تجویز: مدرسۂ فیضِ عام[2] کان پور چوں کہ باعتبار تعلیم نہایت اعلا مرتبہ کا مدرسہ ہے اور بہ تعداد کثیر پڑھنے والے طلبہ اس میں موجود ہیں، لیکن مدرسہ کا مکان نہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف تعلیم میں حرج ہوتا ہے، بلکہ ان کی آسایش اور آرام کا کافی انتظام نہیں ہوسکتا، لہٰذا کل ہندوستان کے مسلمانوں کو بہ لحاظ محبت و ہمدردی ضرور ہے کہ مدرسۂ فیضِ عام کے ایسے مکان بنانے کے واسطے جس میں دو سو پردیسی طلبہ رہ سکیں، حسب حیثیت چندہ دیں اور مستحق ثواب ہوں۔

---

[1] ہندوستان میں اہلِ حدیث کے نام سے تحریک مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی اور ان کے شاگردوں کے ذریعہ شروع ہوئی، اس تحریک کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ طبیعتوں کا جمود دور ہوا اور جب ایک بند ٹوٹا تو اجتہاد کے دوسرے دروازے بھی کھلے، مولوی نذیر حسین صاحب کے شاگردوں میں مولوی ابراہیم صاحب آروی خاص حیثیت رکھتے تھے، وہ نہایت خوش گوار پُر درد واعظ تھے، وعظ کہتے تو خود روتے اور دوسروں کو رلاتے، نئی باتوں میں سے اچھی باتوں کو پہلے قبول کرتے، چنانچہ نئے طرز پر انجمن علما اور عربی مدرسہ اور اس میں دار الاقامہ کی بنیاد کا خیال ان ہی کے دل میں آیا، اور ان ہی نے ۱۸۹۰ء میں مدرسہ احمدیہ کے نام سے ایک مدرسہ آرہ میں قائم کیا اور اس کے لیے جلسہ مذاکرہ علمیہ کے نام سے ایک مجلس بنائی جس کا سال بہ سال جلسہ آرہ میں ہوتا تھا، اس میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی، ندوۃ کے قیام کے بعد ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں اس کا سب سے پہلا جلسہ آرہ سے باہر دربھنگہ میں ہوا اور وہاں بحث پیش آئی کہ ندوہ کے رہتے ہوئے اس کے قیام کی ضرورت ہے یا نہیں، بہر حال وہ قائم رہا اور مدتوں خوش اسلوبی کے ساتھ چلتا رہا، ۱۹۰۰ء میں میرے والد مجھے اسی مدرسہ میں بھیجنا چاہتے تھے، مگر تقدیر کچھ اور تھی، یہ تجویز عمل میں نہ آئی، مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری متوفی ۱۳۳۷ھ سالہا سال تک اس میں پڑھاتے رہے، مولانا عبدالسلام صاحب مبارک پوری، مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارک پوری اور ہمارے مرحوم دوست مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب جون پوری اور بہت سے علما یہاں کے شاگرد ہیں، حافظ صاحب کے بعد مدرسہ پر زوال آیا، ابھی چند سال ہوئے ہیں کہ یہ مدرسہ آرہ سے دربھنگہ منتقل ہوگیا اور مدرسہ احمدیہ سلفیہ کے نام سے مشہور ہے، مولانا ابراہیم صاحب نے سفرِ حجاز میں ۱۳۲۲ھ میں انتقال فرمایا۔

مولانا شبلی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ایک دفعہ مولوی ابراہیم صاحب نے اپنا مدرسہ اور خاص طور پر اپنا بورڈنگ دکھایا، میں نے ان سے کہا کہ آپ کبھی علی گڑھ آیئے اور کالج اور اس کا بورڈنگ دیکھیے تاکہ خیال کی بلندی اور سلیقہ کی ستھرائی معلوم ہو، بہر حال عربی مدرسوں کی یہ نئی بدعت ان ہی اہل حدیث سے شروع ہوئی۔ [2] مدرسہ فیضِ عام سے کچھ دنوں کے بعد مولانا احمد حسن صاحب نے الگ ہوکر مدرسہ جامع العلوم قائم کیا تو مدرسہ کی حالت گر گئی، مدرسہ اب بھی کسی نہ کسی حال میں ہے، اب وہ انگریزی کا اسکول ہے اور اس میں عربی کے کچھ درجے ہیں۔

غور کا مقام ہے کہ یہ وہ تجویزیں ہیں جو عربی تعلیم کی اصلاح اور عربی مدرسوں کی تنظیم کے لیے آج سے سینتالیس برس پہلے پیش کی گئی تھیں اور سینتالیس برس کے بعد بھی ہم آج اسی وادی تیہ میں حیران وسرگرداں ہیں، مدرسہ فیض عام کی جگہ مدرسۂ دار العلوم ندوہ رکھ لیجیے، صورت حال کیا بعینہ وہی نہیں۔

اس کے بعد پہلی تجویز مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے پیش کی، موصوف نے اپنے رنگ میں اصلاحِ نصاب کے مسئلہ کو بڑی جامعیت سے بیان فرمایا، اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے کھڑے ہو کر اس تجویز کی تائید پر ایک عالمانہ بحث فرمائی اور دکھایا کہ اسلام میں آغاز تعلیم سے طریقہ تعلیم کیا رہا، نصاب کیوں کر بدلتا رہا، علوم معقولات کا رواج کیسے ہوا، درس نظامیہ کی بنیاد کیوں کر پڑی اور موجودہ نصاب میں کیا کیا نقائص ہیں، مثلاً معقولات کی کتابیں اس میں ضرورت سے زیادہ ہیں، منطق کی کتابوں میں متاخرین نے الٰہیات کے مسئلے مخلوط کر دیے ہیں، منطق کی تعلیم کو اس سے پاک رکھنا چاہیے، کتاب کے لفظوں کی نہیں فن کی تعلیم ہونی چاہیے، ادب کی کتابیں بڑھائی جائیں، قرآن پاک اور علوم قرآن کی کتابیں داخل کی جائیں اور طریقِ تعلیم میں اصلاح کی جائے۔

اس تجویز کے بعد اسی سے متعلق مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اپنا مضمون پڑھ کر سنایا، جو شاید مولانا شروانی کی پہلی تقریر ہو، مگر اس میں وہی متانت، وہی زورِ انشا اور وہی جدید وقدیم معلومات کا خوب صورت میل موجود ہے، جو آج بھی ان کی تحریر کی خصوصیات ہیں۔

یہ تینوں تقریریں اس سال کی روداد میں موجود ہیں اور پڑھنے کے قابل ہیں۔

اس کے بعد بارہ علما کی ایک مجلس ترتیبِ نصاب کے لیے مقرر کی گئی جس میں ایک نام مولانا کا بھی تھا، ان بزرگوں نے اپنی اپنی رائے کے مطابق نصاب کے رسالے لکھے اور مولانا نے دار العلوم کے نصاب کے بہ جائے دار العلوم کا مسودہ (خاکہ) تیار کیا جس کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا مسافر قسطنطنیہ کے کسی بڑے شہر میں کھڑا ہے، یہ رسالے آج بھی مل سکتے ہیں۔

تیسری تجویز منظور ہو جانے کے بعد مولانا شبلی مرحوم نے فرمایا کہ جو دستور العمل منظور ہوا ہے، اس کی دفعہ (۱۱) کے مطابق اس کے جلسہ انتظامیہ کے ارکان کا انتخاب ہونا چاہیے، چنانچہ سولہ ارکان کے نام تحریک وتائید سے چنے گئے اور ندوۃ العلما کا کالبد قانونی شکل میں جلوہ گر ہو گیا اور مولانا نے ندوہ کی طرف سے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور ندوہ کا پہلا اجلاس ختم ہو گیا۔

ندوہ کا دوسرا اجلاس | ندوہ کا دوسرا اجلاس جناب منشی اطہر علی صاحب[1] رئیس کاکوری و وکیل لکھنؤ و مشیر قانونی انجمن تعلقہ داران اودھ کی کوششوں سے شوال ۱۳۱۲ھ مطابق اپریل ۱۸۹۵ء میں لکھنؤ میں ہوا، مولانا نے اس اجلاس میں بھی شرکت کی اور پہلے روز ناظم کی طرف سے ندوہ کی سالانہ روداد پڑھ کر سنائی، اس کے بعد علما کے فرائض پر ایک مبسوط تقریر فرمائی، جس میں ان کے علمی، اخلاقی، اصلاحی اور سیاسی فرائض سے ان کو آگاہ کیا ہے، یہ تقریر مضامین اربعہ کے عنوان سے ندوہ کے دوسرے مضامین کے ساتھ چھپ چکی ہے، یہ تقریر ایسی ہے کہ آج بھی علما کی جماعت کے سامنے اس کے پیش کرنے کی ضرورت اسی طرح قائم ہے۔

اسی اجلاس کے جلسہ خاص میں اس تجویز پر بحث ہوئی کہ علومِ زیر درس پر کسی اور علم کا اضافہ ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اس ضرورت کو سب نے تسلیم کیا لیکن اس کے بعد مولوی منصور علی صاحب مرادآبادی نے جب یہ تجویز پیش کی کہ نصابِ درس میں علوم جدیدہ کا اضافہ کیا جائے تو اختلاف ہوا، مولانا شبلی مرحوم، مولانا ابراہیم صاحب آروی اور دوسرے اکثر علما نے ان کے اضافہ کی تائید کی اور مولانا فاروق صاحب اور دو اور علما نے اس کی مخالفت کی لیکن اکثریت سے یہ تجویز منظور ہوگئی، کیا یہ عجیب اختلاف تھا کہ جس میں استاد و شاگرد دونوں دو صف میں تھے، مدت تعلیم بالاتفاق دس برس قرار پائی۔

۱۰ ؍رجب ۱۳۱۳ھ مطابق دسمبر ۱۸۹۵ء کو کان پور میں مجلس نصاب کا جلسہ ہوا، جس میں مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی مدرس مدرسہ کان پور، مولانا عبداللہ صاحب ٹونکی، پروفیسر پنجاب یونیورسٹی مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس اعلا مدرسہ عالیہ رام پور، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولانا شبلی نعمانی نے شرکت اور کئی روز کے بحث و مباحثہ کے بعد مجوزہ دارالعلوم کے نصاب کا خاکہ مرتب ہوا۔ (ص۴۲ روداد بانس بریلی)

---

[1] جناب منشی محمد اطہر علی صاحب اور ان کے خاندان کے دوسرے ارکان جن میں سب سے ممتاز منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری خلف الصدق جناب منشی امتیاز علی صاحب وزیر سابق بھوپال ہیں، ندوہ کے ہمیشہ سے حامی و مددگار رہے، جس کی وجہ یہ تھی کہ ان صاحبوں کو حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی سے نسبت ارادت تھی۔

منشی محمد اطہر علی صاحب کے بڑے صاحب زادہ منشی محمد اظہر علی صاحب وکیل و ممبر اسمبلی زمانہ سے ندوہ کے ممبر ہیں اور جناب منشی محمد احتشام علی صاحب کی دل چسپی بھی ندوہ کے ساتھ اسی زمانہ سے شروع ہوئی جو اب تک بہ دستور قائم ہے۔

تیسرا اجلاس اسی سال شوال ۱۳۱۳ھ مطابق اپریل ۱۸۹۶ء میں بانس بریلی میں مولانا محمد لطف اللہ صاحب مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن کی صدارت میں ندوہ کا تیسرا عظیم الشان اجلاس ہوا، مولانا نے اس کے پہلے ہی اجلاس میں حاضرین کے اصرار سے ندوۃ العلما کے مقاصد پر ایک تقریر فرمائی، اسی اجلاس کے جلسۂ خاص میں دارالعلوم کے اجرا کی تجویز منظور ہوئی۔

دوسرے دن ۲۷ رشوال ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۲/اپریل ۱۸۹۶ء کو ندوہ کے عام اجلاس میں مولانا عبدالحق صاحب حقانی نے دارالعلوم کی تجویز پیش کی اور مولانا شبلی مرحوم نے اس کی تائید کی اور اس سلسلہ میں دارالعلوم کی ضرورت پر ایک تقریر فرمائی، جس میں نئے تعلیم یافتہ اور پرانے علما دونوں کو مخاطب فرما کر اس مجوزہ عربی مدرسہ کی ضرورت بدلائل ثابت کی، مولانا شاہ سلیمان صاحب اور دوسرے علما نے بھی اس سے متعلق تقریریں کیں، یہ بھی طے ہوا کہ مجلس دارالعلوم کے نام سے ایک الگ مجلس (کمیٹی) قائم کی جائے، اس مجلس کے قواعد مولانا شبلی مرحوم نے تیار کیے اور وہ ارکان کے پاس بھیجے گئے۔

پٹنہ کو وفد ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں ندوہ کا ایک وفد جس کے ارکان مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوری، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری، مولانا شاہ امانت اللہ صاحب غازی پوری مولانا ابوالخیر صاحب غازی پوری اور مولانا شبلی صاحب نعمانی تھے، پٹنہ روانہ ہوا اور مولانا حکیم عبدالباری صاحب کے مکان پر قیام ہوا، وفد کے ممبروں نے دو جلسوں میں دو تقریریں کیں، پہلا جلسہ مولانا شاہ رشید الحق صاحب کی خانقاہ عمادیہ میں شہر پٹنہ میں ہوا، اس میں مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے مفصل اور مولانا شاہ امانت اللہ صاحب اور مولانا شبلی مرحوم نے مختصر تقریریں کیں، دوسرا جلسہ پٹنہ گورنمنٹ کالج بانکی پور میں ہوا جس میں تقریباً چار ہزار مسلمان شریک تھے، اس میں دوسرے علما کے بعد مولانا شبلی مرحوم نے دارالعلوم کی ضرورت پر ایسی پراثر اور مدلل تقریر فرمائی کہ نئے تعلیم یافتہ حضرات کے دلوں[1] میں اثر کر گئی، یہ وہ تقریر ہے جس سے علما اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب کے درمیان اسلام کی خدمت کے لیے باہمی اتحاد و معاونت کی راہ نکلی اور جس کی ایک پراثر تصویر ایک سحر نگار[2] نقاش نے ان لفظوں میں کھینچی ہے، علمائے ندوۃ العلما نے شروع سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو مانوس کرنے کی جو کوشش کی اس کا ظہور اس مقام پر ہوا جو مسلمانوں کی روشن خیالی کا زبردست مرکز ہے، یعنی بانکی پور، گو میں خود حاضر نہ تھا، مگر

[1] روداد ندوہ اجلاس میرٹھ، ص ۳۵ [2] مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔

میرے ایک نکتہ سنج محترم نے اس موقع کا مرقع کھینچا تھا، جب مولوی سید شرف الدین صاحب بالقابہ کے ڈرائنگ روم میں قدیم وجدید تعلیم کے قائم مقام اول مرتبہ ملے تھے، جاڑے کی شب تھی، علما پہلے سے رونق افزا تھے، جب سیاہ اودر کوٹوں سے ہال میں تاریکی پیدا ہوئی تو چوں کہ ہمارے محترموں کی نگاہ کے سامنے اول مرتبہ یہ سماں آیا تھا، اس لیے کسی قدر منقبض ہوئے، مگر گفتگو نے جلد اصل حال سے پردہ اٹھا کر ظاہر کر دیا

ع کہ آب چشمۂ حیواں درونِ تاریکی ست

''تاریک کوٹوں کے اندر عقیدت مندی اور نورِ خلوص سے روشن دل چھپے ہوئے تھے، اسی جلسہ میں اجلاسِ پٹنہ کی بنیاد پڑی، اس اجلاس نے خیالات قدیم وجدید کے دو دریا اسی طرح باہم ملتے دیکھے جس طرح گنگا اور سون کے سنگم پر یہ مشہور اور تاریخی شہر واقع ہے۔

چوتھا اجلاس ندوہ کا چوتھا جلسہ شوال ۱۳۱۴ھ مطابق مارچ ۱۸۹۷ء میں میرٹھ میں ہوا، ۱۶ر شوال مطابق ۲۰ر مارچ کو مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے دارالعلوم کی ضرورت اور مقصد پر ایک نہایت مبسوط اور اعلا درجہ کی تقریر کی، جو ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی، اس کا ہر ہر فقرہ بلکہ ہر ہر حرف نقش فی الحجر کی طرح سامعین کے قلوب پر بیٹھا جاتا تھا اور ہر شخص جوش اور فرط انبساط سے محو حیرت ہو گیا تھا مگر افسوس ہے کہ فاضل مقرر نے یہ تقریر پہلے سے قلم بند نہیں کی تھی اور بعد کو جو بھیجی وہ تلف ہو گئی[1]۔

۱۷ر شوال کے جلسہ میں مولانا شبلی مرحوم نے نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب کی اس کوشش کا ذکر فرمایا کہ انھوں نے نینی تال دو مہینے رہ کر اور حکام سے مل کر یہ تجویز منظور کرائی ہے، کہ ہفتہ میں دو بار نصف نصف گھنٹہ مذہبی تعلیم کے لیے وقت دیا جائے، اس کا انتظام اور اس کی تعلیم کا نصاب مسلمانوں کی تجویز پر رکھا ہے، اسی اجلاس میں مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے ایک یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان سے چند مستعد اور ذہین طلبہ کو ندوہ تکمیل علوم کی غرض سے مصر بھیجے، مولانا شبلی مرحوم نے اس کی تائید کی اور قوم سے اس کے لیے علاحدہ چندہ کی تحریک کی جس میں ۳۵ ماہ وار ایک سو چالیس سالانہ اور ایک ہزار دو سو روپے یک مشت وصول ہوئے۔

پانچواں اجلاس ندوہ کا پانچواں اجلاس ۱۴/۱۵ر شوال ۱۳۱۵ھ مطابق ۸-۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو کان پور

[1] رودادِ میرٹھ، ص ۵۷۔

میں ہوا، اس کے صدر مولانا مسیح الزماں خاں[۱] رئیس شاہ جہاں پور استاد حضور نظام سابق ہوئے، اس کے پہلے اجلاس میں مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوہ نے یہ تحریک کی کہ ندوہ کا ایک وفد لکھنؤ بھیجا جائے، جو وہاں جا کر دارالعلوم کے لیے کوئی مناسب زمین تجویز کر کے حاصل کرے اور بالفعل کام شروع کرنے کے لیے کوئی مکان پسند کرے، اس وفد کے لیے حسب ذیل حضرات کے نام انتخاب کیے گئے، مولانا مسیح الزماں خاں صاحب، رئیس شاہ جہاں پور (استاد سابق حضور نظام میر محبوب علی خاں) مولانا سید محمد علی صاحب ناظم مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولوی حاجی یونس خاں صاحب رئیس دتاولی، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارن پوری، خلف مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری) مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب سابق مدرس اعلا رام پور، مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتح پوری، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری اور مولانا شبلی نعمانی۔

دوسرے اجلاس میں مولانا شاہ امانت اللہ صاحب فصیحی غازی پوری کی وفات پر افسوس ظاہر کیا گیا، اس فرض کو مولانا شبلی مرحوم نے ادا کیا، فرمایا "مولانا میں ایسی بہت سی خصوصیتیں تھیں جن کی وجہ سے وہ تمام علما کی جماعت میں ایک ممتاز اور جداگانہ حیثیت رکھتے تھے، وہ جس عظمت و شانِ خودداری اور پاسِ وضع، بلند نظری اور عالی حوصلگی سے بسر کرتے تھے، اس سے اسلامی شان کا جلوہ نظر آتا تھا، جب وہ وعظ و تبلیغ کی ضرورت سے سفر کرتے تھے تو جس طرف ان کا گزر ہوتا تھا، ایک غلغلہ پڑ جاتا تھا اور غیر مذہب والوں پر اس کا اثر پڑتا تھا، وہ ندوۃ العلما کے قوت بازو تھے، اکثر جلسوں میں تشریف لاتے تھے۔"

اس تقریر کے یہ فقرے اس لیے میں نے نقل کیے ہیں تاکہ اُس زمانہ کے باوضع علما کی دنیاوی وجاہت کی بھی ایک تصویر آپ کو نظر آ جائے۔

اب وہ زمانہ آ گیا ہے، جب ندوۃ العلما کے آوازہ نے گورنمنٹ کے کان کھڑے کر دیے ہیں اور ارکان کو یہ خیال ہونے لگا ہے کہ صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر صاحب سے مل کر ان کے شکوک کو دور کیا جائے، چنانچہ جناب منشی محمد اطہر علی صاحب وکیل و مشیر قانونی انجمن تعلقہ دارانِ اودھ نے آخر نومبر ۱۸۹۷ء میں الہ آباد جا کر لفٹنٹ گورنر سے ملاقات کی اور ندوہ کی طرف سے ایک وفد کی حاضری

---

[۱] مولانا مسیح الزماں خاں صاحب اس زمانہ کے مشہور رئیس علما میں تھے، حضور نواب میر محبوب علی خاں نظام دکن کے استاذ اور اتالیق تھے، مولوی محمد زماں خاں صاحب شہید کے بھائی اور سالار جنگ اول کے پورے معتمد علیہ تھے، جس زمانہ میں نواب محسن الملک اور وقار الملک وغیرہ حیدر آباد میں تھے، مولانا ممدوح بھی تھے اور اعلا حضرت پر بڑا اثر رکھتے تھے آخر میں ریاست سے ان کا بیش قرار منصب مقرر ہو گیا تھا اور وہ اپنے وطن شاہ جہاں پور چلے آئے تھے، میں نے اخیر زمانہ میں دیکھا تھا، بالا قد، فربہ اندام اور چہرہ پر رعب تھا، ان کے دیکھنے سے لوگوں پر اثر پڑتا تھا، ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء میں شاہ جہاں پور میں وفات پائی۔

کی درخواست پیش کی، لاٹ صاحب نے ایڈریس دیکھنے کے بعد وفد کی پذیرائی کا خیال ظاہر کیا، اس اجلاس میں منشی محمد اطہر علی صاحب نے اس ایڈریس کا مسودہ پڑھ کر سنایا اور مولانا شبلی صاحب کی تحریک سے یہ طے ہوا کہ خان بہادر منشی محمد اطہر علی صاحب اور خان بہادر چودھری نصرت علی صاحب رئیس سندیلہ واسسٹنٹ سکریٹری انجمن تعلقہ دارانِ اودھ اس کو لاٹ صاحب کی خدمت میں لے جا کر پیش کریں، مولانا سید محمد علی صاحب کی تائید سے سب نے اس کو منظور کیا۔

اس کے بعد مولانا سید محمد علی صاحب نے یہ تحریک کی کہ مجوزہ دارالعلوم کے ابتدائی درجہ کے ایک سال کے مصارف کا اسی وقت انتظام ہونا چاہیے، منشی اطہر علی صاحب نے اس کی تائید کی، مولانا شبلی صاحب نے فرمایا کہ علما پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ وہ خود کسی کام کو اپنے روپیہ سے نہیں کرتے، اس واسطے میں یہ تحریک کرتا ہوں کہ درجۂ ابتدائی دارالعلوم کے ابتدائی مصارف کے متکفل ارکانِ انتظامیہ ہو جائیں، مولوی مسیح الزماں خاں صاحب صدر جلسہ نے تائید کی، چنانچہ حسب ذیل علما اور بعض ارکان نے اس کے لیے چندہ منظور کیا:

علما

۱- مولوی مسیح الزماں خاں صاحب رئیس شاہ جہاں پور	۲۰۰ روپے
۲- مولوی محمد یونس خاں صاحب رئیس وتاولی	۲۰۰ روپے
۳- مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی	۱۲۵ روپے
۴- مولوی شبلی صاحب نعمانی	۱۰۰ روپے
۵- مولوی سید محمد علی صاحب ناظم ندوہ	۵۰ روپے
۶- مولوی خلیل الرحمٰن صاحب سہارن پوری	۵۰ روپے
۷- مولوی شاہ ابوالخیر صاحب غازی پوری (خلف مولوی شاہ امانت اللہ صاحب)	۵۰ روپے
۸- مولوی مشتاق علی صاحب، مدرس فیض آباد	۲۵ روپے
۹- مولوی حکیم رونق علی صاحب رودولوی	۲۵ روپے
۱۰- مولوی محمد داؤد صاحب وکیل مرزا پور	۲۵ روپے
۱۱- مولوی مفتی رحیم بخش صاحب مدرس المورہ	۲۵ روپے

رؤسا

۱۲- خان بہادر منشی اطہر علی صاحب	۱۵۰ روپے

۱۴- مولوی سید اشرف صاحب، رئیس کان پور ۱۲۵ روپے

یہ فہرست دو غرض سے یہاں نقل کی گئی ہے، ایک تو یہ کہ اس زمانہ تک علما میں کس قدر باحیثیت اصحاب موجود تھے، جو اس قسم کی تحریک کے لیے لبیک کو تیار تھے اور آج ذی حیثیت لوگوں میں علم دین کی کتنی کمی آ گئی ہے، دوسری غرض ان بزرگوں کے ناموں کو زندہ کرنا ہے، جنھوں نے دارالعلوم کی اس عظیم الشان تجویز کو عمل میں لانے کے لیے سب سے پہلے سبقت فرمائی، هم جزا الله خیرالجزا۔

اس کے بعد پچھلے سال نواب وقارالملک مولوی مشتاق حسین صاحب کی کوشش سے انگریزی اسکولوں میں مذہبی تعلیم کی جو تجویز گورنمنٹ نے منظور کی تھی، اس کے بارہ میں مولانا سید عبدالحیؒ صاحب مددگار ناظم اور مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے تحریک کی کہ اس کام کو ندوہ اپنے ہاتھ میں لے، منشی محمد اطہر علی صاحب نے تجویز پیش کی کہ ابھی صرف کان پور میں یہاں کے مسلمانوں کی کوشش سے اس قسم کا مقامی انتظام کیا جائے، اسی کی تائید مولوی شبلی صاحب نے فرمائی اور کہا کہ میرا قیام اگر کان پور میں ہوتا تو میں نہایت خوشی سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور اس خدمت کو قبول کرتا، اس کے بعد مولوی عبداللطیف[1] صاحب مفتی ندوۃ العلما سے فرمایا کہ آپ کسی قدر وقت تدریس میں بھی صرف کرتے ہیں، آپ اس دینی خدمت کو بالفعل قبول کر لیجیے، مولوی مفتی عبداللطیف صاحب نے مسرت کے ساتھ اس خدمت کو قبول کیا اور جلسہ کی کارروائیاں اختتام کو پہنچیں۔

---

[1] مولوی مفتی عبداللطیف صاحب کا وطن سنبھل ضلع مراد آباد ہے، مولانا لطف اللہ صاحب کے آخری شاگردوں میں سے اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے رفقائے درس میں سے ہیں، فراغت کے بعد ندوہ میں مفتی کے عہدہ پر مقرر ہوئے، پھر جب ایک سال کے بعد ندوہ نے اپنا دارالعلوم کھولا تو اس میں شوال ۱۳۱۶ھ سے مدرس ہو گئے، خاکسار نے اکثر ابتدائی اور فقہ کی کتابیں موصوف ہی سے ندوہ میں پڑھیں، غالباً ۱۹۰۳ء کے بعد یہ ندوہ کی خدمت چھوڑ کر مولانا محمد علی صاحب کے پاس مونگیر چلے گئے تھے، پھر حجاز تشریف لے گئے اور وہاں کئی سال تک مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں مدرس رہے، واپسی کے بعد پھر مونگیر میں رہے، اور خانقاہ رحمانی میں تالیف و تصنیف کی خدمت انجام دی، ۱۹۱۷ء میں جب مولانا شروانی حیدر آباد میں صدر الصدور اور جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر ہوئے تو انہوں نے مفتی صاحب کو جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں پروفیسر مقرر کیا اور آخر مولانا شیر علی صاحب کے بعد وہ شعبہ دینیات کے صدر ہوئے اور اب چند سال ہوئے کہ انہوں نے پنشن پائی، امسال ۱۹۳۹ء میں وہ مولوی سلیمان اشرف صاحب مرحوم کی جگہ پر مسلم یونیورسٹی میں علوم دینیہ کے پروفیسر مقرر ہوئے ہیں۔

موصوف کو طریقۂ تعلیم اور طریقۂ تفہیم میں کمال حاصل ہے، متعدد کتابیں اردو میں لکھی ہیں، صرف (عربی قواعد) اور علم الفقہ کے چند رسالے لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں لکھے، مونگیر میں رہ کر تاریخ القرآن اور سیرۃ امام ابوحنیفہ لکھی، حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں جامع ترمذی کی شرح لکھ رہے تھے، جو غالباً ابھی ناتمام ہے۔

کالج سے رخصت لینے کی تجویز ۱۸۹۷ء کئی برس سے آب و ہوا کی ناموافقت اور کثرت دماغی محنت کے سبب سے مولانا کا معدہ صحیح نہیں رہا تھا، ۶ مارچ ۱۸۹۶ء کو لکھتے ہیں:

"میں دو ایک مہینہ سے بالکل بے کار رہتا ہوں، دماغ سے کچھ کام نہیں ہوسکتا، اب کی انشاء اللہ مکان پر نہایت مستعدی سے علاج کراؤں گا، میری خواہش ہے کہ تمام تعطیل اعظم گڑھ میں بسر کروں، بندول دو تین روز سے زیادہ نہ رہوں۔" (سمیع - ۳۸)

اس سلسلۂ علالت پر مستزاد سید محمود مرحوم کا عبرت ناک اخیر زمانہ کا سوءِ مزاج تھا، اب ان کو کالج کے جز وکل پر پورا اختیار ہوگیا تھا، وہ جدھر نکل جاتے، گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ کر گپ کرتے اور وقت ضایع کرتے، مولانا ان کی اس عادت سے زچ ہوگئے تھے، کیوں کہ الفاروق کی تکمیل کے لیے جس یکسوئی کی ضرورت تھی وہ ملتی نہ تھی، اسی لیے مولانا نے ان سے ایک دو دفعہ بے رُخی برتی تو ان کو اس سے شکایت پیدا ہوگئی اور وہ بڑھتی ہی گئی، یہاں تک کہ انہوں نے مولانا پر عدم لیاقت کا الزام قائم کیا اور ان سے بعض درجے چھین لیے اور کبھی ان کے اس ہنر کو عیب ٹھہرایا کہ یہ دینیات کے سبق اپنے حسن تقریر سے اس قدر دل چسپ بنا دیتے ہیں کہ لڑکے دوسرے مضامین کی طرف توجہ کم دیتے ہیں[1]۔

مولانا کی پریشانی کی تیسری چیز بک صاحب کی سیاست تھی، انہوں نے ایک مسلّمہ مسلمان لیڈر کی حیثیت حاصل کرلی تھی اور پردہ کے پیچھے سے سیاست کی کٹ پتلیوں کو حرکت دیا کرتے تھے، مولانا ان کی اس طرزِ سیاست کو جس کا مقصد کالج کو غلامی اور وفاداری کا دل چسپ و دل پذیر سبق پڑھانا تھا، سخت ناپسند فرماتے تھے۔

اسی زمانہ میں ایک بار دیوان حافظ کھول کر فال دیکھی کہ کالج کی قید سے مجھے کب رہائی نصیب ہوگی، خواجہ حافظ صاحب نے جواب دیا:

وقت آں است کہ پدرود کنی زنداں را

مولانا خواجہ صاحب کی اس نصیحت پر عمل کیا اور ایک سال کے لیے اس قید خانہ سے رہائی کی درخواست دی، یعنی دسمبر ۱۸۹۶ء[2] سے نومبر ۱۸۹۷ء تک کی رخصت لی اور اعظم گڑھ چلے آئے، مگر

---

[1] حسب روایت سید سجاد حیدر صاحب یلدرم [2] یہ تاریخ مولوی سمیع صاحب کے ایک خط میں ملی، جو درج مکاتیب نہیں، ۵ دسمبر کو علی گڑھ سے ان کو جون پور لکھتے ہیں، تمہید کے بعد خط (کارڈ) یہ ہے: "میں غالباً ۲۳ یا ۲۴ دسمبر کو یہاں سے روانہ ہوتا ہوں، اگر تمہارا قصد اعظم گڑھ کا ہو تو انتظار کرو کہ میرا ساتھ ہو اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو لکھ بھیجو، میں نے سردست سال بھر کی رخصت لی ہے، والسلام، شبلی، ۵ دسمبر ۱۸۹۶ء"۔

یہاں آ کر ان کا جی نہ لگا، فروری ۱۸۹۷ء میں وہ پھر علی گڑھ گئے لیکن پھر واپس آ گئے اور جون جولائی اور اگست ۱۸۹۷ء اعظم گڑھ میں گزارے، ان ہی دنوں ۲۷ رجون ۱۸۹۷ء کو ان کے منجھلے بھائی مہدی حسن بیرسٹر و منصف نے اعظم گڑھ میں وفات پائی، یہ غم مولانا کے لیے بڑا سوہانِ روح کا باعث ہوا، (سمیع-۴۰) اس حالت میں بھی وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے والد ماجد کی جوان دنوں بیماری سے اچھے ہوئے تھے، صحت یابی کی خوشی کا اور موازنہ قومی کا جلسہ کریں (سمیع-۴۱) اور یہ خیال بھی تھا کہ مرحوم بھائی کی یادگار میں نیشنل اسکول میں کوئی عمارت بنوائیں (حمید[۱]-۳) اس کے بعد افسردگی کے دور کرنے کے لیے کوئی سفر کریں (سمیع-۴۱) مگر وہ کہیں نہ جا سکے اور اگست بھر یہیں رہ کر نومبر ۱۸۹۷ء میں علی گڑھ واپس چلے گئے اور یہ کوشش شروع کی کہ ان کو کالج سے کافی طویل رخصت مل جائے۔

سر سید اور مسٹر بک اس شرط سے رخصت دینا چاہتے تھے کہ مولانا سال میں چھ مہینے علی گڑھ میں آ کر قیام کریں، مگر دفعۃً سید محمود جوان دنوں کالج پر حاوی تھے، اس کے مخالف ہو گئے، ۹ رنومبر[۲] ۱۸۹۷ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ بک صاحب اور سید صاحب وغیرہ یہ چاہتے ہیں کہ میں یہاں شش ماہہ قیام کروں لیکن سید محمود دفعۃً اس کے مخالف ہو گئے اور اسی اپنی حالت میں بہت سی باتیں اس کے خلاف کہیں لیکن اس قسم کی ان سے اب کسی کو شکایت نہیں رہی، ہر روز یہاں کے رؤسا، ٹرسٹیز اور ارکانِ کالج اس قسم کی باتوں کے متحمل ہو گئے ہیں، میں تو اس دن سے سید صاحب کی کوٹھی پر گیا ہی نہیں، باقی ترکِ تعلق اس کی یہ کیفیت ہے کہ میں نے سال بھر کی رخصت اسی تجربہ کے لیے لی تھی، میں نے دیکھا کہ اعظم گڑھ سال بھر برابر نہیں رہ سکتا، وہاں کوئی ایسی دل چسپی نہیں کہ سال بھر تک کام چل سکے، اس لیے کچھ یہاں (علی گڑھ) کچھ وہاں (اعظم گڑھ) کچھ ندوہ، اسی طرح بسر کرنے کا ارادہ ہے۔'' (حمید-۸)

الفاروق کی تالیف ۱۸۹۴ء-۱۸۹۸ء الفاروق کی تالیف میں اب تک جو انتظار تھا وہ مولانا کی تصریح کے مطابق یورپ میں بعض تاریخی مطبوعات کی تاخیر کے سبب تھا، خصوصاً طبری جواب تک چھپ کر تمام نہیں ہوئی تھی، (مہدی افادی-۵) ۱۸۹۴ء میں جب تاریخِ مذکور کا حصہ مطلوبہ تمام ہو گیا تو مولانا نے اس کی تالیف کا عزم مصمم کر لیا، چنانچہ اگست ۱۸۹۴ء سے جیسا کہ الفاروق کے دیباچہ میں تصریح ہے، پورے

[۱] مکاتیب کے حاشیہ میں غلطی سے اس یادگار کو مولانا کی مرحومہ بیوی سے منسوب سمجھا گیا ہے۔ (حمید-۳) [۲] مکاتیب میں ۱۸۹۸ء غلط چھپ گیا ہے۔

عزم کے ساتھ الفاروق لکھنی شروع کی، بیچ بیچ میں ناغے بھی ہوتے رہے، اس کے لیے جن کتابوں کی ضرورت تھی، ان میں سے ایک طبقات ابن سعد تھی، جواب چھپ کر شایع ہو چکی ہے، مگر اس زمانہ میں یہ عنقا تھی، ہندوستان میں شاید مولوی ناصر حسین مجتہد لکھنؤ کے کتب خانہ میں تھی، مگر انہوں نے دینے سے انکار کیا، آخر ۱۹؍جنوری ۱۸۹۸ء کو مولانا نے مولوی حسین عطاء اللہ صاحب حیدر آبادی کو خط لکھا جن کے پاس قلمی کتابوں کا نادر ذخیرہ تھا اور جن کی نسبت مولانا کو معلوم ہوا تھا کہ ان کے کتب خانہ میں یہ نسخہ موجود ہے، طبقات کا نسخہ مولانا نے قسطنطنیہ میں دیکھا تھا (سفر نامہ) مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ضروری اقتباس نہ لے سکے تھے، اس لیے اس کی تلاش جاری تھی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان کو نہ مل سکی، کیوں کہ الفاروق میں اس کا کوئی حوالہ نہیں، دوسرے یہ کہ جب ابن سعد چھپ کر آئی ہے تو مولانا ندوہ میں تھے، مجھ سے فرمایا کہ ''دیکھو، ابن سعد میرا اہم مذاق تھا، اس نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حال خوب جی کھول کر لکھا ہے۔''

کتاب کا ایک حصہ تین سال کے بعد جون ۱۸۹۷ء میں تمام ہو کر کان پور کے مطبع نامی میں دے دیا گیا (اسحاق-۷) باقی حصہ زیر تحریر تھا، چنانچہ ۳؍جولائی ۱۸۹۷ء کو لکھتے ہیں ''میں نے الفاروق مطبع نامی کان پور میں چھپنے کو دے دی لیکن ابھی اصل کتاب میں ایک ثلث تصنیف کے لیے باقی ہے۔'' (حمید-۳)

ایک سال کے بعد ۴؍فروری ۱۸۹۸ء کو رقم فرماتے ہیں ''الفاروق حصہ دوم میں نے تیار کر لیا ہے، قریباً نصف چھپ بھی گیا ہے۔'' (حمید-۴)

کالج سے الگ ہو کر جون ۱۸۹۸ء میں اعظم گڑھ چلے آئے اور الفاروق کا کچھ حصہ اسی اعظم گڑھ میں اسی شبلی منزل میں اسی کمرہ میں جس میں یہ تحریر اس وقت قلم سے نکل رہی ہے لکھا اور حصۂ دوم کا آخری صفحہ کشمیر میں بیٹھ کر بخار کی حالت میں پانچ جولائی ۱۸۹۸ء کو حوالۂ قلم کیا۔ (خاتمہ الفاروق) مولانا فرماتے تھے کہ جس وقت یہ اخیر صفحہ تمام ہوا ہے، مصنف بخار سے بے حال ہو کر بستر پر دراز تھا، کتاب میں جو کچھ باقی رہ گیا تھا، وہ کشمیر سے واپس آ کر اسی سال شبلی منزل میں جہاں وہ کبھی بیمار رہتے تھے اور کبھی اچھے ہو جاتے تھے اور کبھی سفر کو نکل جاتے تھے، ختم کیا اور یہیں کتاب کا مختصر مقدمہ دسمبر ۱۸۹۸ء کی کسی تاریخ میں لکھا۔

۱۹؍ستمبر ۱۸۹۸ء تک اس کے ۳۱۲ صفحے چھپ چکے تھے، رقم طراز ہیں ''الفاروق کان پور مطبع نامی میں بڑے اہتمام سے چھپ رہی ہے، ایک حصہ جس کے ۳۱۲ صفحے ہیں، پورا چھپ کر تیار ہو گیا ہے، لوح طلائی اور لاجوردی چھپ رہی ہے اور اس کا کاغذ اتنا نفیس دیا گیا ہے کہ ہندوستان میں آج

تک ویسا کاغذ کبھی استعمال نہیں ہوا، جو قدرداں صاحب چرمی کاغذ پر لوح چھپوانا چاہتے ہیں وہ دیکھیں گے تو اس کاغذ کو چرمی کاغذ پر ترجیح دیں گے۔" (مہدی افادی-۸)

مولانا نے جس حصہ کے ۳۱۲ صفحے لکھے ہیں وہ دوسرا حصہ ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرا حصہ پہلے لکھا گیا اور چھپا، دونوں حصوں کے ہندسے الگ تھے، اس لیے آگے پیچھے ہونا ممکن تھا۔

بھوپال کا دوسرا سفر اور عربی مدارس کی تنظیم، فروری و مارچ ۱۸۹۸ء بھوپال میں مولانا کے دوست نواب سید علی حسن خاں صاحب کو حضور شاہ جہاں بیگم صاحبہ نے ۱۳۱۵ھ میں اپنی ریاست کے تعلیمات کا افسر اعلا (ڈائرکٹر) بنا دیا تھا، اس وقت بھوپال کی ریاست کو اس وجہ سے کہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی وفات کو ابھی چند ہی سال ہوئے تھے، عربی تعلیم کی طرف پوری توجہ تھی اور عربی کے پانچ مدرسے شہر بھوپال میں قائم تھے، مگر نتیجہ کچھ نہ تھا، نہ تعلیم کا کوئی سررشتہ تھا نہ قواعد تھے، نہ رجسٹر تھے، نہ کوئی کتب خانہ تھا، نہ امتحان تھا، نہ مدرسین کی حاضری تھی، نہ کوئی نصاب تھا، نہ درجہ بندی تھی، طلبہ پڑھتے اور علما پڑھاتے تھے، نہ کسی سال کوئی طالب علم فارغ ہوتا اور نہ اس کی کوئی فکر تھی، مدرسین کو تنخواہیں اور طالب علموں کو ماہوار وظیفے ملتے تھے اور ان کے کھانے کپڑے کا انتظام تھا اور یہی ان مدرسوں کا ماحصل تھا، طالب علم روٹیوں کے لیے پڑے رہتے اور ماہوار وظیفوں کے لیے پڑھتے تھے، ولایتی اور بنگالی طالب علم ایک دور ختم کرتے تو فوراً دوسرا دور شروع کر دیتے، تاکہ تعلیم سے فراغت ہی نہ ہو، جو اس "جنت" سے نکلنا پڑے، گویا یہ پڑھنے کی نوکری کرتے تھے اور یہی حالت اس وقت ہندوستان کے ان عام مدارس کی تھی جن کو ارباب خیر نے جاری کر رکھا تھا۔

نواب صاحب نے یہ کیفیت دیکھ کر ۱۳۱۷ھ میں "نظارۃ المعارف" کے نام سے ایک تعلیمی مجلس شوریٰ قائم کی جس میں بھوپال کے علاوہ باہر کے دو ممتاز عالموں کو جو عربی مدارس کی تنظیم و اصلاح کے لیے کوشاں تھے، باہر سے بلوایا، ان میں سے ایک شمس العلما مولانا شبلی اور دوسرے مولانا ابراہیم صاحب آروی تھے، جنھوں نے آرہ میں نئے پرواز پر ایک عربی درس گاہ مدرسۂ احمدیہ کے نام سے قائم کی تھی، تعلیم کے ان ماہروں کے مشورہ سے نواب صاحب نے بھوپال کے مدارس کی اصلاح و تنظیم کا کام شروع کیا[1]۔

---

[1] نواب صاحب مرحوم نے اس کی تفصیل اپنی خودنوشت سوانح عمری میں جو معارف ۱۹۳۷ء میں مسلسل چھپی ہے، لکھی ہے اور مارچ ۱۹۳۷ء کے نمبر میں یہ کیفیت درج ہے۔

خوش قسمتی سے نواب صاحب ممدوح کے محفوظ کاغذوں میں مولانا مرحوم کی دو یادداشتیں جن میں ایک ۲۷رفروری اور ۲رمارچ کو اور دوسری ۲راپریل ۱۸۹۰ء کو لکھ کر نواب صاحب کی خدمت میں بھیجی تھی، مل گئی ہیں۔

مولانا مرحوم ''نظارۃ المعارف'' کی مجلس شوریٰ کی شرکت سے فارغ ہو کر فروری کے آخر میں علی گڑھ پہنچے، جیسا کہ ۲۷رفروری کی یادداشت میں ذکر ہے، واپس آ کر ۲۷رفروری اور ۲رمارچ کی دو نشستوں میں عام انتظامی معاملات کی ۱۳ دفعات لکھی ہیں، دوسری یادداشت جو مفصل ہے اور جو ۲راپریل کو مرتب کی گئی ہے، دو کاغذوں پر مشتمل ہے، ایک میں طلبہ کے امتحان اور وظیفوں کے قواعد ہیں اور دوسرے میں پہلے مدرسین کی حاضری اور رخصت کا دستور العمل اور پھر اس کے نصاب کا خاکہ اور تقسیم اوقات کا نقشہ ہے، اس یادداشت کو اس مقام پر اس لیے نقل کیا جاتا ہے تاکہ ہندوستان کے عربی مدارس کی اصلاح کا سب سے پہلا تاریخی نقشہ نگاہوں کے سامنے آ جائے۔

''دستور العمل و ہدایات برائے مدرسین''

دفعہ ۱- تمام مدرسین کو ضرور ہوگا کہ وقت معین پر مدرسہ میں آئیں۔

۲- ایک حاضری کی کتاب مدرس اول کے کمرہ میں موجود ہوگی، ہر مدرس مدرسہ میں آنے کے ساتھ اپنی حاضری اپنے قلم سے اس میں لکھ دے گا، اس کتاب میں تاریخ دن وقت نام اور دستخط کے خانے ہوں گے (پنجاب میں یہ طریقہ عموماً جاری ہے)

۳- ہر مدرس اپنے طلبہ کی حاضری لے گا جو طالب العلم غیر حاضر ہو اس پر جرمانہ اور دیر میں آئے تو خفیف تنبیہ کرے گا۔

۴- کسی مدرس کو جائز نہ ہوگا کہ اوقاتِ مدرسہ میں (بہ جز کسی اتفاقیہ خاص ضرورت کے) مدرسہ سے باہر جائے یا ان اوقات میں کوئی شخص اس سے ملنے آئے۔

۵- مدرسین کو ایک دن کی رخصت دینے کا اختیار مدرس اعلا کو ہوگا اور اس سے زیادہ کے لیے بہ توسط مدرس اعلا کے سررشتۂ تعلیم کے افسر کے پاس درخواست بھیجنی ہوگی۔

۶- جو مدرس کسی دن مدرسہ میں نہ آئے تو ضرور ہوگا کہ وہ رخصت کی درخواست پہلے بھیج کر منظوری حاصل کر لے۔

۷- تعلیم نقشۂ انضباط اوقات کے موافق دی جائے گی اور ہر مہینہ کے اخیر میں ایک کتاب میں جو اسی غرض کے لیے تیار کی جائے گی، ہر مدرس کو یہ درج کرنا ہوگا کہ اس مہینہ میں ہر صف کو کس قدر تعلیم دی گئی۔

۸- ہر مہینہ کے اخیر میں ہر مدرس اپنے طلبہ کا امتحان لے گا اور تاریخ امتحان ایک کتاب میں درج کر لے گا۔

۹- امتحانات نہایت احتیاط کے ساتھ بلا رو رعایت لیے جائیں گے۔

نقشۂ انضباط اوقات بہ تعیین مدرسین

جدول اور خانے وہاں بنا لیے جائیں،

درجہ	۱۰ سے ۱۱ تک	۱۱-۱۲	۱-۲	۲-۳	۳-۴
اول	صرف	حساب	فارسی	صرف	املا وتحریر
دوم	فارسی	صرف	حساب	املا وتحریر	نحو
۳	نحو	منطق وادب	تاریخ وعقائد	عربی انشا پردازی	حساب
۴	حساب	منطق ومناظرہ	فقہ	حدیث وفرائض	ادب
۵	فلسفہ ومنطق	فقہ واصول	عقائد وتاریخ	حساب	ادب
۶	منطق	حساب	فلسفہ	عروض ومعانی	ادب

۱- یہ نقشہ نصاب تعلیم اور تعداد مدرسین کی مناسبت پر مبنی ہے۔

۲- ادب کا ہر روز ایک گھنٹہ رکھا گیا ہے۔

۳- جمعرات کے دن صرف دو گھنٹے جو ہیں اس میں کم ضروری مضامین کو نکال دیا جائے۔

دفعہ دوم میں آپ نے لکھا ہے کہ ”طلبہ کو عربی لکھنی نہیں آتی، اس کے لیے طرزِ تعلیم کے قواعد مقرر ہونے چاہئیں، یہ امر قاعدہ کے نیچے نہیں آسکتا بلکہ مدرسین کے ادبی مذاق پر موقوف ہے لیکن اس کی تدبیر سر دست یہ ہونی چاہیے کہ نقشۂ انضباط اوقات میں املا وتحریر اور ادب کا ہر روز جو ایک گھنٹہ رکھا گیا ہے، اس میں ہمیشہ اردو سے عربی میں ترجمہ کرایا جائے لیکن چوں کہ مدرسین خود عمدہ عربی نہیں لکھ سکتے ہوں گے اور اس لیے ان کی اصلاح چنداں مفید نہ ہوگی، اس لیے اس کا یہ طریقہ ہے کہ عربی کی ایک کتاب عمدہ عبارت کی جس میں قصے ہوں، پہلے مدرس صاحب اس کا صفحہ آدھ صفحہ اُردو میں با محاورہ ترجمہ کر کے وہی ترجمہ طلبہ کو دیں، پھر اصلاح میں اصل عبارت کے موافق اصلاح دیں، یا بالکل وہی وصل یا بہ تغیر یسیر، ہاں اس قدر ضرور چاہیے کہ طلبہ کی صرفی ونحوی اور محاورہ کی غلطیوں پر ان کو مطلع کر دیا کریں۔

دفعہ۳- کا جواب مقدمہ ابن خلدون وغیرہ کے مضامین کا انتخاب میں خود کر کے کل پرسوں بھیجوں گا۔

دفعہ۴- کا جواب، مختصر تاریخ ہندوستان جہاں گیری[1] وصدیقی کے لیے قصص الہند مطبوعہ لاہور نہایت عمدہ اور دل چسپ کتاب ہے، اس کا اسلامی حصہ خاص مولوی محمد حسین آزاد کا لکھا ہوا ہے اور بہت ہی دل چسپ ہے، مسائل ضروری دینیات کے لیے کیا راہِ نجات کافی نہیں؟

دفعہ۵- ہاں میں نے اپنے ریمارکوں میں بعض جگہ کتابوں کے نام نہیں متعین کیے تھے، وہ اب لکھتا ہوں، حسب ترتیب ریمارک۔

درجۂ دوم۔ سفر نامہ کے بہ جائے ناسخ التواریخ کا وہ حصہ جو پنجاب کے فارسی مڈل کلاس میں داخل ہے، وہ کورس منگوالینا چاہیے، مخزن الفوائد کے بہ جائے عبدالواسع کے آسان حصے۔

درجۂ چہارم۔ شرح وقایہ سے پہلے انتخاب جامع صغیر امام محمد، ادب کی کتاب اس درجہ میں کلیلہ دمنہ ابن المقفع مطبوعۂ بمبئی۔

درجۂ پنجم۔ شرح ہدایۃ الحکمۃ مولوی عبدالحق خیر آبادی مناسب ہے، مولانا لطف اللہ صاحب مفتی حیدر آباد نے اپنے کورس میں اسی کو منتخب کیا ہے۔

ملا حسن ہرگز نہیں رکھنا چاہیے، بلکہ اس کے بہ جائے شرح سلّم بحر العلوم مطبوعۂ دہلی رکھنا چاہیے۔ (یہ ریمارک پہلے رہ گیا تھا)

ادب کی کتاب اس درجہ میں انتخاب دیوان ابوالعتاہیہ، مطبوعۂ بیروت رکھنا چاہیے، ہاں یہ امر خاص قابل لحاظ ہے کہ تمام میں حساب کی کتاب پی گھوش کے بہ جائے چکرورتی ارتھمیٹک رکھنی چاہیے، اب ادھر وہی متداول ہے، ہمارے کالج میں اور دوسرے کالجوں میں زیادہ تر اسی کا رواج ہے اور اس کو عموماً ترجیح دی جاتی ہے اردو میں اس کا ترجمہ ہوگیا ہے اور بار بار چھپ چکا ہے۔

فارسی کے درجہ میں مجھ کو سخت اختلاف ہے، ایک کتاب بھی کام کی نہیں، منتخباتِ نظم ونثر تو تیار نہیں کہ اس کو دیکھ کر کوئی رائے دی جا سکے۔

مقاماتِ حمیدی میں نے دیکھی، بلکہ پڑھی ہے، وہ طرز[2] بہ جز حمیدی کے پھر کسی نے اختیار نہیں کیا اور نہ اس طرز میں کوئی مفید مضمون ادا ہو سکتا ہے۔

---

[1] جہاں گیری وصدیقی بھوپال کے دو مدرسوں کے نام ہیں۔ [2] یہ فارسی میں مقامات حریری کے طرز کی کتاب ہے، عبارت مقفّی، مسجع اور لفظی صنائع وبدائع سے بھری ہوئی ہے۔

تحفۃ الاحرار جامی، بالکل پست درجہ کی کتاب ہے، اس سے تو مطلع الانوار خسرو کہیں اچھی ہے اور خود جامی اس کے معترف ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فارسی کے تین دور ہیں، قدما مثلاً فردوسی، عبدالواسع جبلی، منوچہری، اخیر میں انوری متوسطین مثلاً سعدی، سلمان ساوجی، کمال اسماعیل، متاخرین، مثلاً نظیری، عرفی، ظہوری، طالب آملی کلیم ان تینوں طبقے کی ایک ایک دو دو کتاب پڑھانی چاہیے کہ طالب علم کو ایک عام بصیرت ہو، منوچہری، سلمان، کمال اسمٰعیل وغیرہ سب چھپ گئے ہیں۔

اس درجہ میں تاریخ کی کتاب نامۂ خسرواں موزوں ہے، جغرافیہ کی فارسی تصنیف جام جم ہے لیکن وہ بڑی کتاب ہے اور ۱۳ روپیہ اس کی قیمت ہے، جغرافیہ اردو میں پڑھانا کافی ہے، تاریخ میں روضۃ الاحباب بھی اچھی ہے، گو عبارت معمولی ہے۔''

سالِ دوم	مخزن الفوائد اگر وہی قاعدہ کی کتاب ہے جو فائق کی تصنیف ہے تو وہ نہایت معمولی درجہ کی تصنیف ہے اور اس میں غایت درجہ کے ہندی شعرا کے اشعار بھرے ہیں۔ ہدایۃ النحو کی مدت تعلیم کم ہے روزانہ ایک صفحہ سے زیادہ نہیں پڑھانا چاہیے۔	چہارم	رشیدیہ بے فائدہ ہے، مناظرہ کے فن کے لیے صرف اس کی اصطلاحیں اور امثلہ کافی ہیں، ایک مستقل فن بنا کر اصل مسائل سے بعد ہو جاتا ہے، رشیدیہ کا متن کافی ہے، مراقی الفلاح کی کوئی ضرورت نہیں، شرحِ وقایہ سے پہلے کوئی آسان اور مختصر کتاب فقہ کی رکھنی چاہیے، ادب کی کوئی کتاب اس درجہ میں نہیں ہے۔
سوم	میں کافیہ اور شرح ملا دونوں کو ناپسند کرتا ہوں، بجائے اس کے زمخشری کی مفصل ہوتی تو اچھا تھا، لیکن چوں کہ مولویوں کے نزدیک یہ کتاب نہایت ضروری اور معیارِ کمال ہیں، اس لیے مصلحۃً ان کو قائم رکھا جاسکتا ہے، اس سال تاریخ الخلفا کے ۲۳۰ صفحے بہت ہیں، ۱۰۰ صفحے سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔	پنجم	شرح ہدایۃ الحکمت سے اگر میبذی مراد ہے، تو وہ درس میں رکھنے کے قابل نہیں، الہیات میبذی کے ۱۸۰ صفحے نہیں ہیں، بلکہ ساری کتاب بھی شاید اس قدر نہ ہو، اس درجہ میں بھی ادب کی کوئی کتاب نہیں ہے۔

ششم	جب درجہ چہارم و پنجم میں کوئی کتاب ادب کی نہیں ہے تو اس درجہ میں مقامات حریری کیوں کر چل سکتی ہے۔	ہفتم	اس درجہ میں فلسفۂ قدیم کی کوئی کتاب ہونی چاہیے، مثلاً شرح الحکمۃ العین کا کوئی حصہ مختصر المعانی کے بہ جائے مفتاح سکا کی زیادہ مناسب ہے، بہ شرطے کہ علما ناراض نہ ہوں۔ درجہ ششم یا پنجم میں امام غزالی کے رسائل اربعہ یعنی الجام العوام و منقذ من الضلال وغیرہ رکھنا مناسب ہوگا۔

۹؍اگست ۱۸۹۹ء کو مولانا نے نواب صاحب کو امیر افغانستان کے مجوزہ محکمۂ تراجم کی اطلاع دی اور ساتھ ہی ان کی حوصلہ افزائی کے لیے لکھا ”جب صحرائے افغانستان میں یہ اُپج پیدا ہوئی ہے تو بھوپال کا مرغزار تو بڑی قابلیت رکھتا ہے۔“

غرض ان تنظیمات کے بعد مدارس کی حالت درست ہوئی اور نتیجے توقع کے مطابق نکلے، چنانچہ مارچ ۱۹۰۱ء میں سرکار بھوپال کی پہلی تعلیمی رپورٹ بابت ۱۹۰۰ء اردو اور انگریزی میں شایع ہوئی، اس وقت مولانا حیدرآباد میں مولوی سید علی بلگرامی کے پاس مقیم تھے، روداد کو دیکھ کر مولانا نے نواب صاحب کو مبارک باد دی اور لکھا ”روداد مرسلہ میں نے دیکھی اور نہایت مسرت ہوئی، خدا کرے روز افزوں ترقی ہو، میں تو چاہتا ہوں کہ واپسی میں خود مدارس کو دیکھ کر ایک یادداشت لکھوں لیکن آپ فرمائیں تو روداد ہی پر اپنی رائے لکھ کر اخبارات کو بھیج دوں، انگریزی روداد مولوی سید علی صاحب نے لے لی۔“ (علی حسن خاں-۴)

سرسید کی وفات مارچ ۱۸۹۸ء | مولانا بھوپال سے فروری کے اخیر میں علی گڑھ واپس آئے، یہ وقت علی گڑھ کی پالیٹکس کا بڑا نازک تھا، ان دنوں سرسید ایک طرف اپنے بیٹے کی بدمستی اور بدمزاجی سے نہایت قلبی کوفت اور اذیت میں تھے اور دوسری طرف سید محمود کی جانشینی اور ٹرسٹیز بل کی منظوری کے سبب سے سرسید کے اچھے اچھے دوست بلکہ دست و بازو ان سے الگ ہو رہے تھے، نواب وقار الملک اور دوسرے اکابر ارکان کی طرف سے بالا علان مخالفت کی تحریریں اخباروں میں جا چکی تھیں، یہاں تک کہ نیک صفات مولانا حالی بھی موافقت نہ کر سکے کہ دفعۃً چند روز کی علالت کے بعد ۲۷؍مارچ ۱۸۹۸ء

کو سرسید نے وفات پائی اور ساری مخالفانہ کارروائیاں روک دی گئیں، بایں ہمہ اس وقت سرسید کے سانحۂ وفات کا جو اثر مولانا پر ہوا اس کا اندازہ اس عربی خط سے ہوسکتا ہے، جو انہوں نے سانحہ کے دوسرے دن نواب علی حسن خاں کو بھوپال لکھا:

نمی دانم حدیثِ نامہ چوں است	ہمی دانم کہ عنوانش بخون است
تضعضعت ارکان الملة أعني	قومی عمارت کے ستون ہل گئے، یعنی سید احمد
انتقل السید احمد خاں بهادر	خاں بہادر اپنے پروردگار کے جوارِ رحمت میں
الی جوار رحمة ربه وذلك يوم	گئے اور یہ سانحہ یکشنبہ ۲۷/ مارچ کو پیش آیا،
الاحد ۲۷/ مارچ وتفرق شملنا،	اور ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا، میں کچھ دنوں
انّي لا اقدرعلى ان اشتغل بشئي	تک کوئی کام نہیں کر سکتا۔
الا بعد برهة الزمان (شبلی	
نعمانی علی گڑھ) ۲۹/ مارچ ۱۸۹۸ء	

اس موقع پر یہ بات تعجب سے دیکھی جائے گی کہ جس کے مدح انہوں نے پہلے کئی دفعہ لکھی، اس کے مرثیہ میں ایک شعر بھی انہوں نے نہیں کہا، مگر واقعات کی روداد آپ کے سامنے ہے، اس کو پیش نظر رکھیے تو معلوم ہوگا کہ مدح لکھنے والے کا دل اب مرثیہ لکھنے کے زمانہ میں بہت کچھ بدل چکا تھا اور جھوٹی شاعری اس کی افتادِ طبع نہ تھی، البتہ سرسید کی وفات کے بعد ان کی انشا پردازی پر ایک مضمون اپریل ۱۸۹۸ء کے میگزین میں ارکانِ کالج کے اصرار سے لکھا جیسا کہ مضمون کے آخر میں ہے۔

رخصت اور ترک تعلق مئی ۱۸۹۸ء اب کالج سراسر مسٹر بک پرنسپل اور سید محمود کے ہاتھوں میں آ گیا اور سید محمود کی حالت روز بروز بگڑتی ہی گئی، ۱۶/ اپریل ۱۸۹۸ء کو لکھتے ہیں ''کالج کا حال کشمکش میں ہے، سردست بک صاحب نے قبضہ کرلیا ہے، سید محمود کی حالت بہت خراب ہے۔'' (حمید-۲)

مولانا نے فروری ہی میں ارادہ کرلیا تھا کہ وہ پہلی مئی سے چھ مہینہ کی رخصت لیں گے، اس واقعہ کے بعد تو اور ضروری ہوگیا، چنانچہ مئی ۱۸۹۸ء سے پہلے چھ مہینہ کی رخصت لی، پھر استعفا بھیج دیا، اس طرح سولہ برس کی پر انقلاب سبق آموز اور ہنگامہ خیز زندگی کے بعد علی گڑھ کو خیر آباد کہا۔

اعظم گڑھ کو رجعت جون ۱۸۹۸ء کالج سے رخصت ہو کر مولانا نے جون ۱۸۹۸ء میں

اعظم گڑھ کا رُخ کیا، یہاں انہوں نے ۱۸۹۶ء سے پہلے (اسحاق-۳) شہر سے باہر اپنے خاندانی باغ میں ایک چھوٹا سا کچا بنگلہ بنوالیا تھا اور جس کو شبلی منزل کا خطاب دیا تھا اور جواب شبلی کا مدفن اور دارالمصنفین کا مسکن ہے، یہیں آکر قیام فرمایا۔

مولانا نے یہاں بیٹھ کر سب سے پہلے تو الفاروق کے ناتمام حصہ کی تکمیل کرنی چاہی اور اسی کے ساتھ ۱۸۸۳ء میں جس نیشنل اسکول کی بنیاد اعظم گڑھ میں ڈالی تھی، جس نے ان کی برادری میں انگریزی تعلیم کی اشاعت میں بڑی مدد دی تھی، اس کی دیکھ بھال شروع کی، عزیزوں سے اس کے لیے چندے منگوائے، اس کی تعمیر کے اضافہ کا خیال کیا، ماسٹرں اور مدرسوں کی تبدیلی کی ضرورت پیش آئی، آمد وخرچ کو برابر کرنے کی کوشش کی، ان باتوں میں کبھی کبھی ان کا دن دن بھر لگ جاتا تھا، ۹۸ء و ۹۹ء اور ۱۹۰۰ء کے مکاتیب (حمید، اسحاق) میں یہ تذکرے ہیں۔

کتب خانہ کی یک جائی مولانا نے اپنا ذاتی کتب خانہ جو ان کی خریدی اور ہدیۃً ملی ہوئی کتابوں پر مشتمل تھا اور جس میں اچھا خاصہ حصہ یورپ کے مطبوعات کا تھا، علی گڑھ سے منگوایا اور جو کتابیں یہاں تھیں، ان سے ملا کر کئی ہزار کتابوں کا ذاتی کتب خانہ اب یک جا کر لیا، میں نے ۱۹۰۷ء میں جب پہلی بار مولانا کے پاؤں کے حادثہ میں اعظم گڑھ آیا تھا تو اس کتب خانہ کو دیکھا تھا۔

یہ کتب خانہ کیسا تھا، اس کا حال خود مولانا ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:

> ''کتابیں میرے پاس تعداد میں بہت نہیں ہیں لیکن اکثر نایاب مطبوعات یورپ اور بعض نایاب قلمی کتابیں ہیں۔'' (۴۷)

اس کی قیمت کا تخمینہ بھی اس خط میں تین ہزار بتاتے ہیں۔

علالت اعظم گڑھ میں سال بھر رہنا مشکل تھا، اس لیے وہ ستمبر ۱۸۹۸ء میں الٰہ آباد گئے (مہدی افادی) پھر بیمار ہو کر لکھنؤ گئے اور گولہ گنج میں ندوہ کے مکان میں ٹھہرے اور وہاں کے مشہور طبیب حکیم عبدالعزیز صاحب (بانیٔ مدرسہ تکمیل الطب جھوائی، ٹولہ لکھنؤ) کا علاج کرایا، ۱۹ر ستمبر ۱۸۹۸ء کو وہیں تھے، (مہدی افادی) کہ دسمبر ۱۸۹۸ء میں ہم ان کو پھر علی گڑھ میں پاتے ہیں اور عربی کی بعض نئی مطبوعہ کتابوں کے حصول پر خوش ہو رہے ہیں۔ (حمید-۹)

اس تمام چکر میں الفاروق کا کام ساتھ ساتھ تھا اور مزاج کا یہ حال تھا کہ کبھی اچھا اور کبھی برا

اس لیے کسی صحت گاہ کا خیال تھا۔

سفر کشمیر جولائی ۱۸۹۸ء صحت کی بحالی کے لیے کشمیر کے سفر کا خیال جیسا اوپر گذر چکا ہے، مولانا کو کئی سال سے تھا، امسال جب وہ کالج کی خدمات سے سبک دوش ہو رہے تھے، اس خیال کو عمل میں لانے کا ارادہ پورا ہو رہا تھا، چنانچہ فروری ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ ہی سے کشمیر کا قصد تھا، (حمید-۵) اب جب وہ جون ۱۸۹۸ء میں کالج کی خدمت سے سبک دوش ہوئے تو اسی مہینہ کے آخر میں کشمیر کے سفر کو تنہا روانہ ہو گئے، اس وقت الفاروق جیسی زندۂ جاوید تصنیف زیر قلم تھی، جی چاہا ہوگا کہ وہ اسی بہارستان میں ختم ہو۔

کشمیر میں قاضی خواجہ سعد الدین صاحب مرحوم جن کے خاندان میں کشمیر کا عہدۂ قضا موروثی تھا، وہ علی گڑھ میں مولوی لطف اللہ صاحب مرحوم سے پڑھتے تھے، یہیں کے قیام کے زمانہ میں ان سے مولانا کے مراسم قائم ہو گئے تھے، مولانا نے کشمیر کا قصد فرمایا تو انہوں نے میزبانی کا فرض ادا کرنا چاہا، مگر مولانا ایک ایسے محلہ میں الگ مکان لے کر رہے جو نہایت نمناک تھا، خواجہ سعد الدین صاحب نے منع بھی کیا، مگر مولانا نے اسی مقام کو پسند کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک ہی ہفتہ رہنے پائے تھے کہ نہایت سخت بیمار پڑے، الفاروق جلد دوم کا خاتمہ وہیں ۵/ جولائی ۱۸۹۸ء کو قلم سے لکھا، مولانا فرماتے تھے کہ جس وقت ہاتھ نے قلم رکھا ہے، میں بستر پر بیہوش پڑ گیا۔"

کشمیر میں جتنے دن رہے، بیمار ہی رہے، تنہا گئے تھے، یہاں تک کہ ملازم بھی ساتھ نہ تھا، مگر کشمیر کے احباب نے اور خصوصیت کے ساتھ قاضی خواجہ سعد الدین صاحب اور مرزا اسعد صاحب جو کشمیر کے ایک علم دوست رئیس تھے، بڑی خدمت کی اور ایک طبیب کا علاج ہوا، ایک دفعہ بخار کم ہوا تو سمجھے کہ اچھے ہو گئے، مگر دوبارہ پھر بیمار ہوئے اور جب تک وہاں رہے، بیمار ہی رہے، آخر جب ذرا طبیعت سنبھلی تو وطن کا رُخ کیا، ۳۱/ جولائی کو وہ گھر پہنچ چکے تھے[1]، گو اب بھی علیل تھے، مگر آنے کے ساتھ ہی نیشنل اسکول کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا، ۳۱/ جولائی ۱۸۹۸ء کو مولوی حمید الدین صاحب سے تعمیر کا چندہ مانگا، (حمید-۷) اور دوسروں سے تقاضے شروع کیے، مگر طبیعت کا یہ انداز تھا کہ ابھی اچھے ہیں، اور ابھی بیمار، منجھلے بھائی مولوی اسحاق صاحب مرحوم نے الہ آباد بلا بھیجا تو ۲۲/ اگست ۱۸۹۸ء کو یہ

---

[1] مکاتیب میں ۲۲/ مارچ ۱۸۹۸ء لکھ گیا ہے، مارچ تو ممکن ہی نہیں کہ وہ اس مہینہ علی گڑھ میں تھے اور اچھے تھے اور یہ تاریخ سفر کشمیر سے پہلے کی ہے، ۲۷/ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید نے وفات پائی ہے تو وہ علی گڑھ ہی میں تھے، اس لیے یہ سہو قلم ہے۔

معذرت لکھی ”میں جانتا ہوں کہ تمہارا بار بار کا تقاضا جوش محبت کی وجہ سے ہے، مگر کیا کروں کیفیت یہ ہے کہ طبیعت دو چار گھنٹے بھی یکساں نہیں رہتی، بلکہ دو چار مرتبہ بہت خراب حالت ہوگئی، خدانخواستہ ایسی کیفیت کہیں سفر میں پیش آ گئی تو جان کا خطرہ ہے، اس لیے سفر کرنا ایسی حالت میں سخت مخدوش ہے، اگر تمہیں تشخیص طبیعت کے لیے اس قدر اصرار ہے تو حکیم صاحب کو یہاں بھیج دو اور بہر حال بنارس کی ریل کھلنے کا تو انتظار ہی کرنا چاہیے۔“

بہر حال طبیعت سنبھلی تو ۴؍ ستمبر ۱۸۹۸ء کو ہم ان کو الہ آباد میں پاتے ہیں اور ایسے خوش کہ بیماری کا کوئی تذکرہ ہی نہیں، الفاروق کے دل خوش کن تذکرے ہیں۔ (مہدی افادی-۷)

دفعۃً ۱۹؍ ستمبر ۱۸۹۸ء کو ہم ان کو لکھنؤ دفتر ندوہ میں دیکھتے ہیں اور بیمار پاتے ہیں، جھوائی ٹولہ کے مشہور طبیب حکیم عبدالعزیز صاحب کا علاج ہو رہا ہے (مہدی افادی-۸) مگر پھر وہ اعظم گڑھ واپس آ گئے، کچھ نہ کچھ علاج ہوتا رہا، مگر طبیعت راہ پر نہ آتی تھی، لطف یہ ہے کہ علی گڑھ کے اُن کے بعض دوستوں کو ان کی اس شدید بیماری کا یقین نہیں آتا تھا، یعنی حاجی اسمٰعیل خاں مرحوم اس کو مذاق ہی سمجھتے رہے، البتہ نواب محسن الملک نے کرم کیا اور خود اعظم گڑھ آئے اور کئی روز رہے، اسحاق مرحوم کو لکھتے ہیں: پانچ چھ دن سے طبیعت اچھی ہے، نواب محسن الملک میری عیادت کو یہاں آئے اور میرے بنگلہ میں تین دن رہے، ان کی آؤ بھگت میں مجھ کو بہت چلنا پھرنا پڑا لیکن میں اس کو برداشت کر سکا، گرمی کی وجہ سے بدن میں طاقت معلوم ہوتی ہے، تم آنے میں جلدی نہ کرو، میری اس قدر ضرور خواہش ہے کہ کوئی ماہر طبیب یا ڈاکٹر اعضائے رئیسہ کی تشخیص کر لیتا۔“ (۸)

معلوم ہوتا ہے کہ نومبر و دسمبر ۱۸۹۸ء میں ان کی حالت سنبھل گئی، چنانچہ وہ سفر کے قابل ہو گئے، بعض حالات کی بنا پر جس کی تفصیل نہیں، ۳؍ دسمبر ۱۸۹۸ء کو وہ علی گڑھ جاتے ہیں، مولوی حمید الدین صاحب کو اس کی اطلاع دیتے ہیں، خط میں کسی بیماری کا ذکر نہیں، بلکہ طبیعت میں یہ انبساط ہے کہ اس زمانہ میں جو علمی کتابیں ہاتھ آئیں ان کی تفصیل حوالہ قلم ہے۔ (۹)

الفاروق کی تکمیل و اشاعت جنوری ۱۸۹۹ء | اسی حالت میں الفاروق کی آخری تکمیل و نظر ثانی اور طباعت کا کام جاری رہا، دسمبر ۱۸۹۸ء میں اعظم گڑھ میں اس کا مقدمہ تحریر ہوا، ۸؍ جنوری ۱۸۹۹ء کو اس کے چھپ جانے کی بشارت دی جاتی ہے، (مہدی افادی-۹) ۸؍ فروری ۱۸۹۹ء کو اس کے

مطبوعہ اوراق[1] ایک ہمہ تن شوق عزیز دوست (مولانا شروانی) کے پاس اس تاکید سے بھیجے جاتے ہیں کہ ابھی کوئی اور دیکھنے نہ پائے، (شروانی-۱) مولانا کو اس کا بڑا اہتمام رہتا تھا کہ تکمیل واشاعت سے پہلے ان کی کتاب کا مسودہ کوئی دیکھنے نہ پائے، فرماتے تھے کہ "سرسید مرحوم الفاروق کا مسودہ اور اس کے چھپے ہوئے اجزا دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کرتے تھے" اور میں مسکرا کر یہ جواب دیتا کہ "مشاعرہ سے پہلے غزل نہیں سنائی جاتی" مگر افسوس کہ سرسید اس غزل کو نہ پڑھ سکے اور نہ سن سکے، کیوں کہ وہ اس سے پہلے ہی ۲۷ر مارچ ۱۸۹۸ء کو انتقال کر چکے تھے۔

مولانا شروانی فرماتے ہیں "مجھ کو ایک ملاقات میں الفاروق کے ایک حصہ کا مطبوعہ پروف اپنے ہاتھ میں لے کر اس شرط سے دکھایا کہ میں صرف اس کا حسن طبع دیکھوں، پڑھوں نہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

سلسلۂ علالت کا اشتداد

الفاروق جیسی اہم تصنیف سے فراغت کی مسرت ان کو ابھی ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ علالت نے اشتداد اختیار کیا، ۱۵ر فروری ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو اپنا یہ حال لکھ کر بھیجتے ہیں "اصل یہ ہے کہ میری تمام بیماریوں کا سبب معدہ کا فساد ہے اور اب تک نہیں گیا، غذا ٹھیک ہضم نہیں ہوتی، کئی کئی وقت بھوک نہیں لگتی، کبھی نفخ رہتا ہے، کبھی قبض اور اکثر تبخیر، ان اسباب سے نہ قوت آتی ہے نہ ظاہر حال میں تندرستی آتی ہے، شب و روز پلنگ پر پڑا رہتا ہوں، ضروری ڈاک کے لیے ایک ملازم مشاہرہ ۱۰؍ رکھ لیا ہے۔ (شروانی-۲)

اس عالم کے علمی مشاغل

علالت کے اس تکلیف دہ سلسلہ میں بھی ان کے علمی مشاغل بدستور جاری رہتے ہیں، ۱۸ر اپریل ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی سے مسٹر آرنلڈ کے لیے منوچہری کا دیوان مطبوعۂ یورپ منگواتے ہیں اور المامون کے ریویو لکھنے والے کو الفاروق پر ریویو لکھنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ (شروانی-۳) ۱۰ مئی ۱۸۹۹ء کو ریویو تیار ہو جاتا ہے اور معارف علی گڑھ مرتبہ مولوی وحید الدین صاحب سلیم میں اس کے بھیجنے کا مشورہ ہوتا ہے اور اسی خط میں اپنی اس زندگی سے جس میں بیماری کے تسلسل کی وجہ سے مخلص دوستوں سے ملنا نصیب نہ ہوا، تنگ آ جانا ظاہر کرتے ہیں۔ (شروانی-۵)

علالت کا سخت دورہ مئی ۱۸۹۹ء

اس کے ایک ہی ہفتہ کے بعد بیماری کا ایک نہایت ہی سخت دورہ

[1] مکاتیب میں میں نے اپنی نافہمی سے اس "مطبوعہ مسودہ" کو انجمن ترقی اردو کا کاغذ سمجھا تھا، جو اس وقت تک قائم بھی نہیں ہوئی تھی، یہ دراصل الفاروق کے اوراق ہیں-۱۲۔

پڑتا ہے، یہاں تک کہ اپنی علالت کی شدت سے مجبور ہو کر ۱۰ رمئی ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں "اب ادائے حق دوستی کا وقت ہے، حکیم عبدالمجید خاں[1] صاحب کو میرے معالجہ کے لیے خط لکھیے، ان کا جواب آجائے، تو سفر کا قصد کروں، آپ بھی دلی تک چلیں، ظنِ غالب ہے کہ نواب محسن الملک بھی چلیں گے۔" (۶)

ڈاکٹر مصطفیٰ خاں کا علاج اور عارضی صحت ۱۸۹۹ء بیماری کا حملہ اس دفعہ اتنا شدید تھا کہ مایوس ہو کر وصیت نامہ تک لکھ دیا[2] تھا، حسن اتفاق دیکھیے کہ اسی اثنا میں کہ دلی کے سفر کا سامان ہو رہا تھا، ایک مسلمان ماہر ڈاکٹر مصطفیٰ خاں صاحب اسسٹنٹ سول سرجن گونڈہ سے بدل کر اعظم گڑھ آئے، مولانا کے بھائی مولوی اسحاق صاحب سے ان کے تعلقات تھے، اس سبب سے یہ سن کر کہ مولانا بیمار ہیں، وہ دیکھنے آئے اور بہت توجہ سے علاج شروع کیا اور یہ تشخیص کیا کہ قلب میں نہایت کمزوری آگئی ہے، اس لیے کوئی دوا فائدہ نہیں کرتی، انہوں نے محنت اور جدوجہد سے علاج کا سلسلہ جاری رکھا اور بحمد اللہ کہ ان کے چند ہی روز کے علاج سے فائدہ محسوس ہونے لگا اور دلی کا سفر سردست ملتوی ہوگیا، (شروانی-۷) ابھی طبیعت درست ہو چلی تھی کہ ندوہ اور نادر کتابوں کی یاد آئی، ۱۱ رجون کو انہیں لکھتے ہیں "خط پہنچا، مشکور کیا، ڈاکٹری علاج سے بہت فائدہ ہے، ادب الکاتب ناقص خریدنے کی کیا ضرورت ہے، مصر میں مکمل چھپ گئی ہے، مثل السائر کے حاشیہ پر۔

دارالعلوم کی کل میں نہایت ذلیل پرزے لگائے گئے ہیں کیا قوم کو اس قدر امید دلا کر دیوبند وغیرہ سے بھی گھٹیا مال دینا چاہیے۔

مولانا کی اگلی جیسی ہشاش بشاش گفتگو سے دوستوں کو خیال ہوا کہ اب وہ تندرست ہوگئے، مولانا شروانی نے یہ پوچھا تو جواب دیا "ابھی تو میں کیا صحیح ہوں لیکن کچھ امید بندھی ہے شاید صحیح ہو جاؤں، آپ اس بات کے لیے تیار رہیں کہ اگر خدا نے صحت کامل دی تو میں اپنے خالص دوستوں کو مدعو کروں گا، جن میں مولانا حالی، خواجہ عزیز الدین میر ولایت حسین وغیرہ ہوں گے، آپ کو بھی تکلیف کرنی پڑے گی ندوہ کی بیماری لاعلاج ہے۔"

مولانا شروانی نے آنے کا وعدہ کیا تو خوشی سے اچھل پڑے، ۲۵ رجون کو لکھا "کیا آپ واقعی یہاں جلوہ فرما ہوں گے اور کیا درحقیقت ع "میرے ویرانہ میں ہو جائے گی دم بھر چاندنی" نامہ والا کو

---

[1] دہلی کے مشہور شریف خانی طبیب ۱۹۰۱ء میں وفات پائی۔ [2] نواب علی حسن خاں-۳-

بار بار پڑھتا ہوں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں ع: ”سچ سچ بتا یہ حرف ان ہی کے قلم کے ہیں“۔

بہر حال ڈاکٹر صاحب نے مولانا کی صحت کا اعلان کیا اور ان ہی کے اصرار سے ایک جلسہ مرتب ہوا، لوگ مدعو ہوئے، شکرانہ میں ۱۰۰ روپے مولانا نے نذر کیے۔

اورنٹیل کانفرنس اٹلی کا ارادہ جولائی ۱۸۹۹ء صحت کے بعد تبدیلِ آب و ہوا کی ضرورت تھی، حسن اتفاق یہ کہ امسال یورپ کی اورنٹیل کانفرنس (جو مشرقی اور اسلامی علوم وفنون کی تحقیق کرتی ہے) کا اجلاس اٹلی میں ہو رہا تھا اور اس حسن اتفاق پر حسن اتفاق یہ کہ سفر روم والے رفیق پروفیسر آرنلڈ اسی زمانہ میں ۲۶ر جولائی کو پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے اس کی شرکت کے لیے روانہ ہو رہے تھے، انہوں نے مولانا سے بھی سفر کی تحریک کی، وہ آمادہ ہو گئے، اپنے دو عزیز دوستوں نواب سید علی حسن خاں اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھا۔

پہلے ۵ر جولائی ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھا، ہاں ایک اور بات ہے، اب کی کانفرنس اٹلی میں ہے، آرنلڈ ۲۶ر جولائی کو روانہ ہوں گے، مجھ کو بلاتے ہیں، ضعف کی وجہ سے رُکتا ہوں، اگر آپ کی ہم سفری کی امید ہو تو میں قوی ہو جاؤں گا، کیا آپ قصد کر سکتے ہیں؟ اسی سیر میں ممالک اسلامیہ کو بھی لپیٹ آئیں گے، پانچ سات سو کا خرچ ہے، آپ چاہیں تو ذرا ٹھہر کر بھی چل سکتے ہیں۔ (۱۱)

۱۳ر جولائی ۱۸۹۹ء کو نواب سید علی حسن خاں کو بھوپال لکھا (۱) ایک نہایت ضروری امر گزارش ہے، آپ کو معلوم ہوگا کہ یورپ میں علوم مشرقیہ کے علما کا ایک مجمع ہے، جس کو اورنٹیل کانفرنس کہتے ہیں، یہ نہایت معزز کانفرنس ہے اور تمام یورپ و مصر و شام کے علما جمع ہوتے ہیں، اس دفعہ اس کا اجلاس اٹلی میں ہے، ریاست حیدر آباد نے سید علی بلگرامی کو اس کی شرکت کے لیے بھیجا ہے اور پنجاب گورنمنٹ نے ہمارے مسٹر آرنلڈ کو، میں بھی انشاء اللہ جاؤں گا، آپ قصد کریں، تو متعدد فائدے ہیں، ریاست کی نام وری آپ کو یونیورسٹی کا فیلو بننا آسان ہوگا، آپ کے عہدۂ ڈائرکٹری کی گورنمنٹ کے نزدیک نہایت وقعت بڑھ جائے گی، واپسی کے وقت مصر و قاہرہ کی سیر، لطفِ صحبت الگ، خرچ بہت سے بہت ایک ہزار مع خرچ واپسی، جواب سے مطلع فرمایئے۔“

بعد کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ بجائے ذاتی خرچ کے قومی خرچ سے جائیں، غالباً نواب صاحب کا اشارہ اس جانب ہوگا کہ وہ خرچ کے متحمل ہوں گے،

مولانا نے جواب دیا آپ کی یہ تجویز کہ میں قوم کے روپیہ سے جاؤں، آپ کے علمی مذاق کی دلیل ہے، لیکن اس کے دو پہلو ہیں، ۱- میری مالی اعانت تو اس کی ضرورت نہیں اور اگر کسی قدر ہے تو اس کو حمیت نفس نے رفع کر دیا ہے، ۲- قوم کی علمی قدر دانی کا ثبوت تو اس قدر دانی کا ثبوت اور لوگوں پر بھی ہو سکتا ہے۔''

مولانا! اصل یہ ہے کہ ابھی ملک کی یہ حالت نہیں کہ اس قسم کے کام تحسین کی نگاہ سے دیکھے جائیں، آپ کو تو یہ پہلو پیش نظر ہے کہ قوم نے مل کر ایک اچھا کام کیا اور عام زبانوں پر یہ ہوگا کہ ''شبلی دریوزہ گری کر کے یورپ گیا۔'' معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحبوں نے مجبوری ظاہر کی اور وہ خود بھی دوبارہ بیمار پڑ گئے اور وقت نکل گیا، مگر علم کے شوق کا اندازہ کیجیے کہ اس دیرینہ علالت کے بعد بھی دماغ اُدھر ہی مصروف ہے، اس کا ایک اچھا اندازہ اس زمانہ کے خطوط سے ہوگا۔

امیر کابل کی پیشکش، جولائی واگست ۱۸۹۹ء ان ہی دنوں امیر عبدالرحمٰن خاں والیِ کابل نے اپنے ملک کے لیے ہندوستان میں ایک محکمۂ تراجم قائم کرنا چاہا، جو ہندوستان ہی میں رہ کر ہندوستان کے فضلا کے قلم سے فارسی میں علوم وفنون کا سرمایہ بہم پہنچاتا، اس کے لیے اپنی حکومت کے اشارہ سے کابل کے سفیر نے مولانا حالی، مولانا نذیر احمد اور مولانا شبلی سے خط وکتابت کی، ان بزرگوں نے معلوم نہیں کیا جواب دیا، غالباً معذرت کی ہوگی، مولانا شبلی اس وقت گویا علیل ہی تھے، اس لیے چاہا کہ یہ کام مولوی حمید الدین صاحب کے سپرد ہو، اس سلسلہ میں ۳؍ جولائی ۱۸۹۹ء کو انہیں یہ خط لکھا ''آج کل ایک بڑی ریاست بلکہ سلطنت سے ابن خلدون کے ترجمہ کا استفسار آیا تھا، دس ہزار روپیہ نقد دیتے ہیں، میں نے اپنی صحت کے لحاظ سے انکار کر دیا (حمید-۱۰) ۹؍ اگست ۱۸۹۹ء کو نواب علی حسن خاں کو ایک سلسلہ میں لکھتے ہیں ''اسی زمانہ میں سفیر کابل مقیم شملہ نے دس ہزار روپیہ نقد کے معاوضہ پر ابن خلدون کے ترجمہ (بہ حکم امیر صاحب) کے لیے مجھ کو لکھا میں نے انکار کیا، اگرچہ صحیح ہو کر بھی میں نے انکار لکھا۔'' (۳)

پھر شکایات کا عود اور علمی مشاغل ستمبر ۱۸۹۹ء مولانا کا ڈاکٹری علاج اب بھی جاری رہا، پہلے کے مقابلہ میں اب بہت اچھے تھے اور علمی وقومی مشغولیتیں بھی ساتھ ساتھ تھیں، ایک طرف نیشنل اسکول کی مالی امداد، اس کے آمد وخرچ کے برابر کرنے کی کوشش اور ماسٹروں کے مشاہرہ کے لیے مہاجن سے قرض لینے کے سامان میں دن گزر رہے ہیں (اسحاق-۹، ۱۰، ۱۱) تو دوسری طرف علمی انہماک بھی بڑھتا جا رہا ہے، الفاروق کے بعد اب کسی تصنیف کا خاکہ بن رہا ہے، ۱۰؍ جولائی کو مولانا شروانی سے معاملہ طے ہو رہا ہے کہ

آپ کیا لکھیں، میں کیا لکھوں یا دونوں مل کر لکھیں، چند عنوان سامنے آتے ہیں، علوم القرآن امام غزالی کی لائف فارسی شاعری کی تاریخ (۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۶) ۱۴ راگست کو ندوہ کا جلسہ انتظامیہ ہوتا ہے اور مولانا روانگی کا ارادہ کرتے ہیں کہ پھر شکایتیں عود کر آئیں، ڈاکٹر صاحب موصوف اسی اثنا میں بدل کر گونڈہ چلے گئے تھے، آخر مولانا ستمبر ۱۸۹۹ء میں ان سے علاج کرانے کے لیے گونڈہ روانہ ہو گئے، وہاں سے مولانا شروانی کو اپنی دوبارہ علالت کی اطلاع دیتے ہیں اور اب سیر الصحابہ کی تجویز پیش ہو رہی ہے، ساتھ ہی اٹلی کی اورنٹیل کانفرنس کا خیال اور ندوہ (شروانی) ایک آدھ روز کے لیے لکھنؤ آتے ہیں، وہاں کے کسی کتب فروش کے پاس بعض نادر نسخے تصاویر، قطعات دیکھتے ہیں، تو ۱۸ ستمبر کو شروانی کو کس خوشی سے لکھتے ہیں، اکبر جہانگیر اور شاہ جہاں کی علمی نفاست پسندیوں کے وہ نمونے آج کل یہاں آگئے ہیں، کہ عقل کی وسعت اس کے اندازہ سے کمی کرتی ہے، ہیئت کے نوادر اور اس میں کتاب الآلات کا بھی ایک نسخہ ہے لیکن میں جس چیز کی ترغیب دیتا ہوں وہ خوش نویسوں کے قطعے اور تصاویر ہیں، خدا بخش خاں وغیرہ کے خزانے بھی ان جواہرات سے خالی ہیں، ابھی قیمتیں متعین نہیں ہوئیں، ایک آدھ پر میں بھی حوصلہ آزمائی کروں گا۔ (۱۷)

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ اس تحریک کی یہ برکت ہوئی کہ بالآخر یہ خزانے حبیب گنج کے کتب خانہ میں داخل ہو گئے، ان میں سے ایک گلکاری کی بابت حال میں امریکہ کے ایک مؤلف نے لکھا ہے کہ ”دنیا میں منصور زمانی کے ہاتھ کی گلکاری کا نمونہ صرف ایک ہے اور وہ حبیب گنج میں ہے“ یہ تھی مولانا کی نقادی، دکھانا یہ ہے کہ مسلسل علالت کے ایام میں بھی دماغ اپنے کاروبار سے خالی نہیں، ۲۸ ستمبر کو گونڈہ کے شفا خانہ سے لکھتے ہیں ”میں صحیح چلا ہوں اور ساتھ ہی دار العلوم کا خیال آیا، مولوی خلیل الرحمٰن[1] صاحب عیادت کو آئے تھے اور اُبھارا، بہرحال میں نے عالمِ خیال میں وہاں جانے کی تیاریاں شروع کر دیں“ (۱۹)

مولانا اکتوبر تک گونڈہ کے شفا خانہ میں مقیم رہے، گونڈہ میں ایک لطیفہ پیش آیا، قاضی خادم حسین[2] صاحب جو مولانا سید امیر علی صاحب شہید کی بہن کے نواسے ہیں اور جن کے نانا وہیں گونڈہ میں وکیل تھے وہ اس زمانہ میں وہاں طالب العلم تھے اور نوجوان تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ”میں مولانا کی تصنیفات پڑھ کر ان کی زیارت کا بے حد مشتاق تھا، مگر ملاقات کی کوئی صورت نہ تھی، مولانا کے گونڈہ آنے کا حال سنا تو

---

[1] مولوی خلیل الرحمٰن صاحب فرزند دوم مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری و رکن ندوہ [2] جناب منشی احتشام علی صاحب، رئیس کاکوری کے داماد۔

عقیدت مندانہ حاضر ہوا اور شوقِ ملاقات عرض کیا، فرمانے لگے، اب مجھے معلوم ہوا کہ میری یہ علالت ایک مخدوم زادہ کی کرامت تھی اور اس طرح مجھے کھینچ کر گونڈہ بلایا گیا، یہ مقصد پورا ہو گیا اور اب میں جلد اچھا ہو جاؤں گا" واقعی وہ چند روز کے بعد اچھے ہو گئے اور گونڈہ سے چلے آئے، بہ ظاہر ملیریا نے مولانا کے جسم سے مفارقت کی، مگر حقیقت یہ کہ اخیر اخیر تک ان پر اس کے حملے ہوتے رہے، یہاں تک کہ وفات سے ایک سال پہلے مارچ ۱۹۱۳ء میں اپنے ایک عزیز شاگرد کو جو کشمیر میں تھے، لکھتے ہیں، "جموں سے ایک انجمن کا سخت تقاضا آیا ہے، اخیر مارچ میں کوئی جلسہ ہے، کشمیر کا ارادہ تو کرتا ہوں اور کشش کے اسباب بھی ہیں، خصوصاً یہ کہ حکومت کے بڑے بڑے ارکان میرے دوست اور شاگرد ہیں لیکن مارگزیدہ از ریسمان می ترسد ایک دفعہ اس قدر صدمہ اٹھا چکا ہوں کہ اب تک نہیں سنبھلا" (عبدالباری-۳)

قصیدہ کشمیریہ مولانا کا یہ سفر کشمیر، علالت کا یہ سلسلہ، مرض کا اشتداد، پھر علاج کا ایک اتفاقی سامان اور صحتِ مزاج مولانا کی زندگی کی بڑے اہم واقعے ہیں، گویا وہ مر کر پھر جی اٹھے صحت کے بعد مولانا نے ان واقعات کو ایک قصیدہ میں نظم کیا اور اس کا نام "قصدۂ کشمیریہ" رکھا اس کے شروع میں کشمیر کے باغ و بہار کی آرائش ہے، اس کے بعد اپنی بیماری کا حال ہے:

بخت بنگر کہ ازاں بزم گہِ مستی و ناز ۔۔۔ بہرۂ ام ہر چہ بود درد و غم و رنج و عنا ست
بعد یک ہفتہ کہ آسودتن از رنجِ سفر ۔۔۔ تپ بہ من تاختن آورد و بلنیم برخاست
چہ تپے بود کہ فرتے نہ توانستم کرد ۔۔۔ کایں مگر آتشِ سوزندہ بود یا حمیٰ ست
درد آں ما یہ بیفشرد و سراپاے مرا ۔۔۔ کہ تواں گفت کہ یک بہرہ ز اندامم کاست

اس کے بعد احبابِ کشمیر کی خدمت اور تیمارداری کا بیان ہے:

گر چہ با من نہ رفیقے بد و نے خاد کے ۔۔۔ ایزدم لیک تباہی زدۂ و خوار نخواست
بہ عزیزانِ دیار آگہی آمد کہ فلاں ۔۔۔ آمد از ہندو زر نجوری تپ شکوہ سراست
ہر یک از مہرو واں آمد و از غم خواری ۔۔۔ پرس و جوے بہ سزا کرد و پے چارہ نجاست
رسمِ بیگانہ نوازی بود آئین عرب ۔۔۔ می تواں گفت کہ کشمیر عرب را ماناست
خاصہ آں پیشروِ جادۂ معنی یعنی ۔۔۔ سعد دیں آنکہ پسیں قافیۂ بیت[1] قضاست
خاصہ مخدوم من و یار من و یا در من ۔۔۔ میرزا سعد کہ در شہر امیر الامراست

[1] قاضی کے گھرانے کے تھے۔

آنچہ با من ز سرِ خستہ نوازی کردہ است — ہر بنِ موئے ہنوزم بہ سپاسش گویاست

اس زمانہ کے ایک خط میں جس وصیت کا ذکر ہے، اس کی تفصیل قصیدہ میں ہے:

چوں یقیں شد کہ مرا نوبتِ رفتن بہ رسید — بہ وصیت ورق و خامہ نمودم درخواست
شکرِ ایزد کہ دراں حالتِ آسیمہ سری — از زباں ہر چہ برآمد ہمہ آں بد کہ سزا است
ہر چہ از سیم درم بود ز املاکِ قدیم — واں کتب خانہ کہ انواعِ کتب را دارا ست
زاں ہمہ بیشترے وقف نمودم کو را — صرفِ آں کار تواں کرد کہ در شرع رواست
خاصہ بر مسجدِ پارینہ کہ در خانقہ[1] است — کہ ز بے مہری ما خستہ و بے برگ و نواست
خاصہ آں مدرسۂ[2] کز پئے ابنائے وطن — طرحش افگندم و امروز بہ آئین و بہاست

اس کے بعد ڈاکٹر مصطفےٰ صاحب کی اتفاقی آمد اور ان کے پرشفقت علاج کا تذکرہ ہے:

آخرِ کار ز لطف و کرمِ بارِ خدا — مردے از غیب بروں آمد و کارم شدہ راست
مصطفےٰ خاں کہ اسسٹنٹ سول سرجن ہست — از رہِ لطف بہ اعظم کدہ آمد نا خواست
داشت چوں سابقہ معرفتے با سحاق — کہ اخِ اصغرِ من ہست و بہر پایہ سزاست
از پئے دیدنِ من آمد و بر رسمِ فرنگ — دید اعضائے دروں را کہ مرض را امید است
رو بہ من کرد و بہ فرمود کہ از غایتِ ضعف — کار خودی نہ کند دل کہ رئیس الاعضاست
لیک بایں ہمہ از کار نہ رفتہ است ہنوز — می کنم چارہ و از ایزدم امید شفا ست
از سرِ مہر بہ تدبیر و علاجم پرداخت — ہم بداں شیوہ کہ طرز و روشِ اہلِ صفاست
تا دو مہ رسم چنیں بود کہ ہر روز مرا — امتحاں کردے و جستے خبر از ہر کم و کاست
بارے از فضلِ خداوندِ جہاں بعد سہ ماہ — بہ شدم گرچہ ہنوزم اثرِ ضعف بجا است

اس کے بعد اپنے دوستوں کو اپنی صحت کی خود مبارک باد دی ہے:

مژدۂ صحتِ من ہاں برسانند کنوں — ہر کسے را کہ بہ من دعویٰ اخلاص و وفا است
می تواں گفت بہ مہدی[3] و بہ حالی و عزیز — "بہ شد آں بندہ کہ از حلقہ بگوشانِ شماست"
شبلی امروز بود بلبلِ بستانِ سخن — کہ از و گلکدۂ ہند پر از صوت و نواست
بعد یک عمر کہ از بندِ غم آزاد شدہ است — ہم چناں باز بہ آہنگِ کہن نغمہ سراست

---

[1] مولانا کے وطن بندول کے پاس خانقاہ نام کا چھوٹا سا گاؤں ہے۔ [2] نیشنل اسکول اعظم گڑھ جس کا اب نام "شبلی جارج اسکول" ہے۔ [3] مہدی سے مراد نواب محسن الملک مولوی محمد علی خان اور عزیز سے مقصود خواجہ عزیز الدین لکھنوی ہیں۔

مولانا حالی کا قطعہ تہنیت | مولانا نے یہ قصیدہ چھپوا کر دوستوں کو تقسیم کیا، معلوم نہیں کہ مہدی و عزیز نے کیا جواب دیا، مگر مولانا حالی نے اس قصیدہ پر مختصر سا مبارک باد کا قطعہ لکھ کر بھیجا جس کو میں نے ان کے قلم سے لکھا ہوا بھی دیکھا تھا اور جو ان کے ضمیمہ کلیات فارسی میں بھی چھپ گیا ہے:

للہ الحمد پس از ناخوشی و رنجِ دراز — شبلی ما بہ مراد از سرِ بالیں برخاست
آنکہ نامش بہ کمالاتِ سمر درگیتی ست — آنکہ مشہور در آفاق بہ شمس العلما ست
(داستاں)
آنکہ گر سرکند افسانۂ فضل و ہنرش — خامۂ مشکل کہ بہ پایاں بردش بے کم و کاست
آنکہ خوانندش اگر فخر زمان خود و بس — کردہ باشند عدول واہل سخن از رہ راست
بود در علت او علت قومی مضمر — لا جرم صحت او بہر ہمہ قوم شفا ست
بسکہ او روح دمیدہ است بتاریخ سلف — ہر قدر فخر بہ ذاتش بہ کند قوم رواست
زندہ تا دیر ہما ناد کہ بر قد کسے — بعد از و خلعت تحقیق نمی آید راست

ندوہ کی یاد نومبر و دسمبر ۱۸۹۹ء | اس دیرینہ بیماری سے صحیح ہوئے تو ندوہ کی یاد نے ستایا، گونڈہ ہی سے ۲۸/ دسمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی صاحب کو لکھ چکے تھے کہ اگر آپ یا اور ارکان (ندوہ) مجھ سے کام لینا چاہتے ہیں تو بتائیں کہ میں کیا کام کروں، میری جو تجویزیں ہیں، وہاں چلنے نہ پائیں گی، البتہ یہ ہوگا کہ گروہ بندیاں اور نزاعیں قائم ہوں، پھر لڑنے جھگڑنے سے کیا فائدہ؟ سوچ سمجھ کو جواب لکھیے اور مولوی محمد علی صاحب ناظم ندوہ سے مشورہ کیجیے''۔(۱۹)

پھر ۱۳/ اکتوبر ۱۸۹۹ء کو لکھا ''اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ندوہ کی خدمت کر سکوں تو دس پندرہ روز کے لیے لکھنؤ میں آ کر قیام کیجیے، میں کارروائی اور طرز عمل کا نقشہ پیش کروں گا، اس پر رائے دیجیے اور ارکان بھی پورے غور و فکر کے ساتھ بحثیں کریں، پھر جو امر منقح قرار پائے، اس پر عمل کیا جائے اور اس کا خاکہ ڈالا جائے، اس وقت جس طرح کام ہو رہا ہے، اس میں شریک ہونا قومی گناہ سمجھتا ہوں اور لطف یہ کہ بڑے بڑے ارکان کے نزدیک وہی معراجِ خیال ہے، پھر میری کھپت وہاں کیوں کر ہو سکتی ہے، اتمام حجت کے لیے لکھنؤ جانے والا ہوں۔''(۲۰)

گزشتہ جلسہ انتظامیہ میں جو غالباً اگست ۱۸۹۹ء میں ہوا تھا، مولانا نے دارالعلوم کے نصاب میں انگریزی زبان کے داخل کرنے کی تحریک کی تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب عام مسلمانوں کا انگریزی پڑھنا

تو کفر نہیں رہا تھا، مگر علما کا انگریزی سیکھنا تو جرمِ عظیم سمجھا جاتا تھا، مولانا اس جرمِ عظیم کے مرتکب ہوئے، انہوں نے تحریک کی اور مولوی یونس خاں صاحب (رئیس وتاؤلی علی گڑھ) نے تائید کی مگر اس وقت علما کی عصبیت کا یہ عالم تھا کہ وہ منظور نہ ہوسکی، تب مولانا نے یہ فرمایا کہ ''اچھا تو یہ تحریک درج روداد کرلی جائے اب جو روداد چھپ کر آئی تو اس تحریک کا ذکر تک نہ تھا (شروانی -۲۱) ۱۰ردسمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا میں اور مولانا شروانی میں اس مسئلہ پر تحریری گفتگو تک نوبت پہنچی اور لکھا کہ ''مجھ کو اس تمام بے اعتنائی پر واقعی رنج وافسوس ہے۔'' (شروانی -۲۲) تفصیل آگے آئے گی۔

سفرِ ایران کا قصد دسمبر ۱۸۹۹ء صحت کے بعد تفریحِ خاطر کے لیے کسی بیرونی ملک کی سیر وسیاحت کا خیال پھر آیا، اٹلی کا موقع نکل چکا تھا، ایران کا خیال آیا، ان دنوں مولوی حمید الدین صاحب مدرسۃ الاسلام کراچی میں تھے، ۱۰ردسمبر ۱۸۹۹ء کو انہیں لکھا کہ ''بوشہر اور بصرہ جانے والے جہازات کو تھے دن جایا کرتے ہیں، سکنڈ کلاس کا کرایہ نوشہر یا بندر عباس تک کیا ہے، قرنطینہ کہاں کہاں ہوتا ہے'' (حمید-۱۱) جواب کیا آیا معلوم نہیں، مگر سفر نہ ہوسکا اور ہندوستان سے باہر نہ جاسکے بلکہ اپنے وطن ہی میں رہنے پر مجبور ہوئے۔

شبلی منزل میں ۱۹۰۰ء یہ سال انہوں نے زیادہ تر اپنے وطن اعظم گڑھ اور اپنے بنگلہ شبلی منزل میں بسر کیا، بعض خانگی ضرورتوں نے بھی ان کو اس قیام پر مجبور کیا، پانچ برس ہوئے کہ پہلی بیوی کا انتقال ہوچکا تھا، اب تک دوسرا نکاح نہیں کیا تھا اور نہ ارادہ تھا، مگر ان کے معالج ڈاکٹر مصطفےٰ خاں نے دوسرے نکاح کا مشورہ دیا اور یہ مشورہ قبول ہوا اور مولوی محمد سمیع صاحب[1] کی ماموں زاد بہن سے نسبت ٹھہری، عقد ثانی کا یہ ارادہ مولانا کے اکلوتے صاحب زادہ حامد حسن صاحب کو ناگوار گزرا اور وہ چپکے سے لاپتہ ہوگئے اور دربھنگہ پہنچ کر باپ کو خط لکھ دیا کہ ''اب آپ ہم سے مایوس ہوجایئے'' باپ کو اپنے اس یوسف کے گم ہوجانے کا بڑا صدمہ ہوا، دو روز تک کھانا پینا چھوڑ دیا اور روتے رہے، یہاں تک کہ نکاح کی تاریخ گزر گئی، بیٹی والوں نے اس کو برا مانا، مگر مولانا نے اس کی پروا نہ کی، ایک صاحب کے نام ایک خط مورخہ ۲۱راپریل ۱۹۰۰ء میں جو درجِ مکاتیب نہیں، یہ پوری کیفیت خود اپنے قلم سے لکھی ہے ''حامد کے مفرور ہونے کا قصہ تم نے پہلے سنا ہوگا، ۱۱راپریل کو میرے پاس ان کا خط آیا کہ ''مجھ کو اب بھول جایئے'' اس خط سے اس قدر پریشانی ہوئی کہ میں بالکل بدحواس ہوگیا، چار وقت تک کھانا نہ کھایا گیا اور ہر وقت رویا کرتا تھا۔

---

[1] یہ وہی ہیں جن کے نام کے اکثر خطوط آپ پڑھتے آئے ہیں-۱۲۔

اسی اثنا میں شادی کی تاریخ آئی، لوگوں کو اصرار تھا کہ تاریخ نہیں ٹالنی چاہیے لیکن مجھ کو دل پر قابو نہ تھا، نہ جا سکا ادھر مہمان وغیرہ آ چکے تھے اور اس وجہ سے ان لوگوں کی بہت سبکی ہوئی، وہاں سے سمیع آئے کہ اعظم گڑھ ہی میں نکاح ہو جائے میں اس پر بھی راضی نہ ہوا، البتہ زیور اور کپڑا بھیج دیا کہ بعد طبیعت ٹھہرنے کے عقد ہو جائے گا۔

میاں حامد چند روز دربھنگہ میں رہ کر وہاں سے بھی کہیں چل دیے اور بالکل پتہ نہیں اور غالباً مہینوں پتہ نہ لگے۔"

بہر حال حامد صاحب دربھنگہ سے قصبہ بہار شریف پہنچے، وہاں حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا جن کی مکتوبات مشہور ہے، مزار اور خانقاہ ہے، اس خانقاہ کے اس وقت سجادہ نشین شاہ امین احمد صاحب ایک مشہور بزرگ تھے، علاوہ فقر و تصوف کے وہ فارسی زبان کے بہت اچھے ادیب اور شاعر تھے، حامد صاحب ان کے جا کر مرید ہوئے اور گیروا کپڑا پہن کر ترک دنیا کیا، ایک آدھ مہینہ تک تو فقر و فاقہ سے زندگی بسر کی، پھر جی نہ مانا تو شاہ صاحب سے والد ماجد کا نام لیا، وہ سن کر بہت مہربان ہوئے اور مولانا کو خط لکھ کر مطلع کیا اور ساتھ ہی اپنی بعض فارسی مثنویاں مولانا کی خدمت میں بھیجیں، جن میں سے ایک مثنوی کا ذکر مولانا مجھ سے فرماتے تھے، جو بہاء الدین آملی کی مثنوی "نان و حلوا" کے جواب میں لکھی تھی، شاید اس کا نام "شہد و شیر" ہے۔

بیٹے کی اطلاع پا کر مولانا نے ایک دو معتبر آدمیوں کو بھیجا اور شاہ صاحب نے حامد صاحب کو سمجھا بجھا کر ان کے ساتھ کر دیا، وہ اس وقت جس حلیہ میں آئے، اس کا ذکر مولانا نے ایک خط میں کیا ہے جو ۵/مئی ۱۹۰۰ء کو اپنے بھائی اسحاق کے نام لکھا ہے، "شفیع ماسٹر اس کو جا کر لے آئے لیکن جس لباس میں اس کو دیکھا وہ گیروا کرتہ اور گیروا تہمد تھا، اس نے فقر اختیار کیا اور صرف اس وجہ سے یہاں آنے پر راضی ہوا کہ اس کے پیر نے اطاعتِ والدین پر اس کو مجبور کیا، وہ پھر جانے کے لیے مصر ہے اور کسی طرح نہیں ٹھہرتا، فقر عمدہ چیز ہے لیکن وہ جوگیانہ قالب میں جانا چاہتا ہے اور اس میں کوئی ریاکاری نہیں، صرف دماغ کی خرابی کا قصور ہے اور اصل چیز میری قسمت!"

بہر حال حامد صاحب پھر واپس نہیں گئے، یہیں رہے، مولانا نے جون ۱۹۰۰ء میں نکاح بھی کر لیا، شبلی منزل والے بنگلہ میں ایک زنانہ حصہ بھی اٹھا لیا، تا کہ رخصتی کے بعد وہ یہاں رہ سکیں۔

درس ان دنوں اعظم گڑھ میں رہ کر بعض شایق عزیزوں کو ادب کی بعض کتابوں کے سبق شروع کرائے، ہمارے دوست مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل نے جو بعد کو علی گڑھ سے ایم، اے، ایل، ایل، بی، ہوئے اور اب ماشاء اللہ ہمارے صوبہ کے ایم ایل اے ہیں اور فارسی اور اردو کے ممتاز شاعر اور کامیاب وکیل ہیں، یہیں اسی زمانہ میں ان سے حماسہ وغیرہ کے اسباق پڑھے اور ان کی صحبت میں رہ کر فارسی شاعری کا مذاق پیدا کیا۔

الغزالی کا خاکہ مولانا اب تاریخ کے دیکھے بھالے کوچہ سے ہٹ کر فن کلام کی طرف متوجہ تھے اور غالباً انہوں نے اسی زمانہ میں یہیں بیٹھ کر علم کلام کا ایک خاکہ تیار کیا، جس کا ہیولیٰ جولائی ۱۸۹۹ء سے ان کے ذہن میں تیار ہو رہا تھا، (شروانی-۱۳،۱۴) اور علم کلام کے سلسلہ میں بھی غالباً امام غزالی کی لائف پیش نظر تھی، جس کی تحریک ۱۸۹۳ء میں سرسید نے کی تھی، اب بارگاہِ فاروقی کے جلووں سے فرصت پا کر امام غزالی کا دربار سجانے کی فکر لاحق ہوئی، ۸/ جون ۱۹۰۰ء کو اپنے بھائی اسحاق کو لکھتے ہیں "لوئی کی ہسٹری آف فلاسفی میں لکھا ہے کہ اگر احیاء العلوم کا ترجمہ فرنچ میں ہو چکا ہوتا تو ضرور یہ گمان کیا جاتا کہ ڈیکارٹ کا فلسفۂ اخلاق غزالی سے ماخوذ ہے" اور دوسری کسی کتاب میں (اس کا ذکر تم نے کیا تھا) ہے کہ کتاب مذکور کا ترجمہ فرنچ میں ہو گیا تھا" ان دونوں عبارتوں کا ترجمہ لفظ بہ لفظ بھیج دو، بہت ضرورت ہے۔"

ندوہ کے چھٹے اور ساتویں اجلاس میں عدم شرکت ندوہ کا چھٹا اجلاس ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ مطابق مارچ ۱۸۹۹ء میں شاہ جہاں پور میں اور ساتواں اجلاس رجب ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں پٹنہ میں ہوا، ان دونوں اجلاسوں میں مولانا شریک نہ تھے، کیوں کہ جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے، یہ ان کی زندگی کے نہایت سخت سال گزرے، ۱۸۹۹ء میں وہ اکثر بیمار اور ۱۹۰۰ء میں وہ اپنے خانگی معاملات میں نہایت سرگرداں و پریشاں رہے۔

پھر افغان دارالترجمہ جولائی ۱۹۰۰ء امیر کابل فارسی کتابوں کے لیے جو دارالترجمہ ہندوستان میں قائم کرنا چاہتے تھے، اس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے کہ سفیر صاحب کابل نے بیش قرار معاوضہ پر بعض کتابوں کے ترجمہ کے لیے مولانا کو لکھا اور مولانا نے انکار کیا، اس کے بعد کا واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے بعض اعزہ واحباب نے یہ دیکھ کر کہ اس بے کاری سے بہتر یہ ہے کہ اس بے گاری کو قبول کر لیا جائے اور مولوی حمید الدین کو جو عربی و انگریزی دونوں کے ماہر تھے، اس کام میں لگایا جائے، اس بنا پر مولانا

نے سفیر صاحب کو پھر اپنی رضامندی لکھ بھیجی، سفیر صاحب نے یہ معلوم کر کے کل ترجمہ اور اس کا سارا اہتمام مولانا کے سپرد کر دیا اور اس کے لیے سردست دس ہزار کی رقم منظور کی۔

اسی کے ساتھ امیر کابل نے یہ چاہا کہ کلکتہ میں وہ انگریزی کتابوں کے ترجمہ کا محکمہ قائم کریں جس میں چار انگریزی اور سولہ ہندوستانی ملازم ہوں اور اس محکمہ کے سکریٹری مولانا ہوں، مگر انہوں نے اس سے انکار کیا اور معاملہ انجام نہ پایا۔ (حمید-۱۳)

نیشنل اسکول | ان دنوں نیشنل اسکول کے اہتمام و انتظام کے لیے فکر و پریشانی کا سلسلہ جاری ہے۔

علی گڑھ کی مجلس دینیات اور ندوہ | علی گڑھ کالج میں دینیات کی ایک کمیٹی بنی تھی، جس کے ناظم مولانا شروانی قرار دیے گئے تھے، اس کے ایک ممبر مولانا بھی منتخب ہوئے، ۲۶ر محرم ۱۳۲۰ھ کو اس کی یاد داشت پر رائے ظاہر فرمائی اور مولانا شروانی کو لکھا کہ اس کے نصاب میں حدیث کا انتخاب قطعاً شامل ہونا چاہیے، (شروانی-۱۸و۲۴) جولائی ۱۹۰۰ء میں ندوہ کا جلسہ انتظامیہ درپیش ہونے پر اس کی نسبت شروانی صاحب سے گفتگو ہوتی رہی۔ (شروانی-۲۴)

ندوہ کی طرف سے حکومت کی سیاسی بدگمانی کا زمانہ ۱۹۰۰ء و ۱۹۰۱ء | مولانا اعظم گڑھ میں ان دنوں اپنے خانگی حالات میں ایسے مصروف رہے کہ ان کے مخلص دوستوں کو بھی ان کی اطلاع نہیں رہی، یہ وہ زمانہ تھا کہ صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر مگڈانلڈ صاحب تھے، ان کی نظر مسلمانوں کی طرف کچھ یوں ہی تیز تھی، اس پر یہ ندوہ کی تحریک کے اوج کا زمانہ تھا، ہماری بدقسمتی اکثر ذاتیات سے شروع ہوتی ہے، لکھنؤ میں ندوہ کے بڑے حامی منشی محمد اطہر علی صاحب مرحوم کاکوروی تھے، جو وہاں کے مشہور و ممتاز وکیل اور انجمن تعلقہ دارانِ اودھ کے مشیر قانونی تھے اور ان کے حریف چودھری نصرت علی صاحب سندیلہ تھے، چودھری صاحب نے منشی صاحب کو شکست دینے کے لیے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور جیسا کہ سنا جاتا ہے انہوں نے لفٹنٹ گورنر تک ندوہ کی تحریک کی سیاسی بدگمانیوں کی شکایتیں پہنچائیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ندوہ کے بڑے بڑے ارکان نے صوبہ بلکہ برطانی ہندوستان کو چھوڑ دیا، منشی اطہر علی صاحب مرحوم حیدرآباد چلے گئے، ندوہ کے ناظم اور روح رواں مولانا سید محمد علی صاحب بھی ۱۹۰۱ء مطابق ۱۳۱۸ھ میں حجاز تشریف لے گئے اور ان کی جگہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلوی قائم مقام ناظم ہوئے، مگر انہوں نے قیام دہلی ہی میں رکھا، پھر بعد کو وہ بھی ایک ہی سال کے اندر مستعفی ہو گئے۔

مولانا شبلی مرحوم کی حالت سے بے خبری کے سبب سے ان کے دوستوں کو ان کے متعلق بھی تشویش تھی، مولانا حالی مرحوم نے ۶؍جولائی ۱۹۰۰ء کو مولانا شروانی کو خط لکھا ''مدت سے شمس العلما مولانا شبلی کا حال معلوم نہیں، ندوۃ العلما کی نسبت عجیب عجیب افواہیں سنی جاتی ہیں، مگر معتبر ذریعہ سے کوئی بات آج تک نہیں سنی گئی، نواب لفٹنٹ گورنر کے دل میں اس کی طرف سے شکوک کا پیدا ہونا معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے؟''

مولانا کا معاملہ گو اس بدگمانی سے بہت آگے نکل چکا تھا، تاہم وہ اس وقت وطن میں یا علیل تھے، یا خانگی افکار میں مبتلا۔

والد کی علالت اور خانگی پریشانی ۱۲؍نومبر ۱۹۰۰ء صحت کے بعد اب وقت آیا تھا کہ مولانا آرام کریں یا سیر و تفریح کے لیے کہیں باہر تشریف لے جائیں، مگر قضا و قدر کو یہ منظور نہ تھا، اسی اثنا میں ان کے والد ماجد ایک سخت علالت میں مبتلا ہوئے جو آخر کو مرض الموت ہی ثابت ہوا، نومبر میں ان کی حالت بہت خراب ہوئی، ۱۰؍نومبر ۱۹۰۰ء کو اپنے بھائی مولوی اسحاق کو لکھتے ہیں ''استقلال و متانت کی حد ہو گئی، والد کی حالت بیم و امید کی ہو چکی ہے، بلکہ بیم کا پہلو غالب ہے، تمام اطراف کے آدمی روزانہ ان کو دیکھنے آتے ہیں، مستورات سب آئیں، خود والد ہر وقت تم کو پوچھا کرتے ہیں۔'' (۱۶)

مولانا برابر ان کی تیمارداری دوا و علاج میں مصروف رہے، مگر محکمۂ تقدیر کا فیصلہ اٹل تھا، ۱۲؍نومبر ۱۹۰۰ء کو انہوں نے وفات پائی، خاندان بلکہ تمام شہر میں کہرام مچ گیا، حکام تک متاثر ہوئے، عدالتیں بند ہو گئیں، پورے ضلع نے ان کے وجود سے محرومی کا غم کیا، یہ صرف ایک کامیاب وکیل کی موت نہ تھی بلکہ ایک فیاض، ہر دل عزیز اور قوم کے ایک ممتاز و نامور زبردست فردِ فرید کی موت تھی، بیٹے پر اس حادثہ کا جو اثر پڑا وہ مرثیہ سے ظاہر ہے:

ہاں اے پدر نہ گویمت ایں در زد آں مکن ... زنہار عزمِ رہروِ آں جہاں مکن
دستاں سرائے بزم طرب بودہ ام بہ دہر ... مارا بہ نوحہ، زمزمۂ سنجِ فغاں مکن
کوہِ غم فراق توانم کہ برکشم ... با چوں منے شکستہ وزاریں گماں مکن
بیرانہ روئے روشنِ تو آفتاب بود ... ایں آفتاب از نظرِ ما نہاں مکن
رفتی و حالِ قوم نہ دانی کہ چوں شدہ است ... دلہا تمام از غم و از غصہ خوں شدہ است

ایوانِ قوم کز تو سرش چرخ سود بود — در جنبش است و کنگر ہایش نگوں شدہ است
آں قوم کز تو پایۂ جاہش بلند بود — زار و نژند و خستۂ خوار و زبوں شدہ است
آں صفحہائے دفتر اقبال پارہ گشت — آں کاسہ ہائے خوانِ نعم واژگوں شدہ است
در شہر کیست کز غمِ تو دیدہ تر نہ کرد — یکدل نبودہ است کہ صد نالہ سر نہ کرد
دانستہ پاس خاطر ایشاں نہ داشتی — یا کس ترا ز حالِ عزیزاں خبر نہ کرد

آخری بند میں موت کے وقت کا عجیب دلدوز پر اثر نقشہ کھینچا ہے:

آہ آں زماں کہ دردِ تنش زا نزار کرد — آثارِ مرگ بر رُخ و نبض آشکارا کرد
عم بزرگ وار کہ آسیمہ سرد دید — حالش بدید وگریۂ بے اختیار کرد
شبلی رسید و نالہ زد و بسمل اوفتاد — اسحاق آمد و مژہ را اشکبار کرد
مستور خانہ آمد و از سینہ برکشید — آں تیرِ آہ کز دل گردوں گزار کرد

غم زدہ بیٹے نے مولانا سید عبدالحیؒ صاحب مرحوم مددگار ناظم ندوہ کو اس زمانہ میں اپنے والد کی وفات کی خبر ایک کارڈ پر لکھ دی تھی، اتفاق سے ندوہ کے دفتر کے بے کار کاغذات میں وہ کارڈ مجھے مل گیا تھا، ایک ہی سطر تھی، ''دریغا کہ یتیم گشتم''۔

اس اختصار کی بلاغت پر طولِ بیان کی ہزاروں سطریں قربان!

خانگی مصائب دسمبر ۱۹۰۰ء شیخ صاحب کی موت ایک تنہا مصیبت نہ تھی، بلکہ بہت سی مصیبتوں کا مجموعہ تھی، وہ ایک ہرے بھرے، سرسبز و شاداب خاندان کے سرپرست تھے، ان کی سرپرستی کی محرومی سے سارے خاندان پر زوال آیا، شیخ صاحب نے پہلی بیوی (مولانا اور ان کے بھائیوں کی والدہ) کے علاوہ غیر کفو میں جو شادی کی تھی، اپنی زندگی ہی میں ۱۸۹۲ء میں اپنی جائداد کا ایک حصہ اُس بیوی کے نام ہبہ کر دیا تھا، جس سے مولانا اور ان کے بھائیوں کو سخت اختلاف تھا، اس کی تفصیل مکاتیب کے ایک خط (اسحاق-۳) میں مذکور ہے، شیخ صاحب نے اپنی چھ سات ہزار کی آمدنی کی جائداد کے ساتھ تیس[1] ہزار کا قرض چھوڑا، قرض کے سوا شیخ صاحب کا بڑا کارخانہ پھیلا تھا، جس کو قائم رکھنے کے لیے ماہانہ آمدنی کی ضرورت تھی، سوتیلی ماں اور ان کے طرف داروں سے الگ جھگڑے کی صورت تھی۔

[1] شروانی-۴۷، حمید-۲۰ میں غلطی سے تیئیس ہزار چھپا ہے، تیس ہزار چاہیے۔

باپ کی زندگی بھر مولانا اپنی سوتیلی ماں سے ملنا کیا معنی ان کے نام سے بیزار تھے، ان کا ذکر سننا نہیں چاہتے تھے، مگر باپ کی وفات کے بعد یہ انقلاب ہوا کہ وہ خود چھاؤنی[1] میں جہاں وہ رہتی تھیں، تشریف لے گئے، ماں کے قدموں پر گرے، عمر بھر کی معافی مانگی اور ایسی سعادت مندی دکھائی کہ اپنے بیٹے سے بھی ممکن نہیں، یہ بھی مولانا کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔

بہر حال مولانا چوں کہ بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، اس لیے تمام مشکلات کا باران ہی کے سر پڑا، قرض خواہوں اور مہاجنوں نے ہر طرف سے آکر ان کو گھیرا، مقدمات شروع ہوئے اور مقدمات کی پیروی چھڑی، اسی حالت میں مولانا نے فرمایا ''کاش والد ایک حبہ نہ چھوڑتے، مگر یہ قرض تو نہ چھوڑ جاتے'' بہر حال یہ وہ صورت حال تھی، جو ان کے مذاق کے بالکل برخلاف تھی اور ان کی پریشان دلی اور پراگندہ خاطری کے لیے بالکل کافی تھی، مگر اس ذمہ داری کو بھی جس سے عمر بھر ان کو لگاؤ نہیں رہا، پوری طرح اٹھایا، ۱۵؍دسمبر ۱۹۰۰ء کو بھائی کو الہ آباد جہاں وہ وکالت کر رہے تھے، لکھا ''دیوارہ[2] میں اگر تقسیم کا انتظار کرو گے تو اس سال کی تحصیل بھی غارت جائے گی، میری دانست میں مناسب ہے کہ ابھی سے اپنا خاص کارندہ مقرر کرو، جو اس سال کے اپنے حصہ کی تحصیل کرے اور اسامی بٹ کے طور پر کاغذات بھی درست کرتا رہے، باقی علاقہ جات، گاؤں پٹی، جگدیش پور، ڈرکی، بلریا وغیرہ ٹھیکہ دے دینا چاہیے، مصارفِ سیر[3]، مشاہرۂ ملازمان، خرچ مقدمات، خرچ ڈیوڑھی، بندول کا ایک موازنہ (بجٹ) بنا کر مجھے بھیج دو تا کہ ماہ بہ ماہ اس کے مہیا کرنے کا بندوبست کر سکوں۔ (اسحاق-۱۷)

اس کے بعد ۲۰؍دسمبر کے خط (۱۸) میں اسحاق مرحوم کو زمین دار کے کاغذات، مقدمات مصارف اور تمام دشواریوں کو ذکر کر کے بلایا ہے اور آخر میں لکھتے ہیں ''افکار کا ایک گھنگھور بادل چھایا ہے، دیکھیے کیوں کر چھٹتا ہے۔''

لیکن یہ گھنگھور بادل مولانا کے حسن نیت کی برکت سے چھٹ گیا، مولانا نے مظفر کو جو محروم و مجحوب تھا، اپنی جائداد میں شریک کر لیا اور اس کا نام بھی ورثا کی رضا مندی سے حصہ داروں میں داخل

---

[1] اعظم گڑھ میں زمین داری کے عملہ کے مکان کو جس کو ہماری طرف زمین داری کچہری کہتے ہیں، چھاؤنی کہتے ہیں، اعظم گڑھ محلہ پہاڑ پور میں شیخ صاحب کا ایک بڑا مکان تھا، جس کو اس لیے چھاؤنی کہتے تھے، شیخ صاحب کی دوسری بیوی اسی مکان میں رہتی تھیں، اسی لیے وہ چھاؤنی والی کہلاتی تھیں، مکاتیب (اسحٰق-۳) وغیرہ میں ان کو ارباب چھاؤنی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ [2] گھاگھرا کے کنارے مواضعات کا ایک سلسلہ ہے۔ [3] جو کاشت خود کی جائے۔

کرادیا، بچہ کی دادی یعنی مولانا کی سوتیلی ماں نے مولانا کا یہ برتاؤ دیکھ کر یہ کیا کہ جو جائداد شیخ صاحب ان کو ہبہ کر گئے تھے، واپس کر دی، یہ واپس شدہ جائداد قرض خواہوں کو دے دی گئی اور قرض کے بڑے حصہ کے بوجھ سے وہ ہلکے ہو گئے، باقی قرض کی ادائیگی کی فکر بھی ان کو دامن گیر ہوئی، ان ہی دنوں مسٹر آرنلڈ نے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر تھے، ان کو لاہور میں ایک خدمت پر بلوایا، جو غالباً اورینٹل کالج لاہور میں عربی یا فارسی کی پروفیسری[1] ہوگی، مگر انہوں نے وہاں جانے سے انکار کیا اور اعظم گڑھ ہی میں رہے، مگر قرض خواہوں اور مقدمات سے چپراسیوں کی آمدورفت سے پریشان خاطر تھے، آخر فروری ۱۹۰۱ء کی کسی تاریخ کو ایک دن جیسا کہ مولانا خود فرماتے تھے، شہر سے نکل گئے، پہلے تو یوں ہی غازی پور کا ٹکٹ لیا، وہاں سے دفعۃً علی گڑھ چل کھڑے ہوئے علی گڑھ میں نواب محسن الملک نے حیدرآباد کا مشورہ دیا اور وہ حیدرآباد روانہ ہو گئے، ممکن ہے کہ اس سفر کی عجلت اور حیدرآباد کے انتخاب کے مشورہ میں بعض سیاسی اسباب سے جن کا اشارہ اوپر گذر چکا، برطانی ہند سے دور ہو جانے کی مصلحت بھی شامل ہو۔

حیدرآباد میں قیام، فروری ۱۹۰۱ء فروری ۱۹۰۵ء | مولانا نے فروری ۱۹۰۱ء کے آخر میں حیدرآباد کا رخ کیا، راستہ میں بھوپال پڑا، ان کا جی چاہا کہ نواب سید علی حسن خاں کی ملاقات کے لیے وہاں ایک دو دن ٹھہر جائیں، مگر چوں کہ نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ بھوپال بیمار تھیں، اس لیے وہ بھوپال نہیں ٹھہرے اور سیدھے حیدرآباد چلے آئے[2]۔

مولانا حیدرآباد پہنچ کر مولوی عزیز مرزا مرحوم کے جو اُس وقت ہوم سکریٹری تھے، مہمان ہوئے، دوسرے روز جب مولوی سید علی بلگرامی کو اس کی اطلاع ملی تو وہ جا کر خود ان کو اپنے گھر لے آئے[3]، لوگوں کو خبر ہوئی تو ہر طرف سے ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا گیا، مارچ میں مولانا کی تقریر کے لیے ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں ڈیڑھ ہزار بزرگوں کا مجمع ہوا، وزیر عدالت جلسہ کے صدر[4] تھے، مولانا نے علم کلام پر ایک مبسوط محققانہ تقریر فرمائی، یہ تقریر گو زبانی تھی، مگر مولانا کی تقریر بھی مقالہ کی شان رکھتی تھی، ایک صاحب اس تقریر کو قلم بند کرتے گئے اور جتنا حصہ قلم بند ہو گیا، اس کی اشاعت کا خیال ہوا[5]۔

امور مذہبی کی نیابت | نواب مدار المہام بہادر یعنی وزیر اعظم نے نہایت احترام سے مولانا کو شرف

ا مکتوبات حالی، جلد اول، ص ۱۴۱ ۲ علی حسن خاں-۴ ۳ سیر المصنفین، ص ۲۶۴ ۴ مسیح-۴۷ ۵ علی حسن خاں-۴۔

نیاز بخشا اور ان کو حیدر آباد کے قیام کی ترغیب دی، حیدر آباد میں امور مذہبی کا محکمہ حکومت کا بہت بڑا صیغہ ہے، جس کا بجٹ کئی لاکھ کا ہوتا ہے اور جس کے ماتحت ریاست کے تمام مذہبی ادارے، مساجد، منادر، آتش کدے، گرجے، گردوارے وغیرہ امکنۂ مذہبی اور اوقاف ہیں، نواب مدارالمہام نے اپریل ۱۹۰۱ء میں اس صیغہ کی خدمت مولانا کو سپرد کرنی چاہی لیکن مولانا نے اس کو منظور نہیں فرمایا[۱]۔

مولانا نے اپنے خطوط میں اس بات کی تصریح نہیں کی ہے کہ امور مذہبی کا کون سا عہدہ ان کے سامنے پیش کیا گیا تھا لیکن مولانا حالی نے اپنے ایک خط میں (مورخہ ۱۷/ مارچ ۱۹۰۱ء) خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے حوالہ سے جو ان دنوں حیدر آباد میں تھے، مولوی عبدالحق صاحب (موجودہ سکریٹری انجمن ترقی اردو) کو حیدر آباد یہ لکھا ہے ''شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کا تقرر مددگار معتمد امور مذہبی کے عہدہ پر عزیزی غلام الثقلین کی تحریر سے معلوم ہو کر بے انتہا خوشی ہوئی، اگر آپ ان سے ملیں تو میری طرف سے بعد سلام و نیاز کے کہہ دیجیے کہ اگرچہ آپ کے علم و فضل ولیاقت کے مقابلہ میں یہ عہدہ چنداں امتیاز نہیں رکھتا، مگر بہر حال لاہور کی خدمت سے جس پر مسٹر آرنلڈ آپ کو بلانا چاہتے تھے، میرے نزدیک بہت بہتر ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ آپ کو تصنیف و تالیف کا یہاں زیادہ موقع ملے گا اور قوم کو آپ زیادہ فائدہ پہنچا سکیں گے[۲]۔''

مگر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مولانا نے اس عہدہ کو قبول نہیں فرمایا، شاید اس کی ایک وجہ تنخواہ کی کمی ہو، اس عہدہ کی تنخواہ چار سو روپیہ مولانا کو دی جانے والی تھی، ۱۷/ اپریل ۱۹۰۱ء کو اپنے بھائی اسحاق کو لکھتے ہیں ''مجھ کو جو کچھ (جو عہدہ) دیتے ہیں اس میں اس وقت مجھ کو ۴۲۵ روپیے ملیں گے، لیکن میں نے اس سے انکار کیا چوں کہ نواب مدارالمہام اس سے زیادہ کے مجاز نہیں ہیں، اس لیے حضور میں بڑے زور کے ساتھ تحریری سفارش بھیجی ہے، اس کا جواب نہیں آیا اور بہت کم توقع ہے کہ آئے، حضور اور مدارالمہام کی ناچاقی بڑھتی جاتی ہے[۳]۔''

ایک اور خط میں لکھتے ہیں ''بڑی کامیابی ہوتی لیکن بدقسمتی سے وزیر اعظم اور حضور کے تعلقات کشیدہ ہیں اور وزیر اعظم کے اختیارات حسب قانون حضور نے گھٹا دیے ہیں اور اس وجہ سے ہر کام میں حضور سے اجازت لینی پڑتی ہے، یہ صرف چند روز سے ہوا ہے[۴]۔''

بات یہ ہے کہ حیدر آباد کے سیاسی حالات اس وقت سخت نازک تھے، حضور نظام میر محبوب علی خاں

---

[۱] سمیع - ۴۷ [۲] مکتوبات حالی، ص ۱۴۱ [۳] الحق - ۱۹ [۴] سمیع - ۴۷۔

اور مدار المہام سر وقار الامرا کے درمیان سخت چپقلش تھی، مولوی عزیز مرزا مرحوم اور مولوی سید علی بلگرامی مرحوم دونوں کے وہی مربی اور سرپرست تھے اور ان ہی دونوں کے ذریعہ سے مولانا حیدرآباد میں توسل کے خواستگار تھے، اسی زمانہ میں سید علی حسن (نواب محسن الملک کے بھائی) کو جو نواب مدار المہام بہادر کے سب سے بڑے رکن تھے، حضور نے دفعۃً موقوف کردیا، ان کے ساتھ ایک انگریز کو بھی مولانا لکھتے ہیں "حیدرآباد میں اس وقت زلزلہ آگیا ہے، تمام لوگ کانپ اٹھے ہیں، خصوصاً ہندوستانی خاص طور پر موردِ عتاب ہیں۔" (اسحاق-۱۹)

دماغی کشمکش ان حالات میں مولانا ایک دماغی کشمکش میں مبتلا تھے، کبھی یہ چاہتے تھے کہ یہاں کی نوکری قبول کرلیں اور کبھی نوکری کی قید و بند کو سوچتے تو قناعت کی زندگی کا خیال آتا، اس حال میں ۷/اپریل ۱۹۰۱ء کو اپنے بھائی اسحاق مرحوم کو اپنا ارادہ بتاتے ہیں "اب میرا ارادہ سنو:

> "میں نے یہ عزم کرلیا ہے کہ کوئی معقول بات نکل آئے تو خیر ورنہ دنیاوی خواہشوں سے صاف دست بردار ہوتا ہوں، سو روپے[1] ہیں، چھاؤنی، عالیہ[2] اسکول وغیرہ کے چالیس پچاس نکل جائیں گے، باقی جس قدر بچے گا اس سے غریبانہ زندگی خاص طرح بسر ہوسکتی ہے، لکھنؤ یا علی گڑھ میں بستر ہوگا اور ندوہ یا کالج کا مشغلہ تنہائی اور بے تعلقی میں انشاء اللہ قوم کی خدمت اچھی طرح بن آئے گی، کالج تو میری مدد کا محتاج نہیں لیکن ندوہ کام کرنے کی جگہ ہے اور بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔"

پھر ۱۲/اپریل ۱۹۰۱ء کو سمیع مرحوم کو لکھتے ہیں "بہرحال دیکھئے کہ کیا ہوتا ہے، بے شبہ اگر ملازمت کرسکتا اور کسی قدر دنیاداری بھی مجھ سے بن پڑتی تو دنیاوی فائدے بہت حاصل ہوتے لیکن میاں سمیع عمر کا بڑا حصہ صرف ہوچکا، چند برسوں کے لیے دامن زندگی کو کیا آلودہ کروں، دعا کرو کہ جو گردن ہمیشہ بلند رہی، بلند ہی رہے، گھر کے مصائب نے یہاں تک بھی پہنچا دیا ورنہ میں اپنے گوشۂ عافیت کو فلک نما[3] سے کم نہیں سمجھتا ہوں۔"

۷/جون ۱۹۰۱ء کو ان ہی کو پھر لکھتے ہیں "میں یہاں آکر ایسا پھنس گیا کہ ع نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے، ہمت کہتی ہے ع بے تامل آستیں افشاندن از دنیا خوش است،

---

[1] حیدرآباد والا وظیفہ [2] چھاؤنی سے مقصود سوتیلی ماں ہیں، اور عالیہ مہدی مرحوم کی بیوہ کا نام ہے اور اسکول سے نیشنل اسکول مقصود ہے، مولانا ان سب کو کچھ ماہوار دیا کرتے تھے، یہ اسی کا حساب بتا رہے ہیں۔ [3] حیدرآباد کی مشہور شاہی عمارت۔

مصلحت فریب دیتی ہے کہ تم میں اور بہت سے لوگ شامل ہیں، ان کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔[۱]

سلسلۂ آصفیہ اور سررشتۂ علوم وفنون الفاروق کے پڑھنے والوں کو سلسلۂ آصفیہ کی تھوڑی سی تاریخ معلوم ہے، مولانا شبلی مرحوم الفاروق کے دیباچہ میں لکھتے ہیں، ہمارے معزز اور محترم دوست شمس العلما مولانا سید علی بلگرامی بجمیع القابہ کو تمام ہندوستان جانتا ہے، وہ جس طرح بہت بڑے مصنف، بہت بڑے مترجم، بہت بڑے زبان داں ہیں، اسی طرح بہت بڑے علم دوست اور اشاعت علم وفن کے بہت بڑے مربی اور سرپرست ہیں، اس دوسرے وصف نے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انہوں نے جناب نواب محمد فضل الدین خان سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک سر وقار الامرا بہادر مدار المہام دولت آصفیہ خلدہا اللہ تعالیٰ کی خدمت میں یہ درخواست کی کہ حضور پرنور مظفر الممالک فتح جنگ ہز ہائنس نواب میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک) آصف جاہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کے سایۂ عاطفت میں علمی تراجم وتصنیفات کا ایک مستقل سلسلہ قائم کیا جائے جو سلسلۂ آصفیہ کے لقب سے ملقب ہو اور وابستگانِ دولت آصفیہ کی جو تصنیفات خلعت قبول پائیں، وہ اس سلسلہ میں داخل کی جائیں۔

جناب نواب صاحب ممدوح کو علوم وفنون کی ترویج واشاعت کی طرف ابتدا سے جو التفات و توجہ رہی ہے اور جس کی بہت سی محسوس یادگاریں اس وقت موجود ہیں، اس کے لحاظ سے جناب ممدوح نے اس درخواست کو نہایت خوشی سے منظور کیا، چنانچہ کئی برس سے یہ مبارک سلسلہ قائم ہے اور ہمارے شمس العلما کی کتاب ''تمدنِ عرب'' جس کی شہرت عالم گیر ہو چکی ہے، اس ملک کا ایک بیش بہا گوہر ہے، خاک سار کو ۱۸۹۶ء میں جناب ممدوح کی پیش گاہ سے عطیۂ ماہ وار کی جو سند عطا ہوئی اس میں بھی یہ درج تھا کہ خاک سار کی تمام آیندہ تصنیفات اس سلسلہ میں داخل کی جائیں۔''

مولوی عبدالحق صاحب مولوی سید علی بلگرامی کے حال میں لکھتے ہیں ''مرحوم مولوی سید علی بلگرامی نے نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم کے عہد میں جو بڑے قدرداں امیر تھے، ایک سررشتۂ علوم و فنون قائم کیا تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو زبان میں بذریعۂ تصنیف وتالیف وترجمہ علمی کتب کا ذخیرہ بہم پہنچایا جائے، (سید علی) مرحوم اس سررشتہ کے نگراں مقرر ہوئے اور ان کی زیر نگرانی دکن کی تاریخ اور بعض دیگر مضامین پر کتابیں تالیف وترجمہ ہوئیں لیکن اس وقت اس کام کے چلانے کے لیے کوئی

---

۱ سمیع - ۴۷ سمیع - ۴۸۔

لایق شخص انہیں نہ ملا تھا، لہٰذا انہوں نے شمس العلما مولانا شبلی کا انتخاب کیا اور ان کا تقرر خدمت ناظم سررشتہ علوم وفنون پر بہ مشاہرہ چار سو ہوا اور درحقیقت یہ انتخاب بہت ہی اچھا ہوا تھا، مولانا کی چند کتابیں بھی اسی سلسلہ میں شایع ہوئیں۔ (چند ہم عصر از مولوی عبدالحق صاحب ص ۲۷)

اس متن کی شرح نواب جیون یار جنگ بہادر کے اس مقدمہ میں ہے جو انہوں نے تمدن عرب کے دوسرے اڈیشن پر ۱۹۳۶ء میں لکھا ہے "سروقار الامرا بہادر کے عہدِ وزارت میں ڈاکٹر سید علی کی سعی وکوشش سے حکومت نے سررشتۂ علوم وفنون کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا تھا، مقصد اس کا یہ تھا کہ تالیف وترجمہ کے ذریعہ اُردو میں علمی کتابیں مہیا کی جائیں اور ان کو خاص اہتمام کے ساتھ چھپوا کر شایع کیا جائے، اس سررشتہ کے نگراں کار ڈاکٹر سید علی مقرر ہوئے، نظامت کے لیے مولانا محمد مرتضیٰ فلسفی کا انتخاب ہوا، چار سال کے بعد ۱۹۰۱ء میں شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کو یہ خدمت ملی، یہ سررشتہ ۱۸۹۴ء سے ۱۹۰۴ء تک قریباً دس[1] سال قائم رہا۔"

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مولوی سید علی بلگرامی کی تحریک سے ۱۸۹۴ء میں حیدرآباد میں سررشتۂ علوم وفنون کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس کے سب سے پہلے ناظم مولانا محمد مرتضیٰ صاحب مقرر ہوئے تھے جو اپنے کو فلسفی کہتے تھے اور معقولات کا بڑا دعویٰ رکھتے تھے، ان کا اصل وطن نونہرہ ضلع غازی پور[2] تھا، مولانا کے حیدرآباد پہنچنے کے بعد وہ اس عہدہ سے ہٹا کر مال کے صیغہ میں بھیج دیے گئے اور یہ جگہ خالی ہوگئی۔

سررشتہ علوم وفنون کی نظامت بہرحال جب مولانا نے امور مذہبی کی خدمت سے انکار کیا تو ۳ رصفر ۱۳۱۹ھ (۲۲ رمئی ۱۹۰۱ء) کو سررشتۂ علوم وفنون کی اسی خالی شدہ نظامت کے عہدہ پر ان کا تقرر ہوا،

[1] اس عرصہ میں حسب ذیل کتابیں اس کی طرف سے شایع ہوئیں، ان میں سے پہلی پانچ کتابوں کی ڈاکٹر سید علی نے نگرانی کی،

۱-سیاحت نامہ موسیو ٹیوریز، مطبوعہ آگرہ	۱۸۹۶ء	۶-الغزالی شبلی، کان پور	۱۹۰۱ء
۲-سیاحت نامہ موسیو تھیونو، مطبوعہ آگرہ	۱۸۹۷ء	۷-علم الکلام، شبلی علی گڑھ	۱۹۰۲ء
۳-تاریخ دکن جلد اول، مطبوعہ آگرہ	۱۸۹۷ء	۸-تاریخ دکن، جلد سوم، آگرہ	۱۹۰۳ء
۴-تاریخ دکن، جلد دوم، مطبوعہ آگرہ	۱۹۰۰ء	۹-الکلام شبلی، کان پور	۱۹۰۴ء
۵-نظام اکبری، حیدرآباد، مطبوعہ آگرہ	۱۹۰۱ء	۱۰-موازنہ انیس ودبیر شبلی، آگرہ	۱۹۰۴ء

[2] مولانا محمد مرتضیٰ صاحب نونہروی ایک وسیع النظر شیعی عالم تھے، علم کلام میں معراج العقول نام عربی میں ایک مبسوط تصنیف یادگار چھوڑی ہے، یہ کتاب ۱۹۱۶ء میں انہوں نے شایع کی، اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام نے اپنے الہلال میں اس پر مداحانہ تبصرہ کیا تھا۔

پہلے ۳ رصفر والے فرمان میں ان کی قائم مقامی کی نصف تنخواہ دوسو روپے مقرر ہوئی، اس کے بعد ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۱۹ھ (۲۷ رجولائی ۱۹۰۱ء) کو اس عہدہ کی پوری تنخواہ چار سو روپیہ ماہ وار کا فرمان ہوا، بعد کو مولوی عزیز میرزا مرحوم وغیرہ کی کوشش سے پانچ سو روپے ماہ وار ہو گئے لیکن سو روپیہ ماہ وار کا گزشتہ وظیفہ جو سرکار آصفیہ سے ان کو ملا کرتا تھا، بند ہو گیا اور چوں کہ یہ صیغہ مولوی سید علی بلگرامی کی نگرانی میں تھا اور وہ محکمۂ تعمیرات و معدنیات ریلوے کے معتمد تھے، اس لیے سررشتہ علوم و فنون کا یہ صیغہ بھی اسی محکمۂ تعمیرات و معدنیات کے ماتحت تھا اور یہی سبب ہے کہ الکلام کے شروع میں مولوی کاظم علی صاحب قائم مقام معتمد محکمۂ تعمیرات کا مقدمہ شامل ہے۔

اس عہدہ کا کام اپنے ہاتھ میں لینے کے ساتھ مولانا نے علم کلام پر متعدد تصنیفوں کا خاکہ تیار کر لیا، ان کی زندگی کے جو پچھلے حالات آپ نے پڑھے ہیں ان سے اندازہ ہو رہا ہوگا کہ وہ تاریخ سے نکل کر علم کلام کے کوچہ میں قدم رکھ رہے ہیں اور سرسید نے ان سے الغزالی لکھنے کی جو فرمائش کی تھی، وہ اس کے لیے کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے دور نکل گئے اور علم الکلام کا ایک وسیع خاکہ ان کے ذہن میں آ گیا، چنانچہ الغزالی کے شروع میں وہ رقم طراز ہیں: علم کلام جو مسلمانوں کی خاص ایجادات میں سے ایک مہتم بالشان علم اور ان کا سرمایۂ ناز ہے، میں آج کل اس کی نہایت مبسوط تاریخ لکھ رہا ہوں اور اس کے چار حصے قرار دیے ہیں۔

۱- علم کلام کی ابتدا اس کے عہد بعہد کی تبدیلیاں اور ترقیاں۔

۲- علم کلام نے اثباتِ عقائد اور ابطال فلسفہ کے متعلق کیا کیا؟ اور کس حد تک کام یابی حاصل کی۔

۳- ائمۂ کلام کی سوانح عمریاں۔

۴- جدید علم الکلام

پہلا حصہ بقدر معتد بہ لکھا جا چکا تھا کہ بوجوہ چند رک گیا اور تیسرا حصہ شروع ہو گیا، اس حصہ میں امام غزالی کی سوانح عمری شروع ہوئی تو بڑھتے بڑھتے ایک مستقل کتاب بن گئی، چوں کہ پوری کتاب کی تیاری کو عرصہ درکار تھا، مناسب معلوم ہوا کہ بلا انتظار باقی یہ حصہ الگ شایع کر دیا جائے۔"

پہلے حصہ یعنی الکلام کے شروع میں علم کلام کی تاریخ لکھنے کی وجہ ہے اور بتایا ہے کہ اس کے لکھنے میں وہ اپنی تاریخ کی حد سے باہر نہیں نکل رہے ہیں، فرماتے ہیں" تاریخ کے فن میں اہل مغرب نے جو

نئے نئے برگ وبار پیدا کیے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اشخاص اور اقوام کی تاریخ سے گزر کر علوم وفنون کی تاریخ لکھتے ہیں، مثلاً فلاں علم کب پیدا ہوا، کن اسباب سے پیدا ہوا، کس طرح عہد بہ عہد بڑھا، کیا کیا ترقیاں اور تبدیلیاں ہوئیں اور کن وجوہ سے ہوئیں، اس قسم کی کوئی تصنیف اردو بلکہ عربی وفارسی میں بھی موجود نہ تھی، میں نے ابتدائے زمانۂ تصنیف سے اپنی تصنیفات کا موضوع تاریخ قرار دیا ہے، چنانچہ اب تک جو چیزیں میرے قلم سے نکلیں اور شایع ہوئیں وہ تاریخ ہی تھیں، اس بنا پر علم کلام میرے دائرہ سے خارج تھا، علم کلام کی تاریخ لکھنے سے ایک طرف اسلامی لٹریچر کی ایک بڑی کمی پوری ہوتی ہے، دوسری طرف یہ تصنیف جو درحقیقت علم کلام کی تصنیف ہے، تاریخ کے دائرہ میں آجاتی ہے اور میں اپنی حد سے تجاوز کرنے کا گنہگار نہیں رہتا۔''

اس میں شک نہیں کہ مولانا نے تاریخ ہی کی تقریب سے علم کلام کے کوچہ میں قدم رکھا، مگر یہ کوچہ ان کو ایسا پسند آیا کہ وہ پھر عمر بھر اس سے نہیں نکلے، وہ کہتے تو ہیں کہ ان کے علم کلام کی کتابیں تاریخ کے دائرہ میں آجاتی ہیں، مگر اہلِ نظر کو معلوم ہے کہ ان کی تاریخی کتابیں بھی علم کلام ہی کے دائرہ میں ہیں، اس لیے وہ علم کلام لکھنے سے اپنی حد سے تجاوز کرنے کے گنہگار نہ پہلے تھے اور نہ اب ہوئے۔

اس خدمت کے قبول کرنے کے بعد ہی حیدرآباد کی اندرونی سیاسیات میں ایک عظیم الشان تغیر رونما ہوا، شخصی سلطنت میں کسی اعلا مرکزی شخصیت کے ہٹنے سے اس نظامِ شمسی کے سارے ستاروں پر کچھ نہ کچھ اثر پڑتا ہے۔

مولوی سید علی بلگرامی کی حیدرآباد سے علاحدگی اور سررشتۂ علوم وفنون کا تذبذب مولوی سید علی بلگرامی مرحوم میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں، کچھ کمزوریاں بھی تھیں، یعنی انہوں نے طبیعت سیاسی پائی تھی، اس لیے ان کے ہاں ہمیشہ جوڑ توڑ لگا رہتا تھا، کبھی وہ اس میں دوسروں کو پھنساتے تھے اور کبھی وہ اس میں خود پھنس جاتے تھے، اسی قسم کا ایک موقع ۱۹۰۱ء کے آخر میں پیش آیا، نواب وقار الامرا بہادر مدار المہامی سے مستعفی ہوئے اور ان کی جگہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کو وزارت کا قلم دان عنایت ہوا، اس کے نتیجہ میں مولوی سید علی بلگرامی بھی ستمبر ۱۹۰۱ء میں بائیس سال کی کارگزاری کے بعد ملازمت سے سبک دوش کردیے گئے، مولوی صاحب کا اپنی جگہ سے ہٹنا کوئی معمولی بات نہ تھی، بیسیوں اشخاص کا تعلق صرف ان کی ذات سے تھا، اس لیے ریاست کی الجھی ہوئی سیاستوں کے سبب سے ان کا متاثر ہونا ضرور تھا، ۲۷ر

اگست ۱۹۰۱ء کو شروانی صاحب کو لکھتے ہیں ''حیدر آباد کی پولیٹکل زمین میں سخت بھونچال آیا، وزارت کا قبلہ مشرق سے مغرب کو بدل گیا۔ یہاں میں نے نظامتِ علوم و فنون قبول تو کر لی ہے لیکن اس انقلاب میں دیکھئے یہ خدمت بھی مجھے قبول کرتی ہے یا نہیں''[1]۔

پھر ۱۰ر ستمبر کو لکھتے ہیں ''انقلاب حال نے تمام امیدیں خاک میں ملا دیں، اب ایام گزاری ہے، وہ بھی دیکھیے کب تک، کتاب الآلات کا چھپنا اب رہا، اسی دریادل کے بھروسہ پر یہ کام بھی اٹھایا گیا تھا''[2]۔

ایک مہینہ کے بعد ۷ر اکتوبر کو لکھتے ہیں ''یہاں ہر روز ایک نیا شگوفہ کھلتا ہے، سید علی نکل چکے اور لوگ نکلے جاتے ہیں، میرا بھی نفس بازپسیں ہے''[3]۔

۱۰ر اکتوبر ۱۹۰۱ء کو اپنے مخلص عزیز سمیع صاحب کو لکھتے ہیں ''یہاں کے حالات غالباً تم نے اخباروں میں پڑھے ہوں گے مختصر یہ کہ دنیا ادھر کی اُدھر ہوگئی، مولوی سید علی صاحب وغیرہ نکلے اور بقیہ نکلتے جاتے ہیں، میں بھی دو چار روز کا مہمان ہوں''[4]۔

بہر حال یہ دو چار روز دو چار برس ہو گئے، سررشتہ علوم و فنون کی ضرورت یا عدم ضرورت کے فیصلے کے لیے ایک کمیشن بٹھایا گیا[5] اور اس کے فیصلہ تک یہ منصب بحال رہا۔

ایک نظم اسی زمانہ میں مولانا نے حیدر آباد کو خطاب کر کے ایک نظم لکھنی شروع کی، جس میں اس کے موجودہ خلفشار اور انقلاب کے اشارے بھی تھے، یہ نظم غالباً ضائع ہوگئی لیکن اس کے چند شعر مکاتیب میں مولانا شروانی کے ایک خط میں ہیں[6]، مطلع تھا:

اے دکن! اے کہ بہارِ چمنِ جاں از تست

اس کے بعد کے شعر ہیں:

چوں تواند کہ ز ہر پردہ برآرد صد نقش — گر نہ نیرنگی ایں گنبد گرداں از تست
ہندیاں نیز چو از حلقہ بگوشانِ تواند — ہر چہ زیشاں بود آں نیز کنوں ہاں از تست
ہاں تو دعویٰ کن و مانیز مسلم داریم — شبلیِ سحرفن و داغِ غزل خواں از تست

سررشتہ کا نیا انتظام عام حالات کے لحاظ سے مولانا کا اضطراب بجا تھا، مگر مہاراجہ کشن پرشاد[7] جیسے نیک سرشت اور علم دوست مدار المہام سے اس سررشتہ کی ضرورت چھپی نہ تھی اور نہ مولانا کے جوہر

[1] شروانی، ۲۸ [2] ایضاً، ۲۹ [3] ایضاً، ۳۰ [4] سمیع، ۴۹ [5] ایضاً، ۵۰ [6] شروانی، ۳۱ [7] افسوس کی مہاراجہ نے اسی سال ۱۹۴۰ء میں وفات پائی۔

ایسے قدر شناس سے چھپے رہ سکتے تھے، چنانچہ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے بھی اس ''سررشتہ'' کے کاموں سے دل چسپی لی، اور اس کا انتظام پختہ اصول پر کرنے کی طرف مائل ہوئے، جناب نواب شہاب جنگ مختار الدولہ افتخار الملک بہادر معین المہام سرکارِ عالی اس کے افسر اعلا اور سرپرست اور مولوی سید علی بلگرامی کی جگہ پر قائم مقام معتمد تعمیرات میر کاظم علی صاحب نگراں کار مقرر ہوئے (مقدمہ الکلام) اور تصنیف و تالیف کا کام بدستور جاری رہا۔

قیامِ حیدر آباد کی تصنیفات مولانا شبلی مرحوم حیدر آباد میں کل چار برس رہے، یعنی فروری ۱۹۰۱ء سے فروری ۱۹۰۵ء تک، اس میں بھی ۱۹۰۱ء کے چند مہینے امیدواریوں میں گزر گئے، غالباً جولائی یا اگست ۱۹۰۱ء میں وہ سررشتۂ علوم وفنون کی نظامت پر بحال ہوئے اور فروری ۱۹۰۵ء میں اس سے الگ ہو گئے، اس بنا پر ان کی نظامت سررشتۂ مذکور کی مدت ساڑھے تین برسوں سے زیادہ نہیں اور یہ شب و روز بھی اکثر روزانہ کے انقلابات اور سیاسی مد و جزر کے نذر ہوتے رہے اور اطمینانِ خاطر بہت کم نصیب ہوا، اس پر یہ دیکھ کر سخت تعجب آتا ہے کہ بے اطمینانی کے ان ساڑھے تین برسوں میں انہوں نے ایسی پانچ کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں ہر کتاب مستقل پانچ برس کی محنت، مطالعہ اور مراجعت کی محتاج ہو سکتی ہے، مگر تعجب اس لیے نہیں کہ جو لوگ حقیقی صاحب فکر مصنف ہوتے ہیں، وہ کاغذ کے صفحوں پر اپنے خیالات جب بھی قلم بند کریں، مگر وہ خیالات ان کے دماغوں میں سالہا سال کے مطالعہ، مراجعہ اور محنت کے بعد مخزون ہوتے رہتے ہیں اور موقع ہاتھ آنے کے بعد وہ کاغذ کے صفحوں پر آسانی سے منتقل ہو جاتے ہیں۔

الغزالی سررشتہ میں مولانا کی سب سے پہلی کتاب الغزالی تصنیف ہوئی جو ۲۲ فروری ۱۹۰۲ء تک ختم ہو کر مطبع جا چکی تھی، جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ چند مہینوں میں ترتیب پائی، آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ اس کتاب کا خیال ان کے دماغ میں کتنے دنوں تک پک رہا تھا، گزر چکا ہے کہ ۱۸۹۳ء میں جب وہ الفاروق کی تصنیف کے لیے تیار ہو رہے تھے، تو سرسید نے الفاروق کے بہ جائے الغزالی لکھنے کی فرمائش ان سے کی، الفاروق سے فرصت پانے کے بعد ان کا خیال امام غزالی کے سوانح اور فلسفہ و کلام کی طرف کلیۃً منتقل ہوا، ان کی کتابیں دیکھتے، ان کا فلسفہ سمجھتے اور ان کے خیالات کو ترتیب دیتے رہے، یہی سبب ہے کہ حیدر آباد میں ان کی تقریر سننے کے لیے جو پہلا اجتماع ہوا، اس میں انہوں نے علم کلام ہی پر تقریر فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت یہی خیالات و معلومات ان کے دل و دماغ پر چھائے تھے،

اس لیے سب سے پہلے اس کی طرف توجہ فرمائی۔

۱۰ر جولائی ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو تصنیف کے چند موضوعوں سے ایک موضوع امام غزالی کی لائف بتاتے ہیں، لکھتے ہیں "امام غزالی کی لائف جس میں علم کلام پر پورا ریویو ہوتا کیوں کہ موجودہ علم کلام کے موجد وہی ہیں۔" (شروانی-۱۲)

پھر ۱۶ر جولائی کو انہیں لکھتے ہیں "امام غزالی کی لائف کا پہلا حصہ گو تفحص طلب ہے لیکن آپ اس کو بخوبی انجام دیں گے، میں تمام مآخذ عرض کروں گا لیکن اصل چیز ان کی کتاب تہافت الفلاسفہ کا ریویو ہے جس پر ابن رشد نے رد لکھا ہے، میں نے فلسفہ بڑی محنت اور تدقیق سے پڑھا اور مدتوں اس میں منہمک رہا، (علی گڑھ آنے سے پہلے) باوجود اس کے میری سمجھ میں وہ کتاب نہیں آئی، مولوی فاروق صاحب سے پڑھنا چاہا، وہ بھی کترا گئے، میں نے چند دفعہ الغزالی کے کئی کئی صفحے لکھ کر اسی خیال سے چھوڑ دیے کہ ان کتابوں پر ریویو نہ ہو سکا تو کیا فائدہ، اس کے علاوہ پورے علم کلام کی تاریخ اور اس پر ریویو لکھنا پڑے گا، اس کے سامان کے لیے میں مصر سے کتابیں نقل کرانا چاہتا ہوں، اس کا بھی ابھی سامان نہیں، فارسی کے لیے میں ابھی سے تیار ہوں۔"

اس کے بعد ۲۶ر جولائی ۱۸۹۹ء کو سہ بارہ ان ہی کو لکھتے ہیں "امام غزالی کی علمی حالت سنئے، فقہ شافعیہ کی علمی تدوین و ترتیب کی بنیاد امام الحرمین نے ڈالی، پھر امام غزالی نے تین کتابیں وسیط، بسیط وجیز لکھیں، ان کے بعد ان کتابوں کی بے انتہا شرحیں لکھی گئیں اور بعد کی تمام تصنیفات ان ہی سے ماخوذ ہیں اور ان ہی کی تغیر شدہ شکلیں ہیں، اصول فقہ میں نئے طریقہ کی سب سے پہلی کتاب امام صاحب نے لکھی جس کا نام منخول ہے اور جو مدتوں میرے مطالعہ میں رہی ہے، یہ نہایت زور کی کتاب ہے اور بہ خلاف امام کی اور تصانیف کے عبارت اس کی دقیق ہے، اصول میں اور بھی ان کی کتابیں ہیں مرنے سے ایک برس پہلے اسی فن میں ایک کتاب مستصفی لکھی جو میری نظر سے گزر چکی ہے، تصوف میں بے شمار کتابیں ہیں جن کا استقصا بھی مشکل ہے، علم کلام کے وہ بخیال خود موجد ہیں اور اس میں ان کی بہت سی تصنیفیں ہیں، ان کے بعد شیخ الاشراق نے فلسفۂ اشراقی کے نام سے کتابیں لکھیں، ان میں حکمۃ الاشراق سب سے عمدہ ہے جو میرے مطالعہ میں بہت رہی ہے اور ان کے بعد امام رازی نے مطالب عالیہ نہایت العقول اربعین مباحث مشرقیہ لکھیں، یہ سب کتابیں ضخیم ہیں اور بہ جز دو کے سب میری نظر سے گزری ہیں، امام غزالی نے

فلسفہ ومنطق کو بھی صاف کرکے لکھا، اس میں ان کی یہ کتابیں ہیں، محک النظر، مقاصد الفلاسفہ، منتخل وغیرہ۔

عیسائیوں کے رد اور انجیل کی تحریف میں بھی ایک کتاب لکھی ہے، جس کو میں دیکھ چکا ہوں، یہ کتابیں جب تک مہیا نہ ہوں اور جب تک ان پر بلکہ اصل علوم پر ریویو نہ کیا جائے، ان کی لائف لکھنی بے کار ہے، ریویو کے لیے اصل فن پر احاطہ کرنا پڑتا ہے، گو لکھا کم جاتا ہے، مگر وہ بہت وسعتِ نظر اور خوض وفکر کا نتیجہ ہوتا ہے، ایک بات یہ ہے کہ فلسفۂ شرعیہ کے بہت سے مسائل کی نسبت ان کا طرز تحریر یہ ہے کہ وہ مسائل ان کی ایجاد ہیں، حالاں کہ متعدد تحقیقات کو میں نے بوعلی سینا کی کتاب میں پایا، اس لیے ان کے کہنے پر اکتفا نہیں ہوسکتا، بلکہ ہر جگہ سے پتہ لگانا پڑے گا، ان مشکلات کو خیال کرکے قلم اٹھایئے، میں بہت کچھ اس کے لیے تیار ہو چکا ہوں، تاہم ہمت نہیں پڑتی، بیسیوں صفحے لکھ کر چھوڑ دیے ہیں، امام صاحب کی جن تصنیفات کا میں نے نام لکھا ہے، گو اکثر میری نظر سے گزری ہیں لیکن نہایت نایاب ہیں اور مشکل سے بہم پہنچیں گی، مستعار ملنا بھی مشکل ہے۔

خطوط کے ان اقتباسات سے ظاہر ہوگا کہ ان دنوں ان کے غور وفکر کا سب سے بڑا موضوع یہی تھا، حیدرآباد پہنچ کر اس سلسلہ میں ان کو بعض نئی کتابیں ملیں جن میں ایک فرنچ اور دوسری جرمن مصنف کی تھی، جن کا حوالہ انہوں نے الغزالی کے دیباچہ میں دیا ہے اور جو غالباً مولوی سید علی بلگرامی کے کتب خانہ میں دیکھی ہوں گی، بہرحال یہ کتاب ۲۲ر فروری ۱۹۰۲ء کو منشی محمد رحمت اللہ صاحب رعد کے مطبع نامی کان پور میں چھپنے کو جاچکی تھی، (حمید-۱۶) اور اگست ۱۹۰۲ء میں یہ چھپ کر شائع ہوئی، اس کا یہ پہلا اڈیشن بہت آب وتاب سے چھپا اور ہاتھوں ہاتھ لیا اور پڑھا گیا۔

علم الکلام | الغزالی کے بعد علم الکلام کا نمبر آیا، علم کلام کی تاریخ کا ابتدائی خاکہ بھی علی گڑھ کے قیام ہی کے زمانہ میں اس وقت ان کے سامنے آیا تھا، جب ۱۸۹۵ء میں تہذیب الاخلاق میں "المعتزلہ والاعتزال" کے نام سے مضمون لکھا تھا، اس کے بعد بھی وہ اس پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے، چنانچہ ۸ر فروری ۱۸۹۹ء کو شروانی صاحب کو لکھتے ہیں: "میں نے علم کلام پر لکھنا شروع کردیا ہے، اس فن کی کتابیں دور دور سے آرہی ہیں۔"

۱۸ر مارچ ۱۹۰۲ء کو وہ ختم ہورہی تھی (مہدی-۱۰) اور اس وقت خیال یہ تھا کہ علم الکلام اور الکلام دونوں حصے ایک ساتھ چھپیں گے اور اسی لپیٹ میں دونوں حصے ایک ساتھ زیر تالیف تھے اور کس بے اطمینانی میں اس کا اندازہ حسب ذیل فقروں سے کیجیے، جو ۱۸ر مارچ[1] ۱۹۰۲ء کو لکھے گئے ہیں، میں

[1] مکاتیب میں اس خط کی تاریخ ۱۹۰۱ء غلط چھپی ہے۔

الغزالی لکھ چکا اور مطبع میں جا چکی، علم کلام کی تاریخ بھی ختم ہو چکی، اب جدید علم کلام پر لکھ رہا ہوں، یہ دونوں حصے ساتھ چھپیں گے، اگر یہاں اطمینان سے رہنا پیش آتا تو بڑے بڑے کام انجام پاتے لیکن ہر وقت رکاب میں پاؤں ہے، جو گھڑی ٹلتی جاتی ہے، اسی پر حیرت ہے، مولوی سید علی پرسوں میرے پاس تشریف لائے تھے، ۲۲ / مارچ کو ولایت جاتے ہیں، ع

دوستاں رفتند و من ہم میروم (مہدی-۱۰)

مولانا علم الکلام کی تکمیل کے وقت بیمار ہو گئے تھے، بخار اور لرزہ میں مبتلا[1] تھے، ضعف خاصہ ہو گیا تھا، فرماتے تھے کہ فرش پر پڑا پڑا تکیہ کے سہارے ذرا سا سر اٹھا کر لکھا کرتا تھا، اسی حال میں علم الکلام کو فروری ۱۹۰۲ء میں جس طرح بنا تمام کیا (حمید-۱۶) اور اسی لیے اس کتاب میں بہت سی کمیاں رہ گئیں، مثلاً فرماتے تھے کہ "اس میں ماتریدیہ یعنی حنفی علم کلام کا حصہ بہت ہی مختصر ہے، اس کو جی کھول کر بڑھا نہ سکے، کیوں کہ ماتریدیہ کی تصنیفات بہت کم ہیں، اس لیے اس پر تفصیل سے لکھنا بڑی محنت کا کام تھا، غالباً ان کے ایک مکتوب کا یہ فقرہ اسی تفصیل کا اجمال ہو، میں نے علم کلام نہایت ناتمام کتاب لکھی اور وہ درحقیقت میری تصنیفات کا سب سے ناقص حصہ ہے۔" (حمید-۱۷)

بہرحال وہ کتاب ۲۱ / اپریل ۱۹۰۲ء کو صوفی محمد علی کے پریس مفید عام آگرہ میں چھپنے کے لیے بھیجی گئی، چنانچہ اسی تاریخ کو نواب وقار الملک کو لکھتے ہیں، "الغزالی کان پور چھپ رہی ہے، افسوس ہے کہ منشی رحمۃ اللہ رعد دو دن کا کام برسوں میں کرتے ہیں، چھ مہینے ہو چکے ابھی تک ۱۲۷ صفحے لکھے گئے ہیں، اسی وجہ سے میں نے اپنی ایک تازہ تصنیف یعنی علم کلام کی تاریخ آگرہ چھپنے کے لیے آج روانہ کی ہے، یہ انشاء اللہ جلد چھپ جائے گی، جدید علم کلام زیر تصنیف ہے، (مکاتیب اول بہ نام وقار الملک)

۱۱ / مئی ۱۹۰۲ء[2] کو مہدی مرحوم کے نام لکھتے ہیں "تاریخ علم کلام آگرہ چھپنے کے لیے جا چکی، رعد غزالی ہی سے عہدہ برآ نہ ہو سکے، اسی لیے دوسری طرف رُخ کرنا پڑا۔" (مہدی-۱۳)

مارچ ۱۹۰۳ء سے کچھ پہلے یہ چھپ کر شائع ہوئی۔ (حمید-۱۷)

---

[1] مولانا کی علالت اس وقت اور اس کے بعد بھی جاری رہی، دیکھیے، شروانی ۳۷، مورخہ ۱۴ / مارچ ۱۹۰۲ء اور مہدی، ۱۳، مورخہ ۱۱ / مئی ۱۹۰۲ء مکاتیب میں اس کی تاریخ ۱۹۰۵ء غلط چھپی ہے۔ [2] مکاتیب شبلی میں ۱۹۰۵ء لکھ گیا ہے، جو قطعاً غلط ہے، ۱۹۰۲ء ہونا چاہیے۔

الکلام | علم کلام کی تاریخ کے بعد الکلام یعنی جدید علم کلام کی باری آئی وہ ۱۹۰۲ء میں اس کتاب کے کچھ ابواب لکھ رہے تھے اور اس وقت یہ خیال تھا کہ یہ دونوں حصے علم الکلام اور الکلام ساتھ چھپیں گے، (مہدی-۱۰۰) لیکن علم الکلام کے علاحدہ مستقل چھاپے جانے کے فیصلہ کے بعد پہلے علم الکلام پوری کر دی اور اس کے بعد الکلام کو پورا کرنا شروع کیا، جدید علم کلام پر لکھنے کے لیے ان کو انگریزی کتابوں کے فلسفیانہ معلومات کی ضرورت پیش آئی، مگر یہ مددان کو حسب توقع نہ مل سکی، اس پر اپنے عزیز شاگرد مولانا حمید الدین صاحب بی، اے کو جو فلسفۂ جدید میں پروفیسر آرنلڈ کے ممتاز شاگرد تھے، ۲۲ر فروری ۱۹۰۲ء کو لکھتے ہیں ''الغزالی ختم ہو کر مطبع میں جا چکی، شاید سیرۃ النعمان کے لگ بھگ ہو جائے، علم کلام کی تاریخ لکھ رہا ہوں، وہ بھی قریب الختم ہے، اب کلام جدید کا مرحلہ ہے، کوئی انگریزی داں دوست ہوتا تو بڑا کام نکلتا جو حکمائے یورپ روح و واجب الوجود کے قائل ہیں، ان کے دلائل سے کتاب کی بہت رونق ہوتی، تم سے زیادہ کون اس مصرف کا تھا، انگریزی داں تھے، عربی داں تھے، عزیز تھے لیکن ان سب کچھ ہونے کے ساتھ بھی کچھ نہیں، بہتیرا کہا کہ یورپ کے فلسفہ کا ہلکا سا ڈھانچا ہی کھڑا کر دو تو بہت بصیرت ہو، تم کو کس کی پروا ہے، حالاں کہ جو حصہ لکھ رہا ہوں، اس میں مدد دینا ایک مذہبی اور قومی کام ہے۔ (حمید-۱۶)

اسی حالت میں مصر کے ایک نئے تعلیم یافتہ فرید وجدی کے رسائل ''الاسلام فی عصر العلم'' مصنف کے بہت کام آئے اور انہوں نے ان سے فائدہ اٹھایا، جدید کلام کا مرحلہ دشوار گزار تھا، اس لیے قدیم طرز کے کسی سنجیدہ بزرگ سے بھی اس میں مشورہ مناسب تھا، چنانچہ اس کام کے لیے ان کی نظر مولانا شروانی پر پڑی، چنانچہ ۱۴ر مارچ ۱۹۰۲ء کو انہوں نے ان کو لکھا، ہاں ایک بڑا ضروری امر یہ ہے کہ علم کلام کا خاص حصہ لکھ رہا ہوں، آپ کے پاس بھیجوں گا (اور اس شاگردی کی نسبت میں نے آج تک کسی کے ساتھ گوارا نہیں کی) آپ دیکھ کر بتایئے گا کہ کون سا حصہ رکھنے کے قابل ہے، کون سا نہیں لیکن اس وقت دریافت طلب امر یہ ہے کہ عقائد کے مسائل ہیں کیا توحید لکھ چکا ہوں، نبوت لکھ رہا ہوں، اس کے بعد صرف معادرہ جاتا ہے، باقی کیا لکھوں کتب کلام میں جو عقائد لکھے ہیں وہ درحقیقت عقائد میں داخل نہیں، مثلاً حدوث عالم، صفات باری، لاعین، لاغیر ہونا، وغیرہ وغیرہ، اس لیے درخواست ہے کہ آپ کے نزدیک جو مسائل عقائد ضروری البحث ہوں، ان کے عنوان لکھ بھیجئے۔'' (شروانی-۳۷)

مجھے معلوم نہیں کہ مولانا شروانی نے ان کو جواب میں کیا لکھا، مگر الکلام میں بقیہ عقائد کا عنوان قائم کر کے ان عقائد کو گنا دیا ہے، جن کو مناظرانہ علم کلام نے پیدا کیا ہے اور جن کی اصل کتاب وسنت میں نہیں اور اس کے بعد روحانیات یا غیر محسوسات کا عنوان قائم کر کے ان بقیہ عقائد کو لکھا ہے جن کی تصریح کتاب وسنت میں موجود ہے، مگر مصنف کے خیال میں ان کی کیفیت قرآن پاک میں مذکور نہیں، اس لیے ان کی تشریح مختلف اسلامی فرقوں نے مختلف طریقوں سے کی ہے اور اس سلسلہ میں اجمالاً ملائکہ، وحی اور واقعات قیامت پر امام غزالی، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ صاحب وغیرہ کے اقتباسات درج کیے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا یہ باب بے حد مختصر، مبہم اور نا تمام ہے۔

۲۱ر اپریل ۱۹۰۲ء میں یہ کتاب زیر تصنیف تھی (وقار الملک) بلکہ ایک سال کے بعد ۹ر مارچ ۱۹۰۳ء میں بھی وہ نا تمام تھی، البتہ اس کا بہت حصہ لکھا جا چکا تھا اور جو لکھا جا چکا تھا اس سے مولانا خوش تھے، (حمید-۱۷) بہر حال اسی سال کتاب تمام ہوئی اور ۱۹۰۴ء میں منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع نامی سے چھپ کر شائع ہوئی۔

سوانح مولانائے روم مولانا کی طبیعت کو تصوف سے کبھی لگاؤ نہ تھا، اس لیے بہ ظاہر تعجب ہوتا ہے کہ وہ مولانائے روم کے گرویدہ کس طرح ہوئے، مولانا کے ایک محرم اسرار نے جنھوں نے ان کی سوانح مولانائے روم پر تبصرہ لکھا ہے، اس راز سے اس طرح پردہ اٹھایا ہے، علامہ کی حقیقت پسند طبیعت نے ابتداءً وہ میدان انتخاب کیا جو حقایق و واقعات کا غالباً دنیا میں سب سے بڑا ذخیرہ ہے، یعنی مسلمانوں کی تاریخ اس انتخاب کے نتائج وہ گوہر شاہوار ہیں جو الفاروق، سیرۃ النعمان اور المامون وغیرہ کے نام سے آویزۂ گوش روزگار ہوئے، اس کے بعد انہوں نے علم کلام کی طرف توجہ کی، الغزالی، الکلام، علم الکلام، اس کاوش کے جوہر ہیں، اس وقت تک ان کی تصانیف میں ظاہری پہلو غالب تھا، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ الفاروق میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دینی زندگانی اس اہتمام سے نہیں لکھی گئی جس کے وہ مستحق تھے، سلسلہ میں سلسلہ پیدا ہوتا ہے، امام غزالی کی زندگی کا آغاز ظاہری طمطراق یعنی مناظرہ اور مباحثہ سے معمور تھا، انجام باطنی عظمت و تجمل پر ہوا، یعنی معرفت اور تصوف پر، یہی واقعہ ان کے سوانح نگار کو پیش آیا، علامہ شبلی نے جب الغزالی کی تالیف شروع کی تو وہ تصوف سے اس قدر بے گانہ تھے کہ امام غزالی کی زندگانی کا یہ مہتم بالشان پہلو بالکل ان کی نظر سے مخفی تھا، ایک دوست کی توجہ دلانے سے

انہوں نے امام ممدوح کی صوفیت کا مطالعہ کر کے ایک باب ''الغزالی'' میں اضافہ کیا، مبارک تھا وہ وقت جب ان کی توجہ تصوف، کی طرف مائل ہوئی، کیوں کہ اسی توجہ کا بیش بہا نتیجہ وہ تصنیف ہے جس پر ہم یہ تبصرہ لکھ رہے ہیں، امید ہے کہ آئندہ اس سے بھی بڑھ کر نتائج پیدا ہوں گے۔

مثنوی شریف کو ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے پڑھا ہوگا، اس کی بیسیوں شرحیں لکھی گئیں، بہت سے خلاصے ہوئے لیکن (جہاں تک معلوم ہے) صرف ایک تصوف کی کتاب کی حیثیت سے یہ دقیقہ سنجی علامہ شبلی کی نظر کے واسطے ودیعت تھی، کہ مثنوی معنوی علم کلام کا بھی بہترین مجموعہ ہے۔

مولانا شروانی کی یہ عبارت ان کی تقریظ بر سوانح مولانا روم سے لی گئی ہے، جو الندوہ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں چھپی ہے، اس سے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ تبصرہ نگار کے اس حسن تلاش کو مصنف نے بھی تسلیم کر لیا تھا اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح عقلیات کی تلاش نے مولانا کو امام غزالی کی درسگاہ تک پہنچایا، امام غزالی کی تلاش ان کو مولانا روم کے آستانہ تک لے آئی، خود الغزالی میں بھی اس دریافت کا ایک حوالہ موجود ہے، یعنی تصوف کی حقیقت کے اظہار میں امام غزالی کے بعد مثنوی کے چند اشعار کا حوالہ آتا ہے۔

میرے خیال میں ان کے اس موضوع کے انتخاب میں حیدر آباد کے مقامی ذوق کو بھی تعلق ہے، حیدر آباد کے رگ و پے میں تصوف اور وحدۃ الوجود کے مسائل سرایت کیے ہوئے ہیں۔

بہرحال ۱۹۰۴ء میں انہوں نے مثنوی پر تقریظ لکھنی شروع کی، ۱۸ر فروری ۱۹۰۴ء کو مولوی حمید الدین صاحب مرحوم کو لکھتے ہیں ''تم نے ایک زمانہ میں مجھ سے کہا تھا کہ تم نے مثنوی مولانا روم غور سے پڑھی اور ان کے اصول اور پرنسپلز متعین کیے، اگر خیال میں ہوں تو لکھ بھیجو۔ (حمید-۲۵)

۲۱ر اپریل ۱۹۰۴ء[1] کو نواب سید علی حسن خاں کو لکھتے ہیں (۵) ''میں آج کل مثنوی مولوی روم پر ایک بڑا مفصل ریویو لکھ رہا ہوں، مع سوانح عمری مولانا روم''۔

۲ر مئی ۱۹۰۴ء کے خط بہ نام مہدی حسن میں ہے (۱۲) ''میں مثنوی روم پر تقریظ لکھ رہا ہوں، ایک نئی کتاب ہوگی''۔

---

[1] غلطی سے مکاتیب میں ۱۹۰۲ء چھپا ہے، جو صریحاً غلط ہے، کیوں کہ اس میں انجمن ترقی اردو کا ذکر ہے، جو ۱۹۰۳ء میں اور الندوہ کا اشارہ ہے، جو ۱۹۰۴ء میں نکلا، ۱۲۔

الکلام کے شروع میں معتمد سررشتہ کی طرف سے جو دیباچہ ہے، اس میں اعلان ہے کہ "الکلام اس سلسلہ آصفیہ کی نویں جلد ہے اور دسویں موازنہ دبیر وانیس اور گیارہویں سوانح عمری مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ" مگر اشاعت کی ترتیب الٹ گئی، یعنی سوانح عمری مولانا روم پہلے اور موازنہ بعد کو چھپی۔

سوانح مولوی روم اسی سال یعنی ۱۹۰۴ء میں ختم ہوکر منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع میں چھپنے کو بھیجی گئی، ۲۲؍ نومبر ۱۹۰۵ء کو لکھتے ہیں" تقریظ مثنوی کمبخت رعد کے قبضۂ غصب میں ہے، دو برس ہو چکے۔" (مہدی-۱۴)

ابھی یہ کتاب مطبع ہی میں تھی کہ مولانا ۱۹۰۵ء کے شروع میں حیدرآباد چھوڑ کر ندوہ کی خدمت کے لیے لکھنؤ آگئے، چنانچہ یہیں کے قیام کے زمانہ میں اگست ۱۹۰۶ء میں وہ چھپ کر آئی۔ (حمید-۳۴) چار قسم کے کاغذوں پر چھپی تھی، قیمت درجہ خاص مجلد ۳؍ روپے، درجہ اول ایک روپیہ چار آنہ، درجہ دوم ۱۴؍ آنے، درجہ سوم ۱۰؍ آنے، یہ کتاب بہت مقبول ہوئی، یہ اپنی آنکھوں کا مشاہدہ ہے کہ ہر روز اس کی طلب کے بیسیوں خطوط آتے اور کتاب اطرافِ ملک میں بھیجی جاتی۔

حیدرآباد کی ادبی دلچسپیاں مصنف کا قلم لگاتار تین چار برس فلسفہ وکلام کی پیچ در پیچ کوچہ گردیوں سے گھبرا کر خالص ادبیات کے سرسبز وشاداب میدان کا طالب ہوا اور مثنوی مولانائے روم کی شاعری سے کسی دوسرے شاعرانہ موضوع کی طرف نکل آنے سے تصنیفی ارتقا کا حلقۂ اتصال بھی قائم رہا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس حلقۂ اتصال کے پانے میں حیدرآباد کی سرزمین کو بھی ایک گہرا تعلق ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب حضرت داغ کے وجود سے ع "حیدرآباد آج کل گلزار ہے" ملک میں داغ اور امیر کی مقابلانہ شاعری، اہل نظر کی گفتگو اور بحث کا مستقل موضوع بنی ہوئی تھی، مولانا مرحوم داغ کے طرف دار اور مداح تھے، داغ کے سیکڑوں اچھے شعر ان کی زبان پر تھے، داغ سے ملتے بھی رہتے تھے اور ان کے بعض تذکرے بھی فرماتے تھے، حیدرآباد میں ۱۹۰۱ء میں دکن کو خطاب کرکے جو فارسی نظم لکھی تھی، اس میں بھی داغ کو پوری عزت کے ساتھ اپنے پہلو میں جگہ دی ہے:

ہاں تو دعویٰ کن و ما نیز مسلم داریم ۔۔۔ شبلی سحرفن وداغِ غزل خواں از تست

حیدرآباد میں ان کا حلقۂ ادب اکتوبر ۱۹۰۱ء میں اپنے ایک خوش مذاق عزیز (سمیع مرحوم) کو حیدرآباد کی دعوت دیتے ہیں، ان کی ترغیب کے لیے لکھتے ہیں،" داغ، شرر، سید علی بلگرامی، سید حسین یادگارانِ زمانہ کو دیکھنا چاہو گے، تو سب ہی موجود ہیں۔" (سمیع-۴۹)

ان چند ممتاز اصحاب کے علاوہ حیدرآباد میں مولانا کا ایک خاص حلقۂ احباب تھا، جن میں سے بعضوں کے نام معلوم ہیں، جیسے مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم جنہوں نے بہت سے ادبی و تاریخی مضامین اور سیرۃ محمود گاواں اور وکرم اروسی لکھی ہے، مولوی سید عبدالغنی صاحب وارثی (استھانوی بہاری) جو عربی و انگریزی دونوں کے عالم تھے اور بوزاسف وبلوہر طبقاتِ شعرانی اور تاریخ اندلس وغیرہ کے ترجمے کیے، نواب ضیا یار جنگ بہادر مفتی عدالت عالیہ، موصوف درسیات کے فاضل اور فارسی میں شاعری کا مذاق رکھتے ہیں اور اب تک مشق سخن جاری ہے، ان کے علی گڑھ کے بعض خوش مذاق شاگرد جیسے مولوی مسعود علی صاحب محوی، مولوی ظفر علی خاں، مولوی سید محفوظ علی بدایونی، مولوی عبدالحق صاحب وغیرہ۔

یہ لوگ اکثر جمع ہوتے، ادبی دل چسپیاں رہتیں، شعر و شاعری کے تذکرے رہتے، اچھے اچھے اشعار پڑھے جاتے اور سنے جاتے، مولوی عبدالحق صاحب، مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کے حال میں لکھتے ہیں "چنانچہ ایک روز مولانا شبلی، مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی ظفر علی خاں (سید علی) مرحوم کے یہاں مدعو تھے، بارہ بجے کھانا کھانے کے بعد سے چار بجے تک مولوی شبلی مختلف اساتذہ کے اشعار سناتے رہے، جس سے سامعین بہت محظوظ ہوئے۔ (چند ہم عصر ص ۷۹)

نواب ضیا یار جنگ بہادر خود مجھ سے مولانا شبلی کی ادبی اور شاعرانہ صحبتوں کا ذکر فرماتے تھے، مولوی شیخ غلام قادر گرامی، مرحوم جنہوں نے ۱۹۲۳ء میں وفات پائی، فارسی کے مشہور شاعر تھے، وطن جالندھر تھا، مگر حیدرآباد میں رہتے تھے، آخر عمر میں جب وہ وطن چلے آئے تھے مجھ سے مولانا مرحوم کی صحبتوں کا تذکرہ فرماتے تھے۔

یہ صحبتیں کبھی رنگین بھی ہو جاتی تھیں، اسی قسم کی ایک رنگین صحبت میں مولانا نے وہ اردو غزل کہی تھی جس کا مقطع ہے ؎ کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلیؔ، مزہ ہے طرزِ علی حزیںؔ کا

انیس و دبیر | ان ادبی محفلوں میں جس طرح داغؔ و امیرؔ کے مقابلے ہوتے رہتے تھے، میر انیس اور مرزا دبیر کے باہمی مقابلہ کی گفتگوئیں بھی ہوا کرتی تھیں، مولانا میر انیس کے مداح اور ان کے محاسنِ کلام کے دلدادہ تھے اور یوں بھی اقلیم سخن کے ان دونوں تاج داروں کے مقبوضات اور مفتوحات کی وسعت اور ہمہ گیری کی داستان سے ملک کی ساری ادبی محفلوں میں ہنگامہ برپا تھا، مولانا نے موازنہ کے مقدمہ میں اس تصنیف کی تقریب ان لفظوں میں کی ہے، "مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی

ممتاز شاعری کے کلام پر تقریظ وتنقید لکھی جائے، جس سے اندازہ ہوسکے کہ اردو شاعری باوجود کم مائگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے، اس غرض کے لیے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لیے موزوں نہیں ہوسکتا تھا، کیوں کہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے، شکر ہے کہ آج اس ارادہ کے پورے ہونے کی نوبت آئی اور یہ کتاب ناظرین کی خدمت میں پیش کش ہے، اس کتاب میں میر انیس کا موازنہ بھی مرزا دبیر سے کیا گیا ہے اور اس مناسبت سے اس کا نام ''موازنہ'' ہے۔

اصل یہ ہے کہ عربی زبان میں دو مقابل شعرا کے درمیان اس قسم کا موازنہ مشہور ومعروف ہے، اس قسم کی ایک مشہور کتاب حسن بن یحییٰ آمدی المتوفی ۳۰۰ھ کی کتاب ''الموازنہ بین ابی تمام والبحتری'' ہے، جس میں آمدی نے ان دونوں ممتاز شاعروں کے کلاموں کا موازنہ کیا ہے اور دونوں کے کلاموں کے عیب وہنر کو ظاہر کیا ہے، یہ کتاب ۱۲۸۷ھ میں مطبع الجوائب قسطنطنیہ میں سب سے پہلی دفعہ چھپی تھی۔

مولانا کے خطوط میں ان کی تصنیفات کے موضوع، تصنیف سے سالہا سال پہلے بیان اور تذکرہ میں آتے رہتے ہیں اور اس کے بعد جا کر وہ کتاب تالیف پاتی ہے، مگر موازنہ کی نسبت اس قسم کا کوئی سابق تذکرہ ان کے خطوں میں نہیں ملتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ وتنقید لکھنے کا خیال خواہ پرانا ہو، مگر میر انیس ودبیر کے موازنہ کا خیال بہت پرانا نہ تھا، اس موضوع کا ذکر سب سے پہلے نومبر ۱۹۰۱ء کے ایک خط میں آتا ہے، ''میں نے میر انیس کے کلام پر ایک مفصل ریویو لکھا ہے، جو ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوگا۔'' (سمیع-۵۲)

۴؍ مئی ۱۹۰۴ء کو لکھتے ہیں'' دبیر وانیس پر محاکمہ مدت ہوئی تیار ہے لیکن یہاں کچھ ایسی الجھنوں میں پڑ کر اب تک مطبع میں نہیں گیا، شاید عنقریب نوبت آئے، قریباً ۳۰۰ صفحے ہوگئے ہیں'' (مہدی-۱۲) اسی خط میں آگے چل کر ''مثنوی مولوی روم پر تقریظ'' لکھے جانے کی بھی اطلاع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ موازنہ، سوانح مولانا روم سے پہلے ہی لکھی جاچکی تھی، مگر اس کے چھپنے کی نوبت پیچھے آئی، ۲۷؍ نومبر ۱۹۰۴ء کو مولوی سید ابوالکمال صاحب دسنوی کے جواب میں لکھتے ہیں، ''موازنہ انیس ودبیر ابھی مطبع میں نہیں گئی۔'' (ابوالکمال-۱)

اس کے بعد مولانا ۱۹۰۵ء کے شروع میں حیدر آباد سے لکھنؤ چلے آئے اور کام چھڑ گئے، شعر العجم

میں بھی ہاتھ لگ گیا، مگر موازنہ کا مسودہ معتمد تعمیرات کے ملبہ میں دبا رہا، نہ وہ چھپواتے تھے اور نہ دیتے تھے، چنانچہ ۱۹۰۶ء میں مولانا نے دوبارہ اس کو مرتب کرنا شروع کیا، مارچ ۱۹۰۶ء میں لکھتے ہیں ''تقریظ مثنوی چھپ گئی ہے، البتہ موازنہ مدتوں کے لیے رک گیا، مسودات پھر سے مرتب کرنا ہے اور سر دست اس قدر فرصت نہیں، مبیضہ حیدرآباد میں ہے اور وہاں سے ملنے کی امید نہیں'' (مہدی - ۱۹) بالآخر ستمبر ۱۹۰۶ء میں اس کے کچھ اجزا درست ہو کر صوفی محمد علی کے مطبع مفید عام آگرہ میں چھپنے کے لیے دے دیے گئے، ۱۵؍ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ایک دوست کو اطلاع دیتے ہیں ''موازنہ انیس نہایت عمدہ چھپ رہا ہے، مسودات کی ترتیب نے شعر العجم میں ہرج ڈال دیا ہے، چار مہینے سے کچھ نہیں لکھا گیا'' (مہدی - ۲۷) ان چار مہینوں کی تحدید سے معلوم ہوا کہ جون یا جولائی ۱۹۰۶ء سے موازنہ کی دوبارہ ترتیب شروع ہوئی اور اکتوبر ۱۹۰۶ء میں وہ جا کر تمام ہوئی، ۵؍ نومبر ۱۹۰۶ء کو وہ شروانی صاحب کو لکھتے ہیں ''موازنہ سے بہمہ وجوہ نجات ملی اب جس قدر وقت ملے گا، شعر العجم پر صرف ہوگا۔'' (شروانی - ۵۶)

اسی زمانہ میں مولانا نے مولانا حالی کو سوانح مولانا روم کا ایک نسخہ ہدیہ بھیجا تھا اور خط میں موازنہ کے چھپنے کی اطلاع دی تھی، مولانا حالی مرحوم نے ۵؍ نومبر ۱۹۰۶ء کو اپنے گرامی نامہ[۱] میں موازنہ کے اس مسودہ کے متعلق جو حیدرآباد میں پڑا تھا یہ ارقام فرمایا: ''موازنہ انیس و دبیر کا مسودہ میں نے میر کاظم علی صاحب معتمد تعمیرات سرکار عالی سے بڑے تقاضوں کے ساتھ حیدرآباد میں منگوا کر دیکھا تھا اور جس رقعہ کے ساتھ ان کے دفتر میں اس کو واپس بھیجا تھا اس میں ان کو بہت غیرت دلائی تھی کہ اب تک اس کے شائع کرنے کا یہاں کسی کو خیال نہیں آیا، یا تو سرکار کی طرف سے آپ اس کو چھپوا دیں یا بعض اشخاص جو اس کے چھاپنے پر آمادہ ہیں، ان کو اجازت دیں اور سب سے بہتر یہ ہے کہ اس مسودہ کو خود مولانا کے پاس بھجوا دیں، کیوں کہ اس میں جا بجا کورے اوراق چھوڑ دیے گئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اس میں کچھ اور اضافہ کرنا منظور ہے، میر کاظم علی صاحب نے بہت دن کے بعد اس کا یہ جواب دیا کہ سرکار سے اس کے چھاپنے کی منظوری لے لی گئی ہے لیکن باوجود اس کے کہ میں اس کے بعد کئی مہینہ تک وہاں ٹھہرا رہا، میرے سامنے اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی، بفرض محال وہاں چھپتا بھی، تو بالکل مسخ ہوتا، آپ نے بہت اچھا کیا کہ یہاں چھپنے کو دے دیا، جب موازنہ بالکل چھپ جائے تو از راہِ عنایت اس کی بھی ایک جلد سکریٹری وکٹوریہ میموریل لائبریری کے نام ضرور بصیغۂ ویلو پے ایبل بھجوا دیجیے گا۔''

---

[۱] مولانا حالی کا خط بہ نام مولانا شبلی، معارف دسمبر ۱۹۱۶ء میں چھپا ہے۔

سررشتہ کی دوسری کتابیں | مولانا کے عہدِ نظامت میں سررشتہ کی طرف سے بعض دوسری کتابوں کے لکھوانے اور چھپوانے کا بھی اہتمام کیا گیا۔

کتاب الآلات | سررشتہ میں قدم رکھنے کے ساتھ مولانا کو کتاب الآلات کے چھپوانے کا خیال آیا، لکھنؤ کے ایک کتب فروش کی دوکان سے کتاب الآلات کا جو نسخہ ستمبر ۱۸۹۹ء کو ہاتھ آیا تھا اور جس کو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے خرید فرمایا تھا، اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے[۱]، یہ کتاب عربی میکانکس پر تھی، مولانا نے جب سررشتہ علوم وفنون کا کام اپنے ہاتھ میں لیا تو مولوی سید علی بلگرامی کے مشورہ سے اس کتاب کو سررشتہ کی طرف سے چھپوانا چاہا، شروانی صاحب کو لکھا، کتاب الآلات علوم وفنون کی طرف سے چھپوانا مقصود ہے، آپ وہ نسخہ بھیج دیجیے، اور اگر اپنے نسخہ منقولہ میں تصویریں بنوائی ہوں تو وہ بھی یہاں بہت اچھی بن سکتی ہیں۔'' (۲۵)

پھر ۲۵؍مئی ۱۹۰۱ء کو لکھا ''کتاب الآلات کی تصاویر کے لیے رعد[۲] کو لکھیے وہ انتظام کر دیں گے''۔ مگر اس کے چند ہی مہینوں کے بعد حیدرآباد کے سیاسی انقلاب کے بعد اس کتاب کے چھپوانے کا خیال جاتا رہا[۳]۔

دکن کی تاریخیں | اس سررشتہ سے مولانا سے پہلے فرنچ سیاح موسیو ٹیوریز کے سفرنامۂ دکن کے دو حصے ۱۸۹۶ء اور ۱۸۹۷ء میں اور تاریخ دکن کے دو حصے ۱۸۹۷ء اور ۱۹۰۰ء میں شایع ہوئے تھے، جن کا ذکر مکاتیب (ج۔۵۰) میں بھی ہے، مولانا کے زمانۂ نظامت میں نظامِ اکبری ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد میں اور تاریخ دکن کی تیسری جلد آگرہ میں ۱۹۰۲ء میں چھپی۔

حیدرآباد کی سیاسی کشمکش اور مولانا کی دل برداشتگی ۱۹۰۲ء-۱۹۰۴ء | حیاتِ شبلی کے جو پچھلے صفحے آپ کی نظر سے گزرے ہیں، ان میں یہ چیز آپ کو ملی ہوگی کہ مولانا نے ہندوستان سے دکن کا رخ کس اضطراب اور گھبراہٹ کے عالم میں کیا تھا یعنی اپنے والد کی وفات کے بعد جن مشکلات سے ان کو دو چار ہونا پڑا اور قرض کا جو بوجھ ان کے سر پر آ کر پڑا، اس نے ان کو پریشان کر دیا اور اسی پریشانی کے عالم میں حیدرآباد چلے آئے، قدر شناسوں نے قدر کی اور ان کے اطمینان کے لیے ایک معقول جگہ کا انتظام کیا، مگر ابھی انتظام پوری طرح ہونے بھی نہیں پایا تھا کہ سیاست کا مرکز بدل گیا اور بے اطمینانی کے اسباب پیدا ہو گئے، اس زمانہ میں انہوں نے چاہا کہ قرض کے بوجھ سے اب بھی کسی طرح سبک دوشی ہو جائے تو

---

[۱] شروانی، ۱۷۔ [۲] منشی رحمت اللہ رعد، مالک مطبع نامی، کان پور، ۱۲۔ [۳] شروانی، ۲۸، ۲۹، ۳۰۔

ملازمت کی زنجیر کو پاؤں سے نکال دیں، ۵؍فروری ۱۹۰۲ء کو اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں، ''میں اچھا ہوں مگر پریشان ہوں، یہاں برسوں میں ایک چیز کا فیصلہ ہوتا ہے، میرے سررشتہ اور دائرۃ المعارف پر ایک کمیشن بیٹھی ہے، اس کی رپورٹ پر فیصلہ ہوگا لیکن میں پہلے ہی یہاں کی سازشوں سے سخت گھبرا گیا ہوں۔

اگر دیہات بک کر قرض ادا ہو جاتا تو میں دو ہزار پر بھی یہاں کی بلکہ کہیں کی ملازمت نہ کرتا، میں نے ندوہ میں رہنے کا عزم جازم کر لیا ہے، دیکھیے یہ آرزو کب پوری ہوتی ہے، مولوی سید علی بلگرامی ۸؍مارچ کو ولایت روانہ ہوں گے۔'' (سمیع۔۵۰)

دسمبر ۱۹۰۲ء میں ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ اپنے ذاتی کتب خانہ کو جو اعظم گڑھ میں ہے، فروخت کر کے قرض کے بوجھ سے سبک دوش ہو جائیں، اس کتب خانہ کا قدرداں ان کے خیال میں ان کے دوستوں میں ایک ہی شخص تھا، اس کو خط لکھا ''ایک راز کی بات کہتا ہوں، اپنے ہی تک رکھیے گا، آپ کو معلوم ہے والد قبلہ نے تیس ہزار قرض چھوڑا تھا، اس میں سے اب چھ ہزار اور رہ گئے ہیں، اس کے بارے میں غربت کی خاک چھانتا پھرتا ہوں اور کس کم بخت کو نوکری کی غرض ہے، میں چاہتا ہوں کہ اپنا کتب خانہ کل فروخت کر ڈالوں...... باقی تین ہزار کا اور کچھ سامان کر لوں گا، اگر یہاں (حیدرآباد میں) استقلال ہو جاتا، تو میں کل سامان کر لیتا، لیکن ہر نفس نفسِ واپسیں ہے۔'' (شروانی۔۴۷)

نواب محسن الملک کی علی گڑھ کے لیے کوشش اور گورنمنٹ سے صفائی ۱۹۰۲ء

اس کشمکش میں نواب محسن الملک نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ کالج میں دوبارہ آ جائیں، اس راہ میں سب سے بڑی مشکل مولانا سے گورنمنٹ کی ناراضی تھی، نواب صاحب ممدوح نے لفٹنٹ گورنر سے مل کر اس کی صفائی کر لی اور اس کی اطلاع مولانا شبلی کو بھی دی، مولانا لکھتے ہیں ''اس ہفتہ میں نواب محسن الملک کا خط آیا ہے، کہ وہ نواب لفٹنٹ گورنر سے ملے اور معلوم ہوا کہ لفٹنٹ صاحب نے میرے متعلق جو گورنمنٹ کو شکوک تھے، رفع کر دیے اور یہ بھی کہا کہ اب ان کو علی گڑھ کالج اگر بلانا چاہے تو بلا سکتا ہے، محسن الملک نے مجھ کو اس اطلاع کے بعد لکھا کہ کالج میں آ جاؤ، وظیفہ حیدرآباد بھی جاری ہو جائے گا اور سو روپیے کالج سے بھی ملیں گے لیکن میں نے منظور نہیں کیا اور کوشش میں تھا اور ہوں کہ وظیفہ جاری ہو جائے تو ندوہ میں آ جاؤں۔'' (شروانی۔۴۱)

قرض سے نجات اور نوکری سے سبک دوشی کی کوشش

معلوم ہو چکا ہے کہ دسمبر ۱۹۰۲ء تک ان

پر چھ ہزار قرض کا بوجھ تھا مگر چند مہینوں کے بعد پانچ ہزار کسی طرح ادا ہو گئے اور صرف ایک ہزار رہ گیا، یکم جون ۱۹۰۳ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں ''خدا کا شکر ہے کہ قرض ہائے کثیر میں سے اب صرف ایک ہزار ادور رہ گیا ہے، جس کو میں ماہوار ادا کر رہا ہوں، باقی سب ادا ہو گئے، مجموعی قرضہ (والد مرحوم) کی تعداد تیس[1] ہزار تھی۔'' (حمید-۲۰)

اس سے ایک گونہ ان کو اپنی پابندی کی زنجیریں ڈھیلی نظر آئیں اور اس خیال میں کہ ان کا سو روپیہ والا گزشتہ وظیفہ بحال ہو جائے تو وہ خود استعفا دے دیں اور زیادہ پختگی آ گئی۔

ندوہ کی یاد ۱۹۰۱ء میں مولانا ایک نئی ملازمت کی قید میں گرفتار ہو چکے تھے، اس لیے وہ اس سال بھی ندوہ کے سالانہ جلسہ میں جو ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶ شعبان ۱۳۱۹ھ مطابق ۵، ۶، ۷، ۸ دسمبر ۱۹۰۱ء کلکتہ میں ہوا تھا، شریک نہیں ہوئے لیکن انہوں نے ایک خط کے ذریعہ سے جلسہ میں یہ اعلان کرا دیا کہ وہ عنقریب سب چھوڑ چھاڑ ندوہ کے آستانہ پر آ بیٹھیں گے، یہ خط جیسا کہ کلکتہ کی روداد صفحہ ۱۰ میں چھپا ہے، حسب ذیل ہے: ''رخصت ملنے کی توقع نہیں، اس لیے شاید کلکتہ نہ پہنچ سکوں لیکن اب کی مرتبہ ندوہ میں اعلان کر دیجیے کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ سب چھوڑ چھاڑ کر ندوہ کے آستانہ پر آ بیٹھوں اور اپنی تمام عمر اسی کی خدمت میں صرف کر دوں۔''

مولانا اپنے نج کے خطوں میں تو بارہا اپنی اس خواہش کا ذکر فرما چکے تھے، مگر یہ پہلا موقع ہے کہ انہوں نے پبلک میں اس کا برسرِ عام اعلان کیا۔

شوال ۱۳۱۹ھ مطابق فروری ۱۹۰۲ء میں دارالعلوم ندوہ نے ترقی کا ایک قدم اور آگے بڑھایا، یعنی اس کے ابتدائی تین درجوں کے بعد چوتھا درجہ متوسط سالِ اول کے نام سے کھلا اور شوال ۱۳۲۰ھ مطابق جنوری ۱۹۰۳ء میں متوسط کے دوسرے درجہ کا اور شوال ۱۳۲۱ھ مطابق جنوری ۱۹۰۳ء میں متوسط کے تیسرے درجہ کا افتتاح ہوا[2]، دارالعلوم کے درجے پر درجے سال بہ سال کھلتے جاتے تھے اور مولانا کی دل چسپی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا لیکن نصابِ درس کی ترتیب و ترمیم کے واسطے اب تک کوئی خاص مجلس نہ تھی، بلکہ جلسۂ انتظامیہ اس خدمت کو خود ہی ان حضرات کے مشورہ سے جن کو تعلیم کا پورا تجربہ حاصل ہے، انجام دیتا تھا،

[1] یہاں خط میں تینتیس ہزار غلط چھپا ہے۔ تیس ہزار ہونا چاہیے۔ [2] روداد ندوہ امرتسر بابت ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء نمبر ۳۰ و روداد مدراس ۱۹۰۴ء، ص ۲۸۔

۱۳۱۹ھ-۱۹۰۲ء میں اس کام کے لیے ایک خاص مجلس قائم ہوئی تھی، جس میں مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی اور مولوی محمد فاروق صاحب چریا کوٹی جیسے تجربہ کار حضرات مقرر کیے گئے تھے اور اس مجلس کے معتمد مولوی حبیب الرحمٰن خاں[1] شروانی منتخب ہوئے تھے، اس میں خاص لحاظ کے قابل بات یہ ہے کہ اس میں مولوی شبلی صاحب کا نام نہیں، اسی زمانہ میں ندوہ کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ نکالنے کا خیال ہوا، مگر اس میں بھی مولانا سے مشورہ نہیں لیا گیا، یہ گو اتفاقی بات ہوگی، مگر مولانا کو اس سے یہ شبہہ ہوا کہ ندوہ کے کارکن میری شرکت نہیں چاہتے، اس بنا پر ۲۴/ اگست ۱۹۰۲ء کو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو انہوں نے لکھا ''ندوہ کی نسبت ہمیشہ میرا یہی خیال رہا اور سچ یہ ہے کہ صرف ندوہ کے لیے میں نے کالج چھوڑا تھا، گو واقعاتِ اتفاقی کی وجہ سے اس کا موقع نصیب نہ ہوا۔

یہ تو میری حالت ہے، اب آپ لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ جس کام پر میں نے برسوں غور کیا ہے، اس کے سامان بہم پہنچائے ہیں، اس کو اچھی طرح کرسکتا ہوں، اس میں بھی آپ ہاتھ لگانے نہیں دیتے، رسالہ ندوہ اور نصاب تعلیم دونوں چیزیں میرے خاص مذاق کی تھیں اور شاید میں اس کام کو کسی قدر انجام بھی دے سکتا تھا، دونوں سے آپ نے مجھ کو الگ رکھا، مجھ کو ان کی شرکت سے عزت و نام وری مقصود ہوتی تو اس کے لیے علی گڑھ سے بہتر میدان نہیں، مقصود یہ تھا کہ یہ کام اچھی طرح انجام پائے لیکن آپ لوگ ایسا ڈرتے ہیں کہ میں شریک ہوا اور میں نے مذہب کو اور طرزِ تعلیم کو الٹ دیا، بہر حال مجھ کو کسی کے ظن اور خیال پر اعتراض نہیں لیکن جب یہ کیفیت ہے تو بے فائدہ دخل در معقولات سے کیا حاصل ہے، مجھ کو اب ندوہ سے معاف کر دیجیے، مجھ سے صرف نقارچی کا کام لینا مقصود ہے تو اور بھی بہت لوگ ہیں، افسوس ہے ہم مسلمانوں کے قلوب کی یہ کیفیت رہ گئی ہے، اب کی جلسہ کے لیے میں نے سامان کر لیا تھا لیکن ایسے مجمع میں شرکت سے کیا فائدہ جہاں سب لوگ مجھ سے بدظن ہوں۔

اس خط کے جواب میں جناب مولانا شروانی نے غالباً یہ لکھا کہ ''اگر آپ ندوہ سے الگ ہوتے ہیں، تو میں بھی ہوتا ہوں'' ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ ''آپ کی اس علاحدگی سے ندوہ کو جو نقصان پہنچے گا، اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ چند ماہ کے بعد امرت سر میں ندوہ کا اجلاس ہوگا، اس میں دارالعلوم کے نصاب کے مسئلہ کو طے کر لیجیے'' اور یہ بھی لکھا کہ ''آپ حیدرآباد چھوڑ کر آئیں تو ساری مشکلیں حل ہوں'' اس کے

---

[1] روداد ندوہ مذکورہ امرتسر، ص ۳۱۔

جواب میں ۱۸؍ستمبر ۱۹۰۲ء کو لکھتے ہیں، میں نے یہ کب کہا کہ آپ بھی ندوہ سے علاحدہ ہوں، آپ پر ندوہ کو پورا اعتبار ہے، آپ سب کچھ کر سکتے ہیں، اور آپ کو کرنا چاہیے، میرے لیے پہلی شرط تو یہ ہے کہ میں حیدر آباد چھوڑ دوں اور یہ شرط خود آپ کے اس عنایت نامہ میں بھی درج ہے، نصاب کا کام لاہور[1] سے انجام ہوسکتا ہے اور حیدر آباد سے نہیں ہوسکتا۔

میں ندوہ کا دشمن نہیں ہوں کہ اپنی علاحدگی سے اس کے نقصان رسانی میں مدد لوں، میں امرتسر آؤں گا لکچر میں کبھی لکھ کر نہیں دے سکا، اس لیے اگر زبانی منظور ہو تو حاضر ہوں ورنہ معاف۔

ندوہ میں جو لوگ میرے خلاف ہیں، ان میں خود میرے ہم وطن اور عزیز بھی ہیں اور جس وجہ سے خلاف ہیں اس سے بھی میں واقف ہوں لیکن ان باتوں کی طرف توجہ کرنے سے کیا حاصل، البتہ آپ سے تعجب ہے کہ ہر قسم کے کام کے لیے ترکِ معاش کی شرط کو ضروری قرار دیں۔"

اس کے ایک مہینہ کے بعد ۶، ۷، ۸؍رجب ۱۳۲۰ھ مطابق ۹، ۱۰، ۱۱؍اکتوبر ۱۹۰۲ء کو ندوہ کا سالانہ جلسہ امرتسر میں ہوا، ندوہ کا یہ سب سے پہلا جلسہ تھا جس میں مولانا نے اپنے خیالات کو ایک نالۂ موزوں کی شکل میں پیش کیا جو سراپا درد ہے، یہ فارسی ترکیب بند تھا، جو پہلے ہی نہایت اہتمام سے منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع نامی میں چھپوالیا گیا تھا، پہلے ہی اجلاس میں روداد کے بعد مولانا اپنا یہ ترکیب بند سنانے کو کھڑے ہوئے، اس کا مطلع تھا:

ایکہ پرسی چہ کسانیم و چہ ساماں داریم ۔۔۔ انچہ با ہیچ نیرزد بجہاں آں داریم

اس ترکیب بند میں سات بند ہیں، پہلے دو بندوں میں علما کی قناعت و فضیلت کا بیان ہے، تیسرے اور چوتھے میں مسلمانوں کے زوال کی تصویر ہے، پانچویں اور چھٹے میں نئی تعلیم کے نقائص کا بیان ہے اور ساتویں میں ندوہ کے مقاصد کی تشریح ہے، یہ ترکیب بند جس وقت جلسہ میں پڑھا گیا ہے، حاضرین کی کیفیت کیا ہوئی، اس کا مختصر بیان اس جلسہ کی روداد میں مذکور ہے "شیخ عبدالقادر صاحب صاحب بی اے (موجودہ سر شیخ عبدالقادر) جس وقت اپنی تقریر تمام کر چکے معزز حاضرین نے بے چینی سے شمس العلما مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی کی طرف نگاہیں دوڑائیں، وفورِ شوق اور شدت انتظار کے جھرمٹ میں مولوی صاحب ممدوح اسٹیج پر تشریف لائے اور اپنا ترکیب بند ایسے موثر اور درد انگیز لہجہ

---

[1] یہ اشارہ مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی رکن مجلس نصاب کی طرف ہے، جو لاہور میں رہتے تھے۔

میں پڑھا جس کو سنتے وقت سامعین ہمہ تن گوش اور سراپا حیرت بن گئے تھے، خصوصاً دو بند اول کے کچھ ایسے پڑھے گئے جنہوں نے علما پر ایک خاص کیفیت پیدا کر دی اور جہاں تک دریافت ہوا ہے، اس کا مزہ اب تک لوگ نہیں بھولے، اس ترکیب بند پڑھنے سے پہلے مولوی صاحب نے ایک مختصر تقریر بھی کی تھی اور درمیان میں بھی جا بہ جا حالت اور موقع کے مناسب تقریر کرتے جاتے تھے، جس سے سامعین کو زیادہ لطف آتا تھا، اس ترکیب بند کو مولوی صاحب نے کان پور میں چھپوایا تھا، جس کی ۱۰۰ کاپیاں اس وقت موجود تھیں، ان کو حاضرین نے ہاتھوں ہاتھ خرید لیا۔ (ص-۳۸)

زیارت کا پہلا موقع یہ (۱۹۰۲ء) پہلا موقع ہے کہ میرے (راقم الحروف[1]) ہوش وحواس کے کانوں نے مولانا شبلی کا آوازہ سنا، امرتسر سے جب مولانا واپس ہوئے تو لکھنؤ آ کر ٹھہرے اور میں نے سب سے پہلی دفعہ ان کی زیارت کی، مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی اس وقت دارالعلوم میں مدرس اعلا تھے، وہ بھی امرتسر تشریف لے گئے تھے وہ واپس آئے تو شاگرد (مولانا شبلی) کے اس ترکیب بند کے ان چند شعروں سے بہت خفا تھے، جن میں فلسفۂ قدیم پر اور علما کی جدید فلسفہ سے بے خبری پر تعریض تھی:

تا چہ سودت دہد آں فلسفۂ عہد قدیم　　تا چہ سودت دہد آں ہیئت پارینہ نہاد
از عناصر سہ وشصت آمدہ اینک بہ شمار　　تو ہماں در گرد آتش و آبستی و باد

ہم لوگ اس وقت مولانا فاروق صاحب سے فلسفہ ومنطق کی چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھتے تھے، پھر بھی وہ ہم لوگوں کے سامنے بڑے جوش سے ان ۶۳ عناصر کے نظریہ کی تردید فرماتے تھے، اور سمجھاتے تھے اور خیال آتا ہے کہ اس کے جواب میں چند شعر بھی کہے تھے۔

پنجاب میں اس زمانہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کے دعووں کی وجہ سے ختم نبوت کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا تھا، شاید اسی سبب سے مولانا نے اپنی تقریر کا موضوع ''ختم نبوت'' قرار دیا، مگر اس سے پہلے کہ وہ اس موضوع پر تقریر کریں، حسب دستور ندوۃ العلما کی ضرورت پر ایک مدلل تقریر فرمائی، جو روداد میں مذکور ہے، اس تقریر میں جدید اور قدیم دونوں گروہوں کو مخاطب کر کے ندوہ کی ضرورت ثابت کی ہے اور بتایا ہے کہ اب ایک ایسی درس گاہ کی ضرورت ہے جو نیا علم کلام پیدا کرے اور علما کو نئے علوم وفنون کی تعلیم دے۔

---

[1] راقم الحروف شوال ۱۳۱۹ھ مطابق فروری ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوہ میں داخل ہوا تھا۔

اس تقریر میں وقت اتنا گزر گیا کہ مولانا نے چاہا کہ وہ ختم نبوت والی تقریر کو چھوڑ دیں، مگر حاضرین کے بے حد اصرار سے ختم نبوت پر تقریر شروع فرمائی، روداد میں ہے ''شمس العلما مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی چاہتے تھے کہ صرف اسی تقریر پر اکتفا کریں، مگر حاضرین جلسہ کے بے حد اصرار سے ''ختم نبوت'' پر تقریر شروع فرمائی جس پرواز پر تقریر فرما رہے تھے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تقریر ناتمام رہے، باوجودیکہ ایک گھنٹہ صرف اسی عنوان پر تقریر فرماتے رہے مگر تقریر کے بعض بعض حصے چھوٹ گئے، بعض مجمل طریقے پر بیان ہوئے، تاہم جس قدر بیان ہوئے وہ ایسا فاضلانہ مضمون تھا جس کے سننے کے لیے سامعین ہمہ تن گوش ہو رہے تھے اور اس عالم خاموشی میں بھی حسن بیان کا یہ اثر تھا کہ سبحان اللہ اور جزاك الله کی صداؤں سے تمام ہال گونج جاتا تھا، افسوس ہے کہ اردو میں اب تک آواز نویسی کا طریقہ ایجاد نہیں ہوا، اس وجہ سے ایسی دلآویز تقریریں اسی وقت تک کے لیے ہوتی ہیں، جب تک ان کی آواز کانوں میں گونجتی رہی، یہ تقریر اس قابل تھی کہ حرفاً حرفاً قلم بند کی جاتی مگر باوجود کوشش کے نہیں ہوسکی، جس قدر حصے قلم بند ہوئے وہ ایسے نامربوط ہیں جن میں زیادہ لطف نہیں آسکتا، مولوی صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس تقریر کو مستقل رسالہ کی صورت میں قلم بند کر دیں گے۔'' (ص-۱۰۸)

افسوس ہے کہ مولانا کا یہ وعدہ پورا نہ ہوسکا اور حقایق و معارف کے ایک بحر زخار کی موجیں پیدا ہو کر فنا ہوگئیں، اسی زمانہ میں ''وکیل'' امرتسر میں اس کے ناتمام خلاصے جلسہ کی روداد کے ضمن میں چھپے تھے، مگر اس وقت وہ ناتمام خلاصے بھی سامنے نہیں۔

تبدیل نصاب کی کوششیں ۱۹۰۳ء و ۱۹۰۴ء امرتسر میں علما کی مجلسِ خاص میں نصاب کے مسئلہ پر نہایت طول طویل بحثیں ہوئیں اور بالآخر مولانا کی جیت ہوئی اور کثرت رائے سے درس نظامی میں ترمیم منظور ہوئی اور اصولی طور سے بعض اصول طے ہوئے، جن کا ذکر مکاتیب شبلی میں ہے، مگر اس پر بھی ندوہ میں وہی پرانا نصاب عملاً جاری رہا، جس پر ۲۲ رجون ۱۹۰۳ء کو مولانا نے ناظم مجلس نصاب مولانا شروانی کو لکھا'' آج ایک نقشہ نصاب جاریہ دارالعلوم ندوۃ کا آیا، اس میں یہ کتابیں ہیں، ملا جلال، شرح جامی، فصول اکبری، کافیہ، میبذی، شافیہ۔ (۴۸)

مکرمی! ہم آپ خدا کو کیا جواب دیں گے، کیا ندوہ کا یہی دعویٰ تھا کہ دیوبند کی فرسودہ عمارت کو ہم کعبہ بنائیں گے، آپ نصاب کے ناظم ہیں، کیا اس لیے؟ مانا کہ نصاب کے متعلق بعض چیزوں میں

اختلاف تھا لیکن جن میں اتفاق تھا وہ کہاں ہیں، مدرسوں کو کہیے کہ یہ کیا کر رہے ہیں، افسوس، افسوس!''

پھر ان ہی کو جولائی ۱۹۰۳ء میں لکھتے ہیں، میں نے مدرس اعلا دارالعلوم کو نہایت سخت خط لکھا تھا کہ قدیم نصاب کیوں پڑھایا جاتا ہے، امرتسر میں جو طے ہوا وہ کیوں نہیں پڑھایا جاتا، وہاں سے جواب آیا، کہ جدید نصاب ہم لوگوں کو دکھلایا تک نہیں گیا، ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں، آپ نے مدرسہ میں غالباً نصاب نہیں بھیجا جس کی وجہ یہ ہوگی کہ نصاب میں کچھ اختلافات تھے لیکن بہرحال کچھ کتابیں متفق علیہ عام تھیں، ان کی اطلاع تو آپ کو دینی چاہیے تھی، یہ نہایت تعجب کی بات ہے کہ آپ کمیٹی نصاب کے ناظم اور آج تک وہی اندھیر ہے؟

خدا کے لیے فوراً دارالعلوم کے نصابِ مقررہ سے مطلع کیجیے اور تاکید کیجیے کہ اس کو درس میں رکھیں جو کتابیں مختلف فیہ ہوں، ان کو رہنے دیجیے۔''(۵۰)

پھر اسی زمانہ میں ان کو دوبارہ لکھتے ہیں'' جلسہ انتظامیہ میں یہ تو اصولاً طے ہو گیا تھا کہ کسی علم کو مخلوط کر کے نہ پڑھایا جائے، اس سے شروح سلّم وغیرہ خود خارج ہوتی ہیں، اس کے علاوہ میں تو یہ ہوں کہ آپ یہ کیوں نہیں کرتے کہ مثلاً کتب ذیل کی نسبت تمام ممبروں سے پوچھیے کہ درس میں رکھی جائیں یا نہیں، شافیہ، فصول اکبری، شرح ملا، ملا حسن، میرزاہد، ملا جلال وغیرہ۔

تمہید میں یہ وجہ لکھیے کہ زمانۂ درس کا اختصار ضروری ہے، اسی کے ساتھ ہر فن کی ایسی کتابیں جو تمام مسائل کو حاوی ہوں اور اس میں دوسرے علوم کی بحثیں بیچ میں نہ آئیں، میں پوچھتا ہوں کہ آخر جب ندوہ بھی دیوبند ہے تو قوم کا روپیہ کیوں تباہ کیا جا رہا ہے۔

مولانا شروانی کے اس جواب پر کہ نصابِ مجوزہ پر ابھی تک ارکان کا پورا اتفاق نہیں ہوا، ۱۳ر ستمبر ۱۹۰۳ء کو رقم فرماتے ہیں: ''مسلمان سود بے تکلف دیتے ہیں لیکن لیتے نہیں، حرام دونوں ہیں لیکن پہلی صورت میں چوں کہ نقصان ہے، اس لیے اس کے مرتکب اور دوسری صورت میں چوں کہ فائدہ ہے اس لیے اس سے مجتنب ہیں، بعینہٖ یہی حالت ندوہ کی ہے اور ایک خاص حصہ کے متعلق یہ حالت آپ کی وجہ سے ہے۔

ندوہ میں سیکڑوں امور بے ضابطہ ہوتے رہتے ہیں، اس کی تو کچھ پرس و جو نہیں لیکن نصاب کی نسبت آپ کو اس قدر ضابطہ کی پابندی ہے کہ ایک ایک حرف پر سب کا اتفاق جب تک نہ ہو لے کچھ کیا نہیں جا سکتا۔

مکرمی! اس طرح کام نہیں چلتا، سید صاحب نے اس طرح کام نہیں چلایا، امرتسر میں اصولی مراتب طے ہو چکے تھے، مثلاً یہ کہ مخلوط الفن کتابیں خارج کر دی جائیں گی، اس کے مطابق آپ ملا حسن، میرزاہد، حمد اللہ، قاضی کو فوراً خارج کر سکتے ہیں، شرح ملا وغیرہ بہ تصریح خارج ہو چکی ہیں، میں مدرسین کو لکھتا ہوں تو وہ لکھتے ہیں کہ بغیر معتمد کے حکم کے ہم کیوں کر تبدیلی کریں، آپ فوراً لکھ بھیجئے کہ فلاں فلاں کتابیں موقوف اور ان کے بہ جائے فلاں فلاں کتابیں اور اگر آپ اتفاق کی راہ دیکھتے رہے تو خدا کی قسم قیامت تک کچھ نہ ہوگا، ایسی حالت میں معتمدی نصاب کا نام کیوں بدنام کیجیے۔" (۵۲)

۱۴/ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو پھر انہیں ایک مفصل خط لکھا، جس میں فرماتے ہیں "آپ کی اس تحریر سے کہ آپ غزل گوئی کی تاریخ لکھ رہے ہیں، نہایت خوشی اور انبساط ہوتا لیکن اسی خط میں وہ ناپاک اور نجس کورس بھی تھا، جو ندوہ میں جاری ہے۔"

میرے محبوب! کیا آپ کا یہ کام تھا کہ سال بھر سے وہ کتابیں جو قطعاً امرتسر میں خارج کر دی گئی تھیں، جاری رہیں اور آپ مکمل نصاب کے متفق علیہ ہونے کا انتظار کرتے رہیں، خیر اب سنیے۔

• درجہ متوسط سال سوئم میں سے ملا حسن، میرزاہد، رسالہ میرزاہد، ملا جلال، قاضی مبارک، صدرا، سب خارج کر دینا چاہیے، اِن کے بہ جائے شرح مطالع کے بعض حصے، حمد اللہ، شرح ہدایۃ الحکمت از خیرآبادی، رسائل ابن رشد مطبوعۂ مصر، حماسہ، اعجاز القرآن باقلانی اور ہدایہ معاملات (بشرط گنجایش) ہونا چاہیے۔

درجہ متوسط سال دوم میں سے میبذی (یہ سب سے زیادہ نالائق کتاب ہے) شرح عقائد نسفی، تصریح الافلاک خارج ہونی چاہئے، موطائے امام محمد، سبعہ معلقہ، جلالین قائم رہنا چاہیے، اور رسائل اربعہ امام غزالی، الفوز الاصغر لابن مسکویہ مطبوعۂ بیروت جو لکھنؤ میں بھی مطبع یوسفی میں مل سکتی ہے، پڑھانا چاہیے۔

درجۂ متوسط سالِ اول میں مشکوٰۃ کی ضرورت نہیں، مختصر معانی قطعاً خارج کر دینا چاہیے اور حسن التوسل فی صناعۃ الترسل کا مطبوعۂ مصر اس کے بہ جائے رکھنا چاہیے، منتقی الابحر کی بھی ضرورت نہیں، دیوان ابوالعتاہیہ اس میں اضافہ کرنا چاہیے۔

درجہ ابتدائی سال سوم تلخیص اور دیوان علی (جو محض موضوع ہے) بالکل خارج، مشکوٰۃ کی بھی ضرورت نہیں، حدیث کا فن مستقل اخیر میں رکھا جائے گا۔

درجہ ابتدائی سال دوم اور سال سوم سے شافیہ، کافیہ، شرح جامی قطعاً خارج، ان کی جگہ اس درجہ میں ہدایۃ النحو لانا چاہیے، اور مفصل زمخشری اضافہ کرنا چاہیے، نیز کلیلہ دمنہ ابن المقفع مطبوعہ بمبئی۔

لیکن خدا کے لیے پھر پنچایت پر معاملہ نہ اٹھا رکھیے گا، کوئی کتاب نئی قائم کی جائے خواہ نہ کی جائے لیکن کافیہ، شافیہ، شرح جامی، میر زاہد، ملا حسن، ملا جلال، قاضی، یہ تو قطعاً نکلوا دیجیے، خدا کی قسم میں کانپ اٹھتا ہوں کہ ندوہ کے تمام وعدوں کا خدا کے ہاں ہم اور آپ کیا جواب دیں گے۔''

اس ساری خط و کتابت اور سوال و جواب سے اندازہ ہوگا کہ اصلاحِ نصاب کے ہفت خواں کو مولانا مرحوم نے کن مشکلوں سے طے کیا اور عربی تعلیم کے لیے ایک نئے راستہ کی تجویز منوانے میں ان کو کیا کیا دقتیں پیش آئیں۔

ندوہ کا انتشار اس زمانہ میں ناظم ندوۃ العلما مولانا سید محمد علی صاحب ندوہ کی نظامت کی خدمت کے بار سے سبک دوش ہونا چاہتے تھے، کئی سال سفر حجاز میں رہے، ۱۳۲۱ھ-۱۹۰۳ء میں مولانا مسیح الزماں خاں صاحب شاہ جہاں پوری ان کے قائم مقام ہوئے اور ندوہ کا دفتر شاہ جہاں پور کو منتقل ہوا اور اسی سال ۷ا/شعبان ۱۳۲۱ھ-۱۹۰۳ء میں دارالعلوم کی معتمدی اور نگرانی جناب منشی محمد اطہر علی صاحب رئیس کاکوری کو سپرد ہوئی[1]، یہ زمانہ ندوہ کے سخت انتشار کا تھا اور مولانا شبلی مرحوم اس زمانہ میں جھلا جھلا کر ندوہ کے دوستوں کو سخت خط لکھتے رہے۔

ندوہ کا سالانہ اجلاسِ مدراس میں شوال ۱۳۲۱ھ جنوری ۱۹۰۴ء خوش قسمتی سے آیندہ سال ۱۴، ۱۵، ۱۶/شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۳، ۴، ۵/جنوری ۱۹۰۴ء میں ندوہ کا سب سے پہلا اجلاس مدراس میں ہوا جس میں دوسرے عمائد کے علاوہ مولانا شبلی بھی شریک ہوئے، بلکہ اس کے چوتھے اجلاس منعقدہ ۱۷/شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۶ جنوری ۱۹۰۴ء کی صدارت[2] بھی کی، پروگرام میں (سر) شیخ عبدالقادر لاہور کی تقریر کے بعد خود مولانا کی تقریر کا وقت تھا اور موضوع وہی تھا جو ان کے دل سے لگا تھا، یعنی دارالعلوم کی ضرورت،

---

[1] روداد مدراس ۱۹۰۴ء، ص ۳۰، منشی صاحب موصوف کچھ دنوں تک دارالعلوم کی نگرانی کا فرض اس طرح ادا کرتے رہے کہ باوجود رئیس ہونے کے خود دارالعلوم کے صحن میں آکر رات کو آرام فرماتے تھے، ۳۰/رمضان ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۷/نومبر ۱۹۰۶ء کو وہ حج بلکہ ہجرت کے ارادہ سے حجاز کو روانہ ہوئے اور وہیں مدینہ منورہ میں ۹/جمادی الاولی ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء کو وفات پائی اور جوار رحمت میں جگہ پائی، ان کی وفات پر میرا ایک عربی مرثیہ میرے عربی دیوان میں ہے۔ [2] روداد مدراس ۱۹۰۴ء، ص ۸۱۔

روداد کے الفاظ یہ ہیں، اس (شیخ عبدالقادر کی) تقریر ختم ہونے پر پہلے سے کچھ زیادہ شوق اور بے چینی کے آثار جلسہ میں پیدا ہو گئے، ہر شخص کے ہاتھ میں جلسہ کا نظام تھا اور صدر نشین کی طرف نگاہیں تھیں، کیوں کہ یہ وقت جلسہ کے صدر نشین مولانا شبلی نعمانی کی تقریر کا تھا اور آپ دار العلوم کی ضرورت پر بیان فرمانے والے تھے، مولانا ممدوح کھڑے ہوئے، ہاتھ میں ایک کاغذ تھا، جس میں چند عنوانات لکھے ہوئے تھے، حسب عادت ممدوح نے یہ تقریر پہلے سے قلم بند نہیں فرمائی تھی[1]۔

اسی سلسلہ میں مولانا شبلی نے یہ تحریک فرمائی کہ دار العلوم کی تعمیر میں ایک کمرہ صرف علما کے چندہ سے بنے، جناب ملا عبدالقیوم[2] صاحب حیدر آبادی نے اس کی تائید کی، چنانچہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی، مولانا شبلی، مولانا مسیح الزماں خاں، مولوی ضیاء الدین صاحب، ملا عبدالقیوم صاحب، مولوی عبدالقادر صاحب صوبہ دار گلبرگہ، مولوی احمد محی الدین صاحب مدراس نے سو سو روپیہ، مولوی عبدالرب صاحب خواہر زادہ ملا عبدالقیوم نے ڈھائی سو اور باقی علما نے دس بیس پچیس کے چندے[3] لکھوائے۔

مدراس کے جلسہ سے یہ فائدہ ہوا کہ مولانا کو ناظم صاحب ندوۃ العلما مولانا سید عبدالحیٔ صاحب مددگار ناظم اور دوسرے ارکان سے دو بدو گفتگو کرنے کا موقع ملا اور باہمی غلط فہمیاں دور ہوئیں، نصاب کا مرحلہ طے ہوا کہ ملا عبدالقیوم مولوی سید عبدالحیٔ صاحب اور مولانا شبلی باہم مل کر بنائیں، الندوہ کی تجویز بھی مکمل ہوئی اور مولانا کا نام اڈیٹروں میں شامل ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ لکھنؤ سے دفتر ہٹانے کی وجہ کیا تھی؟ مولانا شروانی کو ۱۲ر جنوری ۱۹۰۴ء کو لکھتے ہیں" مدراس میں جو کچھ ہوا دین کے لیے ہوا، دار العلوم یا ندوہ کو دو چار سو بھی ہاتھ نہیں آئے، میں نے اس دفعہ مولوی مسیح الزماں صاحب وغیرہ کو الگ جلسہ میں بلا کر مختتم گفتگو کی، یعنی اگر چلانا ہے تو ٹھیک طرح سے چلایئے، ورنہ کم سے کم میں الگ ہو جاتا ہوں، مولوی مسیح الزماں صاحب نے صاف کہا اور مولوی عبدالحیٔ صاحب وغیرہ نے بھی موافقت کی کہ دار العلوم جب تک شہر لکھنؤ میں منشی اطہر علی کے زیر اثر ہے کچھ نہیں ہو سکتا، اس لیے ہم نے دار العلوم ان کے سر مارا، باقی اشاعت اسلام کا کام شاہ جہاں پور میں انجام دوں گا، مولوی عبدالحیٔ صاحب نے یہ بھی

---

[1] روداد مدراس ۱۹۰۴ء، ص ۹۶ [2] جناب ملا عبدالقیوم حیدر آبادی علما میں تھے اور سرکار نظام میں متعدد ذمہ دار و معزز عہدوں پر سرفراز رہے، جناب مولانا مسیح الزماں خاں صاحب شاہ جہاں پوری استاذ حضور نظام کے برادر نسبتی یعنی سالے تھے، نہایت روشن خیال تھے، دائرۃ المعارف دکن کی تاسیس میں ان کا ہاتھ بھی شامل تھا، اس زمانہ میں کانگریس کے بڑے حامیوں میں تھے۔ [3] روداد مدراس ۱۹۰۴ء، ص ۹۷۔

بیان کیا کہ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سے بار بار نصاب مانگا گیا لیکن وہ نہیں بھیجتے نہ تمام لوگوں کو آپ سے سخت شکایت تھی، لوگ کہتے تھے کہ ویسا ہی مسودہ بھیج دینا تھا۔

میری بھی یہ رائے ہے کہ جس کام کو آپ قلت فرصت یا اور کسی وجہ سے نہ کر سکتے ہوں اس سے استعفا دینا بہتر ہے، ورنہ محض انتساب کے فخر سے کیا حاصل۔

رسالہ کے لیے اب تک مولوی مسیح الزماں صاحب درخواست دینے میں پس و پیش کرتے ہیں''۔

پھر ۲۲ر جنوری ~~۱۹۰۴ء~~[1] کو لکھتے ہیں'' خانۂ ملاح در چمن است و کشتی در فرنگ۔''

میں نے رسالہ کا مسودہ بھیجا وہ دفتر میں پڑا رہا، ناظم نے مدراس میں کہا کہ مجھ کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی، آپ کا نصاب بھی یونہی کہیں پڑا ٹھوکریں کھاتا ہوگا، منشی صاحب[2] مہتمم ہیں، نصاب ان کے پاس کیا ہوگا، وہ کیا کر سکتے ہیں، نتیجہ یہ ہوگا ع اب کی بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے۔

مولوی عبدالحی صاحب کے دو عملہ قیام کی وجہ سے خط نہ لکھنؤ کے پتہ سے پہنچتا ہے نہ شاہ جہاں پور کے پتہ سے، آپ اتنا کیجیے کہ فوراً ناظم صاحب کو خط لکھ کر ہدایت کیجیے کہ نصاب منگوا کر جاری کر دیں، یا فیصلۂ اخیر کے لیے میرے پاس بھیج دیں، کیوں کہ جلسۂ انتظامیہ مدراس میں یہی طے پایا تھا کہ فیصلۂ اخیر کے لیے نصاب میرے پاس بھیج دیا جائے تا کہ ارکان ندوہ موجودہ حیدرآباد سے اس کا فیصلہ کرالیا جائے جلدی فرمائیے دیر کی حد ہو چکی، ورنہ یہ سال بھی آپ کی نذر ہوگا۔'' (شروانی)

مولانا نے اس سال یہ عزم کر لیا کہ دارالعلوم میں نیا نصاب جاری کر دیا جائے اور کچھ دن لکھنؤ رہ کر دیکھیں کہ دارالعلوم میں کیا کیا خرابیاں ہیں؟ اور ان کی اصلاح کی صورت کیا ہے؟ چنانچہ ۵ر ستمبر ~~۱۹۰۴ء~~[3] کو مولانا شروانی کو لکھا'' ندوہ کا اب نفس واپسیں نظر آتا ہے، اس بنا پر بہ طور حرکت مذبوحی کے یہ ارادہ ہوتا ہے کہ دو مہینہ کی رخصت لے کر لکھنؤ آؤں اور کم از کم دو چیزوں کو درست اور جاری کرادوں، نصاب اور رسالۂ ماہانہ، اس کے سوا عام تدابیر بھی سوچی جائیں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کم از کم ایک مہینہ لکھنؤ میں آکر رہیں، میں بغیر آپ کے کچھ کام نہیں کرنا چاہتا اور نہ کر سکتا۔

اگر آپ اپنے کام کا ذاتی ہرج کر کے آسکیں تو فوراً لکھیے، ورنہ ندوہ کو الوداع کہیے، میرا اس وقت آنے میں سخت نقصان ہے، تنخواہ کی مجرائی الگ، میری ملازمت کے استقلال کا مسئلہ اس وقت

---

1. مکاتیب میں ~~۱۹۰۲ء~~ غلط چھپا ہے۔ 2. جناب منشی اطہر علی صاحب مرحوم 3. مکاتیب میں ~~۱۹۰۲ء~~ غلط چھپ گیا ہے۔

پیش ہے، اس کو چھوڑنا الگ نقصان رساں ہے، زنانہ کا الگ بکھیڑا ہے لیکن غالباً ان سب کو میں برداشت کرسکوں گا، آپ فوراً جواب دیجیے۔

میں مدت قیام لکھنؤ میں ہر روز کسی فن پر طلبہ کے سامنے لکچر بھی دوں گا، قدما کے طریقہ پر

(شروانی-۴۲)

اسی خیال سے اواخر ستمبر ۱۹۰۴ء میں وہ حیدرآباد سے لکھنؤ آئے اور دو تین ہفتے دارالعلوم کی پرانی عمارت میں جو گولہ گنج میں واقع ہے اور اب ''خاتون منزل'' کے نام سے مشہور ہے، اس کمرہ میں جواب ہمارے دوست مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی فرودگاہ ہے، قیام فرمایا اور ۲۸ ستمبر ۱۹۰۴ء کو مولانا شروانی کو لکھا ''میں ندوہ میں آگیا ہوں، میری عیادت اور مہمات امور کے طے کرنے کے لیے فوراً تشریف لائیے اور ہفتہ دو ہفتہ یہاں قیام کیجیے۔''

مولانا شروانی اس وقت نہ آسکے اور تنہا مولانا مقیم رہے یہ پہلا موقع تھا کہ خاکسار اور مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی جو دارالعلوم میں زیر تعلیم تھے، مولانا کے حلقہ میں بیٹھے اور مولانا نے اپنی بزرگانہ شفقت سے نوازا، مولوی محمد امین صاحب، خلف مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی بھی اپنے والد بزرگ وار کے ساتھ ان دنوں ندوہ میں ٹھہرے تھے، وہ بھی حاضر رہتے تھے اور ان ہی نے سب سے پہلے مولانا سے مجھے روشناس کیا، نومبر کے آخر میں جب وہ حیدرآباد واپس گئے تو میرے ایک عزیز نے میری صلاحیت کی نسبت ان سے دریافت کیا تو جواب میں ۲۷ رنومبر ۱۹۰۴ء کو وہ فقرہ لکھا جو میرے لیے ہمیشہ طغرائے فخر ہے، ملازمت نے مجھے حیدرآباد آنے پر مجبور کیا، مولوی سید سلیمان چند روز تک میرے ساتھ رہتے تو اچھا ہوتا، وہ جوہر قابل ہیں''۔ (عبدالحکیم-۱)

اب مولانا نے دارالعلوم کو دیکھ بھال کر حیدرآباد سے قطع تعلق کر کے قیام ندوہ کی تجویز پر عمل کرنے کا عزم فرمالیا، مگر ابھی تصفیۂ حالات کے لیے انتظار کے چند مہینے باقی تھے۔

انجمن ترقی اردو کی نظامت جنوری ۱۹۰۳ء کوئی غیر قوم جب کسی دوسرے ملک پر حکومت کرتی ہے تو اس کی سلطنت کا سب سے کامیاب وصول یہ ہوتا ہے کہ وہ محکوم قوم کے افراد اور طبقوں میں اختلافات پیدا کردے، ہندوستان کے مسلمان اور ہندو صدیوں کی جنگ وجدل اور لڑائی بھڑائی کے بعد وحدت ملکی کی ایک سطح پر آگئے تھے، جن کا لباس قریب قریب ایک تھا، تمدن یکساں ہو گیا تھا، زبان

ایک ہوگئی تھی، مگر انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت ہاتھ میں لینے کے ساتھ پہلا کام یہ کیا کہ فارسی کو سرکاری دفتروں سے خارج کر کے اردو کو اس کی جگہ دی، اس کے بعد فورٹ ولیم کالج میں بیٹھ کر اردو کے ساتھ ایک نئی زبان کا کالبد تیار کیا اور اس کا نام ہندی رکھا، پہلی مسلمانوں کی اور دوسری ہندوؤں کی زبان قرار دی، اختلاف کا یہ اثر آگے کو پھیلا اور رفتہ رفتہ سارے ملک پر چھا گیا۔

۱۸۶۶ء میں سرسید نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے ذریعہ ملک میں دیسی زبان کی ایک یونیورسٹی کی تحریک کی، اس وقت اردو سرکاری زبان تھی، اس لیے ظاہر تھا کہ دیسی یونیورسٹی کے معنی اردو یونیورسٹی کے تھے، یہ سمجھ کر بعض ہندوؤں نے یہ مطالبہ شروع کیا کہ اگر اردو کی کوئی یونیورسٹی بنے تو ہندوؤں کے لیے ہندی کا انتظام کیا جائے، اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی یونیورسٹی کی تجویز ناکام رہی۔

اس کے بعد صوبہ بہار اور صوبہ متحدہ کے ہندوؤں کی طرف سے یہ کوشش شروع ہوئی کہ سرکاری دفتروں میں ہندی رائج کی جائے، بہار میں ان کی یہ تجویز کامیاب ہوئی، یہ دیکھ کر صوبہ متحدہ کے ہندوؤں نے ایک محضر تیار کر کے اس پر ہندوؤں کے دستخط کرانے شروع کیے، سرسید نے اردو کی حمایت کے لیے ۹/ستمبر ۱۸۷۳ء کو الہ آباد میں ایک سنٹرل کمیٹی بنائی اور ہر ضلع میں اس کی شاخیں قائم کرنے کی تجویز کی، اس کے جواب میں ۱۸۸۷ء میں علی گڑھ میں بھاشا سمردہنی سبھا بنائی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اردو کے بہ جائے ہندی زبان اور ناگری حروف کا رواج ہو۔

ہندی پسند ہندوؤں کی یہ کوششیں برابر جاری رہیں، یہاں تک کہ سرانٹونی مکڈنل جو صوبہ بہار میں سویلین رہ چکے تھے، اس صوبہ کے لفٹنٹ گورنر ہو کر آئے، وہ ہندی کی محبت صوبۂ بہار سے لے کر یہاں آئے تھے، انہوں نے ۱۸/اپریل ۱۹۰۰ء میں ایک سرکاری فرمان جاری کیا جس کے رُو سے عدالتوں میں ناگری حروف کی اجازت دے دی گئی، اس اجازت سے اردو کے حامیوں میں عام بے چینی پھیل گئی، ۲۹/اپریل ۱۹۰۰ء کو لکھنؤ میں اردو ڈیفنس سنٹرل کمیٹی بنی اور ۱۲/مئی ۱۹۰۰ء کو علی گڑھ میں نواب لطف علی خاں بہادر رئیس چھتاری کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا اور نواب محسن الملک نے جو اب سرسید کے بعد ان کے قائم مقام تھے، ایک مؤثر تقریر کی اور طے پایا کہ حکومت میں ایک یادداشت بھیجی جائے۔

اس کے بعد لکھنؤ میں نواب محسن الملک کی صدارت میں اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے اہتمام سے ۸/اگست ۱۹۰۰ء کو پرانے ورما لائبریری ہال میں ایک بڑا شاندار جلسہ ہوا جس میں مختلف مقامات

سے بہ کثرت نمایندے آکر شریک ہوئے اور بہت سی تجویزیں منظور ہوئیں، اس جلسہ میں مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندو اور عیسائی بھی شریک تھے، ان اختلافی جلسوں اور تجویزوں سے لفٹنٹ گورنر صاحب کے مزاج گرامی کو بڑی برہمی ہوئی اور اردو کے بہت سے حامی معتوبِ بارگاہ ٹھہرے اور آخر اس عتاب کی تاب نہ لاکر اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کو زندہ دفن کر دیا۔

آخر دسمبر ۱۹۰۲ء اور اوائل جنوری ۱۹۰۳ء میں شاہی دربار کے موقع پر دہلی میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا، اس میں کانفرنس کے متعدد شعبے قائم ہوئے، جن میں سے ایک اردو کا شعبہ بھی تھا، جس کا نام انجمن ترقی اردو پڑا، اس شعبہ کے حسب ذیل عہدہ دار منتخب ہوئے:

صدر:	مسٹر آرنلڈ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہو۔
نائب صدر:	شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب
نائب صدر:	شمس العلما مولوی ذکاء اللہ صاحب
نائب صدر:	شمس العلما مولوی الطاف حسین صاحب حالی
سکریٹری	شمس العلما شبلی نعمانی

مولانا نے اجلاس کے بعد فوراً ہی حیدر آباد دکن میں بیٹھ کر ترقی اردو کا کام شروع کر دیا، احباب کو خطوط لکھے، دوستوں سے رکنیت کی فرمایشیں کیں، عربی فارسی و انگریزی سے لائق ترجمہ کتابوں کا انتخاب کیا، مترجموں کو مقرر کیا، اخباروں کے اڈیٹروں کو انجمن کا رکنِ اشاعت بنایا، متعدد مصنفوں نے اپنی کتابیں انجمن کو بھیجیں اور بعض نے تکمیل کے بعد بھیجنے کا وعدہ کیا، اس زمانہ میں انجمن کی مستعدی کا یہ عالم تھا کہ ہر مہینہ اس کی رپورٹ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں چھپتی تھی اور ملک میں اردو کے متعلق اس قدر جوش پیدا ہو گیا تھا کہ اخبار ہندوستانی لکھنؤ نے جس کے اڈیٹر گنگا پرشاد ورما تھے، یہ شکایت چھاپی کی کہ انجمن نے اردو کے کام میں ہندو جماعت کو علاحدہ رکھا، اس پر سکریٹری (مولانا شبلی مرحوم) نے اخباروں میں یہ تحریر شایع کی کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، انجمن کے قواعد میں اس خیال کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا اور عملی تردید اس خیال کی یہ ہے کہ انجمن نے سب سے پہلا انعام جو اردو تصنیف پر دیا، وہ ایک ہندو مترجم (منشی نرائن پرشاد ورما) کو دیا اور ایک ایسی کتاب پر دیا جو ہندو قوم کے ساتھ مخصوص تھی، یعنی کتاب پیغمبرانِ ہند[1]

[1] یہ کتاب انجمن کی طرف سے ''رہنمایان ہند'' کے نام سے شایع ہوئی ہے۔

''جس میں سری کرشن جی اور گوتم بدھ کا تذکرہ اور ہندو مذہب کے اصول وعقائد ہیں۔''

اس تحریر کا اثر یہ ہوا کہ بعض ہندو بزرگوں نے بھی انجمن کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی اور اس کی ممبری قبول کی۔

اس زمانہ میں فلسفہ اور سائنس کی کتابیں اردو زبان میں بہت کم تھیں، اس لیے ان علوم کی ابتدائی اور سہل کتابیں ترجمہ کے لیے انتخاب کی گئیں، مگر افسوس ہے کہ لایق مترجم نہ مل سکے، چنانچہ ۱۳/ اگست ۱۹۰۳ء کو مولانا شبلی نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں ''یہ مہینہ[1] مشتہرہ کتابوں کے ترجمہ کے امتحان کا مہینہ تھا، جو کچھ ظہور میں آیا اس سے قومی مسائل کے متعلق مہتم بالشان نتیجے حاصل ہوئے ہیں، جس وقت انجمن کی تجاویز ملک میں شایع ہوئی تھیں، تو اطرافِ ہند سے اس قدر درخواستیں آئی تھیں کہ گمان ہوتا تھا کہ ہندوستان عباسیوں کا بغداد بن گیا ہے لیکن جب مقررہ کتابوں کا اشتہار چھپا تو ہر طرف سناٹا تھا، کتاب النباتات اور طبقات الارض کو کسی نے ہاتھ تک نہیں لگا، کتاب الروح کا صرف ایک ترجمہ اور سولرسسٹم کے تین ترجمے آئے، آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ مترجمین انگریزی کے اعلا تعلیم یافتہ ہیں، لیکن بہ جز ایک کے تمام ترجمے ناقص اور ابتر ہیں، کیا اس نتیجہ کے بعد بھی ہمارا قومی کالج علی گڑھ سائنس اور عربی زبان کی تعلیم پر خاص توجہ مبذول نہیں کرے گا......؟

انجمن کا پہلا سال بہت کامیاب رہا، کتابیں ابھی شایع نہیں ہوئی تھیں کہ ان کے خریداروں کی تعداد ۱۰۰ سے زیادہ ہوگئی اور دسمبر ۱۹۰۳ء میں جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں ہوا تو اس شعبہ کی رپورٹ علاحدہ چھاپی اور شایع کی گئی، مولانا کی یہ رپورٹ بڑی دل چسپ اور پڑھنے کے لایق ہے، انجمن کا دوسرا سال بھی کامیاب رہا، اس کے ارکان میں متعدبہ اضافہ ہوا، مصنفین ومؤلفین کو معاوضہ ادا کرنے کے لیے کچھ رقم چندہ کے طور پر جمع ہوئی، نصاب تعلیم اردو کی طرف بھی انجمن نے توجہ کی، اس وقت حسب ذیل ترجمے یا تالیفات زیر قلم تھے:

۱- ''ترجمۂ ایجوکیشن'' ہربرٹ اسپنسر

۲- ترجمۂ کان فلکٹ بٹوین ریلجن اینڈ سائنس، از ڈریپر

۳- ترجمہ میکس مولر لکچرز

۴- ترجمہ ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ از کارلائل

۵- کتاب الالٰہیات

۶- نامۂ دانشوران

۷- معارف ابن قتیبہ

۸- رہنمایانِ ہند

---

[1] انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۶/ اکتوبر ۱۹۰۳ء۔

۹- القمر
۱۰- تاریخ تمدن یعنی بکلو ہسٹری آف سولیزیشن
۱۱- سوانح عمر امیر خسرو دہلوی
۱۲- قدیم فارسی
۱۳- سوانح عمری میر انیس
۱۴- طریقۂ حکومت انگریزی

مولانا گوناگوں کار میں مبتلا تھے، اس پر بھی انجمن کا کام نہایت مستعدی اور خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رہا، ۱۱ر اپریل ۱۹۰۳ء کو مولانا حمید الدین صاحب کو جو اس زمانہ میں مدرسۃ الاسلام کراچی میں تھے، لکھتے ہیں "اردو سکشن کی کارروائی زور شور سے شروع کرتا ہوں۔ (۱۸)

پھر ۱۱ر مئی ۱۹۰۳ء کو لکھتے ہیں "انجمن ترقی اردو کی کاپی بھیجتا ہوں، ارکانِ اعانت اور خریداروں کے نام بھیجنے چاہئیں۔" (۱۹)

مولانا حمید الدین صاحب نے کراچی سے انجمن کے ممبروں کے نام لکھ کر بھیجے (حمید-۲۰) پھر ۷ر جون ۱۹۰۳ء کو انہیں لکھا "اردو نے اب تک جو کام کیا وہ علی گڑھ گزٹ میں اس ہفتہ چھپے گا، اس میں دیکھنا تم بتاؤ کہ عربی زبان سے کون سی کتابیں ترجمہ کے قابل ہیں۔" (حمید-۲۱)

۱۱ر مئی ۱۹۰۳ء کو ممتاز انشا پرداز مہدی صاحب افادی کو جو یو پی میں نائب تحصیل دار تھے، یہ لکھ کر بھیجا "اردو ادب کے ساتھ آپ کو جو عشق ہے، اب اس کے اظہار کا موقع ہے، دستور العمل ارسال ہے، جو کچھ ہو سکے کیجیے۔" (مہدی-۱۱)

۲۲ر جون ۱۹۰۳ء کو صوبہ بہار میں اردو کے لائق ادیب و شاعر مولوی ریاض حسن خاں صاحب خیالؔ کو لکھا کہ انجمن کے لیے ارکانِ اعانت بنائیں اور فارسی تذکرۂ علما کی ایک مشہور جدید کتاب "نامۂ دانشوراں" کے ترجمہ کے لیے ان کا انتخاب کیا اور اس سلسلہ میں ان کو لکھا "آپ کا نام ارکانِ اعانت کی فہرست میں درج کیا گیا اور مستقل خریداروں کے رجسٹر میں درج کیا گیا، آپ کے خط کے آنے سے پہلے دو جگہ سے اطلاع آئی، ایک اور صاحب نے نامۂ دانشوراں کا ترجمہ شروع کر دیا ہے لیکن ابھی دفتر میں نمونہ نہیں آیا، اطلاعاً عرض ہے، نامۂ دانشوراں کے ترجمہ میں بعض بعض جگہ ابہام و تفصیل کے لیے اور کتابوں کی طرف بھی رجوع کرنا پڑے گا، غالباً آپ نے خود اس کا اندازہ کیا ہوگا، کتاب مذکور مدت تک میرے استعمال میں رہی لیکن اس وقت پیش نظر نہیں، اس لیے صفحات کی تعداد محض تخمینی لکھ دی گئی، اس کتاب کی دوسری جلد بھی شائع ہوگئی ہے۔" (۲)

اسی صوبہ بہار میں مولوی ابوالکمال دسنوی کو ۲۷؍نومبر ۱۹۰۴ء کو اطلاع دیتے ہیں، کتب مشتہرہ میں سے ہربرٹ اسپنسر کی کتاب چھپ گئی اور عنقریب شایع ہوگی، باقی زیرطبع ہیں۔

یوپی میں اپنے عزیز مولوی محمد سمیع صاحب کو جو جون پور میں محافظ دفتر تھے، لکھا "انہوں نے انجمن کے ممبر اور مستقل خریدار بنائے، ۷؍نومبر ۱۹۰۳ء کو حیدرآباد سے انہیں مطلع کیا، قواعد انجمن ترقی اردو میں اب اس قدر ترمیم ہوئی ہے کہ خریداران مستقل ارکانِ اعانت قرار دیے گئے، تم اپنے خریداروں کو بھی مطلع کردو، انجمن کی تیار کردہ کتابیں زیرطبع ہیں۔" (سمیع-۵۲)

جدید علوم کے ترجمہ میں اصطلاحات کی دقت تھی، اس کے لیے بالفعل یہ کیا گیا کہ اصطلاحات کو الگ چھپوا کر مترجمین کی خدمت میں بھیجا گیا، ۱۲؍جنوری ۱۹۰۴ء کو مولوی ریاض حسن خاں خیالؔ کو لکھتے ہیں "کیمسٹری کی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں، بلکہ صرف اصلی الفاظ چھپوا لیے گئے ہیں، کہ مترجمین کے پاس الگ الگ جلدیں بھیج دی جائیں۔" (۴)

اسی ضمن میں شعرائے اردو کے تذکروں کی اشاعت کی تجویز بھی تھی، اپنے دوستوں میں سے نواب سید علی حسن خاں کو لکھا "انجمن کی طرف سے میں مصحفی اور میر تقی وغیرہ کے مصنفہ تذکرۃ الشعرا چھپوانا چاہتا ہوں، کیا آپ کے کتب خانہ میں ان تذکروں میں سے کوئی ہے۔" (علی حسن خاں-۵) یہ تجویز مولوی عبدالحق صاحب کے زمانہ میں زیرعمل آئی۔

اسی سلسلہ میں مولانا نے ایک اور کام یہ کرانا چاہا کہ اس وقت تک اردو زبان میں کتابوں کا سرمایہ جتنا فراہم ہو چکا ہے، اس کی ایک مبسوط فہرست تیار کر لی جائے، اس کام کے لیے پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی کا انتخاب کیا جو اس زمانہ میں حیدرآباد ہی میں تھے، چنانچہ انہوں نے اس کام کو گو شروع کر دیا، مگر وہ ختم ۱۹۲۲ء[1] میں ہوا اور "الفہرست" کے نام سے شایع ہوئی، پروفیسر صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں، "۱۹۰۳ء میں جب انجمن ترقی اردو قائم ہوئی تو ایک تجویز یہ بھی ہوئی تھی کہ ایک فہرست ان کتابوں کی مرتب کی جائے جو اس وقت تک تصنیف و تالیف ہو چکی ہیں، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہر فن میں کس قدر کتابیں کس کس پایہ کی موجود ہیں، تاکہ آیندہ ان سے بہتر کتابیں تصنیف کرائی جائیں اور اردو کا قدم علم کے میدان میں آگے بڑھایا جائے۔

---

[1] اصل کتاب میں ۱۹۱۳ء غلط چھپ گیا ہے۔

مولانا شبلی صاحب مرحوم کے ایما سے راقم نے اس کام کو شروع کیا اور اسی سال اس کا ایک حصہ تیار بھی کر لیا تھا، جس کا ذکر مولانا ممدوح نے رپورٹ انجمن ترقی اردو ۱۹۰۳ء میں کیا تھا، تھوڑے دن کے بعد مولوی شبلی صاحب حیدر آباد سے چلے گئے اور انجمن نے اس کام کی طرف توجہ نہ کی۔

انجمن کا کام شروع تو بڑے جوش وخروش سے کیا گیا، انتہا یہ ہے کہ دفتر میں کوئی دوسرا مددگار بھی نہ تھا، پھر بھی سارا کام مع خط وکتابت کے خود ہی انجام دیتے تھے، ۱۳؍ جولائی ۱۹۰۴ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں ''میں اردو کے قصہ میں بہت عدیم الفرصت ہو گیا ہوں جو وقت بچتا ہے بالکل خط وکتابت میں صرف ہو جاتا ہے۔'' (حمید-۲۲) لیکن ایک ہی دو سال کے بعد ۱۹۰۵ء کے شروع میں مولانا پر دار العلوم ندوہ کی خدمت کا قدیم ذوق اتنا غالب آ گیا کہ آخر انجمن کو دوسروں کے حوالہ کر کے خود ندوہ کے آستانہ پر آ کر بیٹھ گئے۔

حیدر آباد سے استعفا اوپر کے صفحوں میں یہ بیان آ چکا ہے کہ وہ ندوہ کی مستقل خدمت کے لیے کس طرح تیار ہو رہے تھے اور اب دار العلوم دیکھ کر اور طلبہ سے مل جل کر اپنے عزم کو عمل میں لانے کے لیے سعی کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ سابقہ منصب بحال ہو کر سر رشتہ علوم وفنون کی نظامت سے استعفا منظور ہو جائے، چنانچہ ۱۹۰۴ء کے آخر یا ۱۹۰۵ء کے شروع ہی میں استعفا پیش کر دیا، مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی کو ۴؍ جنوری ۱۹۰۵ء[^1] کو لکھتے ہیں ''عزیزی، خط پہنچا، میں نے چوں کہ استعفا دے دیا اور مدار المہام کے ہاں سے منظور بھی ہو گیا، صرف اعلیٰ حضرت کی منظوری باقی ہے، اس لیے جلد یہاں سے روانگی کا قصد ہے لیکن ابھی متعین نہیں کہ کہاں جاؤں گا، میری صحت کے لیے ضروری ہے کہ چار پانچ مہینہ تک صرف سیر وتفریح کروں، میں چاہتا ہوں کہ چند روز تک آپ کا میرا ساتھ رہتا تا کہ میں ادب اور فلسفہ کی بعض کتابیں آپ کو پڑھاتا اور مضمون نگاری کی بھی تعلیم دیتا، دیکھیے خدا کب موقع لاتا ہے۔'' (ضیاء الحسن)

شروع فروری ۱۹۰۵ء کو وہ حیدر آباد سے مستعفی ہو کر پہلے وطن چلے آئے، ۵؍ فروری ۱۹۰۵ء کو اعظم گڑھ سے مولوی سمیع صاحب کو لکھا ''میں مستعفی ہو کر وطن آ گیا، اگرچہ مدار المہام کو میرے قیام پر اصرار تھا لیکن میں نے ملازمت کے جوئے کو اتارنا ہی مناسب سمجھا۔'' (سمیع-۵۳)

[^1]: مولانا نے غلطی سے خط کے آخر میں تاریخ ۴؍ جنوری ۱۹۰۴ء لکھ دی ہے، سال کے شروع میں اکثر نادانستہ قلم سے پچھلا سال نکل جاتا ہے، یہی غلطی اس خط کے سنہ میں ہے، واقعات کا اقتضا یہی ہے کہ یہ جنوری ۱۹۰۵ء ہو۔

ملازمت سے علاحدگی کے بعد سوروپیے ماہوار کا اگلا منصب بحال ہوگیا۔

بھوپال کی تحریک مولانا کے استعفیٰ کی خبر جب بھوپال پہنچی تو ہر ہائینس بیگم صاحبہ بھوپال نے نواب محسن الملک کے ذریعہ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ مولانا بھوپال آجائیں، نواب صاحب نے حسب ذیل خط مولانا کے نام لکھ کر بھیجا، مولانا ہر ہائینس بیگم صاحبہ نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ مولوی شبلی صاحب یہاں آنا پسند کریں گے یا نہیں؟ اگر آئیں گے تو کیا مشاہرہ قبول کریں گے، فرمایئے کیا جواب دیا جائے۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے، الندوہ کب نکلے گا، آپ کے قبضہ میں ندوہ کے آنے سے حضراتِ علما کیا حال ہے، مدد دیں گے یا فرنٹ ہوجائیں گے۔'' (مہدی)

لیکن مولانا اپنے عزم پر قائم رہے۔

طلبائے دارالعلوم کی خوشی مولانا کی مستقل تشریف آوری اور قیام کی خبر جب دارالعلوم کے طلبہ کو ملی تو ان کو بے حد خوشی ہوئی اور اس خوشی کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا گیا، طلبہ نے جلسے کیے، تقریریں کیں، نظمیں لکھی گئیں، خاکسار نے بھی طلبہ کی ایک انجمن میں اپنی خوشی و مسرت کا اظہار ایک فارسی قصیدہ میں کیا جو زندگی میں فارسی کا پہلا کلام ہے اور آخری بھی، بہ طور یادگار ذیل میں اس کو جگہ دے کر اپنی کم سوادی کو رسوائے عام کرنا چاہتا ہوں۔

شبلی نعمانی

بدہ ساقی مئے کو بفگند جلبابِ ظلمانی ۔۔۔ خرد را نور بخشد از چراغِ طور ایمانی
مئے کز جرعۂ اش رونق فزاید لفظ و معنی را ۔۔۔ دہد تیغ زباں را جوہرِ تیغ صفا ہانی
مپرس افسانۂ داراؤ اسکندر کہ می بافند ۔۔۔ مپرس از دفترِ پارین حکمت ہائے یونانی
خرد گم کردہ راہست اندریں راہے کہ می پویم ۔۔۔ فلاطونی دریں کشور بنا شد جز بہ نادانی
فسوں سازی چشم نرگسیں دل رانمی بازد ۔۔۔ کہ مسحورم بہ سحرِ کلک و جادوے سخندانی
نہ دارم گوش برایں نغمہ سنجیہائے داؤدی ۔۔۔ کہ گوشم ہست بر آواز مرغ باغِ یزدانی
فدائے آں حدیثِ روح پرور باد ہر جانے ۔۔۔ کہ جانِ نو دمد در مردہ دل چوں آبِ حیوانی
خدیو کشورِ معنی کہ فرمانش برو دلہا ۔۔۔ چہ دلہا؟ سکہ بر جاں زو چہ بر قاضی چہ بردانی

بیا اے قصہ خوانِ جاہِ افریدون وکیخسرو	بہ بین اینجا کہ درویشے کند در فقر، سلطانی
نہ ایوانے نہ دربانے نہ دیہیے نہ اورنگے	نمی دارد بدستش ہیچ اسبابِ جہانبانی
وثاقش سجدہ گاہ قصر و ایوانِ شہنشاہی	بساطش بوسہ گاہ و دانش آموزانِ یونانی
کہن دستار او بالاتر از اکلیلِ سلطانی	حصیر کلبہ اش بہتر ز او رنگِ سلیمانی
عصائے موسوی کلکش ید بیضاست قرطاسش	سطور صفحہ اش چوں جعد بر رخسار نورانی
صریر خامہ اش نغمہ سرائے گلشنِ حکمت	مدادش از پئے چشم ورق کحلِ صفاہانی
سخن گوید لبش یا گوہر شہواری بارد	چنیں گوہر نہ زنہار آفرید ست ابر نیسانی
گراں تر چند اوراقش بود از گنج قارونی	نمی ارزد بیک حرفش ہمہ سامانِ سامانی
سنانِ خامہ اش کشور کشائے معنی و دانش	زبانگِ طبل صیتش پر فضائے کونِ امکانی
دلش آرام گاہے، موج دریائے معانی را	ہویدا فکر حلِ معضلات از خطِ پیشانی
ضمیرش چوں کند غواصیِ جیحونِ مشکلہا	برآرد دستِ فکرش صد درنا سفت و نورانی
کفش باشد تہی از درہم و دینار و دامانش	پر از درِ عمانی و پر از لعلِ بدخشانی
خجل از حسنِ نثرش لعبتانِ حجلۂ گردوں	عرق از درِ نظمش بر جبینِ ابر نیسانی
دلش نتواں کشیدن منت اربابِ نعمت را	کہ نشتر می خورد از ہمتش اقبالِ سلطانی
بیانش ابرِ باران است می بخشند چو می بارد	بہوم شور سرسبزی و سبزہ را فراوانی
مسیحا دم باعجاز قلم جانِ دگر بخشید	بحکم قم باذن اللہ آن تن را کہ شد فانی
بخواہم از خداوندے کہ نامش حی و قیوم است	بماند زندۂ جاوید ایں شبلیِ نعمانی
نوشتم چوں مدیح حضرۃ الاستاذ و برخواندم	ندا آمد مرا از پردۂ ناموسِ ربانی

دلیل فضلِ ممدوحت ز مدحِ تو ہویدا شد
بہ پیش مور سر تہی کہ ہمنامِ سلیمانی

دار العلوم کی معتمدی

۱۹۰۵ء - ۱۹۱۳ء

مولانا کا نام دار العلوم کے معتمد کی حیثیت سے سب سے پہلی دفعہ ۱۶؍ ذی الحجہ ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۶؍ مارچ ۱۹۰۳ء کو بمقام شاہ جہاں پور مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری نے جلسۂ انتظامیہ میں پیش کیا اور ارکان نے بالاتفاق منظور کیا اور طے ہوا کہ مولانا شبلی سے درخواست کی جائے کہ وہ لکھنؤ آ کر قیام کریں، مگر وہ ان دنوں نہ آ سکے، تو ۱۷؍ شعبان ۱۳۲۱ھ کو منشی محمد اطہر علی صاحب کو دار العلوم کا عارضی معتمد و نگراں مقرر کیا گیا، اب جب مولانا تشریف لے آئے، تو ۱۵؍ صفر ۱۳۲۳ھ (اپریل ۱۹۰۵ء) کو باقاعدہ معتمد تعلیم منتخب ہوئے، یہ قانونی کارروائی تھی، ورنہ مولانا اس سے چند ماہ پہلے ۱۹۰۵ء کے شروع میں دار العلوم میں تشریف لے آئے تھے اور گولہ گنج میں پرانے دار العلوم کی اس عمارت میں جواب جیسا کہ پہلے بتایا گیا ''خاتون منزل'' کے نام سے موسوم ہے، اس کی سب سے بالائی منزل پر جو صرف ایک کمرہ تھا اور جو پہلے طلبہ کا دار المعلو مات تھا، قیام فرمایا تھا۔

جدید نصاب کا اجرا دار العلوم کے قائم کرنے کا اصلی مقصد عربی طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم میں اصلاح کرنا تھا، قدیم نصاب تعلیم میں جو خرابیاں تھیں، مولانا نے ان پر الندوہ میں بارہا مضامین لکھے اور ندوہ کی تقریروں میں ان کو برملا ظاہر کیا لیکن ان خرابیوں کو اختصار کے ساتھ انہوں نے روداد دار العلوم بابت ۱۳۲۵ھ-۱۹۰۷ء و ۱۳۲۶ھ - ۱۹۰۸ء، ۱۳۲۷ھ-۱۹۰۹ء میں لکھ دیا ہے، مولانا کے خیال کے مطابق قدیم عربی نصاب میں حسب ذیل خرابیاں تھیں:

(۱) جو علوم مقصود اصلی ہیں، ان کی بہت کم کتابیں درس میں ہیں اور جو علوم بالواسطہ مقصود ہیں، ان میں کثرت سے کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، مثلاً نحو و صرف کی غرض علم ادب اور عربیت کی تکمیل ہے لیکن جس قدر وقت نحو و صرف پر صرف کیا جاتا ہے خود علم ادب پر نہیں کیا جاتا، اسی طرح اور فنون کا حال ہے۔

(۲) منطق و فلسفہ کی کتابیں اس کثرت سے درس میں ہیں کہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ ان تمام علوم کی مجموعی کتابیں بھی مل کر تعداد میں ان کے برابر نہیں ہو سکتیں۔

(۳) اکثر کتابیں اس قسم کی ہیں جن میں خلط مبحث ہے، مثلاً حمداللہ، میرزاہد، ملاحسن قاضی وغیرہ منطق کے فن میں ہیں لیکن اس میں فلسفہ کے مسائل نہایت کثرت سے بھر دیے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم اصل فن سے محروم رہتا ہے، ان کتابوں کو پڑھ کر فلسفہ آ جائے تو آ جائے لیکن خالص منطق نہیں آ سکتی۔

(۴) فن تفسیر اس قدر عظیم الشان اور مہتم بالشان فن ہے لیکن اس کی صرف دو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، جلالین اور بیضاوی، جلالین کے اختصار کا یہ حال ہے کہ اس کے الفاظ کی تعداد قرآن مجید کے الفاظ کے برابر ہے اور بیضاوی کے ۳۰ پاروں میں سے صرف ڈھائی پارے درس میں ہیں۔

(۵) علم عقائد سب سے زیادہ مہتم بالشان علم ہے لیکن اس میں صرف شرح عقائد نسفی پڑھائی جاتی ہے، جو بالکل معمولی درجہ کی کتاب ہے، شرح مواقف میں صرف امور عامہ کی بحث درس میں ہے، جس کو عقائد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۶) اکثر کتابیں جو درس میں ہیں، ان میں مسائل کو اس طرح صاف اور منقح نہیں لکھا ہے کہ اصلی مسائل ذہن نشین ہو جائیں، ردوقدح، اعتراض و جواب، احتمالات اور تعلیلات سے مسائل کو مغلق اور پراگندہ کر دیا ہے، جس سے طالب علم گویا ایک جال میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

(۷) علوم جدید کی کوئی کتاب درس میں داخل نہیں۔

(۸) انگریزی زبان درس میں داخل نہیں۔

ان وجوہ کی بنا پر ندوہ نے ابتدا ہی سے اصلاحِ نصاب پر توجہ کی اور تمام علمائے ہندوستان سے مشورہ اور استصواب کیا گیا، چنانچہ ۲۱ مختلف نصاب پیش ہوئے جو چھاپ کر شایع کیے گئے لیکن یہ تمام نصاب باہم نہایت مختلف تھے، رجب ۱۳۲۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۰۲ء میں بمقام امرتسر ایک جلسہ ہوا جس میں اکابر علما شریک تھے، اس جلسہ میں چند اصولی مراتب طے ہوئے، پھر شوال ۱۳۲۱ھ مطابق جنوری ۱۹۰۴ء بمقام مدراس ایک جلسہ ہوا، جس میں یہ طے ہوا کہ اصول طے شدہ کے موافق ملا عبدالقیوم صاحب حیدرآبادی، مولوی سید عبدالحیٔ صاحب اور علامہ شبلی نعمانی باہم مل کر ایک نصاب بنائیں، چنانچہ وہ نصاب بنایا گیا، جس میں جز غالب مولانا کی ترمیمات کا تھا، اس نصاب میں حسب ذیل خصوصیات کا لحاظ رکھا گیا تھا:

(۱) ادب اور فن بلاغت کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا گیا مختصر المعانی کے علاوہ دلائل الاعجاز، اعجاز القرآن باقلانی اور نقد الشعر درس میں داخل کی گئی۔

(۲) تفسیر بیضاوی کے ۱۵؍ پارے درس میں داخل کیے گئے، مصر میں اس زمانہ میں نہایت مفید کتاب تالیف کی گئی تھی، جس کا نام الصراط المستقیم ہے، اس میں قرآن مجید کی صرف وہ آیتیں جمع کر کے ان کی مختصر تفسیر لکھی ہے جو فقہ، کلام اور اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں، اس سے خاص قرآن مجید کی منصوص فقہ، کلام اور اخلاق کے مسائل معلوم ہو جاتے ہیں، یہ کتاب بھی درس میں داخل کی گئی۔

(۳) عقائد میں پہلے ابن رشد کی کشف الادلہ اور اقتصاد امام غزالی داخل کی گئی تھیں لیکن اب اس کے بہ جائے امام رازی کی معالم فی اصول الدین رکھی گئی۔

(۴) فلسفہ میں ہدیہ سعیدیہ، شرح حکمۃ العین اور شرح حکمۃ الاشراق داخل کی گئیں، اس اخیر کتاب میں اشراقیوں کا فلسفہ ہے جس کے متعلق درس قدیم میں کوئی کتاب داخل نہ تھی۔

(۵) اسرار شریعت میں حجۃ اللہ البالغہ نصاب میں رکھی گئی۔

(۶) فلسفۂ جدیدہ میں دروس الاولیۃ رکھی گئی، اس میں سائنس کے جدید مسائل ہیں اور بیروت میں چھپی ہے۔

(۷) انگریزی زبان ضروری قرار دی گئی۔

نصاب قدیم میں کسی تغیر اور اصلاح کا گوارا کرنا لوگوں کو اس قدر شاق تھا کہ گو یہ نصاب ۱۹۰۴ء میں منظور ہو چکا تھا لیکن اس پر عمل نہیں ہوتا تھا، مدرسین وہی قدیم کتابیں پڑھاتے تھے، یہاں تک کہ مولانا نے حیدر آباد سے آ کر ندوہ میں قیام کیا اور جبریہ حکم دیا، جب جا کر اس کی تعلیم جاری ہوئی، اس پر بھی بعض مدرسین خارج شدہ کتابیں پڑھایا کرتے تھے، جس کو بڑی سختی سے روکا گیا۔

تعلیم انگریزی ایسے علما جو موجودہ زمانہ میں اپنے علمی وقار کو قائم رکھ سکیں، غیر ملکوں میں بلکہ خود اپنے ملک میں بھی اسلام کی تبلیغ کے فرض کو ادا کر سکیں، معترضین اسلام کے جوابات دے سکیں اور نئے تعلیم یافتوں کی تشفی کر سکیں، بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ انگریزی زبان سے تھوڑی واقفیت رکھیں، اس خیال کی بنا پر مولانا نے دار العلوم کے نصاب میں انگریزی کے داخل کیے جانے پر بہت زور دیا، علما اس بدعت کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہو سکتے تھے، انتہا یہ ہے کہ ندوہ کے ایک جلسۂ انتظامیہ میں مولانا

نے جب یہ تحریک پیش کی تو مولانا شروانی جیسے روشن ضمیر و روشن خیال عالم نے خود مولانا شبلی کی بدنامی کے ڈر سے اس بحث سے اعراض فرمایا، آج یہ باتیں عجیب معلوم ہوں گی، مگر ۱۸۹۹ء کا حال سنیے ۱۰/ دسمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:

"جلسۂ انتظامیہ میں باقاعدہ انگریزی داخل کرنے کی تحریک میں نے کی تھی اور اصرار کیا تھا کہ تحریک درج تحریر کی جائے، البتہ اس پر بحث نہیں ہو سکی لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ کارروائی میں میری تحریک لکھی بھی نہ جائے، مولوی عبدالحئی صاحب آپ کی اجازت کے طلب گار ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ آپ اجازت نہ دیں، (شروانی-۳) اس کے جواب میں مولانا شروانی نے شاید یہ لکھا کہ یہ واقعہ مجھے یاد نہیں آتا، اس پر ان کو لکھتے ہیں:

"بات تو کچھ نہیں لیکن مولوی عبدالحئی صاحب کی بہانہ جوئی اور آپ کے خارق العادت بھولنے پر تعجب آتا ہے، یہ امر معمولی حیثیت سے نہیں بلکہ ردو کد کے ساتھ ظہور میں آیا تھا، جب میں نے دیکھا کہ انگریزی کے مسئلہ پر گفتگو نہیں ہوتی تو میں نے کسی قدر سختی کے ساتھ کہا کہ اس سے کیوں گریز کیا جاتا ہے، آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص محرک نہیں، میں نے کہا کہ میں ہوں اور میرا نام لکھا جائے، مولوی محمد یونس خان نے کہا میں تائید کرتا ہوں۔

البتہ آپ کی خاطر سے میں نے پھر اس پر بحث نہیں کی، اب بحث طلب صرف یہ امر ہے کہ میں نے نائب ناظم سے کہا یا نہیں کہ میرے نام سے یہ تحریک لکھی جائے، اگر میں نے کہا تو انہوں نے لکھی یا نہیں؟ نہیں لکھی تو کیوں؟ اور لکھی تو اس کے درج کارروائی کرنے سے کیوں انکار ہے، صدر انجمن کو یہ حق البتہ ہے کہ کسی تحریک کو پیش کیے جانے سے روک دے، یہ حق نہیں کہ یہ بھی کارروائی میں درج نہ ہونے دے کہ فلاں شخص نے اس کو پیش کرنا چاہا تھا یا پیش کیا۔

جلسہ کے بعد میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کیوں اس قدر اس بحث سے کتراتے ہیں، آپ نے کہا تمہاری بدنامی کے ڈر سے، باوجود ان تمام باتوں کے اگر آپ کو یہ تمام معرکہ بھول گیا تو نظیری کا یہ مصرع سمجھ میں آ گیا

ع آنکہ نسیاں آورد خاصیت یادِ من است

مجھ کو اس تمام بے اعتنائی پر واقعی رنج و افسوس ہے۔" (شروانی-۲۲)

شوال ۱۳۱۸ھ-۱۹۰۰ء کے جلسۂ انتظامیہ میں یہ تجویز دوبارہ پیش ہو کر منظور ہوئی، یہ تجویز اگرچہ بہت سے ارکان کی موجودگی میں منظور ہوئی تھی لیکن بعض معزز ارکان نے سخت مخالفت کی کہ اگر مدرسہ میں انگریزی پڑھائی گئی تو ہم اس مدرسہ کو توڑ دیں گے، بلکہ ایک صاحب نے جو ندوہ پر ایک جائداد وقف کرنے والے تھے، اس کی وجہ سے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا[۱]، یہ ردوکد ۱۹۰۱ء تک جاری رہی، ۲۵؍ مئی ۱۹۰۱ء کو مولانا شروانی صاحب کو لکھتے ہیں "ایک ہمارے روشن خیال شروانی ہیں جن کو میں اپنا امام کہتا ہوں ان کا یہ حال ہے کہ انگریزی کے نام سے ان کو لرزہ آتا ہے، بڑی مشکل سے مسلمانوں کے پھسلانے کی تجویز پر راضی ہوئے، تو عمل درآمد میں حیران ہیں، حالاں کہ تمام طالب علموں کو انگریزی پڑھانا مقصود نہیں، نہ میرا یہ خیال ہے، صرف اس قدر مقصود ہے کہ دو چار لڑکے انگریزی بھی پڑھیں۔" (شروانی)

بہر حال مولانا اور دوسرے ارکان جو ایمان داری سے انگریزی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے، اپنے ارادے پر قائم رہے، آخر ربیع الاول ۱۳۱۹ھ-۱۹۰۱ء میں دارالعلوم میں پندرہ روپے ماہ وار پر ایک انگریزی کا ماسٹر مقرر ہو گیا اور کچھ طالب علموں نے اے بی سی ڈی پڑھنی شروع کی، مگر یہ تعلیم دفع الوقتی سے زیادہ نہ تھی، سالہا سال کے بعد بھی کوئی پرائمر سے آگے نہیں بڑھا، ۱۹۰۵ء میں جب مولانا معتمد ہوئے تو ان کے اصرار سے صفر ۱۳۲۳ھ-۱۹۰۵ء کے ایک جلسہ میں ہر لڑکے کے لیے انگریزی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی اور اس کی نگرانی کے لیے مولوی سید ظہور احمد[۲] صاحب وکیل لکھنؤ مجلس دارالعلوم کے رکن منتخب ہوئے لیکن سرمایہ کی کمی کے سبب سے ماسٹروں کا بڑھانا ممکن نہ تھا، اس لیے تعلیم کا نقص جاری رہا، ۱۹۰۸ء میں جب گورنمنٹ نے ۵۰۰ روپیہ ماہ وار کی امداد مدرسہ بنیادی تعلیم کے لیے منظور کی تو انگریزی اسٹاف ضرورت کے مطابق مقرر ہوا اور انگریزی تعلیم باقاعدہ جاری ہوئی۔

انگریزی کی یہ تعلیم اتنی تھی کہ طالب علموں میں میٹرک تک کی لیاقت پیدا ہو جائے، اس کا یہ اثر ہوا کہ دارالعلوم کے کئی لڑکوں نے انگریزی پڑھ کر مفید علمی اور مذہبی خدمت انجام دی، ندوہ کے اجلاس دہلی

---

[۱] روداد دارالعلوم بابت ۱۳۲۵ھ و ۱۳۲۶ھ و ۱۳۲۷ھ مرتبہ مولانا شبلی مرحوم، ص ۸۔ [۲] افسوس کہ سید صاحب موصوف نے ۱۹۴۲ء کی گرمیوں میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے دفعۃً انتقال کیا، وطن الٰہ آباد کا ایک قصبہ تھا، اقامت لکھنؤ میں تھی، کام یاب وکیل تھے، ایک زمانہ تک مسلم لیگ کے سکریٹری رہے تھے، مرنج و مرنجان، خاموش اور نیک طینت بزرگ تھے، لکھنؤ کے اکثر قومی کاموں میں شریک رہتے تھے، دارالعلوم اور ندوہ کے رکن کی حیثیت سے وہ اخیر اخیر تک اس کی خدمت کرتے رہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

میں سید محمد اور عبدالمجید نامی دو طالب علموں نے جب ایک مذہبی موضوع پر انگریزی میں تقریریں کیں تو ایک عالم کی زبان سے انگریزی تقریریں سن کر لوگوں کو اچنبھا ہو گیا اور سر شیخ عبدالقادر نے جو جلسہ میں موجود تھے، ان کی تعریف کی، اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام مولوی ضیاء الحسن علوی کا لینا چاہیے، جنہوں نے یہاں سے نکل کر میٹرک کیا اور پھر علی گڑھ جا کر ایم اے کیا اور اسی کے بدولت ۱۹۱۶ء میں ہمارے صوبہ میں وہ عربی مدرسوں کے پہلے انسپکٹر مقرر ہوئے اور جنہوں نے عربی مدرسوں کی اصلاح و ترقی سے متعلق بہت سی اچھی خدمتیں انجام دیں، میری معمولی انگریزی تعلیم ندوہ ہی کی رہین منت ہے، اسی کا فیض ہے کہ میں ۱۹۱۰ء میں انگریزی اسکولوں کی ریڈروں سے صیغۂ اغلاط تاریخی کی رپورٹ پیش کر سکا، ارض القرآن لکھ سکا اور یورپین مواد سے اپنی تصنیفات میں فائدہ اٹھا سکا، اور ۱۹۲۰ء میں یورپ میں جا کر کچھ کام کر سکا، مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے اسی کی بنا پر جدید فلسفہ کی متعدد کتابیں ترجمہ کیں اور عقل و نقل پر سورت کی ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے اجلاس میں وہ رسالہ لکھ کر پیش کیا جو اہل عقل و نقل دونوں کے لیے یکساں مرکز توجہ ہے، پھر معجزات کے امکان اور وقوع پر وہ مبسوط رسالہ لکھا جو سیرۃ النبی ﷺ کے حصہ سوم کا ایک جز ہے اور یورپ کے مشہور فلسفیوں ہیوم اور برکلے کی تصنیفات کو اردو میں منتقل کیا اور دارالترجمہ حیدرآباد کے لیے جدید نفسیات و اخلاقیات کی ضخیم کتابیں اردو میں ترجمہ کیں اور جامعہ عثمانیہ میں فلسفہ جدیدہ کے پروفیسر ہو سکے۔

مولوی زین العابدین ندوی نے اتنی ہی انگریزی پر یہ ہمت کی کہ وہ امریکہ تک پہنچے اور سات آٹھ برس وہاں رہ کر تبلیغِ اسلام کا کام کیا، اور مولوی احمد اللہ صاحب ندوی نے اتنی ہی انگریزی کے سہارے ۱۹۲۰ء میں لندن تک گئے اور وہاں لوگوں کو اردو پڑھا کر چند ماہ گزارے۔

پروفیسر مظفر الدین ندوی نے یہاں سے نکل کر ایم اے تک تعلیم حاصل کی اور اس وقت سے انگریزی میں علمی اور مذہبی مضامین لکھ رہے ہیں اور بعض تصنیفات انگریزی میں لکھ کر شائع کیں اور نٹشے کے فلسفہ پر ایک کتاب لکھی۔

مولوی حاجی معین الدین[1] ندوی ہیں، جن کی انگریزی تعلیم اس مدرسہ سے آگے نہیں بڑھی، پھر بھی انہوں نے انگریزی میں اورنٹیل لائبریری پٹنہ کی فہرست کی کئی جلدیں ترتیب دیں اور اب اسی

---

[1] آہ! کہ حاجی صاحب نے ۵ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ مطابق مئی ۱۹۴۱ء میں پٹنہ میں جہاں وہ مدرسہ شمس الہدیٰ میں صدر المدرسین تھے، وفات پائی۔

کام کو مولوی مسعود عالم ندوی کر رہے ہیں، جن کی انگریزی تعلیم مدرسہ سے نکلنے کے بعد میٹرک تک ہے، ندوہ کے اکثر عالم بقدر ضرورت انگریزی جاننے کی وجہ سے انگریزی اخبار، تار اور دوسرے معمولی کاروبار میں دوسروں کے محتاج نہیں رہتے۔

مولانا کا خیال تھا جس کو انہوں نے اپنی ۱۹۰۷ء و ۱۹۰۸ء و ۱۹۰۹ء کی رودادوں میں خود ظاہر کیا ہے، کہ ۸ برس کی عربی تعلیم کے بعد دو برس خاص انگریزی تعلیم کے لیے انگریزی کا ایک درجۂ تکمیل کھولا جائے، چنانچہ فرماتے ہیں ''اور جب وہ درجۂ تکمیل میں دو برس تک اور صرف انگریزی پڑھیں گے تو زباندانی میں قابل گریجویٹوں کی برابری کر سکیں گے اور اس وقت انگریزی میں تبلیغ اسلام کی خدمت انجام دے سکیں گے'' مگر یہ درجہ اب تک قائم نہ ہو سکا اور نہ یہ امید پوری ہوئی ورنہ اس سے اور بھی فوائد ہوتے۔

بہرحال مولانا کی جس تحریک کی اتنی پرزور مخالفت ہوئی وہ بھی بے اثر نہ رہی، آخر بڑے بڑے عربی مدرسوں کو اس کے آگے جھکنا پڑا اور دیکھا دیکھی ان کے مدرسوں اور طالب علموں کو مجبوراً اس زبان کی تحصیل کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور آج اس کی مثالیں اکثر عربی مدرسوں میں موجود ہیں اور یہ بدعت عام ہو چکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن بزرگوں نے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی، اس سے ان کا منشا محض کسی غیر اسلامی زبان کی تعلیم کا عدم جواز نہ تھا، بلکہ وہ ان اثرات سے ڈرتے تھے جو اس زبان کے ساتھ ساتھ نادانستہ طور پر عربی کے طالب علموں میں سرایت کریں گے اور سچ یہ ہے کہ ان کا یہ خطرہ بے جا بھی نہ تھا اور جو لوگ علما کے لیے اس زمانہ میں اس کی تعلیم ضروری سمجھتے تھے، ان کے سامنے وہ بیسیوں اسلامی مصلحتیں تھیں جو عربی خواں طلبہ کے انگریزی سیکھ لینے سے ان کو پوری ہوتی نظر آتی تھیں ان کا خیال تھا کہ:

زبان گر بہر حق جوئی چہ عبرانی چہ سریانی

مگر سوال یہی ہے کہ ''بہر حق'' ہو۔

ہندی اور سنسکرت کی تعلیم مولانا نے اپنی معتمدی کے زمانہ میں ۱۹۰۸ء میں ایک تیسرا کام یہ کیا کہ دار العلوم میں ہندی اور سنسکرت کا ایک درجہ قائم کیا تاکہ ہمارے مدرسہ کے طلبہ ان زبانوں کو سیکھ کر آریوں کا مقابلہ کر سکیں، جن کا اس زمانہ میں بڑا زور تھا اور ہر جگہ وہ اسلام پر جا و بے جا اعتراضات کرتے رہتے تھے، مولانا نے اس کے لیے پہلے اپنے چند عزیزوں اور دوستوں کو لکھ کر چند وظیفوں کا

سامان کیا اور پھر ایک پنڈت کو نوکر رکھ کر چند طالب علموں کو ہندی اور سنسکرت کی تعلیم دلائی اس درجہ میں محمد حسین ساکن اعظم گڑھ اور سید امداد حسین ہوشیار پوری دو طالب علم اچھے تیار ہو گئے تھے مگر مولانا کے بعد ہی یہ شعبہ ٹوٹ گیا اور اس سے کچھ کام نہیں لیا جا سکا، حالاں کہ ہندوستان میں ہمارے علما کو اگر کچھ تبلیغی کام کرنا ہے تو اس تجویز کی تعمیل سے چارہ نہیں۔

نئی عربی آج کل تمام اسلامی ملکوں میں جو عربی بولی جاتی ہے وہ ہماری قدیم عربی سے بالکل الگ ہے، اس کے علاوہ جو قدیم عربی زبان لکھی جاتی ہے، اس میں زمانہ کی ضرورت سے ہزاروں نئی چیزوں کے لیے نئے عربی الفاظ بن گئے ہیں، جن کے جانے بغیر کوئی شخص عربی اخبار، رسالے اور نئی عربی کتابیں نہیں سمجھ سکتا، مولانا جب مصر و شام کے سفر سے واپس آئے تو انہوں نے ان الفاظ کا ایک نہایت ہی مختصر فرہنگ لکھا جو ان کے سفر نامہ کے آخر میں لگا ہوا ہے، خاک سار کو چوں کہ بچپن سے ادب کا شوق تھا، اس لیے دار العلوم میں اس زمانہ کے جو عربی اخبارات المؤید اور اللواء وغیرہ آتے تھے، ان کو پڑھا اور ان کے معنی حل کیا کرتا تھا، اسی وجہ سے میں نے طالب علمی میں ایک بڑے امتحان میں کام یابی حاصل کی، جس کا واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء میں جب مولانا شاہ سلیمان صاحب دار العلوم میں مقیم تھے، نواب محسن الملک مرحوم دار العلوم دیکھنے کو آئے، میں نے ان کی شان میں ایک عربی قصیدہ پڑھا، جس کو سن کر انہوں نے فرمایا، میں دار العلوم کی عربی دانی کا قائل اس وقت تک نہیں ہوں گا، جب تک یہ نہ جان لوں کہ یہاں کے طالب علم عربی اخبار سمجھ سکتے ہیں؟ چنانچہ المؤید یا اللواء کا ایک پرچہ منگوایا گیا اور مجھ سے ایک مضمون کی طرف اشارہ کر کے پڑھنے کو کہا گیا، میں نے جب اس کو صحیح پڑھ کر اس کا صحیح مطالب بتا دیا، نواب صاحب بے انتہا خوش ہوئے اور اس کو دار العلوم کا خاص امتیاز سمجھا[1]۔

اس کام یابی نے مجھے جدید عربی کے سمجھنے اور اس کے مشکلات کے حل کرنے کی طرف پہلے سے زیادہ متوجہ کر دیا، پھر جب مولانا ۱۹۰۵ء میں ندوہ میں آکر مقیم ہوئے تو ان کے پاس مصر و شام کے اکثر اخبار اور رسالے آیا کرتے تھے، جن کو میں بالالتزام پڑھتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے جدید عربی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کی پوری مشق ہو گئی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۰۸ء میں جب گورنمنٹ نے ندوہ کی امداد منظور کی تو ایک جگہ اس

[1] تفصیل کے لیے دیکھو، مکاتیب سلیمان ۲۹ اور الندوہ ۱۹۰۸ء۔

میں جدید عربی کی تعلیم کے لیے بھی مقرر کی گئی اور اس کے لیے میرا انتخاب کیا، اس کے بعد انہوں نے اس کی تکمیل کے لیے مجھے مصر بھی بھیجنا چاہا، مگر اس زمانہ کے مصری سیاسیات کے سبب سے گورنمنٹ نے اجازت نہیں دی، بہر حال جدید عربی زبان کی ایک خاص کرسی؟ ہو جانے کے سبب سے دارالعلوم ہمارے ملک میں سب سے پہلی عربی درس گاہ تھی جس نے اس کو اپنی تعلیم میں ایک مناسب جگہ دی اور دارالعلوم کے طلبہ نے جدید عربی زبان کے بولنے اور سمجھنے میں پوری شہرت حاصل کی جو بحمد اللہ کہ آج تک قائم ہے۔

جدید عربی الفاظ و اصطلاحات کو عام کرنے کے لیے مولانا کی تجویز کے مطابق میں نے دروس الادب کے نام سے دو ابتدائی عربی رسالے لکھے جو دارالعلوم اور بہت سے دوسرے مدرسوں میں بہت دنوں تک پڑھائے گئے اور اب بھی کہیں کہیں پڑھائے جاتے ہیں، پھر ۱۹۱۰ء میں ندوہ کے اجلاس دہلی میں یہ طے ہوا کہ جدید الفاظ ولغات کی ایک ڈکشنری ترتیب دی جائے اور یہ کام خاکسار کے سپرد کیا گیا جس کو میں نے دو برس میں پورا کر کے پھر ۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ میں جس کے صدر علامہ سید رشید رضا مصری ایڈیٹر المنار تھے، پیش کیا اور لغاتِ جدیدہ کے نام سے وہ چھپ کر شائع ہوئی اور جس نے عربی مدارس میں نئی عربی زبان کی دقتوں کے حل کرنے میں بڑی مدد دی۔

یہ سب مولانا کا فیض تھا۔

ہونہار طلبہ کی تربیت | مولانا نے دارالعلوم میں قدم رکھنے کے ساتھ چند ہونہار طالب علموں کو اپنے گرد جمع کر لیا، ان میں سب سے پہلا نام ہمارے مخلص دوست مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی کاکوروی (رجسٹرار و انسپکٹر مدارس عربیہ الہ آباد) کا ہے مولانا کے پاس مصر و شام کے عربی رسائل اور جدید تالیفات آتی رہتی تھیں وہ انہوں نے ہم لوگوں کے حوالہ کیا اور ان میں سے بعض مضامین کی تلخیص اور ترجمہ کی ہدایت کی، چنانچہ مولوی ضیاء الحسن کو مصر کا فلسفیانہ رسالہ ''المقتطف'' دیا جس میں سے انہوں نے عمر اور صحت کی تدابیر کے مضمون کا ترجمہ کیا، جو دسمبر ۱۹۰۴ء کے پرچہ میں چھپا، مجھے جرجی زیدان کی کتاب ''اللغة العربيه'' حوالہ کی اور اس کی تلخیص کی ہدایت فرمائی، جس کی تعمیل ہوئی، یہ مضمون جنوری ۱۹۰۵ء میں نکلا اور پسند خاطر ہوا۔

ہماری جماعت کے ایک اور رکن مولوی جواد علی خاں عالی تھے، ان کا مذاق طبع خالص ادیبانہ تھا، اس لیے وہ ہمارے ساتھ نہ چل سکے اور بعد کو ''خان عالی'' کے نام سے الناظر میں مضمون لکھتے رہے۔

۱۹۰۶ء میں اس جماعت میں ایک اور رکن کا اضافہ ہوا، یہ مولوی عبدالسلام صاحب ندوی تھے، جن کو تحریر وانشا کا فطری مذاق تھا، ان کے پہلے ہی مضمون تناسخ کو مولانا نے بے حد پسند کیا اور پانچ روپے انعام دیا، اور اصلاح کے بغیر مختصر تمہید کے ساتھ مئی ۱۹۰۶ء کے ندوہ میں شائع کیا۔

تقریر کی مشق | علمی مضامین پر طلبہ کی تقریر کی مشق کی طرف بھی مولانا نے خاص طور سے توجہ کی اور اونچے درجہ کے اکثر مستعد طلبہ کو باری باری سے اپنے پاس بلواتے تھے، ان کے لیے ایک ہفتہ پہلے موضوع مقرر کر کے اس پر مطالعہ کے لیے کتابیں بتاتے تھے، طالب علم اس تیاری کے بعد مولانا کے کمرہ میں جا کر مقررہ موضوع پر تقریر کرتے تھے، مولانا موقع بہ موقع اس میں اصلاح دیتے تھے، طرز تقریر بتاتے تھے، طریقۂ تعبیر سمجھاتے تھے اور مضمون کو عام فہم بنانے کی طرف خاص طور سے تاکید کرتے تھے، اس درس میں جن طلبہ نے خاص طور سے وقتاً فوقتاً حصہ لیا ان کے کچھ نام یاد آ گئے ہیں۔

۱- مولوی عبدالباری بہاری مرحوم،
۲- مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی (ایم اے)
۳- سید سلیمان،
۴- مولوی مسعود علی صاحب ندوی،
۵- مولوی عبدالسلام صاحب ثانی (ایم اے، ایل ایل بی اعظم گڑھ)
۶- مولوی محمد حسن صاحب، اعظم گڑھ،
۷- مولوی سید نجم الہدیٰ صاحب دیسنوی بہاری،
۸- خواجہ عبدالواجد صاحب کان پوری (ایم، اے)

ان میں سے مولوی عبدالباری بہاری مرحوم نے اپریل ۱۹۰۶ء میں بنارس کے جلسۂ ندوہ میں جب کامیاب تقریر کی ہے تو مولانا نے خوش ہو کر اپنی عبا ان کو اڑھا دی تھی۔

لایق مدرسین کی فراہمی | اچھی تعلیم کے لیے اچھے مدرسین کا مہیا کرنا ضروری ہے، مولانا کے پیش نظر جس قسم کی تعلیم تھی، اس کے لیے معیار کے مطابق اساتذہ مشکل سے ہاتھ آ سکتے تھے، تاہم انہوں نے کوشش جاری رکھی اور جہاں کہیں گئے، اپنے معیار کے مطابق اشخاص کو تلاش کرتے رہے، انگریزی کے لیے قاضی تلمذ حسین صاحب، ایم، اے (گورکھپور) کو مقرر کیا، جو اب سالہا سال سے جامعہ عثمانیہ کے

دارالترجمہ میں کام کررہے ہیں، مولانا حفیظ اللہ کے ڈھاکہ چلے جانے کے بعد فلسفہ اور عقلیات کے لیے مولانا شیر علی صاحب کو لائے، جو مولانا ہدایت اللہ خان صاحب رام پوری کے ارشد تلامذہ میں تھے، ان سے مولانا کی ملاقات بمبئی یا حیدرآباد میں ہوئی اور ایک ہی دو ملاقاتوں میں ایک دوسرے کے گرویدہ ہوگئے، مولانا شیر علی صاحب مدرسہ میں کئی سال رہے، علما میں ایسے فیاض، شریف اخلاق اور باوقار کم لوگ دیکھنے میں آئے، ان کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی، مولانا ہی کے زمانہ میں حیدرآباد چلے گئے جو ان کا وطن ہو چکا تھا، مولاناؒ نے مجوزہ جامعہ علوم مشرقیہ حیدرآباد دکن میں ان کی سفارش کی تھی، جامعہ کھلنے کے بعد وہ وہاں کے شعبۂ دینیات کے صدر ہوگئے، ابھی چند سال ہوتے ہیں کہ انہوں نے وفات پائی، ان کے مدرسہ میں آنے پر مولانا نے شروانی صاحب کو جو خط لکھا تھا، اس میں فرماتے ہیں "دارالعلوم اب جا کر رنگ پر آیا، بڑا رونا تعلیم کا تھا...... (مولانا شیر علی صاحب) جن کو میں نے زبردستی حیدرآباد سے بلایا ہے، ایسے شخص ہیں کہ دو ہی چار دن میں طلبہ کی آنکھیں کھل گئیں اور سمجھے کہ تعلیم اور فن دانی اس کو کہتے ہیں۔"(۷۷)[1]

ان کے چلے جانے کے بعد ۱۹۱۱ء میں شمس العلما مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی کو جو اورنٹیل کالج لاہور سے پنشن پا کر علاحدہ ہو چکے تھے، مدرسہ میں لائے، مفتی صاحب مولانا کے ہم سبق رہ چکے تھے، اس لیے ان کی ذہانت اور طباعی کے قائل تھے، مفتی صاحب کئی سال دارالعلوم میں مدرس اعلا رہے، مولانا کی علاحدگی بلکہ وفات کے بعد وہ بھی علاحدہ ہوگئے۔

ادب کی تعلیم کے لیے ۱۹۰۸ء میں مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی کو دوبارہ دارالعلوم میں آنے کی زحمت دی، وہ تشریف بھی لائے، مگر اتفاق دیکھیے کہ وہ یہاں سے اپنا ضروری سامان لانے کے لیے غازی پور گئے، جہاں ان کا قیام تھا، وہیں بیمار پڑے اور وفات پا گئے، اس جگہ کے لیے اب مولانا کی نظر شیخ محمد طیب صاحب عرب مکی پر پڑی جو مولانا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد تھے اور مدرسہ عالیہ رام پور میں عمر بھر رہے تھے، مگر ان دنوں نواب صاحب رام پور نے ان کو مدرسہ سے الگ کر دیا تھا، تو موقع پا کر مولانا ان کو دارالعلوم میں لے آئے، وہ معقولات اور ادبیات میں بڑے ماہر تھے اور حافظہ ایسا قوی پایا تھا کہ جو کچھ دیکھا یا پڑھا تھا، وہ نوکِ زبان تھا لیکن وہ مدرسہ میں بہت کم ٹھہرے، نواب صاحب کی ناخوشی دور ہوگئی تو وہ رام پور واپس چلے گئے۔

---

[1] مکتوبات سلیمان، ۱۷، ۳۱۷ و ۷۷۔

شیخ حسین صاحب عرب محدث یمنی جو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اور اس عہد کے بہت سے علما کے شیخ الحدیث تھے، ان کے صاحب زادے شیخ محمد صاحب عرب ادب میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور نظم و نثر قلم برداشتہ لکھتے تھے، ان کو بھوپال سے بلوایا، وہ ایک زمانہ تک یہاں درس دیتے رہے، بعد کو بھوپال گئے اور وہیں وفات پائی۔

مولانا محمد شبلی صاحب جیراج پوری، مولانا حفیظ اللہ صاحب کے شاگرد تھے، اور چشمۂ رحمت غازی پور میں پڑھاتے تھے، مولانا ایک دفعہ غازی پور گئے اور ان کو پڑھاتے دیکھا تو پسند فرمایا اور ان کو اپنے ساتھ دارالعلوم لے آئے اور یہاں فقہ کی تعلیم ان کے سپرد فرمائی، جس کو وہ اب تک پڑھا رہے ہیں اور اب تک مدرسہ ان سے فیض اٹھا رہا ہے۔

درجۂ اعلا اور درجۂ تکمیل مولانا کی تشریف آوری تک ندوہ میں چھ سال تک تعلیم پہنچ چکی تھی، یعنی تین سال ابتدائی کے اور تین سال متوسط کے، اب دو سال درجۂ اعلا کے کھلے، یعنی معمولی عربی تعلیم آٹھ سال میں پوری ہوگئی، ان آٹھ سالوں کی تعلیم کے بعد مولانا نے ارکان کی منظوری سے ۱۹۰۹ء میں تکمیل کا درجہ کھولا اور حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم میں مولانا کے زمانۂ معتمدی کا یہ اہم کارنامہ ہے، اس درجہ سے مقصد یہ تھا کہ طلبہ کسی ایک فن کو لے کر دو برس تک خاص اس فن کی تعلیم حاصل کرسکیں اور اس میں کمال پیدا کریں، اس وقت تک تمام ہندوستان میں طریقۂ تعلیم یہ ہے کہ ایک نصاب معین جس میں تمام علوم و فنون اوسط درجہ تک پڑھائے جاتے ہیں، سب پڑھتے ہیں اور مولوی کی سند حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس کے بعد کوئی شخص کسی ایک خاص فن کو لے کر اس کی تحصیل اس طرح نہیں کرتا کہ اس فن کا کامل بن جائے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام ہندوستان میں ایک شخص بھی کسی ایک فن کا کامل نہیں پیدا ہوتا، اتفاق سے مدت کے درس و تدریس اور ممارست کے بعد کوئی شخص کسی فن میں ممتاز ہو جائے تو یہ ایک شاذ واقعہ ہے، اس بنا پر دارالعلوم ندوہ کی تجویز میں ابتدا ہی سے تکمیل کا درجہ رکھا گیا تھا لیکن آمدنی کی کمی سے اس کا انتظام نہیں ہوسکا تھا۔

جلسۂ انتظامیہ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۹ء میں یہ طے پایا کہ سردست علم کلام اور علم ادب کا درجۂ تکمیل کھول دیا جائے اور ایک کمیٹی منتخب ہو جو اس درجہ کا نصابِ تعلیم مقرر کرے، چنانچہ کمیٹی مذکور نے نصاب تجویز کر کے تمام ہندوستان کے علما کے پاس بھیجا، اکثر علما نے رائیں بھیجیں، مجلس دارالعلوم منعقدہ ۳۰ رجون ۱۹۰۹ء میں ان تمام آرا کے اشتمال اور اقتباس سے حسب ذیل نصاب مقرر کیا گیا:

علم کلام

شرح مقاصد علامہ تفتازانی	تہافتہ امام غزالی وابن رشد
کتاب الصفات امام بیہقی	برائے مطالعہ رسائل اربعہ امام غزالی برائے مطالعہ

علم کلام

بحث عصمت انبیاء از ملل ونحل علامہ ابن حزم، برائے مطالعہ کتب آریہ مثلاً ستیارتھ پرکاش

تلخیص المقال وکشف الادلہ ابن رشد	واظہار الحق برائے مطالعہ
حدیقۂ فکریہ،	برائے مطالعہ کتاب الروح ابن القیم برائے مطالعہ

علم ادب

دیوان امرأالقیس ونابغۂ ذبیانی وعلقمہ الفحل	موازنہ ابی تمام وبحتری
وعروہ بن الورود وفرزدق	عقد الفرید ابن عبدربہ، برائے مطالعہ
کتاب الصناعتین ابوہلال عسکری	مشق نظم ونثر
اسرار البلاغۃ عبدالقاہر جرجانی	

اس کے بعد دوسرے علوم کی تکمیل کے نصاب بھی مقرر کر کے شایع کیے گئے اور بعض بعض میں طلبہ داخل کیے گئے، تکمیل ادب میں خواجہ عبدالواجد صاحب کان پور، مفتی محمد یوسف صاحب بیتیاوی مرحوم مدرس دارالعلوم، مولوی عبدالسلام صاحب (مصنف دارالمصنّفین) مولوی قمرالدین صاحب مرحوم اعظم گڑھ، علم کلام میں مولوی شبلی صاحب اعظم گڑھ، حال صدرالمدرسین مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور تفسیر میں مولوی مسعود علی صاحب ندوی، حال مہتمم دارالمصنّفین اعظم گڑھ داخل ہوئے۔

تکمیل ادب میں جو طلبہ داخل کیے گئے، ان کو عربی ادب کی نظم ونثر کے علاوہ عربی میں برجستہ تقریر وتحریر کی مشق بھی کرائی گئی، اس کا اثر یہ ہوا کہ ندوہ کے طلبہ نے عربی تعلیم کے اس بڑے نقص کو کہ عربی طالب العلم لکھ پڑھ نہیں سکتے اور نہ بول سکتے ہیں، دور کر دیا اور سارے ہندوستان میں بلکہ ممالک اسلامیہ میں بھی ان کی ادبیت وعربیت کا سکہ بیٹھ گیا جس کی بارہا شہادتیں مل چکی ہیں۔

علم کلام کا درجہ ۱۳۲۶ھ - ۱۹۰۸ء میں جب کھولا جانے لگا تو مولانا نے شوال ۱۳۲۶ھ مطابق نومبر ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں اپنی تجویز کو ان الفاظ میں ظاہر کیا، دس برس کے بعد اب وقت آیا کہ

ندوہ کی تعلیم کا جو اصلی مقصد تھا یعنی خاص فنون میں کامل الفن اشخاص پیدا کرنا، اس کی طرف توجہ کی جائے، یہ حیرت کی بات ہے کہ ایک عام نصاب تعلیم جو دو سو برس ہوئے قائم کیا گیا، اس کے ساتھ یہ کسی کو خیال نہ آیا کہ خاص خاص فن کے بالغ العلوم ہونے کا بھی نصاب بنایا جائے اور ان کی جداگانہ تعلیم دی جائے، جیسا کہ انگریزی میں ایم اے اور ایل ایل ڈی کی تعلیم ہے، حالاں کہ علوم کی ترقی کی اصلی تدبیر یہی ہے، اس بنا پر دارالعلوم ندوہ میں اس سال یہ شاخ کھول دی گئی اور ابتدا علم کلام سے کی گئی، کیوں کہ ہر حیثیت سے یہی علم آج سب سے زیادہ ضروری اور مقدم ہے، علم کلام میں قدما کی تمام کتابیں اور جدید تصنیفات اور فلسفۂ حال کی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے، البتہ یہ افسوس ہے کہ عربی زبان میں ابھی تک فلسفۂ حال کی معمولی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں۔''

۱۹۱۲ء میں تفسیر کا درجۂ تکمیل کھولا گیا، جس میں تفسیر ابن کثیر، بیضاوی، کشاف، کتاب الناسخ والمنسوخ للنحاس، الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی، اعجاز القرآن باقلانی، تفسیرات احمدیہ ملا جیون وغیرہ کتابیں داخل درس کی گئیں، اسی طرح فقہ واصول فقہ کا ایک درجہ قائم ہوا، جس میں تحریر ابن ہمام، مسلم الثبوت، ملا محب اللہ، معانی الآثار امام طحاوی، بدایۃ المجتہد قاضی ابن رشد وغیرہ کتابیں پڑھائی جانے لگیں۔

ندوہ کے درجہ تکمیل کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ دوسرے ایسے بڑے بڑے مدارس میں جہاں سرمایہ ممکن ہے اس کی تقلید کی گی اور اختصاصی کامل الفن علما کے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور ان میں کتابیں بھی زیادہ وہی رکھی گئیں جو ندوہ میں رکھی گئی تھیں، چنانچہ اس سلسلہ میں جامعہ نظامیہ حیدر آباد دکن، جامعہ عباسیہ، بھاولپور، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے نام ہم کو یاد آ گئے اور بھی بعض پرانے طرز کے عربی مدارس میں بھی یہ تجویز دوسری شکل میں پیش ہوتی رہتی ہے، چنانچہ دارالعلوم دیوبند میں بھی اس تجویز پر عمل ہوا اور تفسیر کا درجہ اب کھولا گیا ہے، غرض من سن سنۃ حسنۃ کی بنا پر امت اسلامیہ اور علوم عربیہ کو اگر اس سے فائدہ پہنچے یا آیندہ پہنچیں تو امید ہے کہ مجوز اول بھی اس کے ثواب سے انشاء اللہ تعالیٰ بہرہ مند ہوگا۔

علوم جدیدہ کی تعلیم | دارالعلوم کی ایک اور بڑی غرض یہ تھی کہ قدیم منطق وفلسفہ کا بے کار حصہ نکال کر اس کی جگہ سائنس اور فلسفہ وریاضیات کے لیے علوم داخل کیے جائیں، اس میں اصلی دقت یہ تھی کہ ہمارے قدیم علما ان علوم کو نہیں جانتے تھے اور نئے تعلیم یافتہ ان کو عربی یا اردو اصطلاحوں میں نہ سمجھا سکتے

تھے اور نہ پڑھا سکتے تھے، اس پر بھی جدید طبیعیات میں بیروت کی ایک عربی کتاب الدروس الاولیہ فی العلوم الطبیعیہ اور جدید ہیئت میں قسطنطنیہ کے چھپے ہوئے ہیئت جدیدہ کے ایک فارسی رسالہ کو نصاب میں داخل کیا اور کوشش کی کہ اس زمانہ میں جو ایک دو علما انگریزی پڑھے ہوئے ہیں، ان سے کام لیں، چنانچہ مولانا حمید الدین صاحب بی، اے کو بہ اصرار ان کی تعطیلوں میں بلوا کر ندوہ میں رکھا اور چند طلبہ کو ان سے الدروس الاولیہ کے کچھ اسباق پڑھوائے[1] مگر اس رواروی میں کتاب پوری نہ ہو سکی، پروفیسر مرزا ہادی صاحب رسوا، بی اے (پروفیسر عربی ریڈ کرسچین کالج لکھنو) سے (جو عربی میں عالم ہونے کے ساتھ جدید فلسفہ و ریاضیات میں بھی ماہر تھے اور بعد کو جامعۂ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں فلسفہ کے مترجم ہو گئے تھے) درخواست کی کہ وہ مدرسہ آ کر بعض طلبہ کو جدید ہیئت کا یہ رسالہ پڑھا دیں، چنانچہ انہوں نے آ کر چند سبق پڑھائے، مگر یہ بھاڑے کا کام چند دنوں سے زیادہ چل نہ سکا۔

بہر حال اتنی ہی تعلیم کا یہ نتیجہ ہے کہ خاکسار ۱۹۰۶ء کے جلسۂ دستار بندی میں علوم قدیمہ و جدیدہ کے موازنہ پر ایک بسیط مضمون لکھ کر پیش کر سکا اور الندوہ میں تکوین ارض اور مسلمان اور علم ہیئت پر چند نمبر لکھے اور مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی نے حواس خمسۂ باطنی پر الندوہ میں ایک مضمون لکھا۔

۱۹۰۸ء میں جب مولانا حمید الدین صاحب مدرسۃ العلوم کراچی سے علی گڑھ کالج میں عربی لکچرر ہو کر آ گئے تو مولانا نے ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ میں یہ تجویز منظور کرائی کہ ایک طالب العلم کو ندوہ کے خرچ پر علی گڑھ کالج دروس الاولیہ اور ہیئت جدیدہ پڑھنے کے لیے بھیجا جائے، جہاں وہ آلات کا مشاہدہ بھی کر سکے گا، مولانا حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں "مجلس انتظامیہ ندوہ نے یہ رزولیوشن پاس کیا کہ ایک طالب العلم کو وظیفہ دے کر مولوی حمید الدین کے پاس بھیجا جائے کہ وہ اس کو دروس الاولیہ اور ہیئت جدیدہ پڑھائیں اور ممکن ہو تو وہاں آلات سے اس کو تجربہ بھی سکھلایا جائے، اس لیے ایک طالب العلم، تمہارے پاس بھیجا جائے گا، تم اس کی صورت قیام اور تعلیم و تجربہ سے مطلع کرو، اگر تم اپنے مکان میں جگہ دو تو وظیفہ اس میں محسوب کر سکتے ہو۔" (حمید-۴۳)

اس تجویز پر عمل بھی ہوا مگر مولوی حمید الدین صاحب فوراً ہی علی گڑھ سے الہ آباد یونیورسٹی میں چلے آئے، اس لیے تجویز کامیاب نہ ہو سکی۔

---

[1] مکاتیب شبلی حمید، ۲۸، ۲۹، ۳۱، ۳۲، ۳۷، ۳۹۔

قرآن پاک کا درس مولانا کی یہ کوشش ان کی متعدد تحریروں سے ظاہر ہے کہ وہ نصاب میں قرآن پاک اور علوم القرآن کو درس میں مستقل طور سے داخل کرنا چاہتے تھے، اسی لیے امام باقلانی کی اعجاز القرآن جب مصر سے چھپ کر آئی تو اس کو فوراً درس میں داخل کر دیا اور قرآن پاک کا درس بھی سبقاً سبقاً داخل نصاب کیا اور ۱۹۰۶ء میں قرآنِ پاک کے عالمانہ درس کے لیے خود وقت نکالا اور درس شروع کیا، اس میں مدرسہ کے اکثر طلبہ اور بعض مدرسین بھی شریک ہوتے تھے، اس میں ہر مسئلہ پر پوری پوری بحث ہوتی تھی، ۱۹/ اپریل ۱۹۰۶ء میں مجھے بنارس سے لکھتے ہیں "میں آ کر تفسیر کا مستقل درس دوں گا" (سلیمان-۳) یہ اسی درس کی طرف اشارہ ہے، چند ماہ کے بعد برسات میں حسب دستور مولانا جب بمبئی گئے تو یہ کام دارالعلوم کے مدرس اعلا مولانا حفیظ اللہ صاحب کے سپرد کر گئے، استفسار کے جواب میں ۲/ اگست ۱۹۰۶ء کو لکھتے ہیں، قرآن کا درس ہو لیکن تحقیق کے ساتھ ہو، سرسری بے کار ہے، یہ سلسلہ اس طرح آگے نہ چل سکا، آخر اپنے بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب مصنف نظام القرآن کو لکھا کہ وہ اپنی تعطیل میں آ کر مدرسہ کے لڑکوں کو قرآن پڑھا دیں[1]، چنانچہ وہ دو سال تک اپنی تعطیل میں آ کر قرآن پاک کا درس دیتے رہے۔

رفیق مولوی ضیاء الحسن علوی اور مجھے خاص طور سے مولانا نے قرآن پاک کے اصول بلاغت پر اسباق بھی پڑھاتے رہے اور املا بھی کراتے رہے، مولوی ضیاء الحسن صاحب نے اس درس کے ان ہی معلومات کو ایک سلسلۂ مضمون میں لکھا جو الندوہ میں چھپا اور لوگوں نے اس کی تعریف کی اور دستار بندی کے جلسہ میں ۱۹۰۶ء میں انہوں نے قرآن پاک کی بلاغت پر بھرے جلسہ میں تقریر کی۔

بہر حال دارالعلوم کی خصوصیات میں یہ چیز اب تک باقی ہے اور قرآن پاک کا درس وہاں الحمدللہ کہ اب بھی جاری ہے اور اس کی تقلید بھی ہوتی جا رہی ہے۔

انقلابِ زمانہ زمانہ کے اتنے پے در پے انقلابات کے بعد آخر ان علما کرام کو بھی جن کو شروع میں قدیم نصابِ عربی کی اصلاح کی تجویزوں سے اختلاف تھا، مولانا کا ہم نوا ہونا پڑا، جمعیۃ العلما کے اجلاس لاہور منعقدہ ۲، ۳، ۴/ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ میں جناب مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کی تائید سے یہ تجویز ہمارے سامنے ہے۔

"جمعیۃ العلما کا یہ اجلاس مدارسِ عربیہ دینیہ کے مروجہ نصاب میں دور حاضر کی ضرورتوں کے موافق اصلاح و تبدیلی کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہے اور مدارس عربیہ کے ذمہ دار حضرات اور تعلیمی جماعتوں

[1] مکاتیب حمید، ۳۷ و ۳۹۔

سے اپیل کرتا ہے کہ وہ ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی اس پر غور کرنے کے لیے باہمی مشورہ اور تعاون سے مقرر کر کے ایک ایسا نصاب مرتب کرائیں جو دینی علوم کی تکمیل کے ساتھ ضروریاتِ عصریہ میں بھی مہارت پیدا کرنے کا کفیل ہو اور اس سلسلہ میں جمعیۃ علمائے ہند ارباب علم سے رائے لے کر اپنی صوابدید کے مطابق حتی الوسع جلد کوئی موثر عملی اقدام کرے۔"

لیجیے وہی چیز جو کبھی موردِ اعتراض تھی، اتنے دنوں میں جا کر موردِ تحسین بنی، وللہ الحمد۔

ندوہ کا کتب خانہ تعلیمی مرکزوں کے لیے کتب خانوں کے وجود سے چارہ نہیں، اس لیے دارالعلوم کے ساتھ ساتھ ایک کتب خانہ کا خیال بھی پہلے سے قائم تھا، اس کی ابتدائی صورت یہ تھی کہ ندوہ جب کان پور میں تھا، اسی وقت سے ایک دارالافتا کی شاخ بھی قائم تھی اور اس کے لیے فقہ کی کچھ کتابیں دفتر میں یک جا تھیں، اس کے بعد دارالعلوم کے قیام کے بعد ۱۳۱۶ھ-۱۸۹۹ء میں ندوہ کا سالانہ اجلاس جب شاہ جہاں پور میں ہوا تو وہاں کے ایک صاحب علم رئیس ڈپٹی مولوی عبدالرافع خان صاحب نے اپنا موروثی کتب خانہ جس میں تین ہزار کتابیں تھیں، ندوہ کو عنایت فرمایا، اس کے بعد ۱۳۱۸ھ-۱۹۰۰ء میں ندوہ کے اجلاس پٹنہ میں مولوی عبدالغنی وارثی بہاری (مددگار صدر محاسب سرکارِ نظام) نے اپنی کتابیں جو زیادہ تر تاریخ اور محاضرات پر مشتمل تھیں، ندوہ کے نذر کر دیں، اسی زمانہ میں کچھ اور صاحبوں نے اپنے اپنے بزرگوں کے علمی سرمایوں کو جو ان کے قابل نہیں رہے تھے یا وہ اب ان کے قابل نہیں رہے تھے، ندوہ کے حوالہ کر دیا۔

مولانا شبلی مرحوم کی آمد سے پہلے ندوہ کے کتب خانہ کا سرمایہ اسی قدر تھا، مولانا کو کتابوں سے جو شغف تھا وہ بیان کا محتاج نہیں وہ ۱۹۰۵ء میں جب ندوہ آ کر بیٹھے تو دوسرے صیغوں کے علاوہ اس صیغہ کی طرف بھی توجہ فرمائی، سب سے پہلے اپنے کتب خانہ کو جو اعظم گڑھ میں پڑا تھا اور جس کو کبھی تین ہزار روپے میں بہ ضرورت علاحدہ کرنا چاہتے تھے، لکھنؤ میں منتقل کرا لیا اور ۱۹۰۷ء میں اس کو ندوہ پر وقف کیا، اس کتب خانہ میں تاریخ و ادب کا بڑا سرمایہ تھا اور مصر و شام و قسطنطنیہ کے مطبوعات کے علاوہ یورپ کے بعض نادر مطبوعات بھی تھے۔

مولانا کی تحریک سے مولانا کے بعض دوستوں نے بھی توجہ فرمائی، جون ۱۹۰۷ء میں نواب سکندر نواز جنگ حافظ احمد رضا خاں صاحب سکندر منزل پٹنہ (سابق جج ہائی کورٹ حیدر آباد دکن) نے اپنی کتابیں نذر کیں، ان کتابوں کو پٹنہ سے لانے کا کام خاکسار کے سپرد ہوا، جس کو بہ خوشی انجام دیا، اسی سال شمس العلما نواب عزیز جنگ بہادر حیدر آباد دکن اور حکیم علی احمد صاحب نے اپنی کتابیں ندوہ کو دیں،

مارچ ۱۹۰۸ء میں پٹنہ سے آنریبل مولوی شرف الدین صاحب جج ہائی کورٹ کلکتہ نے بھی اپنی کتابیں بھیجیں[1]، نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے نواسہ سید مرتضیٰ صاحب نے اسی سال اپنے حصہ کی کتابیں ندوہ کے حوالہ کر دیں، نواب عماد جنگ بہادر (حیدر آباد) کا کتب خانہ جس میں مطبوعات یورپ کا اچھا ذخیرہ تھا، اسی زمانہ میں ندوہ میں آیا، ۱۹۱۰ء میں امیٹھی سے مولوی یوسف علی صاحب مرحوم کا کتب خانہ جس میں متعدد نایاب قلمی کتابیں تھیں، ندوہ میں شامل ہوا، (الندوہ جولائی ۱۹۱۰ء) اسی سال نواب علی حسن خاں صاحب خلف الصدق نواب صدیق حسن خاں نے اپنی کتابیں ندوہ کے نذر کیں، ان کی ہمشیرہ مرحومہ صفیہ بیگم کے حصہ کی کتابیں اس سے دو ایک سال پہلے ندوہ کے کتب خانہ میں داخل ہو چکی تھیں، دلی سے نواب احمد سعید خاں بہادر خلف نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر مرحوم کی کتابیں آئیں، یہ وہی کتب خانہ تھا جس کی مدد سے الیٹ نے تاریخ ہند لکھی تھی، نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے اپنا کتب خانہ جس میں انگریزی اور عربی کتابوں کا بڑا سرمایہ تھا مارچ ۱۹۱۱ء میں ندوہ کے حوالہ کیا، مولانا نے ان کو لانے کے لیے مجھے حیدر آباد بھیجا[2]، یہ میرا حیدر آباد کا پہلا سفر اور نواب عماد الملک سے میری ملاقات کا پہلا ذریعہ تھا، میں ایک مہینہ کے قریب مولوی عبدالغنی صاحب وارثی (مددگار صدر محاسب سرکار عالی) کے یہاں مقیم رہا اور روزانہ نواب صاحب کے یہاں جا کر نواب صاحب کے ساتھ مل کر کتابیں الگ کرتا رہا، نواب صاحب مرحوم اپنے ہاتھ سے کتابیں چھانٹ چھانٹ کر الگ کرتے جاتے تھے اور میں رکھتا جاتا تھا، اگر نواب صاحب مرحوم اپنی زندگی میں یہ نہ کر جاتے تو عجب نہیں کہ ان کے بعد ان کی کتابوں کا بھی وہی حشر ہوتا جو ان کے بھائی مولوی سید علی صاحب بلگرامی کی کتابوں کا ہوا۔

عطیات کے علاوہ نئی کتابوں کی خریداری کا سلسلہ بھی شروع فرمایا، مختلف مدوں سے وہ کتب خانے کے لیے روپیہ الگ رکھتے تھے، جب کوئی نئی کتاب چھپتی اور اس کا نام مصری رسالوں اور فہرستوں میں پڑھتے تو مجھے ان کے منگوانے کی ہدایت[3] فرماتے اور وہ منگوائی جاتی، اس طرح ۱۹۰۹ء تک کتب خانہ میں جو سرمایہ فراہم ہوا تھا، اس کی تعداد[4] ۶۲۸۲ تھی اور ۱۹۱۳ء میں جب وہ ندوہ سے الگ ہوئے ہیں، یہ تعداد دونی ہو گئی تھی، یعنی[5] ۱۲۱۰۵ اور اب یہ تعداد تگنی ہو گئی ہے۔

---

[1] مکتوبات بہ نام شروانی، ۴۳ [2] مکتوبات ابوالکلام آزاد ۲۶ [3] مکتوبات سلیمان ۲۶ [4] روداد دارالعلوم مرتبہ مولانا شبلی بابت ۷، ۸، ۱۹۰۹ء ص ۱۷ [5] رپورٹ ندوۃ العلماء، مرتبہ مولوی خلیل الرحمن صاحب سہارن پوری، جو ۳ را پریل ۱۹۱۵ء کے جلسہ عام میں پیش ہوئی ص ۸۔

الندوہ

۱۹۰۴ء/۱۳۲۲ھ-۱۹۱۲ء/۱۳۳۱ھ

الندوہ کا ذکر اس سے پہلے آجانا چاہیے تھا، کیوں کہ اس کا آغاز ۱۹۰۴ء میں ہو چکا تھا لیکن چوں کہ اس کی اشاعت سے ایک بڑی غرض طلبائے دارالعلوم کی ذہنی ترتیب تھی، اس لیے اسی سلسلہ میں اس کا ذکر اس موقع پر کیا جاتا ہے[1]۔

مولانا کو الندوہ یعنی ندوۃ العلما کی طرف سے ایک علمی رسالہ کی اشاعت کا خیال غالباً ۱۹۰۲ء میں آیا، اس قسم کے علمی رسالوں کا تجربہ ارکان میں مولانا سے زیادہ کسی اور کو نہ تھا لیکن جب ندوہ کی طرف سے یہ رسالہ نکالنا طے ہوا تو ارکان نے صرف مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو اس کا اڈیٹر بنایا، مولانا کو ارکان کی اس فروگزاشت پر تعجب ہوا، ۲۴ راگست ۱۹۰۲ء کو مولانا شروانی کو شکایت لکھی "رسالہ ندوہ اور نصاب تعلیم دونوں چیزیں میرے خاص مذاق کی تھیں اور شاید میں اس کام کو کسی قدر انجام بھی دے سکتا تھا، دونوں سے آپ نے مجھ کو الگ رکھا، مجھ کو ان کی شرکت سے عزت اور نام وری مقصود ہوتی تو اس کے لیے علی گڑھ سے بہتر میدان نہیں، مقصود یہ تھا کہ یہ کام اچھی طرح انجام پا جائے۔" (شروانی-۴۱) یہی شکایت ۶ ردسمبر ۱۹۰۲ء کو ایک خط میں دوبارہ دہرائی گئی ہے۔ (شروانی-۴۳)

مولانا شروانی اس کوشش میں تھے کہ اپنی ذمہ داری میں وہ مولانا شبلی کو بھی شریک کرلیں اور اس کے لیے وہ ارکان سے خط و کتابت کر رہے تھے، اس کی نسبت ۸ رنومبر ۱۹۰۲ء کو مولانا شبلی نے انہیں لکھا "رسالہ کے اڈیٹروں میں مولوی محمد علی صاحب (ناظم) غالباً میرا نام پسند نہ کریں، پھر آپ "مہمان را با فضولی چہ کار" کیوں کرتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ میں رسالہ کے لیے موجودہ حالت میں تیار بھی نہیں، ندوہ نے اپنی تجویزوں کے جو نمونے دکھائے یعنی دارالعلوم و دارالافتا وغیرہ وغیرہ کیا رسالہ بھی ایسے ہی نمونہ پر نکالنا مقصود ہے؟ مجھ کو تو ایسے ہی سامان نظر آتے ہیں، علما میں کون صاحب لکھنے کے قابل ہیں اور نہیں تو کیا ندوہ کا رسالہ بھی نیچریوں کی مدد سے نکلے گا؟ اور وحیدالدین[2] و مولوی عبدالعلی و مرتضٰی سے دریوزہ گری کیجیے گا، ایک آپ کیا کیا کریں گے"؟ (شروانی-۴۵)

---

[1] حسب تصریح مولانا شروانی [2] مولوی وحیدالدین سلیم معارف علی گڑھ سے نکالتے تھے اور مولوی عبدالعلی صاحب اور مولوی مرتضٰی صاحب جو اس زمانہ کے مولوی فاضل تھے، اس میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

اس کمی کو دوسرے ارکان نے بھی محسوس کیا، چنانچہ ۱۷؍شعبان ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳ء) کے جلسۂ انتظامیہ میں مولوی عبدالحئی صاحب وکیل چندوسی کی تحریک اور منشی محمد اطہر علی صاحب کی تائید سے مولانا الندوہ کے اڈیٹر قرار دیے گئے۔

۱۹۰۳ء کے آخر میں مولانا نے رسالہ کا ایک خاکہ (مسودہ) بنا کر دفتر میں لکھنؤ بھیجا مگر وہ یونہی پڑا رہا، شاہ جہاں پور میں ناظم صاحب کے پاس بھیجا نہیں گیا۔ ۳، ۴، ۵؍جنوری ۱۹۰۴ء کو ندوہ کا اجلاس جب مدراس میں ہوا تو ناظم صاحب نے فرمایا کہ ''مجھے اس مسودہ کی خبر بھی نہیں ہوئی، آخر مدراس ہی میں ۱۵؍شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۴؍جنوری ۱۹۰۴ء کے جلسۂ انتظامیہ میں مولوی شاہ ابوالخیر صاحب غازی پوری کی تحریک اور مولانا شبلی کی تائید سے یہ طے ہوا کہ ایک مہینہ کے اندر رسالہ کی درخواست ناظم صاحب کی طرف سے گزر جائے اور رسالہ کی نگرانی وتصحیح وغیرہ دفتر کی نظامت سے کی جائے، اس پر بھی دو ہفتے گزر گئے تو ۲۲؍جنوری ۱۹۰۴ء کو شروانی صاحب کو لکھا، میں نے رسالہ کا مسودہ بھیجا، وہ دفتر میں پڑا رہا، ناظم صاحب نے مدراس میں کہا کہ مجھ کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی۔''

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں ''ناظم حال رسالہ ندوہ کی درخواست دیتے ہوئے بہت ہچکتے ہیں، ڈرتے ہیں کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں، مشکل یہ ہے کہ ناظم کے سوا اور کوئی شخص درخواست نہیں دے سکتا، ورنہ میں سو دفعہ درخواست دے چکتا۔''[1]

بہرحال یہ مشکل یوں حل ہوئی کہ مددگار ناظم مولانا سید عبدالحئی صاحب نے اپنے نام سے درخواست دی اور وہ منظور ہوئی۔

اس وقت ندوہ کا دفتر سخت انتشار کی حالت میں تھا، ندوہ کے قائم مقام ناظم مولانا مسیح الزماں خاں صاحب رئیس شاہ جہاں پور تھے، اس لیے مولانا سید عبدالحئی صاحب مددگار ناظم، ندوہ کا آدھا دفتر لے کر شاہ جہاں پور چلے گئے تھے اور آدھا دفتر لکھنؤ میں تھا، بہرحال اسی انتشار کی حالت میں ۱۹۰۴ء کے اواخر میں الندوہ کی اشاعت کے سامان اس طرح مکمل ہوئے کہ مولانا سید عبدالحئی صاحب مددگار ناظم کے قیام شاہ جہاں پور کے سبب سے شاہ جہاں پور اس کا مقام اشاعت ہوا، رسالہ کے دو اڈیٹر مقرر ہوئے، ایک مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جو علی گڑھ میں تھے اور دوسرے مولانا شبلی جن کا قیام ان

---

[1] مکاتیب اول، شروانی، ۳۵۔

دنوں حیدر آباد میں تھا، اس کی چھپائی کا انتظام آگرہ میں صوفی محمد علی خان کے مطبع مفید عام میں ہوا اور اس کا مقصد جیسا کہ اس کی لوح پر لکھا ہوا تھا ''علوم اسلامیہ کا احیاء تطبیق معقول و منقول اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ قرار پایا، ضخامت ۲ جز یعنی ۳۲ صفحے ٹھہری اور اس شان سے اگست ۱۹۰۴ء مطابق جمادی الاولی ۱۳۲۲ھ میں اس کا پہلا نمبر منظر عام پر آیا۔

پرچے میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، معقول و منقول اور قدیم و جدید علوم کے موازنہ اور عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر بہت سے محققانہ مضمون شایع ہوئے جو زیادہ تر مولانا شبلی مرحوم ہی کے قلم سے نکلے تھے، اس رسالہ نے شاید سیکڑوں برس کے بعد علما کی سطحِ جامد میں حرکت پیدا کی تھی، اب تک علما کے تحقیقاتی مسائل، منطق، عقائد اور فقہ کے چند ایسے مسائل قرار پائے ہوئے تھے جن پر گو بہت لکھا جا چکا تھا، پھر بھی جو آتا تھا وہ ان ہی کو دہرا دہرا کر اپنا اور دوسروں کا وقت ضایع کرتا تھا، منطق و فلسفہ کی بعض درسی کتابوں کی شرحیں لکھنا، حاشیے لکھنا، تعلیقات لکھنا غیر مفید مناظرانہ رسائل تالیف کرنا یہ علما کے مشاغل تھے، حالاں کہ زمانہ کا رُخ ادھر سے ادھر پھر چکا تھا اور حالات نے اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے کچھ اور ہی ضروریات پیدا کر دیے تھے، الندوہ کا بڑا فیض یہ ہے کہ اس نے علمائے کرام کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا اور ان کو کتنی ہی ناگواری ہوئی ہو اور ان کی پیشانی پر کتنے ہی بل پڑ گئے ہوں لیکن انھوں نے اس کو پڑھا اور پڑھنے پر مجبور ہوئے۔

اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علما کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا، اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے نئے طریقے ان کو نظر آئے، زبان و بیان کے انداز اور پیرائے معلوم ہوئے اور جو اس کو پسند کرتے تھے، وہ بھی اور جو نہیں پسند کرتے تھے وہ بھی اس کو پڑھ کر اس کے مطابق لکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

الندوہ کا اثر خصوصیت کے ساتھ نوجوان علما اور قریب فارغ التحصیل طلبہ پر بے حد پڑا اور نام نہیں لوں گا، مگر بتا سکتا ہوں کہ بڑے بڑے مقدس آستانوں اور درس گاہوں کے حاشیہ نشینوں نے اس کے طرز نگارش اور پیرایۂ بیان کی نقل اتاری اور اپنے اپنے دائرہ میں نام وری حاصل کی اور ان سے دین و ملت کو فائدہ پہنچا۔

خود دار العلوم کے طالب علموں کو اس سے بہت فائدہ پہنچا اور کئی مستعد طالب علموں کی (جو اس وقت کے مشہور مصنف ہیں) بسم اللہ اسی دبستان میں ہوئی اور اس طرح اہل علم بھری محفل میں ان کو زبان کشائی کی جرأت ہوئی، چند ہی نمبروں کے بعد اہل نظر کی نگاہیں، الندوہ کی اس افادی حیثیت

پر پڑیں، الندوہ میں علم حدیث پر دارالعلوم کے ایک طالب العلم (سید سلیمان بہاری) کا جو مضمون چھپا تھا اس کو پڑھ کر مولانا حالی نے مولانا کو لکھا "سب سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ دارالعلوم نے اپنی تعلیم کا نہایت عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا ہے، فبارك الله فيها و فی طلبتها وفی تعليمها مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کامل تعلیم اور انگریزی کی بہ قدر ضرورت ہماری قوم میں ایسے لایق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی کہ محض انگریزی تعلیم آج تک ویسا ایک بھی نہیں پیدا کر سکی[1]۔"

اس سلسلہ میں مولوی ضیاء الحسن علوی ندوی ایم اے (انسپکٹر مدارسِ عربیہ الہ آباد) مولوی عبدالسلام صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین، مولوی خواجہ عبدالواحد صاحب ندوی ایم، اے کان پور اور دوسرے طلبہ قابل ذکر ہیں، مولوی اکرام اللہ خاں ندوی، مولوی عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم، مولوی قمرالدین ندوی مرحوم وغیرہ بھی اس کے دوسرے دور کی یادگار ہیں۔

الندوہ میں وقتاً فوقتاً جو مضامین نکلے، ان میں سے قابل ذکر مضامین کی فہرست ۱۹۰۶ء میں خود مولانا نے ایک موقع پر دی ہے، جو یہ ہے، علوم القرآن[1]، فلسفہ یونان[2] پر مسلمانوں نے کیا اضافہ کیا، علوم جدیدہ[3]، ابن[4] رشد، فن بلاغت[5]، تذکرہ مولوی[6] غلام علی آزاد بلگرامی، فن نحو کی مروجہ[7] کتابیں، مسائل فقہیہ[8] پر ضروریاتِ زمانہ کا اثر، موبدانِ مجوس[9]، ذو النون مصری[10]، فارسی[11] شاعری اور عرفی شیرازی، مسلمانوں[12] کی بے تعصبی، پردہ اور[13] اسلام، ابن جوزی کی کتاب[14] مناقب عمر بن عبدالعزیز پر ریویو، جمہرۃ[15] البلاغہ، سوانح امام[16] بخاری اور ان کی تصنیفات، المرأۃ المسلمہ پر[17] ریویو۔

ان میں گیارہواں مضمون مولانا شروانی کا پندرہواں دراصل مولانا حمید الدین فراہی کا سولہواں، سید سلیمان بہاری کا اور سترہواں مولانا ابوالکلام کا ہے، باقی سب اپنے وجود میں مولانا کے قلم کے رہین منت ہیں۔

ان کے علاوہ جو مضامین نکلے ان میں اعجاز القرآن، مسئلۂ ارتقا اور حکمائے اسلام عربی زبان کی خصوصیات، مسئلہ تناسخ، شیخ الاشراق سہروردی، مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ، جرجی زیدان کے تمدن اسلام پر ریویو، الاحتساب فی الاسلام، اشتراکیت اور اسلام، قضا و قدر وغیرہ بیسیوں مضامین ہیں جو آج بھی ہماری زبان میں معلومات کا سرمایہ اور تحقیقات کا خزانہ ہیں۔

---

[1] الندوہ، ربیع الآخر ۱۳۲۳ھ۔

الندوہ کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ اس نے متعدد ایسے اشخاص کو روشناس کیا جو آگے چل کر علم و فن کی مسند پر متمکن ہوئے اور جن کے کارناموں سے آج بھی یہ گنبد مینا پرشور ہے، ان میں سب سے پہلا نام، مولانا عبداللہ العمادی کا ہے جو جون پور کے ایک گاؤں کے رہنے والے اور ادب میں مولانا عبدالعلی آسی مدراسی لکھنوی کے شاگرد ہیں اور اس زمانہ میں عربی رسالہ البیان لکھنؤ کے اڈیٹر تھے، وہ فارسی وعربی ادبیات وتاریخ سے فطری مناسبت رکھتے تھے اور مولانا سے لکھنؤ میں اکثر ملتے رہتے تھے، مولانا نے جب ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ آکر قیام کیا اور الندوہ کا دفتر شاہ جہاں پور سے لکھنؤ آیا تو رسالہ مولوی عبدالعلی صاحب آسی مدراسی مرحوم کے مطبع اصح المطابع لکھنؤ میں چھپنے لگا، جہاں سے البیان نکلتا تھا، جون ۱۹۰۵ء سے مولانا عمادی کو الندوہ کی ادارت سپرد ہوئی، اس سلسلہ میں ان کے مضامین اعجاز القرآن اور علم مناظرہ وغیرہ نکلے، موصوف یہاں سے نکل کر ''وکیل'' امرتسر ''زمین دار'' لاہور اور ''الہلال'' کلکتہ میں ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے اور اب وہ سالہا سال سے دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ میں عربی کے مترجم اور وہاں کے علمی حلقوں کے رکنِ رکین ہیں۔

اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی الندوہ کے سب اڈیٹر رہے، اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے، ۱۹۰۵ء میں وہ مولانا شبلی سے ممبئی میں ملے اور یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی کہ ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنادیا، مولانا شبلی مرحوم ان کو اپنے ساتھ ندوہ لائے اور ایک زمانہ تک ان کو اپنے پاس ندوہ میں رکھا، وہ ان کی خلوت وجلوت کی علمی صحبتوں میں شریک رہتے اور اپنی مستثنیٰ فطری صلاحیتوں کی بدولت ہر روز آگے بڑھتے جاتے تھے، یہیں انہوں نے مولانا حمیدالدین صاحب کے ساتھ کچھ دن بسر کیے، جن کو قرآن پاک کے ساتھ عشق کامل تھا اور اس عشق کا اثر صحبت کی تاثیر سے مولانا ابوالکلام میں بھی سرایت کر گیا اور یہی رنگ تھا جو نکھر کر الہلال میں نظر آیا۔

مولانا ابوالکلام نے الندوہ میں پہلا مضمون مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ لکھا جو اکتوبر ۱۹۰۵ء میں چھپا، اس کے بعد ''المرأۃ المسلمۃ'' کے نام سے مصر کے قاسم امین بک اور فرید وجدی نے مسلمان عورتوں کی بے پردگی اور پردہ پر جو کچھ لکھا تھا اس پر مفصل تبصرہ لکھا جو الندوہ کے کئی نمبروں میں چھپا ہے، یہی سلسلۂ تحریر ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کی علمی دنیا میں مولانا ابوالکلام کے نام کو بلند کیا اور ہر طرف مولانا شبلی سے ان کی نسبت استفسار ہونے لگا، اسی قسم کے ایک خط کے جواب

میں مولانا لکھتے ہیں'' آزاد کو تو آپ نے مخزن[1] وغیرہ میں ضرور دیکھا ہوگا، قلم وہی ہے، معلومات میں یہاں رہنے سے ترقی کر گئے ہیں۔'' (مہدی-۱۹)

الندوہ میں ان کے مضامین نے ان کے نام کو ہر طرف پھیلا دیا اور اخباروں اور رسالوں سے ان کی مانگ شروع ہوگئی، آخر کار وہ ۱۹۰۶ء میں ''وکیل'' امرتسر میں چلے گئے اور قریباً دو سال وہاں رہے ہوں گے، اسی اثنا میں ان کے بڑے بھائی مولوی ابوالنصر غلام یٰسین صاحب آہ کا عراق میں جہاں وہ سیر و سیاحت کے لیے گئے ہوئے تھے، انتقال ہوا اور اس کے بعد ہی ان کے والد ماجد مولانا خیرالدین صاحب نے جن کے بمبئی اور کلکتہ میں ہزارہا مرید تھے، وفات پائی، رحلت کے وقت انہوں نے مولانا ابوالکلام کو بلوا کر اپنا جانشین بنایا، اب انہوں نے امرتسر چھوڑ کر پہلے بمبئی میں اور پھر کلکتہ میں قیام کیا اور ہدایت و ارشاد خلق میں مصروف ہوئے، آخر ۱۹۱۲ء میں انہوں نے ''الہلال'' نکالا اور جس طرح نکالا اور اس نے اسلامی سیاسیات پر جو اثر ڈالا اور اس کے بعد کے واقعات سب کے سامنے ہیں لیکن اتحاد اسلامی اور وطنی سیاست میں کانگریس کی ہمراہی جس صحبت کا فیض ہے وہ اس سوانح کے اوراق سے ظاہر ہے۔

۱۹۰۶ء میری تعلیم کا آخری سال ہے، مولانا ابوالکلام کے امرتسر چلے جانے کے بعد مولانا نے الندوہ کا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر رکھ دیا، جس کو میں نے مارچ ۱۹۰۸ء تک انجام دیا، اس کے بعد اپریل ۱۹۰۸ء سے یہ پھر عمادی صاحب کے سپرد ہوا (سلیمان-۲۲) اور جون و جولائی ۱۹۰۸ء کے دو نمبر ان کی ادارت میں نکلے تھے کہ وہ پھر میرے حوالہ کر دیا گیا، اگست ۱۹۰۸ء سے فروری ۱۹۱۰ء تک میں نے دوبارہ اس کی ادارت کا فرض انجام دیا۔

اس کے بعد یہ عزت ہمارے دوست مولوی عبدالسلام صاحب ندوی کو حاصل ہوئی، انہوں نے اپنا پہلا مضمون تناسخ پر ۱۹۰۶ء میں لکھا تھا، جس کو دیکھ کر مولانا بے حد خوش ہوئے اور اس کو الندوہ مئی ۱۹۰۶ء میں اپنی پسندیدگی کے اظہار کے ساتھ بہت شوق سے چھاپا اور یہ خوش خبری اکتوبر ۱۹۰۶ء کو اپنے ایک خط میں مہدی افادی کو جو ادب اردو کے دلدادہ تھے، ان لفظوں میں پہنچائی'' ہمارے یہاں یعنی ندوہ میں عبدالسلام نہایت قابل لڑکا ہے جو غالباً خالی ہونے والی کرسیوں کا مستحق ہوگا۔ (مہدی-۲۷)

---

[1] رسالہ مخزن لاہور سے (سر) شیخ عبدالقادر ۱۹۰۱ء سے نکالتے تھے، مولانا ابوالکلام کے ابتدائی مضمون اسی میں نکلے تھے، خود میرے بھی ابتدائی مضمون اسی میں چھپے تھے۔

پھر ۱۳؍ دسمبر ۱۹۰۶ء کو انہیں لکھا ''عبدالسلام نہایت ہونہار ہے، وہ پورا مصنف ہوسکتا ہے اور ہوگا، انگریزی نہیں جانتا لیکن پڑھ رہا ہے، ندوہ اس قسم کے جواہر کا چمکانے والا ہے۔'' (مہدی-۲۹)

بالآخر زمانہ نے اس پیشین گوئی کو حرف بہ حرف صحیح ثابت کر دیا۔

مولوی عبدالسلام صاحب نے اس اثنا میں شیخ الاشراق سہروردی اور امام مسلم وغیرہ پر مضامین لکھے اور آخر ۱۹۰۹ء میں جب وہ پڑھ کر فارغ ہوئے تو الندوہ کی ادارت ان کے حوالہ کر دی گی، جس کو انہوں نے مارچ ۱۹۱۰ء سے جولائی ۱۹۱۱ء تک بہ خوبی انجام دیا، اس کے بعد یہ خدمت اگست ۱۹۱۱ء سے پھر تیسری دفعہ میرے سپرد ہوئی، جس کو میں نے مئی ۱۹۱۲ء تک پورا کیا اور اسی پر اس الندوہ کا خاتمہ ہوا جس کے اڈیٹر مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے، ندوہ کے اختلافات نے اس کا خاتمہ کیا تھا، ندوہ کے دوسرے فریق نے یہ امانت دارالعلوم ندوہ کے ایک مدرس مولانا عبدالکریم صاحب کے سپرد کی جو دارالعلوم کے چند منتہی لڑکوں کی مدد سے اس کو چند مہینے چلاتے رہے، بعد ازیں مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی نے اس کی ادارت کا بوجھ اٹھایا اور آخر ۱۹۱۶ء میں وہ بہ ظاہر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا، مگر اب ۲۲ سال کے بعد میں نے بعض ندوی عزیزوں کو اس کی ادارت دے کر جنوری ۱۹۴۰ء سے دوبارہ نکالنے کا اہتمام کیا ہے، **والامر بید اللہ تعالیٰ**۔

الندوہ نے ملک میں جو علمی نتائج پیدا کیے وہ حسب ذیل ہیں:

۱- اردو زبان میں علمی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا۔

۲- جدید تعلیم یافتوں کو اسلام کے مذہبی اور علمی کارناموں سے آشنا کیا۔

۳- علما کو جدید مسائل سے روشناس کیا۔

۴- عربی خواں طلبہ میں اپنے پرانے ذخیروں سے کام لینے کا سلیقہ پیدا کیا۔

۵- اسلام اور تاریخ اسلام پر سے بہت سے اعتراضوں کو دفع کیا۔

۶- قوم میں ندوہ کے مقاصد کی تبلیغ کی، اصلاحِ نصاب کی ضرورت سمجھائی اور عربی تعلیم کی اہمیت ذہن نشین کی۔

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے بھی اپنے مضمون میں الندوہ کی اہمیت ان لفظوں میں بیان کی ہے، مولانا کا اہم کام الندوہ تھا جس نے مسلمانوں کے لیے بہت سا محققانہ تاریخی سامان فراہم کر دیا اور اس کے سلسلے میں مولانا نے بڑے بڑے اہم مسائل میں تحقیق و تدقیق سے کام لیا۔

بھوپال کی ماہانہ امداد اب تک جو کچھ کہا گیا وہ مولانا کی ان خدمات کا تذکرہ تھا جو انہوں نے دارالعلوم کی علمی و تعلیمی ترقیوں کے لیے کیں لیکن ابھی ان کی ان خدمتوں کا تذکرہ باقی ہے جو دارالعلوم کی مالی ترقی اور اس کی تعمیر کے سلسلہ میں انہوں نے فرمائیں، اب تک دارالعلوم کی مستقل آمدنی نہ تھی، سالانہ جلسوں اور سفرا کے دوروں سے جو چندہ وصول ہوتا تھا وہ مدرسہ پر خرچ ہوتا تھا، ریاست حیدرآباد نے نواب وقار الامرا کے عہد وزارت میں نواب وقار نواز جنگ مولوی وحید الزماں خاں صاحب کی کوشش[1] سے غالباً ۱۹۰۰ء میں پچاس روپے ماہوار دفتر ندوۃ العلما کے لیے اور پچاس مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوہ کے لیے مقرر کیا تھا، جس کو انہوں نے بکمال ایثار ندوہ کو منتقل کر دیا تھا، یہ سو روپے ماہوار مجلس ندوۃ العلما کے ماہانہ مصارف میں کام آتے تھے۔

البتہ ۱۹۰۲ء میں جب ندوہ کا اجلاس پہلی دفعہ امرتسر میں ہوا تو نواب محمد بہاول خان عباسی فرماں روائے بھوپال کے سمع مبارک تک ندوہ کی آواز پہنچی اور انہوں نے اس کی امداد کی طرف توجہ فرمائی[2]، پھر ۱۹۰۴ء میں تین سو سالانہ مدرسہ کے غریب طالب علموں کے وظیفہ کے لیے مقرر فرمائے[3]، دارالعلوم کے لیے یہ پہلی مستقل امداد تھی۔

اوائل ۱۹۰۵ء میں جب مدرسہ کے انتظامات کی باگ مولانا نے اپنے ہاتھ میں لی تو ادھر بھی توجہ فرمائی اور یہ طے ہوا کہ مختلف مقامات میں وفود روانہ کیے جائیں اور قوم کے رئیسوں کو ندوہ کی امداد کی طرف متوجہ کیا جائے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے مولوی غلام محمد صاحب شملوی کو بھوپال و احمد آباد کی طرف روانہ کیا گیا، بھوپال پہنچ کر ندوہ کے دوستوں نے یہ مشورہ دیا کہ اس کام کے لیے خود مولانا کو تکلیف دی جائے، چنانچہ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں مولانا خود بھوپال تشریف لے گئے، سرکار عالیہ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرماں روائے بھوپال نے مولانا کو ملاقات کا موقع بخشا، مولانا اس ملاقات سے بے حد متاثر ہوئے اور یہ تاثرات ۳۰/ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو قلم بند کر کے الندوہ (اکتوبر ۱۹۰۵ء) میں چھپوائے، اس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکار عالیہ نے نومبر ۱۹۰۵ء میں مولانا کی موجودگی ہی میں پچاس روپے ماہوار کی امداد جاری فرمائی، مولانا نے تار کے ذریعہ سے جب یہ خبر دارالعلوم میں بھیجی تو ہر طرف عید کی سی خوشی چھا گئی۔

---

[1] مکاتیب سلیمان، ۵۱ [2] روداد امرتسر ۱۹۰۲ء، ص ۱۴۵ [3] روداد مدراس ۱۹۰۴ء، ص ۱۰۵۔

اجلاس بنارس ۱۹۰۶ء اور پہلی علمی نمائش | مولانا کی معتمدی سے پہلے ندوہ کے بڑے بڑے دس شاندار جلسے بڑے بڑے شہروں میں بلا انقطاع ہو چکے تھے، پچھلا دسواں جلسہ شروع جنوری ۱۹۰۴ء میں مدراس میں ہوا تھا، اس کے بعد باقی ۱۹۰۴ء اور پورا ۱۹۰۵ء جلسوں سے خالی گیا، مولانا دھوم دھام کے جلسوں کے قائل نہ تھے، بلکہ اس کے ذریعہ سے کچھ کام چاہتے تھے، سرکار عالیہ کی فیاضی سے جب امید کی پہلی شعاع نظر آچکی تو جلسۂ سالانہ کی فکر ہوئی، اس کے لیے اضلاعِ مشرقی کے دو شہر گورکھپور اور بنارس نے پیش قدمی کی، مگر کامیابی بنارس کو ہوئی اور مارچ ۱۹۰۶ء میں بنارس میں ندوہ کے گیارہویں اجلاس کا اعلان ہوا، اس اجلاس میں دو باتیں خاص ذکر کے قابل ہیں، ایک علمی نمائش کا انتظام، جس میں شاہی فرامین، قطعات، نادر قلمی نسخے، تصاویر آلات ہیئت وغیرہ اسلامی علمی یادگاروں کی نمائش کی گئی تھی اور اس غرض سے دور دور سے قلمی کتابیں اور نادر یادگاریں منگوا کر فراہم کی گئی تھیں، دوسری چیز فارسی شاعری اور بعض دوسرے علوم عہد بہ عہد کے دواوین اور تصانیف اس طور سے ترتیب کے ساتھ رکھی گئی تھیں کہ بیک نظر اس فن کی ترقی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا، اس نمائش پر تبصرہ کے عنوان سے مولانا نے ایک نہایت عالمانہ اور محققانہ تقریر فرمائی جس میں ان یادگاروں کی اہمیت اور ان علوم کی تاریخی ترقی پر روشنی پڑتی تھی۔

علمی حیثیت سے یہ جلسہ بہت کامیاب ہوا[1]، اس علمی نمائش کی روداد خود مولانا کے قلم سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے[2]، اس میں اس کی خصوصیات پوری تفصیل سے مذکور ہیں، اسی جلسہ میں مولانا نے پہلی دفعہ طلبا سے مجمع عام میں تقریریں کرائیں اور ان کو پیش کر کے آخر میں یہ شعر پڑھا:

لختے بر داز دل، گذر دہر کہ زپیشم من قاش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

اس جلسہ میں خاکسار نے اور مولوی عبدالباری بہاری مرحوم نے تقریریں کیں، مولوی صاحب مرحوم کی تقریر سب کو بے انتہا پسند آئی، مولانا کا قاعدہ تھا کہ جلسوں میں لڑکوں کو پیش کر کے خود اٹھ جاتے تھے کہ لڑکے مرعوب نہ ہو، مولوی عبدالباری صاحب کی کامیاب تقریر کی خبر سنی تو خوشی میں خود آئے اور اپنی عبا ان کو پہنائی، افسوس کہ انہوں نے عین شباب میں انتقال کیا۔

بنارس میں ہنگامی قیام اور شعر العجم | بنارس کے اجلاس اور علمی نمائش میں فارسی ادب کا پورا

[1] اس نمائش کی تفصیل کے لیے دیکھیے الندوہ مارچ، اپریل، مئی ۱۹۰۶ء [2] مقالات شبلی جلد ہفتم۔

سے مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے کتب خانہ سے منگوایا تھا، یہ ذوق اس وقت اس کا پتہ دے رہا تھا کہ وہ فارسی شاعری کی تاریخ یعنی شعر العجم کی تالیف میں مصروف ہیں، جلسہ کے ختم ہونے کے بعد انہوں نے ایک دومہینہ بنارس ہی میں قیام کیا، شہر کے کنارہ پر ایک بنگلہ لے لیا تھا، اسی میں رہتے تھے، اور شعرائے عجم کی باتوں سے جی بہلاتے تھے، نمائش کی روداد بھی وہیں سے لکھ کر بھیجی اور اس کے متعلق ہدایات مجھے بنارس سے بھیجتے رہے جن کا ذکر مکاتیب میں میرے نام کے ابتدائی خطوط میں ہے، ۱۹؍ اپریل ۱۹۰۶ء کو مجھے ارقام فرمایا۔

"مجھ کو آنے میں ذرا دیر ہوگی، اب انگریزی پر زیادہ توجہ کرو، میں آکر تفسیر کا مستقل درس دوں گا۔"

(سلیمان-۳)

میں نے جلد واپسی کی تمنا ظاہر کی، تو ۲۸؍ اپریل ۱۹۰۶ء کو ارشاد ہوا "بھائی اب مہینہ دو مہینہ تو ستانے دو، ابھی وہاں نہ بلاؤ، یہاں بھی میں سب سے الگ رہتا ہوں، ایک بنگلہ کرایہ پر لے لیا ہے، وہیں رہتا ہوں لیکن لوگوں کو پتہ نہیں دیتا کہ یہاں بھی رات دن کی بک بک نہ رہے" (سلیمان-۷)

اسی زمانہ میں مجھے سیرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا لکھنے کی ہدایت فرمائی اور احادیث و مسانید کی طرف توجہ دلائی۔ (سلیمان-۷)

واپسی اور قرآن پاک کا درس کچھ دنوں کے بعد واپس آکر حسب وعدہ قرآن پاک کا درس شروع فرمایا، جس میں اول تمام طلبہ نے شرکت کی اور سب نے بہ قدر استعداد فیض پایا لیکن آخر میں صرف دو طالب علم رہ گئے، خاکسار اور مولوی ضیاء الحسن صاحب، مولانا گرمی اور لو تو برداشت کر لیتے تھے، مگر برسات کا حبس اور پسینہ برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لیے اس زمانہ میں بمبئی میں سمندر کی آب و ہوا ان کو پسند تھی، چنانچہ قرآن پاک کا درس مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس اول دار العلوم کے سپرد کر کے بمبئی کا سفر کیا۔

بمبئی اور دستۂ گل کا پس منظر میری یاد میں قیام کی غرض سے مولانا کا یہ سفر بمبئی پہلا تھا اور یہی "دستۂ گل" کی عطر بیزی اور مشام پروری کا زمانہ تھا، دستۂ گل کی ابتدائی غزلیں اسی موسم بہار کے پھول ہیں "نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ ونو را" مولانا کو انیس برس کے بعد غزل کا کوچہ یاد آیا تھا، ۱۱؍ ستمبر ۱۹۰۶ء کو بمبئی سے مہدی افادی مرحوم کو لکھتے ہیں "۱۹ برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا، یہاں کی دل چسپیاں غضب کی

محرک ہیں، آدمی ضبط نہیں کرسکتا، اپالو یہاں عجیب سیر گاہ ہے اور چوپاٹی اس کا جواب ہے، خواجہ حافظ کے مصرعہ کو یوں بدل دیا ہے، ''کنار آب چوپاٹی وگلگشتِ پالورا'' اس غزل کا ایک شعر ہے:

بہر سو از ہجومِ دلبرانِ شوخ بے پردا　　　گزشتن از سرِ رہ مشکل افتاد است رہرورا

(مہدی-۲۶)

یہ غزلیں اتنی مست تھیں کہ مولانا حالی نے ان کو حافظ کی غزلوں کے برابر رکھا اور قیاس فرمایا کہ اس میں چشمِ ساقی کی مستی بھی آمیز ہے، خود شاعر نے بھی اپنے اعترافات کا مغالطہ آمیز موقع رکھا ہے:

اند کے نیز بکامِ دل خود بیں باشم　　　روزگارے چو دم از دانش وعرفاں زدہ ام
چند در پردہ تواں کرد سخن فاش بگوئے　　　سنگ بر شیشۂ تقویٰ زدہ ام ہاں زدہ ام
جامۂ زہد چو بر قامتِ من راست نبود　　　شیشۂ تقویٰ سی سالہ بہ سنداں زدہ ام
ان شدائے دوست کہ آراستے پیکر فن　　　نقش زیبا صنمے بر ورقِ جان زدہ ام
آں شدے اے دوست کہ درندہ بہ بنی بازم　　　کہ دم از صحبتِ آں دشمن ایماں زدہ ام

وہ لوگ جن کی سخن فہمی صرف حرفی ہے وہ غلطی سے اس ''دشمن ایمان کی تلاش'' بمبئی میں کرتے ہیں، حالاں کہ وہ علی گڑھ میں تھا، یعنی کہ وہ علی گڑھ تحریک سے الگ ہوکر ندوہ میں شامل ہوگئے۔

یہ غزلیں رسالوں میں چھپیں اور زبان وطرز ادا کی بڑی تعریفیں ہوئیں، معاصر شعرا نے جوابی غزلیں لکھیں جو خوش گمان تھے وہ ان کو تصوف کے رموز واسرار سمجھے اور مولانا سے دست بیعت ہونے اور ان کے پیر کی تلاشیں ہونے لگیں جو بدگمان تھے وہ اس وصف عنوانی کے افراد کی تلاش میں لگ گئے، حالاں کہ واقعہ نہ یہ تھا نہ وہ بلکہ صرف بمبئی کی خوش سوادی اور حسن منظر نے ان کے شاعرانہ جذبات کو ابھار دیا تھا ''خطوطِ شبلیؒ'' کے اوراق میں یہ سامان نہیں، ان کی تاریخ دو برس کے بعد ۱۹۰۸ء سے شروع ہوئی ہے، غزل کے منتخب اشعار ہم ذوق دوستوں اور عزیزوں کو لکھ کر بھیجے تھے، ۵؍نومبر ۱۹۰۶ء مولانا شروانی کو یہ غزل بھیجی:

گرچہ من مرد ہوسنا کی درندی نیستم　　　ایں چنیں ہم گاہ گاہم اتفاق افتادہ بود

۱۶؍نومبر ۱۹۰۶ء کو لکھنؤ سے بمبئی کی ایک غزل کے دو شعر لکھ کر بھیجے، دوسرا شعر ہے:

من فدائے بتِ شوخے کہ بہ ہنگامِ وصال　　　بہ من آموخت خود آئین ہم آغوشی را

مولانا اس کے بعد لکھتے ہیں کہ میں نے تو ایک خیالی بات لکھ دی، لکھنؤ کے ایک صاحب کے

سامنے اخیر کا شعر پڑھا تو کہنے لگے اس کالج کے پروفیسر یہیں مل سکتے ہیں (شروانی-۵۷) یہ میرے سامنے کی بات ہے لکھنؤ کے جن صاحب کا اشارہ اس میں ہے ان کا نام تو یاد نہیں رہا، اتنا یاد رہ گیا ہے کہ وہ ''زہر عشق'' کے مصنف مرزا شوق کے نواسے تھے۔

فروری ۱۹۰۸ء میں جب مدہوش اور دوش والی پہلی غزل کہی ہے:

ساقیِ مست چو سوئے منِ مدہوش آید — ساغر از کف بنہد میکدہ بردوش آید

ایں غزل اولِ فیضِ اثر بمبئی است — باش تا بادہ ایں میکدہ در جوش آید

باش تا شبلی آزاد بہ زیبا صنمے — از در صومعہ تا میکدہ ہم دوش آید

تو مولانا شروانی کی فرمایش سے ان کو بھیجی، آخر میں لکھا ''افسوس یہ ہے کہ ہم نہ صرف پارسائی میں بلکہ رندی میں بھی عالم بے عمل ہیں۔'' (شروانی-۶۹)

بمبئی میں ندوہ کی تحریک | بمبئی کے اس قیام کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ یہاں کے دولت مند سیٹھوں کو ندوہ کی امداد کی طرف مائل کیا جائے، مگر وہاں بدعات کا جوز ور تھا اور علمائے واعظین نے اس کی مٹی جس طرح خراب کی تھی اس سے ان کو ہمت نہیں پڑتی تھی، ۲۳/اکتوبر ۱۹۰۶ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں ''بمبئی میں اس دفعہ صرف منضج پر اکتفا کیا گیا، وہاں شدت سے یہ خیال پھیلا ہے کہ ندوہ کفر ہے۔'' (حمید-۳۶)

افسوس کہ یہ کفر اب تک نہیں ٹوٹا، مولانا نے جس منضج کی طرف اشارہ کیا وہ یہ تھا کہ انجمن اسلام ہال میں ندوہ کے اغراض ومقاصد پر ایک تقریر کی۔

بڑودہ کا سفر اور مضامین عالم گیر | بمبئی کے اس سفر میں ایک عظیم الشان کام کی بنیاد پڑی، محمد علی مرحوم (اڈیٹر کامریڈ) جو مولانا کے علی گڑھ کے شاگرد بھی تھے، اس زمانہ میں بڑودہ میں نوکر تھے، ان کے اصرار پر وہ بڑودہ گئے اور ان ہی کے مکان پر قیام کیا، اسی زمانۂ قیام میں انہوں نے مولانا سے یہ تحریک کی کہ وہ عالم گیر کے الزامات کی تحقیق وجواب میں مفصل مضمون لکھیں، مولانا نے اس کو منظور کیا، چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا نمبر واپسی کے بعد ۵/دسمبر ۱۹۰۶ء میں لکھا گیا اور اسی مہینہ کے الندوہ میں شایع ہوا، سوا برس کے بعد ۶ نمبروں میں مارچ ۱۹۰۸ء میں یہ سلسلہ ختم ہوا اور نہایت مقبول ہوا، محمد علی مرحوم اس سلسلۂ مضمون کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہتے تھے[1]، بلکہ جون ۱۹۰۸ء سے کام بھی شروع کر دینا چاہتے تھے (عبدالقادر-۳)

---

[1] محترمی محمد علی مرحوم نے یہ واقعہ خود مجھے لکھ کر بھیجا تھا، خطوط محمد علی شایع کردہ: مکتبہ جامعہ ملیہ کے ص ۵۹ میں خط کا یہ مضمون ملے گا۔

مگر اپنے ضروری مشاغل کی وجہ سے اخیر تک نہ کرسکے، آخر یہ سعادت ہمارے دوست ڈاکٹر سید محمود کے حصہ میں آئی، جنہوں نے مولانا کی اجازت سے ۱۹۱۰ء میں لندن میں جب وہ ڈاکٹری کی ڈگری کے لیے کام کررہے تھے، اس کا خلاصہ ترجمہ یا اقتباس شایع کیا۔ (ابوالکلام-۱۲)

اس سفر کی ایک بڑی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ محمد علی مرحوم نے یہیں ان سے سیرت نبوی کی تالیف اور پروفیسر مارگولیوتھ کے جواب لکھنے پر آمادہ کیا۔ (خطوط محمد علی، ص ۵۹)

ڈھاکہ کا سفر دسمبر کے آخر میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ڈھاکہ میں تھا، مولانا بھی تشریف لے گئے، ۲۲؍ دسمبر کو مرزا شجاعت علی بیگ سفر ایران کی صدارت میں تاریخ اور اسلام پر لکچر دیا، مولانا جلد واپس آنا چاہتے تھے، مگر خواجہ سلیم اللہ صاحب نواب ڈھاکہ نے روکا کہ ندوہ کے متعلق گفتگو کرنی ہے[1]، چنانچہ جنوری ۱۹۰۷ء کی شروع تاریخوں میں احسن منزل میں جو نواب صاحب کی کوٹھی ہے، ایک جلسہ ترتیب پایا، جس میں مولانا نے اور جناب شاہ سلیمان صاحب نے ندوہ کے مقاصد پر تقریریں کیں، جناب نواب صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ مارچ ۱۹۰۷ء میں خود لکھنؤ تشریف لائیں گے اور دارالعلوم کا ملاحظہ کریں گے، مگر افسوس کہ یہ وعدہ پورا نہ ہوا[2]۔

مظفر پور کا سفر مظفر پور میں خان بہادر دیوان مولا بخش مرحوم سی ایس آئی کا ایک پرانا خاندان ہے جس کا سلسلۂ نسب حضرت امام محمد ملقب بہ تاج فقیہ (فاتح منیر صوبۂ بہار) تک منتہی ہوتا ہے، دیوان مولا بخش غدر کے گرد وپیش زمانہ میں کان پور میں سررشتہ دار تھے، شیخ ناسخ مولوی غلام امام شہید اور قاضی صادق خاں اختر وغیرہ معاصر شعرا سے ان کا دوستانہ تھا، ۱۲۸۳ھ میں وفات پائی۔

اس خاندان[3] میں علم و دولت کی توأم صفتیں موجود ہیں، اس خاندان کے جانشین مولانا کے زمانہ میں مولوی اعجاز حسن خاں اور مولوی ریاض حسن خاں خیالؔ تھے، اعجاز حسن خاں صاحب کا چار برس ہوئے کہ ۱۳۶۵ھ میں انتقال ہوگیا اور مولوی ریاض حسن خاں بحمد اللہ کہ اب تک ہمارے درمیان موجود ہیں، یہ دونوں صاحب مولانا کے خالص دوستوں میں تھے، ڈھاکہ جاتے ہوئے دونوں صاحبوں کا اصرار تھا کہ مولانا مظفر پور تشریف لائیں، یہ وعدہ ڈھاکہ سے واپسی میں پورا ہوا، اس سفر کا حال مولانا نے الندوہ میں خود اپنے قلم سے لکھا ہے "مولوی ریاض حسن رئیس مظفر پور ہمارے قدیم مخلص عنایت فرما اور قومی ضرورتوں کے نبض شناس ہیں، جنوری ۱۹۰۷ء میں ڈھاکہ سے واپس آتے ہوئے، ہم

---

[1] مکاتیب ریاض حسن، ۹ [2] الندوہ، فروری ۱۹۰۷ء [3] اس خاندان کے تفصیل حالات کے لیے دیکھیے معارف مئی ۱۹۴۱ء۔

کو مظفر پور ٹھہرنے کا موقع ملا، مسٹر محبوب حسن صاحب بیرسٹرایٹ لا جو مولوی ریاض حسن صاحب کے چچا ہیں، ان کے دولت خانہ پر قیام ہوا، بیرسٹر صاحب باوجود تعلیم جدید اور سفر ولایت کے عقائد مذہبی اور شعائر اسلام میں اس قدر سخت ہیں کہ ہم کو ان پر ملائے متعصب ہونے کا دھوکا ہوتا تھا، یہاں اور جن تعلیم یافتہ لوگوں سے ملاقات ہوئی، سب اسی رنگ میں نظر آئے، چوں کہ اس سفر میں مجھ کو ندوہ کی تقریب بھی پیش نظر تھی، اس لیے مولوی ریاض حسن صاحب اور ان کے بھائی اعجاز حسن صاحب نے جلسہ کا اہتمام کیا، کثرت سے لوگ شریک ہوئے، میں نے اسلام کی حقیقت اور اس کے ضمن میں ندوہ کی ضرورت پر ایک مفصل تقریر کی، تقریر کے بعد چندہ ہوا اور پانچ سو سے زیادہ نقد جمع ہوگیا، مسٹر محبوب حسن صاحب اور مولوی ریاض حسن صاحب نے سو سو کی رقمیں عنایت کیں، ایک وکیل نے کوئی تعیین نہیں کی لیکن ان کی عام قدیمی عادت کی بنا پر لوگوں نے قیاس بلکہ یقین کیا کہ وہ بھی ایک معتد بہ رقم عنایت فرمائیں گے، چندہ کی پوری تفصیل علاحدہ شایع ہوگی، یہ تمام رقم سرمایۂ محفوظ کی مد میں جمع ہوئی۔"

اس سفر سے واپسی کے بعد دارالعلوم کے جلسۂ عطائے سند کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

مارچ ۱۹۰۷ء جلسۂ عطائے سند دارالعلوم ندوہ کو کھلے ہوئے نو دس برس گزر چکے تھے، مگر ابھی تک اس کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا کوئی جلسہ جس کا رواج ہندوستان کے عام مدرسوں میں ہے، نہیں ہوا تھا، اسی غرض سے مارچ ۱۹۰۷ء مطابق محرم ۱۳۲۴ھ میں رفاہِ عام لکھنؤ کے وسیع ہال میں جلسۂ دستار بندی کے نام سے ندوہ کا عام سالانہ جلسہ ہوا، جس کی صدارت مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوریؒ مرحوم نے کی جو شروع سے ندوہ کے شریک و معاون رہے تھے، اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جدید و قدیم علوم کے ماہرین اور اساتذہ کی نہایت اچھی تعداد شریک تھی جو دارالعلوم کے بلند بانگ دعووں کا امتحان کرنا چاہتی تھی۔

مولانا نے اس جلسہ میں پیش کرنے کی غرض سے اپنے چند منتہی طالب علموں کو بعض عنوانات پر تقریر کے لیے تیاری کی ہدایت فرمائی، اس ضمن میں محبی مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی (ایم، اے رجسٹرار و انسپکٹر مدارس عربیہ الہ آباد) نے قرآن مجید کے اعجاز و بلاغت پر اور راقم نے علوم جدیدہ و قدیمہ کے موازنہ پر تقریر کی، اسی تقریر[2] کے دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جلسہ کو تماشا گاہ اور

---

[1] مرحوم نور محل ضلع جالندھر کے باشندہ تھے، ندوہ کے قدیم ہمدرد وارکان میں تھے۔ [2] یہ میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے، اس لیے بے اختیار نوک قلم پر آگیا، اگر ناظرین کو اس سے خودستائی کی بو آتی ہو تو چشم پوشی فرمائیں۔

سامعین کو آئینہ حیرت بنا دیا، عین راقم کی تقریر کے اثنا میں کسی نے اٹھ کر کہا کہ اگر یہ تقریر عربی میں کریں تو بے شبہہ ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کریں، مولانا حسب قاعدہ جلسہ سے باہر چلے گئے تھے، مولوی سید عبدالحئی صاحب مرحوم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم کر سکتے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا اور عربی میں تقریر شروع کی، جلسہ پر ایک سماں چھا گیا، مولانا کو باہر یہ خبر معلوم ہوئی تو فوراً اندر آئے اور میرے پاس کھڑے ہو کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ اگر تم کو اسی وقت کوئی موضوع دیا جائے تو تم تقریر کر سکتے ہو؟ میں نے پھر اثبات میں جواب دیا تو مولانا نے مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس طالب علم نے جو تقریر کی، اس کی نسبت بعض لوگ بدگمانی کر سکتے ہیں، کہ یہ گھر سے تیار ہو کر آئے تھے، اس رفع بدگمانی کے لیے اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت کوئی موضوع دے سکتے ہیں، یہ اس پر تقریر کریں گے۔

چنانچہ موضوع کے تقرر کے لیے لوگوں نے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا نام پیش کیا، جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور جلسہ میں موجود تھے، انہوں نے موضوع یہ مقرر کیا کہ ''ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہو؟'' میں نے اس موضوع پر عربی میں اپنے خیالات ظاہر کرنے شروع کیے، ہر طرف سے احسنت وآفریں کی صدائیں بار بار بلند ہو رہی تھیں، استاذ مرحوم نے جوشِ مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر میرے سر پر باندھ دیا، جو اس خاک سار کے واسطے ہمیشہ کے لیے طرۂ افتخار بن گیا[1]۔

مولانا نے خود اس واقعہ کی اطلاع اپنے دوست مولانا شروانی کو ان لفظوں میں دی ''آپ کے نہ آنے کا سخت صدمہ ہوا، آپ ارکان اصلی ندوہ ہیں، آپ کی عدم شرکت کا دوسروں پر برا اثر پڑتا ہے اور لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں، بہر حال مقدر میں یہی تھا، اگرچہ شاہ سلیمان صاحب وغیرہ نہیں آئے، لیکن جلسہ بڑی کامیابی سے ہوا، سلیمان کی طرف سے درخواست کی گئی کہ فی البدیہہ جو مضمون مجھ کو بتایا جائے میں اسی وقت اس پر عربی زبان میں لیکچر دوں گا، غلام الثقلین نے ایک مضمون دیا اور بغیر ذرا سی دیر کے سلیمان نے نہایت مسلسل فصیح اور صحیح عربی میں تقریر شروع کی، تمام جلسہ محوِ حیرت تھا اور آخر لوگوں نے نعرہائے آفریں کے ساتھ خود کہا کہ بس اب حد ہو گئی۔'' (شروانی-۵۸)

یہ ہندوستان کی عربی تعلیم کی تاریخ میں بالکل نیا واقعہ تھا، اس لیے اس کا غلغلہ سارے ملک میں پھیل گیا۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے روداد جلسہ دستار بندی، ۱۹۰۷ء، ص ۵۶۔

اس جلسہ میں مولانا نے دارالعلوم کے مقاصد پر ایک مدلل تقریر فرمائی اور ساتھ ہی اپنے امرتسر والے فارسی قصیدہ ع ''مانہ آنیم کہ اورنگِ سلیمان داریم'' کو اس دردناک ترنم سے پڑھا کہ دل ہل گئے، اسی سماں میں مولانا نے لکھنؤ کے تعلیم یافتہ گروہ کی طرف خطاب کر کے ان کو ندوہ کی امداد پر آمادہ کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی ممتاز حسین صاحب بیرسٹر مرحوم، مولوی نسیم صاحب ایڈوکیٹ، مولوی ظہور احمد صاحب وکیل وغیرہ نے ندوہ کی امداد کا وعدہ کیا اور یہ لوگ ندوہ کے ارکان میں داخل ہوئے، ان کی ذات سے ندوہ کو بہت فائدہ پہنچا، آخر الذکر دونوں صاحب آج تک ہمدرد ارکانِ انتظامیہ ہیں، سرگرمِ خدمت ہیں، مولانا شروانی کے نام اسی خط میں مولانا ان کو لکھتے ہیں ''مجمع نہایت کثرت سے ہوا اور بہت بڑی بات یہ ہوئی کہ بیرسٹر اور تمام ایجوکیٹڈ نے کہا کہ ہم لوگوں کو اب عملاً ندوہ میں شرکت کرنی چاہیے، لہٰذا آیندہ اتوار کو ایک خاص جلسہ رفاہ عام میں ہو جس میں ہم ایجوکیٹڈ لوگ اور ارباب ندوہ جمع ہوں اور مشورہ وغور کیا جائے کہ ندوہ کو کیوں کر ترقی دینی چاہیے اور کس طرح اس کو ہم لوگ اعلا درجہ تک پہنچائیں۔''

اسی جلسہ میں ایک رات کو مولانا نے ''اسلام اور بے تعصبی'' پر ایسی دلآویز تقریر فرمائی کہ در و دیوار رقص میں تھے، علمائے معاصرین بہت کم ایک دوسرے کو داد دیتے ہیں لیکن اس جلسہ کے بعد مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس اعلا دارالعلوم جو خود ایک عالم جید ہیں، فرماتے تھے، اس تقریر کو سن کر جی چاہتا تھا کہ میں اپنا سر پھوڑ لوں کیوں کہ جو مولوی شبلی نے پڑھا وہی میں نے بھی پڑھا، پھر وہ کیوں ایسی تقریر کر سکتے ہیں اور میں نہیں کر سکتا۔''

پاؤں کا حادثہ

۱۷ مئی ۱۹۰۷ء

ان دنوں مختلف جلسوں کی شرکت اور آمد و رفت کی وجہ سے شعر العجم کی تصنیف میں بہت کچھ خلل آ گیا تھا، اس لیے مولانا نے چاہا کہ وطن (اعظم گڑھ) جا کر چند مہینے بہ اطمینان رہیں اور اس کی کو پورا کریں، چنانچہ اعظم گڑھ پہنچنے کے چند روز بعد ۲۹/ مارچ ۱۹۰۷ء کو اپنے اس ارادہ کی اطلاع نواب علی حسن خاں کو دی (۵) اسی زمانہ میں اعظم گڑھ میں ایک اسلامی انجمن کا بھی جلسہ تھا اس میں بھی شرکت مقصود تھی، بہر حال مارچ کے آخر میں اعظم گڑھ آئے اور حسب معمول شبلی منزل میں قیام فرمایا۔

اس زمانہ میں شعر العجم جلد اول کے اوراق زیر تصنیف تھے، سترہ (۱۷) مئی ۱۹۰۷ء کی صبح کو دس بجے وہ میز سے اٹھ کر ہال[1] میں تشریف لے گئے جو ان دنوں زنان خانہ میں شامل تھا، یہاں تخت بچھے تھے، یہیں مولانا ایک پاؤں لٹکا کر تخت پر بیٹھ گئے، اس بنگلہ میں باغ بھی تھا، جس میں لیچیاں لگی تھیں، اور کوے آ کر ان کو نقصان پہنچاتے تھے، مولانا کے اکلوتے صاحب زادہ حامد صاحب نے ان کے اڑانے کے لیے بندوق میں چھروں کے کارتوس بھر کر رکھے تھے اور اس کو ہال ہی میں چھوڑ گئے تھے، مولانا نے اس بندوق کو اپنے ہاتھ سے اٹھایا تو بہت وزنی معلوم ہوئی، پاس ہی مقابل میں ان کی بہو یعنی حامد صاحب کی بیوی بیٹھی ہوئی تھیں، ان کو یہ کہہ کر دی کہ یہ عورتوں سے تو اٹھ بھی نہیں سکتی، اس دینے لینے میں ہاتھ بندوق کے گھوڑے پر پڑ گیا اور بندوق سر ہو گئی، جس کا نشانہ مولانا کا پاؤں (قدم) تھا، گھر میں کہرام برپا ہو گیا لیکن مولانا کو کچھ احساس نہیں ہوا، اتنا معلوم ہوا کہ پاؤں میں جھٹکا لگا، وہ دوسروں سے پوچھتے تھے کیا ہوا، خیر ہے؟

اب حادثہ کی تفصیل خود مولانا کی زبان سے سنیے ع "تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں"

حادثہ کی تفصیل مولانا کی زبان سے "ایک اتفاقی تقریب سے میں اپنے وطن اعظم گڑھ میں آیا تھا اور ارادہ تھا کہ مہینے دو مہینے یہاں قیام کروں گا، شعر العجم کے اجزا زیر تحریر تھے اور شاہ نامہ پر ریویو کر رہا تھا، سترہویں مئی ۱۹۰۷ء قریباً دس بجے ہوں گے کہ میں دفتر سے اٹھ کر زنانہ کمرے میں گیا، اندر تخت بچھے

[1] اسی حال میں اب دار المصنفین کا کتب خانہ ہے۔

ہوئے تھے، میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا، تخت پر کارتوس بھری ہوئی بندوق رکھی تھی، میں نے ہاتھ میں اٹھالی اور پھر ایک دوسرے شخص کے ہاتھ میں دے دی، اتفاق سے گھوڑا گر گیا، بندوق کی زد ٹھیک میرے پاؤں پر تھی، بندوق کی نال سے پاؤں تک صرف ایک بالشت کا فاصلہ تھا کارتوس میں اگر چہ چھرے تھے لیکن چوں کہ بڑے تھے اور فاصلہ بہت کم تھا اس لیے ٹخنہ کی ہڈی بالکل چور ہوگئی اور پاؤں کٹ کر صرف دو تسمے لگے رہ گئے، جس وقت ضرب لگی مجھ کو صرف اس قدر معلوم ہوا کہ پاؤں کو ایک جھٹکا سا لگا، کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوئی اور اس وقت میں نے گھبرا کر کہا یہ کیا ہوا؟ آواز سن کر باہر سے بعض آدمی اندر آ گئے اس وقت میں اسی طرح پاؤں لٹائے بیٹھا تھا اور پاؤں جوتے میں تھے، ایک عزیز نے آ کر میرے پاؤں پر ہاتھ رکھا تو میں نے جوتے میں سے نکال لیا، اس وقت پاؤں کی ایڑی جوتے میں پھنس کر رہ گئی، میں نے پاؤں اوپر اٹھا دیا اور نوکروں سے کہا کہ اس پر پانی ڈالو، پانی جب ڈالا جاتا تھا تو پاؤں میں سے بھک بھک دھواں نکلتا تھا، قریباً پاؤ گھنٹہ تک میں پاؤں اٹھائے بیٹھا رہا، جب پنڈلیاں دکھنے لگیں تو میں نے آدمی سے کہا کہ اب تکیہ لا کر میرا پاؤں اس پر رکھ دو آدمی نے رو کر کہا کہ کیا چیز ہے جو رکھی جائے گی، مجھ کو اس وقت تک معلوم نہ تھا کہ میری ایڑی جدا ہو کر جوتے میں رہ گئی ہے، جس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے ابتدا میں ایک فوری نظر کے سوا مطلق اپنے پاؤں پر نظر نہیں ڈالی اور کچھ میں نے پاؤں کے متعلق حالات بیان کیے ہیں، وہ ڈاکٹر اور دیگر حاضرین کی زبانی ہیں۔

اس وقت خاص عزیزوں میں سے کوئی نہ تھا، نوکر اور ماما وغیرہ تھیں، یہ لوگ سخت زار و قطار روتے تھے اور میں ان کو منع کرتا تھا، قریباً ایک گھنٹہ کے بعد فرزند عزیز محمد حامد آیا اور زخم کو دیکھتے ہی چیخ اٹھا اور بہت بے قراری کے ساتھ گریہ وزاری کرنے لگا، تھوڑی دیر کے بعد اس پر غشی سی طاری ہوگئی میں نے نوکروں سے کہا اس کے منہ پر پانی چھڑکو اور حلق میں پانی ٹپکاؤ، اس سے اس کو ہوش آ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے چھوٹے عزیز بھائی، جنید سول سرجن اور اسسٹنٹ سول سرجن کو ساتھ لے کر آئے، بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ جو رگیں کٹ گئیں تھیں ان سے شدت کے ساتھ خون جاری تھا اور خود مجھ کو اور نہ نوکروں چاکروں میں سے کسی کو خیال آیا کہ اس پر پٹی کس کر باندھ دیں، جس سے خون رک جائے، بہرحال ڈاکٹر نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ رگوں کے منہ باندھ دیے، جس سے خون رک گیا، اس کے بعد میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ اگر پاؤں جوڑنے کے قابل ہو تو خیر ورنہ سرے سے نکال ڈالیے، ڈاکٹر نے کہا پاؤں کاٹنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں، غرض بے ہوشی کی دوا پلائی گئی اور عمل

جراحی شروع کیا گیا، چوں کہ ہڈیاں کچھ اوپر تک پھٹ گئی تھیں، اس لیے نصف پنڈلی جدا کر دی گئی اور ہرزہ گردی کی سزا دی گئی، عمل جراحی کے پورے ہونے کے دس پندرہ منٹ بعد مجھے ہوش آیا اور زخموں کے ٹانکے اور رگوں کی کھچاوٹ کی تکلیف محسوس ہوتی تھی، آج نواں دن ہے، ڈاکٹر ایک دن بیچ میں دے کر زخم کھولتا ہے، دھوتا ہے اور پھر باندھ دیتا ہے، تکلیف میں ابھی تک کوئی کمی نہیں ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ابتدائے واقعہ سے اس وقت تک طبیعت کی طمانیت اور سکون میں کوئی کمی نہیں ہے، سوچتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ جو شخص سر کاٹے جانے کے قابل ہو اس کے پاؤں کاٹے گئے تو کیا ہوا؟

ظاہری حالات کے لحاظ سے بھی تسکین ہے کہ پچاس برس سے بھی زیادہ کی کچھ عمر پائی، بہت چلا پھرا دوڑا دھوپا، ملا جلا آخر کہاں تک؟ خود پاؤں توڑ کر بیٹھنا چاہیے تھا، نہ بیٹھا تو قسمت نے بیٹھا دیا،

ع "گر نستانی بہ ستم می رسد"

خدائے بے نیاز کا شکر گزار، احباب واعزہ کا منت پذیر ہوں، بچ گیا تو پھر کسی نہ کسی طرح دوستوں کو دیکھ لوں گا ورنہ انشاء اللہ تعالیٰ اب دوسرے عالم میں ملاقات ہوگی، والسلام۔

دسویں دن ٹانکے کھولے گئے، ایک ٹانکے میں مواد آ گیا اس وجہ سے سوزش اور ٹپک کی سخت تکلیف ہے، ۳۱ رمئی ۱۹۰۷ء تک یہ حالت ہے۔"

احباب اور معتقدین کا اضطراب جس وقت یہ خبر ندوہ پہنچی ہے، طلبہ میں سراسیمگی پھیل گئی، تار سے خیریت منگوائی، اخبارات کی مختصر اطلاع نے احباب اور معتقدین میں عجیب پریشانی پیدا کی، مخصوص احباب مولوی عبدالحلیم صاحب شرر، مولانا سید عبدالحیٔ صاحب، نواب سید علی حسن خان، مولوی ریاض حسن خان صاحب اور مولوی اعجاز حسن خان صاحب اور دوسرے احباب فوراً عیادت کو آئے، طلبہ میں سب سے پہلے خاکسار اور ہم درس مولوی جواد علی خان ۲۴ رمئی کو اعظم گڑھ پہنچے، ہم دونوں دو روز یہاں ٹھہرے، یہیں بیٹھ کر خاکسار نے اخبارات کو حادثہ کی مفصل اطلاع بھیجی، دریافت حال کے لیے احباب اور معتقدین کے خطوط اور تار برابر آ رہے تھے، ۲۵ رمئی کو مولانا نے خاکسار کو بٹھا کر حادثہ کی پوری تفصیلات لکھوائیں، یعنی وہ بولتے جاتے تھے، اور خاکسار لکھتا جاتا تھا اور یہی خط چھپوا کر دوستوں کی خدمت میں بھجوایا اور یہ وہی خط ہے جو ابھی اوپر نقل ہوا۔

گو اس خط میں حادثہ کی پوری تفصیل موجود ہے، مگر راقم نے مولانا کی زبان سے بعض ایسے

واقعے سنے جو اس خط میں نہیں اور جن کو یہاں سے واپس جا کر الندوہ[1] میں لکھا، وہ اس موقع پر اضافہ کے قابل ہے۔

مولانا اس دن شعر العجم میں فردوسی کے شاہنامہ پر تبصرہ لکھ رہے تھے اور اس کو اتفاق کہیے یا فال بد کہ اس تبصرہ کو اس شعر پر ختم کیا تھا:[2]

بر ید و درید و شکست و بہ بست　　　بلاں را سر و سینہ و پا و دست

اور اس کے بعد ہی زنان خانہ میں تشریف لے گئے اور یہ حادثہ پیش آیا، مولانا کو اس وقت پورا احساس نہیں تھا کہ کیا ہوا، جس وقت سول سرجن اور اسسٹنٹ سول سرجن آئے ہیں تو مسکرا کر فرمایا کہ اگر پاؤں جڑ جائے تو خیر، ورنہ سرے سے الگ کر دیا جائے۔

ڈاکٹر نے جب عمل جراحی کے لیے بے ہوشی کی دوا پلائی ہے تو اس وقت ایک نادر واقعہ پیش آیا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ممتاز دماغوں کی قوت اور حواس کی جمعیت بھی ممتاز ہوتی ہے، قاعدہ ہے کہ بے ہوشی کی دوا پلا کر مریض کو گننے کو کہا جاتا ہے، عموماً لوگ پچاس سے ساٹھ تک گنتے ہوئے بے ہوش ہو جاتے ہیں، مگر مولانا نے اس ضعف اور ناقابل برداشت صدمہ پر بھی ستانوے تک گنا اور اس کے بعد بے ہوش ہوئے۔

ٹانکے دیتے وقت دو ٹانکوں کی جگہ چھوڑ دی گئی تھی کہ اگر گرمی کی وجہ سے کچھ مادۂ فاسد جمع ہو جائے گا تو اس راہ سے نکال دیا جائے گا، مگر الحمد للہ کہ زخم روبصحت تھا اور مادۂ فاسد نہیں جمع ہوا، صرف ان ہی دو ٹانکوں کی جگہ میں کچھ مواد آ گیا تھا۔

ڈاکٹر کا خیال تھا کہ دو ہفتہ میں زخم خشک ہو جائے گا مگر افسوس کہ تیسرے ہفتہ تک زخم مندمل نہیں ہوا، مواد آتا رہا اور زخم میں درد ٹپک اور ٹیس ایسی تھی کہ جس سے رات بھر نیند نہیں آتی تھی اور بے چینی تھی،[3] ۶ / جون کو ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں، زخم کی حالت دس بارہ دن تک اچھی تھی لیکن بعد کو ریم آنے لگی اور اب تک آتی ہے، اسسٹنٹ سرجن روزانہ آتا ہے اور دن میں دو بار زخم دھویا جاتا ہے لیکن ابھی تک تکلیف میں کوئی کمی نہیں، تکلیف گو سخت ہے لیکن ہمارے ہی بزرگ تھے جنہوں نے سر

---

[1] اپریل ۱۹۰۷ء (یہ نمبر تاخیر کے ساتھ شائع ہوا تھا، اسی لیے مئی کا واقعہ اپریل کے پرچہ میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔

[2] شعر العجم جلد اول ص ۱۶۷ میں زیر مثال صنایع و بدایع یہ شعر ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اس حادثہ کے وقت یہی صفحہ زیر قلم تھا، مولانا نے اس واقعہ کو شعر العجم جلد اول کے مقدمہ میں ص ۳ پر خود بھی ذکر فرمایا ہے۔ [3] الندوہ اپریل ۱۹۰۷ء۔

کٹوائے تھے، پاؤں کٹنے پر کیا روؤں، **فصبرٌ جمیلٌ** "۔(۶۲)

مولانا تین مہینے اپنے وطن میں بستر علالت پر پڑے رہے، اسی سبب سے مضمون عالمگیر کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، وہ چند ماہ رکا رہا لیکن شعر العجم کی تصنیف باوجود درد اور تکلیف کے تین چار ہفتوں کے بعد شروع ہوگئی[1]۔

راقم نے جولائی میں لکھنؤ تشریف لانے کے خواہش کی تو ۲۲ر جولائی کو اپنے قلم سے جواب لکھا کہ وہاں حسب دستور سابق کوٹھے پر میں رہوں تو پھر اتر نا چڑھنا مشکل ہوگا۔(سلیمان-۱۵)

ان ہی دنوں ۳۱ر جولائی ۱۹۰۷ء کی اطلاع ہے کہ نواب محسن الملک نے علی گڑھ سے لکھا کہ وہ یہاں آجائیں، یہاں کے ڈاکٹر مفت علاج کریں گے، مگر وہ وہاں نہیں گئے اور بمبئی کا قصد کیا (سلیمان-۱۶) اس سخت تکلیف کی حالت میں بھی مولانا شروانی سے قلمی نسخوں پر دل چسپ خط و کتابت ہورہی ہے۔(شروانی-۶۳)

اگست کے شروع میں مولانا لکھنو آئے، ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب نے جو مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری کے داماد تھے اور لکھنؤ میں شاہی اسپتال میں ڈاکٹر تھے، ایک مرہم بنا کر دیا، مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا، اسی زمانہ میں مولانا نے مولوی حمیدالدین صاحب کو جس خط میں اپنے یہ حالات لکھے، اسی میں ان کو ندوہ آکر طلبہ کو قرآن پاک کا درس اور سائنس میں دروس الاولیہ پڑھانے کی خواہش کی (حمید-۳۹) جس کو مولوی صاحب نے منظور کیا۔

مولانا نے اس کے بعد بمبئی کا سفر کیا اور وہاں لکڑی کا ایک مصنوعی پاؤں بنوا کر استعمال کیا، یہ پاؤں اچھا نہیں بنا یعنی بھاری تھا، بمبئی سے حیدرآباد کی مجوزہ یونیورسٹی کے سلسلہ میں وہ حیدرآباد گئے تو نواب افسر الملک بہادر نے جو ان دنوں سپہ سالار عساکر آصفی تھے، سرکاری کارخانہ سے اپنے زیر اہتمام ایک دوسرا پاؤں بنوا کر پیش کیا جو زیادہ آرام دہ اور ہلکا تھا۔

حادثہ کی شاعرانہ تعلیل حادثہ جو ہونا تھا ہوگیا، مگر بہ قول مولانا شروانی علمی آدمیوں کی ہر بات علمی ہوتی ہے، اس حادثہ نے علم ادب کا ایک نیا پہلو سامنے کردیا، مولانا حالی مرحوم، نواب سید علی حسن خان مرحوم، خواجہ عزیز الدین مرحوم اور تلامذہ میں مولوی اقبال احمد صاحب سہیل، مولوی عبدالسلام صاحب اور خاکسار نے متعدد رباعیاں کہیں، جن میں اس واقعہ کی عجیب عجیب لطیف شاعرانہ توجیہات کی گئیں،

---

[1] مقدمہ شعر العجم، حصہ اول، ص ۳۔

مولانا نے یہ تمام رباعیاں راقم کو عنایت فرمائیں اور راقم نے مناسب سمجھا کہ دوسرے غم زدوں کو بھی حسن تعلیل کے اس تسلی نامہ میں شریک کرے، اس لیے ان کو ستمبر اور اکتوبر ۱۹۰۷ء کے الندوہ میں شائع کر دیا گیا۔

(مولانا حالی)

شبلی کہ گزند پاش پر دل شکن است　　با حسنِ تکیش خجستگی مقترن است
چنداں کہ بکاہند فزایند اینجا　　"کار استنِ چمن ز پیراستن است"[۱]

(نواب سید علی حسن خاں مرحوم)

شبلی! ترے قوم پر بہت احساں ہیں　　باتیں تری دردِ قوم کی درماں ہیں
اک پاؤں اگر گیا تو کچھ رنج نہ کر　　اس ایک قدم پہ لاکھ سر قرباں ہیں

(خواجہ عزیز الدین مرحوم)

اے پایۂ تو بلند تر از افلاک　　پایت چو بریدہ شد چہ ہستی غمناک
زیر قدمت بلندی و پستی ہست　　پائے بفلک داری و پائے برخاک

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل نے اس حادثہ پر متعدد رباعیاں لکھیں اور خوب خوب توجیہیں کہیں:

اے ذاتِ تو در علم و عمل گشتہ علم　　وائے مفتخر از وجود پاکت عالم
یک پائے تو چوں شد بعدم دانستم　　داری دو جہاں سرور ما زیر قدم

اے آنکہ تو اہل قوم را ملجائی　　حق داد ترا بہ ملکِ فن دارائی
چوں نیست کسے ہم سر تو در پایہ　　پس پائے ترا ہمی سر ز یکتائی

صد حیف ہوا شکستہ پائے شبلی　　اب سلسلہ سفر بھی مفقود ہوا
مشتاق زیارت جو ہو خود آئے یہاں　　رہبر جو تھا اب کعبۂ مقصود ہوا

اللہ نے آپ کو جو ممتاز کیا　　ہر وصف میں بے نظیر و انباز کیا
باقی تھا فقط فخر شہادت ملنا　　اک پاؤں کا اس سے بھی سرفراز کیا

---

[۱] مولانا حالی کا چوتھا مصرع عنصری کی رباعی کا ٹکڑا ہے، واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ سلطان محمود نے بدمستی میں ایاز کی زلفیں کٹوا دیں، جب سلطان کو ہوش آیا تو اس کی خوب صورت زلفوں کے کٹ جانے سے نہایت غمگین ہوا، اس پر دربار کے شاعروں نے شاعرانہ حسن تعلیل سے سلطان کا دل بہلانا چاہا، اسی سلسلہ میں عنصری نے یہ رباعی کہی، کہتے ہیں کہ اس کے سنتے ہی سلطان خوش ہو گیا اور اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

ان کی ایک رباعی الندوہ میں نہیں، خاک سار کے نام خط ۱۶ میں ہے، لکھتے ہیں، ایک صاحب کو خوب مضمون ہاتھ آیا، کہتے ہیں:

کیا اس سے بھی ہوگی کوئی ساعت منحوس — زخمی ہوا جبکہ پائے شبلی افسوس
ایک پاؤں عدم کو کیوں نہ جاتا اقبال — تھا اہل فنا کو اشتیاق پا بوس

خود مولانا نے بھی اس حادثہ پر کئی نظمیں کہیں:

ہلنا بھی جگہ سے گرچہ اب ہے دشوار — اس پر بھی خدا کا شکر ہے احسان ہے
یعنی کہ پہنچ چکا ہوں جس منزل تک — یاں سے سفر عدم بس اب آسان ہے

ہر چند کہ زخم سخت جاں فرسا تھے — آثارِ ہلاک سر بسر پیدا تھے
ممنوں ہوں ضبط کا کہ اس حال میں بھی — گو پاؤں کٹے قدم بر جا تھے

مقبول نہیں ہے بے نوائی میری — آلودۂ نخوت ہے گدائی میری
تقدیر نے پاؤں کاٹنے پر بس کی — ناقص ہے ابھی بے سروپائی میری

حالت از گردشِ ایام اگر گشت تبر — صبر فرما کہ ازیں نیز بتری بایست
شبلی نامہ سیہ را بجزائے عملش — پا بریدند وصدا خاکست کہ سری بایست

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل نے ان نظموں کے جواب میں عرض کیا:

کیجیے نہ غم شکستِ پا مولانا! — اس میں بھی تھی حکمت خدائے دانا
تھی اہل عدم کو آرزوئے پا بوس — اک پاؤں وہاں بھی چاہیے تھا جانا

اور مولانا کے پہلے قطعہ کے جواب میں یہ قطعہ کہہ کر پیش کیا:

شکستہ پائی تو تھی سرنوشت میں حضرت! — نہ ہاتھ آئے گا کچھ اب تو ہاتھ ملنے سے
عدم کی دور ہے منزل نہ جا سکیں گے حضور — چلے گا قوم کا کام آپ کے نہ چلنے سے

ہمارے دوست مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے بھی جن کی سخن سنجی مسلم ہے، ایک رباعی لکھ کر پیش کی تھی، جس کا اخیر مصرع یاد ہے

ع "ہمت کا قدم زمیں میں اب گاڑ چکے"

خاک سار شاعر نہیں، اس پر بھی کچھ کہا تھا، جس کو ادباً یا مولانا کی تنقید کے ڈر سے پیش

نہیں کیا، اسی مہینہ میں موازنہ انیس و دبیر شایع ہوئی تھی، اسی کو پیش نظر رکھ کر کہا تھا:

تنقید مراثی کے صلہ میں استاد دربارِ حسینؓ نے سعادت بخشی

پر سر سے ابھی کام تھا لینا باقی اس واسطے پاؤں کو شہادت بخشی

اعظم گڑھ سے چلتے وقت معذرت کے چند عربی شعر کہہ کر چپکے سے مولانا کے سرہانے رکھ کر الٹے پاؤں واپس پھرا، مولانا ہر چند پکارتے رہے، مگر میں شرم سے سامنے نہ جا سکا، اس نظم میں دیر سے پہنچنے پر عفوِ تقصیر کی درخواست تھی، مطلع تھا:

دع واغترف منك بحر الفضل والحكما واقتبس منك شمس العلم والعلما

مجھے فضل وحکمت کے سمندر سے چلو بھر بھر کے پانی پینے دے اور اے علم اور عالموں کے آفتاب مجھے اپنے سے روشنی حاصل کرنے دے۔

دوسرا عربی قصیدہ صحت کی خوشی میں کہا، مگر اس کو بھی پیش نہیں کیا، بلکہ اس کے چند اشعار الندوہ (دسمبر ۱۹۰۹ء) کے ایک مضمون میں جس کا عنوان ''علمائے سلف اور کتب بینی'' ہے، چھاپ دیے کہ وہ نظر اشرف سے گزر جائیں، ع ''گفتہ آید در حدیث دیگراں''

عاد الربيع لروضى بعد ما ذهبا وعمّر الله ربعى بعد ما خربا

میرے چمن میں بہار جا کر پھر آ گئی اور خدا نے میرے گھر کو ویرانی کے بعد پھر آباد کر دیا

وازينت الارض خضراً بعد ما يبست والبرق عاد سناه بعد ما احتجبا

زمین خشک ہو کر پھر سرسبز ہوگئی اور بجلی کی چمک چھپ کر پھر نکلی

وفجر العلم عيناً بعد ما نضبا واشرق الفضل شمساً بعد ما غربا

اور علم کا چشمہ سوکھ کر پھر رواں ہوا اور علم و فضل کا آفتاب ڈوب کر پھر نکل آیا

يا من سماحته عمّت بصائرنا اعطيت ما فاق ابهى الدر والذهبا

اے وہ جس کی بخشش ہماری بصیرتوں کو چھپائے ہے تو نے جو دیا وہ زر و جواہر سے بھی بڑھ کر ہے

اذا مرضت فكل الناس قد مرضوا والعلم والفضل نالا مثلهم نصبا

جب تو بیمار ہوا تو سب لوگ بیمار ہوگئے اور علم وفضل نے بھی ان ہی کی طرح تکلیف اٹھائی

واذ برئت فكل الناس قد برئوا والعلم والفضل ماسا مثلهم طربا

اور جب تو اچھا ہوا تو سب لوگ اچھے ہوگئے اور علم و فضل بھی خوشی سے جھومنے لگے

مــا رِجــلك انــفــصــلــت الا لهمتهــا — عن ارضنــا بــعــدت تستصغر الـربــا

تیرا پاؤں جدا نہیں ہوا، بلکہ اپنی ہمت کی بلندی سے منزلوں کو چھوٹا سمجھ کر ہماری زمین سے دور ہوگیا

رجــلٌ بهــا جُــزت کم من سبسبٍ وقری — فــی الــفـضــل مــرتــغبــاً لــلعلم مطلبــا

وہ پاؤں جس سے تو نے کتنے صحرا اور آبادیاں طے کیں — فضل کی خواہش اور علم کی تلاش میں

بهــا وطــاوت بــلاد الــتــرك مغتــربــاً — واجتــزت مــصر و بیت القدس والعربا

وہ پاؤں جس سے تو نے ترکوں کے ملک کا سفر کیا — اور مصر و بیت المقدس اور عرب کو قطع کیا

لهــا تــخــر جباه الــعــلم ســاجــدة — اذ کــعبهــا کــعبةٌ لــلــعــلــم لا کــذبــا

وہ پاؤں جس کے سامنے علم کی پیشانیاں جھکتی ہیں — کیوں کہ اس کا کعب (ٹخنہ) بے شبہ علم کا کعبہ ہے

نــلــت الــعــلــی وسبــقــت القوم قــاطبةً — وان هــم شـــارکــوك سیــدی لــقبــا

تو نے بلندی کا درجہ پایا اور سب سے آگے بڑھ گیا — اگر چہ وہ سب لقب شمس العلما میں تیرے برابر ہیں

کــل الــنــجــوم وان قیــلــت لهــا شهــب — لــکــنــمــا الشمــس فــاقت هذه الشهبــا

سارے ستاروں کو اگرچہ روشن کہتے ہیں — لیکن آفتاب ان تمام روشن اجرام میں سب سے بڑھ کر ہے

اذا ا سبــکــرَّ عــلــیك الــلیل حــالــکــه — مضــی و انــت تراعی الصحف والکتبا

جب تجھ پر تاریک رات دراز ہونے لگتی ہے تو تو کتابوں او رصحیفوں کو دیکھتے ہوئے ان کو گزار دیتا ہے

جــارت یــمــینك بــالاسـفــار من قــلــم — بــه غـــدیٰ درةً مــــا کان مخــشــلــبا

تیرے ہاتھ نے تصنیفات کی سخاوت ایک ایسے قلم سے کی ہے — جس سے کوڑی بھی رتبہ پا کر موتی بن گئے

ان تمام نظموں میں سب سے زیادہ فخر کے قابل مولانا کے استاد مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی کی فارسی مثنوی ہے، جس میں مولانا نے بڑے پیار اور محبت سے اپنے شاگرد کی بیمار پرسی کی ہے، خوشی کی بات یہ ہے کہ ۳۴ برس کے بعد ان کے خاص ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ مثنوی بھی ان کے صاحب زادہ مولوی محمد مبین صاحب کیفی سے ہاتھ آئی اور اس وقت یہ تبرک دارالمصنفین کے کتب خانہ میں ہے، مثنوی اسی زمانہ میں الندوہ میں بھی چھپ چکی ہے، فرماتے ہیں:

اے دل افروز شمعِ علم و ہنر — نور چشم جہان وجانِ پدر

پدر انتساب علم و کمال — از نسب نامہائے عز و جلال

بر تو از آسمان گزند مباد | جور دہر ستم پسند مباد
چشم زخم زمانہ دراز تو | بادہر بزم پر ز نور از تو
من شنیدم کہ اندرین پرکار | کشتی از دستِ روزگار نگار
آفت ناگہاں رسید بہ پائے | پائے آں رہرو جہاں پیمائے
بہ خدائے کز دست صبر و بلا | کہ نیارم شنیدنش اصلا
بودہ ام در تعب ز روزے چند | من در اینجا بہ حاجتے پابند
کہ بہ من گفت رہ روِ عاجل | کاے زاخبار این و آں غافل
تیرے از چرخ خود پسند رسید | شبلی ات را بہ پا گزند رسید
ایں خبر چوں بگوشِ من بہ رسید | تاب بشنفتنش زمن بہ رمید
آدرخ آں پائے راہ پیمائے | بسوئے طیبہ گام فرسائے
ہم رہِ مصر و شام و روم برید | حیف از ساقِ خود جدا گردید
دل بجوش آمدم بہ نوحہ گری | یاد چوں آید از تو رہ سپری
رہ نوردی برائے کسب و ہنر | نہ پئے ادخار بدرہ زر
گرچہ پائے تو دید بیش گزند | صبر تو نیز پایہ داشت بلند
گرچہ شد خون از و رواں بزمین | لیک چینت نگشتہ گرد جبین
گرچہ پایت زساق گشتہ جدا | ایک صبرت چو کوہ پابر جا
اے خداوند واہب اعمار | دائمش بر رہِ سعادت دار

ظرافت و لطائف اس حادثہ کے بعد مولانا اپنے مصنوعی پاؤں پر عجیب عجیب دل خوش کن فقرے کہہ کر دل بہلاتے تھے، مارچ ۱۹۰۸ء میں جب مشرقی یونیورسٹی کے سلسلہ میں وہ حیدرآباد گئے تو نواب افسر الملک بہادر نے ان کے لیے لکڑی کا ہلکا سا جو پاؤں بنوایا تھا، کارخانہ سے اس کو لینے کے لیے مولانا اور نواب افسر الملک بہادر خود گئے، نواب صاحب پاؤں ہاتھ میں لیے ہوئے گاڑی پر سوار ہوئے تو مولانا نے برجستہ کہا:

"پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے"

حسن اتفاق سے اسی روز نواب صاحب کو "سر" کا خطاب ملا تھا، مولانا نے کہا کہ "آپ نے

مجھ کو پاؤں دیا تو خدا نے آپ کو سر دیا"۔

۱۱ر مارچ ۱۹۰۸ء کو مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو ایک خط میں اپنے پاؤں بننے کی خبر دیتے ہیں تو لکھتے ہیں "پاؤں بن گیا، آمد تو نہیں، آورد ہے، رفتہ رفتہ شاید ترقی ہو" (۱۵)

میر اکبر حسین صاحب (جج) سے ان کے تعلقات علی گڑھ کے ابتدائی زمانہ سے تھے، میر صاحب قافیوں کے استاد تھے، الہ آباد میں ایک دفعہ مولانا نے کہا کہ میر صاحب میں آپ کی تلاشِ قافیہ کا جب قائل ہوں جب آپ میرے نام کا قافیہ باندھیں، میر صاحب نے ہنس کر فرمایا "دیکھیے میں آپ کو بھی باندھتا ہوں" بات ہنسی میں ختم ہوگئی، ایک دوروز کے بعد میر صاحب نے ۲۳ر نومبر ۱۹۰۷ء کو دعوت کا ایک منظوم رقعہ ان کے پاس بھیجا جس میں لکھا تھا:

آتا نہیں مجھ کو قیلا قیلی ہے بات یہ صاف بھائی شبلی
مل جائے یہاں جو دال دَلیا سمجھو تم اسے پلاؤ قلیا

مولانا نے اس کے جواب میں لکھا:

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف کرم کا مجھے انکار نہیں حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں
لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں

ایک دن فرمایا کہ بھائی میں استدلالی (متکلم) تھا مولانا روم چھ سو برس پہلے کہہ گئے تھے کہ میرا پاؤں کٹے گا اور لکڑی کا پاؤں بنے گا:

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

ایک دفعہ وہ چل رہے تھے، میں ساتھ تھا، فرمانے لگے "میاں! پہلے گفتار و کردار نقلی تھا، اب رفتار بھی نقلی ہے۔"

ایک دفعہ کا لطیفہ میں بھول نہیں سکتا، میں اور مولانا ۱۹۱۲ء میں بمبئی میں تھے، مولانا مجھے ساتھ لے کر کھانے کے ایک ریسٹران میں گئے، کھانے کے اثنا میں خانساماں سے فرمایا کہ "پاؤں لاؤ" مجھے تعجب ہوا کہ پاؤں تو مولانا لگائے ہیں، یہ پھر پاؤں کیسا مانگتے ہیں، مڑ کر دیکھا تو خانساماں پاؤ روٹی کے

ٹکڑے لا رہا ہے، اس دن مجھے معلوم ہوا کہ بمبئی میں اس کو پون کہتے ہیں (پاؤ روٹی کی اصل یہی ہے، پون پرتگالی میں روٹی کو کہتے ہیں)

مولانا شروانی فرماتے ہیں ''ایک بار علی گڑھ کالج میں لکچر دینے وقت مقررہ کے بعد تشریف لائے تو عذر تاخیر بیان فرما کر کہا'' یہ عذر عذر لنگ نہ خیال فرمایا جائے''۔

اس طرح اس حادثہ نے ادب میں خاصہ لطیف اضافہ کر دیا تھا۔

مسجد کان پور کے واقعہ کے سلسلہ میں مولانا نے ایک قطعہ میں اس کومیڈی کو ٹریجیڈی بنا دیا ہے، مسلمان قیدیوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں:

ہم قدم آپ کا ہونا تو بہت ہے دشوار — ان کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں
پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ — یعنی افسوس میں زنجیر کے قابل ہی نہیں

صحت کے بعد بمبئی و حیدر آباد کا سفر اوپر یہ گزر چکا ہے کہ جولائی ۱۹۰۷ء کے آخر تک وہ اعظم گڑھ رہے، اگست کے شروع میں وہ لکھنؤ آئے، ۸ر دسمبر ۱۹۰۷ء میں بمبئی گئے اور بمبئی سے حیدر آباد پہنچے، جہاں مشرقی یونیورسٹی کی کمیٹی تھی، جس کی تفصیل آگے آئے گی، وہ ان سفروں میں ابھی اور رہتے مگر اس وقت ندوہ سے سرکاری تعلقات کی بات چیت چھڑی ہوئی تھی، اس لیے وہ لکھنؤ واپس آ گئے۔

ندوہ کے سرکاری تعلقات کا آغاز ۱۹۰۸ء، ندوہ کی تاریخ اور مولانا کی معتمدی کے زمانہ کا نہایت اہم سال ہے، اسی سال ندوۃ العلما کے متعلق سرکاری حلقوں میں جو سیاسی بدگمانیاں تھیں وہ دور ہوئیں، اگر چہ جناب منشی محمد اطہر علی صاحب لکھنو، نواب محسن الملک بہادر اور جسٹس سید شرف الدین صاحب پٹنہ وغیرہ نے اپنے اپنے زمانہ میں اس کے لیے پوری کوشش کی، مگر اس میں کامیابی کا وقت مولانا شبلی مرحوم کی معتمدی کے زمانہ میں آیا اور اس کی صورت بھی نئی پیدا ہوئی، ریاست پٹیالہ گو پنجاب میں ہے، مگر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ریاست مذکور نے جو فوجی خدمتیں انجام دیں، ان کے صلہ میں ریاست مذکور کو اودھ میں بھی ایک اچھا خاصہ علاقہ ملا ہے، اس زمانہ میں ریاست مذکور کے فارن منسٹر کرنل عبدالمجید خان ایک با اثر، با رسوخ اور حکومت انگریزی کے مستند وفادار تھے اور ریاست کے تعلقات کی بنا پر حکامِ اودھ سے بھی کافی راہ و رسم رکھتے تھے، مولوی غلام محمد صاحب شملوی کی کوششوں سے کرنل صاحب موصوف کو ندوہ سے دل چسپی پیدا ہوئی اور مولانا سے ملاقات کا اتفاق ہوا، اس ملاقات نے خلوص کا درجہ حاصل کیا، کرنل صاحب جب لکھنؤ آئے تو حکام سے مل کر ندوہ کے باب میں ان کے

خیالات کے پلٹنے میں کام یاب ہوئے۔ (مکاتیب شروانی-۰۷)

سرکاری امداد اسی اثنا میں منشی مشیر حسین قدوائی مرحوم بیرسٹرایٹ لا رئیس گدیہ (بارہ بنکی اودھ) جن کو ندوہ سے شروع ہی سے دل چسپی تھی[1]، ۸؍جنوری ۱۹۰۸ء کے انڈین ڈیلی ٹیلیگراف (لکھنؤ) میں حکومت کو دارالعلوم ندوہ کی امداد کی طرف توجہ دلائی، اس مضمون کے شایع ہونے کے بعد ۲۱؍جنوری ۱۹۰۸ء کو ڈیلا خوس صاحب ڈائرکٹر کی طرف سے منشی صاحب موصوف کے پاس ایک مراسلہ آیا کہ کیا ندوہ باقاعدہ گورنمنٹ سے کسی قسم کی امداد کی درخواست بھیج سکتا ہے، اس وقت مولانا لکھنؤ میں نہ تھے، میں نے اس مراسلہ کی اطلاع دی[2]، مجھے لکھا ''پراونشل آفس کے جواب میں ندوہ کی طرف سے یہ کیوں نہ لکھا جائے کہ ہم دونوں طرح کی مدد چاہتے ہیں، مالی بھی اور اعزازی بھی، خیر اس کے متعلق قدوائی صاحب کو لکھوں گا۔'' (سلیمان-۱۷)

اس سلسلہ میں طرفین کی خط و کتابت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۰؍نومبر ۱۹۰۸ء کو گورنمنٹ نے بلا شرط پانچ سو روپیے ماہ وار کی امداد منظور کرنے کی اطلاع دی[3]، اور یہ وعدہ کیا کہ سرکاری محکمہ مدرسہ کے نصاب اور اصول میں کبھی کوئی مداخلت نہیں کرے گا اور اس امداد کا روپیہ ادبِ عربی اور انگریزی و ریاضی وغیرہ مدرسہ کی غیر مذہبی تعلیم میں خرچ ہوگا۔

---

[1] منشی مشیر حسین قدوائی مرحوم بیرسٹرایٹ لا گدیہ ضلع بارہ بنکی اودھ کے مسلمان تعلقہ داروں میں تھے، ان کو ندوہ اور قومی کاموں سے شروع ہی سے دل چسپی تھی، وہ ۱۹۰۱ء کے قریب زمانہ میں تھوڑی سی انگریزی تعلیم کے بعد لندن چلے گئے تھے، اور وہاں بیرسٹری حاصل کی اور ساتھ ہی انگریزی تحریر و تصنیف کی مشق بہم پہونچائی اور اتحادِ اسلام کی عالم گیر تحریک میں شامل ہوگئے، ۱۹۰۵ء کے قریب وہ انگلینڈ سے واپس آئے اور بدستور ندوہ اور دوسرے قومی کاموں میں دل چسپی لی ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے دوران میں وہ لندن ہی میں تھے اور تقریباً ۱۹۲۰ء تک رہے، ۱۹۲۰ء کے شروع میں واپس آئے، ترکوں سے اور تحریک خلافت سے ان کو بے حد عقیدت تھی، وہ ایک طرف مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم کے ذریعہ سے قوم کو اور دوسری طرف ہز ہائنس آغا خان کے ذریعہ گورنمنٹ کو مسلمانوں کے معاملات کو سدھارنے اور مختلف تحریکوں کو کام یاب بنانے کی کوشش کرتے تھے، ترکی اور یورپ کے بہت سے مشاہیر سے ان کے تعلقات تھے، وہ کنگ کی مسجد میں بھی اس زمانہ میں چند سال رہے تھے اور اسلام کے متعلق بہت سے مضامین اور کتابیں لکھیں، ان کی آخری کتاب ''اسلام اور بالشوازم'' ہے، وہ قلب کے مریض تھے، آخر اسی بیماری میں ۲۳؍دسمبر ۱۹۲۰ء میں وفات پائی۔ [2] اس خط پر جو غالباً جنوری ۱۹۰۸ء کا ہے، مولانا کے قلم سے غلطی سے ۱۹۰۷ء نکل گیا ہے، ابتداء سنہ میں اکثر یہ غلطی نادانستہ ہوجاتی ہے۔ [3] مدرسہ کو یہ امداد ۱۹۲۰ء کے ترک موالات کے زمانہ تک ملتی رہی، ترک موالات کے زمانہ میں ندوہ نے اس رقم کو لینے سے انکار کردیا، بعد کو راجہ کشن پال سنگھ رئیس کوکر نے اپنی وزارت تعلیم کے زمانہ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی سفارش پر دوبارہ جاری کیا، جو اب تک جاری ہے۔

غیر مذہبی علوم کے لیے اس نئی امداد حاصل ہونے پر انگریزی اور ریاضی کا اسٹاف بڑھایا گیا اور عربی علم ادب میں جدید عربی کی تعلیم کے لیے خاک سار جدید عربی کا معلم (ماڈرن عربک پروفیسر) مقرر کیا گیا اور بعض اضافے اور ترقیاں ہوئیں۔

قومی امدادیں | اب مدرسہ کے مذہبی علوم کی تعلیم کی ترقی وتوسیع کے لیے مزید کوشش کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ اس غرض سے مولانا نے پنجاب، صوبہ سرحد اور صوبہ بہار کے بعض شہروں کا دورہ کیا اور معتد بہ امدادیں حاصل کیں، صوبہ سرحد کے دورہ میں مولانا کے ساتھ جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواری بھی شریک تھے۔

وظائف | سنسکرت اور ہندی پڑھنے کے لیے جو طلبہ تیار ہوئے تھے ان کے لیے وظیفوں کا الگ انتظام کیا اور ہمیشہ اپنے دوستوں سے وظائف کی مد میں اعانت کی درخواست کرتے رہتے تھے۔

سرمایہ محفوظہ | ابھی تک ندوہ میں کوئی مستقل محفوظ سرمایہ نہ تھا، بلکہ یہ قاعدہ تھا کہ جو آتا تھا وہ خرچ کر دیا جاتا تھا، مولانا نے ۱۹۰۵ء-۱۳۲۳ھ میں یہ تحریک کی کہ بینک میں ریزروڈ فنڈ کے نام سے ندوہ کا الگ حساب کھولا جائے، پھر ۱۹۰۶ء میں بنارس کے جلسہ میں یہ تحریک پیش ہو کر منظور ہوئی اور اس کے لیے بارہ ہزار کے چندہ کا اعلان ہوا، مگر اس میں سے وصول کم ہوا، ۱۹۰۷ء کی روداد میں اس مد کی تعداد پانچ ہزار[۱] کے قریب ہے، خیال آتا ہے کہ مولانا کے آخر زمانہ میں اس مد میں پندرہ ہزار کے قریب جمع ہو گیا تھا۔

تعمیر کی فکر | مدرسہ اب تک گولہ گنج کی ایک گلی میں ایک پرانے قسم کے مکان میں تھا، جو پہلے ایک ہندو رئیس کا تھا اور ندوہ نے نو ہزار روپیہ میں اس کو خریدا تھا، اسی میں ایک ہال ناصر الاسلام شیخ بہاء الدین صاحب وزیر جوناگڈھ کی ایک ہزار روپے کی فیاضی سے بن گیا تھا، کچھ ادھر ادھر کمرے حسب ضرورت بنوا لیے گئے تھے، مولانا کی نظر میں قسطنطنیہ کے دار العلوم اور علی گڑھ کا مدرسۃ العلوم تھا، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ مذہبی درس گاہ ہماری دنیاوی درس گاہوں سے ظاہری حیثیت میں بھی کسی طرح کم نہ ہو، ۱۹۰۶ء میں مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو لکھتے ہیں "ندوہ کے مکان کی بدحیثیتی اس کو ابھرنے نہیں دیتی، اس لیے ہر طرف سے ہٹ کر اب ادھر توجہ کرنی پڑی، اسی بنا پر کلکتہ کا سفر بھی ہے، ایک معقول شاہی عمارت بہت ارزاں لکھنؤ میں مل رہی ہے، خیال ہے کہ اسی کو لے لیا جائے۔" (۸)

لیکن یہ تجویز عمل میں نہ آسکی، اسی دھن میں ۱۹۰۷ء میں ایک اپیل لکھوا کر چھپوائی جس میں

---

[۱] روداد جلسہ دستار بندی، ص ۳۲۔

مدرسہ کی عمارت کا تخمینہ پچاس ہزار کیا تھا اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایسے پچاس بزرگ جو ایک ایک ہزار دے سکیں ہمت کریں، یہ اپیل مولوی غلام محمد صاحب شملوی مرحوم ریاست بھاولپور میں لے کر گئے تو حاتمۂ دوراں جدۂ ماجدہ اعلا حضرت نواب صاحب بھاول پور نے فرمایا، پچاس شخصوں کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں، یہ پوری رقم میرے نج کے خزانہ سے دے دی جائے۔

یہ خبر تار کے ذریعہ سے جب مولانا کو پہنچی ہے تو ان کی خوشی کا عجیب عالم تھا، اس دن تمام مدرسہ میں جلسہ و اساتذہ خوشی و مسرت سے بغل گیر ہو رہے تھے اور اسی خوشی میں انہوں نے یہ کیا کہ ۱۰ / بجے دن کے کھانے کا جو دستر خوان بچھا تھا وہ سارا کھانا فقرا کو تقسیم کر دیا، مولانا شروانی صاحب رقم فرماتے ہیں کہ ''بیگم صاحبہ کی طرف سے مزید رقم کا وعدہ بھی تھا، مگر بعض معاصرین نے بیگم صاحبہ کو یہ خبر پہنچا کر پریشان کر دیا کہ ندوۃ العلما کے دار العلوم میں (نعوذ باللہ) الحاد لا مذہبی کی تعلیم ہوتی ہے، اس میں روپیہ دینا معصیت ہے'' اس خبر سے مضطرب ہو کر بیگم صاحب نے مولوی سر رحیم بخش صاحب مرحوم پریسڈینٹ کونسل ریاست (جن کی تحریک سے یہ رقم بالا ملی تھی) کو بلا کر کہا ''سائیں سائیں جی روپیہ کس کو دلوا دیا''[1] ایک مولوی صاحب نے رفع الزام کی کوشش کی تاہم شوقِ امداد سرد ہو گیا، مزید رقم نہ مل سکی[2] اور عمارت آج تک ناتمام ہے۔

مدرسہ کے لیے عطائے زمین ۱۹۰۸ء سرمایہ کی طرف سے اطمینان ہوا تو زمین کی تلاش ہوئی، لکھنؤ میں سب سے بہتر اور سب سے موزوں تر وہ قطعۂ آراضی ہے جو دریائے گومتی کے پار آہنی پل کے دائیں جانب واقع ہے، زمین کا منظر یہ ہے کہ ایک طرف نہایت قریب دریا ہے، پشت اور پہلو میں اس وقت کیننگ کالج کا اور اب لکھنؤ یونیورسٹی کا بورڈنگ اور صنعتی اسکول کی پرشان عمارتیں ہیں، شمال کی طرف دور تک کھلا ہوا میدان ہے، یہ قطعہ پختہ ۳۲ بیگھ ہے، چنانچہ اس زمین کے لیے گورنمنٹ میں درخواست کی گئی، اگرچہ اس حلقہ کی زمین میونسپلٹی کے قاعدے کے رو سے ساٹھ روپیہ بیگھ سالانہ پر ملتی ہے اور اسی لیے زمین مطلوبہ کا لگان ڈھائی ہزار کے قریب ہوتا تھا، لیکن جناب مسٹر جاپلنگ صاحب ڈپٹی کمشنر نے رپورٹ کی اور کرنل عبد المجید خاں مرحوم وزیر پٹیالہ کی پر زور زبانی تحریک پر جناب کمشنر صاحب نے اس کے دیے جانے کی سفارش کی اور ہز آنر ہیوٹ صاحب لفٹنٹ گورنر نے اس کو منظور کیا اور صرف دو سو سالانہ لگان مقرر کیا۔

---

[1] مولانا شروانی لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ خود مولوی رحیم بخش صاحب مرحوم نے ان سے بہ مقام بھاول پور بیان کیا تھا۔

[2] خاکسار نے مارچ ۱۹۴۰ء میں بھاول پور ایک سلسلہ میں جا کر ارکان ریاست سے اس عمارت کی تکمیل کی تحریک کی، چنانچہ ہز ہائنس نے پندرہ ہزار کی رقم منظور فرمائی، مگر موجودہ جنگ کی وجہ سے یہ رقم اب تک نہ مل سکی۔

جلسۂ سنگ بنیاد ۱۹۰۸ء ان تیاریوں کے بعد نومبر ۱۹۰۸ء میں دارالعلوم کے سنگ بنیاد اور ندوہ کے سالانہ اجلاس کی تاریخیں مقرر ہوئیں، ندوہ اودھ کے دارالسلطنت میں واقع ہے، اس کے چاروں طرف مسلمان روسا اور تعلقہ دار ہیں، جن کی معمولی نگاہِ التفات بھی ندوہ کو مالا مال کر سکتی تھی، مگر ان لوگوں کو یہ خیال تھا کہ گورنمنٹ ندوہ سے بدگمان ہے، اب جب کرنل عبدالمجید خاں مرحوم کی کوششوں سے ان بدگمانیوں کا پردہ چاک ہوا اور گورنمنٹ نے بیش از بیش نظر توجہ کی تو اس زمانہ کے حالات کے مطابق یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس مدرسہ کا ظاہری سنگ بنیاد یوپی کے گورنر سر جان پرسکاٹ ہیوٹ رکھیں، تاکہ اودھ کے تعلقہ داروں کی بدگمانی دور ہو، مولانا مرحوم نے اس جلسہ کا حال خود اپنے قلم مسرت رقم سے لکھا ہے، اس لیے ہم اس کو یہاں ان ہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

بگذر ازیں حرف مکرر میرس — خوابِ خوشی دیدم و دیگرم میرس
تند مے بود خرابم ہنوز — دیدۂ من باز و بخوابم ہنوز

ہماری آنکھوں نے حیرت فزا تماشا گاہوں کی دلفریبیاں بارہا دیکھی ہیں، جاہ و جلال کا منظر بھی اکثر نظروں سے گزرا ہے، کانفرنسوں اور انجمنوں کا جوش و خروش بھی ہم دیکھ چکے ہیں، وعظ و پند کے پراثر جلسے بھی ہم کو متاثر کر چکے ہیں لیکن اس موقع پر جو کچھ آنکھوں نے دیکھا، وہ ان سے بالاتر، ان سب سے عجیب تر، ان سب سے حیرانگیز تھا۔

یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بدوش نظر آتے تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقدس علما عیسائی فرماں روا کے سامنے دلی شکرگزاری کے ساتھ ادب سے خم تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ شیعہ و سنی ایک مذہبی درس گاہ کی رسم ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی درس گاہ کا سنگِ بنیاد ایک غیر مذہب کے ہاتھ سے رکھا جا رہا تھا، مسجد نبوی ﷺ کا منبر بھی ایک نصرانی نے بنایا تھا، غرض یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی سقف کے نیچے نصرانی، مسلمان، شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، رند، زاہد، صوفی، واعظ، خرقہ پوش اور کج کلاہ سب جمع تھے:

ع : آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

ہز آنر لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک متحدہ نے منظور فرمایا کہ وہ دارالعلوم ندوۃ العلما کا سنگ بنیاد اپنے ہاتھ سے رکھیں گے، یہ تقریب ۲۸ر نومبر ۱۹۰۸ء کو عمل میں آئی، چوں کہ ندوہ کا سالانہ جلسہ بھی ان

ہی تاریخوں میں ہونے والا تھا اس لیے دوطرفہ کشمکش کی وجہ سے گویا تمام ہندوستان امنڈ آیا، افسوس یہ ہے کہ یہ کوئی تعطیل کا زمانہ نہ تھا ورنہ شاید منتظمین جلسہ انتظامِ مہمان داری میں ہمت ہار جاتے، معزز شرکائے جلسہ میں علما میں سے مولوی (مولانا) عبدالباری صاحب فرنگی محلی، مولوی شاہ ابوالخیر صاحب غازی پوری، مولانا ذاکر حسین صاحب، مولوی ابن حسن صاحب مجتہد العصر، مولوی شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مولوی نظام الدین صاحب جھجری، مولوی مسیح الزماں خان صاحب استاد حضور نظام، (مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی) اور اربابِ وجاہت میں سے جناب آنریبل راجہ صاحب محمود آباد، جناب سر راجہ صاحب جہاں گیر آباد، نواب وقار الملک کرنل عبدالمجید خاں فارن منسٹر پٹیالہ، صاحب زادہ آفتاب احمد خان، شیخ عبدالقادر بیرسٹر، حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس علی گڑھ، خان بہادر سید جعفر حسین صاحب، مولوی محمد حسین صاحب، مقبہ رئیس بمبئی، بابو نظام الدین رئیس امرتسر، حاجی شمس الدین صاحب سکریٹری حمایت اسلام لاہور، مرزا ظفر اللہ خاں صاحب سب جج جالندھر، شیخ سلطان احمد رئیس ہوشیار پور، خان بہادر شیخ غلام صادق صاحب، رئیس امرتسر، راجہ نوشاد علی خاں صاحب، صفی الدولہ نواب علی حسن خان لکھنو، حافظ نذر الرحمٰن صاحب رئیس عظیم آباد جلسہ میں شریک تھے۔

تین بجے سے ذرا پہلے تمام لوگ بہ اسلوب بیٹھ گئے اور ارکانِ انتظامیہ ندوہ ہز آنر کے استقبال کے لیے لب فرش دو رویہ صف باندھ کر کھڑے ہوئے، کمشنر صاحب لکھنؤ نے سکریٹری دارالعلوم (شبلی نعمانی) کو لفٹننٹ گورنر صاحب بہادر سے ملایا اور پھر سکریٹری موصوف نے تمام ارکانِ انتظامیہ کا ایک ایک کر کے لفٹننٹ گورنر سے تعارف کرایا، اول دارالعلوم کے قاری نے قرآن مجید کی چند آیتیں تلاوت کیں، پھر شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے ہز آنر سے ایڈریس پڑھنے کی اجازت طلب کی، مولوی مشیر حسن صاحب قدوائی نے ایڈریس پڑھا، ہز آنر نے نہایت خوش لہجگی اور صفائی سے ایڈریس کا جواب دیا، مولوی خلیل الرحمٰن صاحب نے عربی ایڈریس جو ساٹن پر چھپا ہوا تھا، زریں کار چوبی خریطہ میں رکھ کر پیش کیا، ہز آنر نے خود اپنے ہاتھ میں لے کر ایڈیکانگ کے حوالہ کیا، پھر سنگ بنیاد نصب کرنے کے لیے تشریف لے گئے اور مولوی شاہ ابوالخیر صاحب کرنل عبدالمجید خاں صاحب، آنریبل راجہ صاحب محمود آباد، نواب وقار الملک، حافظ عبدالحلیم صاحب رئیس کان پور، نواب علی حسن خان صاحب رئیس بھوپال، منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری، منشی اطہر علی صاحب بی، اے وکیل

لکھنؤ، حکیم عبدالعزیز صاحب، حکیم عبدالولی صاحب، مولوی محمد نسیم صاحب وکیل اور مولانا شروانی ان کے ساتھ گئے، سنگ بنیاد کے نصب کرنے کے وقت دوبارہ قاری صاحب نے قرآن مجید کی تلاوت کی، واپسی کے وقت ارکانِ انتظامیہ نے موٹر کار تک مشایعت کی اور یہ دلفریب تماشا ختم ہوگیا۔

عجیب حسن اتفاق ہے کہ ہندوستان کا سب سے بڑا دارالعلوم لکھنؤ کا فرنگی محل تھا جو درسِ نظامیہ کا بانی ہے اور جس کے دامنِ فیض سے مولانا بحرالعلوم، ملا حمداللہ، ملاحسن وغیرہ تعلیم پاکر نکلے، یہ فرنگی محل اس لیے کہلاتا تھا کہ ایک فرنگی کی کوٹھی تھی اور اس لیے محل اس کی طرف منسوب ہوگیا تھا، شاہ عالم گیر کی سند میں یہ نام درج ہے، اس جدید دارالعلوم کی بنیاد ہزآنر لفٹنٹ گورنر نے رکھی کہ وہ بھی اہل فرنگ ہیں، میر اکبر حسین صاحب نے اس موقع پر اس حسن اتفاق سے شاعرانہ کام لیا، لکھتے ہیں:

رکھی بنائے ندوہ ہزآنر نے آ کے خود سچ پوچھیے اگر تو فرنگی محل یہ ہے

لکھنؤ کی سرزمین میں مدرسہ کے نام سے یہ سب سے پہلے مدرسہ کی بنیاد پڑی تھی، اس واقعہ کو سامنے رکھ کر مولانا نے قرآن پاک کی ایک آیت سے جس میں خانۂ کعبہ کو سب سے پہلا گھر فرمایا گیا ہے، یہ قطعۂ تاریخ موزوں فرمایا:

ملت ایں مدرسۂ تازہ چو بنیاد نہاد کہ در و خلق زہر ناحیے مجتمع است
قدسیاں از سرالہام بہ شبلی گفتند سال وتاریخ بنااوّلُ بیتٍ وُضِعَ است

۱۳۲۵ھ/۱۳۲۶ھ

سنگ بنیاد کی رسم بڑی شوکت وشان سے ادا ہوئی، تمام معززروسا حکام ضلع اور علما وفضلا شریکِ جلسہ تھے، اس موقع پر ارکان ندوہ کی طرف سے جناب ہزآنر کی خدمت میں جو سپاسنامہ پیش کیا گیا، وہ گو پڑھا انگریزی زبان میں گیا، جس کے ساتھ اردو ترجمہ بھی شامل تھا، مگر اصل سپاس نامہ عربی زبان میں تھا۔

لطیفہ: ایک موقع پر ایک لطیفہ یاد آیا، لفٹنٹ گورنر کے انتظار میں ندوہ کے ارکان دورویہ کھڑے تھے، پروگرام یہ تھا کہ ڈپٹی کمشنر مولانا کا تعارف گورنر صاحب سے اور مولانا ارکان کا تعارف گورنر صاحب سے کریں گے، ابھی وہ نہیں آچکے تھے اور ارکان انتظار میں کھڑے باتیں کررہے تھے، مولانا شروانی نے مولانا سے فرمایا کہ جس ترتیب سے ہم لوگ کھڑے ہیں، اسی ترتیب سے ہمارے نام لکھ کر سامنے رکھ لیجیے، علی گڑھ میں ایک ایسا موقع آیا تو نواب وقارالملک نام بھول گئے، مولانا نے ہنس کر فرمایا کہ

اب آپ لوگوں کے نام میں بھول جاؤں گا، اتفاق دیکھیے کہ جب گورنر آئے اور مولانا نے ایک ایک کے سامنے جا کر تعارف شروع کیا تو شاہ سلیمان صاحب کے پاس آ کر ان کا نام بھول گئے، شاہ صاحب نے خود اپنا نام بتایا، اس پر بعد کو بڑی ہنسی ہوئی۔

ندوہ کا جلسۂ سالانہ ۱۹۰۸ء جلسۂ سنگ بنیاد کے دوسرے دن ۲۹ و ۳۰ نومبر ۱۹۰۸ء کو ندوہ کا سالانہ جلسہ ہوا، پہلے جلسہ کے صدر جناب مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی ہوئے، ان کی تقریر صدارت کے بعد مولانا نے اپنا وہ نو تصنیف فارسی قصیدہ جو اسی جلسہ کے لیے لکھا تھا، پڑھنا شروع کیا، اس کا مطلع ہے:

اے کہ نیرنگ سرا پردۂ عالم دیدی — جاہِ کیخسرو و فرِ حشم جم دیدی

قصیدہ کیا تھا تاثیر کا ایک امنڈتا ہوا سیلاب تھا، جو دلوں کے ساحل سے جا کر ٹکراتا تھا، آہ و بکا اور شور و تحسین کے نعروں کے درمیان وہ ختم ہوا، اس کے بعد گورنر کے عطائے زمین اور رئیسہ عالیہ بھاول پور کے شاہانہ عطیہ کے شکریہ کی تجویزیں منظور ہوئیں اور پہلا اجلاس ختم ہوا، ظہر کے بعد دوسرا اجلاس ہوا، جس میں حاضرین کے اصرار سے مولانا نے اپنا قصیدہ دوبارہ پڑھا، قصیدہ کی کاپیاں جو ندوہ کی طرف سے چھپوائی گئی تھیں، لوگوں نے ایک ایک روپیہ میں ہاتھوں ہاتھ لیں اور جناب نواب سید محمد علی حسن خاں بہادر نے تیس روپیہ میں ایک کاپی خرید فرمائی، اس کے بعد جناب سیٹھ محمد حسن مقبہ رئیس بمبئی نے جو خود بھی عربی جانتے تھے، طلبہ کا امتحان لیا اور اردو کی ایک ایسی عبارت ترجمہ کے لیے دی جو جدید قانونی اور تمدنی الفاظ سے بھری ہوئی تھی، چار طالب علموں نے اسی وقت نہایت فصیح و بلیغ عربی میں ترجمہ کر دیا، اس کے بعد ایک طالب علم نے عربی میں نہایت شستہ رفتہ تقریر کی، جس پر تمام حاضرین نے تحسین و آفریں کی، مولانا نے وقت کی موزونیت کو سمجھ کو دارالعلوم کی خصوصیات پر ایسی موثر تقریر فرمائی کہ لوگوں نے تعلیم اور تعمیر کے لیے چندے لکھوانے شروع کر دیے۔

اس جلسہ کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ علی گڑھ پارٹی کے ارکان آفتاب احمد خان، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور کالج اور کانفرنس کے دوسرے ارکان جو ابھی تک ندوہ کے کسی جلسہ میں شریک نہیں ہوئے تھے، شریکِ اجلاس ہوئے، رات کو ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے بطلیموسی اور فیثا غورثی نظام فلکی پر مبسوط لکچر دیا اور تمام علمی تجربات دکھائے اور اس کے بعد پروفیسر فیروز الدین مراد نے طبیعیات و

برقیات کے بعض مسائل پر میجک لینٹرن کے ذریعہ سے تقریر کی جس سے علما کو جدید سائنس کی بعض تحقیقات کا علم ہوا۔

دوسرے دن ندوہ کا تیسرا اجلاس ہوا، اس کے صدر شمس العلما مولانا ابوالخیر صاحب فصیحی غازی پوری ہوئے، اس جلسہ میں سب سے پہلے مولوی عبدالودود صاحب ندوی نے جو انجمن تقویۃ الایمان ڈیک (راجپوتانہ) کی طرف سے آئے تھے، آریہ مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنانے کی جو کوشش وہاں کر رہے تھے، اس کی تفصیلات بیان کیں، اس کے بعد مولانا نے دارالاقامہ کے لیے ہندوستان کے ہر شہر سے ایک ایک کمرہ بنانے کی تجویز پیش کی اور اس تجویز کو پیش کرتے وقت دین و دنیا کے تعلقات پر ایک جامع تقریر فرمائی، اصل تجویز کی تائید مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی اور مولوی غلام محمد صاحب شملوی نے کی اور اسی وقت چند کمروں کے لیے لوگوں نے چندے لکھوائے، اس کے بعد منتظمین کے شکریہ پر جلسہ ختم ہوا اور لوگ یہ کہہ کر رخصت ہوئے:

"خوابِ خوشی دیدم[1] و دیگر مپرس"

وقف علی الاولاد کی کارروائی کا آغاز بھی ندوہ کے اسی اجلاس سے ہوا اور مولانا کی تحریک سے یہ طے ہوا کہ علما سے اس بارہ میں فتوے طلب کیے جائیں۔

دارالاقامہ کا خیال دارالعلوم کی عمارت جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی تھی، مولانا اس کے لیے ایک دارالاقامہ کی تعمیر کی تحریک کو جس کی تجویز جلسہ میں منظور ہو چکی تھی، آگے بڑھا رہے تھے، ایک ایک کمرہ کا تخمینہ سات سات سو روپیہ قرار دے کر احباب سے اور دوسرے دردمندوں سے ایک ایک کمرہ کا چندہ وصول کرنا شروع کر دیا، دلی اور لکھنؤ کے اجلاسوں میں بہت سے اہل خیر نے ایک ایک کمرہ کی تعمیر کا وعدہ کیا اور بہت سے لوگوں نے اپنے وعدے پورے بھی کیے، ان میں پہلا نام تو خود مولانا کا ہے، دوسرا حکیم عبدالولی صاحب مرحوم جھوائی ٹولہ لکھنؤ کا ہے، ان کے علاوہ شیخ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر اور نواب رستم علی خاں صاحب رئیس کرنال کے نام ہیں، نواب مزمل اللہ خان نے لکھا کہ وہ مولانا کی تصنیفات کی یادگار میں ایک کمرہ بنوائیں گے لیکن مولانا نے ان کے اس چندہ کو دارالمصنفین کی تعمیر کے لیے مخصوص کرنے کی تجویز ان کے سامنے پیش کی[2]۔

---

[1] منقول از روداد دوازدہم، اجلاس دہلی ۱۹۱۰ء، ص ۵۵ و ۵۶۔ [2] بحوالہ الندوہ۔

بیگم صاحبہ جنجیرہ (بمبئی) نے جن کے خاندان سے مولانا کے دوستانہ تعلقات قسطنطنیہ کے زمانہ سے تھے، جولائی ۱۹۰۹ء میں ایک کمرہ کے لیے ایک ہزار روپیہ بھیجا، اس کے شکریہ میں مولانا نے یہ قطعہ ان کو لکھ کر بھیجا:

مشغول کار مدرسہ بودم کہ ناگہاں — دیدم کہ نامہ ہا ز پئے ہم رسیدہ است
زاں جملہ ہست نامۂ بے نقش و بے سواد — کز بارگاہِ حضرت بیگم رسیدہ است
از جائے جستم و بگرفتم بدست شوق — گویا کہ خستہ ایست بہ مرہم رسیدہ است
بر سر نہادم و بہ ادب بوسہ دادمش — مانند تشنۂ کہ بہ زمزم رسیدہ است
مہر از سرش گرفتم و از جا در آمدم — چوں دیدم ایں کہ کاغذ زر ہم رسیدہ است
نازم کہ ایں عطیۂ فیض امیرہ است[1] — کآوازۂ سخاش بہ عالم رسیدہ است

بھوپال کی امداد میں اضافہ ۱۹۰۹ء سرکاری امداد سے مذہبی اور غیر مذہبی علوم کے موازنہ میں جو عدم توازن پیدا ہو گیا تھا، اس کے دور کرنے کے لیے مولانا پوری کوشش میں مصروف تھے، کبھی دورہ کرتے تھے، کبھی حیدر آباد کا خیال کرتے تھے۔ (سلیمان-۲۳)

منشی محمد امین صاحب بھوپال کو ۷؍فروری ۱۹۰۹ء کو لکھتے ہیں "آپ کو معلوم ہے کہ ندوہ کی مستقل آمدنی ابھی تک صرف دو سو ہے گورنمنٹ نے پانچ سو روپے دیے اس لیے اب خالص مذہبی علوم کا صیغہ اس کے مقابلے میں بہت کم وقعت رہ جاتا ہے، ضرور ہے کہ خود ندوہ کی آمدنی میں اضافہ ہو، ریاست حیدر آباد سے پانچ سو کا وعدہ ہو چکا تھا لیکن اس حالت میں کہ ریاست پر کئی کروڑ کا بار پڑ گیا جو کئی سال تک قائم رہے گا، زبان نہیں کھل سکتی" (۳) آخر کامیابی کی بجلی بھی اسی افق سے چمکی، جدھر سے امید کی پہلی شعاع نظر آئی تھی، یہ وہی نواب سلطان جہاں بیگم فرماں روائے بھوپال کا دست کرم تھا، سرکار عالیہ نے اس ضرورت کو سننے کے ساتھ اپنے پچاس روپیہ ماہوار کی امداد کو پنج گونہ کر دیا، یعنی از خود دو سو روپے ماہوار کا اضافہ کر کے ڈھائی سو کر دیا، یہ وہ احسان عظیم تھا جس نے مولانا جیسے خود دار شاعر کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی سپاس گزاری کو ایک قصیدہ کی صورت میں ظاہر فرمائیں، چنانچہ عمر میں پہلی دفعہ اپنی خوشی سے وہ مدحیہ قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے:

انچہ با دشت و چمن ابر بہاراں کردہ است — خسرو کشور بھوپال بما آں کردہ است

---

[1] اس شعر میں نازلی بیگم، عطیہ بیگم اور امیرہ بیگم کی طرف اشارہ ہے، جو اس خاندان کی محترم خواتین ہیں۔

ناشکر گزاری ہوگی اگر اس سلسلہ میں منشی محمد امین صاحب زبیری لٹریری سکریٹری سرکار عالیہ و مہتمم صیغہ تاریخ بھوپال کا نام نہ لیا جائے، جن کی سعی خیر سے یہ کام انجام پایا تھا، مولانا نے منشی صاحب کے ایک خط میں خود اس کا اقرار کیا ہے، لکھتے ہیں ''واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ اور ندوہ کو ریاست سے جو فوائد پہنچ رہے ہیں، اس کے سنگ بنیاد آپ ہیں۔'' (امین-۷)

ریاست رام پور کی امداد ۱۹۱۰ء دوسرے سال ایک اور اسلامی ریاست نے امداد کا ہاتھ بڑھایا، ہز ہائینس نواب حامد علی خان صاحب فرماں روائے رام پور سے مولانا کے روابط بہت پرانے تھے، مگر ان کی تجدید غالباً جناب حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے توسط سے اب ہوئی اور شاید ان ہی کی سفارش سے ۱۹۱۰ء میں نواب صاحب ممدوح نے پانچ سو روپیہ سالانہ کی امداد منظور فرمائی، جو مولانا کی معتمدی تک برابر ملتی رہی۔

درس گاہ کی تعمیر کا کام سنگ بنیاد کے بعد دارالعلوم کے مجوزہ عمارت کا نقشہ خان بہادر میر جعفر حسین صاحب انجینیر (لکھنؤ) نے جو علی گڑھ تحریک کے علم برداروں میں تھے نہایت محنت سے تیار کیا اور ۲ رمئی ۱۹۰۹ء کو جلسۂ انتظامیہ[1] نے شکریہ کے ساتھ اس کو منظور کیا، یہ نقشہ اس قدر خوبصورت، موزوں اور جامع حیثیات تھا کہ سب نے بے ساختہ داد دی، بیچ کا کمرہ اتنا وسیع کہ ایک ہزار کرسیوں کی گنجائش ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ ۳۱ کمرے، ارکان کی طرف سے تعمیر کے لیے ایک سب کمیٹی بنادی گئی تھی، جس کے سکریٹری منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری مقرر ہوئے، منشی صاحب موصوف کی نگرانی میں سید بادی صاحب اور سیر (لکھنؤ) نے اسی کے بعد عمارت بنوانی شروع کی اور ۱۹۱۳ء تک تعمیر کا سلسلہ جاری رہا۔

تفسیر کے کمرہ کی بنیاد مدرسہ کی زمین کا یہ منظر مولانا کی بہترین امیدوں کا گہوارہ تھا، وہ اس گہوارہ کو دیکھنے اکثر تشریف لے جاتے تھے، ۱۵ رجون ۱۹۰۹ء کو مولوی ابوالکلام صاحب کو لکھتے ہیں، ''دارالعلوم کی تعمیر شروع ہوگئی، عجب مست اور فرحت انگیز موقع ہے، روز دیکھنے کو جی چاہتا ہے، سینری کے لحاظ سے مدرسۃ العلوم کو اس سے کوئی نسبت نہیں۔'' (۳)

''۱۰ جنوری ۱۹۱۰ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں ''عمارت اب اس حالت تک پہنچ گئی ہے کہ نہایت تفریح ہوتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ وہیں رہا کیجیے، حالاں کہ صرف کمر کمر تک دیواریں آئی ہیں، تم دیکھ کر لطف اٹھاؤ گے۔'' (حمید-۴۷)

---

[1] الندوہ، اپریل ۱۹۰۹ء۔

جب دیواریں تھوڑی تھوڑی اور بلند ہوئیں اور کمروں کے نشان ظاہر ہوئے تو فروری ۱۹۱۰ء میں فرطِ جوش میں ایک دن تمام طلبہ اور اساتذہ کو لے کر اس زمین پر گئے اور فرمایا مدرسہ کی ظاہری بنیاد تو ایک حاکم وقت نے رکھی، اب آؤ مدرسہ کی حقیقی بنیاد ہم رکھیں، اس پُر اثر منظر کی تصویر خود مولانا کے قلم نے کھینچی ہے، مناسب ہوگا کہ وہ اس موقع پر آپ کی نظر سے بھی گزر جائے۔

''ارباب دولت کو ندوۃ العلما کی عظمت وشان کا تماشا اس وقت نظر آیا ہوگا جب ہز آنر نے دار العلوم کا سنگ بنیاد نصب فرمایا تھا لیکن جو لوگ مذہبی خلوص کے دلدادہ ہیں، ان کے دل اس رسم کی ادائیگی کی خبر سن کر ہل جائیں گے، جو اسلامی سالِ نو کے آغاز اور مقدس دن (جمعہ) کو ادا ہوئی، یکم محرم ۱۳۲۸ھ روز جمعہ کو تمام طلبائے دار العلوم اس مقام پر جہاں دار العلوم کی جدید عمارت تعمیر ہو رہی ہے، اس قدیم مذہبی خدمت کو انجام دینے کے لیے جمع ہوئے، جو ان کا آبائی شعار ہے، دار العلوم کی تمام عمارت اگر چہ بہ جائے خود ایک علمی اور مذہبی عمارت ہے لیکن اسلامی علوم میں علم تفسیر تمام علوم دینیہ کا سرتاج ہے، اس لیے جو کمرہ خاص فن تفسیر کے لیے تعمیر ہو رہا ہے، طلبائے دار العلوم ندوہ نے اس کے پاس جا کر تمام مزدوروں کو ہٹا دیا اور خود اپنے ہاتھ سے چونہ، گارا، اینٹیں لا کر ڈھیر کرنی شروع کیں، معمار کام بناتے جاتے اور لڑکے ان کو مصالحہ دیتے جاتے تھے، وہ حالت خاص اثر رکھتی تھی، جب مصالحہ گھٹتا تھا اور کم حیثیت معمار معزز خاندانی لڑکوں کو تحکم کے لہجہ میں ڈانٹتے تھے، کہ مصالحہ پورا نہیں پہنچتا، جلد کام کرو، خاکسار شبلی بھی اس رسم میں شریک تھا، اور اینٹ اٹھا اٹھا کر معماروں کو دیتا تھا، جب یہ رسم ادا ہو چکی تو میں نے دار العلوم کے مقاصد و اغراض کے متعلق ایک تقریر کی جس کی ابتدا دعا سے ہوئی اور دعا پر ختم ہوئی، تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ اے خدا! یہ چند ناتواں کم حیثیت کم مایہ بچے تیرے گھر میں مزدوری کرنے آئے ہیں، ان کی مزدوری قبول کر، مغربی خیالات کا سخت سیلاب مسلمانوں کو اپنی رو میں بہائے لیے جاتا ہے، جس کے ساتھ ان کی مذہبی حالت مذہبی (علوم[1]) مذہبی شعائر سب اسی طوفان کی زد میں ہے، اے خدا! تو ان چند ناتواں بچوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اس سیلاب کی ٹکر کو سنبھال لیں گے، یہ بہت بڑا دعویٰ ہے، جو کسی طرح ان کے چہرے پر نہیں کھلتا، تو ہی ہے جو ان کی آبرو رہ جائے۔

یہ ایک ایسی شان دار رسم تھی، یہ ایک ایسا مؤثر منظر تھا، جہاں دار العلوم کے تمام مقاصد و اغراض محسوس صورت میں نظر آتے تھے، طلبہ کو نظر آتا تھا کہ ان کی زندگی کا آخری مقصد کیا ہے، وہ جس شاہراہ پر جا رہے ہیں، اس کی انتہائی منزل کہاں ہے، ان کو معلوم ہوتا تھا کہ مذہب کا روحانی اثر کس قدر قوی ہے،

---

[1] اصل میں تاریخ ہے، مراد علوم، س۔

ان کو محسوس ہوتا تھا کہ کون سا پرزور ہاتھ ان کو ڈھکیل رہا ہے۔

دارالتفسیر کی یہ بنیاد تعمیر اور اس موقع پر ان کی یہ ولولہ انگیز تقریر ان کے اصلی جذبات کا پتہ دیتی ہے، کہ وہ کن امیدوں کے ساتھ ندوہ اور دارالعلوم کی خدمت میں لگے ہوئے تھے، اس عمارت کی ہر اینٹ ان کی امید و آرزو کی ایک لوح تھی، اس خوش منظر قطعہ میں بھری ہوئی امیدوں کے ساتھ کبھی تنہا جاتے کبھی دوسروں کو لے جاتے۔"

اسی نامکمل عمارت میں ۱۹۱۰ء میں ہز ہائینس سر آغا خان کی آمد پر ایک نہایت شاندار جلسہ کیا اور ۱۹۱۲ء میں جب اس کا ہال پورا ہو چکا تھا، سید رشید رضا کی آمد پر ندوہ کا عظیم الشان سالانہ جلسہ پھر اسی میں منعقد کیا، تاکہ عام مسلمان امید کے اس نخلستان کو دیکھ لیں۔

یہ افسوس کی بات ہے کہ سلسلۂ تعمیر میں مولانا اور منشی صاحب میں ایک اختلاف پیدا ہوا، جو بڑھتا ہی گیا، مولانا یہ چاہتے تھے کہ جتنا سرمایہ ہمارے پاس ہے، اسی کی حیثیت سے تعمیر کو مکمل کر دیا جائے اور منشی صاحب موصوف جو بڑی مستعدی اور محنت سے عمارت کے بنوانے میں مصروف تھے، ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ مدرسہ بنے تو نقشہ کے مطابق ہر حیثیت سے مکمل بنے، کام تین چار برس تک جاری رہا، بالآخر وہ پچاس ہزار ختم ہو گئے، مدرسہ کا پہلا مکان شاید نو دس ہزار میں بکا، وہ بھی خرچ ہوا، مستقل فنڈ بھی تمام ہو گیا، ندوہ کے قبضہ میں ایک آدھ کرایہ کا سکونتی مکان تھا، وہ بھی بک گیا، مگر تعمیر تکمیل کو نہیں پہنچی، ۲۷ مارچ ۱۹۱۳ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں، "مکان بک گیا، اب بھی دیکھیے، عمارت پوری ہوتی ہے یا نہیں، نواب غلام احمد[۱] مدراس سے آئے تھے، ان کو عمارت دکھائی، ان کے اندازۂ تخیل سے باہر تھی، بہت خوش ہوئے۔"

افسوس کہ مولانا کی زندگی میں ان کے خواب تمنا کی تعبیر نہیں نکلی، آخر اسی ناتمام عمارت میں مولانا کی علاحدگی کے بعد اور وفات سے پہلے ۱۹۱۴ء میں دارالعلوم اٹھ کر چلا آیا۔

مدرسہ میں سر آغا خان کی آمد اور ۵۰۰ سالانہ کی امداد ۱۹۱۰ء | اس زمانہ میں مسلم لیگ اور مسلم یونیورسٹی کے کاموں کے سبب سے ہز ہائینس سر آغا خان ہندوستانی مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر تھے، اخیر

---

[۱] نواب غلام احمد خاں کلامی مدراس کے ایک پرانے قومی خادم ہیں، اب بوڑھے ہو چکے ہیں، پھر بھی ریاست میسور کی اسمبلی میں غیر برہمنوں کے لیڈر ہیں، ندوہ کے قدیم بہی خواہ اور معین و مددگار ہیں۔

جنوری ۱۹۱۰ء میں دہلی میں مسلم لیگ کے ایک جلسہ میں جس میں مولانا وقف علی الاولاد کے مسئلہ کو پیش کرنے کی غرض سے گئے تھے، مولانا کی ملاقات سر آغا خاں سے ہوئی، موصوف نے ندوہ کے متعلق کچھ مشورے کیے، اس تقریب سے مولانا نے ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ میں ندوہ کو دیکھتے جائیں، جس کو انہوں نے منظور کیا، چنانچہ ۳۱؍جنوری ۱۹۱۰ء کو وہ لکھنؤ آئے اور ۳؍فروری ۱۹۱۰ء دارالعلوم کی جدید عمارت کے زیر تعمیر ہال میں ایک نہایت شاندار جلسہ ہوا، ہال کو دارالعلوم کے ایک ممتاز طالب علم نے جن کے حسن اہتمام و انتظام کو اب ایک دنیا مانتی ہے، مگر اس وقت تک صرف مولانا ہی مانتے تھے، یعنی مولوی مسعود علی صاحب ندوی، نے نہایت خوبی سے سجایا تھا تقریباً پانچ سو چیدہ اصحاب کا مجمع تھا، جن میں آنریبل راجہ علی محمد خان تعلق دار محمود آباد، آنریبل راجہ تصدق رسول خان تعلق دار جہاں گیر آباد، راجہ شعبان علی خان، مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

ہز ہائینس ٹھیک ۱۲ر بجے تشریف لائے، طلبہ نے جن کی دو رویہ قطاریں سڑک کے دونوں طرف کھڑی تھیں، اھلاً و سھلاً و مرحباً کا زور سے غلغلہ بلند کیا، ہز ہائینس ہال میں تشریف لاکر صدر میں بیٹھے، پہلے دارالعلوم کے ایک طالب علم نے قرآن مجید کی چند آیتیں تلاوت کیں، پھر مولانا نے فارسی میں اڈریس پڑھا جو الندوہ میں اور مقالات شبلی کے سلسلہ میں چھپا ہوا ہے، چوں کہ ہز ہائینس کا اصل مقصد طلبہ کے خیالات و معلومات کا اندازہ کرنا تھا، اس لیے جناب ممدوح نے طلبہ کو بلاکر ان کو تقریر کا موقع دیا اور بعض طلبہ کے لیے خود تقریر کا موضوع متعین کر دیا، طلبہ نے نہایت شستہ اور فصیح عربی میں تقریریں کیں، خاکسار کی تقریر کا موضوع تھا، ''علما کو جدید فلسفہ کا سیکھنا کیوں ضروری ہے؟'' یہ عربی تقریر لکھنؤ کے عربی رسالہ البیان میں چھپی ہے، آخر میں ہز ہائینس نے کھڑے ہو کر نہایت فصیح فارسی میں برجستہ تقریر کی جس میں دارالعلوم کے مقاصد اور تعلیم کی تعریف کی اور فرمایا کہ ندوہ کی تعلیم کے سلسلے تمام ہندوستان میں پھیلنے چاہئیں، تاکہ مذہبی گروہ میں یہ روشن خیالی پیدا ہو جائے، یہ بھی فرمایا کہ طلبہ کو جدید تعلیم کی تکمیل کے لیے یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھیجنا چاہیے اور جس طرح یہودی اور عیسائی پیشوایانِ مذہب علوم جدیدہ کو مذہب کی حمایت کے لیے سیکھتے ہیں، علمائے اسلام کو بھی اسی طرح سیکھنا چاہیے تاکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ پر اپنا مذہبی اثر ڈال سکیں اور ان کی رہبری کر سکیں، آخر میں فرمایا کہ میں ہمیشہ ندوہ کا معین و مؤید رہوں گا اور پانچ سو سالانہ کی امداد منظور کی۔

آخر میں مولانا عبدالباری صاحب مرحوم نے ہز ہائینس کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا ہم کو ہز ہائینس جیسے لوگ درکار ہیں جو مسلمانوں کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو ملا سکیں، اسی پر جلسہ کا خاتمہ ہوا[1]۔

اجلاس دہلی ۱۹۱۰ء ندوہ کے سالانہ اجلاس گو امرتسر سے لے کر کلکتہ اور مدراس تک بڑے بڑے شہروں میں ہو چکے تھے، مگر ہنوز ہندوستان کا پایۂ تخت اس شرف سے محروم تھا، مولانا نے وقف علی الاولاد کے سلسلہ میں مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں شرکت کے لیے جو سفر کیا، اسی سفر میں جنوری ۱۹۱۰ء میں دہلی میں جناب حکیم اجمل خاں صاحب سے ملاقات ہوئی اور وہیں یہ طے پایا کہ ندوہ کا آیندہ سالانہ جلسہ دہلی میں ہو اور اس کے لیے ۱۴، ۱۵، ۱۶/ ربیع الاول ۱۳۲۸ھ مطابق ۲۶، ۲۷، ۲۸/ مارچ ۱۹۱۰ء کی تاریخیں مقرر کی گئیں اور تیاریاں شروع ہوئیں۔

اس جلسہ میں مخالفین نے ایک ہنگامہ یہ برپا کیا کہ مولانا نے اس جلسہ کے سلسلہ میں الندوہ کے ایک شذرہ میں لکھ دیا تھا کہ ''اس جلسہ میں شاید مولانا حالی اور مولانا نذیر احمد صاحب بھی علما کے پہلو بہ پہلو شریک ہوں اور یہ پہلا موقع ہوگا کہ جدید تعلیم کے امیر العسکر قدیم جماعت کے علما کی صف میں دوش بدوش نظر آئیں۔'' (الندوہ ص ۳ فروری ۱۹۱۰ء) ان دنوں مولوی نذیر احمد صاحب نے ''امہات الامہ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کی زبان نہایت سوقیانہ تھی، جس کو پڑھ کر مسلمانوں کو بڑی تکلیف ہوئی اور اس لیے ان کے خلاف دہلی میں خاصی شورش برپا تھی، ندوہ میں ان کی شرکت کی خبر نے خود ندوہ کے اجلاس کو موردِ اعتراض بنا دیا، ارکانِ ندوہ نے بلکہ درحقیقت حکیم اجمل خان صاحب مرحوم نے مولوی نذیر احمد صاحب اور مخالفین کے درمیان اس بات پر مصالحت کرائی کہ کتاب کے نسخے ان لوگوں کو سپرد کر دیے جائیں اور آیندہ اس کی اشاعت بند کر دی جائے، چنانچہ مولوی صاحب نے وہ نسخے فریق مخالف کے پاس بھیج دیے لیکن مولانا نذیر احمد صاحب نے خود اس بات پر اصرار کیا کہ یہ کتابیں فریقِ مخالف کے قبضہ میں بھی نہ رہیں، بلکہ جلا کر ناپید کر دی جائیں، شاید مولوی صاحب کو اس کا خطرہ ہو کہ ایسا نہ ہو کہ ان کی کتاب سے کوئی دوسرا نفع اٹھا لے، بہرحال ان کی اس پر اصرار خواہش کے مطابق کتاب کے موجودہ نسخوں کو ایک مجمع میں جس میں ندوہ کے ارکان بھی تھے، نذرِ آتش کر دیا گیا، اس واقعہ کو مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری ترقی اردو نے اپنے مقدمہ حیات النذیر میں مولانا شبلی کی طرف بواسطہ یا بلاواسطہ بے وجہ اور بلا تحقیق منسوب کر کے ایک تاریخی

---

[1] الندوہ مارچ ۱۹۱۰ء مطابق ربیع الاول ۱۳۲۸ھ۔

جرم کیا ہے، حالاں کہ مولانا اس مجمع میں سرے سے موجود نہ تھے، مولانا شروانی صاحب نے جو شریک جلسہ تھے، مقدمہ، مقدمات عبدالحق (ص ۸) میں اس واقعہ کی پوری کیفیت لکھ دی ہے، جس سے معلوم ہوگا کہ مولوی عبدالحق صاحب مولانا شبلی مرحوم کی طرف بے بنیاد واقعات کی نسبت میں کتنی بے احتیاطی برتتے ہیں۔

بہر حال یہ جلسہ جناب حکیم اجمل خان صاحب مرحوم کے زیر اثر اور ان ہی کی صدارت میں بہت دھوم دھام سے عربک کالج کے میدان میں ہوا، دور دور سے مہمان آئے تھے، حسبِ دستور طلبہ امتحان کے لیے پیش ہوئے، مولوی عبدالسلام صاحب ندوی اور مولوی قمرالدین مرحوم سے حاضرین نے یہ خواہش کی کہ ''ارباب دہلی نے ندوہ کا یہ اجلاس جس خوش اسلوبی اور فیاضی سے کیا ہے اس کا حال عربی میں لکھ کر پیش کریں، ان دونوں نے چند منٹ کے اندر بہترین فصیح عربی میں اس واقعہ کو قلم بند کر کے پیش کر دیا، اس کے بعد ندوہ کے درجۂ تکمیل ادب کے طالب علم مولوی خواجہ عبدالواجد صاحب ندوی (جو بعد کو ''الہلال'' کلکتہ میں شریک ادارت ہوئے اور اب ایم۔اے ہو کر کان پور میں پروفیسر کالج ہیں) نے عربی میں دارالعلوم کی ضرورت پر ایک ایسی برجستہ تقریر کی کہ علما جو اس قسم کی تقریروں کے خاص مخاطب تھے، ان کی یہ حالت تھی کہ وجد میں آ کر جھومتے تھے اور ان کی زبان سے بے ساختہ تحسین آمیز کلمات بلند ہوتے تھے[1]، شیخ عبدالحق صاحب حقی بغدادی اسسٹنٹ پروفیسر عربی علی گڑھ کالج سے خواہش کی گئی کہ وہ ایک اہل زبان اور معلم ادب ہونے کی حیثیت سے اپنی رائے ظاہر فرمائیں، انہوں نے عربی کی ایک فصیح و بلیغ تقریر میں دارالعلوم کی تعلیم اور طلبہ کی ادبی قابلیت کی بے انتہا تعریف کی اور کہا کہ طلبہ کی عربی تحریر و تقریر نے جاہلیت عرب کے سوقِ عکاظ کا سماں پیدا کر دیا جس کو میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا[2]۔

مولانا نے اس زمانہ میں تبلیغ اور ردِ آریہ کے خیال سے ''بھاشا'' کی تعلیم کا ایک درجہ ندوہ میں کھولا تھا، سید امداد حسین صاحب ہوشیار پوری طالب علم ندوہ نے اعیانِ بھاولپور کی خواہش پر ہندی بھاشا میں ایسی عمدہ تقریر کی کہ لوگوں کو شبہ ہو گیا کہ یہ کوئی نومسلم ہندو ہے، لڑکا نہایت گورا چٹا اور بلند قامت تھا، بدگمانی کرنے والوں نے سمجھا کہ یہ کوئی کشمیری برہمن ہے، چنانچہ اس خیال کے ازالہ کے لیے اسے قرآن پاک پڑھنے کی فرمایش کی گئی، اتفاق یہ کہ اس کی آواز بھی اچھی تھی، اس نے ایک خاص پر درد لہجہ میں سورہ رحمان کی تلاوت شروع کی تو سماں بندھ گیا اور اس پر انعامات کی بارش شروع ہو گئی۔

---

[1] روداد دہلی، ص ۱۴۹ [2] الندوہ اپریل ۱۹۱۰ء مضمون نوشتہ مولانا ابوالکلام دہلوی۔

چند طالب علم انگریزی میں تقریر کرنے کے لیے بھی تیار تھے، مگر مولانا کو خیال ہوا کہ شاید عربی خواں طلبہ کی زبان سے لوگ انگریزی تقریر پسند نہیں کریں گے، اس لیے انہوں نے اس بارہ میں حاضرین کی رائے دریافت کی، لوگوں نے شوق کے ساتھ اجازت دی، اس پر سید محمد صاحب جواب بی، اے ہوچکے ہیں اور عبدالمجید نے جو دارالعلوم کے منتہی طالب علم تھے محاسن اسلام پر انگریزی میں تقریریں کیں، ان تقریروں میں اگرچہ صحت مخارج اور انشا پردازی کے لحاظ سے بہت کچھ خامیاں تھیں جن کو ریمارک کرتے وقت شیخ (سر) عبدالقادر صاحب بیرسٹر نے ظاہر کردیا، تاہم جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ صرف ایک سال کی باقاعدہ تعلیم کا نتیجہ ہے تو انہوں نے اس تعلیم کے مستقبل کی نسبت اپنا اطمینان ظاہر فرمایا۔

طلبہ کی ان تقریروں اور تحریروں کا یہ اثر ہوا کہ ہر طرف سے چندہ کی بارش ہونے لگی اور اس جلسہ کے متعلق یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ یہاں جو کچھ کام یابی ہوئی وہ تمام تر طلبہ کی لیاقت کا نتیجہ تھا، مولانا ابوالکلام نے بھی اس اجلاس میں بہت پرزور تقریر کی تھی جس کی یاد لوگوں کے دلوں میں اب تک ہے۔

اس اجلاس کی سب سے اہم تجویز مجلس اشاعت اسلام کا قیام تھا اور جس کے لیے یہ زمانہ نہایت موزوں تھا، اس کی تفصیل آگے آئے گی، اسی اجلاس میں دوسرے دن میں نے ایک کتب خانہ اعظم کی تجویز پر تقریر کی، اور دارالمصنفین کا خاکہ پہلی دفعہ پیش کیا گیا، دوسری تجویز قرآن پاک کے ایک مستند انگریزی ترجمہ کے متعلق پیش ہوکر منظور ہوئی اور تیسری تجویز انگریزی کورس کی ان غلطیوں کی اصلاح کے متعلق منظور ہوئی، جن سے اسلام اور تاریخ اسلام کے متعلق بدگمانی پھیلتی ہے، اس صیغہ کا نام صیغۂ تصحیح تاریخ اسلام رکھا گیا اور خاکسار اس کا سکریٹری منتخب کیا گیا، ایک اور تجویز جدید عربی کے لغت کی ترتیب کی منظور ہوئی اور یہ کام بھی خاکسار کے سپرد ہوا۔

حکیم صاحب مرحوم کی دل پذیر تقریر پر اس تاریخی اجلاس کا خاتمہ ہوا۔

ندوہ کا اجلاس لکھنؤ ۱۹۱۲ء سید رشید رضا مصری کی صدارت | ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں ندوہ کا وہ عظیم الشان اجلاس ہوا جس کو معنوی حیثیت سے ندوۃ العلما کا سب سے کام یاب اجلاس کہا جاسکتا ہے، ان دنوں مولانا جرجی زیدان کی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی کا جواب عربی میں لکھ رہے تھے اور اس کے کچھ اجزا سید رشید رضا اڈیٹر المنار کے پاس مصر بھیجے، جس سے مابین خط وکتابت کی تازہ تقریب پیدا ہوگئی، سید موصوف اس زمانہ میں مصر میں ''دارالدعوۃ والارشاد'' کے نام سے جدید طرز کا

ایک مذہبی مدرسہ قائم کر رہے تھے، اس سلسلہ میں بھی دونوں میں خط و کتابت ہو رہی تھی، ادھر ندوہ کے مجوزہ اجلاس کی تیاری ہو رہی تھی، جس میں تبلیغ کے مسئلہ پر پوری بحث ہونے والی تھی، ان گوناگوں مناسبتوں سے مولانا نے سید موصوف سے تحریک کی کہ وہ ہندوستان آ کر ندوہ کے اس اجلاس کی صدارت کریں، موصوف نے اس کو قبول کیا، یہ دو اسلامی ملکوں کی مذہبی تعلیمی و تبلیغی کوششوں کا سب سے پہلا اتحاد تھا، جس کی خبر ہندوستان میں عام ہوئی تو مسلمانوں میں ایک نیا جوش پیدا ہوگیا، اس وقت لارڈ کرومر مصر میں برطانی سفیر تھے، سید موصوف نے ان سے خاص طور سے اجازت لے کر ہندوستان کا سفر کیا جس کے معنی یہ تھے کہ برٹش گورنمنٹ کو ان کی آمد پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

سید موصوف نے ۲۲؍ مارچ ۱۹۱۲ء کو بمبئی کے ساحل پر قدم رکھا، بمبئی کے اکابر اور عرب تجار نے خیر مقدم کیا، بمبئی سے وہ دلی، دلی سے لاہور اور لاہور سے لکھنؤ آئے، مولوی عبدالحق صاحب حقی بغدادی پروفیسر عربی علی گڑھ کالج سفر میں ان کے ہم رکاب تھے، لکھنؤ کے اسٹیشن پر مسلمانوں کا بہت بڑا مجمع جس میں علما، طلبہ اور روسا غرض ہر طبقہ کے اصحاب تھے، استقبال کے لیے کھڑا تھا، نو بجے پنجاب میل نے اسٹیشن پر قدم رکھا تو اسٹیشن اهلاً و سهلاً و مرحبا کے نعروں سے گونج اٹھا، راجہ صاحب محمود آباد نے اپنی گاڑی ان کی سواری کے لیے بھیجی تھی، اس پر بیٹھ کر وہ شہر روانہ ہوئے لیکن مسلمانوں کا جوش اتنا بڑھا ہوا تھا کہ آدھی دور کے بعد گھوڑے کھول دیے اور خود گاڑی کو اپنے ہاتھوں کھینچتے ہوئے سید ممتاز حسین صاحب بیرسٹر مرحوم کی کوٹھی پر لائے، جہاں سید صاحب موصوف کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

۶؍ اپریل ندوہ کے اجلاس کی تاریخ تھی، قرآن پاک کی تلاوت اور استقبالیہ کے خطبۂ صدارت کے بعد مولانا نے سید رشید رضا کی صدارت کی تحریک کی اور ان کی مذہبی و تعلیمی و تبلیغی کوششوں کو بہ تفصیل بیان کیا، سب نے بہ یک آواز تائید کی، سید صاحب نے صدارت کی کرسی کو زینت بخشی اور عربی زبان میں ایک نہایت دل آویز و فصیح تقریر ارشاد فرمائی، جو اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی تعلیمی و مذہبی ضرورتوں پر نہایت مدلل اور مؤثر تبصرہ تھا، سید صاحب کا انداز بیان ایسا دل چسپ اور مؤثر تھا کہ سماں بندھ گیا تھا، جو لوگ عربی نہیں بھی جانتے تھے، وہ بھی ان کی ڈھائی گھنٹہ کی عربی تقریر کو نہایت سکون سے سنتے رہے۔

اس اجلاس میں مولانا ابوالکلام کی قادر الکلامی کے خوب خوب مناظر سامنے آئے، وہ سید رشید رضا کی عربی تقریر کا خلاصہ اردو میں سنانے کھڑے ہوتے تو بہ جائے خود اپنی سحر بیانی سے دلوں

میں تلاطم برپا کردیتے تھے۔

تہنیت وتعزیت کی رسمی تجویزوں کے بعد مولانا نے یہ تجویز پیش کی کہ ''حکومت ہند سے درخواست کی جائے کہ جمعہ کے دن سرکاری دفتروں میں مسلمانوں کو نماز جمعہ کے لیے دو گھنٹہ کی تعطیل دی جائے، جس کے نہ ہونے سے بہت سے مسلمان ایک بہت بڑے مذہبی فرض سے محروم رہ جاتے ہیں'' اس کی تائید مرزا سمیع اللہ بیگ وکیل لکھنؤ (حال نواب مرزا یار جنگ سابق وزیر عدالت حیدرآباد دکن) اور مرزا محمود صاحب قادیانی (موجودہ مرزا بشیر الدین محمود امام قادیان) نے کی، اس کی منظوری کے بعد دلی کی تجویز کے مطابق قرآن پاک کے انگریزی ترجمہ کی کارروائی کی رپورٹ سنائی جس میں یہ مژدہ سنایا کہ نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی جن سے زیادہ بڑا انگریزی کا کوئی مسلمان ادیب موجود نہیں، قرآن پاک کے ترجمہ میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

تیسرے جلسہ میں خاکسار نے صیغۂ تصحیح اغلاطِ تاریخی کی رپورٹ سنائی اور انگریزی کورس کی ان غلطیوں کے اقتباسات پیش کیے جن میں اسلام پیغمبر اسلام علیہ السلام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم قرآن پاک اور مسلمان بادشاہوں پر الزامات لگائے گئے تھے، مسلمان ان غلط بیانیوں کو سن کر تڑپ اٹھے، پھر یونیورسٹیوں کے مسلمان پروفیسروں اور سرکاری محکمۂ تعلیم سے اس باب میں جو مراسلتیں ہوئی تھیں، وہ پیش کیں اور آئندہ طریق کار کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا۔

اس کے بعد مولانا شبلی مرحوم دارالعلوم کی ضرورت پر تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور آغاز اس شعر سے کیا:

ندانم ایں کہ سر رشتہ از کجا بند است　　　　کہ آہ من بکشیدن نمی شود آخر

پھر فرمایا:- حضرات! میں اس موضوع پر تقریر کرنے کے لیے صرف آج نہیں کھڑا ہوا ہوں، بلکہ کہنے کو کئی بار کہہ چکا ہوں لیکن یا تو لوگوں کے پہلو میں دل نہیں یا میری زبان میں اثر نہیں، اس لیے مجھے غالب کا شعر پڑھنا پڑتا ہے:

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات　　　　دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اس کے بعد موصوف نے وہ زہرہ گداز تقریر فرمائی جو اس طرز سے اس موضوع پر انہوں نے کبھی نہیں کی اور بتایا کہ مسلمان صرف مذہب ہے، اس لیے جو کچھ کرنا ہے اسی راستے سے کرنا ہے اور جو

آواز بھی ان کی اصلاح کے لیے اٹھائی جائے وہ اسی راستہ سے اٹھائی جائے، اسی سلسلہ میں انہوں نے فرمایا کہ مسلمانوں کو قوم کے نام سے اٹھانے کی کوشش تیس برس سے جاری ہے، مگر اس کی ناکامی ظاہر ہے، کیوں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی امت قوم کے نام سے نہیں اسلام کے نام سے جاگتی ہے، اس نام سے اس کو پکارو، پھر دیکھو کہ اس کی بیداری کا کیا عالم ہوتا ہے، اسی تقریر کے دوران میں صیغۂ تصحیح اغلاط کی مذکورۂ بالا رپورٹ کی طرف اشارہ کرکے خاک سار کی حقیر ذات کی نسبت ایک ایسا فقرہ فرمایا جو اس کے لیے ہمیشہ سرمایۂ سعادت رہے گا۔

اس تقریر کے بعد تعمیر کے چندہ کی تحریک ہوئی، مولانا نے خود اپنی طرف سے پانچ سو کا اور سید رشید رضا کی آمد کی مسرت میں سو روپے کا اعلان کیا، ساتھ ہی جناب منشی محمد احتشام علی صاحب صفی الدولہ نواب علی حسن خاں صاحب رضی الدولہ نواب سید نورالحسن خاں صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور خان بہادر میر جعفر حسین صاحب وغیرہ نے پانچ پانچ سو کے وعدے کیے، خود صدر مجلس علامہ سید رشید رضا نے بھی سو روپے پیش کیے۔

اس کارروائی کے بعد مولانا پھر کھڑے ہوئے اور وقف علی الاولاد کی جو کارروائی اب تک ہو چکی تھی، اس کی تفصیلی روداد پڑھ کر سنائی، چوتھے اجلاس میں خاک سار نے دلی کی تجویز کی تعمیل میں جدید عربی الفاظ کا ایک لغت پیش کیا، جلسہ نے میری اس محنت وکاوش کا شکریہ ادا کیا، اس کے بعد مولانا ابوالکلام صاحب نے خطیبوں اور اماموں کی مذہبی تعلیم کی ضرورت پر ایک مؤثر تقریر فرمائی، تاج پوشی کی خوشی میں ملک معظم نے ہندوستان کو تعلیم کے لیے جو پچاس لاکھ روپے عنایت فرمائے تھے، پانچویں اجلاس میں مولانا شروانی نے تجویز پیش کی کہ اس رقم سے عربی مدارس کو بھی مناسب حصہ ملنا چاہیے، اس کے بعد مولانا شبلی مرحوم اشاعت وحفاظت اسلام کے موضوع پر تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور ایسی دل ہلا دینے والی تقریر کی کہ خود بھی رو رہے تھے اور دوسروں کو بھی رُلا رہے تھے، تقریر آج بھی پڑھی جاسکتی ہے اور اس کی تاثیر کا امتحان کیا جاسکتا ہے، مولانا نے اس میں تفصیل سے آریوں کے حملوں، مسلمانوں کی غفلت اور خاندانی نومسلموں کے ارتداد کے واقعات کے ضمن میں سیرۃ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے وہ واقعات بیان کیے جن سے ایمان تازہ ہوتا تھا۔

مولانا کی تقریریں ندوہ میں بارہا ہوئی تھیں، مگر ان تقریروں کا محل ورود ہمیشہ دماغ رہا، مگر

اس دفعہ موصوف نے ندوہ کے اجلاس میں تین دفعہ تقریریں کیں، تینوں دفعہ ہر تقریر دل کی گہرائیوں سے اٹھتی تھی اور دل ہی کی گہرائیوں میں پیوست ہوئی جاتی تھی، اس انقلاب کا راز ان دنوں سیرۃ نبوی اور احادیث شریف کا مطالعہ اور انہماک تھا جس نے ایک ہی دو سال میں علی گڑھ کے مولوی شبلی کو ایک نیا مولوی شبلی بنا کر کھڑا کر دیا تھا، جو ہمہ تن دل اور مجسم محبت بن گئے تھے، مولانا کی تقریر کے بعد خواجہ کمال الدین صاحب لاہور اور مولوی ابوالکمال عبدالودود صاحب بریلوی مرحوم نے تائیدی تقریریں کیں، اور رات کو ان ڈھائی سو مسلمانوں نے اپنے نام لکھوائے جو اسلام کی حفاظت واشاعت کے لیے سربکف نکلیں گے۔

پچھلے اجلاس پر اس سالانہ جلسہ کا خاتمہ ہوا، اس آخری جلسہ میں حسب دستور ندوہ کے دو چھوٹے کمسن بچوں، عبدالرحمٰن نگرامی اور معین الدین (بارہ بنکی) نے اسلام کے فضائل وکمالات پر تقریریں کیں، جن کو سن کر لوگ دنگ رہ گئے، بعض طلبہ نے عربی میں تقریریں کیں، خیال تھا کہ اس دفعہ جب کہ صدر اجلاس ایک صاحب زبان ادیب اور قادر الکلام خطیب ہیں، طلبہ مرعوب ہو جائیں گے، مگر انہوں نے اس برجستگی اور بے خوفی سے تقریریں کیں کہ خود صاحب صدر نے ان کی عربیت کی داد دی، آخر میں مولانا شروانی نے منتظمین جلسہ کا اور ممتاز حسین بیرسٹر سکریٹری مجلس استقبالیہ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، پھر سید رشید رضا صاحب صدر انجمن اجلاس، کھڑے ہوئے اور اس جوش کے ساتھ اپنی اختتامی تقریر کی کہ زبان کی ناآشنائی کے باوجود تمام جلسہ سراپا اثر تھا، آخر میں مولانا شبلی مرحوم نے اردو میں صدر اجلاس کا شکریہ ادا کیا، جس کا عربی ترجمہ مولانا کے ارشاد کے مطابق خاک سار نے کر کے سنایا، جس وقت میری زبان نے ان کے شدائد سفر کا ذکر کیا اور تحیت کے آخری الفاظ ادا کیے وہ بے قابو ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے، جوشِ غم نے ان کی آواز میں رقت پیدا کر دی تھی، اپنے شدائد سفر کے مقابلہ میں حضرت سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شدائد اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تکالیف کا ذکر زبان پر لائے، اس اثر سے سارا جلسہ ماتم کدہ بن گیا تھا اور دیر تک وہ حالت رہی جس کے دیکھنے کے لیے لیل ونہار کی آنکھیں ترستی رہیں گی۔

اسی پر اس سال کے جلسہ کا خاتمہ ہوا اور مولانا شبلی کے زیر اہتمام ندوہ کے جلسوں کا بھی اسی جلسہ پر خاتمہ ہوا اور ندوہ کے متعلق یہ پیشین گوئی جو ۲۴؍ مارچ ۱۹۱۲ء کو انہوں نے کی تھی حرف بہ حرف پوری ہوئی، ''ندوہ کی بساط پر یہ آخری باری ہے جس پر اس کی موت وحیات کا مدار ہے۔'' (شروانی-۱۰۰)

بعض دوسرے تعلیمی خدمات

ریاست حیدر آباد کی تعلیمی خود مختاری ۱۹۰۸ء-۱۹۱۴ء | ریاست حیدر آباد میں جامعۂ عثمانیہ کے قیام نے ملک میں ایک مفید تعلیمی انقلاب کا جو دور پیدا کیا، اس کی تدریجی تاریخ نہایت دل چسپ ہے، یہاں مشرقی تعلیم کے لیے ایک دارالعلوم قائم تھا، جس کے تعلیم یافتہ بہت سے سرکاری عہدوں پر وقتاً فوقتاً فائز ہوتے رہے لیکن اس دارالعلوم کی کوئی مستقل حیثیت نہ تھی، بلکہ پنجاب یونیورسٹی نے مشرقی تعلیم کے امتحانات کا جو نصاب مقرر کیا تھا، اس دارالعلوم میں بھی اسی کی تقلید کی جاتی تھی اور اسی کے مطابق اس دارالعلوم کے طلبہ بھی وہاں مولوی فاضل اور مولوی عالم وغیرہ کے امتحانات دیتے تھے، غالباً ۱۹۰۷ء میں پنجاب یونیورسٹی نے یہ قاعدہ بنایا کہ وہ دوسرے ممالک کی درس گاہوں کے طلبہ کو اپنے امتحانات میں شرکت کی اجازت نہیں دے سکتی، اس وقت اس دارالعلوم میں سات سو طالب علم زیر تعلیم تھے، جن کے لیے مجبوراً ریاست کو ایک خاص نصاب تعلیم اور امتحانات کے لیے ایک نئے مستقل نظام کی ضرورت پیش آئی، اس وقت نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی وہاں تعلیمات کے ناظم یعنی ڈائرکٹر تھے، انہوں نے سرکار عالی میں یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے لیے ایک مناسب نصاب تجویز کرنے کے لیے ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آئے، جس کے لیے مولانا شبلی اور بعض دیگر ماہرین کے خدمات حاصل کیے جائیں، سرکاری منظوری کے بعد نواب صاحب موصوف نے مولانا کے نام ایک سرکاری مراسلہ بھیجا جس کا خلاصہ یہ تھا، چوں کہ دارالعلوم کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے منقطع ہو گیا ہے، اس کے عربی و فارسی نصاب تعلیم کے مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے جس کے ایک رکن آپ ہیں، نصاب تعلیم زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے مرتب کیا جائے، تا کہ جو لوگ اس مدرسہ میں تعلیم پا کر امتحان میں کام یابی حاصل کریں، وہ سرکاری خدمات کے ادا کرنے کے قابل ہوں۔

ترمیم نصاب میں چند امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) ضروریاتِ زمانہ اور حکومت کی خدمات کی ضروریات کے لحاظ سے پنجاب یونیورسٹی کے موجودہ نصاب میں اصلاح۔

(۲) تکمیل تحصیل علوم مشرقیہ۔

مددوم کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ پنجاب کی اورنٹیل تعلیم ناقص ہے، بہت سے علوم جن سے فضیلت کی تکمیل ہوتی ہے، اس تعلیم میں متروک ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جماعت مولوی فاضل سے بالاتر اول مرتبہ دو جماعتیں ہوں جن میں تحصیل کی تکمیل ہو سکے، اگرچہ سلسلۂ نظامیہ کی پابندی ضروری نہیں، مگر تحصیل تکمیل کے لیے بہت کچھ اضافہ کتب درسیہ کی ضرورت ہے۔

یہ مراسلہ مئی یا جون ۱۹۰۷ء میں مولانا کی خدمت میں اس وقت پہنچا جب وہ پاؤں کے حادثہ کے سبب سے صاحب فراش تھے، اس سے صحت ہوئی تو مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم ہوم سکریٹری حیدرآباد نے ۳۰؍ماہ الٰہی ۱۳۱۷ف کو نشان (۱۲۲۳) کے مراسلہ کے ذریعہ سے مولانا کو پھر حیدرآباد آنے کی دعوت دی، چنانچہ وہ جون ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد گئے اور وہاں چند روز قیام کر کے ایک نصاب تیار کیا اور اس کو ایک یادداشت کے ساتھ پیش کیا، جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ نصاب میں ترمیم واصلاح کن اصولوں پر کی گئی ہے؟ اور ترمیم واصلاح کے مہمات امور کیا ہیں؟

مولانا جس جامع الحیثیات تعلیم گاہ کا خواب ہمیشہ سے دیکھا کرتے تھے اور جس کی تعبیر کے لیے ندوہ کی درودیوار سے ٹکرایا کرتے تھے، ان کے خیال میں اس کے لیے یہ بہترین موقع ہاتھ آیا، حیدرآباد ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست تھی، جس کا خزانہ معمور تھا اور جس کو تعلیم کے اس وسیع پروگرام کا بوجھ اٹھانے میں جو مولانا کے مخیلہ میں تھا، کسی قسم کا تامل نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے انہوں نے جی کھول کر اپنے پورے حوصلہ کے مطابق اپنے تعلیمی پروگرام کو پھیلا کر ایک یادداشت تیار کی، اس یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ بہ قول مولانا حسب ذیل مقاصد کو پیش نظر رکھ کر نصاب میں ترمیم واصلاح کی گئی:

(۱) دارالعلوم جب تک پنجاب یونیورسٹی سے متعلق رہا، اس کا مقصد صرف ایسے لوگوں کا پیدا کرنا تھا جو سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے قابل ہوں لیکن اب جب کہ دارالعلوم خودمختار اور آزاد ہو گیا ہے، اس کے مقاصد زیادہ وسیع ہو گئے ہیں، اس کی غرض اب ایسے اشخاص کا پیدا کرنا ہے جو نہ صرف سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے قابل ہوں، بلکہ شرعی خدمات بھی انجام دے سکیں، علوم دینیہ، مثلاً تفسیر، حدیث اور فقہ میں کمال رکھتے ہوں، ان کو ملک میں مذہبی عالم کی حیثیت حاصل ہو، وہ عوام میں عمدہ اخلاق اور مذہبی خیالات پھیلا سکیں اور علوم قدیمہ کے ساتھ علوم جدیدہ سے بھی واقف

ہوں، تاکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ پر بھی ان کا اثر پڑ سکے۔

(۲) اس وقت جو جدید تعلیم ہندوستان میں جاری ہے، اس میں ہماری مذہبی ضروریات اور قومی خصوصیات کا کوئی انتظام نہیں، اس میں نہ مذہبی تعلیم ہے نہ قومی تاریخ سے کچھ واقفیت ہوسکتی ہے، نہ اسلامی اخلاق اور مسائل اخلاق کا علم ہوسکتا ہے، اس لیے بی، اے یا ایم، اے ہونے کے بعد بھی ان چیزوں کے متعلق ایک شخص کی حیثیت ایک عامی آدمی سے زیادہ نہیں ہوسکتی، بایں ہمہ ہندوستان میں اس مشکل کا کوئی علاج نہیں ہوسکتا، کیوں کہ یونیورسٹی کا موجودہ نصاب اس قدر وقت اور فرصت نہیں دے سکتا کہ دوسری چیزوں کے حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آئے۔

لیکن چوں کہ ریاست حیدرآباد ایک وسیع ریاست ہے اور اس وقت تک اس نے سرکاری نوکریوں کے لیے یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کی قید لازمی نہیں قرار دی ہے، اس لیے وہ موجودہ طریقۂ تعلیم کے علاوہ ایک ایسا سلسلہ تعلیم بھی قائم کرسکتی ہے، جس میں انگریزی تعلیم کے ساتھ اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ بھی شامل ہو اور جس کے تعلیم یافتہ گویا دونوں قسم کی تعلیم کا مجموعہ ہوں۔

ان دونوں مقاصد کو پیش نظر رکھ کر مولانا نے ایک اصلاحی نصاب تعلیم تیار کیا جس کے اصول یہ تھے:

(۱) تعلیم کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ایسی کتابیں درس میں رکھی جائیں جن میں تمام مسائل نہایت سادہ، صاف اور واضح طریقہ سے بیان کیے گئے ہوں، اس بنا پر وہ کتابیں جو معما و چیستاں کے طور پر نہایت مختصر اور مغلق لکھی گئی ہیں، نصاب درس سے خارج کردی گئیں۔

(۲) قدیم نصاب میں اکثر ایسی کتابیں تھیں جن میں دوسرے علوم کے مسائل مخلوط کردیے گئے تھے اور اس خلط مبحث کی وجہ سے طالب العلم اصل فن کے مسائل سے دور پڑ تا جاتا تھا، اس لیے یہ تمام کتابیں خارج کردی گئیں اور اصلاحی نصاب میں اس قسم کی کتابیں رکھی گئیں جن میں اسی فن کے خالص مسائل بالاستیعاب مذکور ہوں۔

(۳) قدیم نصاب میں قرآن مجید کی تعلیم کا حصہ بہت کم تھا، اس لیے اصلاحی نصاب میں قرآن مجید کی تعلیم کا حصہ زیادہ وسیع کیا گیا۔

(۴) قدیم نصاب میں ادب اور لٹریچر کا حصہ بہت کم تھا، اس لیے ادب کا حصہ بہت بڑھا

دیا گیا۔

(۵) اس نصاب میں انشا پردازی کی مشق کے لیے خاص گھنٹے مقرر کیے گئے، کیوں کہ قدیم عربی خوانوں پر اعتراض تھا کہ وہ صحیح عربی کی چند سطریں بھی نہیں لکھ سکتے۔

(۶) قدیم نصاب میں عقائد وکلام کی صرف ایک معمولی درجہ کی کتاب داخل تھی، حالاں کہ یہ نہایت اہم فن ہے، اس لیے اس نصاب میں اس فن کی متعدد بلند پایہ کتابیں داخل کی گئیں۔

(۷) قدیم نصاب میں تاریخ اسلام اور تاریخ عام کی ایک کتاب بھی داخل نہ تھی، اس کے موجودہ نصاب میں فن تاریخ کی کتابیں بھی داخل کی گئیں۔

(۸) علوم جدیدہ کی بعض کتابیں بھی جو عربی میں ترجمہ ہوگئی ہیں، نصاب میں شامل کی گئیں۔

(۹) انگریزی زبان بطور سکنڈ لنگویج کے لازمی قرار دی گئی۔

(۱۰) نصاب سابق میں ابتدا سے اخیر تک مدت تعلیم ۱۹ برس تھی، لیکن یہ مدت بہت زیادہ تھی، اس لیے گھٹا کر کل مدت ۱۴ برس قرار دی گئی۔

(۱۱) نصاب مرتبہ کی ترتیب یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کی مدت ۵ سال قرار دی گئی اور یہ فرض کیا گیا ہے کہ لڑکا ساتویں برس کے سن سے دارالعلوم کی ابتدائی جماعتوں میں لیا جائے گا اور اس مدت میں اردو ابتدائی فارسی، حساب اور کسی قدر انگریزی کی تعلیم ہوگی۔

اس درجہ کے بعد منشی اور عالم کی دو الگ شاخیں شروع ہوں گی اور طالب العلم کو اختیار ہوگا کہ ان میں سے جس شاخ کو چاہے، اختیار کرے، منشی کے تین سال اور منشی عالم کے دو سال اور منشی فاضل کا ایک سال مقرر کیا گیا، منشی فاضل تک طالب علم کو فارسی زبان میں عمدہ مہارت اور عربی کی سواد خوانی اور انگریزی بہ قدر عام ضرورت آجائے گی۔

عربی کے دو درجے قرار دیے گئے۔

عالم: اس کی مدت تعلیم آٹھ برس رکھی گئی، یہ درجہ بی، اے کے برابر ہے، اس میں تمام علوم متداولہ عربی بعض علوم جدیدہ اور انگریزی زبان دانی، انٹرنس کے درجہ تک آجائے گی۔

فاضل: اس کی مدت تعلیم دو برس ہے اور یہ درجہ ایم، اے کے برابر ہے، اس میں کسی ایک

خاص فن کی پوری تعلیم ہوگی اور طالب العلم اس خاص فن کی تکمیل کرے گا اور اسی فن کے انتساب سے موسوم ہوگا، مثلاً مفسر، ادیب، فقیہ، وغیرہ، عالم یا فاضل کے درجے کے بعد ضرور ہے کہ چند طلبہ کو دو برس تک خالص انگریزی زبان سکھائی جائے، تاکہ انگریزی زبان میں تحریر اور تقریر کا ملکہ پیدا ہو اور ایسے علما پیدا ہوں کہ یورپ کی علمی تحقیقات کا اسلامی علوم میں اضافہ کرسکیں اور انگریزی داں جماعت کے مجمع میں ان ہی کی زبان وخیالات میں اسلامی عقائد ومسائل پر تقریر کرسکیں۔

دارالعلوم کے نصاب تعلیم کی یہ اصلاح درحقیقت وہ پہلا قدم تھا جو جامعہ عثمانیہ کے قیام کے لیے اٹھایا گیا اور مولانا کی یادداشت وہ پہلی اینٹ ہے جس سے بعد کو عظیم الشان جامعہ عثمانیہ کی بنیاد رکھی گئی، مولانا نے حیدرآباد کی تعلیمی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ حیدرآباد میں ایک آزاد اور مستقل یونیورسٹی کا تمہیدی خیال پیش کیا اور طعنہ دیا کہ جو لوگ غلام ہندوستان میں ایک مسلم یونیورسٹی بنانے کا خواب دیکھتے ہیں وہ اس آزاد حیدرآباد میں خود ایک آزاد یونیورسٹی کی بنیاد کیوں نہیں رکھتے، چنانچہ یادداشت[1] مذکور کے شروع میں فرماتے ہیں:

> ''معلوم نہیں مسلمانوں میں کون سی مبارک ساعت میں تقلید کی بنیاد پڑی تھی کہ زمانہ کے سیکڑوں ہزاروں انقلابات کے ساتھ بھی اس کی بندشیں اب تک کمزور نہیں ہوئیں، تعجب اور سخت تعجب یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ فرقہ جو اجتہاد اور جدت کا دعویدار ہے اور درحقیقت جدید تعلیم کا یہی اثر ہونا چاہیے تھا وہ بھی اسی طرح بے سمجھے بوجھے ایک عام راستہ پر پڑ لیا ہے اور کچھ نظر نہیں آتا کہ ہم کہاں جارہے ہیں، جس تعلیم اور نتائج تعلیم کا اس قدر شور وغل ہے وہ کیا ہے؟ کالجوں کی نوکریاں اور ڈگریاں وڈگریچ، شاید کہا جائے کہ اس کے سوا ہم اور کیا کرسکتے ہیں اور اسی لیے تو ہم اپنی خاص یونیورسٹی چاہتے ہیں کہ اپنی ضرورتوں کے موافق اپنی تعلیم کا سامان بہم پہنچائیں لیکن مجبوری یہ ہے کہ اس قدر روپیہ بہم نہیں پہنچتا کہ یونیورسٹی بن سکے لیکن سوال یہ ہے کہ جہاں یونیورسٹی بن سکتی ہے، وہاں کیا ہورہا ہے؟ حیدرآباد میں عنانِ تعلیم ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے جو ہندوستان میں یونیورسٹی بنانے کے محرک اور جان دادہ ہیں، یونیورسٹی کے لیے دس لاکھ روپیہ مانگا جارہا ہے، حیدرآباد میں ایک منٹ میں یہ رقم مل سکتی ہے، حیدرآباد میں صرف ایک کالج پر ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف ہورہا ہے، حیدرآباد کو اس بات کی کچھ پروا نہیں ہوسکتی کہ اگر وہ اپنی یونیورسٹی

---

[1] یہ یادداشت الندوہ مارچ ۱۹۰۹ء میں اور مقالات شبلی حصہ دوم (تعلیمی) ص ۱۵۲ میں چھپی ہے۔

بنائے تو اس کے تعلیم یافتہ انگریزی گورنمنٹ میں نوکریاں نہ پائیں گے، کیوں کہ حیدرآباد خود ایسی وسیع ریاست ہے کہ وہاں کے تعلیم یافتہ دوسری جگہ نوکری کرنے کے محتاج نہیں لیکن تقلید پرستی کی یہ حالت ہے کہ انگریزی تعلیم میں کسی قسم کی اصلاح وترمیم ایک طرف، خاص مشرقی تعلیم میں بھی جس کے لیے وہاں ایک دارالعلوم ہے، پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کے بیہودہ نصاب کی آج تک تقلید کی گئی، پنجاب نے مولوی فاضل اور مولوی عالم وغیرہ کے جو امتحانات مقرر کیے ہیں وہ دنیا کے کام کے ہیں نہ دین کے، تاہم آج تک اسی کی محکومی کی گئی اور اس وقت تک آزادی کا خیال نہ آیا، جب تک خود یونیورسٹی نے یہ قاعدہ نہیں بنایا کہ ہم دوسرے ممالک کے لوگوں کو اپنے امتحانات میں شریک نہیں کر سکتے۔"

دو سہ بار با تو گفتم کہ مرا بہ ہیچ بستاں　　نہ شد اتفاق شاید کہ بایں بہا گرانم

مولانا کی اس یادداشت اور نصاب پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کا اجلاس شعبان ۱۳۲۶ھ (ستمبر ۱۹۰۸ء) میں قرار پایا لیکن چوں کہ عین اسی زمانہ میں ندوہ کی ایک خاص ضرورت سے مولانا کو لکھنؤ واپس آنا پڑا، اس لیے وہ اجلاس ملتوی ہوگیا، اس کے بعد مولانا ۲۳ر جنوری ۱۹۰۹ء کو پھر حیدرآباد گئے اور ایک کمیٹی میں ان کا مرتبہ نصاب پیش کیا گیا، اس کمیٹی میں مولوی عزیز مرزا صاحب معتمد عدالت وتعلیمات شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی، مولانا انوار اللہ خاں صاحب استاد حضور نظام،، سید ابوبکر شہاب یمنی، مولوی عبدالحلیم صاحب شرر، مددگار ناظم تعلیمات اور دیگر اصحاب شریک تھے، اس اجلاس میں کچھ امور باقی رہ گئے تھے، اس لیے ۷ار فروری ۱۹۰۹ء کو اس کا پھر ایک اجلاس ہوا، جس کے پریسیڈنٹ جناب نواب فخر الملک بہادر وزیر عدالت تھے اور جس میں نواب عماد الملک بہادر (سابق ناظمِ تعلیمات) اور ڈاکٹر سید سراج الحسن صاحب ناظم تعلیمات حال بھی شریک تھے اور غور وفکر کے بعد کسی قدر تغیر اور ترمیم کے ساتھ مرتبہ نصاب منظور کیا گیا۔

مولانا نے یہ پوری تفصیل حیدرآباد کی ''مشرقی یونیورسٹی'' کے عنوان سے الندوہ مارچ ۱۹۰۹ء میں لکھی ہے، اس کے آخر میں فرماتے ہیں'' یہ ہم نے بار بار کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لیے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے، نہ قدیم عربی مدرسوں کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جز مشرقی اور دوسرا مغربی ہے۔

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق　　ہر ہوسناکے نداند جام وسندان باختن

مولانا کا خیال تھا کہ ایک سال میں جدید نظام کے مطابق اس درس گاہ کا کام شروع[1] ہو جائے گا، (سلیمان-۲۳) لیکن ایک سال کیا اس میں پانچ چھ سال لگ گئے، ۱۹۱۳ء میں جب مولانا دوبارہ نواب عماد الملک کی دعوت پر حیدر آباد گئے تو ابھی تک اس کے سوا اس کی داغ بیل بھی نہیں پڑی تھی کہ سرکاری امتحانات کا انتظام ہو گیا تھا۔

بعض صاحب شروع سے یہ چاہتے تھے کہ مولانا حیدر آباد میں رہ کر اپنی اس اسکیم کو خود ہی چلائیں، مگر انہوں نے اس سے معذرت چاہی، ۳۰ر جولائی ۱۹۰۸ء کو مہدی صاحب کو لکھتے ہیں "سرکار نظام علوم مشرقیہ کی یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے، اس کے نصاب وغیرہ کے لیے مجھے بلایا ہے، چند روز یہاں قیام رہے گا، یونیورسٹی کی نظامت مجھے دیتے ہیں، مشاہرہ بھی معقول ہے لیکن اب کسی کے آگے کیا سر جھکاؤں۔" (مہدی-۴۷)

۹ر اگست ۱۹۰۸ء کو پھر لکھتے ہیں "یہاں (حیدر آباد میں) مجھ کو بہت دیر ہوتی جاتی ہے اور میں گھبراتا جاتا ہوں، ایک دن کا کام یہاں مہینوں میں ہوتا ہے، یونیورسٹی کے لیے سب سامان مہیا ہیں، لیکن آدمی نہیں اور آدمی ہو تو سازشوں کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتا، میں ملازمت تو کسی طرح نہ کروں گا، البتہ اگر سامان اچھے ہوئے تو برس دو برس رہ کر کام چلا دوں گا کہ آیندہ چلتا رہے۔" (مہدی-۴۸)

۱۹۱۴ء میں جب کام کا آغاز ہو رہا تھا، مولانا کی جگہ پر نواب عماد الملک اور دوسرے قدر دانوں کے اصرار سے جون ۱۹۱۴ء میں (سلیمان) مولانا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب بی، اے کا انتخاب اس دار العلوم کی صدارت (پرنسپلی) کے لیے عمل میں آیا، حالاں کہ خود مولانا ان کی آزاد مذہبی اور علمی خدمت کے خواہاں تھے، مگر مجوزہ درس گاہ کی کامیابی کے خیال سے وہ نیم راضی سے ہو گئے، (حمید ۶۵، ۶۶، ۶۷) اس وقت ڈاکٹر الماللطیفی حیدر آباد میں تعلیمات کے ناظم تھے اور اکبر حیدری صاحب صیغہ مال کے اعلا عہدہ دار۔

---

[1] حضرۃ الاستاذ نے اسی زمانہ میں اس کے جدید اسٹاف میں میرا نام بھی داخل کرا دیا تھا، (سلیمان-۲۳) چنانچہ مولانا کی وفات کے بعد ۱۹۱۵ء میں الماللطیفی صاحب نے مجھے انٹرویو کے لیے بلایا، میں پونہ سے جا کر ان سے ملا، انہوں نے انٹرویو کے بعد میری تقرری کی ابتدائی کارروائی کے لیے کچھ کاغذات بھی میرے پاس بھیجے، مگر میں نے دار المصنفین کے خیال سے اس کارروائی کو آگے نہیں بڑھایا۔

مولانا حمید الدین صاحب نے اس مجوزہ درس گاہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا یعنی یہ کہ دینیات اور ادبیات کے علاوہ اس درس گاہ میں سارے علوم اردو میں پڑھائے جائیں، یہ بالکل نیا خیال تھا، اس لیے انہوں نے بڑی ہی مشکل سے ارکانِ حکومت کو اس کے لیے راضی کیا، اب المالطیفی کی جگہ راس مسعود صاحب ناظم تعلیمات ہوئے، ان کے زمانہ میں زمانہ نے نئی کروٹ لی، یعنی ایک مشرقی یونیورسٹی کے بہ جائے اس نے اردو کی ایک ایسی مغربی یونیورسٹی کا جامہ پہن لیا جس میں دینیات کی حیثیت ثانوی ہوگئی اور علوم مشرقیہ اس کا ایک صیغہ ہوکر رہ گئے، بعض وجوہ سے مولانا حمید الدین صاحب دل برداشتہ ہوکر ۱۹۱۷ء میں استعفا دے کر چلے آئے اور عثمانیہ یونیورسٹی موجودہ صورت میں بن کر نمودار ہوئی جو گو وہ نہیں بنی، جس کے بنانے کا خیال کیا گیا تھا لیکن پھر بھی اس نے وجود میں آکر ہندوستان کی تعلیمی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور اس کے دینیات اور علوم مشرقیہ کا صیغہ اپنی تعلیم، طرز تعلیم، اساتذہ اور انگریزی وعلوم جدید کی آمیزش سے مولانا شبلی کے مرتبہ نقشہ کا اچھا خاصہ خاکہ ہے۔

مشرقی بنگال وآسام میں اصلاح مدارس کی تجویز ۱۹۱۰ء

۱۹۱۰ء میں بنگال گورنمنٹ نے مشرقی بنگال اور آسام کے عربی مدرسوں کی اصلاح کے لیے ایک کمیٹی بنائی تھی جس کے ایک ممبر مولانا بھی منتخب ہوئے تھے، اس کا پہلا جلسہ ۲۸ / جنوری ۱۹۱۰ء کو اور دوسرا ۱۱ / ۱۲ / مارچ ۱۹۱۰ء کو ہونے والا تھا، مولانا کے کاغذوں میں اس کے متعلق سرکاری مراسلہ تو ملتا ہے لیکن اس کے لیے سفر اور اس میں مولانا کے کاموں کی نوعیت کا حال مجھے نہیں معلوم ہوسکا۔

مراسلۂ مذکور ۲۳ / فروری ۱۹۱۰ء کو ڈھاکہ سے بھیجا گیا ہے۔

مشرقی کمیٹی شملہ ۱۹۱۱ء

جولائی ۱۹۱۱ء میں گورنمنٹ نے علوم مشرقیہ کی ترقی واصلاح کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جس کے ایک ممبر مولانا بھی تھے، اس کمیٹی کا اجلاس اسی مہینہ میں شملہ میں ہوا، ہندوستانی ممبروں کے علاوہ علی گڑھ کالج کے جرمن عالم ڈاکٹر یوسف ہارویز اور مسٹر برن چیف سکریٹری صوبہ متحدہ جو فارسی اور اردو کے عالم تھے اور بعض دوسرے انگریز ممبر بھی تھے جلسہ سے واپس آکر مولانا نے اگست ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں "ہوا کا رخ دوسری طرف" اور "مشرقی کانفرنس" کی دوہری سرخیوں کے نیچے اس کمیٹی کے اغراض ومقاصد اور نتائج کی تفصیل کی ہے، شروع میں سرسید اور ان کے دوستوں کو مشرقی تعلیم کی ترقی سے جن وجوہ سے اختلاف تھا، ان کا جواب دیا ہے، پھر لکھا ہے کہ اب ہوا کا رخ

پلٹ رہا ہے، یعنی گورنمنٹ اب مشرقی تعلیم کی سرپرستی کے لیے آمادہ ہو رہی ہے، اس کے بعد اس کمیٹی کے حسب ذیل اغراض لکھے ہیں:

(۱) مشرقی و مغربی تعلیم میں اتحاد پیدا کرنا۔

(۲) علم الآثار (ارکیالوجی) کی تعلیم دینا اور جدید طریقہ تحقیقات آثار قدیمہ سے واقف کرنا۔

(۳) اعلا طریق پر قدیم و قلمی کتب خانوں کی فہرست سازی (کٹیلوگنگ) کی تعلیم دینا۔

(۴) اعلا مشرق تعلیم کے لیے بیش قرار وظائف مقرر کرنا۔

(۵) دیسی زبانوں کو ترقی دینا اور ان کے لیے امتحانات مقرر کرنا۔

(۶) علمی مشرقی تعلیم یافتوں کے لیے کالجوں میں پروفیسری، مدرسوں میں ٹیچری، عجائب خانوں میں تحقیقات آثار قدیمہ اور قدیم کتب خانوں میں ترتیب فہرست کے لیے عہدے قائم کرنا۔

(۷) کلکتہ کی مشرقی درسگاہوں کو متفق و متحد کرنا۔

(۸) انگریزی افسروں کی زباں دانی کا امتحان لینا۔

(۹) کلکتہ میں اغراض بالا کے لیے ایک عظیم الشان مشرقی درس گاہ قائم کرنا، کانفرنس نے جو کچھ طے کیا اس کے متعلق مولانا نے اپنے مضمون میں حسب ذیل نتائج کی توقع کی:

۱- گورنمنٹ کی طرف سے ایک انسپکٹر ہوگا جو قدیم عربی مدارس کا معائنہ کر سکے گا، اگر مدرسہ کے مہتمم ایسی نگرانی پسند کریں گے۔

۲- جن مدرسوں کو گورنمنٹ اس قابل سمجھے گی، ان کو کچھ ماہوار امداد دے گی۔

۳- کلکتہ میں بہت بڑے وسیع پیمانہ پر ایک مشرقی درس گاہ قائم ہوگی، مدارسِ عربیہ کے فارغ شدہ اگر چاہیں گے تو اس درس گاہ میں تعلیم حاصل کریں گے۔

۴- اس درس گاہ کے تعلیم پانے والوں کو بیش قرار وظیفے دیے جائیں گے۔

(۵) اس درس گاہ سے سند لینے کے بعد ان کو متعدد اسامیاں مل سکیں گی، جو مشرقی تحقیقات سے متعلق ہوں گی۔

یہ مدارس عربیہ جن کو گورنمنٹ تسلیم کرے گی اور جن کے تعلیم یافتہ کم سے کم انگریزی زبان جانتے ہوں گے، ان کالجوں اور اسکولوں کی پروفیسری اور مدرسی مل سکے گی۔

مولانا نے اس کمیٹی کی سفارشوں سے جن نتائج کی توقع دلائی تھی وہ سب کی سب تو پوری نہیں ہوئیں، مگر ان سے حسب ذیل نتیجے ضرور برآمد ہوئے:

۱- سرکاری خرچ پر مشرقی علوم کی اعلا تعلیم کے لیے یورپ کی یونیورسٹیوں میں عربی اور انگریزی پڑھے ہوئے طلبہ کا بھیجا جانا، اگرچہ اس کے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا نے ۱۹۰۸ء میں اعلان بھی کر دیا تھا اور بیش قرار وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا اور اس کے مطابق سب سے پہلے بہار سے ڈاکٹر عظیم الدین ۱۹۰۹ء میں یورپ بھیجے گئے اور ۱۹۱۰ء میں ڈاکٹر منصور[1] علی گڑھ سے گئے اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ۱۹۱۲ء میں بھیجے گئے اور پنجاب سے مولوی محمد شفیع صاحب (موجودہ پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور) گئے اور اب بھی طلبہ جا رہے ہیں۔

۲- ان لوگوں کو ان کی کام یاب واپسی پر کالجوں میں مشرقی علوم کی پروفیسری بیش قرار تنخواہوں پر دی گئی اور اب تک دی جا رہی ہے۔

۳- یوپی بہار اور بنگال میں ایک ایک عربی داں گریجویٹ کو مدارس عربیہ کی انسپکٹری کا یا علوم اسلامیہ (اسلامک اسٹڈیز) کی سپرنٹنڈنٹی کا عہدہ دیا گیا اور عربی مدرسوں کی نگرانی کا کام ان کے سپرد ہوا، چنانچہ یوپی میں ۱۹۱۶ء میں مولانا کے شاگرد خاص مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی جو ندوہ کے فاضل اور علی گڑھ کے ایم، اے تھے، انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔

۴- بعض بعض صوبوں میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ کی طرح سرکاری امداد سے عربی کا ایک بڑا مدرسہ قائم ہوا، جیسے بہار میں مدرسۂ شمس الہدیٰ، پٹنہ۔

---

[1] افسوس ہے کہ ڈاکٹر منصور نے ۲۰ رجنوری ۱۹۴۳ء کو انتقال کیا، شاہ جہاں پور وطن، اور ۱۸۸۸ء سال ولادت ہے، علی گڑھ کالج میں ڈاکٹر ہارویز کے خاص شاگرد تھے، ۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ کے وظیفہ سے یورپ گئے اور برلن میں ڈاکٹر سخاؤ کی نگرانی میں عربی جغرافیہ نویسوں پر اپنا مقالہ تیار کیا، اور ۱۹۱۵ء میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی، اسی اثنا میں یورپ کی بڑی جنگ شروع ہوگئی اور چار سال تک ممالک یورپ اور ممالک اسلامیہ کی سیر کرتے رہے، ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء تک وہ زیادہ تر برلن میں رہے، اسی زمانہ میں حدیث کی فہرست بنانے کا جو کام وہاں ہو رہا تھا، مستشرق وینسک کے ساتھ مل کر اس کو انجام دیا، ۱۹۳۱ء میں وہ ہندوستان واپس آئے، قرآن پاک کا وہ جرمن ترجمہ جو مولوی صدرالدین صاحب احمدی کے نام سے چھپا ہے، ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ان ہی کا کیا ہوا ہے، ۱۹۳۵ء میں وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں عربی کے لکچرر ہوئے اور یہیں وفات پائی۔

۵- مختلف عربی مدرسوں کے لیے حسب مرتبہ یا حسب ضرورت ماہانہ امدادیں، ایڈ کے طور پر منظور ہوئیں۔

۶- کلکتہ امپیریل لائبریری میں فن کتب خانہ کی تعلیم کے لیے ایک درجہ کھولا گیا۔

۷- کلکتہ کے بہ جائے ڈھاکہ یونیورسٹی میں مشرقی علوم کی ایک بڑی درس گاہ کھولی گئی۔

۸- آثار قدیمہ کی تحقیقات کے لیے بعض ماہرین علوم مشرقیہ کا تقرر ہوا، جن میں سے ہمارے صوبہ میں پہلا نام ظفر حسن صاحب کا ہے جو علی گڑھ کے ایم، اے اور ہارویز صاحب کی نگرانی میں آثار کے پڑھنے کی تعلیم پائے ہوئے تھے۔

مولانا نے اس کمیٹی میں ندوہ کو بھی روشناس کیا اور اس کے بعض مقاصد کی تشریح کی، شروانی صاحب کو ۲۷/ جولائی ۱۹۱۱ء کو لکھتے ہیں، مشرقی کانفرنس سے اچھے نتائج کی امیدیں ہیں، میں نے ندوہ کو وہاں زیادہ روشناس کیا اور بعض کارروائیوں میں وہ شامل کرلیا گیا۔ (شروانی-۹۲)

مولانا زبانی فرماتے تھے کہ انہوں نے اس میں شمس العلما کے خطاب کی بے قدری کا حال بھی بیان کیا اور اس کا سبب یہ بتایا کہ اس کے عطا کرنے میں استحقاق اور قابلیت پر نہیں بلکہ سرکاری سفارشوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔

مولانا کے اس سفر شملہ کے بعض ادبی پہلو بھی ہیں، اثنائے قیام میں شملہ کے علم دوست وادب نواز دوستوں نے اپنے حلقہ میں لیا، جن میں سے اخگر مرادآبادی اور مولوی محمد عمر صاحب نعمانی کے نام معلوم ہیں، مولوی صاحب نے بھی الندوہ (سلسلۂ جدید) کے دوسرے پرچہ مورخہ فروری ۱۹۴۰ء میں اس ملاقات کے بعض ادبی پہلوؤں کا ذکر کیا ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اس سفر میں کرنل عبدالمجید خان پٹیالہ کے مہمان تھے اور اس کوٹھی میں فروکش ہوئے تھے جو اب شیخ ریاض الدین صاحب خلف شیخ شہاب الدین مرحوم کی ملکیت ہے، مولوی غلام محمد صاحب شملوی کی وجہ سے شملہ ندوہ سے ہمیشہ سے روشناس تھا، مگر مولانا کے اس سفر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ندوہ کو وہاں مزید مقبولیت حاصل ہوئی۔

ڈھاکہ یونیورسٹی جولائی ۱۹۱۲ء | لارڈ کرزن کے عہد میں بنگال کی تقسیم نے جس طرح ہندو بنگالیوں میں گورنمنٹ کی طرف سے غم وغصہ کا طوفان برپا کردیا تھا، اسی طرح ۱۹۱۰ء میں تاج پوشی کے موقع پر اس کی تنسیخ نے مسلمانوں میں ہیجان برپا کردیا، یہاں تک کہ نواب وقار الملک جیسے ٹھنڈی

طبیعت کے آدمی نے ایک سخت مضمون لکھ کر گورنمنٹ کے اس فعل کو ناعاقبت اندیشی ٹھہرایا، گورنمنٹ نے مسلمانوں کے اس زخم پر رکھنے کے لیے جو مرہم تجویز کیا اس کا نام ڈھاکہ یونیورسٹی ہے، اس یونیورسٹی کی تجویز اور خاکہ بنانے میں ان لوگوں کو بھی شریک کیا جو احرار کے سرگروہ سمجھے جاتے تھے، چنانچہ نئے تعلیم یافتوں میں سے محمد علی مرحوم اور علما میں سے مولانا شبلی کے نام اس سب کمیٹی میں داخل ہوئے، جو اسلامک اسٹڈیز کے لیے بنی تھی۔

ڈھاکہ یونیورسٹی حقیقت میں اس خواب کی تعبیر ہے جو شملہ مشرقی کانفرنس میں دیکھا یا دکھایا گیا تھا، چوں کہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور مدرسہ عالیہ[1] کے اصول پر سرکاری عربی مدرسوں کا ایک وسیع سلسلہ قائم ہے، اس لیے ڈھاکہ یونیورسٹی کا ایک ایسا نظام قرار دیا جانا تجویز ہوا، جس میں عربی علوم اور اسلامی دینیات کے ساتھ جدید علوم اور اعلا انگریزی زبان کی تعلیم دی جائے۔

۵/ اگست ۱۹۱۲ء کو اس کی کمیٹی کی تاریخ تھی اور اسی زمانہ میں بنگلور میں مدراس کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا اور دونوں جگہوں سے طلبی تھی، مولانا اسی زمانہ میں بمبئی میں تھے، راقم بھی ہمرکاب تھا، تو بنگلور کانفرنس کی شرکت کے لیے ۲۵/ جولائی ۱۹۱۲ء کو مجھے روانہ فرمایا اور خود دوسرے دن ۲۶/ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ کی راہ سے ڈھاکہ تشریف لے گئے۔ (عبدالقادر-۲۵)

ڈھاکہ کی ترجیح کی دو وجہیں تھیں، ایک تو یہ کہ مولانا کو ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں سیرۃ کے لیے بعض کتابیں دیکھنی تھیں اور دوسری یہ کہ بنگال کے احباب نے ان کو لکھا کہ اگر وہ آجائیں تو مدرسہ عالیہ وغیرہ کی اصلاح کا کام بھی انجام پا جائے، ۲۱/ جولائی ۱۹۱۲ء کو وہ شروانی صاحب کو خود لکھتے ہیں ''مدراس میں خود جاتا لیکن عین اسی زمانہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی سب کمیٹی میں گورنمنٹ بنگال نے مجھ کو مدعو کیا ہے اور وہاں کے لوگوں نے مجھے لکھا ہے کہ اگر تم آجاؤ تو مدرسۂ عالیہ وغیرہ کی ابتری کی اصلاح کی بہت کچھ امید ہو سکتی ہے، اس لیے باایں شکستہ پائی و پیری وہاں جا رہا ہوں، سیرت کے لیے ایشیاٹک سوسائٹی میں بعض کتابیں بھی دیکھنی ہیں۔'' (شروانی-۱۰۲)

---

[1] مولانا شروانی لکھتے ہیں کہ اس سے پہلے ۱۹۰۲ء میں بھی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں سر جان ولفنٹ گورنر وقت نے بھی مولانا سے خواہش کی تھی کہ مدرسہ عالیہ کی اصلاح میں مدد دیں، اس اجلاس میں میں بھی موجود تھا۔

ورنیکولر اسکیم، الہ آباد ۱۹۱۲ء اردو کو ناگری ہونے سے بچانا | ۱۹۱۲ء میں الہ آباد گورنمنٹ نے ایک ''ورنیکولر اسکیم کمیٹی'' قائم کی تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ اسکولوں اور کالجوں میں دیسی زبان کا کورس ایسی زبان میں مرتب کیا جائے جو اردو ہندی دو زبانوں میں ایک ہی عبارت و الفاظ کے ساتھ پڑھا جا سکے، نیز اردو کے کورس میں بھاشا لٹریچر بھی ضروری قرار دیا جائے، پنڈت سندر لال وغیرہ اس کمیٹی کے ممبر تھے، مسٹر برن چیف سکریٹری گورنمنٹ صوبہ جات متحدہ نے اس کے متعلق ایک اسکیم مرتب کی تھی جس کے دفعہ ۳ و ۴ میں اس تجویز کی تائید میں حسب ذیل دلیل قائم کی تھی ''اردو زبان اور ہندی زبان دراصل ایک ہی زبانیں ہیں کیوں کہ ان کی گرامر متحد ہے اور جن زبانوں کی گرامر متحد ہوتی ہے وہ زبانیں دراصل ایک ہی ہوتی ہیں، اس بنا پر ورنیکولر کورس ایسی مشترک زبان میں بننا چاہیے کہ صرف رسم خط (کیرکٹر) کے فرق سے وہ اردو اور ہندی دونوں بن جائے۔''

لیکن ہندی زبان کی ایک یہ خصوصیت ہے کہ ''اس کی نظم و نثر کی گرامر مختلف ہے، اس لیے ہندی نظم کی گرامر کی مہارت اور واقفیت کے لیے رامائن، تلسی داس کورس میں داخل ہونی چاہیے، ہندوؤں کے لیے وہ لازمی کر دی جائے اور مسلمانوں کے لیے بھی اس کا پڑھنا مناسب ہوگا۔''

مولانائے مرحوم بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے اور اس موقع پر اردو زبان کے تحفظ و بقا کے لیے انہوں نے ایک مدلل یادداشت مرتب کی تھی جو معارف اکتوبر ۱۹۱۶ء میں چھپ چکی ہے اور مقالات شبلی کے سلسلہ میں بھی شامل ہے، اس یادداشت کے اخیر میں مولانا نے یہ رائے دی تھی ''اخیر میں نہایت زور سے کہتا ہوں کہ نہایت ابتدائی درجوں تک ایک سادہ زبان جو عربی اور سنسکرت دونوں سے قریباً آزاد ہو، اختیار کی جا سکتی ہے لیکن ہائر (اونچے) کلاسوں کے لیے اردو اور ہندی کو بالکل الگ الگ قائم کرنا چاہیے اور اسی صورت میں دونوں اعلا درجہ تک ترقی کر سکتی ہیں۔''

۳/ مارچ ۱۹۱۲ء کو مولانا نے مجھے مطلع کیا کہ یہ یادداشت اس قدر مؤثر اور کامیاب رہی کہ ''خود انگریز اور ہندو ممبروں نے اس سے حرف بہ حرف اتفاق کیا۔'' (سلیمان-۳۸)

اور ۱۰/ مارچ ۱۹۱۲ء کو شروانی صاحب کو لکھا کہ تیسرے جلسہ میں مجھ کو کامل فتح نصیب ہوئی، اور مسٹر برن نے جو تجویزیں پیش کی تھیں، سب کی سب اڑ گئیں۔ (شروانی-۹۷)

۱۵/ مارچ ۱۹۱۲ء کو کمیٹی کا پھر جلسہ ہوا اور مولانا کی رائے کے مطابق وہی طے ہوا جس کا

خلاصہ اوپر لکھا جا چکا۔

مذہبی تعلیم کی کمیٹی میں شرکت اسی سال یوپی گورنمنٹ نے سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کے اجرا کی ایک کمیٹی مقرر کی، اس کے ایک ممبر مولانا بھی تھے، ۶/اپریل ۱۹۱۲ء کو اس کے اجلاس کی تاریخ تھی، (شروانی-۹۷) مولانا کے خطوط میں پھر اس کمیٹی کا کچھ حال نہیں ملتا اور زبانی بھی مجھے یاد نہیں کہ کیا پیش آیا۔

صیغۂ تصحیح اغلاط تاریخی ۱۹۱۰ء-۱۹۱۲ء اس زمانہ میں تاریخ صرف کسی قوم کے گزشتہ واقعات کا مجموعہ نہیں رہی ہے، بلکہ اس کے احاطہ میں دین و مذہب اخلاق و عادات، معاشرت و تمدن، اسلافِ کرام اور پوری ملت کی ہزار سالہ عملی زندگی کی مکمل تصویر آجاتی ہے، اس لیے اس کی اہمیت گزشتہ زمانہ سے آج بہت زیادہ ہے، انگریزوں نے ہندوستان میں آکر اس سے ایک اور کام لیا، یعنی یہ کہ چوں کہ انہوں نے ہندوستان کا تخت مسلمانوں سے چھینا تھا، اس لیے انہوں نے زیرِ درس اسلامی تاریخ کو ایسے رنگ میں لکھ کر پیش کیا کہ اس سے دو نتیجے نکلیں، ایک یہ کہ مسلمان طلبہ ان کے بیانات کو سچ سمجھ کر اپنے اسلاف اور بزرگوں کے کارناموں سے خود شرمانے لگیں اور دوسرے یہ کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں اور مختلف قوموں کے طالب علموں میں تعصب اور بغض و عداوت کے جذبات پیدا ہو جائیں، چنانچہ ان کو یہ دونوں نتیجے حاصل ہوئے اور وہ سب کے سامنے ہیں، اگرچہ بعض یونیورسٹیوں کے کورس کی نسبت کبھی کبھی کانفرنس اور اخبارات یہ شکایت کیا کرتے تھے لیکن اب تک اس کام کے لیے کوئی باقاعدہ صیغہ قائم نہیں ہوا تھا، دہلی کے اسی جلسہ میں جو مارچ ۱۹۱۰ء میں ہوا، مولانا نے اس صیغہ کے قائم کرنے کے لیے ایک رزولیوشن پیش کیا، جو منظور کیا گیا اور خاکسار کو اس صیغہ کا سکریٹری مقرر کیا، خاکسار نے اس کام کو شروع کیا، مختلف یونیورسٹیوں کے مسلمان پروفیسروں سے خط و کتابت کی اور ان سے اس بارہ میں مشورہ پوچھا اور ۲۵/مئی ۱۹۱۰ء کو عام اطلاع کے لیے اخباروں میں ایک مضمون شائع کیا، جس میں واقف کار لوگوں سے اس قسم کی قابل اعتراض کتابوں کے نام دریافت کیے گئے تھے، اس کے جواب میں متعدد لوگوں نے مختلف کتابوں کے نام لکھ کر بھیجے، سب سے زیادہ قابل اعتراض کتاب سابق ڈائرکٹر تعلیم مارسڈن صاحب کی تاریخ ہندوستان تھی جو نہ صرف الٰہ آباد بلکہ کلکتہ وغیرہ دوسری یونیورسٹیوں کے بھی جونیر کلاسوں میں پڑھائی جاتی تھی۔

دوسری کتاب ڈیلافوس صاحب کی تاریخ ہند تھی، ان دونوں کتابوں کو پڑھ کر ان کی قابل

اعتراض عبارتوں کو نقل کر کے جولائی ۱۹۱۰ء میں اسلامی اخبارات سے خواہش کی گئی کہ وہ ان کتابوں کے نکالنے کی تحریک کی پوری تائید کریں، چنانچہ نہ صرف اردو بلکہ بعض انگریزی اخباروں نے بھی اس طرف توجہ کی، ساتھ ہی ۳ر جولائی ۱۹۱۰ء کو مولانا کی طرف سے رجسٹرار صاحب یونیورسٹی الہ آباد کی خدمت میں ایک یادداشت بھیجی گئی جس میں یہ درخواست کی گئی کہ مارسڈن صاحب کی اس کتاب کو مڈل کے کورس سے خارج کر کے اس کے بہ جائے موجودہ ڈائرکٹر تعلیم ڈیلافوس صاحب کی تاریخ ہندوستان چند ترمیمات کے بعد داخل کی جائے، رجسٹرار صاحب نے ۲۸ر اگست ۱۹۱۰ء کو سنڈیکیٹ کمیٹی کے حسب ہدایت اس تحریک کو ڈائرکٹر صاحب سررشتۂ تعلیم کے نام بھیج دیا اور اس کی نقل مولانا کے پاس بھیجی۔

یونیورسٹی نے اس یادداشت کی اطلاع مارسڈن صاحب کو جو اتفاق سے اس وقت ہندوستان ہی میں تھے، بھیج دی، اس کو پڑھ کر مارسڈن صاحب نے مولانا سے خط و کتابت شروع کی اور خود لکھنؤ آ کر مولانا کے مکان پر ملاقات کی، ساتھ ہی فقہ کی ایک بڑی قلمی کتاب ہدیۃً پیش کی جو اب ندوہ کے کتب خانہ میں ہے، اس ملاقات میں مارسڈن صاحب نے یہ وعدہ کیا کہ وہ آیندہ اشاعت میں ان غلطیوں کی اصلاح کر دیں گے، اس کے بعد یکم اپریل ۱۹۱۱ء کو کلکتہ سے انہوں نے یہ خط لکھا کہ میں اب اپنی اس کتاب کے طبع ثانی کا انتظام کرنا چاہتا ہوں، اس لیے آپ کی حسب ذیل عنایتوں کا خواست گار ہوں:

۱- ایک یہ کہ ڈیلافوس صاحب کو آپ یہ خط لکھ دیں کہ چوں کہ مارسڈن صاحب نے اپنی کتاب کی طبع ثانی میں قابل اعتراض سطور کو نکال دینا منظور کر لیا ہے، اس لیے اب اس کتاب پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اور اب میں اپنی تحریک کو واپس لیتا ہوں۔

۲- آپ میری کتاب کے انگریزی اور اردو نسخوں کے حاشیوں پر ان اصلاحات کو لکھ دیں، جو آپ کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے جواب میں شعبہ نے ۱۳ر اپریل ۱۹۱۱ء کو حسب ذیل خط لکھ کر ڈائرکٹر صاحب کی خدمت میں بھیجا، جس میں ظاہر کیا کہ مارسڈن صاحب کی پوری کتاب جس لب و لہجہ میں لکھی گئی ہے اس کے لحاظ سے وہ صرف چند عبارتوں کے بدل جانے سے پاک و صاف نہیں ہو سکتی ہے، بلکہ پوری کتاب کا ڈھانچہ بدلنے کے لائق ہے، ڈائرکٹر صاحب نے ۱۰ر جولائی ۱۹۱۱ء کو اس کا جواب دیا۔

شعبہ نے اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی کی تاریخ اور جغرافیہ کی دوسری کتابوں کی تصحیح کی طرف

توجہ کی اور ان کے قابل اعتراض مقامات کی نشان دہی کی اور بعض دوسرے صوبوں کی تاریخی کتابوں کا بھی جائزہ لیا اور ۷/اپریل ۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ میں اس شعبہ کی پوری رپورٹ پیش کی، اس رپورٹ میں قابل اعتراض عبارتوں کے جو اقتباسات پیش کیے گئے تھے ان کو سن کر پورے جلسہ میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی تھی، اس لیے جب مولانا کھڑے ہوئے تو حاضرین سے پوچھا ''حضرات! کیا آپ نے اس بات پر غور کیا ہے کہ آپ کے ہزاروں لاکھوں بچے ان الفاظ کو مدرسوں میں پڑھتے ہیں جن کو آج آپ نے سنا اور جن کے سننے سے آپ کے دل لرز گئے ہیں اور جس پر آپ نے نفرت کے نعرے بلند کیے ہیں (کبھی اس سے پہلے آپ نے نعرے بلند کیے تھے، سوال یہ ہے کہ جب آپ کا لڑکا پڑھ کر گھر میں آتا تھا تو کیا کبھی اس نے شکایت کی کہ آیا ایسے ناگوار اور لغو الفاظ ہم کو اسکول میں پڑھائے جاتے ہیں، آپ کا احساسِ مذہبی زائل ہو رہا ہے، آپ کو اس پر رونا چاہیے کہ آپ کی فیلنگ آپ کے احساسِ مذہبی بالکل فنا ہوتے جاتے ہیں۔) (روداد لکھنؤ ص ۱۱۵، ۱۹۱۲ء)

اس صیغۂ تاریخ کی، تاریخ یہیں آکر ختم ہو جاتی ہے، جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہماری ان تحریروں اور تحریکوں سے چونک کر صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کام نہ وہیں ہوا نہ یہیں ہوا، میں نے صیغہ کے سکریٹری کی حیثیت سے دو سال پہلے ہی ۱۵/اگست ۱۹۱۰ء کو ان کو یہ خط لکھا تھا'' جناب مکرم دام لطفکم السلام علیکم، ندوۃ العلما کے اعلان شعبۂ تصحیح کے بعد ''البشیر'' میں یہ خبر نہایت مسرت کے ساتھ پڑھی کہ جناب نے بھی اس امر کی طرف توجہ فرمائی ہے، دوسری بار بعض اغلاط تاریخی کی اشاعت کے بعد پھر ''البشیر'' میں پڑھا کہ جناب نے معلمین وافاضل مدرسۃ العلوم کی ایک کمیٹی بغرض تصحیح اغلاط مرتب فرمائی ہے، چوں کہ ایک قومی کام دو منتشر مقاموں میں انجام پانا خلافِ مصلحت ہے، اس لیے چند امور عرض ہیں، (۱) اس کام کو متحد قوت سے کیوں کر عمل میں لایا جائے؟ (۲) آپ نے اس کام کو عملی صورت میں لانے کی کیا تدابیر اختیار کی ہیں؟

(۳) انگریزی کورس کی جو تاریخ از سر تا پا لغو ہو اس کو خارج از کورس کرنے کی کیا تدبیر ہے؟

امید ہے کہ قومی کاموں میں یکجہتی کو پیش نظر رکھ کر جواب سے مستفیض فرمائیں گے۔''

مگر جواب حسب مراد نہیں آیا۔

عربی مدارس کی تنظیم کی تحریک ۱۹۱۲ء | ۱۹۱۲ء میں دہلی کے اجلاسِ ندوہ کے زمانہ میں مولانا کو

یہ خیال ہوا کہ موجودہ عربی مدرسوں کا انتشار ان کو کسی ایک سلسلہ میں منسلک ہونے سے مانع ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں جو طوائف الملوکی ہے وہ جس طرح اس کے ہر شعبۂ حیات کو محیط ہے، عربی مدرسے بھی اس کے احاطہ سے باہر نہیں اور اس کے سبب سے عربی مدرسوں کی بہت سی خرابیاں اور بد انتظامیاں دور نہیں ہوسکتیں، اس خیال کا آنا تھا کہ مولانا نے سب سے پہلے حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدرس اول دارالعلوم دیو بند کو اس بارہ میں خط لکھا موصوف نے اس کا جو جواب دیا وہ حسب ذیل ہے:

''مکرم والا درجت زید فضلکم ...... تسلیم مع التکریم،

''بوجہ تشریف آوری حجاج بندہ کو دہلی، میرٹھ، سہارن پور جانا ہوا، اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی، آپ نے جو خیال لایق مدرس کی نسبت ظاہر فرمایا نہایت ضروری اور قابل اہتمام ہے، اس کا بندوبست ہونا چاہیے۔

جیسا آپ نے تصاویر کا انسداد فرمایا، اسی طرح دیگر جزئیات کی طرف وقتاً فوقتاً آپ کی توجہ نہایت مفید اور مؤثر ہوگی۔

ایک مختصر مجمع میں جس میں چند حضرات بیرونی بھی شریک تھے، حالاتِ موجودہ پر کچھ بحث ہوئی دو باتیں قابل اہتمام سمجھی گئیں، اول یہ کہ مرکز بنایا جائے، یا نہیں اور بنایا جائے تو کس کو؟ دوسری یہ کہ اس کی صورت کیا ہو، امر اول کو موجودین نے منظور کیا اور بالاتفاق مسئلہ مرکز کو مستحسن کہا، تعیین مرکز کی نسبت جو رائے ہوئی تو بعد گفتگو یہی قرار پایا کہ مدارس اسلامیہ بہ جز دیو بند اور کسی کی ماتحتی نہیں پسند کر سکتے ہیں اور نہ یہ امر مناسب ہے۔

بقیہ حضرات سے استفسار کے بعد جو امر طے ہوگا، اطلاع دوں گا، امر دویم یعنی اس سلسلہ کی صورت اور شرائط و قیود کیا ہوں گی، یہ لمبی بحث ہے، جو جملہ اراکین وغیرہ کے بدون اس کا تصفیہ قابل اعتبار ناممکن ہے، بعد مشاورت اگر کوئی امر قابل عمل درآمد طے ہوگیا تو جناب کو اطلاع دی جائے گی، آپ کسی تجویز مفید سے اطلاع فرمائیں تو غالباً اس وقت میں مفید ہوگی۔

مجھ کو یہ بھی خیال ہے کہ آپ کو اور ہم کو یونیورسٹی سے کیا تعلق رکھنا مناسب ہے، غالباً آپ نے کوئی امر ضرور مقرر فرمالیا ہوگا۔'' والسلام بندہ محمود حسن، دیو بند ۱۸ ربیع الاول ۲۹ھ

اس جواب کی بنا پر مدرسوں کی تنظیم کے خیال کو چھوڑ کر صرف مذہبی ضروریات کے لیے ندوۃ العلما کی مرکزیت کی تجویز پیش ہو کر منظور ہوئی۔

مدینہ یونیورسٹی کی تجویز ۱۹۱۳ء ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء میں طرابلس الغرب پر اٹلی کے حملہ اور بلقان میں بلقانی ریاستوں کی بغاوت نے دنیائے اسلام میں جو ہلچل پیدا کر دی تھی اس کی تاریخ اس زمانہ کے اخبارات کے صفحوں میں ہے، اس وقت دولت عثمانیہ کی امداد و تحفظ کے لیے ساری دنیا کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے تھے، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم مولوی ظفر علی خاں اور بہت سے ہندوستانی اہل فکر مسلمانوں نے ٹرکی کا سفر کیا اور وہاں کے اہل الرائے اکابر سے ملاقاتیں کیں، اسی سلسلہ میں یہ قرار پایا کہ مدینہ پاک میں ایک مدینہ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جائے جس میں سارے اسلامی ملکوں کے طالب علم یک جا ہوں اور اسلامی دنیا کے بڑے بڑے ماہرین علوم اس میں درس و تدریس کے لیے اپنے اوقاتِ عزیز کو وقف کریں، ہندوستان کی طرف سے اس میں مولانا شبلی اور ان کے عزیز و شاگرد مولانا حمید الدین صاحب کے نام لیے گئے، اس سلسلہ میں اس زمانہ کے ''زمین دار'' اور ''الہلال'' میں بہت سی تجویزیں زیر بحث آئی تھیں، مکاتیب شبلی میں بھی ۲۹ رمئی ۱۹۱۳ء کے خط میں اس کا ذکر آ گیا ہے، (ابوالکمال عبدالحکیم-۲) ۱۰ر جون ۱۹۱۳ء کو اپنے ایک عزیز شاگرد مولوی عبدالباری صاحب ندوی کو لکھتے ہیں ''مدینہ یونیورسٹی کی تجویز میں قسطنطنیہ کو لکھنؤ سے توارد ہوا، خیر لیکن بہت ضروری چیز ہے، افسوس ہے کہ اب ہمت نہیں کہ اس کے متعلق کچھ کر سکوں، پہلی سی بات ہوتی تو مدینہ جانا کیا مشکل تھا۔'' (۵)

لیکن افسوس ہے کہ بلقان کے معرکہ میں ٹرکی کی ناکامی سے ان تجویزوں پر اوس سی پڑ گئی۔

مسلم یونیورسٹی ۱۹۱۱ء-۱۹۱۴ء علی گڑھ تحریک میں مسلم یونیورسٹی کا تخیل تمام تر سید محمود مرحوم کا ساختہ و پرداختہ ہے سب سے پہلے ان ہی نے ۱۸۷۳ء میں ایک ایسی اسلامی یونیورسٹی کا نصب العین پیش کیا، جو کیمبرج و آکسفورڈ کی طرح حکومت وقت کے اختیارات سے آزاد ہو، اس کے بعد نواب محسن الملک مرحوم نے سر سید کی وفات کے بعد اس خیال کو آگے بڑھایا اور اس کو سر سید کی یادگار ٹھہرا کر ایجوکیشنل کانفرنس کے مقصد میں اس کو داخل کر دیا، اس وقت سے ۱۹۱۱ء تک جب کہ مسلم یونیورسٹی نے خواب کے بجائے تعبیر کی صورت اختیار کی، کانفرنس کے ہر اجلاس کے صدر نے اس خوش آیند خواب کو دہرانا اپنے خطبہ کا ضروری حصہ قرار دے لیا تھا۔

مولانا شبلی مرحوم کالج کے تعلق سے اس تحریک کی اندرونی تاریخ سے پوری طرح واقف تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ خواب کبھی ممنونِ تعبیر نہ ہوگا، چنانچہ مئی ۱۹۰۱ء میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں کہ ''ندوہ میں چند لڑکوں کو انگریزی پڑھنے کی اجازت دینا اتنی ذرا سی بات ان کے نزدیک اتنی عظیم الشان ہے جس قدر نواب محسن الملک کی فرضی یونیورسٹی'' (۲۶)

لیکن یہ کیا معلوم تھا کہ دس بارہ برس کے بعد یہ فرضی یونیورسٹی جن لوگوں کے ہاتھوں واقعی بن جائے گی، ان میں خود مولانا کا ہاتھ بھی شامل ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں کے سبب سے مسلمانوں میں بے حد جوش وخروش تھا اور انگریزوں کی طرف سے دلوں میں بے حد ناراضی اور نفرت پھیلی تھی اور ان کی ذرا ذرا سی بات سے مسلمانوں کو چڑھ ہوتی تھی، حکام کے سامنے ان ناخوش گوار حالات کا تدارک ازبس ضروری تھا، اس کے لیے بہترین تدبیر یہ تھی کہ ملک میں کوئی ایسی عالم گیر اسلامی تحریک شروع کردی جائے جو مسلمانوں کے رُخ کو اُدھر سے اِدھر پھیر دے، یہ چیز ایک مسلم یونیورسٹی کا تخیل تھا جس کو لے کر ہز ہائینس سر آغا خاں جو اس وقت کے مسلم قومی رہنما اور انگریزوں کے معتمد تھے، آگے بڑھے، علی گڑھ پارٹی کے ہاتھوں سے مسلمانوں کی رہنمائی کی باگ نکل رہی تھی، اس کو دوبارہ ہاتھ میں لینے کے لیے بھی یہ تدبیر کارگر ہوسکتی تھی، بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا، خود ہز ہائینس سر آغا خاں نے صوبوں کا دورہ کیا اور بڑے بڑے امرا کے دروازوں پر جا جا کر دستک دی اور چندہ کی بڑی بڑی رقمیں حاصل کیں اور یوں بھی عام طور سے ملک کے مختلف حصوں میں چندوں کی وصولی کی کارروائی شروع ہوگئی اور تھوڑے دنوں کے بعد اکتیس لاکھ کی مطلوبہ رقم پوری ہوگئی، مولانا نے اس کی تاکید میں جنوری ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں حسب ذیل نوٹ لکھا ''حکومت انگریزی کی ابتدائی تاریخ سے آج تک مسلمانوں نے کبھی ایسی بلند ہمتی کا اظہار نہیں کیا جو آج ایک یگانۂ قوم ہز ہائینس سر آغا خان کی ذات سے وجود میں آئی، محمڈن یونیورسٹی ایک خواب تھا جو گو نہایت خوشگوار وشیریں تھا لیکن پھر بھی خواب تھا، ہز ہائینس موصوف نے اس کی تعبیر بتائی اور بتائی نہیں بلکہ کرکے دکھادیا، چھ کروڑ مسلمان اس کام کو انجام نہیں دے سکتے تھے، جو ایک ذاتِ واحد نے انجام دیا، خدا کرے وہ دن آئے کہ علی گڑھ میں مسلمان فیلو نظر آئیں، مسلمان تعلیمی اسکیم بنائیں، مسلمان نصاب تعلیم تجویز کریں، فیلوشپ کی امیدواریاں ہوں، مسابقت ہو، ووٹوں کی کشاکش ہو اور فریق اور رجج دونوں ہمیں ہوں۔''

از من بہ من سلام و ہم از من بہ من پیام　　رنجِ دلے مباد سلام و پیام ما

اس کے بعد ہی لکھنؤ میں اس کا وفد آیا تو بڑی خوشی سے اس کی کوششوں میں شریک ہوئے اور سب سے دل چسپ بات یہ ہوئی کہ ایک فیاض مسلمان نے ندوہ کی طرف سے دس ہزار روپے اس فنڈ میں داخل کیے، اس پر خوش ہو کر فروری ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں دوسرا نوٹ لکھا ”ہز ہائنس سر آغا خاں بہادر کی سرپرستی میں محمڈن یونیورسٹی کا جو وفد لکھنؤ میں آیا، اس کا جس جوش، جس شان، جس خلوص کے ساتھ استقبال کیا گیا، وہ مدت تک اہل لکھنؤ کو یاد رہے گا، امیر و غریب وکلا، تاجر، بیرسٹر، عام، خاص، غرض ہر قسم کے لوگ اسٹیشن پر ہز ہائنس موصوف کے خیر مقدم کے لیے موجود تھے، یونیورسٹی کے لیے چندہ کی جو فہرست کھولی گئی اس میں بھی ہر قسم کے لوگوں نے اپنے نام لکھوائے، ندوۃ العلما اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے اگر چہ ابھی تک خود قومی فیاضیوں کا محتاج ہے لیکن محمڈن یونیورسٹی کی تکمیل میں اس نے بھی نمایاں حصہ لیا اور اپنی طرف سے دس ہزار کی رقم پیش کی، ممکن ہے لوگوں کو یہ خیال ہو کہ ندوہ کو جب خود اپنی تکمیل بلکہ اپنی بقا کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے تو وہ دوسروں کی طرف کیوں کر متوجہ ہو سکتا ہے، ممکن ہے کسی کو یہ بھی خیال ہو کہ ندوہ کو یہ کیا حق ہے کہ وہ ندوہ کے سرمایہ کو دوسرے کام میں لگائے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ رقم ندوہ کے سرمایہ سے نہیں دی گئی بلکہ ندوہ کے ایک بہی خواہ نے اپنے پاس سے دی، باقی یہ کہ ندوہ خود محتاج ہے، تو اسلام میں اس ایثار نفس کی مثالیں موجود ہیں کہ محتاجوں نے محتاجوں کی شرکت کی ہے۔

لاہور میں ہز ہائنس سر آغا خاں کی سرکردگی میں جو وفد گیا اس کے ایک ممبر خود مولانا بھی تھے، چنانچہ وہیں اپنی یہ مشہور نظم پڑھی:

ہمیں یک حرف از یونیورسٹی مدعا باشد　　کہ ایں سررشتۂ تعلیم مادر دست ما باشد
علوم تازہ را با شرع و حکمت باہم آمیزیم　　الٰہی با ریاضی و طبیعی آشنا باشد
بساطے تازہ چینیم و طرحے نو در اندازیم　　کہ در بزم نوے پیشنیاں را نیز جا باشد
کنوں دہ سال شد کیں خواب نوشیں در نظر داریم　　کہ خوابے ایں چنیں خود جاں نواز و جانفزا باشد
و لے پیدا نہ شد ایں خواب را چوں صبح تعبیرے　　گماں بردیم کیں اندیشہ از روئے خطا باشد
گہے با خویش می گفتیم کاساں گردد ایں مشکل　　و لے بائستہ صد محنت و رنج و عنا باشد
بود آساں کہ چوں طفلاں دو سہ نقشی کشف وانگہ　　بگوئی کیں در و بام است و ایں قصر و سرا باشد

ولے آساں نہ باشد در سگا ہے رابنا کردن | کہ خود ہر گونہ گوں رنجوریِ ما را شفا باشد
درین بودیم ما کز پردہ گاہِ غیب سر برزد | ہمایوں طلعتے کیں عقدہ را مشکل کشا باشد
سر آغا خاں کہ خود خواب است ایں تعبیر نوشیں را | چہ خوش باشد کہ خواب از ما و تعبیر از خدا باشد
بکیش شیعہ و سنی سر آغا خاں خدا نبود | ولیکن کشتی اسلامیاں را نا خدا باشد

کنوں بینی کہ زود آن گلشنِ رنگین بپا گردد
کہ شبلی ہم درد یک بلبل رنگیں نوا باشد

مجلس تاسیس جامعہ اسلامیہ (مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی) کے نام سے یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط بنانے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی، مولانا اس کے بھی ممبر تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ یونیورسٹی کیا ہوگی، ۲۵/ مارچ ۱۹۱۱ء کو مولانا ابوالکلام کو لکھتے ہیں ''یونیورسٹی کا چارٹر تو ضرور مل جائے گا یہ قطعی ہے، باقی یہ کہ وہ کیا ہوگی، اس کو وہ لوگ خود جانتے ہیں لیکن بہر حال نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے۔'' (۲۷) اسی لیے وہ یونیورسٹی کمیٹی کے سارے کاموں میں شریک رہے، وزیر تعلیم سے گفتگو کرنے کے لیے جو وفد شملہ گیا تھا وہ اس کے بھی ممبر تھے، راجہ صاحب محمود آباد کی سرپرستی میں لکھنؤ میں یونیورسٹی کے اجلاس بار بار ہوتے تھے، ۱۸/ اگست ۱۹۱۱ء کو مولانا ابوالکلام صاحب کو لکھتے ہیں ''یونیورسٹی کے اجلاس یہاں ہو رہے ہیں، بڑے بڑے معزز لوگوں کا مجمع ہے، میں بھی ممبر ہوں، اس لیے شریک ہوتا ہوں، اس کے بعد شملہ ڈیپوٹیشن میں جانا ہے۔'' (۳۱)

یونیورسٹی کے سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ گورنمنٹ اور مسلمانوں کے درمیان بعض شرائط کے تصفیہ کا تھا، ان میں تین باتیں سخت متنازعہ فیہ تھیں۔

(۱) مسلمان چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کا نام مسلم یونیورسٹی ہو، اور گورنمنٹ علی گڑھ یونیورسٹی کہتی تھی۔

(۲) مسلمان چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کو ہندوستان میں مسلمانوں کے جس قدر کالج اور اسکول ہیں ان کے الحاق کا اختیار ہو، گورنمنٹ اس کو تسلیم نہیں کرتی تھی اور اب تک تسلیم نہیں کیا۔

(۳) گورنمنٹ نے یونیورسٹی کے متعلقہ امور کے آخری فیصلہ کا اختیار (ویٹو) اپنے حکام اعلا کو دینے پر مصر تھی اور ہے، مسلمان اس کے ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔

اربابِ علی گڑھ متردد تھے کہ اہم مسائل میں عام مسلمانوں کو دخل اندازی کی حاجت ہے یا نہیں، بہر حال اس بحث کو طے کرنے کے لیے لکھنؤ کے قیصر باغ میں یونیورسٹی کا اساسی جلسہ فونڈیشن کمیٹی ۲۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو ہوا جس میں ملک کے تمام اکابر اور رہنمایانِ ملت شریک تھے، جس میں مولانا بھی تھے، اربابِ علی گڑھ راجہ صاحب محمود آباد کی سرکردگی میں ایک طرف تھے اور احرار کی جماعت مسٹر محمد علی (اب مولانا) ابوالکلام کی سیادت میں دوسری طرف تھی، پہلے روز کے اجلاس میں محمد علی صاحب نے جلسہ میں نہایت جوش پیدا کیا اور احرار کی سربراہی کی لیکن دوسرے دن دفعۃً معاملہ بدل گیا، واقعاتِ شبینہ کیا تھے، کم لوگوں کو معلوم ہیں، بہر حال جلسہ میں یہ نظر آیا کہ محمد علی صاحب اربابِ علی گڑھ کی حمایت میں ہیں اور تنہا مولانا ابوالکلام ادھر ہیں، کہتے ہیں کہ جابہ جا کالج کے طلبہ جن کو ووٹ دینے کا حق نہ تھا، وہ نہایت اہتمام سے جلسہ کے اطراف میں باقاعدہ بٹھائے گئے اور انہوں نے اس قدر جلسہ پر استیلا حاصل کرلیا کہ موافقین کا چیرز سے دل بڑھایا اور مخالفین کو ''شی شی'' کی آواز سے مبہوت کردیا، مخالفین نے ہر چند بولنے کی کوشش کی، ناکامی ہوئی، یہ واقعات اس زمانہ میں نہایت اہم تھے۔

اسی جلسہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ اس میں ایک تجویز پیش کی گئی کہ معاملات کے تصفیہ کے لیے وائسرائے کی خدمت میں ارکان کا ایک وفد بھیجا جائے تو خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے اس کی سخت مخالفت کی، مگر جب ان کا نام بھی داخل وفد کرلیا گیا تو وہ چپ ہوگئے[۱]۔

ان میں سے ہر واقعہ پر مولانا کی متعدد نظمیں ہیں، جو ان کے اردو کلیات میں جمع کردی گئی ہیں، جن صاحبوں کو شوق ہو وہ ان نظموں کو واقعات سے ملاکر دیکھ لیں، ان نظموں نے عام لوگوں میں مسلم یونیورسٹی کے معاملات سے نہایت گہری دلچسپی پیدا کردی تھی۔

لطیفہ: مولانا کے فارسی قطعہ کے دوسرے مصرع ع کہ ''ایں سررشتۂ تعلیم مادر دست ماباشد'' کے جواب میں خوب فرمایا تھا ع ''بشرط آنکہ ایں دست شما دست شما باشد''

ناگ پور یونیورسٹی میں مشورہ ۱۹۱۴ء | ناگ پور یونیورسٹی یعنی صوبہ متوسط و برار کی یونیورسٹی جس کا صدر مقام ناگ پور ہے، اس وقت تجویز و خیال کی منزل میں تھی، مسٹر جونس اس زمانہ میں وہاں کے ڈائرکٹر اور اس تجویزی کمیٹی کے سکریٹری تھے، موصوف نے مولانا کو ۲۵ر اگست ۱۹۱۴ء کو حسب ذیل سرکاری چھٹی لکھی:

---

[۱] خاکسار مؤلف اس جلسہ میں خود شریک تھا۔

"آپ شاید واقف ہوں گے کہ صوبہ متوسط اور برار کے لیے ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز کی گئی ہے اور اس کی اسکیم مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی ہے، مقامی حکومت کی طرف سے اس امید کا اظہار کیا گیا ہے کہ اعلا تعلیم سے دل چسپی رکھنے والے اصحاب اس کمیٹی کی امداد کریں گے۔"

مجھ کو آپ تک یہ اطلاع پہنچانے کی ہدایت دی گئی ہے کہ عربی اور فارسی کی تجاویز کے لیے ایک سب کمیٹی کی تشکیل ہوئی ہے اور غالباً اس کام کی تکمیل کے لیے آپ کی امداد اور مشورے کی ضرورت ہو، آپ سے امداد اس سے زیادہ نہیں لی جائے گی، کہ آپ بعض مسائل سے متعلق خطوط کا جواب دیں، ان مسائل کے متعلق آپ کی معلومات اور تجربے قیمتی ہوں گے، اس لیے میں یہ دریافت کرتا ہوں کہ اس قسم کی ضرورت پیش آئی تو کیا آپ خطوط پا کر جواب دینے پر رضامند ہوں گے۔

امید ہے کہ اس کا جواب ۵ دسمبر تک مرحمت فرمائیں گے۔"

مولانا نے اس کا جواب ۳۱/اگست ۱۹۱۴ء کو دیا، مگر یہ وقت مولانا کے لیے بڑی مصیبت کا تھا اور چند ہی مہینوں کے بعد وفات پائی، اس لیے مجھے امید نہیں کہ انہوں نے اس یونیورسٹی کے مشرقی صیغہ کی تشکیل میں کچھ زیادہ مشورے دیے ہوں گے، یونیورسٹی کا یہ خاکہ چھ برس میں تکمیل کو پہنچا اور ۱۹۲۰ء میں اس کا قیام عمل میں آیا، نیز اس کا مشرقی صیغہ جو عربی و فارسی و اردو پر مشتمل ہے، خاصہ ہے، اور اس کو یہ سعادت حاصل ہے کہ وہ علامہ شبلیؒ کی تجاویز کا بھی کسی حد تک ممنون ہے۔

مذہبی اور قومی کام

وقف علی الاولاد ۱۹۰۸ء-۱۹۱۲ء | اسلام میں اپنی اولاد اور عزیزوں پر بلکہ خود اپنے آپ پر وقف کرنا بھی جائز ہے، ہندوستان پر جب انگریزوں نے قبضہ کیا تو چوں کہ یہ مسئلہ ان کے قانون کے مطابق نہ تھا، اس لیے انگریزی عدالتوں نے اس قسم کے مقدمات میں اپنے فیصلوں میں اس اسلامی قانون کو رد کر دیا، حالاں کہ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر نہ صرف مسلمانوں کی جائداد کا تحفظ و بقا موقوف تھا، بلکہ اس کے ذریعہ سے ان نوجوانوں کی اخلاقی اصلاح بھی ہو سکتی تھی، جو اپنے آبا و اجداد کی جائداد کو نہایت بے دردی اور ناعاقبت اندیشی کے ساتھ اپنی ہوائے نفسانی پر قربان کر رہے تھے۔

سرسید نے اسی خیال سے اپنی لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کے زمانہ میں "وقف خاندانی" کے نام سے ایک مسودۂ قانون کے پیش کرنے کی تیاری کی تھی، جس میں گورنمنٹ سے یہ چاہا تھا کہ ایسی وقف جائداد کی تولیت کا مسئلہ ہمیشہ حکام کی مرضی سے طے ہو اور نیز یہ جائداد کسی سرکاری مطالبہ، مال گذاری میں ضبط نہ ہو، مگر ایک طرف بعض علما نے اس سے اختلاف کیا اور دوسری طرف سرسید کے بعض دوستوں نے جو کونسل میں تھے، ان کو بتایا کہ گورنمنٹ اس قانون کو اس لیے منظور نہیں کر سکتی کہ ولایت کے مقنّنوں کی یہ قطعی رائے قرار پا چکی ہے کہ کسی جائداد کو ہمیشہ کے لیے ناقابل انتقال بنا دینا ملک کو نقصان پہنچانا ہے۔[1]

جسٹس مولوی سید امیر علی صاحب جس زمانہ میں کلکتہ ہائیکورٹ کے جج تھے، وقف کے ایک مقدمہ میں (میر محمد اسماعیل بہ نام منشی چرن گھوش) اس مسئلہ کے جواز کے تمام دلائل لکھے لیکن حکام پریوی کونسل نے ۱۸۹۴ء میں (یہ مقدمہ ابوالفتح بہ نام راس مایا دھر چودھری مندرجہ جلد ۲۲ ترجمہ انڈین لا رپورٹ مطبوعہ جولائی ۱۸۹۵ء) ان دلائل کو ناکافی خیال کیا، اور "وقف علی الاولاد" کو ناجائز قرار دیا، اس وقت سے مسلمانوں کو برابر یہ خیال رہا کہ اس غلط فیصلہ کی تصحیح کی جائے، چنانچہ خود مولوی سید امیر علی صاحب مرحوم نے ۱۹۰۵ء میں انگریزی کے مشہور رسالہ "نائینٹینتھ سینچری" میں اس مسئلہ پر ایک نہایت مدلل مضمون لکھا، لیکن وہ بھی بے اثر رہا، بعد ازاں کلکتہ کے ممتاز وکیل مولوی محمد یوسف صاحب مرحوم نے ایک نہایت

---

[1] حیات جاوید حصہ اول، ص ۲۳۹۔

مدلل و مفصل رسالہ لکھ کر بنگال ایسوسی ایشن کی طرف سے گورنمنٹ کی خدمت میں ایک عرض داشت کے ساتھ بھیجا، نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے جب وہ انڈیا کونسل کے ممبر تھے، اس وقت کے وزیر ہند سے کہہ کر اس غلطی کی اصلاح کی کوشش کی لیکن یہ تمام پرزور کوششیں اور یہ باا ثر شخصیتیں اس لیے ناکام یاب رہیں کہ اس منزل کے طے کرنے کا جو راستہ تھا، سب اس سے الگ جاتے تھے۔

سب سے مقدم بات یہ تھی کہ گورنمنٹ کے کانوں تک جو صدا پہنچائی تھی وہ عام صدا ہونی چاہیے تھی لیکن اب تک جو کچھ کہا گیا تھا وہ انفرادی حیثیت سے کیا گیا تھا، مولوی سید امیر علی صاحب مرحوم کے مضمون کی خوبی میں کیا کلام ہوسکتا تھا لیکن پھر بھی وہ ایک شخص خاص کا خیال تھا، مولوی محمد یوسف صاحب مرحوم نے بے شبہ اس کے آگے ایک قدم بڑھایا تھا اور بنگال ایسوسی ایشن کی طرف سے درخواست بھیجی تھی لیکن یہ ایسوسی ایشن کل ہندوستان کیا، کل بنگال کی زبان بھی نہ تھی، یہی وجہ تھی کہ ملک کو اس درخواست کی خبر بھی نہیں ہوئی اور گورنمنٹ نے مارچ ۱۹۰۸ء میں صاف جواب دے دیا کہ پریوی کونسل کے فیصلہ میں کوئی مداخلت نہیں ہوسکتی، اس کے علاوہ کہا یہ جاتا تھا کہ یہ مسئلہ ایک مذہبی مسئلہ ہے، اس لیے پریوی کونسل کا فیصلہ جو اس کے خلاف ہے، منسوخ ہونا چاہیے لیکن جو لوگ یہ صدا بلند کرتے تھے، وہ مسلمانوں کے مذہبی لیڈر یا پیشوا نہ تھے، اس لیے ان کی آواز مذہبی آواز نہیں ہوسکتی تھی لیکن مولانا نے منزل مقصود تک پہنچنے کا جو راستہ اختیار کیا اس میں اس قسم کے نشیب و فراز نہ تھے۔

مولانا کا خیال اس مسئلہ کی طرف ۱۹۰۸ء کے شروع میں رجوع ہوا، اس وقت ان کے سامنے چند امور قابل غور تھے۔

۱- آیا یہ مسئلہ حقیقت میں مسلمانوں کا مسلمہ مذہبی مسئلہ ہے یا نہیں؟

۲- اگر ہے تو گورنمنٹ کو کیوں کر اس کا یقین دلایا جاسکتا ہے۔

۳- گورنمنٹ پریوی کونسل کے فیصلہ میں مداخلت کرسکتی ہے یا نہیں؟

چوں کہ دفعہ اول میں ان کو کوئی شبہ نہ تھا، اس لیے دفعہ دوم اور سوم کے متعلق انہوں نے قوم کے اکثر نامور قانون داں اور سربرآوردہ اصحاب مثلاً سید علی امام بیرسٹر پٹنہ پریسیڈنٹ، مسلم لیگ، مولوی مظہر الحق بیرسٹر پٹنہ، مسٹر شفیع بیرسٹر لاہور، نواب سید امیر حسن خاں کلکتہ، مولوی حامد علی خاں بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ، نواب وقار الملک بہادر علی گڑھ، سید ظہور احمد صاحب بیرسٹر لندن، مولوی محمد شریف

آنریری سکریٹری وقف کمیٹی لندن، مولوی محمد یوسف صاحب وکیل ہائی کورٹ کلکتہ مولوی مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ نواب نصیر حسین خاں خیال کلکتہ، نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی وغیرہ سے خط وکتابت کی، فروری اور مارچ ۱۹۰۸ء میں ان میں سے اکثر اصحاب نے خطوط کے جواب دیے، جن کا خلاصہ انجمن وقف اولاد کی کارروائی میں درج ہے، سب نے متفقاً کامیابی کی امید ظاہر کی اور ہر طرح کی امداد کا وعدہ کیا اور خواہش کی کہ صحیح طریقہ سے اس تحریک کو جاری کیا جائے۔

ان تمام بزرگوں کے نزدیک سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ اس سلسلہ کے متعلق گورنمنٹ کو یقین دلایا جائے کہ یہ مسلمانوں کا مسلمہ مذہبی مسئلہ ہے، اس لیے یہ مناسب خیال کیا گیا کہ پہلے اس کو علما کے سامنے پیش کیا جائے، ندوۃ العلما کا جلسۂ عام دارالعلوم کے سنگ بنیاد کے سلسلہ میں نومبر ۱۹۰۸ء میں لکھنؤ میں ہو رہا تھا، چنانچہ اسی زمانہ میں انہوں نے اس مسئلہ کو ایک تجویز کی صورت میں پہلے ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ میں پیش کیا، مولوی خلیل الرحمٰن صاحب کے سوا باقی سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور طے پایا کہ تمام ہندوستان کے علما سے پہلے فتوے حاصل کیے جائیں، اس کے بعد آگے کارروائی کی جائے، یہی تجویز ندوہ کے اس کھلے اجلاسِ عام میں پیش ہو کر منظور ہوئی، اس منظوری کے بعد کام شروع کر دیا، عام اعلان کے لیے ۲۴ر دسمبر ۱۹۰۸ء کو الندوہ میں ایک کھلا خط شائع کیا جس میں کام کے حسب ذیل مراتب مقرر فرمائے:

۱- ایک رسالہ اردو زبان میں نہایت تفصیل اور تحقیق کے ساتھ فقہ کی مستند کتابوں سے تیار کیا جائے، جس میں ثابت کیا جائے کہ وقف اولاد فقہ اسلامی کا ایک مسلم اور قطعی مسئلہ ہے۔

۲- اس رسالہ پر تمام علمائے ہندوستان سے دستخط کرائے جائیں۔

۳- اس رسالہ کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرایا جائے۔

۴- ہندوستان کے ہائی کورٹوں اور پریوی کونسل نے جس بنا پر وقف اولاد کو ناجائز قرار دیا ہے، ان دلائل سے تعرض کیا جائے اور ان کی غلطی دکھائی جائے۔

۵- ایک محضر اس مضمون کا تیار کیا جائے، کہ چوں کہ وقف اولاد کا مسئلہ مسلمانوں کا ایک مذہبی مسئلہ ہے، اس لیے پریوی کونسل نے اس کے متعلق جو غلط فہمی پیدا کی ہے، اس کی اصلاح قانون کے ذریعہ سے کر دی جائے۔

۶- اس محضر پر تمام اسلامی انجمنوں اور عام مسلمانوں کے دستخط کرا کے گورنمنٹ کے پاس بھیجا جائے، ان تمام امور کے انجام دینے کے لیے ایک رقم کی ضرورت ہے، جس کی تعداد تخمیناً دو تین ہزار ہوگی، جس سے رسالہ کی تیاری، انگریزی ترجمہ اور خط و کتابت کے مصارف ادا ہوسکیں، اس بنا پر ہم تمام مسلمانانِ ہندوستان سے التجا کرتے ہیں کہ اگر وہ اس تدبیر کو ضروری سمجھتے ہیں تو خاکسار کو مطلع فرمائیں اور یہ بھی ظاہر کریں کہ وہ وجوہ مفصلہ ذیل میں کس قسم کی شرکت کرسکتے ہیں۔

۱- مشورہ اور رائے میں شرکت۔

۲- چندہ میں شرکت۔

۳- رسالہ کی ترتیب اور تیاری میں قانونی مشورہ اور انگریزی ترجمہ کرنے میں شرکت۔

لوگوں نے بڑی خوشی سے ان تینوں کاموں میں شرکت کا وعدہ کیا۔

اس کے بعد ندوۃ العلما کی تجویز کے مطابق مولانا نے تمام علما سے استفتا کیا، سب سے پہلا فتویٰ مولانا فضل حق صاحب[1] رام پوری مدرس اعلا مدرسۂ عالیہ رام پور نے لکھا اور اس کے بعد عام طور سے علما نے اس پر دستخط ثبت فرمائے، بعضوں نے کچھ اور عبارتیں اور حوالے بھی بڑھائے، عموماً دونوں مذہب (شیعہ و سنی) کے علمائے نے متفقاً فتوے لکھا کہ یہ مسئلہ شریعت اسلام کا مسلم مسئلہ ہے اور پشاور سے بنگال تک کے علما نے اس فتویٰ پر دستخط کیے اور جب اکثر جگہ سے فتاوے آگئے تو مولانا نے خود اس مسئلہ پر نہایت مدلل رسالہ لکھا، جس میں پریوی کونسل کے تمام دلائل کے جواب دیے اور مسئلہ کی شرعی مصلحتیں ظاہر فرمائیں اور ندوۃ العلما کے جلسۂ انتظامیہ مورخہ ۲ مئی ۱۹۰۹ء میں اس کو پیش کیا، جلسہ نے اس کے متعلق حسب ذیل رزولیوشن منظور کیے۔

۱- رسالہ وقف علی الاولاد جو اس مسئلہ پر لکھا گیا ہے اس کا انگریزی ترجمہ کرایا جائے، مع ان فتوؤں کے جو علما نے لکھے ہیں نیز علمائے حرمین سے بھی فتوے حاصل کیے جائیں اور مصر میں اس کے متعلق جو فیصلے عدالتوں میں ہوچکے ہیں، وہ بہم پہنچائے جائیں۔

۲- ایک مجلس وقف زیر حمایت ندوہ قائم کی جائے اور ہندوستان کے تمام مقتدر مجالس سے اس میں مدد لی جائے۔

---

[1] شاگرد رشید مولانا محمد لطف اللہ صاحب و مولانا عبدالحق خیر آبادی رکن ندوۃ العلما، افسوس کہ مولانا نے ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں تقریباً اسی برس کی عمر میں وفات پائی، بڑے پایہ کے مدرس تھے، اخیر عمر تک درس و تدریس میں مصروف رہے۔

۳- ایک عرض داشت اس کے متعلق تیار ہو جس میں گورنمنٹ سے خواہش کی جائے کہ وہ شریعت اسلام کے موافق قانون تیار کردے۔

۴- اس عرض داشت پر تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے دستخط کرائے جائیں اور دستخط کے بعد وہ ایک معزز اور مقتدر ڈیپوٹیشن کے ذریعہ سے وائسرائے کی خدمت میں پیش کی جائے۔

ان ضروری مراتب کے طے ہو جانے پر مئی ۱۹۰۹ء سے مولانا نے عملی کارروائیاں شروع کیں بزرگانِ قوم سے مجلس وقف کی ممبری قبول فرمانے کی درخواست کی، عرض داشت پر دستخط کرانے کے لیے فارم تیار کرا کے نہایت کثرت سے شایع کیے اور متعدد آدمیوں کو مقرر کیا، جنھوں نے دورہ کر کے ہر طبقہ کے لوگوں سے اس پر دستخط کرائے، ان دستخطوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوگئی۔

تمام کارروائیوں کے لیے ایک معتد بہ رقم کی ضرورت تھی اس لیے چندے کی تحریک کی، اہل خیر نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ اس تحریک کا خیر مقدم کیا، چنانچہ لاہور، بہار، مدراس، سورت اور بعض دوسرے شہروں میں اس کی اعانت و ہمدردی کے لیے نہایت شاندار جلسے ہوئے اور لوگوں نے بخوشی چندے دیے۔

۱۹۱۰ء میں شیعہ کانفرنس نے بھی اس کی تائید کی، ایک خاص رزولیوشن پاس کیا، اسی سال جنوری میں مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں بھی ایک خاص رزولیوشن منظور ہوا، جس کی تحریک مولوی عزیز مرزا مرحوم نے کی جو اس وقت لیگ کے سکریٹری تھے، مولانا نے بھی صدر انجمن مسلم لیگ کے ایما سے اس مسئلہ پر تقریر کی اور یہ طے ہوا کہ ندوہ اور مسلم لیگ دونوں کی طرف سے الگ میموریل گورنمنٹ کی خدمت میں جائیں اور حضور وائسرائے کی خدمت میں ڈیپوٹیشن بھیجنا قرار پائے تو ندوہ اور مسلم لیگ دونوں کے ممبر بہ تعداد مساوی شریک ہوں اور مشترکہ ڈیپوٹیشن بھیجا جائے، کیوں کہ یہ مسئلہ پولیٹکل اور مذہبی دونوں حیثیتیں رکھتا ہے، اس لیے دونوں حیثیتوں سے گورنمنٹ کی خدمت میں سفارت جانی چاہیے۔

مارچ ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلما کا جو جلسہ دہلی میں ہوا، اس میں بھی یہ مسئلہ پیش ہوا اور مولانا نے اس کی اصلیت اور صورت شرعی پر نہایت مفصل تقریر کی اور اس وقت تک اس کے متعلق جو کچھ کارروائی ہو چکی تھی اس کو پیش کیا، مولانا کے بعد شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لا، چودھری سلطان محمد خاں بیرسٹرایٹ لا، مولانا سید عبدالحی صاحب، خان بہادر خواجہ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر، اور چند دیگر اشخاص نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی اور آخر میں شیخ عبدالرحیم صاحب تاجر چرم کی طرف سے

وقف علی الاولاد فنڈ کے لیے پانچ سو روپے کے چندے کا اعلان ہوا۔

اسی سال میموریل کا مسودہ جس کو مئی ۱۹۱۰ء میں غالباً سرتیج بہادر سپرو (الٰہ آباد) نے تیار کیا تھا (شروانی۔۸۱) شائع ہوا اور ملک کے مقنن اور اہل الرائے کی خدمت میں ترمیم و اصلاح کے لیے روانہ کیا گیا، انگریزی اور اردو اخبارات میں بھی اس کی ایک ایک کاپی بھیجی گئی لیکن غالباً یہ میموریل قابل اعتماد ثابت نہیں ہوا، اس لیے مولانا نے اس کے لکھوانے کے لیے قابل ترین اشخاص کی جستجو کی، اکتوبر ۱۹۱۰ء میں نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے اس کے لکھنے پر آمادگی ظاہر کی، مگر یہ شرط کی کہ مولانا خود حیدر آباد آئیں، مگر ندوہ کی ضرورتوں کی وجہ سے وہ نہ جا سکے، (شروانی۔۸۸) جب ہندوستان میں کوئی شخص اس قابل نہ ملا تو جنوری ۱۹۱۱ء میں تمام کاغذات لندن میں ایک ایسے بزرگ (غالباً مولوی امیر علی) کے پاس روانہ کیے، جن سے بڑھ کر کسی کو اس مسئلہ پر لکھنے کا حق حاصل نہ تھا۔[1]

اسی زمانہ میں کونسل کی اصلاح و ترقی (ریفارم) کی وہ اسکیم ہندوستان میں جاری ہوگئی، جس کو "منٹو مارلے ریفارم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس اسکیم کے نفاذ نے "وقف علی الاولاد" کی کوششوں کا راستہ آسان کر دیا، یعنی اب کونسل کو وضعِ قوانین کا تھوڑا بہت اختیار حاصل ہوا، اس لیے مولانا نے اس تجویز کو وائسرائے کی کونسل کے مسلمان ممبروں کے اندر ہر ممکن طریقہ سے کامیاب بنانا شروع کر دیا، اس کے لیے بار بار کلکتہ جا کر مسلمان ممبروں سے گفتگو کی اور انہوں نے اس کی تائید پر پوری آمادگی ظاہر کی، ان میں سب سے پیش پیش مولوی مظہر الحق مرحوم بیرسٹر پٹنہ[2] تھے، انہوں نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ اپنے اثر سے ہندو ممبروں کو بھی اس کی تائید کے لیے آمادہ کیا۔

ان مختلف کوششوں کا یہ اثر ہوا کہ سارے ملک میں اس مسئلہ کے متعلق ایسی پرزور آواز پیدا ہوئی کہ گورنمنٹ بھی اس کے سننے سے انکار نہ کر سکی، چنانچہ ۱۹۱۰ء کے اجلاس میں جب مسٹر محمد علی جناح نے کونسل میں سوال کیا کہ گورنمنٹ اس تحریک سے جو اس مسئلہ کے متعلق مسلمانوں میں پیدا ہو رہی ہے، واقف ہے یا نہیں؟ اور اس کے لیے وہ کیا کرنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ نے صاف اعتراف کیا کہ یہ صدائیں اس کے کانوں میں آ چکی ہیں لیکن وہ خود قانون بنانا نہیں چاہتی بلکہ جو صورت اس کے متعلق مسلمان پیش کریں گے، اس پر غور کرنے کے لیے وہ آمادہ ہے، اس جواب سے لوگوں کو ہمت بندھی اور آخر مولوی مظہر الحق مسٹر جناح اور دوسرے قانون داں ممبروں کے مشورے سے یہ طے ہوا کہ آئندہ اس مسئلہ کو ایک

---

[1] شذرات الندوہ ۱۹۱۱ء ص ۵ [2] شذرات ستمبر ۱۹۱۱ء۔

بل کی صورت میں کونسل میں پیش کیا جائے، چنانچہ اس تجویز کے مطابق ۱۷ ر مارچ ۱۹۱۱ء کو مسٹر جناح نے اس مسئلہ کو وقف بل کی صورت میں کونسل میں پیش کیا اور اس پر ایک مفصل تقریر کی، جس میں مولانا شبلی مرحوم کی تحریک، ندوۃ العلما کی تجویز اور مسلمانوں کے احتجاجی جلسوں اور تجویزوں کا ذکر کیا اور مولانا موصوف نے جو رسالہ پریوی کونسل کے دلائل کے جواب اور مسئلہ کی فقہی حیثیت کی تشریح میں لکھا تھا اس کا خلاصہ پڑھ کر سنایا اور بتایا کہ مسلمانوں میں مولانا کا علمی پایہ کتنا اونچا اور مسلمانوں میں ان کی وقعت کس درجہ ہے اور اس بنا پر ان کی رائے کا وزن کتنا ہوسکتا ہے اور یہ کہہ کر اس کے اقتباسات جگہ جگہ سے پڑھ کر سنائے اور بتایا کہ مولانا کی زیر نگرانی علمائے ہند کی مشہور مجلس ندوۃ العلما کی طرف سے گورنمنٹ کی خدمت میں ایک میموریل بھیجا جارہا ہے جو یا تو گورنمنٹ میں پہنچ چکا ہوگا یا پہنچ رہا ہوگا اور جس پر ہزاروں مسلمانوں کے دستخط ثبت ہیں۔

آخر میں انہوں نے وقف اولاد کا بل پیش کیا اور اس کے دفعات کی تشریح کی۔

اس کے بعد سب سے پہلے مہاراجہ بردوان نے مختصراً اور آنریبل مسٹر سچد انند سنہا (بیرسٹر پٹنہ) نے پوری تفصیل سے اس کی تائید کی، ان کے بعد نواب عبدالمجید صاحب بیرسٹر الہ آباد نے مولانا شبلی مرحوم اور ندوۃ العلما کی کوششوں کا شکریہ ادا کیا اور رسالۂ مذکور کے بعض دوسرے ضروری اقتباسات کا اضافہ کیا بعدازیں راجہ دیگھا پتیا، مولوی شمس الہدیٰ صاحب وکیل کلکتہ، نواب سید محمد بہادر مدراس مسٹر سوبہ راؤ، بابو بھوپندر ناتھ باسو مسٹر گوکھلے اور سب سے آخر میں مولوی مظہر الحق مرحوم نے تقریر کی اور ہندو ممبروں کی اس پر جوش تائید کا شکریہ ادا کیا، آخر میں مسٹر جناح نے اس بل کو بزبان انگریزی گورنمنٹ گزٹ میں اور صوبہ کی حکومتوں مین مختلف زبانوں میں شایع کرنے کی تجویز پیش کی۔

گورنمنٹ ممبر نے جواب میں کہا کہ گورنمنٹ مسودہ کو عام طور پر شایع کر کے مسلمانوں کی عام رائے کا انتظار کرے گی، چنانچہ گورنمنٹ نے ملک کے تمام حصوں سے رائیں طلب کیں اور ہر جگہ سے متفقہ رائیں آئیں۔

مسٹر جناح نے جو بل پیش کیا تھا اس کے بعض دفعات سے مولانا کو اختلاف تھا، اس لیے بمبئی جا کر وہ خود مسٹر جناح سے ملے[1] اور ان کو اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کیا، انہوں نے اس کے مطابق اپنے بل میں اصلاح منظور کرلی، بہرحال جولائی ۱۹۱۱ء تک یہ کام باقی رہ گیا کہ میموریل بل کے قانونی وشرعی اصلاحات

---

[1] مکاتیب بہ نام عبدالباری۔

کے ساتھ چھپوا کر اور اعیان و اکابر سے دستخط کرا کر وائسرائے کی خدمت میں بھیج دیا جائے[1]، اس غرض سے مولانا نے ہوم ممبر سے جن سے تمام قوانین کا تعلق تھا، خط و کتابت کی اور لکھا کہ وہ ایک ڈیپوٹیشن کی پذیرائی قبول کریں جو ان کو تمام کاغذات سمجھائے، چنانچہ انہوں نے نہایت خوشی سے اس کو منظور کیا اور ڈیپوٹیشن کے لیے ایک تاریخ مقرر کی لیکن یہ تاریخ قطعی و یقینی نہ تھی، اس لیے ٹل گئی ۱۹۱۲ء کے اوائل میں مولانا خود کلکتہ تشریف لے گئے اور وائسرائے کی کونسل کے تمام ممبروں کو ایک جلسہ میں جمع کر کے تمام مراتب طے کیے اور یہ توقع قائم ہوگئی کہ اسی مہینہ میں بل حسب مراد پاس ہو جائے گا اور سب کمیٹی بیٹھ جائے گی، چنانچہ یہ توقع پوری ہوئی اور گورنمنٹ نے اصولاً وقف علی الاولاد کو تسلیم کر لیا اور اس کے جزئیات ایک سب کمیٹی کی نگرانی میں طے ہوگئی اور مولانا کی چار سال کی جدوجہد تگ و دو اور سعی و محنت کا نتیجہ حسب مراد نکل آیا اور مسلمانوں کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوئی جس سے ہزاروں گھرانے تباہی سے بچ گئے۔

تعطیل جمعہ ۱۹۱۲ء سرکاری دفاتر اور انگریزی مدارس کے اوقات چوں کہ عموماً ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک رکھے گئے ہیں، اس لیے مسلمان عہدہ داروں اور مسلمان ٹیچروں اور طالب علموں کو جمعہ پڑھنے کا موقع نہیں ملتا، اگرچہ یہ افسوس ناک بات ہے کہ جدید تعلیم کے اثر سے خود مسلمانوں میں فرائض مذہبی کی پابندی کا بہت کم احساس باقی رہ گیا ہے، تاہم بہر حال یہ ایک مذہبی مسئلہ ہے اور کوئی مسلمان اپنے اس حق سے دست بردار ہونا نہیں پسند کرے گا، مولانا کو وقف علی الاولاد کے معاملہ میں جو کامیابی حاصل ہوئی، اس نے ان کے حوصلہ کو بہت کچھ بڑھا دیا اور انہوں نے اسی سلسلہ میں تعطیل جمعہ کی طرف بھی توجہ کی اور اس کو گورنمنٹ کی خدمت میں اسی طرح پیش کرنا چاہا جس طرح وقف علی الاولاد کے مسئلہ کو پیش کیا تھا، چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے اپریل ۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ میں جو لکھنؤ میں ہوا تھا، اس مسئلہ کے متعلق ایک رزولیوشن پیش کیا جو منظور کیا گیا، اس کے بعد انہوں نے اس کے متعلق ایک یادداشت مرتب کی، جس میں بہ ترتیب حسبِ ذیل متعدد دلیلوں کی بنا پر مسلمانوں کے اس مطالبہ کو حق بجانب قرار دیا۔

۱۔ انگلش گورنمنٹ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رعایا کے تمام مختلف مذاہب کو یہ آزادی دیتی ہے کہ وہ بہ اطمینان تمام اپنے اپنے فرائض مذہبی کو بجا لاسکیں۔

۲۔ جمعہ کی نماز ہر مسلمان پر جو معذور و مجبور نہ ہو، فرض قطعی ہے۔

---

[1] مکاتیب بہ نام شروانی، ۹۲، ۹۳، ۹۴۔

۳- چنانچہ جمعہ کی فرضیت کا حکم قرآن پاک میں مذکور ہے۔

۴- اس نماز کی اہمیت کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام اسلامی سلطنتوں اور ریاستوں میں اس دن تعطیل ہوتی ہے۔

۵- یہاں تک کہ ہندوستان کی اکثر ہندو ریاستوں میں بھی باوجودیکہ وہاں مسلمان ملازموں کی تعداد نسبتاً کم ہے، اس دن تعطیل ہوتی ہے۔

۶- انگریزی عملداری کے شروع میں چوں کہ مسلمانوں کو یہ خیال تھا کہ انگریزی حکومت ایک غیر حکومت ہے، وہ ہماری مذہبی فرائض کا لحاظ کیوں کرنے لگی، اس لیے انہوں نے اس درخواست کی ہمت نہیں کی لیکن بعد کو مسلمانوں کو انگریزی حکومت کی انصاف پسندی کا جیسے جیسے تجربہ ہوتا جاتا ہے، ان کی یہ خواہش بڑھتی جاتی ہے کہ وہ اس ضروری فرض کے ترک کی طرف گورنمنٹ کو متوجہ کریں۔

۷- آیندہ جیسے جیسے تعلیم بڑھتی جائے گی، مسلمان سرکاری ملازموں کی تعداد بھی بڑھتی جائے گی اور اسی مناسبت سے نماز جمعہ کی تعطیل کا مسئلہ بھی روز بروز اہم ہوتا جائے گا۔[1]

مولانا کے اسی مضمون کو پیش نظر رکھ کر انگریزی میموریل تیار ہوا اور تمام مسلمانوں سے اس پر دستخط کرانا چاہا، چنانچہ ۱۵/ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں "تعطیل جمعہ کی نسبت جا بجا کچھ کارروائیاں ہو رہی ہیں، آپ اخباروں میں پڑھتے ہوں گے لیکن جب تک وقف اولاد کی طرح متحدہ، پُرزور اور وسیع طریقہ سے باضابطہ کارروائی نہ کی جائے گی کامیابی نہ ہوگی، میں نے انگریزی میں میموریل لکھوالیا ہے اور اس کو چھپوا کر دستخطوں کے بہم پہنچانے کی کارروائی شروع کرنی چاہتا ہوں لیکن اس معاملہ کے آخر تک پہنچانے کے لیے کم از کم چار پانچ سو روپے کی رقم درکار ہوگی، آپ اس سرمایہ میں جو کچھ عنایت فرما سکیں، مطلع فرمائیں۔" (۱۰۵)

ان اغراض کے لیے مولانا نے جس رقم کی درخواست کی تھی وہ نہایت آسانی سے جمع ہوگئی،[2]

اب اس کام میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی، کام شروع تھا، کہ مارچ ۱۹۱۳ء میں مسٹر غزنوی (بنگال کے ممبر) نے بنگال کونسل میں اس کے متعلق گورنمنٹ سے سوال کیا، سرکاری ممبر نے اس کا جواب تشفی بخش دیا اور گورنمنٹ بنگال نے نماز جمعہ کے لیے دو گھنٹہ کی چھٹی منظور کرلی، اس پر مسٹر شفیع بیرسٹر لاہور نے مولانا

---

[1] مولانا کا یہ پورا مضمون مقالات شبلی حصہ ہشتم صفحہ ۲۹ میں ہے۔ [2] مکاتیب شبلی حصہ دوم، سلیمان-۴۰۔

کو لکھا کہ اب اس تحریک کو آگے چلانے کی ضرورت نہیں (ریاض حسن ۲۱ و شروانی ۱۰۷) خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا خیال تھا کہ کامیابی ناممکن ہے (شروانی - ۱۰۷) لیکن دوسرے اہل الرائے حضرات نے اس سے موافقت نہیں کی، چنانچہ مولانا نے ایک اور میموریل تیار کرایا جس میں بنگال گورنمنٹ کے فیاضانہ حکم کا حوالہ دے کر گورنمنٹ سے خواہش کی کہ جمعہ کو دو گھنٹوں کی تعطیل کے بجائے ایک بجے سے آدھے دن کی عام تعطیل دی جائے، اس مطالبہ کا حق بجانب ہونا حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کیا گیا "گورنمنٹ بنگال تمام مسلمانوں کے شکریہ کی مستحق ہے کہ اس نے نہایت فراخ دلی سے مسلمانوں کی اپیل نہایت توجہ سے سنی اور مسلمان سرکاری ملازموں کو جمعہ کے دن دو گھنٹہ کی رخصت عطا کی، اس میں شبہ نہیں کہ یہ رعایت ادائے مذہبی، مذہبی فرائض کو دیکھتے ہوئے کافی ہے لیکن اس طرفدارانہ انتظام میں ایک خطرہ ہے جو تمام اہل اسلام کے خوف کا موجب ہوسکتا ہے، خاص کر اس خطرہ کا اثر سب آرڈنیٹ سروس (ماتحت اسامیاں) پر پڑتا ہے، خطرہ یہ ہے کہ بہت سے افسر ایسے بھی ہوں گے، جو ایسے مسلمانوں کو اپنی ماتحتی میں لینا ناپسند کریں گے، جو ہر جمعہ کو دو گھنٹہ کے لیے کام چھوڑ کر چلے جایا کریں گے اور چوں کہ ایسی اسامیاں جیسے تجویز نویس، محرر، نقل نویس، وغیرہ وغیرہ، ایسے ہی افسروں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں، اس لیے یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ ایسی اسامیوں پر مسلمانوں کے مقابلہ میں جو دو گھنٹہ کے لیے چلے جایا کریں گے، غیر مسلمان ملازموں کو ترجیح دی جائے گی، جو ہر روز اور ہر وقت ان کے ساتھ کام کیا کریں گے، اگر اس خطرہ کی کوئی اصلیت ہوسکتی ہے تو ایسے طرفدارانہ انتظام سے مسلمان سرکاری ملازموں کی آیندہ امیدوں اور ترقیوں پر سخت اثر پڑے گا۔

لہٰذا حضور والا کے ملتمسین یہ تجویز کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ جمعہ کے دن نصف دن کی تعطیل ایک بجے سے اس ضرورت کے لیے کافی ہوگی، بلاشبہ اس رعایت سے ایک حد تک کام پر اثر پڑے گا لیکن حضور والا کے خدام بصد ادب ملتجی ہیں کہ اس نقصان کی تلافی بھی آسانی سے کی جاسکتی ہے، بہت سی عدالتوں اور دفتروں میں سنیچر کے روز نصف دن کی تعطیل بالکل فضول ہوتی ہے، بجائے سنیچر کے جمعہ کے دن آسانی کے ساتھ ایسی تعطیل کی جاسکتی ہے۔"

یہ کارروائی ابھی جاری تھی کہ مولانا نے انتقال فرمایا، اس تحریک کا یہ اثر ہوا کہ اکثر صوبوں میں ملازمین کو نماز جمعہ میں جانے کی اجازت مل گئی، یعنی اگر وہ چاہیں تو آدھ گھنٹہ کی چھٹی لے کر جاسکتے ہیں اور اسکولوں میں یہ سفارش کی گئی کہ یا تو اسکول صبح سے ۱۲ بجے تک ختم کردیا جائے یا ایک بجے جو لڑکے اور مدرس نماز کو جانا چاہیں، ان کو آدھ گھنٹہ کی چھٹی دے دی جائے۔

افسوسناک لطیفہ | جن دنوں مولانا نماز جمعہ کی تعطیل کی کوشش کر رہے تھے، اکثر فرماتے تھے کہ تعطیل کی کوشش تو ہو رہی ہے، مگر ڈر یہ لگتا ہے کہ کہیں تعطیل ہو جائے اور مسلمان نماز پڑھنے نہ جائیں تو ان کی کیسی جگ ہنسائی ہو گی۔

اوقافِ اسلامی ۱۹۱۴ء | ہندوستان میں اسلامی اوقاف کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے، اس سے کون واقف نہیں، مولانا کا دل بھی اسلامی اوقاف کی تباہی و بربادی سے کڑھ رہا تھا، خصوصیت کے ساتھ وقف علی الاولاد کے سلسلہ میں ان کو اسلامی اوقاف کی جو کیفیت معلوم ہوتی رہی اس سے ان کے دل کا زخم اور بڑھتا رہا اور خصوصیت کے ساتھ اس لیے کہ اوقاف کی کثیر رقم بیکار پڑی رہنے کے باوجود قومی اور مذہبی ضرورتوں کے واسطے جس مشکل سے ایک ایک جیب سے ایک ایک دانہ جمع کر کے انبار لگانا پڑتا ہے، اس سے خوب واقف تھے، غرض ان مختلف اسباب سے مولانا نے وقف علی الاولاد کی کامیابی کے بعد عام اسلامی اوقاف کے حسن انتظام واہتمام کی طرف توجہ فرمائی۔

مولانا سے پہلے بھی قوم کے کارکن اور ذی احساس افراد نے ادھر توجہ کی تھی اور ان کے مداخل ومصارف کا باقاعدہ انتظام کرنا چاہا تھا، چنانچہ مسلم لیگ اور دیگر اسلامی انجمنوں نے بارہا یہ رزولیوشن پاس کیا کہ گورنمنٹ ان اوقاف کی نگرانی کی طرف متوجہ ہو لیکن گورنمنٹ نے یہ جواب دیا کہ دو باتیں ثابت کرنی چاہئیں، ایک تو یہ کہ یہ خواہش تمام قوم کی طرف سے ہے، دوسرے یہ کہ ان اوقاف کی آمدنی صحیح مصرف میں نہیں صرف کی جاتی، اس کے بعد مسلم لیگ یا اور کسی انجمن نے کچھ کارروائی نہیں کی اور ایسا ضروری معاملہ جوں کا توں رہ گیا۔

مولانا نے وقفِ اولاد کے بعد اس مسئلہ کی طرف توجہ کی اور جنوری ۱۹۱۴ء میں ایک عام خط شائع کیا[1]، جس میں حسب ذیل تجویزیں پیش کیں:

۱- ایک مختصر سی کمیٹی قائم ہو جو اس کی تدبیروں پر غور کرے اور کوئی صحیح اور متعین اور قابل عمل طریقہ تجویز کر کے ایک اسکیم بنائے جو قوم کے سامنے پیش کی جائے اور فیصلہ کے بعد اس پر عمل کیا جائے۔

۲- ایک میموریل تیار کیا جائے، جس میں انتظام اوقاف کی خواہش گورنمنٹ سے کی جائے اور اس میموریل پر اس کثرت سے مسلمانوں کے ہر طبقہ سے دستخط کرائے جائیں کہ یہ میموریل تمام قوم کی طرف سے سمجھا جائے۔

---

[1] یہ خط مقالات شبلی جلد ہشتم، ص ۲۶ میں موجود ہے۔

۳- گورنمنٹ سے جس قسم کی نگرانی کی خواہش کی جائے اس طریقہ کی ہو کہ مذہبی دست اندازی کا کسی طرح احتمال پیدا نہ ہونے پائے، مثلاً اس کا یہ طریقہ ہو کہ ایک کمیٹی قائم کی جائے، جس کے ارکان تمام صوبوں سے نیابتانہ طریقہ پر انتخاب کیے جائیں اور انتخاب کی تمام تر کارروائی صرف اسلامی جماعت کی طرف سے انجام پائے، پھر گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کمیٹی کو باقاعدہ تسلیم کرلے اور اس کو باضابطہ اختیارات تحقیقات وغیرہ کے لیے دیے جائیں، پھر اس کی مرتب کردہ رپورٹ ملک میں شایع کی جائے اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

۴- تیموری سلطنت میں تمام اوقاف کے انتظام کے لیے ایک خاص عہدہ دار مقرر تھا، جس کو صدر الصدور کہتے تھے، کیا گورنمنٹ سے یہ درخواست نہیں کی جاسکتی کہ یہ عہدہ دوبارہ پھر قائم کیا جائے لیکن صدر الصدور کا تقرر اسی نیابتانہ اصول پر اسلامی جماعت کی طرف سے ہوتا کہ گورنمنٹ کے متعلق کسی قسم کی دست اندازی کا احتمال نہ پیدا ہوسکے۔

مولانا نے جنوری ۱۹۱۴ء میں یہ تحریک کی تھی اور فروری ۱۹۱۴ء ہی میں گورنمنٹ نے اوقاف کے متعلق ایک یادداشت شایع کی اور اسی مہینہ میں اس معاملہ کی تحقیقات کے لیے ایک کانفرنس بٹھانا چاہا (سلیمان-۲۶) خوشی میں مولانا شروانی صاحب کو ۱۶ر فروری ۱۹۱۴ء کو ان لفظوں میں اس کی خبر دی :

ع "آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم"

آپ نے دیکھا، ادھر اوقاف اسلامی کی تحریک شروع ہوئی، ادھر گورنمنٹ نے یادداشت شایع کی اور ایک کانفرنس اسی مہینہ میں بٹھانے والی ہے، خیر میرا کام تو اس کے پیچھے جان لڑا دینا ہے۔

ع آگے نصیب ہے جسے پروردگار دے

لیکن افسوس کہ اسی سال مولانا کا انتقال ہوگیا، تاہم اوقاف کی نگرانی اور انتظام کے متعلق جو تحریک چل چکی تھی وہ مردہ نہیں ہوئی، خود گورنمنٹ نے اور صوبہ کی اسمبلیوں اور کونسلوں نے اس کو جاری رکھا اور بالآخر مختلف صوبوں میں اس کے لیے پہلے تحقیقاتی کمیٹیاں قائم ہوئیں اور ان کی سفارش سے نگرانی اور حسابات کی پڑتال کی ایک صورت قائم ہوگئی، گو مولانا کی خواہش اور مسلمانوں کے مطالبہ سے وہ بہت کم ہے، اسی طرح ہندوستان میں صدر الصدوری یا شیخ الاسلامی یا امارت شرعیہ کی جو تحریکیں بعد کو اٹھیں وہ بھی اسی تجویز کی صدائے بازگشت ہے۔

اشاعت اسلام ۱۹۰۸ء-۱۹۱۳ء ہندوستان میں ۱۹۰۸ء کا زمانہ اسلام کے لیے عجیب کشمکش کا زمانہ تھا، ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں سیکڑوں ہزاروں راجپوت، جاٹ، میواتی اور دوسرے ہندو خاندان مسلمان ہو گئے تھے، ان میواتی کی تعداد بہت کافی ہے، یہ لوگ خدا جانے کب مسلمان ہوئے اور کس نے ان کو مسلمان کیا کہ اس وقت سے لے کر آج تک نہ پورے مسلمان ہوئے، نہ ہندو ہی رہے، وہ اپنے کو نام کا مسلمان تو ضرور کہتے تھے، مگر ان میں بہت سے رسوم ہندوؤں کے بھی جاری تھے، بلکہ بعض کے تو نام تک ہندوانہ تھے، ان کی تعداد لاکھوں کے قریب ہے اور حدودِ راجپوتانہ سے لے کر دہلی و آگرہ تک پھیلے ہیں، آریہ مبلّغ معلوم نہیں کب سے اس شکار کی تاک میں تھے اور ان کو دوبارہ ہندو بنانے کے لیے تیاریاں کر رہے تھے، ۱۹۰۸ء میں یک بیک یہ راز طشت از بام ہوا تو تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک آگ سی لگ گئی اور ہر طرف اس کی مدافعت اور بچاؤ کی کوششیں شروع ہو گئیں، مولانا بھی ضعف اور بیماری کے باوجود اس فتنہ کے انسداد کے لیے فوراً کمر بستہ ہو گئے، مارچ ۱۹۰۸ء میں کرنل عبدالمجید خاں وزیر خارجہ ریاست پٹیالہ نے جو خود مسلمان راجپوت تھے، پٹیالہ میں ایک مسلمان راجپوت کانفرنس قائم کی اور شاید اس لیے کہ مولانا بھی راجپوت نسل سے تھے، ان کو اس جلسہ میں آنے کی دعوت دی، چنانچہ سخت مصروفیتوں کے باوجود وہ جا کر اس میں شریک ہوئے [۱]۔

۱۳ اپریل ۱۹۰۸ء کو نومسلم راجپوت اور حفاظت اسلام کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں بتایا کہ ان نومسلموں کے ارتداد کا اصلی سبب مذہبی جہالت ہے، اس سلسلہ میں ایک عجیب حقیقت کا اظہار فرمایا جو آج آنکھوں کے سامنے ہے، فرمایا ”ان نومسلموں کی مذہبی جہالت تو سب کو معلوم ہے، لیکن جس جدید تعلیم کے پھیلانے پر اتنا وقت اور سرمایہ صرف کیا جا رہا ہے، اس کے مذہبی تعلیم سے سراسر خالی ہے، کی بنا پر اس سے بھی اسی قسم کے نتیجہ کا ڈر ہے“ ان کے الفاظ یہ ہیں ”سب سے پہلے ہم کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ ان نومسلموں کے مرتد ہو جانے کا سبب کیا ہوا، اس کا جواب صرف ایک ہے، وہ یہ کہ لوگ اسلامی عقائد، اسلامی احکام اور اسلامی تاریخ سے بالکل ناواقف تھے، ان کا اسلام صرف نام کو اسلام تھا، اس لیے ذرا سی فریب کاری اور دھوکہ سے یہ عارضی رنگ اُڑ گیا، یہ جواب بلاشبہ صحیح اور سرتاپا صحیح ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہماری موجودہ دنیوی تعلیم سے کیا اس پیشین گوئی کی مخفی آواز نہیں آ رہی ہے؟

---

[۱] مکاتیب حمید-۴۱، مہدی افادی-۲۶۰۔

کیا ہماری دنیوی تعلیم (انگریزی تعلیم) میں عقائد اسلام کے استحفاظ کا کوئی بندوبست ہے؟
کیا اس میں تاریخ اسلام کا کوئی معتدبہ حصہ شامل ہے؟ کیا وہ مذہبی زندگی کی ذمہ دار ہے؟
بے شبہ ابھی تک موجودہ نسلوں میں اسلام کے آثارات نظر آتے ہیں، لیکن یہ پچھلی اور موجودہ سوسائٹی کی بقیہ یادگاریں ہیں۔
کچھ زیادہ دن نہیں گزرے کہ اخباروں میں یہ مضامین مسلمان لیڈروں[1] کی طرف سے شایع ہوتے تھے کہ اسلام کا قانونِ وراثت بدلنے کے قابل ہے، ایک مسلمان صاحب نے علانیہ لکھا تھا کہ قرآن کی وہ سورتیں جو مدینہ میں اتریں بادشاہانہ حیثیت رکھتی ہیں، ان کو مذہب سے کچھ تعلق نہیں۔
بے شبہ ابھی اس قسم کی مثالیں کم ہیں لیکن ابھی دنیوی تعلیم کو پھیلتے ہوئے کے دن ہوئے ہیں؟ نومسلم راجپوت دوسو برس کے بعد اس حالت کو پہنچے ہیں، جدید تعلیم کی جو رفتار ہے، دوسو برس کے بعد اس سے کس قسم کے نتیجہ کی امید کی جاسکتی ہے؟
اس تقریر سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ دنیوی تعلیم کو روکا جائے، ہمارے نزدیک دنیوی تعلیم کو اس قدر پھیلانا چاہیے کہ بچہ بچہ تعلیم یافتہ ہوجائے لیکن ساتھ ہی ہم کو ''مذہب'' کی حفاظت پر بھی اپنی تمام قوت صرف کردینی چاہیے، اس کی تدبیر اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ مذہبی تعلیم کی ایک وسیع الشان درس گاہ موجود ہو، جس میں تمام مذہبی علوم نہایت تکمیل اور اہتمام کے ساتھ پڑھائے جائیں، طلبہ کو عمدہ تربیت دی جائے، وہ دریوزہ گری کے طریقہ سے بچائے جائیں، ان کو ایثار نفس اور سچی قناعت وخود داری کی تعلیم دلائی جائے۔
اس کے بعد انہوں نے مذہبی تعلیم کی ایک جامع حیثیات درس گاہ کی ضرورت پر زور دیا اور مسلمانوں کو متحد ہوکر کسی ایک تبلیغی مرکز کی کوشش پر آمادہ فرمایا۔
ندوۃ العلما نے اگرچہ ابتدا ہی سے اشاعت اسلام کو اپنے مقاصد میں داخل کیا تھا اور ارکان میں سے پہلے مولوی خلیل الرحمٰن صاحب اور پھر مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی اس کے معتمد قرار پائے تھے، تاہم اب تک اس نے عملی طور پر اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی لیکن اب وہ حالت

[1] یہ مضامین مسٹر شاہ دین لاہور کے نام سے نکلے تھے، دیکھیے الندوہ شوال ۱۳۲۲ھ (جنوری ۱۹۰۵ء) جلد ا، نمبر ۶، وذی قعدہ ۱۳۲۲ھ (فروری ۱۹۰۵ء) جلد ا، نمبر ۷، فروری ۱۹۰۷ء (شذرات)۔

پیش آ گئی کہ خاموش رہنا مشکل تھا، مولانا نے ہندوستان کے افق پر نظر ڈالی تو ان کو نظر آیا کہ مسلمانوں میں مذہبی جوش کا طوفان تو ضرور برپا ہو گیا ہے لیکن اس کی موجیں بے راہ روی اختیار کر رہی ہیں، اس مذہبی بے چینی اور جوش کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ تمام انجمنیں اپنے اپنے سفیر اور اپنے اپنے واعظ مقرر کر کے مختلف مقامات میں بھیج رہی ہیں لیکن ان انجمنوں میں باہم کسی قسم کا ربط و اتحاد نہیں ہے، اس بنا پر ان کی رائے یہ قرار پائی کی الگ الگ کام کرنے کے بجائے "انجمن ہدایت الاسلام" دہلی کو جسے مولانا عبدالحق صاحب حقانی مرحوم نے قائم کیا تھا، وسعت دے کر اشاعت اسلام کی ایک مجلس عمومی بنا دی جائے اور تمام متفرق و پراگندہ قوتیں جو علاحدہ علاحدہ کام کر رہی ہیں اسی میں مدغم ہو جائیں اور ندوہ بھی اپنی بساط کے مطابق اس کی پوری مدد کرے۔

شروع میں مولانا کا اصلی خیال یہی تھا اور انہوں نے اس خیال کو اس مضمون[1] میں جس کو ۱۳؍ اپریل ۱۹۰۸ء میں لکھا تھا نہایت بلند آہنگی کے ساتھ ظاہر بھی کر دیا تھا لیکن مسلمانوں میں یہ اتفاق عام پیدا نہ ہو سکا، مجبوراً انہوں نے پہلے ندوہ کے اندر رہ کر اشاعت وحفاظت اسلام کے مختلف کام کیے، لیکن اس میں بھی ایک دقت حائل تھی، ندوہ کی مجلس اشاعت اسلام کے معتمد جناب مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی تھے اور مولانا کے خیال میں وہ کام نہیں کر رہے تھے، اس لیے مولانا دو برس تک عجیب کشمکش و پیچ میں رہے، کبھی خود کام کرنے لگتے اور کبھی شاہ صاحب کا خیال کر کے چپ ہو جاتے، اسی حال میں دو برس گزر گئے، اس زمانہ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ان کے دل کو ٹھیس لگی اور وہ ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اس آگ میں کود پڑے، انہیں اطلاع ملی کہ شاہ جہاں پور کے قریب ایک مسلمان زمین دار راجپوت مرتد ہوا چاہتا ہے، یہ سننا تھا کہ بے قرار ہو گئے، پہلے سیدھے دارالعلوم میں تشریف لائے اور طلبہ کے مجمع میں تقریر شروع کی، تقریر کے شروع میں سورۂ نصر کو تعوذ اور بسم اللہ کے بغیر یوں پڑھا، اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ "يَخْرُجُوْنَ" مِنْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجاً، پھر فرمایا، عزیزو! تم نے خیال کیا ہوگا کہ میں نے آیت غلط پڑھی، ایک دن تھا کہ جب لوگ جوق جوق اسلام میں داخل ہوتے تھے لیکن آج وہ دن ہے کہ لوگ جوق جوق اسلام سے نکلے جاتے ہیں، پھر مسلمانوں کی بے پروائی سے اس فتنہ کے جو نتائج نکلیں گے، ان کا ہولناک منظر کھینچا اور طلبہ کو تبلیغ کے سپاہی بننے کی ترغیب دی۔

---

[1] یہ مضمون مقالات شبلی جلد ہشتم ص ۳ پر چھپا ہے۔

مولانا نے اس واقعہ کا ذکر ۱۹۱۲ء کے اجلاسِ لکھنؤ میں خود کیا ہے، فرماتے ہیں "حضرات! میرے اوپر ابتداً اس اثر کی یوں ہے کہ دو سال ہوئے کہ شاہ جہاں پور سے ایک خط میرے پاس سفید خاں سوداگر کا آیا کہ شاہ جہاں پور سے آٹھ کوس پر ایک گاؤں ہے، جمال پور، وہاں کے رئیس راجپوت جو مسلمان ہیں وہ ہندو ہونا چاہتے ہیں، آریہ وہاں پہنچ گئے ہیں، ان کو ہندو کرنا چاہتے ہیں، آپ جلد آیئے اور مدد کیجیے، انہوں نے اس کے ساتھ ہی دہلی کی انجمن ہدایت الاسلام کے مولانا عبدالحق حقانی کو لکھا تھا، وہ وہاں سے تشریف لائے تھے اور میں ندوہ سے گیا، جس وقت میں یہاں سے چلا ہوں، میری جو حالت تھی، یہ طلبہ ندوہ کے جو یہاں بیٹھے ہیں وہ اس کے شاہد ہوں گے، کہ میں نے اس وقت کوئی گالی نہیں اٹھا رکھی تھی جو میں نے ان ندوہ والوں کو نہ سنائی ہوگی کہ اے بے حیاؤ اور اے کم بختو! ڈوب مرو، یہ واقعات پیش آئیں ہیں، ندوہ کو آگ لگا دو اور علی گڑھ کو بھی پھونک دو، یہی الفاظ میں نے اس وقت کہے تھے اور آج بھی کہتا ہوں، اس وقت نہایت افسوس میں یہاں سے گیا تھا، وہاں جا کر میں نے پوچھا کہ کیا واقعہ ہے، لوگوں نے یہ بیان کیا کہ آریہ اس گاؤں میں آئے ہوئے ہیں اور وہ گاؤں کے نومسلم راج پوتوں کو ہندو بنانا چاہتے ہیں، مسلمان علما کو بلوایا ہے، جمال پور سے ایک کوس پر خیمہ کھڑا کیا گیا ہے، تین سو روپے کھانے میں صرف ہوئے ہیں، چندہ وغیرہ کیا گیا ہے، وہ نومسلم بے چارے یہ کہتے تھے کہ مناظرہ ہم جانتے نہیں، پڑھے لکھے نہیں، آپ ہمارے اس گاؤں میں آیئے اور یہاں آ کر ہم کو سمجھایئے، جو باتیں ہمارے دل میں ہوں گی ہم آپ سے کہیں گے، آپ ان کا جواب دیجیے، پھر جو کچھ بھی ہو، یہ واقعہ ہے اس میں ذرا بھی غلط نہیں کہتا ہوں، اس کے شاہد سید وزیر حسن صاحب وکیل شاہ جہاں پور ہیں وہ اس کی گواہی دے سکتے ہیں" اس پر ایک شخص بھی راضی نہ ہوا کہ گاؤں میں جایئے، اس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ وہ لوگ خدانخواستہ فوج داری کریں گے، یا ماریں گے، کیوں کہ پولیس اور تحصیلدار وہاں موجود تھے کہ امن وامان قائم رہے۔

میں نے بالآخر یہ کہا کہ بھائیو! مجھے تو پالکی میں ڈال کر وہاں لے چلو، میں چلتا ہوں لیکن کوئی شخص نہیں لے گیا، غرض تین دن تک میں وہاں پڑا رہا، بالآخران لوگوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم ہندو ہیں۔

"کیا یہ واقعات آپ کے کانوں میں پڑتے ہیں، اگر نہیں پڑتے تو آپ کی بے خبری کی داد دینی چاہیے اور اگر پڑتے ہیں تو آپ کا دل جل نہیں جاتا؟ پھک نہیں جاتا؟ کڑھ نہیں جاتا، اس سے زیادہ کیا بے حمیتی ہوگی؟ کیا یہ باتیں ایسی ہیں کہ جن سے چشم پوشی کی جائے؟"

مولانا ہنگامی دورہ، مناظرہ اور تقریر وغیرہ کی ان عارضی تدبیروں کو جو اس وقت کی اسلامی انجمنیں اختیار کر رہی تھیں، حفاظت اسلام کی مستقل تدبیر نہیں خیال فرماتے تھے، ان کے نزدیک صحیح صورت یہ تھی کہ ان آریوں کے مقابلہ کے لیے ایسے جفاکش، ایثار پسند اور مخلص علما کا گروہ پیدا کیا جائے جو بھاشا میں بات کر سکے اور سنسکرت کی تھوڑی واقفیت رکھے، یہ لوگ دیہاتوں میں جا کر پھیل جائیں اور ان اطراف میں اپنے مستقل تعلیمی مرکز قائم کر لیں، آریوں کے گروکل کے مقابلہ کے لیے اپنے یہاں بھی اسی قسم کی ایک تربیت گاہ کو وہ ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ مارچ ۱۹۱۰ء کے اجلاس دہلی کی تقریر میں انہوں نے اپنے اس خیال کی تفصیل کی ہے، ندوہ کا ایک دوسرا فرض اشاعت اسلام ہے، یہ مقصد اگرچہ مدت سے ندوہ کے مقاصد میں شامل کیا گیا تھا اور اس کا ابتدائی دستور العمل مرتب ہو گیا تھا لیکن ندوہ نے قصداً اس کام کو نہیں شروع کیا اور مجھ کو تفصیل سے بتانا چاہیے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟

اشاعت اسلام کی ضرورت آج کل درحقیقت اس وجہ سے بڑھ گئی ہے کہ آریوں نے تمام ملک میں اپنے سفیر اور واعظ پھیلا دیے ہیں اور انہوں نے جاہل اور نومسلم مسلمانوں پر مختلف تدبیروں سے اپنا اثر پھیلانا شروع کر دیا ہے، یہ حالت نہایت اندیشہ ناک ہے اور خوشی کی بات ہے کہ مسلمانوں کو ہر جگہ اس خطرہ کا احساس ہو گیا ہے اور جابجا اس کی مدافعت کے لیے انجمنیں اور مجلسیں قائم ہو گئی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں، لیکن ہم کو نہایت غور و فکر سے دیکھنا چاہیے کہ جو کوششیں کی جا رہی ہیں، یہ کافی ہیں یا نہیں، آریوں نے جن اسباب سے اپنی تحریک میں کامیابی حاصل کی ہے اور کرتے جاتے ہیں وہ دو چیزیں ہیں۔

۱- ایثار نفس، یعنی ان کے واعظ نہایت ایثار نفسی، نہایت جاں نثاری، نہایت جفاکشی کے ساتھ اس کام میں مصروف ہیں، ان کا واعظ جو اچھے سے اچھا تعلیم یافتہ ہوتا ہے، نہایت فقیرانہ زندگی کے ساتھ ایک ایک گاؤں میں پھرتا ہے، چنے چبا کر بسر کر لیتا ہے، راتوں کو درخت کے نیچے سو رہتا ہے، لوؤں کی لپٹ میں سفر کرتا ہے۔

۲- دیہات اور قصبات میں پیہم اور لگاتار کوشش جاری رکھنا۔

اس کے مقابلہ میں ہمارے علما صرف شہروں پر اکتفا کرتے ہیں اور دیہات میں جاتے بھی ہیں تو ایک آدھ دن سے زیادہ قیام نہیں کر سکتے، اس لیے وہ کوئی پائدار اثر قائم نہیں کر سکتے۔

۳- آریہ واعظ اکثر انگریزی تعلیم یافتہ اور جدید علوم و فنون سے واقف ہوتے ہیں اور

ہمارے واعظ اکثر ان علوم سے واقف نہیں ہوتے۔

۴- آریوں نے اپنے مذہب کا مدار صرف وید پر رکھا ہے اور کہتے ہیں کہ وید کے معنی جو عام پنڈت بیان کرتے ہیں، وہ صحیح نہیں، بلکہ وہ صحیح ہیں جو سوامی دیانند نے بیان کیے ہیں اور چوں کہ مسلمان (ایک آدھ کے سوا) سنسکرت سے واقف نہیں، اس لیے وید کی صحت و غلطی کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے۔

اسباب مذکورۂ بالا کے لحاظ سے آریوں کے مقابلہ کے لیے اسباب ذیل کی ضرورت ہے:

۱- ایسے لوگ پیدا کیے جائیں جن میں ایثار نفسی، سادگی، جفاکشی اور جاں نثاری کے اوصاف ہوں۔

۲- اشاعت اسلام کا مستقل صیغہ قائم کیا جائے، تاکہ اضلاع میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں، مستقل واعظ مقرر کیے جائیں جو نومسلم دیہات میں جا کر ایک ایک دو دو مہینے رہ کر اسلامی احکام اور عقائد کی تعلیم دیں۔

۳- عربی خوانوں کے سنسکرت اور انگریزی کی اعلا درجہ تک تعلیم دی جائے۔

۴- اسی بنا پر ندوہ نے دارالعلوم میں انگریزی اور سنسکرت کی شاخیں کھولیں اور اشاعت اسلام کے مستقل صیغہ کے قائم کرنے کا انتظام کیا، جس کی عملی صورت چند دنوں کے بعد نمایاں ہوگی۔

ندوہ کا کام یہ ہے کہ دارالعلوم میں خاص مذہبی خدمات انجام دینے والوں کی ایک جماعت موسوم کرے، ان کو مذہبی وظائف دے، ان کو وقتاً فوقتاً ان اوصاف کے پیدا کرنے کی ترغیب دلائے، تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد ان کو ان کاموں میں لگائے، یہ تدبیریں ندوہ نے پیش نظر رکھ لی ہیں اور ان کو عمل میں لانا شروع کر دیا ہے، خدا اس کی کوششوں میں کامیابی دے۔

مولانا نے اپنے اسی خیال کے مطابق دارالعلوم میں بھاشا کی تعلیم کا ایک درجہ کھولا اور خدام الدین کے نام سے دارالعلوم کے طلبہ کا ایک گروہ الگ کیا، ۲۷ / مارچ ۱۹۱۰ء میں دلی کے اجلاس میں جب ندوہ ہی کو مرکزی مذہبی مجلس بنانے کی تجویز اور اشاعت اسلام کی تحریک منظور ہوگئی تو پھر پوری طاقت سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا، ملک کے اکابر کو اشاعت وحفاظت اسلام کی تدابیر کی طرف مائل کیا، اخبارات میں مضامین لکھے، نومسلموں کے حالات کی تفتیش و تحقیق کے لیے ایک انسپکٹر متعین کیا، وقف اولاد کے کام کرنے والے سفیروں کو حکم دیا کہ وہ اشاعت وحفاظت کے کام کو بھی اپنی نظر میں رکھیں، عام مجلس اشاعت اسلام کے قیام کی تجویز پیش کی اور ضروری مقامات پر خود اپنے دورہ کا ایک پروگرام بنایا، یہ زمانہ مئی جون کی سخت گرمیوں کا تھا

اور مولانا ایک مہینہ سے پیچش میں مبتلا تھے، اس کے باوجود شاہ جہاں پور اور رائے بریلی وغیرہ مقامات پر گئے، ۵؍مئی ۱۹۱۰ء کو شروانی صاحب کے نام لکھتے ہیں "اشاعت اسلام کے لیے مجھ کو ایک بار دورہ کرنا ہے، میں ایک مہینہ سے پیچش میں مبتلا ہوں...... اسی حالت میں رائے بریلی گیا اور وہاں جلسہ کر کے اس کی بنیاد ڈالی، چھینٹا پڑنے پر عام دورہ شروع ہو جائے گا بڑی دقت یہ ہے کہ دیہات میں جا کر تلقین اسلام کرنے والے واعظ نہیں ملتے، اس کا کیا علاج ہوگا؟ اشاعت اسلام کی کارروائی تمام تر اس پر موقوف ہے۔ (شروانی-۸۱)

۱۲؍جون ۱۹۱۰ء کو پھر انہیں لکھا "اشاعت اسلام کی بنیاد دو کاموں پر ہے، تقرر وعاظ، آمدنی مشاہرۂ وعاظ، واعظ حسب خواہش وضرورت نہیں ملتے اور ملیں تو کئی سو ماہوار کی آمدنی چاہیے، انہی دونوں باتوں کے متعلق میں نے یادداشت کے لیے لکھا تھا اس پر مکرر غور فرمایئے اور اپنی رائے قلمبند کر کے دیجیے کہ "کیوں کر" اور کس طریقہ سے یہ دونوں باتیں حاصل ہوں گی۔" (شروانی-۸۴)

یہ تو معلوم نہیں کہ مولانا شروانی صاحب نے اس کا جواب کیا دیا، مگر مولانا نے اس تجویز کا جو حل سوچا وہ یہ تھا کہ ائمہ اور مؤذنین کی تعلیم کے لیے اردو کا برس دو برس کا کوئی کورس بنایا جائے اور اردو خواں جوانوں کو قرآن پاک کے ساتھ اردو میں مسائل وعقائد کی سادہ تعلیم دے کر دیہاتوں میں مسجدوں میں پھیلا دیا جائے کہ یہ مسجدوں میں بچوں کی تعلیم کے لیے اپنے مکتب کھول لیں اور لوگوں کو اسلام کی تلقین کریں، مگر سرمایہ کے نہ ہونے سے یہ تجویز عمل میں نہ آ سکی۔

حالات نازک سے نازک تر ہوتے چلے جاتے تھے، ۲۷؍فروری ۱۹۱۲ء کو مولانا شروانی کو لکھا "نومسلموں کے متعلق نہایت کثرت سے خطوط آئے کہ اکثر جگہ مسجدوں کو گوبر سے لیپتے ہیں، نماز کا ذکر نہیں، میں نے انسپکٹر روانہ کر دیا ہے" (۹۷) اور ادھر مولانا نے مختلف کام شروع کر دیے تھے، وقف اولاد کی تحریک پورے شباب پر تھی، اس کے کام کا سارا بوجھ اکیلے مولانا کے کندھوں پر تھا، تصحیح اغلاط کے کام کی نگرانی سیرت نبوی ﷺ کی تصنیف کا خیال جس کو خود اشاعت اسلام نے پیدا کیا تھا، خدام الدین کی تربیت، اشاعت اسلام کے لیے دورے، جرجی زیدان کی تمدن اسلامی کی تردید، اردو ورنیکلر اسکیم کی مخالفت سید رضا مصری کی آمد کی تیاری اور لکھنؤ میں ندوہ کے آیندہ جلسہ کی تدبیر لیکن اس زمانہ میں ان سب میں اشاعت اسلام ہی کا خیال تھا، جو ہر طرح سے ان پر چھایا ہوا تھا اور اسی کے لیے یہ سب کچھ تھا، ندوہ کے اجلاس دہلی نے ندوہ میں اشاعت وحفاظت کا کام تو منظور کر دیا، مگر یہ طے نہ کیا

کہ کام کون کرے، ندوہ کی مجلس اشاعت کے سکریٹری مولانا شاہ سلیمان صاحب تھے، مولانا ان کے اختیارات میں دخل دینا نہیں چاہتے تھے اور دخل دیے بغیر کام نہیں چلتا تھا، یہ ادھیڑ بن الگ تھا، ۱۰ مارچ ۱۹۱۲ء کو اپنے محرم اسرار مولانا شروانی کو لکھتے ہیں ''سیرۃ نبوی ﷺ کا کام واقعی بڑے پھیلاؤ کا ہے، ادھر اشاعت اسلام کی یہ حالت ہے کہ بیسیوں خطوط اور رپورٹیں آرہی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں نومسلم ارتداد کے خطرہ میں ہیں، آریوں کی مقامی کمیٹیاں جابجا دیہات میں قائم ہوتی جاتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے، کہاں کہاں واعظ مقرر کیے جائیں، کہاں کہاں مکتب قائم ہوں، یہ تو سلطنت کا کام ہے۔''

آج ایک اپیل بھیجتا ہوں، کاغذات جلسہ (مجوزہ اجلاس لکھنؤ) میں پیش کروں گا، کلکتہ میں ایک انجمن سے کام لیا اور نواب ڈھاکہ کو راضی کیا کہ وہ انجمن اشاعت اسلام کے پریسیڈنٹ ہوں، لطف یہ ہے کہ ادھر شاہ سلیمان صاحب نہ کچھ کرتے ہیں نہ مجھ کو اجازت دیتے ہیں کہ ''میں باقاعدہ کام کروں، مجبور ہو کر ندوہ کے دائرہ سے نکل کر کام کرنا پڑے گا۔'' (شروانی-۹۷)

مولانا نے اس تجویز پر ۱۹۱۲ء کے آغازِ سال ہی میں عمل شروع کردیا تھا، یعنی ندوہ کے دائرہ سے الگ ہو کر ایک عام مجلس اشاعت وحفاظت کی بنیاد ڈالی اور خاکسار کو اس مجلس کا شریک ناظم بنا کر ہر قسم کی دفتری کارروائیوں کی ذمہ داری عنایت فرمائی، سفر وحضر دونوں میں برابر کام کے متعلق ہدایات کرتے رہتے، جنوری ۱۹۱۲ء میں نومسلموں کی مردم شماری اور ان کی موجودہ کیفیت کی ایک رپورٹ تیار کرنے کا خیال پیدا ہوا، اس بنا پر نومسلموں کی مردم شماری یعنی ان کی کہاں کہاں آبادیاں ہیں اور جہاں ان کی آبادی ہے، اس کی تعداد کیا ہے؟ اور ان کی موجودہ حالت کیا ہے؟ ان تمام معلومات کو حاصل کرنے کے لیے اخبارات میں ایک اطلاع بھیجی گئی، ۲۸ رجنوری ۱۹۱۲ء کو مجھے لکھتے ہیں ''نوٹس مردم شماری نومسلمان ''زمین دار'' میں ضرور بھیجنا اور اخباروں میں تو میں نے دیکھا۔'' (سلیمان-۳۵)

۱۳ رفروری ۱۹۱۲ء کو ایک رجسٹر پر اپنے ہاتھ سے حسب ذیل نقشہ بنایا جس کی خانہ پری مطلوب تھی۔

نمبر شمار	نام، مقام، معہ پرگنہ وتحصیل و ضلع	نام قوم ومردم شماری وپیشہ	وضع ولباس ورسم	کس بنا پر اپنے کو مسلمان کہتے ہیں؟	کوئی مسجد یا مدرسہ ہے؟ کیا مسجد یا مدرسہ کی تعمیر پر راغب ہو سکتے ہیں؟	کیا گوشت کھاتے ہیں؟ ذبح کون کرتا ہے اور کیوں کر؟	قرآن شریف وہاں موجود ہیں یا نہیں؟ قرآن کے ساتھ ان کی تعظیم وتکریم کیسی ہے؟	کون سی بات اسلام کی ان میں پائی جاتی ہے؟ اور ان کو کیوں کر اسلام کے احکام کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے؟

اس نقشہ کو لے کر سفرا نے بدایوں، بیاور، اجمیر، جے پور، جودھ پور، کشن گڑھ، الور، باندی کوئی اور ریواڑی وغیرہ کے قصبات اور دیہات میں دورہ کیا اور مطلوبہ مواد فراہم کیا، جو اس وقت تک دار المصنفین میں موجود ہے، حسن شاہ صاحب جو ایک سادہ مزاج متدین اور متقی بزرگ تھے وہ مقرر کیے گئے کہ دیہاتوں میں جا کر نومسلمان میں احکام اسلام کی تلقین کریں، ان کو ایک رجسٹر بنا کر دیا، جس میں اپنے قلم سے حسب ذیل مدیں لکھیں:

تاریخ و وقت روانگی	مدت سفر و ذریعہ سفر	جائے قیام	مقام تحقیقات	تعداد مردم شماری وقومیں و پیشہ	مختصر تحقیقات و کیفیت

ایک علاحدہ اشتہار اور خطوط کے مسودے لکھے اور مجھے حکم دیا کہ ان کو چھپوا کر ملک کے اہل الرائے کی خدمت میں بھیجوں اور ان سے اعانت اور ہمدردی کی خواہش کروں، چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی اور اعلانات و اشتہارات اور خطوط روانہ کیے گئے، یکم مارچ ۱۹۱۲ء کو وہ الہ آباد ہو کر وقف اولاد کے سلسلہ میں کلکتہ جا رہے تھے، اس لیے میرے لیے حسب ذیل ہدایات لکھیں" میں نے نومسلموں کی ایک مسل بنوائی ہے، کاتب سے لے کر ان لوگوں کے نام اور ایڈریس لکھ لو، جن لوگوں نے نومسلموں کے متعلق خطوط بھیجے ہیں، نومسلموں کے متعلق ایک اپیل جلی خط میں عبدالولی[1] صاحب کے یہاں چھپوایا ہے لیکن ابھی ان ہی کے یہاں ہے، وہ منگوا کر ان اشخاص کے نام ایک ایک دو دو پرچے بھیج دو، ایک خط کا مسودہ کاتب کو دے آیا ہوں، ہر اپیل کے ساتھ وہ خط بھی بھیج دو۔

(۲) اپیل مذکورۂ بالا کی سو کاپیاں میرے پاس اس پتہ سے بھیج دو" شبلی مکلاوڈ اسٹریٹ نمبر ۱۳ کلکتہ۔" (سلیمان-۳۷)

اوپر کی سطروں میں جس اپیل کا ذکر ہے اس کا عنوان ہے، "نومسلموں کو دوبارہ ہندو ہو جانے سے بچانے کے لیے تمام برادرانِ اسلام کی خدمت میں فریاد" یہ اپیل اخبارات میں چھپا (اور اب سلسلۂ مقالات جلد ششم میں شامل ہے) اس میں مولانا نے حسب ذیل تدابیر کا ذکر کیا تھا:

(۱) اس قسم کے واعظ مقرر کیے جائیں جو دو دو چار چار مہینے ایک ایک گاؤں میں رہ کر لوگوں کو اسلام کے احکام سکھائیں، اس قسم کے واعظوں کے تیار کرنے کا خاص انتظام ہونا چاہیے۔

---

[1] مالک اصح المطابع محمود نگر لکھنؤ۔

(۲) دو دو چار چار گاؤں کے بیچ میں ابتدائی مدرسے قائم کیے جائیں، جن میں قرآن شریف اور اردو کی تعلیم دی جائے۔

(۳) صوفی وضع لوگ بھیجے جائیں، جن کا اثر عوام پر خود بخود پڑتا ہے۔

(۴) مسلمانوں کے دیہات میں جو سرکاری ابتدائی مدرسے ہیں، کوشش کی جائے کہ ان کے مدرسین مسلمان مقرر ہوں، اب تک اکثر ہندو مدرس مقرر ہوئے ہیں اور اس لیے بچوں کو اسلام کی طرف رغبت نہیں ہو سکتی، غرض یہ ایک نہایت اہم مذہبی اور قومی مسئلہ ہے، اس کو نہایت غور و فکر اور جد و جہد سے حل کرنا چاہیے، اگر مسلمان ایسے خطرہ کی پروا نہیں کرتے تو ان کو اسلام کا نام نہیں لینا چاہیے۔''

حفاظت و اشاعت اسلام کے عنوان سے ایک مجلس کی بنیاد کی تجویز پیش کی اور اس کا ایک مختصر خاکہ تیار کیا جو مقالات میں شامل ہے۔

۳/ مارچ ۱۹۱۲ء کو کلکتہ پہنچ کر لکھا کہ ''یہاں دو تین روز رہ کر اشاعت کا کام شروع کرا دیتا ہوں'' (سلیمان-۳۸) یہاں ایک انجمن کو یہ کام سپرد کیا اور جناب نواب خواجہ سلیم اللہ صاحب نواب ڈھاکہ کو جو ان دنوں بنگال کے مسلم لیڈر تھے، اس بات پر راضی کیا کہ وہ مجوزہ مجلس اشاعت اسلام کی صدارت قبول کریں، (شروانی-۹۷) اجلاس لکھنؤ کے بعد جو شروع اپریل میں ہو رہا تھا، وہ ملک میں دورہ پر آمادہ ہو رہے تھے، ۱۸/ مارچ ۱۹۱۲ء کو شروانی صاحب کو لکھا ''ہاں! کام بہت ہیں لیکن میں اشاعت کے کام کو سب پر مقدم رکھوں گا، قطعی طور سے معلوم ہوا کہ راج پوت خاندان مرتد ہوتے جاتے ہیں، آریوں کی مقامی انجمنیں چپکے چپکے کام کر رہی ہیں، ذرا دقت یہ ہے کہ جلسہ کے بعد ہی میرا دورہ شروع ہونا چاہیے، لیکن موسم ناقابل برداشت شروع ہو جائے گا، اس لیے دو مہینوں کا وقفہ ہو جائے گا، جو مضر ہوگا۔ (شروانی-۹۹)

جو خطوط اور اپیل لوگوں کو بھیجے گئے تھے، ان کے حوصلہ افزا جوابات آئے، ۲۴/ مارچ ۱۹۱۲ء کو مولانا شروانی صاحب کو لکھا ''جلسہ انشاء اللہ نہ صرف بارونق بلکہ مہمات امور کے اجرا کا پیش خیمہ ہوگا، لیکن شرط یہ ہے کہ آپ تین روز پہلے آ جائیں، اشاعت اسلام کا بہت اچھا اثر ملک میں پھیل رہا ہے، لوگ خط و کتابت کر رہے ہیں، صرف اتنی بات ہے کہ شاہ صاحب وغیرہ اس کام کو کرنے دیں، یہ اس وقت ہوگا کہ آپ آ جائیں، آپ کا توسط سب مشکلات کو حل کر دے گا۔''

چنانچہ مولانا شروانی تشریف لائے اور مولانا کی دعوت پر بہت سے اہل الرائے حضرات

۶، ۷، ۸/ اپریل ۱۹۱۲ء (۱۷، ۱۸، ۱۹/ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ) کے اجلاس لکھنؤ میں شریک ہوئے۔

اجلاس کی اخیر تاریخ میں یعنی ۱۹/ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ مطابق ۸/ اپریل ۱۹۱۲ء کی صبح کو جب دارالعلوم کا ہال حال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، مولانا ایک خاص کیفیت میں اشاعت و حفاظت اسلام کی تدابیر پر تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور تقریر کا آغاز اس تمہید سے فرمایا "حضرات! میں نے اسلام کی تاریخ جہاں تک مجھ سے ہوسکا، نہایت غور وفکر کے ساتھ پڑھی ہے، میں تیرہ سو برس کی وسیع مدت کا ایک حد تک واقف کار ہوں کہ تمام ممالک اسلامیہ میں مسلمانوں کی حالتیں مختلف زمانوں میں، مختلف سلطنتوں میں، مختلف دوروں میں کیا رہی ہیں، مگر آپ کے سامنے میں صحیح شہادت دیتا ہوں کہ مجھ کو نہیں معلوم ہے کہ "مسلمانوں پر کوئی وقت اور کوئی زمانہ آج سے زیادہ مشکل، زیادہ شاق اور زیادہ تباہ کنندہ گزرا ہے۔"

پھر مسلمانوں کی اس تباہی کا ذکر کر کے جو تاتاریوں کے ہاتھوں چھٹی صدی ہجری میں ہوئی، فرمایا کہ اسلامی تاریخ میں مسلمانوں کی تباہی کا سب سے بڑا واقعہ ہے، مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں پر ہر طرف سے جو تباہی آرہی ہے اس سے اس کا کوئی جوڑ ہی نہیں، وہ تباہی یک طرفہ تھی، یعنی صرف جان و مال کا نقصان ہوا، مگر آج جو تباہی ہے وہ ہمارے مذہب پر ہے، اخلاق پر ہے، تمدن پر ہے، اس سلسلہ میں فرمایا "لیکن حضرات! جیسا آج کل کئی مہینوں کی خط وکتابت سے معلوم ہوا، اشتہارات دینے کے بعد جو تحریرات جا بجا سے آئی ہیں اور جو کیفیتیں محقق طور سے معلوم ہوئیں جو ایجنٹ اور سفیروں کو بھیج کر دریافت کی گئیں، خاص ایک شخص حسن شاہ مقرر کر کے بھیجے گئے، انہوں نے بہت سے مقامات میں جا کر خود دیکھا تو ایسی حیرت انگیز باتیں معلوم ہوئی ہیں جن کی بنا پر میں نہیں سمجھتا کہ اگر تمام مسلمان قوت متفقہ کے ساتھ متحد نہ ہوں گے تو کیا ہونا ہے۔"

پھر تفصیل کے ساتھ آریوں کی مخفی کوششوں، گروکل کی کیفیت اور مسلمانوں کی بے پروائی کی داستان بیان فرمائی، پھر صحابۂ کرام، ائمۂ عظام اور صوفیہ اور خصوصاً حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کی مخلصانہ خدمات کا تذکرہ کر کے فرمایا کہ "ہم میں پھر اخلاص و ایثار کا وہی جذبہ پیدا ہو کہ ہم کفنی پہن کر صحرا بہ صحرا اسلام کا پیغام لے کر پھیلیں اور لوگوں کو ہدایت کی راہ دکھائیں، ایسے علما پیدا کریں جو انگریزی، بھاکا اور علوم جدیدہ سے واقف ہوں ہر اس زمانہ کی دہریت اور الحاد کا توڑ کریں، آخر میں فرمایا "سردست دو تدبیریں نظر آتی ہیں، ایک یہ کہ دیہات میں نومسلموں کے لیے چھوٹے چھوٹے

مکاتب قائم کیے جائیں، پانچ چھ، سات گاؤں کا ایک حلقہ قرار دے کر ایک صدر مقام جہاں سے آدھ آدھ کوس کے فاصلہ پر دیہات ہوں وہاں ایک بڑا مکتب ہو جس میں نہ آپ کا یہ فلسفہ یونانی ہو اور نہ انگریزی کا ایک لفظ ہو، بلکہ صرف قرآن شریف کا متن اور اردو اتنی کہ جس سے بعض مسائل عبادت نماز روزہ اور وہ بھی نہایت آسان آسان ان کو پڑھائے جائیں اور زور دے کر فرمایا کہ اردو میں نہیں بلکہ یہ رسائل ناگری ہی میں چھپوائے جائیں، تاکہ آسانی سے وہ اس کو سیکھ کر پڑھ سکیں۔

دوسری تدبیر یہ بیان کی کہ ایسے معمولی خواندہ مسلمانوں کو جو اردو پڑھ لیتے ہوں، ان کے لیے ایک ٹریننگ کلاس ندوہ یا الٰہیات کان پور میں کھول دیا جائے اور ان کو وظیفہ دے کر ایک سال وہاں پڑھایا جائے، اس کے بعد ان کو ان دیہاتوں میں تعلیم و تلقین کے لیے پھیلا دیا جائے کہ دو دو تین تین مہینے ایک گاؤں میں رہ کر مسلمانوں کو مسلمان بنائیں،" آخر میں فرمایا "میں فوری جوش کا قائل نہیں، آپ گھروں پر جا کر غور کریں اور سوچیں اور اس کے بعد اپنے دل میں اثر پائیں تو اسلام کی خدمت کے لیے آمادہ ہو جائیں۔"

مولانا کی یہ تقریر بڑی پر اثر تھی، ندوہ کی روداد کے یہ الفاظ ہیں:

مولانا ممدوح کی یہ تقریر جس کا لفظ لفظ اثر میں ڈوبا ہوا تھا، حاضرین کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی اور ان کی اندرونی تاثیر کو امداد کی صورت میں ظاہر کر رہی تھی۔

دن کو یہ تقریر ہوئی اور ساتھ خواجہ کمال الدین صاحب لاہوری اور مولوی ابوالکمال عبدالودود صاحب بریلوی کی تائیدی تقریریں بھی ہوئیں، اس کے بعد رات کے جلسہ میں جب ان تقریروں کی تاثیر کی جستجو کی گئی تو ڈیڑھ سو مسلمانوں نے آگے بڑھ کر اپنے نام لکھائے، جو اس کام میں ہر طرح کی امداد کے لیے آمادہ تھے۔

مولانا یہ چاہتے تھے کہ اشاعت کے کام تمام فرقے مل کر کریں، اسی لیے مرزا بشیر الدین محمود جو اب خلیفہ قادیان ہیں اور خواجہ کمال الدین صاحب تک کی شرکت سے انکار نہیں کیا گیا، اس پر اسی جلسہ کے دوران میں مولانا پر یہ الزام رکھا گیا کہ انہوں نے قادیانیوں کو جلسہ میں کیوں شریک کیا اور ان کو تقریر کی اجازت کیوں دی، مگر مولانا شروانی کی ثالثی سے یہ بلا ٹلی، جلسہ کے بعد ہی اضلاع کے دورہ کا خیال تھا، اس کا آغاز کان پور سے کیا، ۱۷ اپریل ۱۹۱۲ء کو وہ کان پور روانہ ہوئے، منشی محمد امین کو لکھتے ہیں، میں آج کان پور روانہ ہوتا ہوں، نومسلموں پر آریہ جو جال ڈال رہے ہیں، وہ سخت خطرناک درجہ

تک پہنچ گیا ہے، اس غرض سے تمام اضلاع میں وفائی انجمنیں اور دیہات میں مکاتب قائم کرنا مقصود ہے، چوں کہ گرمی سخت ہو رہی ہے، اس لیے یہ دورہ مختصر ہوگا۔ (امین-۷)

مئی ۱۹۱۲ء میں گرمیوں کے ڈر اور سیرت کے خیال سے یکسوئی اور تنہائی کی تلاش میں بمبئی روانہ ہو گئے اور مجھے سیرت کے کام کے سلسلہ میں رفاقت کا شرف بخشا۔ (امین-۹، ۱۰) تین چار مہینے وہاں رہے اور سیرت کی پہلی جلد تعمیر کعبہ تک ختم کی، مجھے یہ ہدایت ہوئی کہ ابن اسحاق، ابن سعد اور طبری کے رجال چھانٹ کر الگ کروں، چوں کہ عام طور سے ان کے رجال نہیں ملتے اس لیے بڑی دقت سے میں نے رجال ابن اسحاق، رجال ابن سعد اور رجال طبری پر الگ الگ رسالے پیش کیے۔ (شروانی-۲۰)

برسات کے بعد بمبئی سے واپسی ہوئی، مجھے ارشاد ہوا کہ میں بمبئی سے بی بی سی آئی ریلوے سے گجرات اور بڑودہ وغیرہ کا دورہ کر کے مسلمانوں کی عام مذہبی کیفیت کا اندازہ کروں، چنانچہ اس پروگرام کے مطابق گجرات، بڑودہ اور اجمیر تک کا سفر کیا اور وہاں کے اکابر سے مل کر اشاعت وحفاظت اسلام کے مسئلہ پر تبادلۂ خیال کیا اور آخر آگرہ ہو کر لکھنؤ پہنچا، واپسی کے بعد مولانا نے یہ طے کیا کہ وہ اشاعت کا کام ندوہ سے بالکل الگ ہو کر کریں، مجھ سے فرمایا کہ جن لوگوں نے جلسہ سالانہ میں امداد کا وعدہ کیا تھا اور دوسرے ہمدرد حضرات کے نام ایک مطبوعہ خط بھیجوں اور ان سے مجلس اشاعت وحفاظت اسلام کی رکنیت کی خواہش کروں اور ہر رکن سے دو روپے سال کے چندہ کا وعدہ لوں، اس تجویز کے مطابق میں نے پانچ سو اصحاب کے نام یہ خطوط بھیجے اور ان کے جوابات آئے۔

۲۰ر جنوری ۱۹۱۳ء کو مجھے الہ آباد سے لکھتے ہیں" اشاعت کے جوابات آرہے ہیں، میری دانست میں خط ملفوف اور اس کے ساتھ مطبوعہ کاغذات کے پمفلٹ بھیجو، چند لوگوں نے استحسان اور ممبری قبول کی ہے۔" "بہ از دیا دِ رقم ممبری"

لکھنؤ کے پچھلے اجلاس میں اردو خواں معلموں کی جو تجویز پیش کی تھی، اس سلسلہ میں فرمایا

"دس روپے ماہوار پر مسلم گزٹ میں ایسے ابتدائی معلموں کے لیے اشتہار دے دو جو دیہات میں جا کر اردو کی ابتدائی کتابیں اور قرآن مجید پڑھا سکیں۔"

میں نے چاہا کہ صیغۂ اشاعت اسلام الگ قائم کر کے اس کی طرف سے اعلان ہو، مولانا نے اس کو ابھی پسند نہیں کیا، فرمایا "صیغۂ اشاعت اسلام کے نام کی ابھی ضرورت نہیں، آریہ بھڑکیں گے،

صرف میرا نام لکھ دو۔'' (سلیمان-۳۹)

میں نے پھر اپنے خیالات لکھ بھیجے اور عرض کی کہ اشاعت وحفاظت کے کام کو بڑے پیمانہ پر شروع کرنا چاہیے اور اسی کے مطابق ایک یادداشت لکھ کر الہ آباد بھیجی، ۲۳ر جنوری ۱۹۱۳ء کو جواب آیا، خط پہنچا، آپ کے پروگرام کے ابتدائی حصہ سے میں سردست متفق نہیں، اسی لیے پہلے پروگرام کو آپ کی رایوں کے انضمام کے ساتھ بھیجتا ہوں، بڑے بڑے امرا ابھی شریک نہیں ہوں گے، بلکہ ایسے بڑے پروگرام سے بھڑکیں گے، ان سے استفسار کرنا اور ناکام یاب ہونا دل شکستہ کردے گا، اس لیے ابھی بہت اونچا نہ دیکھیے، اگر مارچ میں اس کا کہیں اجلاس ہوتا تو رستہ نکلتا، غلام حسین عارف کو خاص طرح پر لکھنا چاہیے، شاید کلکتہ میں انتظام ہو سکے۔''

میں نے عرض کیا تھا کہ اشاعت وحفاظت کا کام اگر آپ کے بہ جائے اور ممبروں کے نام سے چلایا جائے تو شاید دوسرے ارکان کے رشک وحسد کی آگ نہ بھڑکے اور کام چل نکلے، اس پر اسی خط میں لکھا: ''لکھتے ہو کہ لوگ میرے نام کی تکرار سے گھبرا گئے، بھائی یہ کاغذات دو برس کے چھپے پڑے ہیں، بیسیوں ضروری فرائض آنکھ سے دیکھتا ہوں اور زبان سے ہر وقت ہائے ہائے پکارتا ہوں، اسی اشاعت کے متعلق ''الہلال'' میں خط تک چھپوا دیا، جب کوئی نہ کرے تو کیا کروں، واللہ اب نام ونمود اور افسری کا شوق نہیں، کوئی کرے، اس کے ساتھ ہوں اور پیرو بن سکتا ہوں۔'' (سلیمان-۴۰)

اشاعت فنڈ میں روپیہ نہ تھا، اس لیے اجازت دی کہ جمعہ فنڈ سے قرض لے کر کام شروع کروں، پھر لکھا: ''کلکتہ، پٹنہ، رام پور، میں اشاعت کے کاغذات کیا کم گئے؟ پرنس ارکاٹ کو انگریزی خط لکھوا کر اس کے ساتھ کاغذات بھیجو، غلام احمد خاں کو خاص طور پر لکھو، خود اپنے دستخط سے بھیجو اور جوائنٹ سکریٹری اشاعت اپنا نام لکھو...... اشاعت اسلام کو حک واصلاح کے بعد بھیجتا ہوں، دو ہزار یا زیادہ چھپوالو اور بڑا خط بھی۔''

پانچ سو کے انداز میں یہ کاغذات ملک کے اکابر کے نام بھیجے گئے، مگر ۶ر فروری ۱۹۱۳ء تک صرف بیس پچیس اصحاب کے جواب آئے، یہ صورت دیکھ کر مولانا نے مجھے لکھا ''برادرم! دیکھا پانچ سو اشتہارات اور کل پچیس جواب، ان ہی باتوں کو میں دیکھ رہا تھا، خیر اب تو پیچھے ہٹنا نہیں ہے، زنہار اس رسید ہی سے کام نہ لو (ندوہ کی پرانی چھپی ہوئی رسیدوں سے) ورنہ شاہ سلیمان اور مولوی خلیل الرحمن

صاحب فوراً آ کر ہاتھ پکڑیں گے اور کچھ کرنے نہ دیں گے، ندوہ سے بالکل آزاد رہنا چاہیے، ایک موتمر دینی عمومی کا مسودہ لکھ کر چھپنے کو دے دیا جائے، وہ اصل اسکیم ہے، جس پر چلنا چاہیے، آ جائے تو بھیج دوں، آج جن لوگوں کے جواب قبول ممبری کے آئے ہیں، حسب ذیل ہیں:

اس تجویز پر عمل کا وقت آیا ہی تھا کہ مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی کا قضیۂ نامرضیہ پیش آیا، خاکسار دل برداشتہ ہو کر وطن چلا آیا اور وہاں سے ''الہلال'' کلکتہ کے اسٹاف میں شامل ہو گیا اور مولانا بیمار اور پراگندہ خاطر ہو کر مولوی عبدالسلام صاحب اور سیرت کو لے کر بمبئی روانہ ہو گئے اور دو چار ماہ کے غور و فکر کے بعد جولائی ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے مستعفی ہو کر سبک دوش ہو گئے اور کام کی ساری تجویزیں درہم ہو کر رہ گئیں۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خدام الدین ۱۹۱۲ء مولانا نے اشاعت اسلام کا کام شروع کیا تو ان کو نظر آیا کہ جب تک مبلغین اسلام کی ایک ایسی جماعت نہ تیار کی جائے جو مذہبی تعلیم کے ساتھ سادہ مذہبی زندگی بسر کرے، اس میں ایثار، قناعت اور جفاکشی کا مادہ ہو، اس وقت آریوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، اس وقت آریہ مبلغوں کا سب سے بڑا مرکز گروکل تھا، گروکل کے حالات اخباروں میں پڑھ کر اور جانے والوں سے زبانی سن کر وہ بہت بے تاب تھے کہ اس کے مقابلہ کے لیے ایک جماعت مسلمانوں میں بھی ہو۔

اعظم گڑھ کے ضلع میں ایک قصبہ سرائے میر ہے، مولانا کی برادری کے لوگوں نے عربی کا ایک مدرسہ نیا نیا قائم کیا تھا جس میں زیادہ تر اسی ضلع کے دیہاتی لڑکے عربی تعلیم حاصل کر رہے تھے، چوں کہ یہ مدرسہ بالکل مولانا کے زیر اثر تھا اور ان دیہاتی بچوں میں نہایت آسانی کے ساتھ یہ تمام اوصاف پیدا کیے جا سکتے تھے، یعنی یہ کہ وہ سادہ زندگی بسر کریں اور مسلمانوں کے دیہاتوں میں سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ سفر کریں اور تبلیغ کا کام انجام دیں، اس لیے مولانا نے اس مقصد کے لیے اس مدرسہ کو خاص طور پر پیش نظر رکھا، چنانچہ ۲۹/اپریل ۱۹۱۰ء کو مولانا حمیدالدین صاحب مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں ''کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو؟ میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے۔''

اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو۔ (حمید-۵)

مدرسۂ سرائے میر کی نسبت تو ابھی خیال ہی تھا کہ مولانا نے خود دارالعلوم میں ایک جماعت

کی بنیاد ڈال دی اور اس کا نام خدام الدین رکھا جو طلبہ اس کام کے لیے تیار ہوئے تھے، ان کے والدین کو لکھ کر ان کی رضامندی منگوائی، پھر طلبہ کو اس میں داخل کیا، ان کے لیے سادہ کھانا، سادہ پہننا، سادہ رہنا، زمین پر سونا، احکام اسلام کی پوری پابندی اور تقویٰ اور قناعت ان کی زندگی کا اصول بنایا گیا، اس زمانہ میں خود مولانا پر بھی یہی اثر تھا اور یہ اخیر زندگی تک رہا۔

مولوی حمید الدین صاحب کو ۸/فروری ۱۹۱۲ء کو یہ خوشخبری سناتے ہیں "میں نے خدا کا نام لے کر خدام الدین کی جماعت قائم کردی، الگ مکان لے دیا ہے اور الگ تربیت ہے، قریباً ایک ماہ ہوا اب تک امید افزا آثار ہیں، احکام اسلام کی پابندی میں شغف اور مستعدی پائی جاتی ہے، ابھی تک سات لڑکے عہد و پیمان کے ساتھ خود اپنی مرضی سے داخل ہوئے ہیں، یہ دیہات وغیرہ میں اشاعت اسلام کے کام بھی آئیں گے اور جو کام ان کو بتایا جائے گا۔" (حمید-۵۵)

ان سات طالب علموں میں سے ایک طالب علم مولوی عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم تھے، انہوں واقعہ یہ ہے کہ بچپن میں مولانا کے ہاتھ پر جو عہد کیا تھا اس کو اخیر تک نباہا، افسوس ہے کہ جوانی ہی میں وہ دنیا سے رخصت ہوگئے، اگر وہ زندہ ہوتے تو مولانا کے حسن انتخاب کا زندہ پیکر ہوتے۔

جنوری ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے الگ ہونے کے بعد جب مولانا نے اعظم گڑھ کو اپنا دائرۂ عمل قرار دیا اور نیشنل اسکول اور مدرسہ سرائے میر میں سے پہلے کو تمام قوم کی دنیوی اور دوسرے کو دینی تعلیم کا مرکز بنانا اور اسی میں اس خدام دین کی جماعت کا انتظام کرنا چاہا، چنانچہ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کو ۲۳/اکتوبر ۱۹۱۳ء کو ایک خط میں لکھا "مدرسہ اپنی آمدنی سے چل رہا ہے، بحث یہ ہے کہ ہماری قومی قوت سرائے میر پر صرف ہو یا اعظم گڑھ پر، دونوں کے برداشت کے قابل قوم نہیں ہے، کم سے کم یہ کہ دونوں کی جداگانہ پوزیشن قائم ہونی چاہیے اور ان کا باہمی تعلق۔

کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کو مرکز بنا کر اسی کو دین و دنیا دونوں تعلیم کا مرکز بنایا جائے، یہیں خدام دین بھی تیار ہوں، مذہبی اعلیٰ تعلیم بھی دلائی جائے، گویا گروکل ہو، تم اپنی رائے لکھو، ندوہ میں لوگ کام کرنے نہیں دیتے تو اور کوئی دائرۂ عمل بنانا چاہیے، ہم سب کو وہیں بودوباش رکھنی چاہیے، ایک معقول کتب خانہ بھی وہاں جمع ہونا چاہیے، اگر تم یہ عزم جزم آمادہ ہو تو میں موجود ہوں۔" (حمید-۶۷)

بہرحال ابھی یہ تجویز خواب و خیال میں تھی کہ مولانا نے اس کے ایک سال کے بعد آنکھیں

بند کرلیں، مولانا کی یہ تجویز حقیقت میں بڑی اہمیت کی چیز تھی اور ان کی نکتہ رس نظر بہت دور پہنچی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی حقیقی کامیابی کے لیے خود بانی کی زندگی اور نقطۂ نظر میں جو اصلی تبدیلی چاہیے تھی وہ ہنوز پوری طرح پیدا نہیں ہوئی تھی، اس کے لیے وقت درکار تھا، اس کے لیے گردوکل پر جذبۂ رشک سے ہٹ کر خود صحابہ کرام ﷺ اور اپنے بزرگانِ دین اور ائمہ ہدیٰ کی نظیریں سامنے ذہنی چاہیے تھیں، مولانا نے اشاعت و تبلیغ اسلام کے کاموں میں جتنی کوششیں بھی فرمائیں، ان کی تہ میں یہ کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہتی، اگر مولانا کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو ان کے دل میں اخیر میں جو تخم پیدا ہو چکا تھا، وہ یقیناً ایک دن بار آور ہوتا۔

جرجی زیدان کی تمدن اسلامی کا رد، اگست و ستمبر ۱۹۱۱ء مصر میں شام کا ایک عیسائی مؤرخ وادیب جرجی زیدان نام تھا جس کا رسالہ الہلال ان دنوں بہت مشہور تھا، یہ عربوں کے علوم وفنون اور اسلامی تاریخ پر مضامین اور کتابیں لکھا کرتا تھا، اس کے کئی تاریخی ناول ہیں جن میں کسی نہ کسی اسلامی عہد کی تاریخ کی تصویر کھینچی ہے، اس کی سب سے مشہور کتاب تمدن اسلامی کی تاریخ ہے جو اس نے عربی میں پانچ جلدوں میں لکھی ہے، یہ تاریخ تمدن اسلامی مستشرقوں میں اس قدر مقبول ہوئی کہ پروفیسر مارگولیتھ (آکسفورڈ یونیورسٹی) نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا (اور بعض صاحبوں نے اس کا اردو میں بھی ترجمہ کیا ہے۔)

مصنف چوں کہ عیسائی تھا، اس لیے اس نے اپنے قلم سے اس میں اسلامی تمدن کی صورت بگاڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، مگر ایسے اسلوب سے اس کو دکھایا ہے کہ بہ ظاہر وہ حسن نظر آتا ہے، لیکن درحقیقت اس میں کوئی نہ کوئی عیب چینی ہوتی ہے۔

جرجی زیدان سے مولانا کے پرانے تعلقات تھے، خط و کتابت تھی، الہلال میں ان کے مضمون نکلتے تھے، مگر اس کے باوجود مولانا اس کی اس کتاب کی حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھانے کے لیے وقت کے منتظر تھے، اس اثنا میں برلن سے ایک مصری فاضل ڈاکٹر محمود لبیب کا خط ۱۹۰۸ء میں مولانا کے نام آیا جس میں مولانا سے اسلامی آلات پر ایک رسالہ کی نسبت سوال تھا، مولانا نے بہت دن ہوئے وہ رسالہ اڈیٹر الہلال کے پاس مصر بھیج دیا تھا، مولانا نے ان کو جرجی زیدان کے نام ایک رقعہ لکھ کر بھیج دیا، جس میں لکھا تھا کہ اس رسالہ کو وہ ڈاکٹر صاحب کے حوالہ کردیں، اسی تقریب سے

مولانا نے اس خط میں جرجی زیدان کی ابلہ فریبیوں اور دسیسہ کاریوں پر بھی کچھ سطریں لکھی تھیں، ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں برلن سے ۱۱راگست ۱۹۰۸ء کو ایک طویل خط لکھا جس میں مولانا کی تائید کی تھی اور اس کی تصنیفات کا راز فاش کیا تھا، یہ خط مزید تحریک کا باعث ہوا لیکن اس وقت مولانا کو فرصت نہ تھی، اس لیے مجھے اشارہ ہوا اور میں نے ایک مختصر مضمون جرجی زیدان کی تصنیفات کی غرض و غایت اور قدر و قیمت پر لکھا، جو اکتوبر ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں شایع ہوا، پھر اگست ۱۹۱۰ء کے الندوہ میں اس کی تمدن اسلامی کے اس باب کا جو کتب خانہ اسکندریہ پر ہے اور جس میں اس نے مولانا کے کتب خانہ اسکندریہ کے دلائل کا رد کیا ہے، جواب لکھا لیکن ۱۹۱۱ء میں چند واقعے ایسے پیش آئے کہ مولانا کو باوجود قلت فرصت اس کی کتاب پر مستقل طور سے ایک نہایت سخت اور مبسوط تنقید بلکہ تردید لکھنی پڑی۔

پہلا واقعہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر یوسف ہارویز کی تجویز سے اس عربی کتاب کا کچھ حصہ ہمارے صوبہ کے مولوی فاضل کے امتحان[1] میں رکھا جانے لگا، دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ مارگولیوس نے اس کتاب کا جب انگریزی میں ترجمہ کیا تو اسی زمانہ میں ٹائمس نے ایک مضمون لکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کتب خانہ اسکندریہ کو جلانا ثابت ہے، جیسا کہ جرجی زیدان نے اس کو تمدن اسلام میں جدید دلائل سے ثابت[2] کردیا ہے، اس پر طرہ یہ ہوا کہ مصر کی یونیورسٹی کو جس کا نام جامعہ مصریہ تھا، اسلامی تاریخ پر لکچر دینے کے لیے ایک پروفیسر کی ضرورت ہوئی تو بعض آزاد خیالوں نے جرجی زیدان کا نام پیش کیا، یہ نام منظور ہونا ہی چاہتا تھا کہ مصر میں اس تقرر کے خلاف ایک شورش سی برپا ہوگئی، آخر اس کے بہ جائے شیخ محمد خضری مقرر ہوئے[3]، جن کے تاریخی لکچر چھپ چکے ہیں اور اردو میں تاریخ الامت کے نام سے روشناس ہیں۔

---

[1] ۲۹راگست ۱۹۱۱ء کو ابوالکلام صاحب کو لکھتے ہیں: ''تمدن اسلام کا ضرر بہت متعدی ہوا، یہاں تک کہ ڈاکٹر ہارویز پروفیسر علی گڑھ نے اپنی تحریری رائے یونیورسٹی میں بھیجی کہ امتحانات فاضل و عالم میں وہ داخل درس کی جائے، مجھ پر اس کا سخت اثر ہوا اور میں نے سب کام چھوڑ کر اس کی دروغ بافیوں پر ایک مضمون لکھنا شروع کیا، اس وقت تک بیس صفحے ہو چکے ہیں، عربی میں لکھوں گا اور عربی اخبارات میں طبع کراؤں گا۔'' (ابوالکلام-۳۲) [2] مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو لکھتے ہیں: ''جرجی زیدان کے صرف ایک حصہ کا انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے، مارگولیوس نے کیا ہے جو اسلام کا سخت دشمن ہے اور درحقیقت اسی انگریزی ترجمہ نے مجھ کو رد لکھنے پر آمادہ کیا۔'' (ریاض-۱۸) اس مضمون کی تمہید الندوہ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں پڑھیے، جس میں اس واقعہ کا حوالہ ہے۔ [3] الندوہ جنوری ۱۹۱۱ء۔

ان واقعات نے مولانا کو مجبور کیا کہ ۱۹۱۱ء کے آخر میں اس کتاب پر ایک سخت تنقید لکھیں، جس سے اس کی بے اعتباری نمایاں ہو جائے، غالباً اگست ۱۹۱۱ء[1] سے مولانا پورے انہماک کے ساتھ اس کام میں مصروف ہوئے، جو کئی مہینے تک جاری رہا، بیسیوں تصنیفات کے ہزارہا صفحات جن کے حوالے اصل کتاب میں تھے، ان کو ملا ملا کر دیکھنا اور مختلف اڈیشنوں کو تلاش کرنا اور ان میں مصنف کے دیے ہوئے حوالوں کو ڈھونڈنا آسان کام نہ تھا، یہ رمضان کا مہینہ اور برسات (ستمبر) کی امس اور حبس، مولانا روزہ رکھ کر اسی طرح کتابیں دیکھنے پڑھنے اور لکھنے کی محنت اٹھاتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک آنکھ میں پانی اتر آیا اور اس کی بینائی گویا جاتی رہی، اس پر بھی کام جاری رہا اور اس کو تمام کر کے چھوڑا۔

۶ر نومبر ۱۹۱۱ء کو مولانا اس واقعہ کو کس حسرت سے مولوی ابوالکلام کو لکھتے ہیں "تمدن کے رد میں ابتداءً ایک ہفتہ میں اس قدر انہماک رہا کہ ایک آنکھ میں پانی اترنا محسوس ہوا اور اب اس سے حرف نظر نہیں آتے، ایک آنکھ جو صحیح ہے اس پر بھی بہت بار معلوم ہوتا ہے، اب لکھنا پڑھنا بالکل کم ہو گیا ہے، اس لیے ساٹھ صفحے ہو کر رہ گئے اور اسی پر کتاب ختم کر دی، طبیعت بہت افسردہ رہتی ہے، سپاہی کا ہتھیار چھن جائے تو پھر وہ کس کام کا ہے۔" (ابوالکلام-۳۴)

اسی تنقید و تردید کا اردو خلاصہ اکتوبر ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں چھپا اور اصل عربی مضمون کو جو عربی ادب کا نمونہ ہے، الانتقاد علی التمدن الاسلامی کے نام سے پہلے خود مولانا نے جنوری ۱۹۱۲ء میں ہندوستان میں لکھنؤ کے ایک مطبع میں چھپوایا اور ساتھ ہی اس کے اجزا مصر میں فروری ۱۹۱۲ء میں سید رشید رضا اڈیٹر المنار کے پاس بھیجے سید موصوف نے بڑی تعریف کی اور اس اہم کام کے انجام پانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور لکھا کہ وہ مصر کے کئی علما کو ادھر متوجہ کر چکے تھے، مگر کسی نے ہمت نہیں کی، بحمد اللہ کہ یہ فرض کفایہ ہندوستان کے ایک عالم سے ادا ہو سکا، (ریاض حسن ۱۸-وحید-۵۵) مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ سید رشید رضا نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں خود بھی تردید کرنی چاہتا تھا مگر جرجی زیدان کے مکائد اس قدر پھیلے ہوئے تھے کہ ان کو سمیٹ کر یکجا کرنا اور ان کی تردید کرنا قابو میں نہ آتا تھا، آپ نے اس پر قابو پالیا اور تردید کر دی۔

سید موصوف اس کے بعد مولانا کی خواہش پر ۱۹۱۲ء کے شروع میں ہندوستان آنے اور یہاں سے واپس جا کر اس کو المنار میں اور بعد کو ایک رسالہ کی صورت میں شایع کیا۔

---

[1] ابوالکلام-۳۲۔

اس رسالہ کی عربی تحریر بڑی انشا پردازانہ ہے، مولانا عربی تحریر میں جاحظ کے طرز کے پیرو تھے، جس زمانہ میں وہ یہ مضمون لکھ رہے تھے، جاحظ کی بیان وتبیین اور کتاب الحیوان اکثر مطالعہ میں رہتی، راقم کو یہ سعادت حاصل ہے کہ اس کتاب میں نبوامیہ کی علمی سرپرستی کا باب جوطبع ہند کے صفحہ ۴۷ سے صفحہ ۵۳ تک ہے حضرۃ الاستاذ کے اشارہ سے اس شکستہ رقم کے قلم سے نکلا ہے، وللہ الحمد۔

اس کتاب کے چھپوانے کا مرحلہ درپیش تھا کہ حکیم نورالدین صاحب نے قادیان سے اس کے لیے پچاس روپے بھیج دیے، باقی کے لیے انہوں نے اپنے دوستوں میں سے مولانا شروانی، نواب مزمّل اللہ خان اور عزیزوں میں سے مولانا حمید الدین کو لکھا اور خود مولانا نے بھی اپنا حصہ دیا اور کتاب چھپ کر شائع ہوئی۔ (شروانی-۹۵)

اس کتاب کی اشاعت نے ہندوستان اور مصر اور دنیائے اسلام کے دوسرے حصوں میں جہاں تک تمدن اسلامی کا زہر پھیلا تھا، تریاق کا کام دیا اور ایک بڑے فتنے کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔ والحمد للہ علی ذلک۔

قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ۱۹۱۰ء اس وقت تک قرآن پاک کے جتنے ترجمے یورپ کی زبانوں میں ہوئے تھے، وہ کل عیسائیوں کے قلم سے نکلے تھے، انگریزی میں سب سے پہلا اور مشہور ترجمہ سیل کا تھا اور اس کے بعد پامر کا اور ۱۹۰۹ء میں راڈویل کا ترجمہ شائع ہوا لیکن ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کے نزدیک کسی استناد کے لائق نہیں ہو سکتے تھے، ہندوستان میں انگریزی زبان کی اشاعت کے سبب سے جن نوتعلیم یافتہ مسلمانوں کو قرآن کے سمجھنے کی طرف توجہ ہوئی، وہ ان ہی ترجموں کی طرف توجہ کرتے تھے، غیر مسلم لوگ بھی جب اسلام کی دعوت کا صحیح مطلب سمجھنا چاہتے تھے تو انہی ترجموں میں سے کسی ایک کو پڑھتے تھے۔

اس زمانہ میں آریوں کے سبب سے جب مولانا کو تبلیغ وحفاظت اسلام کی طرف توجہ ہوئی تو قرآن پاک کے ایک مستند انگریزی ترجمہ کی ضرورت بھی معلوم ہوئی، چنانچہ مارچ ۱۹۱۰ء میں جب دلی میں ندوۃ العلما کا سالانہ اجلاس ہوا تو مولانا نے اس جلسہ میں یہ تجویز پیش کی اور تمام لوگوں نے اس کی تائید میں صدائیں بلند کیں، مصارف کا مرحلہ اسی جلسہ میں نہایت آسانی کے ساتھ طے ہوگیا، یعنی سردار اسماعیل خاں سفیر افغانستان نے اعلان کیا کہ وہ سردست اس مقصد کے لیے پانچ ہزار روپیہ دیتے ہیں اور اس کے علاوہ جو مصارف پڑیں گے وہ ان کو بھی برداشت کریں گے، اب جو کچھ دقت تھی وہ صرف یہ تھی کہ

کون شخص اس کام کو انجام دے، مولانا کے نزدیک اس کے لیے ایک ایسا جامع الحیثیتین شخص درکار تھا جو عربی اور انگریزی دونوں کا ماہر ہو اور اس کے ساتھ قرآن مجید پر کافی غور کر چکا ہو، اس لحاظ سے ان کی نگاہ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم اور نواب عماد الملک مرحوم پر پڑی، اسی زمانہ میں مولانا نے مولوی محمد صالح صاحب پروفیسر بھاولپور کالج کی بھی تعریف سنی اور ان سب سے خط و کتابت کی لیکن نواب عماد الملک جو انگریزی کے ایک اعلا ادیب تھے اور عربی زبان سے بھی واقف تھے، اس کام کے لیے سب سے زیادہ مستعد نظر آئے، حالاں کہ ان کی عمر ستر سے زیادہ ہو چکی تھی، اس پر بھی مستعدی ظاہر کی اور ۴ گھنٹہ روزانہ کام کرنا شروع کیا، چنانچہ انہوں نے مولانا کو لکھا کہ وہ مسودہ مولانا کے پاس بھیج دیں گے، جو چھپوا کر مولانا حمید الدین اور مولوی محمد صالح اور دوسرے قابل حضرات کی خدمت میں بھیجا جائے گا، پھر جو رائیں ان کی نسبت موصول ہوں گی وہ نواب صاحب کی خدمت میں بھیجی جائیں گی اور متفقہ رائے سے فیصلہ ہوگا۔

اس کے ساتھ مولانا نے یہ رائے بھی قائم کی کہ انگریزی کا اردو ترجمہ علما کی ایک کمیٹی کے سامنے پیش ہوگا تاکہ وہ اس کی صحت و غلطی کا فیصلہ کر سکیں۔

نواب صاحب کا یہ ترجمہ پندرہ پاروں تک مکمل ہو چکا تھا، ۱۹۱۴ء میں جب مولانا کی کوششوں اور نواب عماد الملک کے اصرار سے مولوی حمید الدین صاحب دار العلوم حیدر آباد کے صدر (پرنسپل) مقرر ہو کر حیدر آباد پہنچے تو نواب صاحب نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور روزانہ مولوی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر اپنے انگریزی ترجمہ پر نظر ثانی شروع کی، یہ کام تمام بھی نہیں ہوا تھا کہ خود مولانا کی عمر تمام ہوگئی، مولوی حمید الدین صاحب اور نواب صاحب کا کام اس پر بھی جاری رہا اور اس متفقہ کوشش سے جو اصلاح ہوئی تھی، وہ غالباً چار پاروں تک پہنچی تھی، اسی اثنا میں ۱۹۱۷ء میں مولوی حمید الدین صاحب حیدر آباد سے چلے آئے اور نواب صاحب ضعف بصارت اور علالت کے سبب سے تنہا کام کرنے سے معذور ہو گئے اور ۱۹۲۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا اور کام سولہ پاروں سے آگے نہ بڑھ سکا، نواب صاحب نے جن ۱۶ پاروں کا ترجمہ کیا تھا اس کا چھپا ہوا مسودہ تو موجود ہے، مگر افسوس ہے کہ چار پاروں کے اصلاح شدہ مسودہ کا تلاش کے باوجود پتہ نہیں چلا۔

مولانا کی یہ تجویز گو ان کی وفات سے ناتمام رہی، مگر بحمد للہ کہ ناکام نہیں رہی، یعنی گو ان کے ہاتھوں سے یہ انجام نہ پا سکی، مگر اس واقعہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان کی اسی تحریک کا فیض تھا کہ اس کے بعد قادیانیوں نے مولوی محمد علی صاحب لاہوری نے مسٹر محمد پکھتال (حیدر آباد) نے اور بعض

دوسرے مخلص مسلمانوں نے اس کام کو انجام تک پہنچایا، اس لیے الدال علی الخیر کفاعلہٖ کے اصول پر انشاء اللہ تعالیٰ مولانا کو بھی اس ثواب سے حصہ ملے گا۔

مجلس علم کلام کی تجویز ۱۹۱۲ء اسلام کی مستقل حفاظت و اشاعت کی غرض سے جو تجویزیں اس زمانہ میں مولانا کے ذہن میں آ رہی تھیں، ان میں سے ایک مجلس علم کلام کی تجویز تھی، جس کے ذریعہ سے یورپ کے فاسد خیالات و اعتراضات کا استیصال مقصود تھا، ان کے خیال میں اس مشکل کا اصل حل قدیم و جدید تعلیم کا امتزاج تھا، جس کے لیے وہ ہر طرف کوشش کر رہے تھے لیکن جب تک اس امتزاج کا سامان نہ ہو اور اس کا نتیجہ پیدا نہ ہو، ان مشکلات سے اعراض نہیں برتا جا سکتا جو جدید تعلیم کے بدولت مسلمانوں کو پیش آ رہی تھیں، اس بنا پر ان کو یہ خیال ہوا کہ ملک میں اس وقت نئے تعلیم یافتوں میں سے ایسے لوگوں کو جو فلسفہ کا ذوق اور اسلام کا درد رکھتے ہوں، ایک طرف سے لیا جائے اور دوسری طرف سے ایسے علما کو لیا جائے جو قدیم فلسفہ کے ماہر، جدید تعلیم سے مانوس اور فلسفۂ جدیدہ کے نئے اعتراضات کی تردید و تنقید کی قوت رکھتے ہوں اور ان دونوں کو ملا کر ایک مجلس علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے، جس میں یہ غور کیا جائے کہ فلسفہ جدیدہ کے کون کون سے مسائل مذہب کے مخالف ہیں اور یہ مسائل کہاں تک یقینی ہیں اور ان کی بنا پر مذہب پر جو اعتراضات پڑ سکتے ہیں، ان کا جواب کیا ہے؟ اس مجلس کے لیے علما میں سے انہوں نے مولوی مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی، مولانا شیر علی صاحب حیدر آباد، سید رشید رضا مصری کو لیا اور نئے تعلیم یافتوں میں سے ڈاکٹر محمد اقبال لاہور، مولوی حمید الدین صاحب پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد اور مولوی عبدالقادر صاحب بی۔ اے بھاگل پوری کو لیا اور ۱۴؍ مارچ ۱۹۱۲ء کے مسلم گزٹ میں ایک مضمون[1] کی صورت میں اس تجویز کو شائع کیا اور دلی کے اجلاس ندوہ میں اس پر غور و فکر کی دعوت دی، اس مضمون میں مولانا نے پہلے عباسیوں کے زمانہ میں علم کلام کی بنیاد پڑنے کی کیفیت لکھی ہے اور اسی پرداز پر موجودہ زمانہ میں کام کرنے کا خیال ظاہر کیا۔

اس تجویز پر عمل کا آغاز اس سے کیا کہ ڈاکٹر محمد اقبال وغیرہ کو اس تجویز کے مطابق خطوط لکھے اور ان کے جوابات بھی آئے، مگر مجلس کا کام شروع نہ ہو سکا، گویا تجویز تجویز کی حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔

کلکتہ کا سفر ۱۹۱۲ء کلکتہ اس زمانہ میں حکومت کا پایۂ تخت تھا، وقف علی الاولاد کے سلسلہ میں کونسل کے اکثر مسلمان ممبروں سے ملنے کے لیے مولانا کو کئی دفعہ کلکتہ کا سفر کرنا پڑا، وہاں کبھی جسٹس شرف الدین

---

[1] یہ مضمون مقالات شبلی جلد ہشتم ص ۵۳ میں ہے۔

کے ہاں ٹھہرے اور کبھی مولانا ابوالکلام صاحب کے پاس ۱۹۱۲ء کے شروع میں انہوں نے پھر کلکتہ کا سفر کیا اور وائسرائے کی کونسل کے تمام ممبروں کو ایک جلسہ میں جمع کر کے تمام مراتب طے کیے اور واپسی میں پٹنہ میں قیام کیا۔

پٹنہ کا سفر ۱۹۱۲ء مولانا نے پٹنہ کا متعدد بار سفر کیا، شروع میں ۱۸۹۷ء میں ندوہ کے لیے گئے اور غالباً مولوی عبدالغنی صاحب[1] مرحوم وکیل کے دولت کدہ پر قیام فرمایا، پھر خدا بخش خاں کے کتب خانہ کے سیر کو کئی دفعہ گئے، ۱۹۰۶ء میں بھی گئے تھے اور مولوی شرف الدین صاحب بیرسٹر کے یہاں ٹھہرے تھے، ڈھاکہ سے واپسی میں بھی پٹنہ میں ٹھہرے اور خدا بخش خاں کے یہاں اترے، ایک دفعہ شمس العلما مولوی حافظ محبّ الحق صاحب (مصنف دعوۃ الحق) کے یہاں مہمان ہوئے تھے۔

اس دفعہ ۴ر فروری ۱۹۱۲ء کی صبح کو وہ پٹنہ پہنچے تو اسٹیشن پر ان کے استقبال کے لیے معتقدین کا نہایت کثرت سے مجمع تھا، شہر کے عمائد اور کالج کے تمام طلبہ موجود تھے، آدھی راہ کے بعد طلبہ کے اصرار سے گاڑی کے گھوڑے کھول دیے گئے اور خود طلبہ ذوق وشوق کے عالم میں اس گاڑی کو اپنے ہاتھوں سے کھینچ کر فرودگاہ تک لائے، مولانا اس واقعہ کو لکھ کر فرماتے ہیں "یہ تو نہیں کہتا کہ رعونت پرست نفس کو پھریری نہیں ہوئی ہوگی لیکن واقعتاً ہنسی آتی تھی کہ عجیب خوش اعتقاد بلکہ ضعیف الاعتقاد ہیں۔" (ابوالکلام-۳۵)

مولانا کا ایسا سمجھنا ان کے حسن تواضع کی دلیل ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں ان کے کاموں نے ان کو لوگوں میں اور خصوصاً نوجوانوں میں انتہائی ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔

یہاں ایک جلسہ ہوا جس میں لوگ کثرت سے شریک ہوئے اور مولانا نے اس میں وقف اولاد اور اس کے سلسلہ میں ندوہ کا مناسب ذکر کیا۔ (ابوالکلام-۳۵)

اسی سال اکتوبر کے آخر میں انہوں نے پٹنہ کا ایک اور سفر کیا اور غالباً اس سفر کی غرض تعطیل جمعہ کے میموریل کی تیاری کے سلسلہ میں تھا اور غالباً کتب خانہ میں قیام فرمایا، ۲۳ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کو ڈاکٹر محمود کو جواب پٹنہ میں بیرسٹری کر رہے تھے، حسب ذیل خط[2] لکھا "بانکی پور پٹنہ میں تو غالباً کتب خانہ ہی میں ٹھہروں، مدت سے وہاں آمد ورفت ہے اور وہیں ٹھہرتا ہوں۔"

---

[1] مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم ایک لائق خاندان کے لائق فرد تھے، پٹنہ کا مشہور مردم خیز گاؤں صالح پور ان کا وطن تھا، علم دوست اور علما کے قدر شناس تھے، پٹنہ کے مشہور وکلا میں تھے۔ [2] اس خط کا عکس ندیم گیا، اگست ۱۹۴۰ء میں چھپا ہے۔

سیاسیات

مولانا کی سیاست و واقعات کا جو سلسلہ چلا آتا ہے، اس سے ہمارے ناظرین پر یہ بات بے پردہ ہو چکی ہوگی کہ گو سیاسیات کا باب مولانا کے قلم کا موضوع نہ تھا، تاہم وہ سیاسیات کے ہمیشہ دلدادہ رہے لیکن ان کے سیاسیات کا یہ رقبہ بھی حقیقت میں ان کے کلامیات ہی کی وسعت کا ایک جز تھا، یعنی ان کو اسلام، اسلامی تمدن، اسلامی تاریخ، اسلامی علوم وفنون سے جو شیفتگی تھی، اس کا فطری اقتضا یہ ہونا چاہیے کہ ان کو اسلام کی حکومت عزیز ہو اور جی چاہتا ہو کہ وہ کتابوں میں جس کی تصویر دیکھتے رہتے ہیں، اس کو وہ مجسم بھی دیکھ سکتے، دوسری طرف چمن اسلام کے پھولوں کو جن گستاخ ہاتھوں نے نوچ ڈالا، ان کی طرف سے ان کو پورا انحراف ہو، یہی ان کی سیاست تھی، ایک طرف وہ یورپ کی علمی سر پرستی کے لیے سراپا سپاس تھے، دوسری طرف یورپ کی دست بُرد سے ہمہ تن فریاد اسی جذبہ نے ہندوستانی سیاست کی ایک دوسری شکل ان کے سامنے پیش کی اور وہ یہ کہ یہ ملک ہندو مسلمانوں کا متحدہ وطن ہے، لیکن اسلامی سیاسیات میں وہ پورے پین اسلامی تھے۔

مابین الاسلامی سیاست اور ترکوں سے محبت اس وقت ساری دنیا میں صرف ترکی ہی کی وہ سلطنت تھی جس کے پیکر میں ان کو اسلام کے شان وشکوہ کا جلوہ نظر آتا تھا، اس لیے ان کو ترکوں سے بڑی محبت تھی، ان کی جوانی تھی کہ ۱۸۷۶ء میں روس وروم کی جنگ نمودار ہوئی، اس لڑائی میں سارا ہندوستان بلکہ ساری اسلامی دنیا ترکوں کے ساتھ تھی، ہندوستان بھر میں مسلمانوں نے ترکوں کی اعانت کے لیے چندے جمع کیے، بلکہ حضرات علما نے بھی اس میں پوری طرح حصہ لیا اور چندے جمع کر کے ترکی بھیجے، مولانا نے بھی اپنی حیثیت کے مطابق اس سلسلہ میں کام کیا اور اپنے شہر کی طرف سے کئی ہزار روپے سفیر ترکی، مقیم بمبئی کی معرفت قسطنطنیہ بھیجے، یہی وہ راستہ ہے جس سے ترکوں کی محبت نے ان کے دل میں گھر کیا اور اسی محبت میں ترکی کا سفر کیا اور وہ عشق جو اب تک صرف گفتار کے ذریعہ تھا، دیدار سے وہ اور دہ چند بڑھ گیا، ان کو ترکوں کے کوکبہ جلال میں بدر وحنین کے جلوے نظر آتے تھے:

تازگیِ بدر وحنین از تو ہست — زیب وطر از حرمین از تو ہست
جز تو کہ ہست اے شہِ انجم سپاہ — آنکہ بود شرع نبی را پناہ

فرۂ دین نبوی از تو ہست بازوے اسلام قوی از تو ہست

اس زمانہ میں ترکوں کا نام لینا برٹش گورنمنٹ کی سیاسیات کی نگاہ میں بڑا جرم تھا، مولانا نے اس جرم کا ارتکاب کیا اور ہر چند کہ ٹرکی کے سفرنامہ کی ترتیب میں صرف اس کا علمی و تعلیمی ہی پہلو پیش نظر رہا، سیاسیات کو ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا، مگر یہ خفیف جرم بھی عفو و درگزر کی نظر سے نہیں دیکھا گیا، ان کو سلطانی ایلچی ہونے کا ملزم ٹھہرایا گیا اور ان کے پیچھے خفیہ پولیس لگائی گئی، انتہا یہ ہے کہ مولوی عبدالرزاق صاحب کان پوری، مصنف البرامکہ نے اس سفرنامہ پر ریویو لکھا تو کان پور کے کلکٹر نے ان کو بلوا کر ڈانٹا کہ تم برطانی رعایا ہو کر سلطانِ روم کی تعریف کرتے ہو اور مولوی صاحب کو معذرت[1] کرنی پڑی۔

۹۶-۱۸۹۵ء میں جب آرمینیا کا مسئلہ اٹھا اور اس سلسلہ میں یورپ کا ایک ایک اخبار طرح طرح کی دروغ بافی کرکے دنیا کی نگاہ میں ترکوں کو ملزم ٹھہرا رہا تھا اور ہندوستان کے اخباروں میں اس کی نقلیں چھپ رہی تھیں تو مولانا سے ضبط نہ ہو سکا، انہوں نے ۲۱ر فروری ۱۸۹۶ء کے آزاد اخبار لکھنؤ میں ایک زبردست مضمون لکھا اور حقیقت کا پردہ چاک کیا، یہ وہ وقت تھا جب وہ علی گڑھ کالج کی ملازمت میں تھے۔

۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی جنگ جب پیش آئی تو وہ علی گڑھ میں تھے اور سرسید کا نقطۂ نگاہ سب کو معلوم ہے، گو مولانا نے اس موقع پر اپنے کو قابو میں رکھا لیکن ان کو علی گڑھ کی فضا میں اندر سے گھٹن ہونے لگی اور نتیجہ اس قسم کی سیاسی کشمکش کا علاحدگی تھا۔

ان کی بہت کم مجلس ترکوں کے فضائل و مناقب اور دلچسپ قصوں کے بیان سے خالی ہوتی تھی اور جب وہ بیان کرنے پر آتے تھے، بلبل ہزار داستان بن جاتے تھے۔

۱۹۰۸ء میں جب انور بے وغیرہ کے زیر علم ٹرکی نے دستوریت کا اعلان کیا تو وہ خوشی میں آپے سے باہر تھے، ایک ایک نام ور نوجوان ترک اور انجمن اتحاد و ترقی کے ایک ایک جاں باز رکن کی تعریفیں کرتے تھے سلطان عبدالحمید خان کی اس معاملہ فہمی کی مدح کرتے تھے کہ محمد علی شاہ کج کلاہ ایران کی طرح اپنے ملک کو خانہ جنگی میں نہیں برباد کر دیا بلکہ خون کا ایک ایک قطرہ بہائے بغیر ملک میں اتنا بڑا انقلاب ہونے دیا، انہوں نے اس انقلاب سے بڑی بڑی امیدیں قائم کر رکھی تھیں، اس زمانہ میں شیخ عبدالعزیز

---

[1] یہ دونوں واقعے مولوی عبدالرزاق صاحب نے جو مولانا کے اسی زمانہ کے ملنے والے اور دوست ہیں، اپنے مضمون یاد ایام میں لکھے ہیں۔

شاویش ٹرکی سے ''العرب'' نام ایک عربی اخبار نکالتے تھے، وہ ان کے پاس آتا تھا، اس کو بڑی دل چسپی سے پڑھتے تھے اور جو پڑھتے تھے اپنی مجلس میں اس کو دوسرے ہفتہ تک بیان کرتے رہتے تھے۔

۲۸ راگست ۱۹۰۸ء کو ایک خط میں مہدی مرحوم کو لکھتے ہیں'' ٹرکی کی جدید زندگی نے اس کے ہواخواہوں کو مخمور کر دیا ہے، کیا بتاؤں عربی اخبارات میں آج کل کیا نشہ ہوتا ہے، سوسو دفعہ پڑھتا ہوں اور سیر نہیں ہوتا، آپ کو مبارک ہو کہ آزادی کے جو جلوس نکلے، ان میں بیس ہزار کی جمعیت کا ایک کمانڈر ایک جنس لطیف تھی...... ایران اور ٹرکی کی پارلیمنٹ یورپ کا اثر نہیں، گو توارد ہے اَمْرُهُمْ شُوْرٰى کا سبق مسلمانوں کو اب یاد آیا اور چوں کہ گھر کی چیز تھی، کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی، خدا کی قسم یہ جوش، یہ صداقت، یہ مسرت، یہ اعتدال دنیا کی تاریخ دکھائے گی، تو اسلام ہی کے آئینہ میں دکھائے گی، خیال فرمایئے، آٹھ لاکھ آدمیوں کا دربار قسطنطنیہ میں کوہ شکن موجیں لے رہا تھا اور ایک تنکے کا بال بیکا نہ ہوا، معاویہ[1] رضی اللہ عنہ کی غلطی کا کفارہ عبدالحمید نے ادا کیا۔'' (مہدی-۴۹)

یہ خط اپنے لکھنے والے کے وفور جوش کا مرقع ہے، بار بار پڑھیے محسوس ہوگا کہ مسرت اور خوشی کا ایک امنڈتا ہوا سمندر ہے، جو موجیں لے رہا ہے اور یہ راز بھی یہیں سے کھلے گا کہ ان کی سیاست کا سرچشمہ اسلام کی تعلیم ہے، یورپ کی آزادی نہیں۔

اسی زمانہ میں عطیہ بیگم (بمبئی) ٹرکی کے سفر سے واپس آئی تھیں، ان سے حالات سنے اور جب انہوں نے یہ کہا کہ'' ٹرکی ایک یورپین طاقت کا بازیچہ ہے اور یہ پتلیاں صرف بیرونی تاروں پر حرکت کرتی ہیں، جدید قرض نے اپنا جان ستانی کا کام انجام دیا ہے اور دیتا جاتا ہے'' تو انہوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا (مہدی-۵۳) ان ہی کو سلطان عبدالحمید خان کی نسبت کس قدر بلیغ فقرہ لکھ کر بھیجا ہے، '' عبدالحمید جس نے ۳۵ برس تک یورپ کی پالیٹکس کے اوراق کا تاش کھیلا ہے۔'' (۵۶) ۲۲ رنومبر ۱۹۱۰ء کو پھر انہیں لکھتے ہیں، ترکوں نے دکھا دیا:

نالوں سے عندلیب کو میں نے دبا لیا بھاری ہوں لاغری میں بھی تنہا ہزار پر

(ہزار بلبل کو بھی کہتے ہیں) عربی اخبارات آج کل پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔'' (۶۴)

---

[1] یہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی اس خطا کی طرف اشارہ ہے جو ان سے اسلام کے نظام شوریٰ کے توڑنے اور بیٹے کی ولی عہدی کے متعلق ہوئی۔'' س''۔

پھر دفعۃً جب ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کیا تو ان کے دل میں ٹھیس سی لگی، اس زمانہ میں ان کا رہ رہ کر اضطراب اور باتوں باتوں میں شعلہ نفسی، مجھ کو اچھی طرح یاد ہے، ہر ہفتہ جب مصر کے عربی اخبارات آتے تھے تو ماسوا سے بے خبر ہو جاتے تھے اور ترک بہادروں کی جاں بازی اور شجاعت کے قصے مزے لے لے کر بیان کرتے، انور بے، عزیز بے مصری اور دوسرے نوجوان ترک افسر جو اٹلی کی ناکہ بندیوں کے باوجود اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر چھپ چھپ کر طرابلس پہنچ رہے تھے، ان کی اس جواں مردی کے قصوں کے دہرانے میں اس بڑھاپے میں بھی ان میں جوانی کی اکڑ پیدا ہو جاتی تھی۔

طرابلس کی اس لڑائی کے زمانہ میں ساری دنیائے اسلام میں یورپ کے خلاف غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی تھی، ہندوستان کا براعظم اس زمانہ میں اسلامی جوش وخروش کا طوفان خیز سمندر بن گیا تھا، یاد ہوگا کہ ترکی نے اٹلی سے اس بات پر صلح کر لی تھی کہ ترک طرابلس کو خود مختار بنا دیں گے اور وہ جس طرح چاہے اٹلی سے نپٹ لے، چنانچہ باب عالی نے اس کے مطابق طرابلس کو خود مختاری بخش دی[۱] اور شیخ سنوسی وغیرہ نے اس کی آزادی کا بیڑا اٹھایا، مجھے اسی زمانہ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ یاد ہے، رات کو تقریباً آٹھ نو بجے بے وقت مولانا کا رقعہ آیا، جس میں مجھے اور اونچے درجہ کے دو تین طالب علموں کو یاد فرمایا تھا، ہم سمجھے کوئی ضروری بات پیش آئی ہوگی جو اس وقت طلب فرمایا ہے، ہم لوگ بتمام عجلت پہنچے تو دیکھا کہ خود چٹائی پر لیٹے ہیں، سامنے لیمپ ہے اور چاروں طرف عربی اخبار پھیلے ہیں، ارشاد ہوا ''بھائی سنا؟ بڑا مزا ہوا، عربی اخبار آئے ہیں ان میں انور بے وغیرہ کا اعلان ہے کہ وہ ترکی کی خدمت سے استعفا دے کر طرابلس میں اپنی نئی حکومت بنائیں گے اور اخیر وقت تک اٹلی کا مقابلہ کریں گے، اس خبر سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ بے اختیار ہنسنے کو جی چاہتا تھا، مگر اکیلے ہنستے نہیں بنتا تھا، اس لیے تم لوگوں کو بلوایا ہے'' یہ کہہ کر صندوقچہ سے روپیے نکالے اور آدمی بھیج کر بازار سے مٹھائی منگائی، خوشی ومسرت کا یہ جلسہ دیر تک قائم رہا، حالاں کہ مولانا عموماً نو بجے سو جانے کے ہمیشہ سے عادی تھے۔

ابھی طرابلس الغرب کی یہ مصیبت ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں یورپ سلطنتوں کی شہ پا کر بلقان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا، اسلامی جذبات کا وہ

---

[۱] دنیا کے انقلاب کا حیرت انگیز منظر ہے، اس وقت ۲۳ جنوری ۱۹۴۳ء کو اٹلی کی یہ سلطنت طرابلس ختم ہوگئی اور انگریزوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور اسی کے ساتھ اٹلی کی افریقہ کی شہنشاہی کی زمین کا ایک ایک چپا اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور انگریزوں کے زیر علم آ گیا، تلك الايام نداولها بين الناس۔

سمندر جو ابھی ٹھہر نے بھی نہیں پایا تھا، پھر جوش میں آیا اور مسلمانوں کے دلوں میں علانیہ آزادی اور حریت کی تحریک لہریں لینے لگی، اس زمانہ میں اس تحریک کی رہنمائی جن لوگوں نے کی ان میں ایک نام ہمارے ہیرو کا بھی ہے ''شہر آشوب اسلام'' کے نام سے غم وحسرت سے بھری ایک ایسی نظم لکھی جس نے اس حادثہ پر مسلمانوں کے دامن کو آنسوؤں سے تر کر دیا اور آج بھی جو کوئی اس کو سنے گا، اس کی آنکھوں سے اشک غم کے چند قطرے بے اختیار نکل آئیں گے:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک — چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے — فضائے آسمانی میں اڑیں گے دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے — کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک
یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے — اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے — یہ سیر ان کو دکھائے گا شہید نیم جاں کب تک
یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے — یہ راگ ان کو سنائے گا یتیم ناتواں کب تک
کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو — یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ جوش انگیزیِ طوفانِ بیداد و بلا تا کے — یہ لطف انگریزیِ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے — ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
نگارستانِ خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی — تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خونچکاں کب تک
یہ مانا گرمیِ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو — دکھائیں ہم تمہیں ہنگامۂ آہ وفغاں کب تک
یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے — سنائیں تم کو اپنے دردِ دل کی داستاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا — ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک
عروس بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں — ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زر افشاں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتح ایوبی — دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہم ہیں — مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام ونشاں کب تک
زوالِ دولت عثماں زوالِ شرع وملت ہے — عزیز و فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک
خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیاں ہیں؟ — نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک
پرستارانِ خاک کعبہ دنیا سے اگر اٹھے — تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک
جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے — تو پھر یہ نغمۂ توحید و گلبانگ اذاں کب تک

بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی — چلیں گی تند، بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک
کہیں اڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئے — غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں — تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کا آشیاں کب تک

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

یہ نظم (شاعرانہ معنوں) میں سراسر الہامی معلوم ہوتی ہے، اس کی متعدد پیشین گوئیاں حرف حرف پوری ہوئی ہیں۔

یہ نظم مولانا نے لکھنؤ کے ایک عام جلسہ میں جوٹر کی فراہمی چندہ کے لیے ہوا تھا، پڑھی تھی[1]، خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رُلایا، معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی لکھنؤ کی کوئی ماتمی مجلس ہے، خواجہ کمال الدین صاحب (لاہور) اس زمانہ میں اشاعت اسلام کی غرض سے لندن (بشپ گیٹ نمبر ۲۶) میں مقیم تھے، اس نظم نے ہزاروں میل دور سے ان کے دل پر جو اثر کیا، اس کا ذکر ان کے اس خط میں ہے، جو انہوں نے لندن سے مولانا کے نام لکھا تھا:

''مکرمی مولانا! السلام علیکم

اگر چھ ہزار کوس دور بیٹھے ہوئے کسی بات نے مجھے بچوں کی طرح رُلایا تو آپ کے طبع زادِ جدید کے اس مصرع نے ع ''چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک'' کیا حقیقت اور صداقت ہے اور کیسا یاس افزا منظر سامنے آجاتا ہے، اللہ تعالیٰ رحم کرے......''

مسلمانوں نے بار بار حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے احساس کا لحاظ کرے اور بلقانی ریاستوں کی سیاسی امداد سے باز رہے، مگر اس کا جواب ہمیشہ یاس انگیز ملا، اس پر شاعر نے جل کر یہ کہہ کر اپنے دل کے پھپھولے توڑے:

وہ کہتے ہیں کہ ہم کو پاس ہے احساسِ مسلم کا — مگر اس کا اثر جو کچھ ہے وہ ہندوستان تک ہے
مگر ہم کیا کریں اس کو کہ عالم گیری ملت — عراق و فارس و نجد و حجاز و قیرواں تک ہے
منافق ہے جو کہتا ہے کہ میں ٹرکی سے یکسو ہوں — یہ وہ الفاظ ہیں جن کی جہاں گیری زباں تک ہے
ہمارا جوشِ اسلامی انہیں باور نہیں آتا — یہ انداز تغافل جلوہ گاہِ امتحاں تک ہے
پڑا سوتا ہے کوئی گنبد خضرائے یثرب میں — کہ جس کا بندۂ فرماں زمیں سے آسماں تک ہے
کوئی جا کر یہ کہہ دے ہم گنہ گاروں کی جانب سے — کہ اب مسلم کی ہستی تیری الطافِ نہاں تک ہے

[1] مکاتیب جلد دوم بہ نام مولوی ظفر علی خاں۔

اسی زمانہ میں جب تمام ہندوستان میں وزرائے برطانیہ کے اس طرز سیاست کے خلاف جوش و غصہ کی لہر دوڑ رہی تھی، بمبئی میں ایک گمنام وفادار اسلامی انجمن بمبئی کے نام سے اخبارات میں مسلمانوں کے عام خیالات کی مخالفت میں اس کی تجویزیں شایع ہوئی تھیں، مولانا نے اس نظم میں اس کی پردہ دری کی:

ایک دن تھا کہ وفاداری مسلم کی متاع — ہر جگہ عام تھی اور نرخ میں ارزانی بھی
دفعۃً ہوگئی ہنگامۂ بلقان میں گم — قوم کو سخت مصیبت تھی پریشانی بھی
ہاتھ آنے کا تو کیا ذکر، پتہ تک بھی نہ تھا — ڈھونڈ ھنے والوں نے گو خاک بہت چھانی بھی
ہو مبارک تجھے اے بمبئی اے نازِ دکن! — کہ ترے تاج میں ہے طرّہ سلطانی بھی
تیرے بازار میں وہ یوسف گم گشتہ ملا — جس کا مشتاق تھا خود یوسف کنعانی بھی
یہ الگ بات ہے اندھوں کو وہ آئے نہ نظر — گو اسی زمرہ میں ہے "یوسف[1] ثوبانی" بھی

اس زمانہ میں ہز ہائینس سر آغا خاں نے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں ترکوں کو یہ صلاح دی تھی کہ ان کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ سرزمین یورپ کو چھوڑ کر ایشیا چلے جائیں تا کہ وہ دول یورپ کے حملوں سے محفوظ رہیں، اس مضمون سے مسلمانوں میں بہت غم و غصہ پیدا ہوا، کیوں کہ اس سے ان کے عالم گیر سیاسی وقار کو بہت صدمہ پہنچا تھا، مولانا نے آغا خان کو اپنی دو نظموں میں طنزیہ جواب دیا جو کلیات میں موجود ہے۔

مولانا محمد علی مرحوم کی کوشش سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں اس لڑائی میں ایک طبی وفد نومبر ۱۹۱۲ء میں ٹرکی کے محاذ جنگ پر بھیجا گیا تھا، اس کے ممبر شعیب قریشی (موجودہ وزیر حضوری بھوپال) چودھری خلیق الزماں وکیل لکھنؤ، عبدالرحمٰن صاحب صدیقی (موجودہ ممبر اسمبلی بنگال) عبدالعزیز انصاری وغیرہ تھے، یہ سب اس زمانہ میں علی گڑھ کالج میں زیر تعلیم تھے، مگر جوش کا یہ عالم تھا کہ تعلیم چھوڑ کر زخمی مسلمانوں کی مرہم پٹی کے لیے چل کھڑے ہوئے، ڈاکٹر سید عبدالرحمٰن صاحب (موجودہ میڈیکل آفیسر بھوپال) جو اس وقت انگلینڈ میں اپنی طبی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے، وہیں سے سیدھے چل کر قسطنطنیہ پہنچے، ڈاکٹر نعیم انصاری بھی وفد کے ہم راہ تھے اور وہ بھی انگلینڈ ہی سے آکر ملے تھے، اس وفد کے تمام اخراجات ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے چندوں سے پورے کیے اور تاریخ میں یہ ترک بھائیوں

[1] سیٹھ یوسف ثوبانی مرحوم، عمر ثوبانی کے والد بمبئی کے ممتاز تاجر تھے اور تعلیم کے مسئلہ سے دل چسپی رکھتے تھے، وہی اس جماعت کے سرگروہ تھے۔

کی خدمت کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کا اپنی قسم کا پہلا کارنامہ تھا، ڈاکٹر انصاری مرحوم جو برسوں لندن کے شفاخانوں میں کام کر چکے تھے، اس وقت ہندوستان میں موجود تھے، موصوف کا وطن غازی پور میں یوسف پور کا قصبہ ہے، جو اعظم گڑھ سے جو مولانا کا وطن تھا، نسبۃً قریب ہے، اور ڈاکٹر صاحب موصوف کے بڑے بھائی حکیم عبدالوہاب مشہور حکیم نابینا صاحب مولانا کے ہم درس تھے، انہوں نے بھی اعظم گڑھ میں مولانا فاروق صاحب سے پڑھا تھا، مولانا اور ڈاکٹر صاحب کی عمروں میں بڑا تفاوت تھا، ڈاکٹر صاحب اس وقت بالکل جوان تھے اور مولانا بوڑھے اس پر بھی یہ منظر آنکھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر انصاری صاحب لکھنؤ ہو کر روانگی کے لیے دلی جا رہے ہیں، لکھنؤ کے اور چند ممتاز لوگ بھی الوداع کہنے کو موجود ہیں، گاڑی روانہ ہونے کو ہے، مولانا پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں، ڈاکٹر صاحب ڈبہ کے دروازے پر کھڑے وداعی سلام کر رہے ہیں کہ دفعۃً اس ہمہ تن جوش علامۂ وقت کا وہ سر جو بڑے بڑے جباروں کے سامنے بھی نہیں جھکا تھا، دفعۃً ڈاکٹر انصاری کے بوٹ پر جھک گیا[1]، آنسوؤں نے اس کے گرد و غبار کو دھویا اور لب نے اس کے بوسے لیے اور گاڑی اسلامی غیرت و حمیت کے ان گہر ہائے گراں مایہ کو لے کر آگے بڑھی۔

چند مہینوں کے بعد جنگ کے اختتام پر جب ڈاکٹر انصاری اپنا یہ طبی وفد لے کر ہندوستان واپس آئے ہیں تو مولانا اتفاق سے بمبئی میں تھے، جب وہ جہاز سے اترے تو مولانا نے ان کے پاؤں دوبارہ چومنے چاہے، ڈاکٹر صاحب نے معذرت چاہی تو فرمایا کہ ''یہ تمہارے پاؤں نہیں، اسلام کے مجسمۂ غربت کے پاؤں ہیں'' ان کے یہی جذبات موزوں نالہ کی صورت بن کر بمبئی کے اس جلسہ میں ظاہر ہوئے جو اس وفد طبی کے استقبال و خیر مقدم کے لیے بمبئی میں ہوا تھا، بڑی پر درد نظم ہے:

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری — کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفد انصاری
ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی — یہی تھا درد اسلامی یہی تھی رسم غم خواری
فراق ملک و ترک خانماں و دوریِ منزل — خدا کے فضل سے تم نے یہ کڑیاں جھیل لیں ساری
تمہارے روکنے کے واسطے ہنگامہ آرا تھے — صدائے نالہ ہائے درد و جوش گریہ و زاری
نگاہ حسرت آلود عزیزاں کی سناں باری — فغانِ سینہ ریشانِ محبت کی شرر باری
مگر اک جذبۂ اسلام نے سب کو شکستیں دیں — کہ سب کو چھوڑ کر پہنچے وہاں باایں گراں باری

[1] اس قسم کے واقعہ کو غلبہ حال پر محمول سمجھنا چاہیے۔ ''س''۔

جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی / کہ سب اہلِ وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری
کسی کو خواب میں بھی یہ سعادت مل نہیں سکتی / مریضوں کے لیے وہ آپ کی شب ہائے بیداری
جو سچ پوچھو تو زیبا ہے تمہیں دعویٰ آقائی / کہ تم نے کی ہے ترکمانِ مجاہد کی پرستاری
تمہارا ناز اٹھائیں اہل ملت جس قدر کم ہے / کہ تم نے غازیانِ دین کی کی ہے ناز برداری
تمہارے سامنے موتی کی لڑیاں پوت سے کم ہیں / کہ دیکھ آئے ہو تم ترکی یتیموں کی گہرباری
تمہیں کچھ جاں نوازی ہائے اسلامی کو سمجھو گے / کہ تم دیکھ آئے ہو نصرانیوں کا طرزِ خوں خواری
نہیں ہے سوزِ اسلامی کا گو نام و نشاں باقی / تمہارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی
مسلمانوں کے تم نے طالع واژوں کو بھی دیکھے ہیں / نئے سب انقلاب گردشِ گردوں بھی دیکھے ہیں
تمہارا دردِ دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے / کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں
یتیموں کے سنے ہیں نالہ ہائے جاں گزا تم نے / زبانِ بے نوا کے چہرۂ محزوں بھی دیکھے ہیں
گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا / بلادِ مغربی کے یہ نئے قانون بھی دیکھے ہیں
مسلمانوں کا قتلِ عام اور ترکوں کی بربادی / نتائج ہائے، امید گلیڈسٹوں بھی دیکھے ہیں
تمہیں نے غازیوں کے زخم پر ٹانکے لگائے ہیں / شہیدانِ وطن کے جامۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں
تمہاری چشمِ عبرت گیر خود ہم سے یہ کہتی ہے / کہ ہم نے وہ مصائب ہائے گوناگوں بھی دیکھے ہیں
لہو کی چادریں دیکھی ہیں رخسارِ شہیداں پر / زمیں پر پارہائے سینہ پرخوں بھی دیکھے ہیں
نگار آرائیاں دیکھی ہیں چشمِ گوہر افشاں کی / شہیدانِ وفا کے عارضِ گلگوں بھی دیکھے ہیں
تمہیں سے کچھ پتہ ملتا ہے، شیدایانِ ملت کا / کہ تم نے شاہدِ اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں
جنونِ جوشِ اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے / کہ تم نے لیلیِٰ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں
سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی / تو تم نے وہ رموزِ قوتِ مکنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے / کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبول یزدانی
تو اب دست دعا ہے اور یہ شبلی نعمانی

ایک فتویٰ لڑائی کے زمانہ میں بقرعید کا زمانہ آ گیا تھا، مولانا کو خیال ہوا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان اس سال قربانی کے روپے ترکی کے فنڈ میں داخل کر دیں تو اچھا ہے کہ قربانی کا روپیہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا جو اس وقت اپنی حقیقی قربانی کر رہے ہیں، فقہ کی رو سے انہوں نے اس پر غور کیا تو ان کو کوئی مانع

نظر نہیں آیا، مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی بھی یہیں تھے، ان سے رجوع کیا، مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کو لکھا اور اس باب میں جو فتویٰ مرتب کیا تھا وہ دکھایا تو سب نے تائید کی ادھر سے تسلی ہوگئی تو اس تحریک کو اخباروں میں پیش کیا اور وہ چل پڑی، اس طرح ہزاروں روپیے اس فنڈ میں جمع ہو گئے، بعض علما نے ان کے اس فتویٰ سے اختلاف بھی کیا، چنانچہ مولوی ظفر علی خاں نے مولانا کو اپنا شبہ لکھ بھیجا تو ۱۶؍نومبر ۱۹۱۲ء کو اس کے جواب میں لکھا ''عزیزی مولوی ظفر علی خاں صاحب دام قدرہٗ السلام علیکم میں نے جو فتویٰ لکھا اس سے علمائے فرنگی محل بھی متفق ہیں اور مولوی عبدالباری صاحب کا خط بھی شائع ہو چکا ہے، ہدایہ میں اس کا جزئیہ موجود ہے[1]، البتہ ہدایہ میں صرف جواز ہے اور میں نے افضلیت کا فتویٰ دیا ہے، اس قدر میرا اجتہاد ہے۔

بھائی! ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے اور قربانی کا درجہ واجب سے زیادہ نہیں، آپ کہتے ہیں کہ سنت ابراہیمی موقوف نہ ہو، ہاں وہی سنت مقصود ہے، فرق یہ ہے کہ آپ اس سنت کو لیتے ہیں جس کا مینڈھے پر عمل ہوا اور میں وہ پیش نظر رکھتا ہوں جو اسماعیل علیہ السلام پر مقصود تھی، کیا ترکوں کی جان مینڈھے سے بھی کم ہے؟ پھر ۱۷؍نومبر ۱۹۱۲ء کو عام اخباروں میں اپنا ہی خط چھپوایا:

> جناب من! بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ ترکوں کی ہمدردی میں اگر قربانی کے بجائے قیمت دی گئی تو اس سے احتمال ہوگا کہ قربانی خود غیر ضروری ہے۔
>
> لیکن یہ صحیح نہیں، شریعت میں فرائض کے درجات میں بھی ترتیب ہے اور وقتی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے، غزوۂ خندق میں جہاد میں مصروف ہونے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی نماز عصر قضا ہوئی تو کیا یہ حجت ہو سکتی ہے کہ نماز کا قضا کرنا جائز ہے؟
>
> ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے، اس لیے اس خاص موقع اور ضرورت کے وقت اگر یہ فرض مقدم رکھا گیا تو اس سے آیندہ کے لیے کیا حجت ہو سکتی ہے؟
>
> قربانی شعار اسلام ہے، مسلمان اس کو نہیں چھوڑ سکتے، نہ کوئی قوم ان کو اس پر مجبور کر سکتی ہے، نہ وہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کی پروا کر سکتے ہیں۔

---

[1] مولانا نے اپنی تائید میں ہدایہ کی یہ عبارت پیش کی تھی، والتضحية فيها افضل من التصدق بثمن الاضحية یعنی عیدالضحیٰ کی قربانی کے دنوں میں قربانی کی قیمت کے صدقہ کرنے سے قربانی کرنا بہتر ہے۔(هدایه كتاب الاضحية) اس عبارت کا مقصود یہ ہے کہ اگر قربانی کے جانور کی قیمت نقد خیرات کر دی جائے تو گو اس صدقہ کا بھی ثواب ہوگا، مگر قربانی کی سنت کے ثواب سے محرومی رہے گی، جیسا کہ اس کے آگے کی عبارت میں تفصیل ہے۔'' لانها تقع واجبة اوسنة والتصدق تطوع محض فتفضل عليه '''' س''۔

امید کہ میرا خط اور صاحبانِ اخبار بھی اپنے پرچوں میں نقل کردیں۔''

ترک اس جنگ میں اڈریانوپل (ادرنہ) تک پیچھے ہٹ آئے تھے اور اڈریانوپل بھی ہاتھ سے جا چکا تھا، مگر آخر آخر ایسی صورت ہوئی کہ انہوں نے اس شہر کو جو یورپ میں ان کا پہلا پایہ تخت تھا، دوبارہ لے لیا، مسلمانوں کو اس فتح سے بڑی خوشی ہوئی، شاعر نے ۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء اس پر مبارکباد کے یہ چند شعر گائے:

اے ترک! اے مجسمۂ کبریائے حق — اے وہ کہ جس پہ عالم ہستی کو ناز ہے
پشت و پناہِ ملت ختم الامم ہے تو — تو آج زور بازوئے شاہِ حجاز ہے
رنگیں ہے تیری تیغ سے ہر صفحۂ وجود — مغرب ترا ہی عرصہ گہِ ترک تاز ہے
تو نے دکھا دیا کہ تری تیغِ جاں ستاں — اب بھی فنائے ہستی دشمن کا راز ہے
رنگیں جو ہے مرقع عالم کا ہر ورق — شمشیر تیری خامۂ رنگیں طراز ہے

طرابلس اور بلقان کے ساتھ ساتھ سیاسیات اسلامی کا تیسرا اہم حادثہ خود ہندوستان میں مسجد کان پور کی صورت میں پیش آیا۔

مسجد کان پور کا ہنگامہ اگست ۱۹۱۳ء رمضان ۱۳۳۱ھ بلقان کا شورِ محشر ابھی برپا ہی تھا کہ مسجد کان پور کا ایک نیا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا، یہ ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی وقومی جوش وخروش کے طوفان کا سب سے بڑا خونیں منظر ہے، یہ عین اس وقت رونما ہوا جب جنگ بلقان کی آگ ایک طرف ہندوستان سے ہزاروں میل دور بھڑک رہی تھی[1] اور مسلمانوں کے دل برطانی وزارتِ خارجہ کی سیاسی روش سے سخت مشتعل تھے، دلوں کا یہ بخار نکلنے نہیں پایا تھا کہ صوبہ متحدہ کے گورنر سر جیمس مسٹن اور ان کے ماتحت حکام کان پور کی غلط کاریوں نے خود ہندوستان میں اس کا ایک موقع بہم پہونچا دیا، کان پور کے محلہ مچھلی بازار میں ایک مسجد بر سر راہ تھی، وہاں سے شہر کی میونسپلٹی نے ایک نئی سڑک نکالی جس میں مسجد کا ایک حصہ جو وضوخانہ تھا، بیچ میں آ گیا اور مسلمانوں کی مرضی کے خلاف زبردستی اس کو منہدم کر دیا گیا، حالاں کہ اسی کے پاس ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا جس کو بچا کر یہ سڑک نکالی گئی، اس واقعہ نے تمام مسلمانوں میں ایک آگ سی لگا دی، ۳۱ر اگست ۱۹۱۳ء کو جب رمضان المبارک کی دسویں تاریخ تھی، مسلمانانِ کان پور نے مولانا عبدالقادر آزاد سبحانی مدرس اعلا

---

[1] ۲۲ر جولائی ۱۹۱۳ء کو ترکوں نے اڈریانوپل لے لیا تھا، اس کے بعد گو لڑائی ختم ہو چکی تھی، مگر صلح ابھی تک نہیں ہوئی تھی، صلح کی کانفرنس ستمبر ۱۹۱۳ء سے شروع ہوئی۔ ''س''۔

مدرسۃ الٰہیات کان پور کی سرکردگی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا، جلسہ میں کافی جوش وخروش پیدا ہوا، جلسہ کے بعد پرجوش مسلمانوں نے جن میں بچے بھی تھے، مسجد کا رخ کیا اور مسجد کی منہدم دیوار پر اینٹیں چن چن کر رکھنے لگے، مسٹر بٹلر ڈپٹی کمشنر کان پور نے یہ دیکھ کر مسجد پر متعین سکھ فوج کو ان نہتے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا، فوجی پولیس کے سپاہیوں اور سواروں نے ان پر نہایت بے رحمی سے دور سے گولیاں برسائیں اور قریب سے برچھے مارے، شہیدوں اور زخمیوں میں ننھے ننھے بچے بھی شامل تھے، شہدا کی تعداد کا صحیح اندازہ معلوم نہ ہوا، سرکاری اندازہ بیس تیس آدمیوں کا تھا، اس خونی سانحہ نے تمام ہندوستان کو خونیں بنا دیا، آتش بیاں مقرروں، شعلہ افشاں محرروں اور شعلہ نفس شاعروں نے مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگا دی، یہ واقعہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد اور آزادی پرستی کے سلسلۂ تاریخ کی ایک اہم کڑی ہے، مولانا مرحوم پر اس واقعہ نے بے حد اثر کیا اور یہ اثرات نالہائے موزوں بن کر ان کی زبان وقلم سے ادا ہوئے اور ان کی ان نظموں نے، حقیقت یہ ہے کہ ملک کے سیاسی انقلاب میں مسلم طور سے بہت بڑا حصہ لیا، اس واقعہ کے کئی برس کے بعد تک یہ نظمیں ہندوستان میں بچہ بچہ کی زبان پر تھیں اور اب بھی ہیں۔

اس واقعہ کے وقت مولانا بمبئی میں تھے اور راقم الحروف کلکتہ میں الہلال کے ادارہ میں شامل تھا، اس واقعہ کو واقعہ بنانے، تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلمانانِ کان پور کی پرجوش حمایت میں کھڑا کر دینے اور مقتول شہیدوں کے عزیزوں کی دل دہی و دستگیری، زخمیوں کی غم خواری و تیمارداری اور قیدیوں کی قانونی چارہ جوئی کا غیر محدود جذبہ جس کی زبان وقلم کا سب سے زیادہ مرہون ہے، وہ مولانا ابوالکلام کی ذات ہے، اس زمانہ کے مشہور بیرسٹر مسٹر مظہر الحق[1] پٹنہ کو کان پور بھیجنا اور ان کے ساتھ

---

[1] شیوخ فاروقی میں تھے، چھپرہ (بہار) کا ایک گاؤں فرید پور نامی ان کا وطن تھا، انٹرنس کے بعد انگلستان گئے اور بیرسٹر ہوئے، یہ اور گاندھی جی ایک ساتھ ایک جہاز میں بیرسٹر ہو کر ہندوستان واپس آئے تھے، پٹنہ میں بیرسٹری کرتے تھے، کانگریس کے حامی تھے اور مسلم لیگ کے بانیوں میں سے ایک تھے، نہایت پرجوش اور بے باک لیڈر تھے، کونسل اور اسمبلی کے ممبر رہ چکے تھے، وقف اولاد کے کاموں میں مولانا کو زیادہ مشورہ ان ہی سے ملتا تھا، کانگریس اور لیگ کے ملانے میں ان کا بھی حصہ تھا، ۱۹۲۰ء کی خلافت تحریک میں شامل تھے اور ترک موالات کے سلسلہ میں پریکٹس چھوڑ دی تھی، پٹنہ میں صداقت آشرم کے نام سے ایک سیاسی خانقاہ بنا کر اس میں گوشہ نشین فقیر بن کر بیٹھ گئے، یا تو زندگی سراسر انگریزی تھی اور یا بدلی تو ایسی بدلی کہ گلاس میں پانی تک نہ پیتے تھے کہ یہ انگریزی چیز ہے، مس کے کٹورے میں پانی پیتے تھے، تہبند باندھتے تھے اور انگرکھا پہنتے تھے، سپید داڑھی سینے تک لمبی ہوگئی تھی، زمین پر بیٹھتے تھے اور اسی پر سوتے تھے اور اسی سلسلہ میں روحانیات یعنی اسپریچوالزم کا شوق پیدا ہوگیا تھا، لمبا قد، گورا رنگ، بلند آواز، اسی فقیری اور گوشہ گیری کی حالت میں جنوری ۱۹۳۰ء میں وفات پائی، ستر برس کے قریب عمر ہوئی ہوگی۔

ہر صوبہ کے ممتاز وکیلوں اور بیرسٹروں کا کان پور جانا، ان ہی کی تحریک کا فیض تھا، مقامی حیثیت سے سید فضل الرحمٰن صاحب مرحوم وکیل کان پور کی محنتیں بھی بھولنے کے قابل نہیں، اسی واقعہ نے مولانا عبدالقادر آزاد سبحانی کو سب سے پہلے ملک میں روشناس کیا، ملک کے سارے طول وعرض میں ان مظلوموں کی حمایت کے لیے مسلمانوں نے بے خطر جلسے کیے، آتشیں تقریریں کیں، آزادی کا پیام سنایا اور مظلوموں کی امداد اور مقدمہ کے مصارف کے لیے تھوڑی سی کوشش میں انہوں نے ایک لاکھ کی رقم ایسی حالت میں جمع کر دی، جب کہ ابھی مسلم یونیورسٹی کے لیے تیس لاکھ اور بلقان وطرابلس میں ٹرکی کی امداد کے لیے ہزاروں روپیے وہ دے چکے تھے اور دے رہے تھے۔

غرض ہندوستان میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کی تاریخ میں یہ واقعہ متعدد حیثیتوں سے ذکر کے قابل ہے، مولانا نے اس واقعہ پر جو پرجوش نظمیں لکھیں وہ اس قدر پراثر تھیں کہ جس ہفتہ وہ الہلال کلکتہ یا ہمدرد دہلی یا زمین دار لاہور چھپتیں، ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک اسلامی جوش و خروش کے رجز کا کام دیتی تھیں، اس سلسلہ میں جو سب سے پہلی نظم لکھی، اس میں اب بھی جوش وخروش کا وہی طوفان ہے۔

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے	دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر	بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر	نیند آ گئی ہے، منتظر نفخ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب	ظاہر میں گرچہ صاحب عقل وشعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ	مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینہ پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار	از بسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر	لذت شناس ذوق دل ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا	جو خاک وخوں میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا	ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں

انہیں اس کا غم تھا کہ وہ اس وقت بمبئی میں کیوں تھے؟

مساجد کی حفاظت کے لیے پولیس کی حاجت ہے	خدا کو آپ نے مشکور فرمایا عنایت ہے

عجب کیا ہے کہ اب ہر شاہراہ سے یہ صدا آئے
"مجھے بھی کم سے کم اک غسل خانہ کی ضرورت ہے"

پہنائی جا رہیں ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہ زیور سید سجادِ عالی کی وراثت ہے

یہی دس بیس اگر ہیں کشتگانِ خنجر اندازی
تو مجھ کو سستی بازوے قاتل کی شکایت ہے

شہیدانِ وفا کے قطرۂ خون کام آئیں گے
عروسِ مسجد زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
یہ بچے ہیں سویرے ان کو سو جانے کی عادت ہے

شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہے آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے

ان کے دلی تاثر کا اندازہ ان دو قطعوں سے کیجیے:

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے

بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خوں
کہ کان پور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسول عرب کی قوم
کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ظہور میں

سن لو وہ گنج ہائے گراں مایہ دفن ہیں
کچھ بیلقاں کہ خاک میں کچھ کان پور میں

مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ مسٹر بٹلر ڈپٹی کمشنر کان پور کو سزا دی جائے، مسجد اپنی جگہ پر پھر بنوادی جائے، قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے اور مقتولوں کا خوں بہا ادا کیا جائے، سر جیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر یوپی اڑے تھے کہ مسٹر بٹلر جو فیصلہ کر چکے اس میں ترمیم نہیں ہو سکتی۔

ابھی دو برس پہلے دہلی کی تاج پوشی کے موقع پر تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کا تماشا ہو چکا تھا کہ لارڈ کرزن کی تقدیر مبرم کو شہنشاہِ برطانیہ نے آ کر بدل دیا تھا، جس کے متعلق وائسرائے اور وزرائے برطانیہ بار بار کہہ چکے تھے کہ یہ طے شدہ اور ناقابل تغیر مسئلہ ہے، مولانا نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کر کے تعریض و تلمیح کے رنگ میں یہ دو فارسی قطعے ارشاد فرمائے:

حضرت لاٹ بفرمود کہ فرمانفرمائے
(جیمس مسٹن) (وائسرائے)
نیست ممکن کہ دگر بگذرد از گفتہ خود

صدر اعظم بہ سوئے قسمت بنگالۂ شرق
(وزیر اعظم)
نگہے کرد و بفرمود کہ "من کردم و شد"

مولانا نے فرمایا کہ اس اصول کی استواری کا حال تقسیم بنگالہ کے مسئلہ میں معلوم ہو چکا، اب

جب وہ بنگالیوں کے اگیٹیشن سے بدل چکا تو اب مسلمان بھی اس فیصلہ کو بدلوائے بغیر دم نہیں لیں گے، ''گربہ کشتن روزاول باید''

جناب لاٹ از فرمودۂ خود برنمی گردد | کہ تمکین حکومت را سیاست بیشتر باید
دلے درقسمت بنگالہ ایں اندیشہ می بایست | کہ گربہ کشتن اول روز می باید اگر باید

سرسید علی امام مرحوم اس زمانہ میں وائسرائے کی کونسل میں ممبر تھے، انھوں نے مولانا محمد علی مرحوم کو اور ان کے ذریعہ سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم کو مصالحت کا پیام دیا اور صلح کی گفت و شنید کا آغاز ہوا اور بات یوں شروع ہوئی کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا، ملزموں سے مقدمہ اٹھا لیا جائے گا اور مظلوموں کو مالی امداد دی جائے گی لیکن مسجد کا جو حصہ توڑ دیا گیا ہے وہ اب اسی طرح چھوڑ دیا جائے اور مسلمان اس کو دوبارہ بنوانے پر اصرار نہ کریں، یہ سن کر مولانا نے یہ قطعہ لکھ کر چھپوایا:

لوگ کہتے ہیں کہ حکام ہیں آمادۂ صلح | یہ اگر سچ ہے تو جز خوبی تقدیر نہیں
لیکن انعام گرانقدر و وظائف کی طمع | یہ حقیقت میں کوئی صلح کی تدبیر نہیں
مایۂ بحث اگر ہے تو فقط مسجد ہے | دیت قتل شہیدان جواں میر نہیں
داد خواہِ حق مسجد ہیں اسیرانِ جفا | ورنہ ان کی گلۂ سختیِ تقدیر نہیں
ہم سے خود ذوق اسیری نے یہ کانوں میں کہا | کہ خم طرۂ محبوب ہے زنجیر نہیں
جز مسجد کو اگر آپ سمجھتے ہیں حقیر | آپ کے ذہن میں اسلام کی تصویر نہیں
آپ کہتے ہیں وضوخانہ تھا، مسجد تو نہ تھی | یہ بجا مسئلہ فقہ کی تعبیر نہیں
آپ اس بحث کی تکلیف نہ فرمائیں کہ آپ | حامل فقہ نہیں، واقف تفسیر نہیں
بند کرتے ہیں جو یہ آپ جرائد کی زبان | یہ بھی کچھ مانع آزادیِ تحریر نہیں
اور بھی برہمی طبع کا ساماں ہے یہ | فتنۂ عام کے دبنے کی یہ تدبیر نہیں
فتح اس طرح کیا کرتے ہیں اقلیم قلوب | تیر ترکش میں نہیں، ہاتھ میں شمشیر نہیں
اور ہی کچھ ہے گرفتاری دل کی تدبیر | سختی طوق و گراں باری، زنجیر نہیں
جبر سے برہمی عام کا رُکنا ہے محال | یعنی اس خواب پریشاں کی یہ تعبیر نہیں
داد خواہوں سے ہز آنر نے جو ارشاد کیا | کہ ''یہ حکم ازلی قابل تغیر نہیں''

حسن ظن کے جو گرفتار تھے وہ بول اٹھے — اس مرقع میں بھی اسلام کی تصویر نہیں
ہم اسیرانِ محبت سے یہی ہے جو سلوک — پھر نہ کہیے گا کہ فتراک میں نخچیر نہیں

بالآخر مصالحت کی تدبیر کامیاب ہوئی، لارڈ ہارڈنگ وائسرائے خود کان پور آئے اور سر علی امام نے حکومت کی طرف سے اور مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی نے مسلمانوں کی نیابت فرما کر معاملہ کو اس طرح طے فرمایا کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے، مقدمے واپس لے لیے جائیں اور مسجد جو بلندی پر تھی اس کے ٹوٹے ہوئے حصہ کو اس طرح بنایا جائے کہ اوپر چھت دے کر وضو خانہ پھر قائم کر دیا جائے اور چھت کے نیچے سے سڑک کی آمد و رفت کا راستہ رہے، اس فیصلہ کو سب نے منظور کیا اور وائسرائے نے اپنی طرف سے اس کا اعلان کیا، اس اعلان پر مسلمانوں کے احرار اور وفادار دونوں طبقوں نے شکر گزاری کا اظہار کیا، مولانا نے وائسرائے کو خطاب کر کے حسب ذیل قطعہ میں اپنی شکر گزاری کا فرض ادا کیا:

اے ہمایوں گہر و افسر اورنگِ شہی — وہ کیا تو نے جو آئین جہاں بانی ہے
تو نے ظاہر میں رعایا سے جو کھائی ہے شکست — یہ حقیقت میں ظفر مندیِ سلطانی ہے
تو نے سمجھا کہ رعایا کا وہ انبوہ وہ جوش — گر چہ زائد نہ سہی فطرت انسانی ہے
تیرے لطف و کرم عام نے دے دی یہ ندا — کوئی مجرم ہے نہ قیدی ہے، نہ زندانی ہے
تو نے اک آن میں گرتا ہوا گھر تھام لیا — بازوؤں میں یہ تیرے زور جہاں بانی ہے
بات رکھ لی تری تقریر نے حکام کی بھی — گر چہ لازم انہیں اظہار پشیمانی ہے
گر چہ مدحِ امرا میں نے نہیں کی ہے کبھی — شکر احسان مگر فطرتِ انسانی ہے
تیرے دربار میں پہنچیں گے جو اوراقِ سپاس — ان میں یہ پیش کش شبلی نعمانی ہے

اور مولانا ابوالکلام کو جو اس زمانہ میں مسلمانوں کے سب سے مقبول رہنما اور اس تحریک کے جان تھے، لکھا ''برادرم! کان پور کا معاملہ جس طرح ہوا، فیصل ہوگیا، اب سر دست اس سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں۔'' (ابوالکلام-۳۸)

چنانچہ اسی پر اس کا خاتمہ ہوگیا، مظہر الحق صاحب کے پاس جو ہزاروں روپے جمع ہو گئے تھے، اس سے برسوں تک کان پور کے مظلوموں اور بیواؤں کی امدادیں ہوتی رہیں، پھر وہ سلسلہ بند ہوگیا۔

سیاسیات ہند ملکی معاملات میں وہ ہمیشہ سے آزاد تھے اور آزاد رہے، حالاں کہ وہ ایک ایسے

گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جس نے اس زمانہ کے دستور کے مطابق حکومت وقت سے وفاداری اور حکام شہر سے تابع داری میں نیک نامی حاصل کی تھی، ان کے والد ماجد اور خاندان کے دوسرے بزرگوں نے اپنی ساری عمر حکام ضلع کی خوشنودی کی دولت جمع کرنے میں صرف کی تھی، وہ گھر سے نکل کر علی گڑھ گئے تو وہاں کی فضا بھی یہی تھی، وہاں کے آنے جانے والے بھی وہی تھے، بلکہ اس موضوع نے وہاں قومی مذہب کی حیثیت اختیار کرلی تھی، جس سے انکار ارتداد سے کم نہ تھا، اس لیے ان موانع کے ساتھ مولانا کی سیاسی آزادی ان کی فطری صلاحیت کے سوا کسی اور سبب کی ممنون نہیں ہوسکتی۔

مولانا اپنے ایک خط میں جو معارف میں چھپ چکا ہے، ایک صاحب کو لکھتے ہیں:

''رائے میں ہمیشہ آزاد رہا، سرسید کے ساتھ ۱۶ ربرس رہا، لیکن پولٹیکل مسائل میں ہمیشہ ان سے مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا رہا اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں'' (معارف نومبر ۱۹۲۳ء ص ۳۹۴)

خواجہ غلام الثقلین مرحوم جو سرسید اور مولانا شبلی کے زمانہ کے علی گڑھ کالج میں پڑھتے ہوئے تھے اور دونوں سے اچھی طرح واقف تھے، مولانا کے سانحۂ وفات پر اپنے ''عصر جدید'' (مورخہ ۱۷ر دسمبر ۱۹۱۴ء) میں لکھتے ہیں '' سرسید احمد خاں مرحوم مذہب میں کچھ کم آزاد خیال نہ تھے لیکن سیاسی معاملات میں وہ زیادہ تر قدامت پسند یا کنسرویٹو واقع ہوئے تھے، اس لیے کالج کی پروفیسری کے زمانہ ہی سے مولانا شبلی کو سرسید کے سیاسی خیالات سے سخت کراہت تھی۔''

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل راوی ہیں کہ سرسید نے لکھنؤ میں کانگریس کے حالات جو مشہور تقریر کی تھی مولانا نے اپنا نام چھپا کر علی گڑھ گزٹ میں اس کا جواب لکھا تھا۔

۱۸۹۲ء میں یونین کے ایک جلسہ میں شخصی اور جمہوری حکومت پر جو مباحثہ ہوا تھا اور مولانا نے جمہوریت کی تائید پر جو تقریر کی تھی اور سرسید نے اس کے جواب میں اپنے گزٹ میں جو مضمون لکھا تھا اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

بایں ہمہ مولانا کی سیاست ابھی تک مجلسی بحث سے آگے نہیں بڑھی تھی، وہ اپنی مجلس میں بیٹھ کر کانگریس کے مطالبوں پر رجز خوانی اور مسلمانوں کی سیاسی گمرہی کا ماتم کیا کرتے تھے اور بس اردو اخباروں میں ''ہندوستانی'' لکھنؤ کو جسے لکھنؤ کے کانگریسی لیڈر گنگا پرشاد ورما نکالتے تھے، بہت شوق سے پڑھتے تھے اور اس سے اثر لیتے تھے لیکن دسمبر ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ نے دفعۃً لبوں کی مہر کو

توڑ دیا، نواب وقار الملک کے مضمون کے بعد جو دوسرا بہادرانہ مضمون اس انقلاب کی بشارت لے کر نکلا وہ مولانا شبلی ہی کا تھا، جس کی سرخی "مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ" ہے، مسلمانوں میں مستقل سیاسی انقلاب برپا کرنے کے لیے آزاد اخبارات کا وجود بہت ضروری تھا، اس وقت لاہور سے زمیندار دلی سے ہمدرد اور کلکتہ سے الہلال جیسے اخبارات نکل رہے تھے اور یوپی جو اصل میں مسلمانوں کا تمدنی و سیاسی مرکز تھا، اس قسم کے اخباروں کے وجود سے خالی تھا، مولانا نے اس کمی کو پورا کرنا چاہا۔

مسلم گزٹ ۱۹۱۲ء اس زمانہ میں لکھنؤ میں ایک عالی ہمت نوجوان سید میر جان صاحب تھے، انہوں نے ان دنوں لکھنؤ کی گرسرمیوں میں بہت اچھا خاصا حصہ لیا تھا، ایک ریڈنگ روم قائم کیا تھا، مولانا نے ان دنوں امین آباد پارک کی شمالی قطار میں ایک بالاخانہ کرایہ پر لیا تھا، اس میں رہتے تھے، اسی کے پاس یہ ریڈنگ روم تھا، سید میر جان صاحب اکثر مولانا کی خدمت میں آیا جایا کرتے تھے، مولانا نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ ایک آزاد مسلمان اخبار جاری کریں، جس کے تبادلہ میں اخبارات آئیں گے بھی اور صحیح خیالات کی ترویج بھی ہوگی، انہوں نے اس شرط پر آمادگی ظاہر کی کہ اس کے مضامین کی نگرانی مولانا اپنے ذمہ لیں، انہوں نے اس کو قبول کیا اور اسی طرح مسلم گزٹ کے نام سے ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ سے اخبار نکلا۔

اخبار کی ایڈیٹری کے لیے مولانا نے مولوی وحید الدین صاحب سلیم کو پسند کیا، جو اس سے پہلے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور معارف (علی گڑھ) کے ایڈیٹر تھے، ان کا کمال یہ تھا کہ وہ پورا اخبار تنہا تیار کر لیتے تھے، بڑے لکھنے والے تھے اور جو لکھتے تھے وہ ٹھوس لکھتے تھے، اس میں نری لفاظی اور بھرتی نہیں ہوتی تھی لیکن دقت یہ تھی کہ علی گڑھ کے زمانہ میں ان کے والد اور مولانا کے درمیان میں بعض معاملات میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا، جس کی بنا پر مولوی وحید الدین صاحب سلیم کا دل مولانا کی طرف سے صاف نہ تھا، الفاروق نکلی تو مئی ۱۸۹۹ء میں مولانا شروانی نے اس پر ریویو لکھا اور اس کو مولوی وحید الدین صاحب کے رسالہ معارف علی گڑھ میں چھپوانا چاہا، تو مولانا نے شروانی صاحب کو لکھا "بہتر ہے معارف میں بھیج دیجیے، مگر پہلے ان سے پوچھ لیجیے کہ چھاپیں گے یا نہیں؟ اڈیٹر صاحب مجھ سے خفا ہیں" (شروانی-۵) مگر بہر حال وہ ریویو اس میں چھپا، اس کے دو ہی برس کے بعد ۱۹۰۱ء میں جب حیات جاوید نکلی تو اس اختلاف کی بنا پر جو مولانا کو سرسید کے بعد خیالات یا پچھلی کارروائیوں سے تھا اور جن کا ذکر حیات جاوید میں نہیں یا بہت ہلکا ہے، مولانا نے اس کتاب کو مدلل مداحی یا کتاب المناقب کہا، جس سے مولانا حالی کی تنقیص

مقصود نہ تھی، بلکہ یہ مقصود تھا کہ اس کتاب میں صاحب سوانح کی زندگی کے دونوں رُخ ہیں، مولانا حالی کو اس کمی کا احساس خود بھی تھا، چنانچہ انہوں نے دیباچہ میں خود اپنے اس احساس کی تشریح اور اپنے طرز عمل کی توجیہ کی ہے۔

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ ''میں نے جو ریویو حیات جاوید پر لکھا تھا، اس میں یہ پہلو بسط سے دکھایا تھا، مولانا نے اس کو پڑھ کر لکھا کہ اگر اور ریویو بھی ایسے لکھے جائیں تو کتاب کا زہر بہت کچھ کم ہو سکتا ہے۔

بہر حال مولانا کی اس تنقید سے مولانا حالی کے بعض خاص عقیدت مندوں کو بڑی تکلیف پہنچی اور اس وقت سے ان صاحبوں کے قلم سے جب کوئی ایسا مضمون نکلا جس میں مولانا شبلی کا ذکر کسی طرح آسکتا ہو تو اس کو قصداً لایا گیا اور ان پر چند نا ملائم حرف کہنا صداقت کا منشا سمجھا گیا، حالاں کہ خود ان دونوں بزرگوں کے دل باہم صاف تھے اور دونوں ایک دوسرے کے پورے جوہر شناس تھے۔

غرض یہ کہ اس اختلاف کے باوجود مولانا نے ان کو اڈیٹری کے لیے منتخب کیا اور وہ خود کسی تقریب سے علی گڑھ گئے تو مولوی وحید الدین صاحب سلیم سے اور ان سے مولانا حمید الدین صاحب کے قیام گاہ پر ملاقات ہوئی اور طرفین کے گلہ و شکایت کے بعد جس میں سرسید کی لائف لکھنے کے پرانے واقعہ سے حیات جاوید تک کے معاملات پر گفتگو ہوئی[1] اور آخر کار پرانی شکایتوں کی بساط لپیٹی گئی اور باہم لطف و محبت کا نیا عہد نامہ مرتب ہوا اور مولوی صاحب مسلم گزٹ کی اڈیٹری کے لیے لکھنؤ تشریف لے آئے اور مولانا کے قریب ہی ایک دوسرے بالا خانہ میں قیام کیا اور مسلم گزٹ ایک آزاد اخبار کی حیثیت سے بہت کامیابی سے نکلا اور دو سال تک نکلتا رہا اور مولوی وحید الدین صاحب اگست ۱۹۱۳ء تک اس کے اڈیٹر رہے۔

شروع شروع میں مولوی صاحب اور مولانا میں بڑا اتحاد رہا، اکثر ساتھ نشستیں رہتیں، صحبتیں چھنتیں اور معاملات پر گفتگو اور اخبار کی سیاست کی تجویزوں پر بحثیں ہوتی، مولانا اس اخبار میں کبھی اپنے نام سے اور کبھی بے نام کے مضامین اور نوٹ لکھتے تھے، اس سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ یہ خاص مولانا کا اخبار ہے، اس لیے اس اخبار کی پسندیدگی کا سارا کریڈٹ مولانا کے حصہ میں آتا رہا، مولانا کا خیال تھا کہ مولوی وحید الدین صاحب کو یہ امر ناگوار ہوا اور وہ اس کی فکر میں رہے کہ کوئی ایسا موقع آئے جس میں

---

[1] یہ روایت مولوی اقبال احمد صاحب سہیل جو اس وقت وہیں موجود تھے۔

خود مولانا کے مقابلہ میں وہ اپنی آزادی کا ثبوت دیں، چنانچہ مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی کے سلسلہ میں ان کو یہ موقع ہاتھ آیا اور انہوں نے نہایت ناموزوں طریقہ سے مولانا کے خلاف سخت و درشت مضمون لکھنے اور چھاپنے شروع کیے، پھر ۱۹۱۳ء میں طلبائے ندوہ کی اسٹرائک کی تقریب سے مولانا کے خلاف بہت کچھ لکھا تاکہ لوگوں کا یہ خیال کہ یہ اخبار سارا مولانا کا ساختہ و پرداختہ ہے، دور ہو جائے، اسی درمیان میں مولوی وحید الدین صاحب اگست ۱۹۱۳ء میں پولیٹکل وجوہ سے گورنمنٹ کے حکم سے لکھنؤ سے باہر کر دیے گئے اور یہ سلسلہ ختم ہوا[1]۔

مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ بہرحال مسلم گزٹ جس سیاسی مقصد کو لے کر پیدا ہوا اور چلا اور بڑھا، وہ تمام تر مولانا کی تجویز و ہدایت کے مطابق تھا، اس وقت تقسیم بنگال کی تنسیخ، بلقان کی جنگ، مسلم یونیورسٹی کے مطالبات، کان پور کی مسجد اور مسلم لیگ کی اصلاح اور مسلمانوں میں صحیح پولیٹکس کا مذاق پیدا کرنے کی کوشش وغیرہ مسائل خاص اہمیت رکھتے تھے اور ان ہی مسئلوں پر مولانا کے مضامین اور نظمیں نکل رہی تھیں، مسلم گزٹ میں ان کے جو سیاسی مضمون نکلے ان میں سب سے اہم سلسلۂ مضمون وہ ہے جو مسلمانوں کے پولیٹکل کروٹ کے عنوان سے چار نمبروں میں شائع ہوا، حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون اس قدر مدلل اور پرجوش تھا کہ اس نے مسلمانوں کی سیاست کا رخ شملہ سے قبلہ کی طرف پھیر دیا۔

مضمون کا پہلا نمبر جو ۱۲؍ فروری ۱۹۱۲ء کو نکلا، اس کا آغاز یہ ہے ''اگر یہ سچ ہے کہ تقسیم بنگال کے طمانچے سے مسلمانوں کی پالیٹکس کا منہ پھر گیا تو ہم رضامند ہیں کہ اس تقریب مسرت میں بنگال کے سوا کچھ اور بھی نثار کر دیا جائے لیکن مرکز پالیٹکس اور اس کے حوالے سے جو صدائیں آتی ہیں، زود فنا ہونے کے ساتھ خود ان کا لہجہ بھی غلط ہے۔

پانیر کا مسلمان نامہ نگار لکھتا ہے کہ ''چوں کہ اب نظر آتا ہے کہ ٹرکی اور ایران کے کم زور ہونے کی وجہ سے ہمارا فارن رتبہ قائم نہیں رہے گا، اس لیے ہم کو ہندوؤں سے مل جانا چاہیے'' ہندوؤں سے ملنا اچھی بات ہے لیکن یہ ہمیشہ سے اچھی بات تھی اور ہمیشہ اچھی بات رہے گی لیکن نامہ نگار نے جو جدید ضرورت بیان کی ہے، وہ اسلام کا ننگ ہے، کیا ہم کو ہمسایوں کے دامن میں اسی لیے پناہ لینی چاہیے کہ اب ہمارا کوئی سہارا نہیں رہا، کیا اگر ٹرکی اور ایران پرزور ہوتے تو ہمارے ہم سایہ کے مقابلے میں مدد کر سکتے؟ کیا شملہ ڈیپوٹیشن کی اس فخاری پر انگریزوں کو یقین آ گیا تھا کہ ہمارا پولیٹکل وزن اپنے ہم سایوں سے زیادہ ہے؟

---

[1] مکاتیب سلیمان-۵۳ نیز دیکھیے عبدالباری-۵۔

اس کے بعد نواب وقار الملک بہادر کے اس بہادرانہ مضمون کا ذکر ہے جو تنسیخ بنگال کے بعد ان کے قلم سے نکلا لیکن ان کی اس رائے سے کہ ''مسلمان کانگریس میں شرکت کریں گے تو ان کی ہستی فنا ہو جائے گی'' اتفاق نہیں کیا، لکھا ''نواب وقار الملک کا سنجیدہ لیکن بہادرانہ مضمون ایک سچے دلیر مسلمان کی آواز ہو سکتا تھا، اگر اس میں یہ غلط منطق شامل نہ ہو جاتی کہ ہم نیشنل کانگریس میں شریک ہو جائیں گے تو ہماری ہستی اس طرح برباد ہو جائے گی، جس طرح معمولی دریا سمندر میں مل جاتے ہیں، اگر پارسیوں کی قوم ایک لاکھ کی جماعت کے ساتھ ہندوؤں کے ۱۹ کروڑ اور مسلمانوں کے پانچ کروڑ افراد کے مقابلہ میں اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے اگر دادا بھائی نوروز جی تمام ہندوستان کے مقابلہ میں سب سے پہلے پارلیمنٹ کا ممبر ہو سکتا ہے، اگر گوکھلے تنہا ریفارم اسکیم کی عظیم الشان تحریک کی بنیاد ڈال سکتا ہے تو ۵ کروڑ مسلمانوں کو اپنی ہستی کے مٹ جانے کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیے۔

غرض دلائل اگرچہ غلط ہیں لیکن بات بالکل صحیح ہے کہ پولیٹکل خواب سے بیدار ہونے کا وقت آ گیا ہے، اس کے بعد مسلمانوں کی سیاسی غفلت پر ماتم کیا ہے، ہم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جس چیز کو ہم پالیٹکس سمجھتے تھے، وہ پالیٹکس کی تحقیر تھی، ہماری پالیٹکس کا کعبہ دراصل بت کدہ تھا، ہماری پالیٹکس جس کی آواز کلمۂ شہادت کی طرح ولادت کے دن سے ہماری کانوں میں پڑی، صرف یہ تھی، ابھی وقت نہیں آیا ہے، ابھی ہم کو پالیٹکس کے قابل بننا چاہیے، ابھی صرف تعلیم کی ضرورت ہے، ہماری تعداد کم ہے، اس لیے نیابتی اصولِ سلطنت ہمارے موافق نہیں۔''

یہ الفاظ اس قدر دہرائے گئے کہ قوم کی رگ و پے میں سرایت کر گئے، ہر مسلمان بچہ ان خیالات کو ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور زندگی کے تمام مراحل میں ساتھ رکھتا ہے، مسلمانوں کی عام جماعت میں جب پالیٹکس کا نام آتا ہے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اچھے سے اچھا نوجوان تعلیم یافتہ گراموفون کی طرح ان الفاظ کو دہراتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدوجہد، سعی و کوشش، حوصلہ مندی، قوت عمل، سرگرمی، جوش اور ایثار نفس کے لحاظ سے عام سناٹا چھا گیا، ہم سنتے ہیں کہ گروکل میں تین سو وہ بچے تعلیم پا رہے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی قوم کے ہاتھ فروخت کر دی ہے اور جو باوجود دولت مندی کے زمین پر سوتے اور کمل اوڑھتے ہیں، ہم کو معلوم ہے کہ پونا میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی قائم ہے، جہاں اس وقت ۲۹۔ بی، اے

پالیٹکس کی تعلیم پا رہے ہیں جو پانچ برس کی تعلیم کے بعد تمام عمر ہندوستان کی خدمت کریں گے اوران کی کل زندگی کی قیمت صرف ۳۰ روپیہ ماہوار ہوگی، ہم واقف ہیں کہ فرگوسن کالج میں ۱۹ پروفیسروں نے جن میں سے کوئی بی اے سے کم تعلیم یافتہ نہیں، صرف ۷۵ روپے ماہوار پر اپنی تمام عمر فروخت کر دی ہے، ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ آریہ کالج اور ہندو کالج میں متعدد ہندو پروفیسر ہیں، جو بغیر کسی معاوضہ کے کام کرتے ہیں، لیکن یہ تمام عبرت انگیز آوازیں، یہ تمام پرجوش نمونے، یہ تمام حیرت انگیز واقعات ہمارے دلوں میں ایک ذرہ جنبش نہیں پیدا کر سکتے، ہماری قومی درس گاہوں نے آج تک ایثار نفس کی ایک مثال بھی نہیں پیدا کی، ہمارا قومی تربیت یافتہ گریجویٹ قومی کام میں نرخِ بازار سے ایک حبہ اپنی قیمت نہیں کم کرتا، کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہمارا پولیٹکل احساس بالکل مر گیا ہے۔

دنیا میں صرف آئیڈیل (مطمح نظر) ایک چیز ہے جو انسان کے جذبات واحساسات کو برانگیختہ کر سکتی ہے، ہمارا آئیڈیل کیا ہے؟ ہم نے کس چیز کوتاکا ہے؟ ہمارا کیا منتہائے خیال ہے؟ بی، اے اور نوکریاں، کیا اس آئیڈیل سے قوم میں کسی قسم کے پرزور جذبات پیدا ہو سکتے ہیں؟ کیا اتنی سی بات کے لیے زحمتیں برداشت کی جا سکتی ہیں؟ کیا یہ مقصد کوئی بڑا ولولہ دل میں پیدا کر سکتا ہے؟ کیا اس ذوق میں فرشِ خاک پھولوں کی سیج بن سکتا ہے؟

اس پست مقصد سے سخت نقصان یہ ہوا کہ تمام قوم کی قوم میں پست حوصلگی، جبن اور بزدلی چھا گئی، ہمارے پولیٹکل لغت نے جائز آزادی کا نام بغاوت رکھ دیا ہے، ایک پارسی یا ہندو کانگریس میں جاتا ہے، انتظام حکومت پر نکتہ چینیاں کرتا ہے اور پھر پارلیمنٹ اور وائسرائے کی کونسل کا ممبر باقی رہتا ہے لیکن مسلمان ایجوکیشنل کانفرنس میں آتے گھبراتے ہیں اور سرسید سے فتویٰ پوچھتے ہیں، یہاں تک کہ مرحوم کو علی گڑھ گزٹ میں مراسلہ چھاپنا پڑتا ہے کہ ''تعلیمی کانفرنس میں شریک ہونا ممنوع نہیں'' ہم کو معلوم ہے کہ بہت سے معزز لوگوں نے مسلم لیگ کی ممبری کے لیے یہ شرط پیش کی کہ صاحب کلکٹر بہادر سے اجازت دلوائی جائے۔

جب ہم اس اختلاف حالت کا سبب پوچھتے ہیں تو ہمارے لیڈر یہ نازک فرق ہم کو سمجھاتے ہیں کہ ''ہندو مچھر ہیں'' اس لیے گورنمنٹ کو ان کی بھن بھناہٹ کی پروا نہیں لیکن مسلمان شیر نیستاں ہیں، ان کے ہمہمہ سے جنگل دہل جاتا ہے، خیر! یہ فریب کاری ختم ہو چکی، غفلت کا دور گزر چکا، قوم میں

ایک احساس پیدا ہو چلا ہے اور صرف یہ متعین کرنا رہ گیا ہے کہ نئی زندگی کا طریقِ عمل کیا ہوگا؟

مضمون کے دوسرے نمبر میں حسب ذیل امور پر بحث کی ہے:

(۱) پالیٹکس کی صحیح اسکیم۔

(۲) ہمارے موجودہ طریقہ کی غلطیاں۔

(۳) ہندو مسلمانوں کا اتحاد۔

پھر لکھا ہے کہ مسلمان دو حیثیتیں رکھتے ہیں، ایک یہ کہ وہ گورنمنٹ برطانیہ کی رعایا ہیں، (موجودہ زمانہ میں اس کو یوں کہنا چاہیے کہ وہ ہندوستانی ہیں) اور دوسری یہ کہ وہ مسلمان ہیں، اب مسلمانوں کی پالیٹکس کا ہیولیٰ ان ہی دو جزؤں سے بن کر تیار ہوگا، اس سلسلہ میں مولانا نے پہلے شخصی حکومت کے بہ جائے جمہوری حکومت کی تائید کر کے اس غلطی کو دور کیا ہے کہ سرسید مرحوم نے مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھنے کی جو پالیسی اختیار کی تھی، وہ ان کی ذاتی رائے تھی، بلکہ ان کے پس پشت کوئی اور قوت تھی جو کالج کے فائدے دکھا کر اور مسلمانوں کی تعلیمی کم زوری سے ڈرا کر گویا زبردستی ان کے منہ سے یہ کہلوا رہی تھی، چنانچہ سرسید کی سیاسی آزادی کے چند واقعے نہایت بلیغ انداز میں گنوا کر فرماتے ہیں ''ایسے بہادر کو حالات اور گرد وپیش کے واقعات نے اس پر مجبور کیا کہ اس نے تمام اسلامی پبلک کو پالیٹکس سے روک دیا، یہ کیوں ہوا؟ کن اسباب سے ہوا؟ کس چیز نے یہ اختلاف حالت پیدا کر دیا؟ ان سوالات کا آج جواب دینا غیر ضروری بلکہ مضر ہے۔''

اس کے بعد سرسید کی لکھنؤ والی تقریر کے ایک ایک ٹکڑے کو لے کر واقعات سے اس کا مدلل اور مسکت جواب دیا ہے، آخر میں کہتے ہیں ''بہر حال سرسید نے اگر نیشنل کانگریس سے روکا تو اچھا کیا، کانگریس میں شریک ہونا پھر بھی تقلید تھی، جو ہمارا عار ہے، ہم کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے، ہم کو اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیے، ہماری ضروریات ہندوؤں کے ساتھ مشترک بھی ہیں اور جداگانہ بھی، اس لیے ہم کو ایک جداگانہ پولیٹکل اسٹیج کی ضرورت ہے، اس موقع پر پہنچ کر دفعۃً ہمارے سامنے ایک چیز نمودار ہوتی ہے، مسلم لیگ یہ عجیب الخلقت کیا چیز ہے؟ کیا یہ پالیٹکس ہے؟ خدانخواستہ نہیں، انٹی کانگریس ہے؟ نہیں، کیا ہاؤس آف لارڈس ہے؟ ہاں سوانگ تو اسی قسم کا ہے۔''

مضمون کے ان دو نمبروں کا شائع ہونا تھا کہ سارے ملک میں کھلبلی مچ گئی، فیض آباد اور

راولپنڈی میں ان کے خلاف تحریک کھڑی کی گئی اور ساتھ ہی اسی جرم میں نواب وقار الملک کے خلاف بھی آواز اٹھائی گئی، اس پر مولانا نے اپنے مضمون کا تیسرا نمبر لکھا، جس کا آغاز ان فقروں سے ہے "ہمارے پچھلے دو آرٹکلوں نے ہمارے دوستوں کو سخت برہم کر دیا ہے، ہمارا جرم مفرد جرم نہیں، بلکہ سینکڑوں جرائم کا مجموعہ ہے، ہم نے مسلمانوں کی سی سالہ پالیٹکس کی بے احترامی کی، ہم نے مسلمانوں کی پولیٹکل پالیسی سے بغاوت کی، ہم نے "اتفاقِ عام" کے شیرازہ کو درہم برہم کرنا چاہا، ہماری گستاخیوں سے ڈر ہے کہ لیڈروں کی عظمت وشان میں فرق آ جائے، ہمارا لہجہ سخت ہے، ہم لیگ جیسے پرزور انسٹی ٹیوشن کی عظمت کے منکر ہیں، ہم مصنف کے درجہ پر قانع نہ ہو کر پولیٹکل لیڈر بننا چاہتے ہیں، ہم کونسل کی ممبری کے امیدوار ہیں۔"

اس کے بعد مولانا نے مسلم لیگ کی غلط پالیسی پر پورا تبصرہ کر کے صحیح پالیٹکس کا ایک نظام پیش کیا ہے، اس سلسلہ میں یہ فقرہ کتنا بلیغ اور معنی خیز ہے "اگرچہ ہم آگے چل کر صحیح پالیٹکس بتائیں گے لیکن سچ یہ ہے کہ صرف یہ سمجھ لینا کہ موجودہ پالیٹکس غلط ہے، یہی صحیح پالیٹکس ہے۔"

پھر مسلم لیگ کی کیا حقیقت ہے اور وہ کیوں کر عالم وجود میں آئی، اس پر چند فقرے ہیں:

"اس بنا پر پالیٹکس کی بحث میں سب سے بڑا اور مقدم کام یہ ہے یہ سمجھا دیا جائے کہ مسلم لیگ نہ آج بلکہ ہزار برس کے بعد بھی پالیٹکس نہیں بن سکتی، مسلم لیگ کیوں کر قائم ہوئی؟ کب قائم ہوئی؟ کس نے قائم کی؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ وحی (بہ قول سرسید مرحوم) خود دل سے اٹھی تھی یا کوئی فرشتہ اوپر سے لایا تھا؟

یہ سوالات اگرچہ اصل مسئلہ پر کسی قدر اثر رکھتے ہیں اور اگرچہ ان کے جواب دینے کا حق ہم کو اسی قدر حاصل ہے جس قدر خود بانی اول کو (کیوں کہ جب یہ تماشا ہو رہا تھا تو مجھ کو پردہ کی طرف جھانکنے کی اجازت تھی) تاہم اس سے ضروری تر باتیں درپیش ہیں اور ہم کو پہلے ان کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

امور تنقیح طلب حسب ذیل ہیں:

۱- کیا لیگ کا کانسٹیٹیوشن پالیٹکس سے مطابقت رکھتا ہے؟

۲- کیا اس میں پالیٹکس کی علامات پائی جاتی ہیں؟

۳- کیا مسلم لیگ، مسلم لیگ رہ کر کسی کام کے قابل ہو سکتی ہے؟

لیگ کا سنگ اولین شملہ کا ڈیپوٹیشن تھا اور اب یا آیندہ جو کچھ اس کا ترکیبی نظام قرار پائے، ڈیپوٹیشن کی روح اس میں موجود رہے گی، ڈیپوٹیشن کا مقصد سراپا یہ تھا اور یہی ظاہر بھی کیا گیا تھا کہ جو ملکی حقوق ہندوؤں نے (اپنی سی سالہ جدوجہد سے) حاصل کیے ہیں اس میں مسلمانوں کا حصہ متعین کر دیا جائے''۔

اس کے بعد مولانا نے مسلم لیگ اور کانگریس کی رودادوں سے ان دونوں کے مطالبات کی قدر و قیمت کا موازنہ کیا ہے اور دونوں کے تخیل اور طریق عمل کے فرق کو دکھایا ہے، پھر آخر میں مسلم لیگ کے نظامِ ترکیبی پر بحث کی ہے اور پوچھا ہے ''سب سے آخری بحث یہ ہے کہ مسلم لیگ کا نظام ترکیبی کیا ہے؟ اور کیا وہ قیامت تک درست ہو سکتا ہے؟ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا مسلم لیگ اس خصوصیت کو چھوڑ دے گی کہ اس کو سب سے پہلے دولت اور جاہ کی تلاش ہے اور اس کو اپنے صدر انجمن کے لیے نیابت صدر کے لیے، سکریٹری شپ کے لیے، ارکان کے لیے، اضلاع کے عہدہ داروں کے لیے، وہ مہرے مطلوب ہیں، جن پر طلائی رنگ ہو لیکن پولیٹکل بساط میں ان مہروں کی کیا قدر ہے، کیا ایک معزز رئیس ایک بڑا زمین دار، ایک حکام رس دولت مند، اپنی فرضی آبرو کو نقصان پہنچانا گوارا کر سکتا ہے، ہندوؤں کے پاس زمین داری، دولت اور خطاب کی کمی نہیں لیکن کیا انہوں نے تیس برس کی وسیع مدت میں کسی بڑے زمین دار یا تعلقہ دار کو پریسیڈنٹی کا کرسی نشین کیا؟ کیا اس کے پریسیڈنٹوں میں کسی کا سر خطاب کے تاج سے آراستہ ہے۔''

مولانا نے اس کے بعد اضلاع میں مسلم لیگ کی شاخوں کی ضرورت پر اس لیے بحث کی ہے کہ سارے اضلاع میں چوں کہ ایسے مسلمان نہیں مل سکتے جو بہادری سے صحیح پالیٹکس پر چل سکیں، اس لیے حالت یہ ہوئی ہے کہ جاہ پسند دولت مندوں کی تلاش ہوتی ہے اور چار و ناچار ان کے سر پر یہ تاج رکھ دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد صحیح پالیٹکس کا نظام پیش کیا ہے اور اس کی پہلی دفعہ یہ لکھی ہے:

۱- سب سے پہلا اور مقدم کام یہ ہے کہ مسلم لیگ اپنے مقاصد کے دائرہ کو وسعت دے، چھوٹی چھوٹی باتیں جو کسی خاص فرقہ سے تعلق رکھتی ہیں، ان کے علاوہ ان چیزوں کو اپنا نصب العین قرار دے، جن پر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ موقوف ہے، مثلاً ایک بندوبست کا مسئلہ ہے جس کو لیگ نے کبھی خیال کے ہاتھ سے بھی نہیں چھوا، یہ وہ مسئلہ ہے جس پر ہندوستان کی سرسبزی کا مدار ہے، ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ کاشت کار روز بروز مفلس ہوتے جاتے ہیں، ہر بندوبست مال گذاری کی

مقدار میں اس قدر اضافہ کر دیتا ہے کہ جو زمینیں مویشی کا حق تھیں ان کو اپنے کام میں لانا پڑتا ہے، چارہ نایاب ہوتا جاتا ہے، چرا گاہیں، مزروعہ بنتی جاتی ہیں، ایک فصل بھی اگر کمی کر جائے تو فاقہ کی نوبت پہنچ جاتی ہے، ہزاروں کاشت کار گھر چھوڑ کر نئی آبادیوں میں بھاگتے جاتے ہیں، مالگذاری کے وقت ہزاروں لاکھوں کے زیورات رہن ہو کر بے درد مہاجنوں کے گھر پہنچ جاتے ہیں، با ایں ہمہ ہر تیسویں سال نیا بندوبست ہوتا ہے اور زمین دار نئے بندوبست کے نام سے دہل جاتا ہے۔

فرض کرو کہ اگر بنگال کی طرح ہمارے ملک میں بھی استمراری بندوبست ہو جائے تو یہ ہندوستان کے حق میں رحمت ہوگا یا یہ کہ چند مسلمانوں کو موجودہ تعداد سے زیادہ نوکریاں مل جائیں؟

۲- سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمام انتظامی کاموں میں یہ خواہش کی جائے کی ہندوستانیوں کی شرکت ہو، گوکھلے نے یہ بل پیش کیا تھا کہ ہر ضلع میں ایک کونسل چھ آدمیوں کی قائم ہو اور کلکٹر ضلع ان کے مشورہ سے انتظامی امور عمل میں لائے، کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اپنا حال ہم دوسروں سے زیادہ جان سکتے ہیں، کس کو اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ اپنی تکلیف کا جس قدر احساس ہم کو ہو سکتا ہے دوسرے کو نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ سب سے عمدہ تدبیر تھی جو ملک کی بہبودی کے لیے پیش کی جا سکتی تھی لیکن یہ بل نامنظور کر دیا گیا، مختصر یہ کہ بہ جز کسی خاص رزولیوشن کے باقی تمام ان تجاویز کو جو کانگریس میں پیش کی جاتی ہیں، مسلم لیگ کو اپنے پروگرام میں داخل کرنا چاہیے، جس طرح ہندوؤں کا ماڈریٹ فرقہ کرتا ہے۔

۳- مولوی امیر علی صاحب نے حال میں جو صورت تجویز کی ہے، یعنی یہ کہ مشترکہ مسائل میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک مشترکہ اسٹیج قائم ہو اور جب حضور وائسرائے کی خدمت میں ڈیپوٹیشن جائے تو دونوں گروہ کے ممبر برابر کے شریک ہوں، یہ نہایت صحیح تجویز ہے اور اس کو فوراً اختیار کرنا چاہیے۔

۴- مسلم لیگ کی انتظامی کمیٹی بڑے بڑے زمین داروں اور علاقہ داروں سے بالکل خالی کر لی جائے، صرف وہ لوگ شریک کیے جائیں جو آزادی اور حق گوئی کے ساتھ اظہار رائے کر سکیں۔

۵- سب سے بڑی اور سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ قومی پالیٹکس کا ذوق پیدا ہو جائے، پالیٹکس ایک وسیع علم ہے، اس کے مسائل اور معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ ہے، ان کو بقدر ضرورت اپنی زبان میں لایا جائے، مہمات مسائل پر رسالے اور پمفلٹ شایع کیے جائیں، کچھ لوگ مقرر کیے جائیں جو ملک میں دورہ کریں اور پولیٹیکل مسائل پر عالمانہ لکچر دیں، جو دلائل معلومات اور اعداد پر مبنی ہو۔

۶- چند لوگ آنریری یا تنخواہ دار مقرر کیے جائیں، جو کسی کسی خاص مسئلہ کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں، مثلاً کسی ایک ضلع کے صدر مقام میں قیام کر کے ان امور کی تحقیقات کریں کہ تیس برس پہلے ضلع کی کیا حالت تھی؟ کتنے بڑے بڑے زمین دار تھے، کن لوگوں کے پاس زمین داریاں تھیں، اب کیا حالت ہے، کتنی زمین داریاں نیلام ہوگئیں، کس قسم کے قرضوں میں نیلام ہوئیں، بندوبست کا کیا اثر پڑا، کاشت کاروں کی کیا حالت ہے، کتنے آدمی دوسرے ممالک میں چلے گئے، اس قسم کے اعداد اور واقعات سے پُر نتائج یادداشتیں تیار ہوسکیں گی اور گورنمنٹ ان سے فائدہ اٹھا سکے گی۔

آپ نے دیکھا کہ صحیح پالیٹکس کے متعلق ان کا نظریہ کیا تھا، مضمون کے آخر میں انہوں نے ہندو مسلمانوں کے مصالحانہ اتحاد کے مسئلہ پر بحث کی تھی اور بتایا تھا کہ مغلوں کی حکومت کے دور میں یہ مصالحانہ اتحاد باہمی محبت اور رواداری کیوں کر پیدا ہوئی اور اب بھی وہ ممکن ہے۔

مسلم لیگ کی اصلاح ان مضامین نے مسلمانوں کے خیالات میں عجیب انقلاب برپا کیا، یہاں تک کہ مسلم لیگ کے اربابِ بست وکشاد نے بھی اپنے اندر ترقی اور اصلاح کی ضرورت محسوس کی اور قوم کے بعض ممتاز لیڈروں نے مولانا کو یقین دلایا کہ اب کے سالانہ اجلاس ۱۹۱۲ء میں لیگ کا نظام بدل جائے گا، مولانا اپنے مضمون کے چوتھے نمبر کے شروع میں لکھتے ہیں" پچھلے آرٹیکل میں ہم نے مسلم لیگ کی موجودہ حالت اور ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے متعلق بحث کی تھی، ہم کو مسرت ہے کہ مضمون کے پہلے حصہ سے اکثر بزرگوں کو اتفاق ہے اور قوم کے بعض نہایت ممتاز لیڈروں نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ اب کے سالانہ اجلاس میں لیگ کا نظام قریباً بدل دیا جائے گا اور جو تجویزیں ہم نے لیگ کی اصلاح کی پیش کی ہیں، قریب لیگ اسی قالب میں ڈھل جائے گی، اگر یہ صحیح ہے تو پھر ہم کو لیگ کی مخالفت کی کوئی وجہ نہیں ہوگی اور ہم سب سے پہلے اس کے آگے گردن جھکا دیں گے۔"

لیکن ہندو مسلمانوں کے مصالحانہ اتحاد کے مسئلہ میں مولانا نے جس رواداری کا ثبوت دیا تھا، اس میں ترازو کے دونوں پلڑے برابر نہیں رہے تھے، یعنی ہندوؤں کی رواداری کو اتنا سراہا تھا کہ دوسری طرف مسلمان مجرم نظر آتے تھے، اس لیے اخیر نمبر میں یہ دکھایا کہ ہندوؤں میں یہ رواداری مسلمانوں کی بے تعصبی کے جواب میں تھی اور تاریخی واقعات سے اس پر استدلال کیا، مگر افسوس کہ یہ نمبر ان کی زندگی کے بعد شایع ہوا۔

۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا، نظام بدلا، نصب العین کسی قدر اونچا کیا گیا، سلف گورنمنٹ کو لیگ کا مقصد قرار دیا گیا لیکن اس کے ساتھ ایک ذو معنیین لفظ بڑھا کر سرکار اور احرار دونوں کو خوش کرنے کی کوشش کی گئی، یعنی "سوٹ ایبل سلف گورنمنٹ"۔

مولانا مرحوم نے لیگ کی اس بوالعجبی پر خوب خوب طنزیہ نظمیں لکھیں[1] اور جو کچھ لکھیں وہ ایسی صحیح نکلیں کہ آج تک ان کی صحت میں فرق نہیں آیا، بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لیگ میں اس وقت جو کچھ انقلاب پیدا ہوا، اس میں دوسرے اسباب کے ساتھ مولانا کے نشتر ریز قلم کا بھی کچھ کم حصہ نہیں، مولوی نظام الدین صاحب بدایونی (اڈیٹر ذوالقرنین بدایوں) نے کسوف الشمسین کے نام سے ۱۹۱۵ء میں مولانا شبلی اور مولانا حالی کی وفات پر ایک رسالہ مع مرثیوں کے چھاپا تھا، اس میں وہ لکھتے ہیں "اس کے علاوہ سلف گورنمنٹ کے ریزولیوشن کے بانیوں میں بھی مولانا کا نام ایک وقیع جگہ رکھتا ہے، گزشتہ چند سال سے وہ تمام قومی اور سیاسی معاملات کے متعلق اپنی رائے بلند پایہ نظموں کی شکل میں اخبارات میں شائع کراتے رہے۔" (صفحہ-۲۷)

مولوی سید طفیل احمد صاحب اپنی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" میں لکھتے ہیں "سیاسی کاموں میں حصہ لینے والوں میں اب تک زیادہ تر نام جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے آئے ہیں، مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب سے مسلمان فرقہ وارانہ سیاست سے نکل کر عام ملکی سیاست میں داخل ہوئے، قدیم تعلیم یافتگان کا حصہ اس میں نمایاں ہو گیا، بلکہ انہوں نے ہی مسلمانوں کو فرقہ پرستی کی دلدل سے نکالنے میں خاص کام کیا، جن میں سب سے اول مولانا شبلی نعمانی تھے...... انہیں موقع ملا کہ وہ اپنا زور قلم مسلم لیگ کا نقطۂ نظر بدلنے میں صرف کریں...... مسلمانوں کو سیاست کی طرف لانے میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی کے شریک کار رہے۔" (طبع دوم از صفحہ ۳۷۴ تا صفحہ ۳۷۹)

مسلم لیگ اور کانگریس کا اتحاد بہرحال مولانا کی یہ کوششیں ضائع نہیں ہوئیں اور ان ہی کے بقول خود زمانہ کے طمانچوں نے مسلمانوں کو بیدار کیا، ان میں روز بروز احرار کی تعداد بڑھنے لگی، ابوالکلام، محمد علی، شوکت علی، ظفر علی خان، حسرت موہانی، ڈاکٹر محمود، ڈاکٹر انصاری اور بہت سے نوجوان احرار آگے بڑھے اور بوڑھوں کو بھی اپنے ساتھ لگا لائے، حکیم اجمل خان، نواب اسحاق خان، میجر سید حسن بلگرامی، راجہ محمد علی محمد خان والیِ محمود آباد، وغیرہ بہت سے کہن سال رہنما بھی جوانوں کے قدم بہ قدم چلنے

[1] دیکھیے کلیات شبلی اردو۔

پر آمادہ ہوئے، مسٹر مظہر الحق بیرسٹر (پٹنہ) اور مسٹر محمد علی جناح (بمبئی) نے احرار لیگ کے اس مشترکہ اقدام کی رہبری کی، یہ دیکھ کر مولانا نے فرمایا:

لاکھ آزادیِ افکار کو روکا لیکن — یہ وہ افسوں ہے کہ ہر شخص پہ چل جاتا ہے
غیر کمبخت تو گستاخ تھے مدت سے مگر — اب تو کچھ آپ کے منہ سے بھی نکل جاتا ہے

کام یابی میں بس اک آدھ برس باقی ہے — لیگ سے سلسلۂ کانگریس باقی ہے
اب بھی آجاتی ہے کالج سے خوشامد کی صدا — جا چکا قافلہ اب بانگ جرس باقی ہے

مولانا کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی، لیگ اور کانگریس کے تعلقات آپس میں بڑھتے گئے، یہاں تک کہ مولانا کی وفات کے ایک سال بعد اخیر دسمبر ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا جس کے صدر مسٹر مظہر الحق بیرسٹر پٹنہ اور صدر استقبالیہ مسٹر محمد علی جناح تھے، اسی زمانہ میں وہیں کانگریس کا اجلاس بھی تھا، دونوں کے رہنما آپس میں ملے اور خیالات میں اتحاد کی شکل پیدا ہوئی اور لیگ اور کانگریس میں اشتراک عمل نمایاں ہوا، لیگ کے رہنماؤں نے کانگریس میں اور کانگریس کے لیڈروں میں جن میں گاندھی جی، پنڈت مالوی جی، مسز سروجنی نائیڈو، سر ایس پی سنہا صدر کانگریس، مسز اینی بسنٹ اور مسٹر ہارنی من اڈیٹر بمبئی کرانیکل وغیرہ شامل تھے، لیگ کے اجلاس میں شرکت کی اور حاضرین نے پرتپاک چیئرز سے ان کا خیر مقدم کیا[1]، دوسرے سال دسمبر ۱۹۱۶ء میں دونوں

---

[1] اس اجلاس میں راقم شریک تھا، اس وقت مولانا مرحوم کے رنگ میں کچھ کہنے کی کوشش کی تھی، اس موقع پر یہ نظم قلم نے لکھی:

حق و باطل مدتوں تک معرکہ آرا رہا — ابر خورشید حقیقت پر بہت چھایا رہا
پر شب تاریک اب تاریک پہلی سی نہیں — ملک میں پچھلے دنوں کچھ کچھ اجالا سا رہا
وہ زمانہ جا چکا جب بت پرستی عام تھی — جب خدا کا حکم ہر عیار کا ایما رہا
جب متاع رہنمائی تھی سزاوار خرید — جب کہ ہر قاروں پہ ہم کو خضر کا دھوکا رہا
جب کہ تھی آزادگان عشق کی ہم میں کمی — جب کہ ہر فرعون ہم میں قوم کا موسیٰ رہا
پھر بھی تمیز حق و باطل کا وہ جوہر نہ تھا — جو ہمیشہ قوم میں شمع رہ صحرا رہا
رزم گاہ نور و ظلمت بمبئی مدت سے ہے — گر یہیں انوار حق چمکے تو کیا بے جا رہا

آیت قرآن کہ جاء الحق مصدق ہوگئی
مجلس آئین ہماری "مظہر حق" ہوگئی

یہ اشارہ مسٹر مظہر الحق کی طرف تھا۔

سیاسی مجلسوں کے اجلاس لکھنؤ میں ہوئے، مسلم لیگ کی صدارت کا فرض محمد علی[1] جناح نے انجام دیا۔

یہیں دونوں قوموں کے درمیان ''لکھنؤ پیکٹ'' طے ہوا اور اب یہ اتحاد سال بہ سال اتنا آگے بڑھا کہ کئی سال تک متواتر دونوں مجلسوں کے اجلاس ایک شہر میں ایک ساتھ ہونے لگے اور ایک دوسرے کے اکابر، دوسرے کے جلسوں میں شرکت کرنے لگے اور ایک ہی قسم کے ریزولیشن دونوں جگہ منظور ہونے لگے، مسٹر محمد علی جناح نے لکھنؤ کے اس جلسہ کے صدارتی خطبہ میں ایک جگہ فرمایا، تجدیدِ ملی کا سب سے زیادہ پر امید پہلو یہ ہے کہ ہندو مسلمان مشترکہ مقصد کے لیے متحد ہو رہے ہیں، بمبئی کی خوش نصیبی ملاحظہ ہو کہ گزشتہ دسمبر میں پہلی بار لیگ و کانگریس کے اجلاس اسی شہر میں ہوئے، بڑی کٹھن منازل طے کرنے کے بعد اس اتحاد کا مظاہرہ نظر آیا...... آج پھر لکھنؤ کا تاریخی شہر جو اسلامی ادب و تہذیب کا گہوارہ ہے اور جہاں سے چند برس ہوئے لیگ کی بنیاد پڑی تھی، کانگریس اور لیگ کے متحدہ اجلاس کا منظر پیش کر رہا ہے[2]۔

یہ وہ خوش آیند منظر تھا کہ جس کو اگر مولانا مرحوم دیکھتے تو اپنی تحریک کی کامیابی پر بے انتہا خوش ہوتے۔

احرار کو تنبیہ اس موقع پر ایک اور بات بھی یاد دلانی ہے، احرار کے نام سے جو گروہ بن رہا تھا جیسا کہ قاعدہ ہے، قدیم سیاسی حد بندیوں کے ٹوٹنے سے وہ اعتدال سے آگے قدم رکھ رہا تھا، مولانا نے اس کو بھی ٹوکا اور اپنی متعدد نظموں میں اس کی بے اعتدالی، لہجہ کی سختی اور طرزِ کلام کی ناہمواری پر گرفت کی، پہلے تو قدیم بزرگوں کی خدمت میں معذرت کے طور پر فرمایا:

---

[1] راقم اس دوسرے اجلاس میں بھی شریک تھا اور یہ نظم موزوں ہوئی:

اک زمانہ تھا کہ اسرار دروں مستور تھے — کوہ شملہ جن دنوں ہم پایہ سینا رہا
جب کہ داروے وفا ہر درد کا درماں رہی — جب کہ ہر ناداں عطائی بوعلی سینا رہا
جب ہمارے چارہ فرما زہر کہتے تھے اسے — جس پہ اب موقوف ساری قوم کا جینا رہا
بادہ حب وطن کچھ کیف پیدا کر سکے — دور میں یوں ہی اگر یہ ساغر و مینا رہا
علت دیریں سے گو اصلی قوی بے کار ہیں — گوش سنوا ہے نہ ہم میں دیدہ بینا رہا

پر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جناح رہا

[2] مسلم لیگ کی تاریخ، مولفہ سید اختر حسین، ص ۱۳۷۔

اعتدال آنے نہ پایا ہے نہ آئے گا کبھی — آپ کی طرح سے مجھ کو بھی یہی کھٹکا تھا
یہ تو ہوتا ہے کہ اچھلے گی اسی زور سے آپ — آپ نے قوم کو جس زور سے دے پٹکا تھا
آشنائی میں تو اک عمر بسر کی میں نے — اب تو سب سے مجھے بیگانہ ہی رہنے دیجیے
مدتوں آپ نے عاقل تو مجھے دیکھا ہے — اب تو کچھ دن مجھے دیوانہ ہی رہنے دیجیے

ایک اور نظم میں احرار کی سیاست کی ابھی نوعمر بتا کر ان کی سیاسی خطاؤں سے درگزر کرنے کی درخواست کی:

یہ اعتراض آپ کا بیشک صحیح ہے — احرار قوم میں ہیں بہت خامیاں ابھی
چلتے ہیں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ — گم گشتۂ طریق ہے یہ کارواں ابھی
زود اعتقادیاں ہیں تلوّن ہے، وہم ہے — ہو جاتے ہیں ہر ایک سے یہ بدگماں ابھی
دل میں نہ عزم ہے نہ ارادوں میں ہے ثبات — جھیلے نہیں ہیں معرکۂ امتحاں ابھی
بے اعتدالیاں ہیں ادائے کلام میں — باہر ہے اختیار سے ان کی زباں ابھی
ہر دم ہیں گو مسائل ملکی زبان پر — ان میں سے ایک بھی تو نہیں نکتہ داں ابھی
یہ سب بجا درست مگر سچ جو پوچھیے — جو کچھ کہ ہے یہ ہے اثر رفتگاں ابھی
یہ ہے اسی سیاست پارینہ کا اثر — گو شمع بجھ چکی ہے مگر ہے دھواں ابھی
موزوں نہیں ہے جنبش اعضا تو کیا عجب — شب کے خمار کی ہیں یہ انگڑائیاں ابھی
چلنے میں لڑکھڑاتے ہیں اک اک قدم پہ پاؤں — چھوٹے ہیں قید سخت سے یہ خستہ جاں ابھی
بیکار کر دیے تھے جو خود بازوئے عمل — گو کھینچتے ہیں پر نہیں کھنچتی کماں ابھی
آئے کہاں سے قوتِ رفتار پاؤں میں — کچھ بیڑیاں ہیں پاؤں کی بندگراں ابھی
غوں غاں ہے کچھ مباحث ملکی نہیں ہیں یہ — اک طفل ہے سیاست ہندوستاں ابھی

اس کے بعد احرار کو خطاب کر کے ان کو بھی مناسب سرزنش فرمائی:

یہ جو لیڈر شکنی آپ نے کی خوب کیا — قوم اب طوقِ غلامی سے ہے بالکل آزاد
لوگ اب حلقۂ تقلید میں ہوں گے نہ اسیر — ٹوٹ جائے گا طلسم اثر استبداد
ہاں مگر ایک گزارش بھی ہے یہ قابل غور — یہ تو فرمایئے، اس باب میں کیا ہے ارشاد؟

بتکدے آپ نے ڈھائے بہت اچھا لیکن — شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی تو رکھیے بنیاد
آبلہ قابل نشتر تھا یہ مانا لیکن — دیکھیے یہ کہ کہیں زخم میں آئے نہ فساد
آپ کہتے ہیں کہ وہ مجمع ناجائز تھا — خیر جو کچھ تھا، مگر جمع تو تھے کچھ آزاد
اب کوئی مرکزِ قومی ہے نہ توحید خیال — نہ کوئی جادۂ مقصد ہے نہ کچھ توشۂ زاد
خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازۂ قوم — خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ نہ ہو پھر آباد
ذرّے جس طرح سے ہوجاتے ہیں اُڑ اُڑ کے فنا — یونہی ہوجائے گی پھر قوم بھی آخر برباد
نکتہ چینی سے فقط کام نہیں چل سکتا — یہ بھی لازم ہے کہ کچھ کام بھی ہو پیش نہاد
بھاپ پر زور ہے لیکن کوئی انجن بھی ہو تو — کام کیا آئے گا نشتر جو نہ ہوگا فساد

بعض پر جوش احرام کا قلم خاص طور سے تیر و نشتر تھا، اس کی طرف رُخ کر کے یہ نظم ارشاد کی:

دیکھ کر حریت فکر کا یہ دورِ جدید — سوچتا ہوں کہ یہ آئینِ خرد ہے کہ نہیں؟
رہنماؤں کی یہ تحقیر یہ اندازِ کلام — اس میں کچھ شائبۂ رشک وحسد ہے کہ نہیں؟
اعتراضات کا انبار جو آتا ہے نظر — اس میں کچھ قابل تسلیم وسند ہے کہ نہیں؟
نکتہ چینی کا یہ انداز یہ آئینِ سخن — بزم تہذیب میں مستوجب رد ہے کہ نہیں؟
جس نئی راہ میں ہیں بادیہ پیمایہ لوگ — کوئی اس جادۂ مشکل کا بلد ہے کہ نہیں؟
شاطروں نے جو نئی آج بچھائی ہے بساط — اس میں ان پر بھی کہیں سے کوئی زد ہے کہ نہیں؟
پہلے گر شانِ غلامی تھی تو اب خیرہ سری — اس دوراہے میں کوئی بیچ کی حد ہے کہ نہیں؟
فیصلہ کرنے سے پہلے میں ذرا دیکھ تو لوں — ''جزر'' جیسا تھا، اسی زور کا ''مد'' ہے کہ نہیں؟

حریت خیال کے مسافر نے یہاں تک منزل طے کی تھی کہ بہت سے کہنہ سال وفادارانِ قوم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمارے نوجوانوں کی خیرہ سری ہمارے ازلی آقاؤں کو ہم سے سرگراں نہ کردے اور طرابلس، بلقان، کان پور اور یونیورسٹی کے معاملات میں ہماری آزادہ گوئی اور مسلم لیگ کے انقلاب، مسلم لیگ وکانگریس کے اتحاد اور لکھنؤ پیکٹ وغیرہ میں ہماری سیاسی آزادہ روی سے حکومت وقت کے دل میں ہماری طرف سے غلط فہمی نہ ہو، اس لیے بہ ظاہر صلح کان پور کے شکریہ میں اور درحقیقت مسلمانوں کی وفاداری کا یقین دلانے کی خاطر مہاراجہ صاحب محمود آباد کی سرکردگی میں ایک ڈیپوٹیشن ترتیب دیا گیا، جس

میں حزب الاحرار کے بھی بعض نامور افراد نے افسوس ہے کہ شرکت کی اور گویا انہوں نے اس طرح اپنے پچھلے گناہوں کا کفارہ ادا کیا، اس وفد نے پندرہ اپریل ۱۹۱۴ء کو وائسرائے سے ملاقات کی اور ایک ایڈریس پیش کیا لیکن مولانا ابوالکلام اور بعض دوسرے احرار نے اس وفد سے قطعاً احتراز کیا اور اس کے خلاف سخت مضامین لکھے، مولانا نے اس عجیب وغریب وفد کے متعلق تین قطعے ارشاد فرمائے:

سچ تو یہ ہے کہ وفا کیشِ ازل ہیں ہم لوگ — ہم کو شکوہ نہیں آئینِ جہانبانی کا
ہم نے یہ لکھ کے جو دی آپ کو تحریرِ وفا — یہ شگن ہے ہماری خطِ پیشانی کا

مشق ہے جادۂ طاعت پہ ہمیں چلنے کی — ہم سے اس راہ میں اغیار کبھی بڑھ نہ سکے
ہم نے تحریرِ وفا پڑھ کے سنائی ان کو — کہ ذرا خط جو خفی تھا وہ خود پڑھ نہ سکے

احرار اور مدعیانِ وفا ہیں اور — دونوں کا ہے طریقۂ سود و زیاں الگ
دونوں کا منتہائے نظر ہے جو مختلف — ہے خود بخود ہر ایک کا طرزِ بیاں الگ
اس پر بھی صاف صاف نہ تھا امتیازِ حق — کھلتا نہ تھا کہ کون الگ ہے، کہاں الگ؟
دہلی کی انجمن نے وہ پردہ اٹھا دیا — قائم ہوا جو معرکۂ امتحاں الگ
اب صاف ہوگیا حق و باطل میں امتیاز — اب فصلِ نو بہار الگ ہے، خزاں الگ
اب آفتابِ صدق گہن سے نکل گیا — اب شمعِ دلفروز الگ ہے دھواں الگ
وہ اختلاطِ دردِ مئے صاف اب نہیں — گم گشتگانِ راہ سے ہے کارواں الگ
جو لوگ ہیں متاعِ خوشامد کے مایہ دار — کھولیں گے اب وہ ملک میں اپنی دکاں الگ
یہ مختصر فسانۂ بزمِ شبینہ ہے — سنئے گا الہلال میں یہ داستاں الگ

مولانا کی سیاسی کلام کا یہ آخری بند ہے اور اسی کے چند مہینوں کے بعد انہوں نے وفات پائی۔

سیاست میں بھی اعتدال تھا | تاہم اس زمانہ میں آزاد سے آزاد آدمی کا حکومت وقت سے مطالبہ صرف اصلاحات کا تھا، مولانا کی سیاست بھی اس سے آگے نہ تھی اور نہ اس کے آگے کوئی راستہ کسی کو معلوم ہوتا تھا، یہی سبب ہے کہ اس سیاسی حریت طلبی کے باوجود وہ حکومت وقت سے انحراف کا کوئی خیال بھی اپنے دل میں نہیں رکھتے تھے اور ذرا سے دباؤ سے وہ اپنی مسلّم وفاداری کا اقرار کرنے لگتے تھے۔

یاد ہوگا کہ ترکی کے سفر سے واپسی کے بعد سے ان پر ترکی خلیفہ کے ''خفیہ سفیر'' ہونے کا الزام تھا، سرسید کی وفات کے بعد ۱۸۹۸ء میں یونان وروم کی جنگ کے موقع پر جب مسلمانوں میں بڑا جوش تھا،

انہوں نے علی گڑھ کالج میگزین میں ''خلافت'' پر تین چار صفحوں کا ایک مضمون لکھ کر یہ بتانا چاہا کہ تاریخِ اسلام میں اب تک کسی غیر قریشی نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا ہے، اس لیے ترکوں کا دعوائے خلافت بھی تسلیم کے قابل نہیں لیکن چوں کہ یہ مضمون ''آورد'' تھا، آمد نہ تھا، اس لیے ایک نمبر کے بعد اس کے دوسرے نمبر کا چھپنا بلکہ شاید سپردِ قلم ہونا بھی نصیب نہیں ہوا اور اسی طرح ناتمام رہا، ۱۹۲۰ء میں جب راقم وفدِ خلافت کے رکن کی حیثیت سے لندن میں تھا اور وہاں کے وزرا اور اربابِ سیاست سے ترکی خلافت کی نسبت بحث و گفتگو جاری تھی تو پروفیسر آرنلڈ جو ان دنوں انڈیا آفس سے متعلق تھے، اکثر کرم فرما کر میرے پاس تشریف لاتے اور مولانا کے اس مضمون کا حوالہ دے کر ترکوں کے دعوائے خلافت کو بے بنیاد ثابت کرنا چاہتے تھے، میں کہتا کہ یہ مضمون مولانا نے لکھا نہیں، ان سے لکھوایا گیا ہے اور اس کی ناتمامی خود اس کی دلیل ہے۔

۱۹۰۸ء میں جب کرنل عبدالمجید خاں وزیر خارجیہ ریاست پٹیالہ جو انگریزوں کے بڑے دوست تھے اور ان دنوں گورنمنٹ اور ندوۃ العلما کے درمیان صلح وصفائی کی پیامبری کر رہے تھے، مولانا نے الندوہ رجب ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں ایک مضمون لکھا کہ مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیوں کر رہنا چاہیے؟ اور اس میں یہ ثابت کیا کہ ''مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ قومی شعار رہا ہے کہ وہ جس قوم کی حکومت میں رہیں اس کے وفادار ہو کر رہیں''[1] یہ مضمون لکھ کر گویا مولانا نے گورنمنٹ کو اس کے اس چھ ہزار سالانہ امداد کی قیمت ادا کی جو اس نے دارالعلوم کو دینا منظور کی تھی۔

---

[1] یہ دونوں مضمون مقالاتِ شبلی جلد اول میں چھپ گئے ہیں، افسوس ہے کہ مولانا نے اس دوسرے مضمون ''مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیوں کر رہنا چاہیے'' میں ردمختار کے جس فقرہ پر اپنے نظریہ کی بنیاد رکھی ہے اس کے صحیح پڑھنے میں ان سے سہو ہوا ہے، ویفترض علینا اتباعهم میں انہوں نے اتباع (پیچھا کرنا) کو اتباع (پیچھے ہونا یا تابع ہونا) پڑھا ہے اور یہ ترجمہ کیا ہے کہ ''اگر غیر مذہب والے ہمارے مال پر قبضہ کر لیں اور اس کو اپنے گھر میں جمع کریں تو وہ اس کے مالک ہوں گے اور ہم پر ان کی اطاعت فرض ہے۔'' لیکن یہ تمام تر غلط ہے، صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ''اگر غیر مسلم حملہ کر کے مسلمانوں کے مال و دولت پر قبضہ کر لیں اور اس کو اپنے ملک یعنی دارالحرب میں لے کر چلے جائیں تو وہ اس کے مالک ہو جائیں گے اور وہ مال مسلمانوں کی ملکیت میں باقی نہیں رہے گا لیکن جب کفار دارالحرب سے آ کر دارالاسلام میں حملہ کر کے مسلمانوں کے مال و دولت پر اس طرح قبضہ کر لیں تو مسلمانوں پر حملہ آوروں کا پیچھا کرنا اس وقت تک فرض ہے جب تک وہ دارالاسلام کے حدود میں ہوں، البتہ جب وہ دارالاسلام کی حدود سے نکل جائیں اور مال لے کر دارالحرب میں داخل ہو جائیں تو پھر ان کا پیچھا کرنا مسلمانوں پر فرض نہ رہے گا''۔ (دیکھئے شامی حاشیہ ردمختار علی الدر المختار، ج ۳، ص ۳۷۷، مصر)۔

اس کے بعد طرابلس، بلقان اور کان پور کے ہنگاموں میں مولانا نے جو تیز و تند نظمیں لکھیں، جنھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں جوش و خروش پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا، صوبہ متحدہ کی حکومت اس واقعہ سے بے خبر نہ تھی، اس زمانہ میں مسٹر برن نامی ایک لایق اور علم دوست انگریز حکومت یوپی کے چیف سکریٹری تھے، وہ اردو بہت اچھی بولتے تھے اور فارسی خوب سمجھتے تھے اور اسی لیے ان سے اور مولانا سے مراسم تھے، لوگوں نے یہ نظمیں ان تک پہنچائیں، اسی زمانہ میں بنگال کی حکومت نے ستمبر ۱۹۱۳ء میں ایک اردو مجموعۂ اشعار کو ضبط کیا، جس میں مولانا کی نظم بھی تھی، اخبارات میں مولانا کی شہرت کی وجہ سے یا لوگوں میں تحریک پیدا کرنے کے لیے اس کو یہ کہہ کر شایع کیا گیا کہ بنگال گورنمنٹ نے مولانا کی نظمیں خلاف قانون قرار دیں اور ضبط کرلیں[1]۔

جنوری ۱۹۱۴ء میں کوئی سرکاری پارٹی تھی، جس میں مولانا بھی شریک تھے، اس میں لفٹنٹ گورنر صاحب سے جب سامنا ہوا تو انہوں نے شکایت آمیز بلکہ کچھ طعن آمیز فقرے کہے، چیف سکریٹری صاحب بھی کچھ سرگراں رہے اور دوستانہ شکایت کی، مولانا نے کہا کہ یہ اتفاقی حالات ہیں، ورنہ میں نے تو ہمیشہ قوموں میں بے تعصبی پھیلانے کی کوشش کی ہے، مولانا نے یہ پورا واقعہ ۵ر فروری ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں لکھ کر مجھ کو بھیجا ''میری نظموں کی ضبطی کا یہاں بہت برا اثر ہوا، لفٹنٹ گورنر صاحب سے ایک پارٹی میں سامنا ہو گیا، پہلے تو کہا ''مزاجِ مقدس'' پھر شکایت آمیز بلکہ طعن آمیز فقرے کہے، ابھی تک میں ان سے مل نہ سکا، جاسوسوں نے ان کو سب نظمیں پہنچائیں اور معنی سمجھائے، چیف سکریٹری صاحب بھی مجھ سے شاکی تھے، میں نے کہا یہ اتفاقیہ خلاف معمول بات ہوئی، ورنہ میں نے تو ہمیشہ بے تعصبی پھیلانے کی کوشش کی ہے۔''

اس واقعہ کی مزید تفصیل مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کے ایک بیان سے معلوم ہوتی ہے، جو انہوں نے مکاتیب شبلی میں مولانا کے ایک رقعہ کی تشریح میں حاشیہ کے طور پر لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ (حاذق الملک) حکیم اجمل خاں مرحوم جوان دنوں نہایت حکام رس تھے اور ریاست رام پور سے تعلقات کی بنا پر مسٹر برن سے ان کے خاص مراسم تھے، لکھنؤ آئے تو یکم فروری ۱۹۱۴ء کو مولانا کو ساتھ لے کر مسٹر برن سے ملنے گئے، مگر مولانا کی طرف سے ان کی پیشانی پر بل بدستور رہے، وہاں سے واپس آ کر رات ہی کو مولانا نے ایک رقعہ لکھ کر (عبدالماجد-۱۱) مولوی عبدالماجد صاحب کو بلوایا جو ان

[1] اس زمانہ میں میں کلکتہ میں موجود تھا، تاہم اس کا حوالہ مکاتیب میں بھی ہے۔ (دیکھیے عبدالحکیم-۴، سلیمان-۶۶)۔

دنوں سیرت کے انگریزی تراجم کے سلسلہ میں مولانا کے انگریزی کاروبار کو انجام دیا کرتے تھے، مولوی صاحب فرماتے ہیں "تحریر بالا شب کو ملی، میں اسی وقت گیا، مولانا بہت دیر تک تخلیہ میں گفتگو کرتے رہے، ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ آج کل مجھ سے بدظن ہے، خصوصاً معاملہ کان پور کے متعلق میری نظموں سے حاذق الملک حکیم اجمل خاں مجھے آج مسٹر برن چیف سکریٹری کے پاس لے گئے تھے، وہ بہت کبیدہ تھے، حالاں کہ اس سے پیش تر نہایت اخلاق و تپاک سے ملتے تھے، تم ان کے نام ایک مفصل چھٹی اس مضمون کی میری طرف سے لکھ دو کہ میں مدۃ العمر کبھی انگریزی گورنمنٹ کا بدخواہ نہیں رہا ہوں، میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مشرق و مغرب کے درمیان یگانگت بڑھے اور ایک دوسرے کی طرف سے جو غلط فہمیاں مدت دراز سے چلی آتی ہیں، دور ہوں، چنانچہ اس پر میری تصانیف شاہد ہیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۰۸ء میں میں نے الندوہ میں ایک مستقل مضمون کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہبًا فرض ہے اور اسی سال ندوہ کے سالانہ جلسہ میں وفاداری کا ایک رزولیوشن بھی پاس کرایا، پھر معاملہ عبدالکریم میں مجھے محض اس جرم پر کہ میں نے اپنے ضمیر کے مطابق ایک باغیانہ مضمون کی اشاعت بند کی، اخبارات میں گالیاں سننا پڑیں، رہا واقعۂ کان پور کے متعلق نظمیں تو وہ ایک ہنگامی جوش کا نتیجہ تھیں جس میں سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ میں بھی شریک تھا۔

خط کے اسی سلسلہ میں مولوی صاحب کو یہ دوسرا رقعہ لکھا، جو مکاتیب میں شامل ہے" جس خط کے لیے میں نے شب کو کہا ہے، وہ آدمی کے ہاتھ نہ بھیجئے گا، یہ بھی مناسب موقع پر بڑھا دیجیے گا، کہ میں نے اپنے کانشنس کے مطابق معاملہ میں پانچ ارکان کو ساتھ لے کر جو کیا، باوجود اس کے کہ بعد کو پبلک کے شور وغل کی وجہ سے سب نے اخبارات کے ذریعہ سے اپنی برأت ظاہر کی اور یہ لکھا کہ ہم نے فلاں شخص کی وجہ سے مجبور ہو کر ایسا کیا لیکن صرف میں اپنی رائے پر اپنے فرض کے مطابق قائم رہا۔" (عبدالماجد-۱۲)

آخری واقعات ہم کو یہ معلوم نہیں کہ یہ خط بھیجا گیا یا نہیں اور اگر بھیجا گیا تو اس کا کیا اثر ہوا لیکن یہ معلوم ہے کہ مولانا کی اس ساری مدافعانہ کوشش کی غرض یہ تھی کہ ندوہ سے گورنمنٹ کے تعلقات جو اس کدو کاوش اور جدو جہد کے بعد درست ہوئے تھے، وہ ان کی بدولت پھر بگڑ نہ جائیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ مولانا کی "سیاسی خوئے بد" میں بہ قول سعدی اب بھی کوئی تغیر نہیں ہوا، چنانچہ اس کے بعد ہی اگست ۱۹۱۴ء میں جب بڑی لڑائی چھڑی گو وہ اس وقت اپنے بھائی کی ناگہانی وفات کے سبب سے نہایت نڈھال تھے،

تاہم اس ناتوانی میں بھی ان کی کمان سے یہ تیر نکل ہی گیا جس میں انہوں نے غالب کے اس شعر کی:

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

تضمین کی تھی:

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہِ غرور — آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم — اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ رند لم یزل — آئیں شناسِ شیوۂ پیکار بھی نہیں
میں نے کہا "غلط ہے ترا دعویٔ غرور — دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہل ہند ہیں جرمن سے دس گنے — تجھ کو تمیز اندک و بسیار بھی نہیں
سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور — پھر وہ کہا جو لایق اظہار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

یہ تیر پورے نشانہ پر بیٹھا، مولوی اقبال احمد صاحب سہیل کی روایت ہے کہ اس نظم پر حکومت نے ان کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن مولانا خود مرض الموت میں گرفتار تھے، اتفاق سے ایک نیک دل مسلمان پولیس آفیسر اس زمانہ میں یہاں متعین تھے، جو مولانا کے پورے قدر شناس تھے، وہ ان کی اس بیماری کے عذر پر اس کو ٹالتے رہے، یہاں تک کہ شاعر چند روز کے بعد خود قید عنصری سے آزاد ہو گیا۔

اخیر زندگی کا ایک اور واقعہ بھی سننے کے قابل ہے:

نومبر ۱۹۱۴ء میں ترکوں نے بھی لڑائی میں جرمنوں کے ساتھ ہو کر انگریزوں اور اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا، ہر شہر کے پرانے وفادار مسلمانوں کی طرح اعظم گڑھ کے چند وفاداروں نے بھی ترکوں سے برأت کا اعلان مناسب سمجھا اور اس کے لیے قیامت یہ کی کہ خود شبلی منزل کو جلسہ کا مقام بنایا، جس کی مولانا کو کوئی خبر نہ تھی، عین وقت پر جب وہ دوسرے کمرہ میں موت کے بستر پر پڑے تھے ان کے بچپن کے ایک بے تکلف دوست ان کے پاس گئے کہ "آپ رضامندی دیں تو جلسہ آپ کی صدارت میں ہو" مولانا یہ سن کر بے چین ہو گئے، ان کی طرف منہ کر کے فرمایا بھائی صاحب! میں نے تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ترک اپنی جوتیوں میں میری کھال کا تسمہ بھی لگائیں" یہ اس پُر جوش عالم کی بین الاقوامی سیاست کا اخیر فقرہ تھا۔

ندوۃ العلما میں مولانا کی مخالفت
اور
معتمدی سے استعفا

۱۹۰۵ء میں جب مدرسہ کا انتظام مولانا کے ہاتھ میں دیا گیا تو کسی لایق ناظم کی عدم موجودگی کے باعث یا یوں کہیے کہ کسی ایک واحد ذات پر پورا اعتماد نہ ہونے کے سبب سے ندوہ کے کاموں کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ہر ایک کے لیے ایک ایک معتمدی قائم کر دی گئی تھی۔

۱- دارالعلوم اور اس کے تعلیمی انتظامات: معتمد مولانا شبلی نعمانی

۲- دفتر مراسلات: معتمد مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب

۳- صیغۂ مال: معتمد منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری

یہ ایک ایسا انتظام تھا جس میں وحدت کا سررشتہ گم تھا، یہ تینوں نہریں الگ الگ بہتی تھیں، یعنی یہ تینوں مل کر پھر کہیں ایک نہیں ہوتی تھیں اور کسی ایک شخص کے ہاتھ میں طاقت آ کر سارے کاموں میں اشتراک اور اتحاد نہیں پیدا ہوتا تھا، اس اتحاد اور اشتراک کی صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ ان کارکنوں کا اخلاص اور باہمی اعتماد تھا، جب تک ان کارکنوں میں یہ روح موجود رہی، کام کی رفتار آگے کو بڑھتی گئی، یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا کہ اعتماد کی جگہ بدگمانی نے لے لی، اب اتحاد کا وہ روحانی سررشتہ بکھر گیا اور ایک دوسرے کے ہر کام پر بدگمانی کی نگاہیں پڑنے لگیں۔

پھر اس تقسیم عمل سے ندوہ کے دفتری کام کا تو انتظام ہو گیا، مگر ندوہ کے اصل مقاصد کی تکمیل اور اس کے ذریعہ سے اہم اصلاحات اور قومی و مذہبی مطالب کے لیے سعی و کوشش کا کام ان میں سے کسی فہرست میں بھی داخل نہیں ہوا دوسرے اصحاب اپنی اپنی ذاتی مصروفیتیں بھی رکھتے تھے اور مولانا کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے ہر ذاتی کاروبار سے بے پروا ہو کر ندوہ کے آستانہ پر آ بیٹھے تھے اور ندوہ ہی کے کام کو اپنی زندگی کا کام بنا لیا تھا، اس لیے وہ ان کاموں کو بھی کر دینا چاہتے تھے لیکن دوسرے لوگ اس کو اپنے حدود و فرائض سے تجاوز اور دوسرے کے کاموں میں مداخلت سے تعبیر کرتے تھے۔

اب تک جو واقعات آپ کی نگاہ کے سامنے سے گزرے ہیں، ان سے یہ اچھی طرح معلوم

ہو چکا ہوگا کہ جیسے جیسے ندوہ کی شہرت پھیلتی جاتی تھی اور اس کا کام آگے کو بڑھتا جاتا تھا، اس کی ترقی کا ہر واقعہ مولانا کی شہرت اور مقبولیت کا ایک ورق بنتا جاتا تھا، یعنی ندوہ کی کثرت میں مولانا کی وحدت نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جاتی تھی، یہ گو واقعہ تھا، مگر اس واقعہ کو واقعہ سمجھ کر برداشت کر لے جانا ہر انسان کا کام نہیں، اس لیے رشک وحسد نے بے اعتمادی اور بے اعتمادی نے مخالفت کا رنگ اختیار کیا۔

لیکن یہ کہنا کہ مولانا کے سوا ان کے تمام دوسرے مخالف رفقا اخلاص اور حسن نیت سے خالی تھے، ایک بڑی جرأت ہے، یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ مولانا کی عمر کا ایک بڑا حصہ یعنی سولہ برس علی گڑھ میں بسر ہوا تھا اور علی گڑھ تحریک سے ان کی وابستگی شہرت عام رکھتی تھی لیکن یہ واقعہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ ان کو اس وابستگی کے باوجود اس تحریک کے بعض حصوں سے سراسر اختلاف تھا اور اسی بنا پر وہ ندوہ میں شامل ہوئے تھے، مگر عام علما اور ان کے معتقد ارکان یہی سمجھتے تھے کہ یہ علی گڑھ تحریک کے آدمی ہیں اور علی گڑھ چھوڑ کر ندوہ میں اسی لیے شریک ہیں کہ اس مذہبی تحریک کو برباد کریں[1]۔

پھر اس اظہار میں بھی کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی واتقا اور مذہبی تورُّع وتقدس جو علمائے دین کا خاصہ ہی نہیں تھا اور اس لیے ان علما کی نگاہوں میں جو ان چیزوں کے دیکھنے کے عادی تھے، مولانا کا رنگ کھٹکتا تھا اور اسی بنا پر وہ طلبہ کے لیے ان کی تعلیم وصحبت کو سخت مضر سمجھتے تھے۔

مولانا کی تصنیفات میں علم الکلام اور الکلام ایسی دو کتابیں تھیں جو مصنف کی ہزار احتیاطوں کے باوجود علما کے نزدیک اعتراض کے قابل تھیں، ان کے بعض مباحث ٹھیٹھ مذہبی خیالات کے سراسر خلاف تھے، اس لیے علما کی ایک جماعت جو متکلمین کی آراو تحقیقات سے بے خبر تھی، ایک مذہبی تعلیم گاہ کی صدارت کے لیے ان کو موزوں نہیں سمجھتی تھی۔

اس پر مستزاد یہ کہ مولانا دارالعلوم کی تعلیم میں جس قسم کی اصلاح اور ترقی چاہتے تھے، علما کا بڑا حصہ اس سے نفور تھا، وہ قدیم معقولات کی ان کتابوں کو جن سے علما کو صدیوں کا قلبی انس تھا، یکسر الگ کر رہے تھے اور ان کی جگہ نئے علوم لانا چاہتے تھے جس کو وہ اپنے خیال میں کفر وزندقہ جانتے تھے، مولانا انگریزی کی ضرورت پر زور دیتے تھے اور ان کو اس ضرورت سے شدید انکار تھا۔

غرض ارکان میں مختلف مذاق کے افراد تھے لیکن دوسرے قومی کارکنوں کی طرح مولانا نے کبھی

---

[1] مضمون بر وفات مولانا شبلی نوشتہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔

اس کی نہ تدبیر کی اور نہ پروا کی کہ ارکان میں ان کے خیال اور مذاق کے لوگوں کی اکثریت ہو حالاں کہ مخالف پارٹی نے اس کا پورا بندوبست کیا اور ایک ہی جلسہ میں زبردستی ممبروں کی تعداد ۳۵ سے ۵۱ کر لی اور خلاف قاعدہ اپنے ۱۵ آدمی دفعۃً بڑھا لیے (مکاتیب نواب علی حسن خاں صاحب ۱۳) نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کے ہمدردوں اور معاونوں کی جماعت اقلیت میں آ گئی اور جلسۂ انتظامیہ کی کارروائیوں پر فریق ثانی کا پورا قبضہ ہو گیا۔

مولانا خلیل الرحمٰن صاحب کا اختلاف جب مولانا نے ندوۃ العلما میں قیام کا ارادہ کیا تھا، اس وقت نواب محسن الملک نے کہا تھا کہ ”ندوہ کی اس کس مپرسی کی حالت میں تو کوئی شخص آپ کا مزاحم نہ ہوگا، لیکن جب ترقی کے آثار نمایاں ہوں گے تو دفعۃً تمام مولوی آپ پر ٹوٹ پڑیں گے اور آمادۂ مخالفت ہوں گے“ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور جلسۂ سنگ بنیاد ہی میں اس کی بنیاد پڑ گئی، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارن پوری مرحوم جو پہلے رسماً نائب ناظم تھے اور اب کسی ناظم کی عدم موجودگی میں اپنے کو قائم مقام ناظم سمجھتے تھے، بطور حریف کے مولانا کے مقابل کھڑے ہوئے اور اس کی ابتدا ایک خط سے ہوئی، جس میں مولانا نے ان کو یہ لکھا تھا کہ اس وقت ندوہ کا کوئی ناظم نہیں (حالاں کہ مولانا خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم اپنے آپ کو ندوہ کا قائم مقام ناظم سمجھتے تھے) بہر حال اس کے بعد مولوی خلیل الرحمٰن صاحب نے اپنی مخالفت کا اظہار (جس کو کون کہہ سکتا ہے کہ نیک نیتی پر مبنی نہ ہوگا) مختلف پردوں میں کیا، سب سے پہلے جلسۂ سنگ بنیاد کے موقع پر ۱۹۰۸ء میں مولانا نے جلسہ انتظامیہ میں مسئلہ وقف علی الاولاد کو بغرض منظوری پیش کیا تو مولانا خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم نے اس کی مخالفت کی، اس کے بعد جب ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ ایڈ کی تقسیم اور جدید مدرسین کے تقرر کے لیے جلسہ انتظامیہ ہوا، تو مولانا خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم نے ایک یادداشت کے ذریعہ سے تمام ممبروں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کی معتمدی یعنی مولانا کا عہدہ توڑ دیا جائے (مہدی-۵۶) جون ۱۹۱۰ء میں مولانا نے مولانا شروانی صاحب کو جو اپنی فطری متانت و سنجیدگی اور صلح کل طبیعت کی بنا پر طرفین کے معتمد علیہ تھے یہ لکھا ”اگر آپ کو ندوہ کا درد ہے تو آٹھ سات دن کے لیے آیئے، مولوی خلیل الرحمٰن صاحب کو بلایئے، پہلے آپس میں صلح اور نیک نیتی کے ساتھ تمام مراتب طے ہو جائیں اور ضرور ہو سکتے ہیں، پھر تمام امور کو باقاعدہ جلسہ میں طے کر لیجیے، جب ہم لوگ متفق ہوں گے تو کسی کو اختلاف نہ ہوگا ورنہ حالت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب انجمن حمایت الاسلام کی طرح ندوہ کی مالی کارروائیاں بھی اخبارات کے منظر پر نظر آئیں گی، چار برس ہوئے کوئی حساب کتاب

نہ مرتب ہوا، نہ شایع ہوا، لوگ چاہتے ہیں کہ ماہ بماہ الندوہ میں جمع خرچ چھپے، یہاں کسی کو خبر بھی نہیں، مد تعمیر کی ایک مجلس ہے اس کا ایک اجلاس ابتدائی کے سوا آج تک کوئی اجلاس نہیں ہوا، سب جمع خرچ محض ذاتی رائے سے ہو رہا ہے۔'' (۸۳) مگر اس پر عمل نہ ہو سکا۔

کمیشن کا معاملہ | ۱۹۱۰ء کے جلسۂ انتظامیہ میں مولوی خلیل الرحمٰن صاحب کی تجویز بالا جب ارکان نے منظور نہیں کی تو انہوں نے بلا اطلاع یعنی قاعدہ کے خلاف ایجنڈے میں درج ہوئے بغیر بروقت یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے طلبہ کی مذہبی حالت کی تحقیق و تفتیش کے لیے ایک کمیشن بٹھایا جائے، مولانا اس تجویز پر خاموش رہے اور جلسۂ انتظامیہ نے منظور کر لیا، اس کے بعد مخالفوں نے اس کے طریق کار میں یہ وسعت پیدا کی کہ خود معتمد دارالعلوم کی بھی شہادت ہو یعنی گویا مجرم کی حیثیت سے اس کو بھی سامنے لایا جائے۔

مولانا پر اس تجویز کا اس قدر برا اثر پڑا کہ وہ ندوۃ العلما سے الگ ہونے کے لیے تیار ہو گئے، چنانچہ ۳۱ راگست ۱۹۱۰ء کو اس کے متعلق مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب کو ایک مفصل خط لکھا پھر ۲۹ ر ستمبر ۱۹۱۰ء کو دوبارہ دوسرا اور زیادہ مفصل خط لکھا یہ دونوں خط (۸۵، ۸۶) مکاتیب شبلی میں موجود ہیں، مولانا شروانی نے اس کے جواب میں غالباً کچھ تسلی آمیز باتیں لکھیں، اسی پر ان کو فوراً ہی ۳۰ ر ستمبر ۱۹۱۰ء کو لکھا ''ندوہ کے مواد فاسد کی ہر دفعہ اوپر سے لیپ پوت کر دی جاتی ہے اور اندر اندر مواد پکتا رہتا ہے، اس لیے ہمیشہ خلجان رہتا ہے، اگر واقعی ندوہ کا درد ہے (اور ضرور ہے) تو ایک ہفتہ کے لیے آیئے، اصل یہ ہے کہ منشی احتشام علی صاحب اور مولوی خلیل الرحمٰن صاحب بلکہ مولوی عبدالحیٔ صاحب کو کسی قدر یقین ہے کہ میں ان لوگوں کے اختیارات میں دست اندازی کرتا ہوں اور ان کے کرنے کا کام خود کرتا ہوں اور اس طرح وہ نمایاں نہیں ہوتے، اس لیے آ کر میری اور ان کی سنیے اور دیکھیے کہ کیا واقعہ ہے، مجھ کو آپ کی رائے پر پورا بھروسہ ہے، اگر آپ کے نزدیک میں نے ایک ذرہ بھی اپنے حدود سے تجاوز کیا ہوگا تو معترف ہو کر معافی مانگوں گا، ورنہ جب تک ان لوگوں کا یقین زائل نہ ہوگا کوئی کمیشن اور اصلاح سودمند نہ ہوگی، یہ تو سب اسی رنجش کے بخارات ہیں، باقی مفصل خط پہلے لکھ چکا ہوں۔'' (۸۷)

ارکان کی یہ باہمی کشاکش ختم نہیں ہوئی اور فیصلہ کے لیے جلسۂ انتظامیہ کی ایک تاریخ مقرر ہوئی، مخالف ارکان نے اس تاریخ سے ایک ہفتہ پہلے تمام شہر میں گشت کیا اور بہت سے معززین کو دارالعلوم کے ہال میں جو گولہ گنج میں واقع تھا، اس لیے جمع کیا کہ وہ مولانا شبلی کی برطرفی کا تماشا دیکھیں،

مگر اس اجتماع کا عجیب مضحکہ خیز انجام ہوا جو لطیفہ سے کم نہیں، ارکان اور شہر کے معززین کا اجتماع جب دارالعلوم کے ایک ہال میں جمع تھا، مولانا ندوہ کے دستور العمل کا ایک نسخہ ہاتھ میں لیے ہوئے ہال میں داخل ہوئے اور جب جلسہ کی کارروائی شروع ہونے لگی تو سب سے پہلے اٹھ کر یہ دریافت فرمایا کہ ندوہ کے جلسوں کی تین قسمیں ہیں، جلسۂ عام، جلسۂ خاص، جو کسی امر کے طے کرنے کے لیے ارکان اور دوسرے اہل الرائے حضرات کی شرکت سے ہوتا ہے، تیسرا جلسۂ انتظامیہ جس میں صرف ارکان شریک ہوتے ہیں، سوال یہ ہے کہ اس وقت یہ کون سا جلسہ ہے، اس پر شاہ سلیمان صاحب نے یا کسی اور نے فرمایا کہ یہ جلسہ خاص ہے، مولانا نے فرمایا دستور العمل میں جلسۂ خاص کی تعریف یہ کی گئی ہے ''جلسہ خاص وہ جلسہ ہے جس کو جلسہ انتظامیہ کسی خاص مقصد سے کسی معین تاریخ میں طلب کرے اور ملک کے سر برآوردہ اہل الرائے حضرات کی خدمت میں شرکت کی دعوت بھیجے'' اب اس اجتماع کی کیفیت پر غور کیجیے کہ نہ تو اس اجتماع کو جلسہ انتظامیہ نے بلایا ہے نہ اس کی تاریخ متعین کی ہے اور نہ ملک کے تمام اہل الرائے حضرات کو دعوت دی گئی ہے، اس قانونی اعتراض پر سب دم بخود رہ گئے، اس پر بعض مخالف ارکان نے کہا کہ بہتر ہے۔

ہم ابھی دوسرے کمرہ میں بیٹھ کر جلسہ انتظامیہ کیے لیتے ہیں اور اس کو جلسۂ خاص بناڈالتے ہیں، اس تجویز کے مطابق سب ارکان اٹھ کر دوسرے کمرہ میں چلے گئے اور جلسۂ انتظامیہ کی کارروائی شروع ہوئی، مولانا نے پھر فرمایا یہ جلسہ گو ارکان کا ہے، مگر یہ جلسۂ انتظامیہ نہیں ہے، کیوں کہ جلسۂ انتظامیہ کے لیے ضروری ہے کہ انعقاد سے پندرہ روز پہلے اس کی تحریری یادداشت تمام ارکان کے پاس بھیج دی جائے، اس اعتراض پر ایک سادہ دل مولوی صاحب (مولانا احمد علی صاحب محدث میرٹھی) نے کیا خوب فرمایا ''یہ قاعدہ تو ہم ہی ارکان نے مل کر بنایا ہے، اب ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ قاعدہ غلط ہے'' اس پر بہت سے لوگوں کو ہنسی آگئی اور یہ سارا اجتماع بے نیل مرام منتشر ہوگیا۔

مولانا نے قانون کی جو تعلیم حاصل کی تھی، شاید تمام عمر میں اس موقع سے زیادہ اس نے کبھی ان کو فائدہ نہیں پہنچایا ہوگا۔

بالآخر اس باہمی کشاکش کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ کرنل عبدالمجید خان بہادر فارن منسٹر ریاست پٹیالہ نے جو اس وقت ندوہ کے مربیِ خاص اور ندوہ کے بڑے محسن تھے، اس طرف خاص طور پر توجہ کی اور ان کے سامنے ایک انتظامی جلسہ میں تمام لوگوں نے اپنی اپنی شکایتیں بیان کر کے مصالحت کی اور

باہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔

مولوی عبدالکریم صاحب کی معطّلی کا معاملہ اس مصالحت کے بعد کچھ عرصہ تک ندوۃ العلما میں ہر قسم کا سکون رہا لیکن شروع ۱۹۱۳ء میں ایک دوسرا ہنگامہ برپا ہوا، مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم نامی ایک بزرگ تھے، جو سرحد کے رہنے والے تھے، پہلے حیدرآباد میں مدرس تھے، پھر مولانا مسیح الزماں خان صاحب کے تعلق سے شاہ جہاں پور کے مدرسہ عین العلوم میں مدرس ہوئے اور وہاں سے مولانا کے اخیر زمانہ میں فقیہ اول کے عہدہ پر دارالعلوم میں رکھے گئے، موصوف اچھے خاصے طباع اور ذہین تھے، مگر افسوس ہے کہ اس ذہانت کا رخ دوسری طرف تھا، وہ بہت جلد دوسروں کے حلقۂ اثر میں آگئے، جنھوں نے ان کو فضل و کمال میں مولانا شبلی کا مدمقابل بنا کر کھڑا کیا، مولانا نے الندوہ کی ایڈیٹری سے جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ مطابق مئی ۱۹۱۲ء کے پرچہ کے بعد جب استعفا دے دیا تو نائب ناظم صاحب نے جلسۂ انتظامیہ کی منظوری کی امید پر ان ہی مولوی عبدالکریم صاحب کو اس الندوہ کا اڈیٹر مقرر کردیا، جس کی منظوری چند ماہ بعد ۲۶ ستمبر ۱۹۱۲ء کے جلسہ انتظامیہ میں ہوئی، اس وقت جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کی وجہ سے مسلمانوں میں بڑا اشتعال تھا، مولوی عبدالکریم[1] صاحب نے اس موقع کی مناسبت سے اپنے پہلے ہی مرتبہ پرچہ میں جو ۱۹۱۲ء کے آخر میں جون ۱۹۱۲ء کے مہینہ کا چھپا، جہاد کے فضائل ومناقب پر ایک طویل مضمون لکھ کر شایع کیا، اس زمانہ میں لفظ جہاد کے نام کی جو ہیبت انگریزوں اور مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی اس کا تصور بھی آج مشکل ہے اور ندوہ ابھی ابھی ان سیاسی الزاموں سے حکومت کی نگاہ میں بری ثابت ہوا تھا، اس مضمون کی اشاعت نے ندوہ کے کارکنوں کو گھبرا دیا، مولانا نے ۲۰ جنوری ۱۹۱۲ء کو معتمدین اور مقامی ارکان کو بلا کر صورت حال پیش کی، سب کی متفقہ رائے سے وہ چند روز کے لیے معطل کردیے گئے اور اس کارروائی کی اطلاع ڈپٹی کمشنر کو دی گئی، یہ کارروائی اگرچہ تمام معتمدین اور مقامی ارکان کے اتفاق رائے سے کی گئی تھی لیکن مخالفین نے اخبارات میں جب شور وغل کیا تو ان میں سے متعدد ارکان نے اپنی برأت ظاہر کی اور آخر چند دیگر ارکان نے جن میں مقامی وکلا تھے، ۹ مارچ ۱۹۱۳ء کو ایک جلسہ انتظامیہ کرکے اس قانونی نقص کی بنا پر اس کو منسوخ کرایا کہ اس معطلی کا قانونی

[1] مولوی عبدالکریم صاحب نے افسوس ہے کہ دارالعلوم کی مدرسی ہی کے زمانہ میں اپریل ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ میں لُو لگ جانے سے وفات پائی۔

اختیار نہ معتمدین کو تھا اور نہ صرف مقامی ارکان کو لیکن اس کے بعد جب منشی احتشام علی صاحب وغیرہ کمشنر سے ملے تو اس کی خواہش یہ معلوم ہوئی کہ اڈیٹر کو کچھ نہ کچھ تنبیہ ضروری ہے، اس لیے انہوں نے ۲۰ / مارچ ۱۹۱۳ء کو ارکان کے نام خطوط جاری کیے اور چھ مہینے کے لیے مولوی عبدالکریم صاحب کو باقاعدہ معطل کرایا لیکن اس پوری کارروائی کو بھی بعض لوگوں نے مولانا ہی کی طرف منسوب کر کے ان کو بدنام کرنا چاہا اور خصوصیت کے ساتھ مسلم گزٹ لکھنؤ کے اڈیٹر مولوی وحیدالدین صاحب سلیم نے ایک خاص غرض سے اس فتنہ کے بڑھانے میں بڑا حصہ لیا، حالاں کہ مولانا کو اس دوسری کارروائی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

مولانا ایک خط میں جو ۱۳ / مئی ۱۹۱۳ء کو لکھا گیا ہے، فرماتے ہیں ''لکھنؤ میں میرے مخالف پہلے سے تھے، انہوں نے موقع پا کر اس قصہ کو طول دیا اور ایک جتھا بنا لیا ہے جو مختلف اخباروں میں مضامین لکھتا ہے، یہ ایک باقاعدہ اور مسلسل کوشش ہے جو.......... وغیرہ کی طرف سے کی جارہی ہے۔

حیرت یہ ہے کہ میں نے اس معاملہ کو گورنمنٹ تک پہنچانے میں مطلق حصہ نہیں لیا، البتہ جب سب نے کہا تو میں نے بھی اتفاق کیا، اس پر یہ حال ہے کہ آپ الگ ہیں، نفاق کا یہ حال ہے کہ پبلک میں اپنی علاحدگی دکھاتے ہیں اور گورنمنٹ آفیسر سے مل کر تمام کام انجام دیے، مجھ کو خبر تک نہیں ہونے پائی، حکام سے ملنا اور خط و کتابت کرنا، چھ مہینے کی معطلی کا ممبروں سے منظور کرانا، مجھ کو ذرہ بھر اس سے تعلق نہیں۔'' (عبدالحکیم-۲)

ایک اور خط میں ۱۴ / جون ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں ''میرے خلاف چند خود غرضوں نے ندوہ کے معاملہ میں جو طوفان مچایا، آپ نے سنا ہی ہوگا، لطف یہ کہ شرکت سب نے کی اور اب سب الگ ہیں اور لطف یہ کہ گورنمنٹ افسروں سے گورنمنٹ ہی کا پہلو ظاہر کرتے ہیں اور سرخرو بنتے ہیں، مولوی عبدالکریم کی چندروزہ معطلی جو میں نے کی اس کو نرغہ کر کے منسوخ کرایا، پھر...... وغیرہ چپکے خود کمشنر کے پاس گئے اور ان کی مرضی لے کر مخفی خطوط ارکان کے نام جاری کیے اور چھ مہینے کے لیے مولوی صاحب کو معطل کرایا اور پبلک کو اب تک دھوکہ دیتے ہیں کہ ہم کو ان کی معطلی سے واسطہ نہیں، شبلی نے کیا، جو کچھ کیا، میرے پاس تمام اصلی اور مطبوعہ کاغذات ہیں، موقع ہوا تو دکھادوں گا، ہز آنر نے جو خط بھیجا اس میں لکھا ہے کہ وہ ندوہ کے مضمون کو سخت شرارت انگیز خیال کرتے ہیں، مجھ کو یہ پہلے سے معلوم تھا کہ گورنمنٹ ایسا خیال کرے گی، اگر ندوہ کی طرف سے خبر نہ لی جاتی تو گورنمنٹ خود مقدمہ قائم کرتی اور نواب

وقار الملک کی طرح[1] ہم لوگوں کو عدالت میں جا کر گواہی دینی پڑتی۔" (امین-۱۵)

مولانا کے ان بیانات کی تصدیق کے لیے حاشیہ پر ندوہ کے ایک غیر مطبوعہ دفتری خط کی نقل درج کی جاتی ہے جو ۲۰/ مارچ ۱۹۱۳ء کو مولانا اور دیگر ارکان کے نام لکھا گیا تھا اور جس کا دفتری نشان ۲۸۱۴/۴۳۵ ہے اور جس پر مولانا سید عبدالحئی صاحب اور مولانا خلیل الرحمٰن صاحب کے دستخط ہیں، اس خط سے واقعہ کی پوری کیفیت معلوم ہو سکتی ہے۔[2]

---

[1] غالباً ۱۹۰۸ء میں مولوی سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی نے اپنے اردوئے معلیٰ میں جس کو وہ علی گڑھ سے نکالتے تھے، مصر کے متعلق ایک پرجوش مضمون شایع کیا تھا، جس کو گورنمنٹ نے قابل اعتراض سمجھا، وہ گرفتار کر کے عدالت میں حاضر کیے گئے، اور نواب وقار الملک شہادت میں پیش کیے گئے، سید حسرت موہانی صاحب اسی مقدمہ میں پہلی دفعہ قید ہوئے تھے۔ [2] یہ خط حسب ذیل ہے: از دفتر ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۲۰/ مارچ ۱۹۱۳ء، ۲۸۱۴/۴۳۵

مخدومی و مکرمی جناب شمس العلماء مولانا شبلی صاحب نعمانی دام لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ، جلسہ انتظامی ۹/ مارچ ۱۹۱۳ء نے یہ طے کیا کہ اس جلسہ کی رائے میں کل کارروائی جلسہ غیر معمولی ۲۸/ جنوری ۱۹۱۳ء و کارروائی معتمد صاحب دارالعلوم بہ نسبت معطلی مولوی عبدالکریم صاحب خلاف دستور العمل ندوۃ العلماء بغیر کسی اختیار کے عمل میں لائی گئی ہے، لہٰذا کالعدم سمجھی جائے۔

صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر لکھنؤ نے قبل جلسہ کے منشی احتشام علی صاحب کو بلا کر اپنی خواہش ظاہر کی تھی کہ مولوی عبدالکریم صاحب کو بے موقع اشاعت مسئلہ جہاد کی وجہ سے چھ مہینے کے لیے معطل کیا جائے، چنانچہ اس کا اظہار منشی صاحب نے جلسہ میں کیا اور لکھا بھی گیا، مگر جلسہ نے اس کی اشاعت کو بہ خیال ناگواری حکام منع کیا اور بہ طور خود تجویز کر کے یہ چاہا کہ اراکین سے مولوی صاحب کی بابت رائے طلب کریں کہ اس اشاعت کی بابت مولوی عبدالکریم صاحب سے کچھ تدارک کیا جائے یا نہیں اور کیا جائے تو کیا؟

جلسہ کے بعد احتیاطاً میں اور منشی محمد احتشام علی صاحب ۱۵/ مارچ ۱۹۱۳ء کو ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر سے ملے اور اس بارے میں گفتگو کی، تو صاحب نے فرمایا کہ ضرور ہمارا یہ منشا اور خواہش ہے کہ مولوی عبدالکریم صاحب کو صرف چھ مہینے کے لیے معطل کیا جائے اور پھر وہ بدستور اپنا کام کریں، اور ہماری اس خواہش کا اعلان کر سکتے ہو، اور مولوی عبدالکریم صاحب کی سچائی کی ہم نے ہز آنر سے سفارش کی ہے اور مقدمہ جو ان کے اوپر بہ وجہ نہ لکھنے کے نام مشتہر کنندہ پرچہ کے چل سکتا تھا، نہیں چلایا، مگر اس قدر معطلی کا اس اشاعت کی بابت ضرور خیال ہے، اس کے بعد ہم کو ان سے اور ندوہ سے کچھ شکایت نہیں، وہ اپنا کام کریں۔

چوں کہ جلسہ انتظامی ۹/ مارچ کو ہو چکا ہے، فوراً دوسرا جلسہ طلب نہیں ہو سکتا اور اس کا التوا جلسہ ثانی تک باعث بدظنی حکام ہوگا اور احتمال نقصان کا ہے، اس لیے بموجب دفعہ ۲۵ دستور العمل دوبارہ معطلی مولوی عبدالکریم صاحب تحریری رائے کا خواستگار ہوں کہ اندر ایک ہفتہ کے اپنی رائے سے مطلع فرمائیے، تا کہ کثرت تحریر رائے عمل کر سکوں اور صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر کو ان کی خواہش کے نتیجے کی اطلاع دے سکوں، والسلام، خلیل الرحمٰن، نائب ناظم ندوۃ العلماء، بقلم عبدالحئی۔

ندوہ کے اس دفتری مراسلہ سے ثابت ہوگا کہ کن لوگوں نے اس کو حکومت تک پہنچایا اور کس طرح ان کی شش ماہہ معطلی عمل میں آئی، ان کی چندروزہ معطلی کے پہلے جلسہ میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی بحیثیت رکن انتظامی شریک تھے، مگر بعض مقامی اخباروں کے شوروغل کے بعد انہوں نے ایک اخبار میں اپنی شہادت شائع کرائی اور اپنی برأت ظاہر کی، اس کا جواب مولانا نے ۲۴ رمئی ۱۹۱۳ء کے وکیل امرتسر میں چھپوادیا، یہ تحریر اور دوسری تحریر جو مولانا سید عبدالحیؒ صاحب کے جواب میں ہے، مقالاتِ شبلی جلد سوم صفحہ ۱۱۹ اور صفحہ ۱۳۱ پر چھپی ہوئی ہے۔

دارالعلوم کی معتمدی سے استعفا بہرحال مولانا ان ہنگاموں سے ایسے بددل ہوئے کہ انہوں نے دارالعلوم کی معتمدی سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کرلیا، چنانچہ جولائی ۱۹۱۳ء میں بمبئی سے اپنا استعفا دفتر میں بھیج دیا، ان کے ساتھ اور معتمدین یعنی مولوی سید عبدالحیؒ صاحب مرحوم اور منشی احتشام علی صاحب بھی اپنی اپنی معتمدیوں سے مستعفی ہو گئے، بعض اور دوسرے ارکان نے بھی رکنیت سے استعفا دیا، اس کے بعد ۱۸/۱۹/۲۰ر جولائی ۱۹۱۳ء کے جلسۂ انتظامیہ میں مولانا خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم مستقل ناظم بنائے گئے اور ندوہ کی عنانِ حکومت ان کے ہاتھ میں دے دی گئی، (شروانی - ۱۰۹) اور مولوی سید عبدالحیؒ صاحب اور منشی احتشام علی صاحب عہدوں کے لحاظ سے نائب ناظم مقرر کیے گئے۔

نظامت کے عہدے کے لیے مولانا خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم کا انتخاب اگرچہ دستورالعمل کے قواعد اور مولانا کی مصلحت بینی کے بالکل خلاف تھا، کیوں کہ وہ مولانا کے نزدیک دارالعلوم کے اصلی نصب العین اور مقصد سے متفق نہ تھے اور وہ اس کو پرانی قسم کی ایک عربی درس گاہ بنا دینا چاہتے تھے، تاہم چوں کہ مولانا صرف ندوۃ العلما کی اصلاح اور بہبودی کے خواستگار تھے، اس لیے اس یکسوئی میں ان کو ندوۃ العلما کے فوائد نظر آئے اور وہ اس پر خوش ہوئے، چنانچہ ۷ر اگست ۱۹۱۳ء کو مجھے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "باوجود مخربات کے چند باتیں خود بخود مفید بھی نکل آئیں، ہیڈ ماسٹر نے دوسری جگہ تعلق کرلیا اور سردست چھ مہینے کی رخصت لی، پھر غالباً مستعفی ہو جائے گا، اس سے انگریزی کا جو سخت نقصان تھا، رفع ہو جائے گا، مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی کے اختیارات وسیع ہوئے اور..... کے استعفا سے ہر ہر کام میں رکاوٹ جاتی رہی...... معتمدیوں کے ٹوٹ جانے سے اتنا فائدہ ہوا کہ بہرحال قوت ایک جگہ ہوگئی، یہ دوسری بحث ہے کہ اس وقت انجن خراب ہے لیکن کوئی کام کا آدمی منتخب ہوگا، تو کام

میں رکاوٹ نہ ہوگی، ورنہ معتمدین کا ہٹانا بہت مشکل تھا۔'' (سلیمان-۵۱)

مولانا کے استعفے کا اثر مولانا کے استعفے کی خبر جب طلبہ کو معلوم ہوئی تو ان کو سخت افسوس ہوا، پہلے سب نے ایک جلسہ کر کے مولانا کو بمبئی پے در پے کئی تار بھیجے[1]، جن میں ان سے استعفے کی واپسی کی پرزور خواہش کی تھی اور فرداً فرداً دوسرے طالب علموں نے بھی اسی قسم کے خطوط لکھے اور التجائیں کیں کہ وہ اپنے استعفے کو واپس لے کر ان کو مرہون منت فرمائیں، لیکن مولانا نے عہدہ کی ذمہ داری لینے سے بدستور انکار کیا، لیکن اس انکار کے باوجود یہ اقرار کیا کہ معمولی رکن کی حیثیت سے اب بھی ان کی زندگی کا مقصد ندوہ ہی کی خدمت ہے، چنانچہ ۱۳؍ جولائی ۱۹۱۳ء کو طلبائے ندوہ کے نام حسب ذیل خط لکھا ''عزیزانِ من! السلام علیکم! آپ لوگوں کے پر اثر خطوط اور تار پے در پے آئے ہیں، ایسا سنگ دل نہ تھا کہ ان سے متاثر نہ ہوتا لیکن موجودہ حالت میں کام کرنا ناممکن تھا اور میں دارالعلوم کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا سکتا، مجھ کو اپنی تمام کوششوں اور جاں فشانیوں کی (اگر میں نے یہ فرض کچھ کی ہیں) داد مل گئی اور یہ میرا پورا صلہ ہے کہ جن کی خدمت کی گئی وہ اس کی قدر کرتے ہیں، آپ لوگ مایوس ہیں لیکن مایوسی کی کوئی بات نہیں، عام اسلامی جماعت بیدار ہوگئی ہے، وہ اپنے ہر قسم کے فوائد کو سمجھے گی اور اس کی نگہداشت کرے گی ممکن ہے کہ کچھ دیر ہو لیکن جو تخم زمین پر پڑ چکا ہے وہ انشاء اللہ برباد نہ جائے گا۔

ندوہ کیا چیز ہے؟ موجودہ زمانہ کے مقابلہ میں مذہب کی حمایت، یہ احساس عام ہو چلا ہے، معارف قرآنیہ[2] دہلی اسی رفتار کا ایک قدیم ہے، ندوہ بھی اپنے اولیت کے نتائج حاصل کرے گا، ولو بعد برھۃ باوجود استعفا میری زندگی کا مقصد ندوہ ہی رہے گا اور آپ لوگوں کی خدمت نہ صرف دل بلکہ ہاتھ سے بھی کرسکوں گا وعلی اللّٰہ التکلان۔'' (مکاتیب اول)

پھر مولانا مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی مدرس اعلا دارالعلوم اور حضرات مدرسین کے جواب میں یہ خط لکھا ''آپ صاحبوں کی ہمدردی اور قدردانی شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن فرمایئے چارہ کیا ہے؟ پورے چار برس گزر رہے بجز اس کے کہ ہر کام میں میری مخالفت کی گئی اور کیا ہوا، اس بنا پر میں ندوہ کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہوں، دو ایک برس بھی آزادی سے کوشش کرسکتا تو ندوہ کو کچھ ترقی دے سکتا۔

---

[1] مکاتیب ابوالکمال، عبدالحکیم [2] شاید ۱۹۱۲ء میں مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نے اس نام سے ایک قرآنی درس گاہ کی بنیاد مسجد فتح پوری میں ڈالی تھی، جس کا مقصد سند یافتہ عربی طلبہ اور مسلمان گریجویٹوں کو قرآن پاک کی تعلیم دینا تھا۔ ۱۹۱۴ء کی بڑی لڑائی میں مولانا عبیداللہ صاحب وغیرہ نے جب ہندوستان کو چھوڑا تو یہ ادارہ بند ہوگیا۔

اس لیے یہی بہتر ہے کہ اور لوگ یکسوئی سے کام کریں، ممکن ہے کہ وہ مجھ سے اچھا کرسکیں، بہر حال میں مدرسہ کا اور طلبہ کا ویسا ہی خدمت گزار رہوں گا، اب محبت اور ہمدردی کا تعلق بالکل بے لاگ ہوگا، یعنی افسری کی ظاہری بے گانگی بھی نہ رہے گی اور بچے دیکھیں گے کہ میں کیوں کر ان کا برابر کا بھائی بن کر کام کرتا ہوں۔''

۱۹؍ جولائی ۱۹۱۳ء کو مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو لکھا ''ندوہ سے تعلق منقطع ہونا تو محال ہے لیکن یہ وہیں آ کر فیصلہ ہوسکتا ہے کہ تعلق کی نوعیت کیا ہو۔'' (مسعود علی-۲)

ملک کے مختلف گوشوں سے بھی استعفے کی واپسی کے لیے تحریکیں اٹھیں مگر مولانا اپنی رائے پر جمے رہے۔

حیدر آباد کا سفر اور ماہانہ میں اضافہ مولانا بمبئی سے نواب عماد الملک کی طلبی پر اکتوبر ۱۹۱۳ء کے دوسرے ہفتہ میں (امین اور ابوالکلام-۲۷) حیدر آباد روانہ ہوگئے، نواب صاحب اس وقت مولانا کی تحریک سے قرآن پاک کا جو انگریزی ترجمہ کررہے تھے، اس میں مولانا سے مشورے درکار تھے، یاد ہوگا کہ سرکار آصفیہ سے مولانا کو ۱۰۰ روپیہ ماہوار جب ۱۸۹۶ء میں مقرر ہوئے تھے تو اس فرمان میں آیندہ کے اضافہ کا اشارہ بھی تھا، مگر اب تک نہ مولانا نے خواہش کی اور نہ سرکار آصفیہ نے توجہ فرمائی، اس سفر میں نواب صاحب نے اعلاحضرت نواب میر عثمان علی خان بہادر کی سرکار میں اضافہ کی تحریک کی تو اعلاحضرت نے مسرت ظاہر فرمائی (عبدالماجد-۱۷) اور دو سو ماہوار کا اضافہ منظور فرمایا، اس اضافہ سے مولانا کو اپنے بہت سے پیش نظر علمی وقومی کاموں میں سہولت حاصل ہوگئی۔

حیدر آباد میں اس دفعہ ان کو مکان بہت دل خواہ اور تفریح بخش مل گیا تھا، اس لیے وہ دو تین مہینے حیدر آباد میں ٹھہر گئے اور سیرت کی پہلی جلد کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔

لکھنؤ کو واپسی آخر ہم سب لوگوں کے بڑے تقاضے سے ۸؍ دسمبر ۱۹۱۳ء کو لکھنؤ کا قصد کیا۔ (سلیمان-۶۴) اس اثنا میں میں الہلال کلکتہ سے الگ ہوکر پٹنے میں ٹھہرا ہوا تھا، مولانا کے لکھنؤ کی آمد کی خبر سن کر میں بھی حاضر خدمت ہوا اور چند ہی روز کے بعد مجھے دکن کالج پونہ کی ایک خدمت پر روانہ کیا، اور خود لکھنؤ میں قیام فرمایا۔

طلبائے دارالعلوم سے بدستور تعلق طلبہ نے ان کے آنے پر ایک جلسہ کیا، جلسہ میں انہوں

نے اپنی تقریر سے پہلے طالب علموں سے مخاطب ہوکر بڑی حسرت سے اپنا یہ قطعہ پڑھا جس کو وداعیہ کہنا چاہیے:

کیے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے | یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہد شباب اپنا
اور اب تو یہ ہے جو کچھ امیدیں ہیں وہ تم سے ہیں | جواں ہو تم لب بام آچکا ہے آفتاب اپنا

درس بخاری کو روکنا دسمبر ۱۹۱۳ء کے آخر میں آخری سال کے لڑکوں نے مولانا سے خواہش ظاہر کی کہ وہ انہیں بخاری شریف کا درس دیں، مولانا نے اس کو قبول کیا اور ہر روز مغرب کے بعد درس شروع ہوگیا[1] اور بہت سے لڑکوں نے اس میں شرکت کی لیکن ناظم صاحب نے اس کو پسند نہیں کیا، انہوں نے جناب مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی سے جو مہتمم و مدرس اعلا تھے، خواہش کی کہ وہ طلبہ کو اس سے روکیں، مفتی صاحب نے اس میں تامل کیا اور اس کا تذکرہ مولانا سے کیا، انہوں نے فرمایا کہ وہ آپ کو تحریری حکم بھیج دیں، تو آپ اس پر عمل کیجیے لیکن جناب ناظم صاحب نے اس ناگوار فرض کی انجام دہی سے پہلوتہی کی اور مفتی صاحب کو مجبور کیا کہ وہی اپنے قلم سے حکم لکھیں، انہوں نے یہ کیا کہ یہ تخصیص بخاری کے درس کے روکنے کے بہ جائے طلبہ کو خارج اوقات میں کسی سے درس لینے کی ممانعت کردی، اس کا اثر طلبہ پر بہت برا پڑا، بہت سے طلبا خارج اوقات میں دوسروں سے اپنے سابق کی کمی کو پورا کرتے تھے، وہ سب بند ہوگئے۔

میلاد میں مولانا کی تقریر کو روکنا دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ دارالعلوم کے طلبہ ہر سال کسی نہ کسی تاریخ میں دھوم دھام سے بیان سیرت کی مجلس کرتے تھے، جس میں تمام اہل شہر مدعو ہوتے تھے اور مولانا عموماً سیرت نبوی ﷺ پر کوئی مفید و مؤثر تقریر فرماتے تھے، اس سال بھی اس مجلس کا اہتمام شروع ہوا اور خیال تھا کہ طلبہ مولانا سے تقریر کی درخواست کریں گے، اس لیے پہلے اس مجلس ہی کو روکنے کی کوشش کی گئی لیکن پھر بعد کو عام بدنامی کے ڈر سے مجبوراً چند شرطوں اور قیدوں کے ساتھ اس کی منظوری دے دی گئی۔

اسٹرائیک اس کے بعد اور واقعات پیش آئے جو طلبہ میں ہیجان کا باعث بنتے گئے، جن میں سے ایک طلبہ کو سیاسی جلسوں میں شرکت سے حکماً باز رکھنا بھی تھا، آخر ۷؍ مارچ ۱۹۱۴ء کو مولانا کی ہر قسم کی فہمائش کے باوجود طلبہ نے اسٹرائیک کا عام اعلان کردیا اور چوں کہ طرابلس و بلقان کی لڑائیوں اور کان پور

[1] ابوالکمال عبدالحکیم-۵، حمید-۷۔

ئے ہنگاموں اور مسلم یونیورسٹی کے پرجوش مطالبوں کے باعث طبائع میں عام طور سے بے چینی تھی، اس لیے اسٹرائیک کے ساتھ ملک کی ہمدردی ایک ملکی مسئلہ کی طرح پھیل گئی، زمین دار لاہور، ہمدرد دہلی، مسلم گزٹ لکھنؤ اور الہلال کلکتہ اس زمانہ کے مشہور اور آزاد اخبار تھے، جو طلبہ کی حمایت میں پرزور مضامین لکھ رہے تھے، وقت کی سیاسی بے چینی نے قوم کے افراد کو دو حصوں میں صاف صاف منقسم کر دیا تھا، ایک آزاد جن کا نام آہستہ آہستہ احرار پڑ رہا تھا، جس کے سربراہ مولانا ابوالکلام، محمد علی مرحوم، سید حسرت موہانی، مولوی ظفر علی خاں اور ان کے شیخ طریقت مولانا شبلی تھے، دوسرا حصہ قدامت پسندوں کا تھا جن میں اس وقت صاحب زادہ آفتاب احمد خاں، نواب حاجی اسحاق خاں اور دوسرے حکام رس اشخاص تھے، احرار کا طبقہ ہر طرح طلبہ کی ہمدردی و حوصلہ افزائی کر رہا تھا اور دوسرا طبقہ ندوہ کے موجودہ کارکنوں کی حمایت میں تھا، مدارس کی عام ڈسپلن اور کارکنان مدارس کی ہمدردی کے نام سے علی گڑھ کالج کے ارباب اقتدار اور مدرسۂ دیوبند کے علما بھی ندوہ کے مدعیوں کے ساتھ تھے اور یہ تصادم ملک کے طول و عرض میں پورے ڈھائی مہینہ قائم رہا۔

مولوی مسعود علی ندوی اور طلبائے قدیم اسٹرائیک کے اعلان کے ساتھ بعض ان قدیم طلبہ نے جو لکھنؤ میں رہتے تھے، مناسب سمجھا کہ طلبائے قدیم کی ایک مجلس کی بنیاد ڈال کر اس اسٹرائیک کی رہنمائی کریں، اس مجلس کے پہلے ناظم مولوی مسعود علی صاحب ندوی منتخب ہوئے، مولوی صاحب ممدوح کی عملی قابلیت کا غیر معمولی اظہار اسی اسٹرائیک کی رہنمائی کے دوران میں ہوا، انہوں نے بڑی قوت اور قابلیت سے طلبہ کی اسٹرائیک کو پورے زور شور سے اس خوبی سے جاری رکھا کہ تمام ملک دنگ رہ گیا، ایک طرف ۱۰۰ سے زائد طلبہ کے کھانے پینے رہنے سہنے کا انتظام، ان کو قابو میں رکھنا، ان میں بددلی نہ پیدا ہونے دینا اور ساتھ ہی ان کے پڑھنے کے لیے مدرسین کا فراہم کرنا اور دوسری طرف تمام ملک میں اخبارات رسائل اور پمفلٹوں کے ذریعہ سے رائے عامہ کو ابھارتے رہنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔

اصلاح ندوہ کی کوشش مولانا نے استعفا دینے کے ساتھ اپنے ہمدرد احباب اور شاگردوں کو ندوہ کے علاج سے مایوس ہونے کے بجائے اصلاح ندوہ کی تجویزوں کی طرف متوجہ کیا تھا، دوستوں میں سے خصوصیت کے ساتھ نواب سید علی حسن خاں، مولانا ابوالکلام اور شاگردوں میں سے مولوی مسعود علی صاحب ندوی اور خاکسار کو متعدد خطوط لکھے اور ان کو ندوہ کی اصلاح کے لیے آمادہ کیا[1]، ان ہی میں سے بعض

---

[1] یہ خطوط اب بھی نواب صاحب، مولوی ابوالکلام صاحب، مولوی مسعود علی صاحب اور میرے نام کے مکاتیب شبلی میں چھپے ہوئے موجود ہیں۔

خطوط کو ڈاک سے اڑا کر دفتر نظامت نے ۲۶، ۲۷، ۲۸، مارچ ۱۹۱۴ء کے جلسہ انتظامیہ میں پیش کیا اور اخباروں میں شائع کرایا اور ثابت کرنا چاہا کہ مدرسہ میں یہ اسٹرائیک ان کی سازش سے ہوئی ہے، حالاں کہ یہ واقعہ نہ تھا لیکن جہاں تک اصلاح کا تعلق ہے مولانا نے علی الاعلان اعتراف کیا کہ بے شبہ یہ میری تحریک ہے اور لوگوں سے میری یہ استدعا ہے کہ وہ ندوہ کی اصلاح کے لیے فوراً کھڑے ہو جائیں[1]۔

مجلس اصلاحِ ندوہ کا قیام ملک میں یہ ہنگامہ برپا تھا اور مختلف شہروں میں ندوہ کے کارکن اصحاب کے خلاف احتجاجی جلسے ہو رہے تھے، آخر ندوہ کے ارکان میں سے ان لوگوں نے جو اصلاح کے حامی تھے اور جن کی تعداد دو تہائی کے قریب تھی، متفق ہو کر اپریل ۱۹۱۳ء کی ابتدائی تاریخوں میں لکھنؤ میں مجلس اصلاحِ ندوہ کی بنیاد ڈالی، نواب سید علی حسن خاں مرحوم اس مجلس کے ناظم اور مولوی نظام الدین حسن صاحب (سابق منصب دار بھوپال وحیدر آباد) صدر قرار پائے اور بہت سے حضرات نے اس کی ممبری قبول کی اور تمام ملک میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں، چنانچہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور شہروں بلکہ قصبات ودیہات میں تقریباً پچاس ۵۰ جلسے مطالبہ اصلاح کی تائید میں مسلسل منعقد ہوئے۔

الہلال اور مولانا ابوالکلام اور حق یہ ہے کہ اس وقت اس بلند آہنگی سے ملک میں ندوہ کے انقلاب اور اصلاح کا صور جس نے پھونکا وہ مولانا ابوالکلام کا آتش ریز قلم تھا، انہوں نے الہلال میں مسلمانوں کی اس عظیم الشان اصلاحی تحریک کی بربادی پر اس زور شور سے ماتم کیا کہ ملک میں اس سرے

---

[1] یہ تمام واقعات مولانا کے اس مضمون میں مذکور ہیں، جو "اسٹرائک کا سبب کون تھا؟" کے عنوان سے ہمدرد دہلی مورخہ ۶ / اپریل ۱۹۱۴ء میں چھپا تھا، اور اب مقالات شبلی جلد ہشتم کے ص ۱۲۸ پر چھپا ہے۔

اس سلسلہ میں مولوی عبدالسلام صاحب ندوی کے ایک خط نے بڑا ہنگامہ برپا کر دیا، انہوں نے ۲۵ / جولائی ۱۹۱۳ء کو بمبئی سے مولوی مسعود علی صاحب ندوی کے نام ایک خط لکھا جس میں یہ لکھا تھا کہ: "اب خاموشی کا وقت نہیں، مختلف مقاموں میں جہاں جہاں آپ کا اثر ہو، اظہار افسوس اور ندوہ کے موجودہ نظام سے بے اطمینانی کے جلسے کرایئے، سرکشی اور اسٹرائک کا وقت اب آیا ہے۔" اس کے آخر میں لکھا تھا کہ "اس خط کی خبر کسی کو نہ ہو، یہ مولانا کا حکم ہے۔" یہ خط بھی دفتر نظامت نے ڈاک سے اڑا لیا اور بعد کو اسٹرائک کے بعد اس کو پبلک میں شایع کیا، مولانا نے اس خط کے متعلق بہ حلف اپنے مضمون میں لکھا کہ "نہ یہ میری ایما سے لکھا گیا ہے، نہ میں نے اس کو دیکھا ہے اور نہ میں اس کو اب بھی جائز سمجھتا ہوں۔" مولوی عبدالسلام صاحب نے اس خط کو اپنا قبول کیا، مگر یہ لکھا کہ "میں نے مولانا کے استعفے کی منظوری کی خبر سے مضطرب ہو کر لکھا اور مولانا کی طرف اس لیے نسبت کی کہ طلبہ میں اس تحریک کی اہمیت بڑھ جائے۔" مگر یہ خط نہ مکتوب الیہ کو ملا اور نہ طلبہ تک پہنچا اور نہ وہ اسٹرائک کا سبب بنا، یہ اسٹرائک اس خط کی تاریخ کے سات مہینوں کے بعد ہوئی۔

سے اس سرے تک آگ سی لگ گئی اور ہر طرف ندوہ ندوہ کا شور برپا ہو گیا۔

حکیم اجمل خاں مرحوم | یہ حالت تھی جب حکیم اجمل خاں مرحوم نے اپنی مسیحا نفسی کا ثبوت دیا انہوں نے پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ معاملہ کی اہمیت کو سمجھ کر تمام ملک کے اہل الرائے حضرات کو دہلی میں ایک مشورہ کی مجلس میں شرکت کی دعوت دی، جو ۱۰ رمئی ۱۹۱۴ء کو وہاں ہونی قرار پائی۔

مجلس اصلاح ندوہ کا اجلاسِ عام دہلی میں | مولانا کا قیام دلی میں حکیم صاحب ہی کے مکان پر تھا، ہر روز اصلاح حال کے جلسے اور مشورے ہوتے رہتے تھے مختلف ہمدرد اصحاب آتے اور معاملہ کی یکسوئی کی رائیں پیش کرتے تھے، ۲۹ راپریل ۱۹۱۴ء کو مولانا دلی سے نواب علی حسن خاں صاحب کو لکھتے ہیں ''مقامی کمیٹی جلسہ کے انتظام میں مصروف ہے، باہر سے بہت سے لوگ آتے نظر آتے ہیں، خطوط آرہے ہیں، مولوی خلیل الرحمٰن صاحب منشی سخاوت علی، نواب وقار الملک، مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے مواجہہ میں مختلف جلسے معاملات کے طے ہونے کے ہوئے، گو میں شریک نہ تھا، اب تک جو امور طے ہوئے، بہ ظاہر قابل اطمینان ہیں، دیکھیے اگر اخیر تک قائم رہ جائیں، ایک خاص امر میں زیادہ بحث ہے اور وہ ۱۰ ر کے جلسہ کا انعقاد ہے، بہرحال دو ایک دن میں آخری نتائج معلوم ہو جائیں گے اور مطلع کروں گا، کوئی امر بغیر آپ کی اصلاحی کمیٹی کی منظوری کے طے نہ کیا جائے گا، ابھی تک مسودہ ہے۔ (نواب علی حسن خاں-۹)

محمد علی مرحوم ابھی تک پوری مستعدی سے اصلاحی کمیٹی میں شرکت نہیں کر رہے تھے، ان کا خیال تھا کہ جب تک اصلاح کی تمام دوسری صورتیں ناکام نہ ہو جائیں، ۱۰ رمئی کی کانفرنس کو ملتوی کر دینا چاہیے، ۲۴ راپریل کے ہمدرد میں انہوں نے اپنے اس خیال کو پھیلا کر لکھا، مولانا نے یکم مئی ۱۹۱۴ء کے ہمدرد میں ان کو جواب دیا، جس میں پہلے ان کی مخلصانہ کوشش کا اعتراف کیا[1]، پھر لکھا کہ اب تک میں نے اور میرے ہمدرد ارکان نے مصالحانہ اصلاح کی کیا کیا کوششیں کیں اور وہ ناکام رہیں اور اب بہ جز مسلمانوں کی ایک عام کانفرنس کے کوئی دوسرا علاج باقی نہیں رہا۔

غرض ۱۰ رمئی ۱۹۱۴ء کی اصلاحی کانفرنس کی تاریخ قائم رہی۔

مولانا کی تکفیر | مخالفین نے اس اصلاحی تحریک کو ناکام کرنے کے لیے جو آخری ہتھیار اٹھایا وہ

[1] اب یہ مضمون مقالات شبلی جلد ہشتم میں ملے گا-۱۲۔

مولانا کی تکفیر کا فتویٰ تھا، دلی میں مخالف ارکان وعلما کا مرکز مولانا عبدالحق صاحب حقانی کا مکان تھا، کہتے ہیں کہ ان ہی کے مشورہ سے بعض علما نے الکلام اور علم الکلام کی بعض عبارتوں کی بنا پر تکفیر کا یہ فتویٰ مرتب کیا، جس میں ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ قدم مادہ کے قائل ہیں اور نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں، یہ فتویٰ ملک میں شائع ہوا اور اشتہار کے طور پر مختلف شہروں کی دیواروں پر چسپاں کیا گیا، اس موقع پر سید عبدالسلام صاحب مالک مطبع فاروقی دہلی نے مولانا کی خدمت میں ایک استفسار پیش کیا، جس میں یہ پوچھا تھا کہ کیا آپ مادہ عالم کو قدیم اور نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں؟ مولانا نے اس کے جواب میں پہلے ایک مفصل بیان لکھا کہ میں مادۂ عالم کو قدیم نہیں مانتا، البتہ تمام صفاتِ الٰہی کے قدم کا قائل ہوں اور اسی طرح نبوت کو اکتسابی بھی نہیں جانتا بلکہ اس کو عطیہ الٰہی مانتا ہوں' سید عبدالسلام صاحب نے کہا کہ یہ تحریر ذرا لمبی ہے اور عوام اس کو سمجھ نہیں سکتے، مولانا نے اسی مطلب کی ایک دوسری مختصر تحریر لکھ دی، میں اس وقت پاس بیٹھا تھا، میں نے مولانا کے ہاتھ کی وہ دونوں تحریریں اپنے پاس رکھ لیں (جو انشاء اللہ آیندہ کسی موقع پر پیش ہوں گی) اور دوسری تحریر کی نقل سید صاحب کے حوالہ کی، جو عام طور سے شائع کی گئی جس سے اس فتنہ کا سارا تاروپود بکھر گیا۔

دلی کی اصلاحی کانفرنس، محمد علی مرحوم اور اسٹرائک کا خاتمہ بہرحال ۱۰ رمئی ۱۹۱۳ء کو دلی میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کی صدارت میں اصلاحی کانفرنس منعقد ہوئی، حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے اس کا ایسا معقول انتظام کیا تھا کہ ایسا ہنگامہ خیز اجلاس پوری دل جمعی کے ساتھ بیٹھا اور اس نے اپنا کام کیا، اس کانفرنس میں تمام ہندوستان سے لوگ آئے تھے اور ہر طرف سے موافق ومخالف سمٹ کر اس میں جمع ہوئے تھے، دونوں طرف کے ممبروں نے تقریریں کیں، اپنی اپنی رودادیں سنائیں اور تجویزیں پیش کیں، اس سلسلہ کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ محمد علی مرحوم جو حزب احرار کے دوسرے دست وبازو تھے، وہ ابھی تک گومگو میں تھے اور پوری مستعدی کے ساتھ ہمارے ساتھ نہ تھے، میں اور مولوی مسعود علی صاحب ان سے کئی دفعہ ملے اور ان کو طلبہ کے مطالبات کی حمایت کے لیے آمادہ کیا، انہوں نے کہا جب تک طلبہ اسٹرائک نہ ختم کردیں، میں ان کی حمایت نہیں کرسکتا، ہم دونوں نے کہا اگر آپ ان کے مطالبات کی ذمہ داری قبول کرلیں تو امید ہے کہ وہ ابھی اسٹرائک ختم کردیں گے، یہ سن کروہ

[1] مکاتیب شروانی - ۱۱۶۔

خوش ہوئے، کیوں کہ اس سے پہلے بہت سے اکابر اس کے لیے کوشش کر کے ناکام ہو چکے تھے، غرض اسی وقت ہم نے اور انہوں نے مل کر طلبہ کو لکھنؤ تار دیا، وہاں سے محمد علی مرحوم کے نام جواب آیا کہ ہم بخوشی اپنی قسمت کی باگ آپ کے مضبوط ہاتھوں میں دیتے ہیں اور آپ کے حسب مشورہ اسٹرائیک کو ختم کرتے ہیں'' یہ ایسی خوش خبری تھی کہ محمد علی مرحوم اپنی اس کامیابی پر اچھل پڑے اور فوراً تار لیے ہوئے جلسہ میں آئے اور ایک تمہیدی تقریر کے ساتھ اس تار کو پڑھ کر طلبہ کے مطالبات کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

دوسرا واقعہ جس نے محمد علی مرحوم کو طلبہ کی حمایت میں اور زیادہ سرگرم بنا دیا، وہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی تقریر تھی، وہ محمد علی مرحوم کی جوابی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور منتظمین کی حمایت میں ایک مبسوط تقریر کی، میں پاس بیٹھا تھا، محمد علی مرحوم کا یہ حال تھا کہ صاحب زادہ صاحب مرحوم کے ہر ہر فقرہ پر وہ اور زیادہ مشتعل ہوتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ صاحب زادہ صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہہ اٹھے کہ ''اگر استبدادِ مجسم دیکھنا ہو تو ادھر دیکھو'' آخر صاحب زادہ صاحب کی تقریر کے بعد وہ پھر کھڑے ہوئے اور ایسی گرم اور پرزور تقریر کی کہ استبدادی منتظمانہ اصول کی جڑیں ہل گئیں، اس سلسلہ میں خواجہ غلام الثقلین، حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام، مرزا حیرت دہلوی، سید جالب دہلوی، مولانا عبدالوہاب بہاری نے تائیدی تقریریں فرمائیں[1]۔

اصلاحی سب کمیٹی بہر حال ان گرما گرم تقریروں کے بعد حاضرین کی کثرت رائے سے چند تجویزیں منظور ہوئیں اور ایک سب کمیٹی بنی، جس کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ ندوہ کے لیے ایک ایسا نیا دستور العمل بنائے جس میں کسی کو پھر مستبدانہ کارروائی کا موقع نہ ملے، اس دستور العمل کے بنانے کا کام حکیم صاحب مرحوم کے حسب منشا، پیرزادہ محمد حسین (پنشنر جج دہلی) کے سپرد ہوا اور حکیم صاحب مولانا ابوالکلام صاحب، محمد علی مرحوم، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، خواجہ غلام الثقلین مرحوم، نواب علی حسن خان مرحوم، حکیم عبدالولی صاحب مرحوم (جھوائی ٹولہ لکھنؤ) وغیرہ ممبر منتخب ہوئے۔

اصلاحی سب کمیٹی نے اپنا کام فوراً ہی شروع کر دیا، پہلی کمیٹی میں محمد علی مرحوم نے اس بات پر زور دیا کہ یہ کمیٹی پچھلے واقعات کی تنقید سے تعلق نہ رکھے، بلکہ یہ پیش نظر رکھے کہ اب ایسے قاعدے بنائے جائیں اور جمہور کی قوت کو اتنا بڑھایا جائے کہ آیندہ کسی کو خود مختارانہ کارروائی کا موقع نہ ملے،

[1] روداد جلسۂ عام، انجمن اصلاح منعقدہ دہلی، بتاریخ ۱۰ ار مئی ۱۹۱۴ء۔

غرض یہ قرار پایا کہ ۲۴ رمئی کو ایک جلسہ بلایا جائے، جس میں تمام ارکان جمع ہوں اور پورا خاکہ اس طرح مرتب کرلیا جائے کہ بار بار اجتماع کی ضرورت پیش نہ آئے، ہر طرف کے توسط کے لحاظ سے دہلی کو پھر مقام جلسہ تجویز کیا گیا[1] اور مجلس اصلاح ندوہ لکھنؤ کو اس کی اطلاع دی گئی، اس تجویز کے مطابق ۲۴ رمئی کو ایک جلسہ ہوا اور آیندہ کارروائی کی راہیں متعین کی گئی اور پیرزادہ محمد حسین صاحب نے ایک نیا دستور العمل بنایا جس کو مجلس اصلاح نے چھاپ کر شایع کیا۔

مولانا بمبئی میں مولانا نے اس اصلاح ندوہ کے سلسلہ میں پورا اپریل و مئی اور جون کا ایک حصہ دہلی میں بسر کیا، اصلاحی سب کمیٹی کے کاموں سے فرصت کر کے وہ وسط جون میں بمبئی روانہ ہو گئے اور سیرۃ النبی ﷺ جلد اول کی تکمیل میں مصروف ہوئے اور ساتھ ہی دار المصنفین کے تخیل کو عملی صورت میں لانے کی تدبیروں پر غور کرنے لگے اور احباب و تلامذہ کو خطوط بھیجتے رہے کہ ندوہ کے پرانے دستور العمل کے نقائص اور پیرزادہ محمد حسین صاحب کے مجوزہ دستور العمل پر ناقدانہ مضامین لکھے جائیں۔

علی گڑھ کانفرنس کا کمیشن چوں کہ اس شورش کے زمانہ میں حیدرآباد کے سوا دوسری ریاستوں نے دارالعلوم کی ماہانہ و سالانہ امدادیں روک دی تھیں اور گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم نے بھی سخت اعتراضات کیے تھے، اس لیے صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے اپنی ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے معاملات کی تحقیقات کے بہانہ سے ایک کمیشن بھیجنے کی تجویز پیش کی، جو موجودہ منتظمین کے موافق ایسا معائنہ لکھے جس کو وہ سرکار بھوپال اور گورنمنٹ میں پیش کر کے مسدود امدادوں کو دوبارہ جاری کرائیں، چنانچہ اس تجویز کے مطابق کانفرنس کے کچھ اہل کار دارالعلوم کے معائنہ کے لیے تشریف لائے اور منتظمین نے اس ننگ کو گوارا کرلیا، مولانا گو الگ ہو چکے تھے، مگر ان کی خوددار طبیعت کو ندوہ کی اس پستی سے ٹھیس لگی اور آنسو کے چند قطرے شعروں کی صورت میں نکل گئے، اس سلسلہ کی پہلی نظم یہ ہے، جس میں ۱۰ رمئی ۱۹۱۳ء کے اجلاس دہلی میں علی گڑھ پارٹی کے طرزِ عمل کی تشریح ہے:

کیا لطف ہے کہ حامی ندوہ ہیں اب وہ لوگ ۔۔۔ جن کو کہ اس کے نام سے بھی اجتناب تھا
وہ لوگ جن کی رائے میں یہ ندوۂ غریب ۔۔۔ اک بیہُدہ خیال تھا یا آنکہ خواب تھا
وہ لوگ جن کی رائے میں تعلیم کا یہ طرز ۔۔۔ اعلانِ جنگ سید عالی جناب تھا

---

[1] مکاتیب شبلی بہ نام نواب علی حسن خاں۔

وہ لوگ جن کی رائے میں یہ ندوۂ حقیر — تعلیم مغربی کے لیے سد باب تھا
وہ لوگ جن کی رائے میں ندوہ کا یہ طلسم — سر تا قدم فریب وہ شیخ و شاب تھا
ندوہ کا نام سن کے جو کھاتے تھے پیچ و تاب — جن کے لیے وہ موجب رنج و عذاب تھا
حیرت یہ ہے کہ مجمع دہلی میں یہ گروہ — ندوہ کے حل و عقد کا نائب مناب تھا
ندوہ پہ حرف گیر جو ہوتا تھا کوئی شخص — وہ اس گروہِ پاک کا وقفِ عتاب تھا
ندوہ میں کوئی نقص بتاتا اگر کوئی — ان کی طرف سے ایک کا سو سو جواب تھا
سیارگانِ چرخ علی گڑھ تھے پیش پیش — جن میں کوئی قمر تھا کوئی آفتاب تھا
حیرت میں تھے تمام تماشائیانِ بزم — یعنی یہ کیا طلسم تھا؟ کیا انقلاب تھا
ندوہ کہاں، کہاں وہ علی گڑھ کی انجمن؟ — اس بزم قدس میں یہ کہاں باریاب تھا
کس دن کی دوستی ہے یہ کب کا ہے ارتباط — یوں کب وہ موردِ کرم بے حساب تھا
شایانِ آفریں ہے وہی ندوۂ غریب — جو مدتوں سے موردِ خشم و عتاب تھا
سرشار ہے حمایت ندوہ میں وہ گروہ — جس کو کہ اس کے ذکر سے بھی اجتناب تھا
بغض معاویہؓ ہے، یہ حب علیؓ نہیں — اک ایک کی زبان پہ یہ فصل الخطاب تھا
یہ قصۂ لطیف ابھی ناتمام ہے — جو کچھ بیاں ہوا ہے یہ آغازِ باب تھا

خاص اس کمیشن کے سلسلہ میں دوسری نظم ارشاد فرمائی:

آتا ہے اب معائنہ ندوہ کا مشن — جو اختراع مجمعِ حکمت شعار ہے
جن میں سے کچھ شریک نزاع قدیم ہیں — کچھ ابتدا سے بانیِ آغاز کار ہے
جن میں سے کوئی محکمۂ راز کا شریک — مضمون آفتاب کا مضموں نگار ہے
خود کوزہ گر ہے، خود گل کوزہ بھی ہے وہی — جو صلح ہے وہی روش کارزار ہے
کیا شانِ ایزدی ہے کہ وہ ندوۂ علوم — جو مدعیِ رہبری روزگار ہے
جو مایۂ امید ہے نسل جدید کا — جو کاروان رفتہ کی اک یادگار ہے
جس پر یہ حسن ظن ہے کہ ہے مجمع کرام — جس کا کہ مصر و شام میں اب تک وقار ہے
آیا تھا جس کے شوق میں وہ فاضل عرب[1] — جس کا مرقع ادبی المنار ہے

---

[1] سید رشید رضا، اڈیٹر المنار، مصر۔

چلتے ہیں جس کے نقشِ قدم پر حریف بھی | گو اعترافِ حق سے ابھی ان کو عار ہے
جس نے خطابتِ عربی کو دیا رواج | جو فنِ جرح و نقد کا آموز گار ہے
جس نے بدل دیا روشِ شیوۂ قدیم | یہ انقلاب گردشِ لیل و نہار ہے
آتے ہیں اس کی جانچ کو نا آشنائے فن | جو رہبرِ طریقۂ اصلاحِ کار ہے
تعلیم مشرقی سے نہیں جن کو کچھ غرض | ندوہ اب ان کا نازکشِ اقتدار ہے
اربابِ ریش و جبۂ اقدس کا وہ گروہ | اب چند منشیوں کا اطاعت گزار ہے
یہ داستانِ درد، یہ افسانہ الم | ندوہ کا نوحۂ نفسِ احتضار ہے

بہر حال یہ کمیشن آیا اور اس نے دارالعلوم کا معائنہ کیا اور رپورٹ تیار کی، جو گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم اور ریاستوں میں بھیجی گئی۔

مصالحت کے لیے مولانا کی آخری کوشش ۱۴ رجون ۱۹۱۴ء کو ندوہ کا جلسۂ انتظامیہ ہونا طے ہوا اور اس کا ایجنڈا رکن کی حیثیت سے مولانا کی خدمت میں بھی بھیجا گیا، اس میں غالباً دہلی کی اصلاحی کانفرنس کی مخالفت کی طرف بھی کوئی اشارہ تھا، اس پر مولانا نے ۲۵ رمئی ۱۹۱۴ء کو اس کے جواب میں بمبئی سے ایک مفصل تحریر لکھ کر بھیجی اور مصالحت کی تجویز پیش کی، خوش قسمتی سے اتفاقاً مجھے یہ تحریر دفتر ندوہ کے پرانے کاغذات میں اس وقت مل گئی، گو نیچے سے اس کی ایک دو سطریں پھٹ کر الگ ہو گئی ہیں، تاہم مطلب کی بات اس میں سب کچھ موجود ہے۔

"جنابِ من! السلام علیکم، جلسۂ انتظامیہ مورخہ ۱۴ رجون ۱۹۱۴ء کا ایجنڈا پہنچا، اس زمانہ میں غالباً میں ان اطراف میں نہ رہوں گا، میری صحت اب اس کی مقتضی نہیں کہ میں سیرت نبوی کے سوا زیادہ تر اور کسی طرف متوجہ ہو سکوں، بعض ضروری امور گزارش ہیں:

۱- جلسۂ دہلی کے متعلق میری رائے ہے کہ اس کا منشا ارکان ندوہ کی توہین یا شکست نہ تھی، بلکہ صرف یہ تھی کہ چوں کہ تین چار دفعہ خود ندوہ کے مختلف اور متعدد ارکان کی طرف سے اصلاح کی کوشش ہو چکی، مولوی عبدالباری[1] صاحب اور میرزا ظفر اللہ[2] خاں صاحب کے خطوط مطبوعہ اور یادداشت مطبوعہ سب کے پیش نظر ہیں، باوجود اس کے کوئی توجہ اس لیے بعض لوگوں نے یہ مناسب خیال کیا کہ یہ مسئلہ پوری قوم کے سامنے لایا

---

[1] مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم [2] میرزا ظفر اللہ خاں صاحب، ڈسٹرکٹ جج سیال کوٹ، پنجاب۔

جائے لیکن بعض لوگوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا کہ (اس کا مقصد) کسی شخص کو معتمد یا ناظم بنانا ہے، یا موجودہ کارکن صاحب کو برطرف کرانا ہے، اس لیے نہایت فریق بندانہ جوش پیدا ہوا، لیکن جلسہ میں ایک حرف ان امور کے متعلق نہیں کہا گیا، صرف چند اصحاب منتخب ہوئے کہ دستور العمل کے اصلی نقائص اور اس کی عدم پابندی کے متعلق اصلاحی اسکیم مرتب کریں، یہ اسکیم غالباً خود ارکانِ ندوہ کے سامنے پیش ہوگی، اس بنا پر جلسۂ دہلی کی کارروائی کے ساتھ مخالفت کی بہ ظاہر وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

سچ تو یہ ہے کہ ندوہ اب بالکل نئے سرے سے باقاعدہ ہونے کا محتاج ہے۔

۲- مولوی عبداللہ صاحب[1] کی رپورٹ متعلق اسٹرائیک دیکھ کر سخت حیرت ہوئی اس میں بعض باتیں تو ایسی ہیں جن کی شہادت صرف خدائے عالم الغیب پر محول ہے، مولانا عبداللہ صاحب نے ایک نہیں متعدد دفعہ مجھ سے صحیح بخاری کے سبق روکنے پر اپنی مجبوری بیان کی اور کہا کہ میں کیا کروں؟ ناظم صاحب سے متعدد دفعہ نماز کے اوقات میں مسجد میں ملاقات ہوتی ہے اور وہ ہر دفعہ مجھ سے کہتے ہیں کہ بخاری پڑھنے والے لڑکوں کو خارج کر دیا یا نہیں لیکن اب تک میں نے نہیں خارج کیا'' میں نے کہا کہ آپ ان سے حکم لکھوا لیجیے، اس پر فرمایا کہ وہ باہر چلے گئے ہیں، آئیں گے تو میں لکھواؤں گا'' پھر یہ بھی کہا کہ ان کے واپس آنے تک لڑکے اگر بخاری پڑھیں تو مجھے اعتراض نہ ہوگا۔

اب اگر مولانا موصوف ان واقعات سے منکر ہوں تو خدائے عالم الغیب کے سوا اور کون اس کا فیصلہ کرنے والا ہے؟

باقی قانونی حیثیت سے تو اس کی یہ کیفیت ہے کہ ندوہ جب سے قائم ہے، لڑکے باہر اساتذہ وغیر اساتذہ سے پڑھتے تھے، خود اس زمانہ میں جب یہ واقعہ پیش آیا، بہت سے لڑکے اور اسباق ......مثلاً خلیل صاحب (شیخ محمد عرب صاحب کے فرزند) سے......کیں، بخاری شریف کے سبق کے متعلق چوں کہ مولانا نے براہِ راست مجھ کو مخاطب کیا ہے، اس لیے یہ چند سطریں لکھنی پڑیں۔

۳- اسی رپورٹ میں میرے دار الاقامہ کے تعلق کا بھی ذکر ہے، اس کے متعلق کوئی شکایت ہے، تو میں اس کا ذمہ دار ہوں لیکن دار الاقامہ میری نگرانی میں کبھی براہِ راست نہیں رہا جو مہتمم ہوتا تھا،

---

[1] مولانا مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی، مدرس اعلا دار العلوم نے اسٹرائیک کے متعلق ایک یادداشت لکھ کر موجودہ ناظم صاحب کی خدمت میں پیش کی تھی، جس کو انہوں نے چھاپ کر تمام ارکان کے پاس بھیجا تھا، اس میں انہوں نے اسٹرائک کے ان اسباب کی تردید کی تھی جو عام طور سے طلبہ نے اپنی شہادت میں بتائے تھے۔

اسی سے اس کا تعلق رہتا تھا۔

یہ امور ضابطہ کی حیثیت سے لکھے گئے:

خاص طور پر میری یہ گزارش ہے کہ یہ جائے اس کے کہ باہمی مخالفت میں دو قوتیں ہمیشہ ٹکراتی رہیں، اسلامی (مصالح) کا یہ اقتضا ہے کہ دو تین شخصوں کو حکم مان کر تمام معاملات ان کے ہاتھ میں دے دیجیے جو فیصلہ وہ لوگ کریں سب منظور کر لیں، پھر وہ جلسۂ انتظامیہ میں با قاعدہ منظور ہو جائے، ورنہ تمام ہندوستان میں ہم سب کی سخت تضحیک ہو چکی اور ہوتی رہے گی، اس وقت اس بحث سے بھی قطع نظر کیجیے کہ جھگڑا کہاں سے شروع ہوا، کیوں کہ ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ دوسرا فریق برسرِ ناحق ہے، ایسے اشخاص خود ندوہ میں موجود ہیں، جن کی دیانت پر فریقین کو اعتماد ہے۔''

ممبروں کی خالی شدہ جگہوں کے لیے اشخاصِ ذیل موزوں ہیں:

ڈاکٹر ناظر الدین حسن (بیرسٹر)

مسٹر ممتاز حسین (بیرسٹر)

مولوی آزاد صاحب سبحانی کان پور

مولوی سید سلیمان پونہ، دکن (شبلی ۲۵/ مئی ۱۹۱۴ء)

آخری مصالحت مئی ۱۹۱۵ء مولانا نے مصالحت کی جو تجویز اس وقت پیش کی تھی وہ بدستور نا قابل قبول ٹھہری لیکن کیا عجیب بات ہے کہ اس کے چھ مہینے کے بعد نومبر ۱۹۱۴ء میں جب مولانا نے وفات پائی تو ناممکن ممکن اور نا قابل قبول قابل قبول ہو گیا، حادثہ وفات کے چار مہینے بعد ندوہ کے ارکان نے لکھنؤ میں اس کے سالانہ اجلاس کی تاریخ مقرر کی، اس موقع پر ۱۸/ مارچ ۱۹۱۵ء کو مولانا ابوالکلام صاحب کی رائے سے نواب سید علی حسن خاں صاحب مرحوم نے دفتر نظامت کے سامنے مصالحت کی آخری حجت پیش کی، مصالحت کا مبارک وقت آ پہنچا تھا، اس لیے ارکان نے اس تجویز کو قبولیت کی نظر سے دیکھا اور مولانا ابوالکلام اور نواب سید علی حسن خاں صاحب اور ارکان ندوہ نے متعدد صحبتوں میں بیٹھ کر معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا اور یہ طے کیا کہ دس آدمیوں کی ایک مشترک مجلس ۳۱/ مارچ کی شام کو منعقد ہو اس میں پانچ ندوہ کے موجودہ ارکان اور پانچ مجلس اصلاح ندوہ کے ارکان شریک ہو کر کثرتِ رائے سے تمامی اختلافی معاملات کا تصفیہ کر دیں، چنانچہ انجمن اصلاح کی جانب سے حاذق الملک حکیم اجمل خاں مرحوم،

مولانا ابوالکلام صاحب، بابو نظام الدین صاحب رئیس امرتسر، ڈاکٹر ناظر الدین حسن بیرسٹر لکھنؤ (حال نواب ناظر یار جنگ جج ہائی کورٹ حیدرآباد) اور نواب سید علی حسن خاں صاحب اور موجودہ ارکان ندوہ کی طرف سے مولانا حکیم سید عبدالحیؒ صاحب، منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری، مولوی محمد نسیم صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ، مولوی ظہور احمد صاحب وکیل لکھنو اور مولوی اعجاز علی صاحب رئیس کاکوری منتخب ہوئے، یہ اصحاب ۳۱ مارچ کی رات کو بعد مغرب دارالعلوم کی عمارت میں جمع ہوئے اور تمام امور پر نہایت ہمدردی سے غور وفکر کیا اور حسب ذیل امور اتفاقِ کامل سے منظور کیے:

(۱) ندوۃ العلما کے دستور العمل میں مناسب اصلاح وترمیم۔

(۲) مسئلہ نظامت کا تصفیہ مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارن پوری نے استعفا دیا اور ان کی جگہ مولانا سید عبدالحیؒ صاحب مرحوم کو سب نے بالاتفاق ناظم منتخب کیا، جس کو مولانا نے اصرار کے بعد قبول فرمایا۔

(۳) معتمد صاحب مال نے اپنے تمام حسابات کی جانچ پڑتال کی شرط کو منظور کیا۔

(۴) دارالعلوم کے طلبائے قدیم میں سے پانچ اشخاص کو ندوہ کا ممبر بنانا قبول کیا گیا۔

اس تصفیہ کے بعد مولانا ابوالکلام صاحب ''مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن'' کے ضروری اجلاس میں شرکت کے لیے پہلی اپریل کو علی گڑھ چلے گئے، جہاں سے وہ ۵ راپریل کو واپس آ کر ندوہ کے آخری سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے اور مجلس اصلاح کی طرف سے کھلے جلسہ میں تمام اختلافات کے خاتمہ کا اعلان کیا اور دونوں فریق نے اتحاد واتفاق کے اس پر مسرت منظر پر خوشی ظاہر کی لیکن اس خوشی و شادمانی کے رنگین مناظر میں جو بات کانٹے کی طرح چبھتی تھی، وہ یہ تھی کہ افسوس اس منظر کو دیکھنے کے لیے ہم میں وہ موجود نہ تھا، جس کو اس کے دیکھنے کی سب سے زیادہ آرزو تھی، مگر اس کی روح امید ہے کہ شاد ہوئی ہوگی۔

بھائی کی وفات

وطن کی طرف بازگشت اور مرحوم بھائی کے ادھورے کاموں کی تکمیل کا عزم

مولوی اسحاق صاحب مرحوم مولانا کے بعد اس وقت سب بھائیوں میں بڑے تھے، الہ آباد ہائی کورٹ کے اولوالعزم کام یاب وکیل تھے، نہایت سنجیدہ، متین، کم سخن، بلند ہمت، مستقل مزاج اور بہت صائب رائے اور با تدبیر تھے، مولانا کو شیخ صاحب مرحوم یعنی اپنے والد کے قرضہ کے ادا ہو جانے کے بعد سے گھر کے معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا، گھر کی زمین داری، تحصیل وصول، مقدمات، مال گزاری اور دوسرے خانگی کاروبار کی دیکھ بھال یہی منجھلے بھائی مولوی اسحاق صاحب مرحوم کیا کرتے تھے، ادھر جب سے مسلمانوں میں پالیٹکس کا انقلاب پیدا ہوا تھا، وہ پالیٹکس میں بھی دل چسپی لینے لگے تھے ''منٹو مارلے اسکیم'' کے زمانہ میں وہ یوپی کے ان بڑھتے ہوئے تعلیم یافتہ لوگوں میں تھے، جو الہ آباد میں رائے عامہ کی نمایندگی کررہے تھے، سر علی امام جو اس سال (۱۹۰۸ء) کی مسلم لیگ امرتسر کے پریسیڈنٹ کی حیثیت سے مسلمانوں کے مسلم لیڈر ہو رہے تھے، اسی اسکیم کے زمانہ میں انہوں نے جب اپنی رائے مخلوط انتخاب کی ایک[1] خاص شکل کی حمایت میں ظاہر کی تو یوپی میں ان کے خلاف جو تحریک اٹھی، اس کے رہبروں میں مولوی اسحاق صاحب مرحوم سب سے آگے تھے، یہاں تک کہ سر علی امام پر ملامت کا ووٹ تک الہ آباد میں پاس کرایا گیا۔

مولانا نے اپنی برادری اور ضلع میں جو تعلیمی کام چھیڑ رکھے تھے، ان دنوں ان کی نگرانی بھی مولوی اسحاق صاحب ہی کرتے تھے، ایک تعلیمی کمیٹی بھی ضلع میں قائم کی تھی اور اب اسی کے ماتحت نیشنل ہائی اسکول جو اتنے دنوں کی غفلت میں جارج مڈل اسکول بن چکا تھا، اس کو محمڈن شبلی اسکول کا نام دے کر اس کی اصلاح و ترقی کی تجویز بھی ان کے زیر غور تھی اور عنقریب اس کام کے لیے وہ اعظم گڑھ میں آکر ضلع کا دورہ کرنے والے تھے، ساتھ ہی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر بھی پیش نظر تھا۔

جولائی ۱۹۱۴ء کا اخیر تھا، مولانا بمبئی میں تھے، ۶ر جولائی ۱۹۱۴ء کو قرآن پاک کا ایک نہایت قیمتی نسخہ ڈھائی سو میں بمبئی میں خریدا تھا، اس کی خوشی میں تھے (شروانی-۱۱۷) اور ہمہ تن سیرت نبوی ﷺ کی

---

[1] عام مسلمان جداگانہ انتخاب پر مصر تھے، سر علی امام نے یہ پیش کیا کہ کچھ مسلمان ممبر جداگانہ انتخاب سے اور کچھ مخلوط انتخاب سے منتخب ہوں۔

جلد اول کی تکمیل میں مصروف تھے، چنانچہ ۱۶؍ جولائی ۱۹۱۴ء کو اپنی مصروفیت کا حال ان لفظوں میں لکھتے ہیں "سیرت کے اتمام کے لیے یہیں کی خاموشی اور سکوت درکار ہے، دن بھر کوئی جھانکتا تک نہیں، اس لیے ارادہ تو یہ ہے کہ جلد اول بہمہ جہت تمام کر کے اٹھوں، ہر روز کوئی نہ کوئی نیا تاریخی اور تحقیقی راز کھلتا ہے اور بعض مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔" (شروانی - ۱۱۸)

ان کا خیال تھا کہ وہ رمضان بھر وہیں رہیں گے اور تکمیل کے طلبہ کو وہیں بلوائیں گے، (عبدالحکیم ۷؍ مورخہ ۱۹؍ جولائی ۱۹۱۴ء) وہ ان ہی منصوبوں میں تھے کہ دفعۃً الہ آباد سے بھائی کی سخت علالت کی اطلاع آئی، یہ خبر سنتے ہی فوراً الہ آباد روانہ ہو گئے، علالت ایسی سخت اور پیچیدہ تھی کہ خود ڈاکٹروں کی سمجھ میں بھی نہیں آئی، شاید چودہ پندرہ روز کی مختصر علالت کے بعد انہوں نے ۵؍ اگست ۱۹۱۴ء کو الہ آباد میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

مولانا کے لیے یہ حادثہ بڑا روح فرسا ہوا، ان کے سکون و اطمینان کی دنیا ہی الٹ گئی، اب ہر طرف سے منہ موڑ کر انہوں نے اس ویرانہ کو آباد کرنے کا عزم کیا، جس کو عمر بھر آبادی کے قابل نہیں سمجھا، یعنی اعظم گڑھ کو مراجعت فرمائی اور شبلی منزل میں بیٹھ کر بقیہ عمر اپنے مرحوم بھائی کے ادھورے کاموں کی تکمیل میں صرف کرنے کا عزم کر لیا، یہیں بیٹھ کر ان کی وفات پر پھوٹ پھوٹ کر رو دیے، یعنی ایسا پر درد مرثیہ[1] لکھا جس کا لفظ لفظ ان کے خون شدہ دل کی ایک ایک بوند ہے:

وہ برادر کہ مرا یوسف کنعانی تھا — وہ کہ مجموعۂ ہر خوبیِ انسانی تھا
وہ کہ گھر بھر کے لیے رحمت یزدانی تھا — قوت دست و دلِ شبلی نعمانی تھا

جوش اسی کا تھا جو میرے سر پر شور میں تھا
بل اسی کا یہ مرے خامۂ پرزور میں تھا

ہم سے ناکاروں میں ایک قوت عامل تھا وہی — مایۂ عزتِ اجداد کا حامل تھا وہی
مسند والد مرحوم کے قابل تھا وہی — یوں تو سب اور بھی اعضا ہیں مگر دل تھا وہی

اب وہ مجموعۂ اخلاق کہاں سے لاؤں
ہائے افسوس! میں اسحاق کہاں سے لاؤں

---

[1] یہ مرثیہ ستمبر ۱۹۱۴ء میں اعظم گڑھ میں بیٹھ کر لکھا ہے، (مسعود-۲۴)۔

جب کیا والد مرحوم نے دنیا سے سفر | گھر کا گھر تھا ہدف ناوک صد گونہ خطر
بن گیا آپ اکیلا وہ ہر آفت میں سپر | تیر جو آئے، گیا آپ وہ ان کی زد پر

خود گرفتار رہا تاکہ میں آزاد رہوں
اس نے غم اس لیے کھائے تھے کہ میں شاد رہوں

اس کا صدقہ تھا کہ ہر طرح سے تھا میں بے غم | گھر کے جھگڑوں سے نہ کچھ فکر نہ کچھ رنج والم
امن وراحت کے جو سامان تھے ہر طرح بہم | میں تھا اور مشغلہ نامہ و قرطاس و قلم

اس کے صدقے سے تھی میری سخن آرائی بھی
اس کا ممنون تھا مرا گوشۂ تنہائی بھی

تازہ تھا دل پہ مرے مہدیِ مرحوم کا داغ | کہ مرا قوت بازو تھا، مرا چشم و چراغ
اس کو جنت میں جو خالق نے دیا کنج فراغ | میں یہ کہتا تھا کہ اب بھی تر وتازہ ہے یہ باغ

یعنی وہ آئینۂ خوبیِ اخلاق تو ہے
اٹھ گیا مہدیِ مرحوم تو اسحاق تو ہے

آج افسوس کہ وہ نیر تاباں بھی گیا | میری جمعیت خاطر کا وہ ساماں بھی گیا
اب وہ شیرازۂ اوراقِ پریشاں بھی گیا | عتبۂ والد مرحوم کا درباں بھی گیا

گلۂ خوبی تقدیر رہا جاتا ہے
نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

تجھ کو اے خاکِ لحد آج اجل نے سونپی | وہ امانت جو مرے والد مرحوم کی تھی
بسکہ فطرت میں ودیعت تھی نفاست طلبی | ناز پروردہ، نعمت تھا بایں سادہ وشی

دیکھنا اڑ کے غبار آئے نہ دامن پہ کہیں
گرد پڑ جائے نہ اس عارضِ روشن پہ کہیں

اس کے اخلاق کھٹک جاتے ہیں دل میں ہر بار | وہ شکر ریز تبسم وہ متانت وہ وقار
وہ وفا کیشیِ احباب وہ مردانہ شعار | وہ دل آویزی خو وہ نگہ الفت یار

صحبت رنج بھی اک لطف سے کٹ جاتی تھی
اس کے ابرو پہ شکن آ کے پلٹ جاتی تھی

حق نے کی تھی کرم ولطف سے اس کی تخمیر — خوبیِ خلق و تواضع میں نہ تھا اس کا نظیر
بات جو کہتا تھا ہوتی تھی وہ پتھر کی لکیر — اس کی اک ذات تھی مجموعۂ اوصاف کثیر
بس کہ خوش طبع تھا وہ صاحب تدبیر بھی تھا
سچ تو یہ ہے کہ وہ نوخیز بھی تھا پیر بھی تھا

اس کو شہرت طلبی سے کبھی کچھ کام نہ تھا — وہ گرفتارِ کمند ہوس خام نہ تھا
اس کی ہر بات میں اک لطف تھا ابرام نہ تھا — وہ کبھی مدعی رہبری عام نہ تھا
اس کو مطلوب کبھی گرمیِ بازار نہ تھی
اس کی جو بات تھی کردار تھی، گفتار نہ تھی

اس کو معلوم جو تھا وسعت تعلیم کا راز — اس نے دیکھے تھے جو منزل کے نشیب اور فراز
اس نے یہ کام نئی طرح کیا تھا آغاز — مگر افسوس کہ تھا راہ میں رخش تگ و تاز
کوششوں کے جو نتیجے تھے اسے مل نہ سکے
ہائے وہ پھول کہ پھولے تھے مگر کھل نہ سکے

آہ! بھائی ترے مرنے کے تھے یہ بھی کوئی دن — وہ ترا اوجِ شباب اور وہ بچے کمسن
مسند حلقۂ احباب ہے سونی تجھ بن — تو ہی تھا اب خلف صدر نشینانِ مُسِن
دن جب آئے کہ تجھے رہبر جمہور کہوں
چرخ اب مجھ سے یہ کہتا ہے کہ مغفور کہوں

یہ بھی اے جانِ برادر کوئی جانے کا ہے طور — اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر، نہ تدبیر نہ غور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور — کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہو گیا کچھ اور سے اور
چھوڑ کر بچوں کو بے صبر و سکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

آہ! اے مرگ کسی شئے کی نہیں تجھ کو تمیز — تیری نظروں میں برابر ہے گہر اور پشیز
میں نے مانا ترے نزدیک نہ تھا وہ کوئی چیز — رحم کرنا تھا کہ چھوڑے ہیں کئی اس نے عزیز
لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

اے خدا! شبلی دلِ خستہ بایں موئے سفید　　لے کے آیا ہے ترے درگہ عالی میں امید
مرنے والوں کو نجاتِ ابدی کی ہو نوید　　خوش وخرم رہے چھوٹا یہ مرا بھائی جنید
کیا لکھوں قصۂ غم تابِ رقم بھی تو نہیں
اب مرے خامۂ پرزور میں دم بھی تو نہیں

ان کے اس دردوغم کا اندازہ ان کے ان خطوط سے بھی کیجیے جو اس زمانہ میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو لکھے، کتنے مختصر، مگر کتنے بلیغ اور ساتھ ہی کس قدر اثر میں ڈوبے ہوئے، ۱۰ر اگست ۱۹۱۴ء کو الہ آباد سے راقم کو ان لفظوں میں حادثہ کی اطلاع دیتے ہیں، "میرا سب کچھ جاتا رہا" انا للہ (سلیمان-۷۹) دولفظوں کے اس کوزہ میں غم والم کا ایک سمندر بند ہے، ۲۹ر اگست کو مولوی مسعود علی صاحب کو لکھتے ہیں، "آخر ساری دنیا لٹا کے گھر آیا۔" (۱۹)

ان لفظوں میں غم و ماتم کی ایک دنیا آباد ہے، ۵ر ستمبر کو پھر مجھے لکھتے ہیں "واقعۂ حال نے میرے حواس کھودیے۔" (۸۰)

۱۶ر اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مولوی عبدالباری صاحب ندوی کو لکھتے ہیں "میں واقعۂ حال سے اس قدر افسردہ ہوگیا ہوں کہ اب کسی بات سے طبیعت شگفتہ نہیں ہوتی"۔ (۸)

بہرحال اس شدتِ غم نے گو ان کی طبیعت کو اس قدر ملول اور افسردہ بنادیا تھا کہ وہ خود مرنے کو تیار بیٹھے تھے، تاہم دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس عالم میں بھی دین وملت اور علم کی خدمت کے ولولہ میں کمی نہیں آئی، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی فکر، شبلی اسکول کی دھن، دارالمصنفین کے قیام اور سیرت نبوی کی تکمیل کا کام، اسی طرح ان کے دل سے لگا ہے، اس بارہ میں ان کا ایک مکتوب جو ۱۶ر ستمبر ۱۹۱۴ء کو مولانا شروانی کو لکھا تھا پڑھنے کے قابل ہے، یہ مکتوب خدا جانے کس طرح مکاتیبِ شبلی میں درج ہونے سے رہ گیا ہے، مولانا شروانی نے مولانا کی وفات پر جو مضمون علی گڑھ گزٹ میں لکھا تھا، اس میں اس کو پورا نقل کردیا ہے۔

"عزیز مرحوم کے واقعہ نے مجھ پر اس قدر سخت اثر کیا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا تھا، حالاں کہ مہدی مرحوم کا واقعہ اسی درجہ کا گذر چکا تھا، بہرحال میں اعظم گڑھ چلا آیا، محمڈن شبلی اسکول جو ۳۰ر برس ہوئے میں نے قائم کیا تھا، ہائی اسکول سے مڈل اسکول تک آگیا، عزیز مرحوم اس کو انٹرنس تک پہنچانا اور تمام برادری کے قصبات میں اسکول اور کاتب قائم کرنا چاہتے تھے، دو مہینے کا دورہ رکھا تھا اور پانچ سو روپے مصارف دورہ کے لیے الگ کردیے تھے، اشتہارات اور رسید یہاں سب چھپ گئی تھیں۔

مجھ کو اس کام کے علاوہ دارالمصنفین اور دارالتکمیل کی فکر ہے ندوہ میں کام کرنا ممکن نہ تھا، ۶ برس تک کشاکش میں گزرے، جو ہو گیا وہ تعجب انگیز ہے، بہرحال صورت موجود یہ ہے کہ اسکول کے پاس ہی میرا اور میرے خاندان کا باغ ہے، جس کا کل رقبہ گیارہ بیگہ پختہ ہے، اس کو وقف کر رہا ہوں، اور شرکا بھی راضی ہو گئے ہیں، مسودہ لکھا جا چکا، رجسٹری کرانا ہے، دو بنگلے پہلے سے موجود ہیں، کتب خانہ (دوبارہ) بقدر معتد بہ مہیا ہو گیا ہے اور بڑھتا جاتا ہے، دفتر سیرت کا کل سرمایہ اس طرف منتقل ہو جائے گا، بلکہ صرف کتب خانہ کے لیے کافی ہوگا اور دارالمصنفین کی عمارت کے لیے کچھ اضافہ ہوگا، چاہتا ہوں کہ اس کے چار کمرے چار عناصر اردو کے نام سے تعمیر ہوں اور عمارت پر تمام موجودہ معززین ارباب قلم کے نام کندہ ہوں چندہ مشروط نہیں، ہر صاحب قلم چندہ دے بھی نہیں سکتا، اس کے ساتھ دارالتکمیل کھول رہا ہوں، یعنی ادب اور تفسیر کی تکمیل کے طلبہ کو تیار کروں، دو مددگار ہوں گے، انتہائی صفوں کو خود پڑھاؤں گا، سردست طلبائے تصنیف کی تعلیم کا یہ طریقہ ہوگا کہ پہلے چھوٹے چھوٹے عنوانات اور ان کے متعلق ذخیرۂ معلومات اور کتابیں ان کو دی جائیں گی، جو کچھ لکھیں گے، اس کا عیب و ہنر بتایا جائے گا، پھر پمفلٹ، رسالے اور پھر تصانیف کرائی جائیں گی، وظائف تصنیفی مقرر ہوں گے، جو کم از کم ۲۰، ۲۵ روپے ماہوار ہوں گے، دستاویز کی رجسٹری ہو جائے تو باغ کی کانٹ چھانٹ اور عمارت کی داغ بیل ڈالی جائے، ایک کمرہ مرحوم کے نام سے بھی تعمیر کرانا مقصود ہے، یہ آخر عمر کا خواب ہے اور امید ہے کہ: ع ''چوں ہنر ہائے دگر موجب حرماں نہ شود''

نواب عماد الملک نے دارالمصنفین کی صدر انجمنی قبول کر لی ہے، تکمیل دستاویز کے بعد انجمن کے قواعد اور ممبروں اور عہدہ داروں کے نام شایع ہوں گے، والتسلیم۔''

مولانا شروانی اس مضمون میں فرماتے ہیں ''اسی تحریر (مذکورۂ بالا خط) میں دو امر خاص قابل لحاظ ہیں، ایک پاک اور کارآمد منصوبہ، دوسرے یہ کہ شدت غم میں بھی دماغ علم کی غمخواری میں مصروف تھا۔ بعد وفات علامہ مرحوم معلوم ہوا کہ بنگلہ اور باغ از روئے وصیت وقف کر دیا ہے اور بلند حوصلہ اعزہ تعمیل وصیت پر آمادہ ہیں، قبر اسی باغ میں بنی ہے اور وہیں تکمیل سیرت کے سامان ہو رہے ہیں:

شدیم خاک و لیکن ز بوئے تربت ما — تواں شناخت کزیں خاک مردے خیزد''

اس خط سے قیاس ہوگا کہ اس کرب و بیتابی کے عالم میں بھی وہ اپنے اصلی کاموں کو نہیں بھولے تھے، مولوی حمید الدین صاحب مولوی مسعود علی صاحب اور راقم کے نام کے خطوط سے اندازہ ہوگا کہ اس وقت ان کے پیش نظر ندوہ کی اصلاح، سرائے میر کا انتظام نیشنل اسکول کی تعمیر، دارالمصنفین اور دارالتکمیل کے قیام اور سیرت کی تکمیل کی تجویزیں تھیں۔

شبلی اسکول

۱۹۱۳ء-۱۹۱۴ء

پچھلے صفحوں میں مولانا کے ابتدائی تعلیمی کارناموں میں نیشنل اسکول کا نام بار بار آیا ہے، مولانا جب سے حیدرآباد گئے اور وہاں سے واپسی پر ندوہ کے کاموں میں اتنے منہمک رہے کہ وہ اپنے اس اسکول کو جس سے انہیں بڑی محبت تھی، بھول سے گئے، اتنے عرصہ میں اس کی یہ کیفیت ہوئی کہ وہ ہائی اسکول سے تنزل کر کے مڈل اسکول ہوگیا، اس وقت جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس کا کام تھا، انہوں نے شاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کے موقع پر اسکول کا نام جارج اسکول بنا کر لفظی تغیر سے اس کی معنوی ترقی کا خیال باندھا، جو تمام تر بے سود تھا، اسکول اپنی موجودہ حالت سے ذرا آگے نہ بڑھ سکا، آخر جب مولانا ندوہ کے ہنگاموں سے الگ ہوئے تو پھر اگلی محبت یاد آئی، ۷/نومبر ۱۹۱۳ء کو مولوی اسحاق مرحوم کو لکھا ''وہاں (اعظم گڑھ) رہ کر اسکول کا بھی تفریحی مشغلہ ہے۔'' (اسحاق-۲۴)

مولوی اسحاق صاحب مرحوم کو اس کے لیے آمادہ کیا اور لکھا کہ ''اعظم گڑھ میں پہلے ایک پرزور تعلیمی کانفرنس ہو'' مولوی اسحاق مرحوم نے کچھ اختلاف کیا تو انہیں لکھا ''شور و غل فی نفسہ بیہودہ چیز ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ کوئی کام دنیا میں بغیر اس کے نہیں چلتا، انبیا اور ریفارمر دونوں کی نظیریں دیکھ لو، علی گڑھ کالج صرف شور و غل سے قائم ہوا اور اب تک اسی پر قائم ہے۔

تم نے کانفرنس تسلیم تو کر لی لیکن اس کے لیے ایک عمدہ پراسپکٹس انگریزی اور اردو میں چھپوا کر تمام برادری کے معزز ملازمین سرکار اور روسائے دیہات کے پاس بھیجنا ضرور ہے، بڑی ضرورت یہ ہے کہ وکلا منصف عہدہ دار جو اچھی حالت رکھتے ہیں وہ برادری کی تعلیم پر متوجہ ہوں، اب تک یہ گروہ محض بے پروا ہے، نیشنل اسکول یا سرائے میر کی ان لوگوں کو خبر ہی نہیں، تم پرائیویٹ خطوط لکھ کر بہ اصرار و تقاضا ان لوگوں کو جمع کرو، مثلاً مولوی عبدالحمید صبر حدی، مولوی عبدالحمید منصف، میاں جنید وغیرہ وغیرہ پر تمہارا ہی اثر پڑ سکتا ہے، میرا کہنا تو ان لوگوں کے لیے بھی ایک معمولی عام صدا ہوگی۔

کانفرنس کا مقام اعظم گڑھ ہوگا، نیشنل اسکول یا بنگلہ میں اور اگر سرائے میر ہو تو عامی مذاق غالب رہے گا، میرے لیے یہ مشکل ہے کہ علی گڑھ والوں کا سخت تقاضا ہے، وعدہ بھی کر چکا ہوں، تاہم

زیادہ بلکہ قطعی یہی ارادہ ہے کہ اعظم گڑھ ہی آؤں۔

اعظم گڑھ کانفرنس میں حکام کو بھی مدعو کیا جاسکتا ہے، بورڈنگ کو اگر وسعت دی جائے تو گورکھپور اور جون پور تک کے لڑکے آسکتے ہیں، غرض ایک نہایت وسیع پیانہ خیال میں ہے۔

افسوس ہے، قبل از وقت معذور سا ہوگیا ہوں، ۲۴ رگھنٹہ میں صرف ڈیڑھ دو گھنٹہ کام کرسکتا ہوں، یہ غنیمت وقت صرف سیرت پر صرف کرتا ہوں، ع ''عمر تھوڑی حسرتیں دل میں بہت''

''میاں حمید کو بھی یہ خط دکھاؤ اور کانفرنس کا اعلان و پروگرام دونوں صاحب مل کر اور چھپوا کر ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کے ساتھ بھیجو اور تقسیم کرو۔''

پھر دوبارہ ۸ ردسمبر ۱۹۱۳ء کو انہیں لکھا'' قابل غور یہ مسئلہ ہے کہ نیشنل اسکول کو ہائی اسکول بنانا چاہیے، ایک بورڈنگ قائم کرنا چاہیے، اسکول ہر شہر میں سرکاری یا مشن موجود ہوتے ہیں اور ان کے برابر اسٹاف کا اسکول بنانا آسان نہیں اور بہت قوت اور محنت صرف کرنی پڑتی ہے، اب تجربہ کار لوگ اس کو تسلیم کرتے جاتے ہیں کہ اسلامی بورڈنگ بنانا نہایت مفید ہے، جس میں اخلاقی اور مذہبی تربیت ہو، باقی تعلیم تو کسی اسکول میں حاصل کریں گے، اگر یہ رائے صحیح ہو تو نیشنل کی عمارت کے قریب بورڈنگ کی بنیاد ڈالنا چاہیے، جس کو رفتہ رفتہ بہت ترقی دی جاسکتی ہے، بورڈنگ کی وجہ سے بہت زیادہ بچے تعلیم حاصل کرسکیں گے اور کفایت شعاری کے ساتھ۔

مولوی محمد عمر صاحب اور سمیع سال بھر میں پنشن لے لیں گے، یہ لوگ بورڈنگ یا مدرسہ کے قیام و ترقی کے متعلق اپنا کافی وقت دے سکیں گے اور ان پر برادری کا اعتماد بھی ہے۔''

بہر حال مولوی اسحاق صاحب مرحوم نے ۱۹۱۴ء میں ضلع اعظم گڑھ میں ایک ایجوکیشن سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور اسکول کو اس کی نگرانی میں دے دیا اور یہ عزم تھا کہ اس سال الہ آباد ہائی کورٹ کی بڑی تعطیل میں جو تین مہینہ کی ہوتی ہے، پورے ضلع کا دورہ کریں گے اور نئے سرے سے اسکول کو اٹھائیں گے، لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس تعطیل کے آنے سے پہلے ہی انہوں نے ۵ راگست ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا، ان کی وفات کے بعد جب مولانا نے اعظم گڑھ کا قیام اختیار کیا تو اسکول کی طرف توجہ فرمائی، مولوی اسحاق صاحب مرحوم کی

یادگار میں اسکول میں چند کمروں کی تعمیر کی تجویز منظور کی اور متعدد عزیزوں سے چندے لے کر ان کی تعمیر کا کام شروع کر دیا، ابھی یہ معاملہ یہیں تک پہنچا تھا کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں خود مولانا نے وفات پائی، مگر بحمد للہ کہ کام جاری رہا، بلکہ کام کرنے والوں میں اب ایک کے بہ جائے دو بزرگوں کی آرزوؤں کی تکمیل کا جذبہ پیدا ہوا، مولوی سمیع صاحب کے بڑے بھانجے مرزا مصطفٰے بیگ مرحوم اس وقت ایل ایل بی ہو کر اعظم گڑھ آئے اور اسکول کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پوری محنت وتندہی سے کام کر رہے تھے کہ دو تین سال کے بعد مبتلائے دق ہو کر وفات پائی، اس کے بعد شہر کے ایک ممتاز وکیل مولوی ولی جان صاحب بی اے ایل ایل بی نے اس کی خدمت کا جائزہ لیا مگر وہ اپنے پیشہ کی مصروفیت کی وجہ سے کچھ زیادہ نہ کر سکے، آخر مولانا کے ایک ماموں زاد بھائی شیخ محمد صاحب (زمین دار پھریہا) نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی محنت اور کوشش نے اسکول کو دوبارہ زندہ کر دیا اور اس کو پھر ہائی اسکول تک پہنچایا اور تعمیرات میں بھی اضافہ کیا، مولانا کے صاحب زادہ حامد صاحب نعمانی نے بھی اس کی تعمیر کی تکمیل کی پوری کوشش فرمائی، اس کے دوسرے انتخاب میں مولوی سمیع صاحب مرحوم کے چھوٹے بھانجے اور مرزا مصطفٰے بیگ مرحوم کے چھوٹے بھائی مرزا مرتضٰی بیگ صاحب بی اے، ایل ایل بی سکریٹری ہوئے، ان کے دور میں جواب تک جاری ہے، اسکول نے شاندار کامیابی حاصل کی اور اب اس سال ۱۹۴۰ء میں اس کے موجودہ ہیڈ ماسٹر مولوی بشیر احمد صاحب صدیقی کی کوشش اور حسن تدبیر سے اس اسکول نے ترقی کر کے شبلی کالج کا رتبہ حاصل کر لیا، کالج کی عمارت الگ بن گئی، جس کی تعمیر میں مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے جن کو شروع سے اپنے استاد کے اس ابتدائی تعلیمی کارنامہ سے دلچسپی رہی، ان تھک محنت کی اور کالج کی پوری عمارت ان ہی کی کوشش اور اہتمام سے بن کر تیار ہوئی۔

کالج کے کارکنوں نے مناسب سمجھا کہ اس کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد اس شخص کے ہاتھ سے رکھوایا جائے جو اس اسکول کے بانی کا حبیب صمیم تھا، یعنی نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، چنانچہ موصوف سے عرض کیا گیا اور وہ زحمت سفر برداشت کر کے اعظم گڑھ آئے اور ۱۳؍ مارچ ۱۹۴۰ء کی شام کو ایک بہت بڑے جلسہ میں اس کے افتتاح کا اعلان کر کے بہت سے معززین کی معیت میں اپنے ہاتھ سے شبلی کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔

کالج بحمد اللہ اسی سال جولائی سے کھل گیا اور اس میں اس وقت ایف اے تک کی تعلیم ہو رہی ہے۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر

۱۹۰۸ء-۱۹۱۴ء

سرائے میر اعظم گڑھ اور شاہ گنج کے بیچ میں ایک مشہور پرانا قصبہ ہے، حضرت میر علی عاشقان رحمۃ اللہ علیہ شیر شاہ اور ہمایوں کے عہد میں ایک صاحب دل گزرے ہیں، ان ہی کی نسبت سے یہ مشہور ہے، ان کا مقبرہ اور ان کی خانقاہ کی عمارتیں اب بھی گری پڑی قصبہ کے وسط میں موجود ہیں، اس کے آس پاس بعض دولت مند شیعہ زمین دار بھی آباد ہیں، مگر کثرت ان لوگوں کی ہے جو مولانا مرحوم کی برادری سے تعلق رکھتے ہیں، یہ لوگ زیادہ تر دیہاتوں میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور اکثر نہایت محنت سے معمولی زمین داری اور کاشتکاری پر گزر کرتے ہیں اور بعض لوگ اور ملکوں اور جزیروں میں جا کر تجارت کرتے ہیں، یہ سب نیک اور دین دار لوگ ہیں، مولوی حمید الدین صاحب کا وطن پھریہا بھی اسی کے قریب ہے۔

مولوی شفیع صاحب نام ایک بزرگ نے جو نہایت نیک اور مقدس اور ان ہی اطراف کے رہنے والے ہیں اور دوسرے مقامی علما اور علم دوست اور دیندار مسلمان زمین داروں نے (جن میں مولوی حمید الدین صاحب کے خاندان کے بزرگ جو مولانا کے بھی نانہالی بزرگ تھے) مل کر شاید ۱۹۰۶ء میں ایک انجمن ''اصلاح المسلمین'' قائم کی، جس کا عام جلسہ ہر مہینہ کسی نہ کسی آس پاس کے قصبہ میں ہوتا تھا اور اصلاح و ترک بدعات کے مواعظ اس میں بیان کیے جاتے تھے، اس کے سالانہ جلسے بھی بڑے پیمانے پر ہوتے تھے، ان میں وقتاً فوقتاً مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلوی اور مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری جیسے مشاہیر علما آتے اور لوگوں کو مستفید کرتے رہے، اسی سلسلہ میں ایک اسلامی مدرسہ کی بنا کا خیال پیدا ہوا، اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں ان ہی اطراف کے ایک مدرس مولوی عبدالاحد صاحب (جو منجیر پٹی نام ایک گاؤں کے باشندہ تھے، جو سرائے میر سے ایک میل پر واقع ہے) جون پور کے کسی مدرسہ میں مدرس تھے، وہ کسی سبب سے مدرسہ چھوڑ کر اپنے گاؤں میں آگئے، ان کے ساتھ کچھ طلبہ بھی آئے، جن کو وہ اپنے گاؤں میں بیٹھ کر پڑھانے لگے، مدرسہ کی تحریک کرنے والوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور مدرسہ کے لیے سرائے میر میں اسٹیشن کے پاس ۲۴ بیگھ کی ایک زمین پسند کی، یہ زمین چند سنی اور شیعہ زمین داروں کی

ملکیت تھی، سب نے بخوشی اپنے اپنے حصہ کو اس نیک کام کے لیے وقف کیا، اسی زمانہ میں ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں ایک چبوترہ بنا کر چھپر ڈال دیا گیا اور وہ مدرسہ ہو گیا، اس زمانہ میں مولانا سید اصغر حسین صاحب جو اب دیوبند کے مدرسہ میں ہیں اور نہایت مقدس بزرگ ہیں، اٹالہ کی جامع مسجد جون پور میں پچیس برس سے مدرس تھے، وہ تشریف لائے اور ان کے ہاتھوں سے مدرسہ کا افتتاح ہوا، مولوی عبدالاحد صاحب یہیں آکر پڑھانے لگے، مولوی فیض الحسن صاحب میرٹھی نامی ایک خوش بیان واعظ، اتفاق سے انجمن کے ایک سالانہ جلسہ میں آئے تو لوگوں نے ان کو اور انہوں نے اس مقام کو غنیمت سمجھا، چنانچہ انہوں نے چند سال یہاں رہ کر مدرسہ کے لیے چندوں سے سرمایہ جمع کیا اور ایک بنگلہ اور کچھ کچے کمرے بنوائے۔

مدرسہ کی تحریک اور بنیاد تک میں مولانا کا ہاتھ نہ تھا لیکن جوں ہی اس نے برگ و بار پیدا کیا، برادری کی ایک نیک تحریک کے خیال سے مولانا نے اس کی سرپرستی قبول کر لی، ۱۹۱۰ء میں اس کا بڑا جلسہ ہوا، اطراف کے سارے مسلمان جمع ہوئے، دیوبند سے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی اور ندوۃ العلما سے مولانا مرحوم دارالعلوم کے دو چھوٹے طالب علموں، عبدالرحمٰن نگرامی اور معین الدین کو لے کر جو باوجود کمسنی کے بہت اچھی تقریر کرتے تھے، جلسہ میں شریک ہوئے، یہیں مولانا مرحوم اور مولانا عبیداللہ صاحب سندھی میں پہلی ملاقات ہوئی اور تخلیہ میں گفتگوئیں ہوئیں اور ایک نے دوسرے کو پہچانا، اس تعارف میں شاید اس واقعہ کو بھی دخل ہو کہ مولانا حمید الدین صاحب مدت تک کراچی میں رہے تھے اور مولانا عبیداللہ صاحب سندھی سے اور ان سے وہاں ملاقاتیں رہتی تھیں، دونوں میں قرآن پاک کے درس اور غور و فکر کا ذوق مشترک تھا۔

اس زمانہ میں مولانا پر آریوں کے حملوں کی وجہ سے اشاعت و حفاظت اسلام کی تحریک بالکل چھائی ہوئی تھی اور آریوں کے گروکل کی سادگی اور مذہبی خدمات کے لیے ان کی تیاری کے قصوں سے بہت متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں بھی کوئی جماعت یا درس گاہ اسی اصول پر قائم کی جائے، یہ مدرسہ جو بالکل دیہات میں قائم تھا، اس کام کے لیے ان کو بہت موزوں نظر آیا، ۲۹؍اپریل ۱۹۱۰ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھا ''کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو؟ میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے، اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو۔'' (حمید-۵)

۱۹۱۲ء میں مولانا نے اس کے انتظامی جلسوں میں شرکت فرمائی اور مولوی فیض الحسن کو جن پر لوگوں کو بہت سے اعتراضات تھے، خوش اسلوبی سے الگ کیا گیا۔

۱۹۱۳ء میں جب مولانا نے دارالعلوم کی معتمدی سے سبک دوشی حاصل کی تو مدرسۂ سرائے میر کی طرف مزید توجہ فرمائی، اس وقت وہ حیدرآباد میں تھے اور دارالعلوم حیدرآباد دکن میں مولانا حمید الدین صاحب کی تقرری کا مسئلہ گراں قدر مشاہرہ پر طے پا رہا تھا، تاہم انہوں نے مولوی حمید الدین صاحب کو لکھا، بحث یہ ہے کہ ہماری قومی قوت سرائے میر پر صرف ہو یا اعظم گڑھ پر دونوں کے برداشت کے قابل قوم نہیں ہے، کم سے کم یہ کہ دونوں کی جداگانہ پوزیشن قائم ہونی چاہیے اور ان کا باہمی تعلق۔

کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کو مرکز بنا کر اسی کو دین و دنیا دونوں تعلیم کا مرکز بنایا جائے، یہیں خدام دین بھی تیار ہوں، مذہبی اعلا تعلیم بھی دلائی جائے، گویا گروکل ہو، تم اپنی رائے لکھو، ندوہ میں لوگ کام کرنے نہیں دیتے تو اور کوئی دائرۂ عمل بنانا چاہیے، ہم سب کو وہیں بود و باش کرنی چاہیے، ایک معقول کتب خانہ بھی وہاں جمع ہونا چاہیے، اگر تم یہ عزم جزم آمادہ ہو تو میں موجود ہوں۔

آج ڈائرکٹر تعلیمات سے تمہارے متعلق فیصلہ کرانا ہے، صرف یہی ایک زینہ رہ گیا ہے، لیکن یہ فیصلہ موافق بھی ہو جائے تب بھی میں اس کو قومی خدمت پر ترجیح نہیں دیتا، البتہ کچھ معاش کا سہارا ہونا چاہیے، وہ بقدر کفاف کسی نہ کسی طرح ہوتا رہے گا، آخر تمہارا بھی خود خیال تھا، پرنسپلی اور بیش قرار تنخواہ چند روزہ ہیں اور یہ کام ابدی ہے۔" (حمید-۶۷)

مولوی اسحاق صاحب مرحوم کی وفات کے بعد جب مولانا اعظم گڑھ آئے اور یہاں کے منتشر اداروں کو باہم ملا کر ایک منظم شکل دینی چاہی تو اس کی ایک کڑی مدرسہ سرائے میر بھی قرار دی، مولوی حمید الدین صاحب نے ان کو لکھا کہ "آپ اس مدرسہ کی نظامت قبول فرما کر اسی کو اپنی کوششوں کا محور قرار دے لیں" اس کے جواب میں ۲۱ ستمبر ۱۹۱۴ء کو انہیں لکھا "بھائی! با ایں ضعف و دل شکستگی مدرسہ سرائے میر کی نظامت کیوں کر کر سکتا ہوں، کوئی دوسرا شخص سوچو، امکانی مدد کرتا رہوں گا۔" (حمید-۷۵)

بالآخر مولانا نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے شاگردوں میں سے مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو جن کے حسن انتظام کا ان کو تجربہ ہو چکا تھا، اعظم گڑھ بلالیں اور دارالمصنّفین کے ساتھ مدرسۂ سرائے میر کی نگرانی بھی ان کے سپرد کریں، اکتوبر ۱۹۱۴ء کے شروع میں مولوی مسعود علی صاحب اعظم گڑھ آئے

اور انہوں نے مجوزہ دارالمصنّفین کے مکان اور مدرسہ سرائے میر کو جا کر دیکھا، ۱۰ را کتوبر ۱۹۱۴ء کو مولانا نے مجھے لکھا ''تمہارا انتظار بہت رہا، مسعود آئے بھی اور چلے بھی گئے، وہ تو اس ویرانہ کو علمی کوششوں (دارالمصنفین وتکمیل وغیرہ) کی جولان گاہ بننے کے قابل خیال کرتے ہیں۔'' (سلیمان-۸۱)

مولوی صاحب نے واپس جا کر مولانا کو لکھا کہ ''مدرسہ میں جو مدرس اول ہیں وہ اس جگہ کے لیے موزوں نہیں'' مولانا نے جواب دیا، سرائے میر کے منتظم دلیر نہیں ہیں، مدرس حال گو ان کے نزدیک نا قابل ہیں لیکن ان کو فوراً موقوف نہ کریں گے اور شاید اس میں کچھ دیر لگے، درجۂ تکمیل والوں کے ساتھ شبلی یہاں چلے آئیں، جب تک کوئی انتظام نہ ہو وہ تکمیل میں رہیں۔'' (مسعود-۲۱)

یہاں شبلی سے مقصود مولوی شبلی[۱] صاحب ندوی متعلم ہیں، جو اعظم گڑھ ہی کے رہنے والے اور دارالعلوم سے فارغ ہو کر دو برس سے دارالعلوم کے درجۂ تکمیل میں علم کلام اور معقولات کی تکمیل میں مصروف تھے، مولانا ان کو سرائے میر کے لیے تجویز فرما رہے تھے، مگر چوں کہ وہاں کے انتظام میں کچھ تاخیر تھی، اس لیے سردست ان کو اعظم گڑھ آنے کی ہدایت فرمائی، مولانا کے ذہن میں اس وقت دارالمصنّفین درجۂ تکمیل اور سرائے میر کو ملا کر ایک اچھے خاصے جامعۂ اسلامیہ کا تصور قائم ہو گیا تھا، مولوی مسعود علی صاحب کو اپنی ایسی غم انگیز حالت میں بھی کس خوشی سے اپنے اس خوش آیند خواب کی اطلاع دیتے ہیں، ''دارالمصنّفین درجہ تکمیل، سرائے میر ابتدائی پورا جامعہ اسلامیہ[۲] کا مصالحہ ہے، کام کرنے کی ضرورت ہے، سرائے میر والے چند بار آئے، وہ تمہارے بہت آرزومند ہیں، وہاں کے موجودہ عملی ناظم اور بانی مدرسہ

---

[۱] لطیفہ:- دارالعلوم میں بیک دفعہ تین شبلی جمع تھے، مولانا شبلی صاحب معتمد دارالعلوم، مولانا شبلی صاحب مدرس اور یہ مولوی شبلی متعلم، ان بے چارے کے نام کے ساتھ اسی فرق کے لیے متعلم کا لفظ لگایا گیا، وہ احباب کی زبان پر ان کے نام کا ایسا لازمی جز بن گیا کہ اس کے ملائے بغیر ان کی شخصیت کا تصور نہیں آتا تھا، مگر جب انہوں نے علم کلام کی تکمیل کر لی تو اسی وزن پر متکلم کا لفظ ان کے نام کے ساتھ لگا دیا گیا، جو اب تک قائم ہے، یہ ہماری جماعت میں کلام و معقولات میں نہایت لائق و فاضل اور ساتھ ہی نہایت متواضع، خاکسار اور ایثار پسند ہیں، مولانا ان سے محبت رکھتے تھے۔ [۲] جامعہ کا لفظ جامعہ ملیہ دہلی کے بعد سے تو عام ہے مگر یہ لفظ ہماری زبان میں اس معنی میں پہلے مولانا ہی کے قلم سے نکلا اور بعد کو اشاعت پذیر ہوا، جامعہ ملیہ کے نام کی تاریخ بھی ایک اتفاقی واقعہ ہے، مسلم یونیورسٹی سے ٹوٹ کر اس کے بالمقابل جو نئی قومی مسلم یونیورسٹی قائم کی گئی، اس کا لیٹر ہیپر یعنی خط کا کاغذ مولانا ابوالکلام نے چھپوایا تھا، ان ہی نے نیشنل مسلم یونیورسٹی کے انگریزی لفظوں کے ساتھ اس کا عربی ترجمہ جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی کر دیا، پھر بعد کو یہ لفظ چل گیا، جامعہ مصر کی نئی عربی زبان میں یونیورسٹی کو کہتے ہیں، جو یونیورسٹی کا گو لفظی ترجمہ ہے، لیکن چوں کہ جامع عربی میں مسجد اعظم کو کہتے ہیں اور شروع میں مسجدیں ہی درس گاہیں تھیں، اس لیے جامع کے ساتھ جامعہ کا لفظ خاص مناسبت رکھتا ہے۔

مولوی محمد شفیع صاحب کی خواہش ہے کہ تم ناظم یا نائب ناظم بن جاؤ اور وہ واعظ بن کر قصبات کا دورہ کرتے رہیں کہ مالی حالت کی طرف سے اطمینان ہو جائے، وہ کہتے ہیں کہ مجھ کو نظم و نسق نہیں آتا" یہ بھی خیال تھا کہ انسپکٹر مدارس سے مل کر اس کی سرکاری امداد کا کوئی انتظام ہو، اسی خط میں لکھتے ہیں:

"انسپکٹر مدارس آئے تھے، وہ سرائے میر کو دو مہینہ کے بعد دیکھیں گے اور امداد کی پوری توقع ہے"۔ (مسعود-۲۵)

پہلی نومبر کو پھر مولوی مسعود علی صاحب کو لکھا "میں ایک مفصل اسکیم لکھ چکا ہوں، اب جو آنے والے ہوں فوراً آ جائیں، تا کہ ایک صحیح اسکیم قائم ہو جائے، شبلی متعلم بھی اور اور لوگ بھی تم اپنی نسبت فیصلہ کر لو کہ کہاں رہنا بہتر ہے، لکھنؤ سے بالکل قطع تعلق مناسب معلوم نہیں ہوتا، ورنہ ایک عمدہ اسکیم یہ تھی کہ سرائے میر کا نظام تمہارے ہاتھ میں ہوتا، اگر اس کا کچھ تدارک یعنی تلافی ہو سکے تو سرائے میر کے ارادہ سے آ جاؤ، میرا دورہ بھی اکثر رہے گا۔" (مسعود-۳۲)

مولوی مسعود علی صاحب نے لکھا کہ "وہ بالفعل چھ مہینے کے لیے سرائے میر کے مدرسہ کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیں گے"، مولانا نے ۵/نومبر ۱۹۱۴ء کو انہیں لکھا "تمہاری نسبت یقیناً سرائے میر میں رہنا بہتر ہے اور چھ مہینے کی رائے ٹھیک ہے، تم کو ہر بات کا تجربہ ہو جائے گا، اختیارات جس قدر چاہو گے مل جائیں گے۔" (مسعود-۳۳)

مولوی مسعود علی صاحب جب آئے تو بلانے والا مرض الموت کے بستر پر تھا۔

مولوی شبلی صاحب متکلم مولانا کی وفات سے تین روز پہلے پہنچ گئے تھے، ان کو پاس بلا کر فرمایا کہ میری زندگی کے حاصل تم لوگ ہو، جہاں رہو میری طرز تعلیم کو پھیلاتے رہو۔

مولانا مرحوم کی وفات کے تیسرے روز گویا ماتم سے فارغ ہو کر مولانا حمید الدین صاحب نے مولانا کے ان چند شاگردوں کو لے کر جو اس وقت جمع تھے، ایک مجلس اخوان الصفا کی بنیاد ڈالی اور اس کا مقصد یہ قرار پایا کہ مولانا مرحوم کے ادھورے کاموں کی تکمیل کی جائے، اس مجلس میں اس وقت مولانا حمید الدین صاحب کے علاوہ حسب ذیل اشخاص شریک تھے، مولوی مسعود علی صاحب ندوی، مولوی شبلی صاحب متکلم ندوی اور خاکسار، اس مقصد کی بنا پر ہم لوگوں نے مولوی شبلی صاحب متکلم کو مدرسہ سرائے میر کی صدر مدرسی اور مولوی مسعود علی صاحب کو اس کی نگرانی کی خدمت سپرد کی جس کو ان

دونوں صاحبوں نے قبول کیا، مولوی مسعود علی صاحب کو تو سال دو سال کے بعد دارالمصنفین کے کاموں کے پھیلاؤ کے سبب سے اس کی نگرانی کی خدمت سے الگ ہو گئے اور خود مولوی حمید الدین صاحب نے اس بوجھ کو اپنے سر اٹھا لیا لیکن مولوی شبلی صاحب اس وقت سے لے کر اس وقت تک پوری جانفشانی، محنت اور ایثار کے ساتھ ہر قسم کی مصیبتوں کو مردانہ وار جھیل کر اپنے کام کو انجام دے رہے ہیں اور بحمد اللہ کہ ان کے اور ان کے ساتھیوں کی محنت اور ایثار کی بدولت مدرسہ آج ایک ممتاز علمی حیثیت رکھتا ہے، آخر عمر میں گویا مولانا کی آرزو کے مطابق جس کا پچھلے خط میں ذکر ہے، مولانا حمید الدین صاحب نے حیدر آباد کی ملازمت سے مستعفی ہو کر اپنی زندگی اس کی خدمت کے لیے وقف کر دی اور قرآن پاک کی تعلیم و تدریس اس کا خاص مقصد قرار دے کر اس کا خاص نصاب بنایا، جس پر وہ آج تک گامزن ہے اور اچھے نتائج پیش کر رہا ہے۔

دار المصنّفین

۱۹۱۰ء - ۱۹۱۴ء

ابتدائی خیال مولانا مرحوم کے ذہن میں دارالمصنفین کی تجویز کتب خانۂ ندوۃ العلما کی عمارت کے سلسلہ میں سب سے پہلی بار آئی، مارچ ۱۹۱۰ء کے اجلاس دہلی میں دارالعلوم کی جو سہ سالہ رپورٹ انہوں نے لکھ کر پیش کی تھی، اس میں یہ بھی لکھا تھا ''قومی اور مذہبی ضروریات میں جس قدر ایک قومی مدرسہ ایک قومی کالج، ایک قومی یونیورسٹی کی ضرورت ہے، اسی قدر ایک قومی کتب خانہ اعظم گڑھ کی بھی ضرورت ہے، اگر مسلمانوں کے مذہب، مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کی قومی تاریخ کو زندہ رکھنا ہے تو ضروری ہے کہ ایک ایسا کتب خانہ بہم کیا جائے جس میں علوم مذہبی کے متعلق نادر اور بیش بہا تصانیف موجود ہوں، جس میں مسلمانوں کے خاص ایجاد کردہ علوم وفنون کا کافی سرمایہ ہو، جس میں ہر فن کے متعلق وہ تمام کتابیں موجود ہوں جو اس فن کے دورِ ترقی کے مدارج ہیں، جس میں قدما کے عہد کی یادگاریں ہوں اور ان سب باتوں کے ساتھ یہ کتب خانہ کسی کا ذاتی نہ ہو بلکہ وقف عام ہو تا کہ تمام ہندوستان کے مسلمان بالخصوص مصنفین اور اہل قلم اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

یہ تجویز کہ ندوہ میں ایک دائرۂ تالیف قائم کیا جائے جس کے ارکان کا کام صرف مطالعۂ کتب اور تصنیف وتالیف ہو، جس طرح یورپ میں اکاڈمیاں ہوتی ہیں، یہ بھی اسی وقت پوری ہوسکتی ہے، جب ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کر دیا جائے۔''

مولانا نے اسی جلسہ میں پڑھنے کے لیے ''ندوہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ کی ضرورت'' کا عنوان میرے حوالہ فرمایا تھا اور ارشاد ہوا تھا کہ اسی سلسلہ میں ایک دارالمصنفین کے قیام کی تجویز پیش کرو، میری یہ تقریر ندوہ کے اجلاس دہلی کی رپورٹ اور الندوہ میں چھپ چکی ہے، اس کے آخر میں صیغۂ تصنیف وتالیف کے عنوان کے نیچے ہے، ندوہ جس قسم کے علما اپنے مدرسہ میں تیار کرانا چاہتا ہے، وہ اس اسکیم سے ظاہر ہے کہ یہاں کے طلبہ درجۂ عالمیت یا درجۂ تکمیل کے بعد تالیف وتصنیف میں مشغول ہوں اور ایک بڑے پیمانہ پر صیغۂ تالیف وتصنیف قائم کیا جائے، جس سے علوم وتاریخ اسلام کا احیا ہو،

لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ کام اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب ندوۃ العلما کے احاطہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ ہو، جس میں تمام نادر تصنیفات موجود ہوں اردو زبان کی بہترین مذہبی لائف الفاروق ہے لیکن حضرات آپ کو معلوم ہے کہ یہ پانچ سو صفحوں کی کتاب ہندوستان، مصر قسطنطنیہ کے تمام کتب خانوں کو کنگھال کر لکھی گئی ہے، یہ امر بدیہی ہے کہ ہر مصنف کو یہ فرصت و وسعت نہیں مل سکتی کہ وہ ایک ایک تصنیف کی خاطر تمام روئے زمین کا سفر کرے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں عمدہ تصنیفات شاذ و نادر شایع ہوتی ہیں، اگر قوم ندوۃ العلما کے اقتدار میں ایک ایسا کتب خانہ تیار کر دے جو تمام ضروری اسلامی تالیفات کو محیط ہو تو یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ مفید تالیفات کا ذخیرہ اردو زبان میں نہایت آسانی سے جمع ہو جائے اور خصوصاً اس اسکیم کی قوت سے فعل میں آنے کی صورت پیدا ہوگی کہ ممتاز طلبائے دار العلوم کا ایک حصہ صیغۂ تالیف و تصنیف کے لیے وقف کیا جائے، جس کی قوم کو اس وقت نہایت ضرورت ہے''۔

دار العلوم کی جدید عمارت میں اس کتب خانہ اعظم کے مناسب شان ایک بلند عمارت تیار کی جائے، جس میں کتب خانہ کے سوا ایک وسیع کمرہ ارباب قلم و مصنفین کے لیے بنایا جائے، جس میں قوم کی ایک جماعت تالیف و تصنیف میں مشغول ہو، مادری زبان کو جس کا گہوارۂ طفولیت یہی دہلی ہے، ان تصنیفات کے ذریعہ سے ترقی دی جائے، میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے اربابِ قلم و مصنفین جن کی تعداد ہندوستان میں ایک مناسب حد تک ہے، اس کے مصارف بطور یادگار اپنی جیب سے پورے کریں اور اس عمارت کا نام دار المصنّفین ہو، بہ ظاہر یہ تجویزیں خیال کا اختراع معلوم ہوتی ہیں لیکن قوم کی امداد سے آج جہاں بہت سے مشکل اور بہ ظاہر محال کام انجام پا رہے ہیں، اس کتب خانۂ اعظم کا قائم ہو جانا بھی بعید نہیں، جس کے لیے غالباً متوسط حیثیت میں پچاس ہزار کا سرمایہ کافی ہوگا۔''

اگست ۱۹۱۰ء میں نواب مزمل اللہ خاں نے سرکاری خطاب پانے کی خوشی میں مولانا کو لکھا کہ وہ ان کی تصنیفات کی یادگار میں دار العلوم میں ایک کمرہ بنوائیں گے تو مولانا نے الندوہ (اگست ۱۹۱۰ء) میں یہ نوٹ لکھا، جناب نواب صاحب موصوف نے ہم کو خط لکھا ہے کہ وہ دار العلوم کے بورڈنگ کا ایک کمرہ ہماری تصنیفات کی یادگار میں بنوانا چاہتے ہیں، ہماری تصنیفات کی تو خیر کیا وقعت ہے لیکن نواب صاحب موصوف چوں کہ علم دوست ہیں، اس لیے انہوں نے علم پروری کا یہ بھی ایک بہانہ پیدا کر لیا ہے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ دار العلوم میں ایک عمارت دار المصنّفین کے نام سے تعمیر ہو جس کا یہ مقصد ہو کہ اس میں تالیف

وتصنیف کا ایک دفتر ہو اور اس سے باقاعدہ تصانیف شایع ہوں، باہر کے مصنف اگر چاہیں تو اس میں آ کر رہیں، ان کے لیے ہر قسم کے آرام کا سامان مہیا کیا جائے، تمام ضروری علوم وفنون کی کتابیں مہیا رہیں، چوں کہ ندوہ کا کتب خانہ اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ ہوتا جاتا ہے اور ندوہ کے تعلیم یافتہ طلبہ میں تصنیف وتالیف کا مذاق خصوصیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، اس لیے دارالمصنفین کی تجویز ہر طرح موزوں ہے، نواب مزمل اللہ خاں صاحب سے ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی رقم کو اس مد میں منتقل فرمائیں لیکن شرط یہ ہے کہ ملک کے اور باہمت اور علم دوست حضرات اس سرمایہ میں اضافہ فرمائیں، اس وقت صرف عمارت اور ضروری سامان کے لیے دس ہزار روپے درکار ہوں گے۔

اس کے بعد ندوہ میں اختلافات کا دور پیدا ہو گیا اور یہ خیال ان کے دماغ میں یونہی پیچیدہ رہا۔

جولائی ۱۹۱۳ء میں جب ندوہ سے الگ ہونے پر مجبور ہوئے تو ادھر سے یکسو ہو کر ان کے ذہن میں ایک تصنیفی ادارہ کا خیال زور پکڑنے لگا، چنانچہ یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو منشی محمد امین صاحب زبیری کو (جو اس وقت ہز ہائینس بیگم صاحبہ بھوپال کے لٹریری سکریٹری تھے) ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "ہاں یہ دونوں (سلیمان، عبدالسلام) اچھے بن گئے، کمبخت مخالفین نے اوقات اور کام میں خلل ڈال دیا ورنہ اور بھی داغ بیل پڑ رہی تھی، بہر حال یہ طے ہولے کہ کہاں صدر مقام کروں تو پھر ارباب قلم کی تربیت شروع کروں، انشاء اللہ سیرت ہی کے دفتر کو اتنا وسیع کرتا ہوں کہ دائرۃ التالیف بن جائے، ہندوستان میں اور ہر کام کے لیے انجمنیں ہیں لیکن تصنیفی انجمن کا میدان خالی ہے اور یہ سب سے بڑا اہم کام ہے، ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں کے دل پر حکمرانی کرتا ہے۔" (۱۸)

سیرت اکاڈمی ایک خیال یہ بھی تھا کہ مخصوص طور پر سیرت کی ایک اکاڈمی بنائی جائے اور اس کے ذریعہ سے اس فن کے ماہر تیار کیے جائیں، چنانچہ ۲۷/اکتوبر ۱۹۱۳ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک خط میں لکھتے ہیں " آپ نے یہ نہ لکھا کہ کون سا کام لے کر بیٹھوں، میں خود بھی یہی چاہتا ہوں لیکن ابھی مختلف مقاصد میں سے کسی ایک کا قطعی انتخاب نہیں ہوتا، چاہوں تو خود سیرت کو ایک مقصد مستقل قرار دوں۔ یعنی ایک اکاڈمی قائم ہو، سیرت کے متعلق تمام نادر تصانیف جمع کی جائیں، لوگوں کو وظائف بطور فیلوشپ کے دیے جائیں کہ سیرت کی اسٹڈی کریں اور خاص اس فن میں ماہر بنیں اور سیرت پر تقریر وتحریر کریں، وغیرہ وغیرہ، اس میں بقدر ضرورت مالی اعانت بھی مل سکتی ہے۔ (۳۹)

دار المصنّفین کی تجویز کی اشاعت | بہر حال دار المصنفین کا خیال اس قدر پختہ ہو گیا کہ انہوں نے ۱۹۱۴ء میں الہلال کلکتہ کے ذریعہ سے اس تجویز کو عام طور پر ملک کے سامنے پیش کیا اور انگریزی میں اس کا ترجمہ کرایا اور مخصوص احباب کو خاص طور پر اس کی طرف توجہ دلائی، چنانچہ مولوی ریاض حسن خاں صاحب رئیس رسول پور ضلع مظفر پور، بہار ۲۶ر فروری ۱۹۱۴ء کو ایک خط میں لکھا کہ "ہاں دار المصنفین کی تجویز الہلال میں کیا نظر سے نہیں گزری، ضرور دیکھیے، آپ اس کے خاص مخاطب ہیں، اس کے لیے خود وہاں تک آؤں گا، یہ میرا اخیر کام ہے، اور زمرۂ مصنفین کی دائمی خدمت ہے۔" (۲۳)

ابتدا میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورہ سے یہ قرار پایا کہ چند طلبہ خود مولانا کے ساتھ رہیں اور ان کو خاص خاص فنون میں تیار کرایا جائے، چنانچہ وہ مجھی کو جون ۱۹۱۴ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں "آزاد سے مشورہ ہوا، رائے یہ ٹھہری کہ اصل غرض قابل اشخاص کو تیار کرنا ہے، اس لیے میں خود دو چار طلبہ اپنے ساتھ رکھوں اور ان کو کسی فن میں تیار کروں اور صحیح مذاق ان میں پیدا کرایا جائے، ان کے مصارف پر تکفل بھی (جن کو ضرورت ہو) میرے ذمہ ہوگا، اگر تم اس رائے سے متفق ہو تو لکھو اور کوئی طالب علم اس کے قابل ہو اور میرے ساتھ رہنا چاہے تو اس کے نام سے مطلع کرو، نیز ایک وظیفہ فنڈ قائم ہونا چاہیے، اس میں کچھ ماہوار تم بھی دو۔" (سلیمان-۶۸)

اس رائے کے مستحکم ہو جانے کے بعد اس زیر تجویز ادارہ کے اہتمام وانصرام کا کام مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو جن کی انتظامی قابلیت اور حسن تدبیر کے مولانا معترف تھے اور جو اب ندوہ کے اصلاحی کاموں سے فارغ ہو چکے تھے اور کسی عملی مشغلہ کی تلاش میں تھے، سپرد کرنا چاہا، اسی بنا پر دار المصنفین کے آیندہ قیام اور نظام کے مشورے اس زمانہ میں ان سے ہوتے رہے، جن کے اذکار ان کے خطوط میں بکثرت ہیں۔

دار المصنّفین کا مرکز | سب سے اہم سوال یہ تھا کہ دار المصنفین کو کہاں قائم کیا جائے؟ مولانا نے اس کے متعلق سب سے پہلے ارکان ندوہ سے اتمام حجت کرنا چاہا، ۱۴ر فروری ۱۹۱۴ء کو مولانا شروانی سے پوچھا، ہاں دار المصنفین پر کیوں آپ نے سکوت کیا، آپ سے بڑھ کر اس کی شرکت کا حق کس کو ہے، میں اس عمارت کو انشاء اللہ پورا کر کے رہوں گا اور وہی شاید میرا مدفن بھی ہو۔" (۱۱۳)

پھر چند روز کے بعد ۳ر مارچ ۱۹۱۴ء کو انہیں دوبارہ لکھا "دار المصنفین کی تجویز میں قطعاً طے کر چکا ہوں، کہیں سے بندوبست نہ ہو تو موجودہ ابتدائی عمارت جس کا تخمینہ پانچ ہزار روپیہ ہے، میں خود اپنے

پاس سے ادا کردوں گا، چھوٹے چھوٹے بنگلے اور احباب سے بنوالوں گا، بہرحال اس وقت ضرورت آپ سے یہ مشورہ مطلوب ہے کہ کہاں بنے، اگر علی گڑھ یا کہیں اور بنے تو لوگ مولوی سمیع اللہ خاں کا مقلد کہیں گے، اس لیے میں اتمام حجت کے طور پر چاہتا ہوں کہ پہلے ندوہ کے تمام ارکان سے پوچھ لوں اگر وہ منظور نہ کریں تو پھر مجھ پر اعتراض نہ ہوگا، پرلطف تجویزیں دارالمصنّفین کے متعلق ذہن میں ہیں۔" (۱۱۴)

لیکن مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے غالباً اس کے لیے خود اپنے وطن حبیب گنج کا انتخاب کیا، جس کو مولانا نے منظور نہیں کیا، لکھا: "آپ دارالمصنّفین کو حبیب گنج لے جانا چاہتے ہیں، تو حضرت میں اعظم گڑھ کو کیوں نہ پیش کروں، اعظم گڑھ میں اپنا باغ اور دو بنگلے پیش کر سکتا ہوں۔" (۱۱۵)

لیکن مولانا کی اصلی خواہش یہ تھی کہ دارالمصنّفین ندوہ ہی میں قائم ہو، چنانچہ مولوی مسعود علی صاحب نے جب ان کو یہ لکھا کہ دارالمصنّفین لکھنؤ میں اور ندوہ ہی کے احاطہ میں قائم ہو، تو اس کے جواب میں ۲۷/ جولائی ۱۹۱۴ء کو انہیں لکھا "بھائی وہ لوگ دارالمصنّفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے کہ میں بناؤں، میری اصلی خواہش یہی ہے لیکن کیا کیا جائے، حالاں کہ اس میں انہی کا فائدہ ہے۔" (۱۳)

ندوہ سے الگ بھی وہ دارالمصنّفین کا مرکز لکھنؤ ہی کو بنانا چاہتے تھے، چنانچہ ۱۸/ جولائی ۱۹۱۴ء کو انہی کو لکھا: "ایک کام کرنے کا تو یہ ہے کہ دارالمصنّفین کا بندوبست کرو، راجہ صاحب[1] محمود آباد نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے نجف کے پاس زمین لی ہے، چاہو تو وہیں تم کو بھی دلا دوں، کہو تو میں ان کو لکھوں اور تمام معاملات تمہارے ہاتھ سے انجام پائیں، اگر زمین مل جائے تو ایک پھوس کا مختصر بنگلہ اور چند اور چھپر کمرے بنوا لیے جائیں، پھر کام چلتا رہے گا، غالباً وہاں میری صحت بھی درست رہے۔" (۱۵)

بالآخر دارالمصنّفین کے مرکز کے مسئلہ کا قطعی فیصلہ خود قاضی تقدیر نے کر دیا، یعنی اگست ۱۹۱۴ء میں ان کے عزیز بھائی مولوی محمد اسحاق مرحوم کی موت نے ان کو اعظم گڑھ آنے پر مجبور کیا، یہاں سکون واطمینان نظر آیا تو اسی شہر کو اپنے مقاصد کا مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ ۴/ ستمبر ۱۹۱۴ء کو مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو لکھا: "میں یہاں تکمیل کا درجہ کھول دوں گا، تم طلبہ کے نام سے مطلع کرو اور خود ان کو لکھ دو کہ مجھ سے خط و کتابت کریں۔"

میں نے یہاں اپنا مستقل انتظام کر لیا ہے، ہر طرح کا آرام اور پھیلاؤ ہے، تعلیم کے کام

---

[1] سابق مہاراجہ محمود آباد، محمد علی محمد خاں۔

شروع ہوگئے ہیں، کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں، بالکل ایک بادشاہت معلوم ہوتی ہے، اور افسوس ہوتا ہے کہ میں نے کیوں اتنے دن پاجیوں میں بسر کیے، باغ ہے، بنگلہ ہے، حکومت ہے، گریجویٹ ہیں، اسکول ہے، تعلیمی انجمن ہے اور سب حسب خواہ کام کرتے ہیں، نہ کہ وہاں سگانِ بازاری کے ساتھ عوعو میں مبتلا ہونا، دارالمصنّفین بھی شروع ہوجائے گا۔'' (۷۲)

اب اعظم گڑھ میں دارالمصنّفین کی بنیاد ڈالنی چاہی تو سب سے پہلے مولانا نے اس کے لیے اپنے ذاتی باغ اور بنگلہ کو وقف کرنا چاہا لیکن چوں کہ خاندان کے اور لوگ بھی اس میں شریک تھے، اس لیے ان کی رضامندی بھی حاصل کرنا چاہی، یہ لوگ راضی ہوگئے تو وقف نامہ لکھوانا شروع کیا، چنانچہ ۱۰/ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مجھے لکھتے ہیں: ''تمہارا انتظار بہت رہا، مسعود آئے بھی اور چلے بھی گئے، وہ تو اس ویرانہ کو علمی کوششوں (دارالمصنّفین و تکمیل وغیرہ) کی جولانگاہ بننے کے قابل خیال کرتے ہیں، کتابیں بقدر ضرورت مہیا ہوگئی ہیں، چھ سات الماریاں بھر گئی ہیں، وقف نامۂ باغ زیر تحریر ہے، بنگلہ کے بغل میں مختصر سا دارالضیوف بن گیا ہے۔'' (۸۱)

وظائف کا انتظام چوں کہ اب تک دارالمصنّفین کے لیے کسی قسم کی آمدنی نہ تھی اس لیے درجۂ تکمیل کے وظائف کے لیے مولانا حمید الدین صاحب نے ۳۰ روپیہ ماہوار مقرر کیے، اسی قدر مولانا نے اپنی طرف سے منظور کیا، کتب خانہ باغ اور بنگلہ کی وسعت و ترمیم میں جو مصارف کثیر پڑنے والے تھے، ان کا بار بھی مولانا نے خود اپنے سر لیا، دارالتصنیف اور دارالتکمیل کے طلبہ کے قیام کے لیے اپنے والد مرحوم کا مکان جو بنگلہ کے قریب اور دوسرے حصہ دار کے قبضہ میں تھا کرایہ پر لیا، باغ کے پہلو میں سڑک پر جو سرکاری مکان تھا، اس کے خریدنے کا بھی سامان کرنا چاہا۔ (مسعود-۲۲)

دارالمصنّفین کا تعلیمی خاکہ ان تمام مراتب کے طے ہوجانے کے بعد طلبائے دارالمصنّفین کے لیے حسب ذیل قواعد داخلہ بنائے:

۱- مدت تعلیم دو سال۔

۲- اس کی دو شاخیں ہوں گی، تکمیل و تصنیف۔

۳- ہر طالب العلم جو صرف و نحو کافی جانتا ہو، اس درجہ میں داخل ہو سکے گا۔

۴- اس درجہ میں داخل ہونے کے لیے ایک سرسری امتحان لیا جائے گا۔

درجۂ تکمیل، اس درجہ میں دو مضمون لازمی ہوں گے، ادب اور علوم ثلاثہ میں سے کوئی ایک

دونوں عالمانہ ہو، علما کا ہمیشہ قاضی ابو یوسف کے زمانہ سے ایک خاص لباس رہا ہے، طلبہ بھی اسی کے قریب قریب استعمال کرتے تھے۔'' (مسعود-۲۱)

طلبہ کا انتخاب ان سب مرحلوں کے طے ہونے کے بعد طلبہ کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا، ندوہ کے فارغ التحصیل یا قریب فارغ التحصیل طلبہ میں سے جن سے وہ خود واقف تھے، چند طلبہ کا انتخاب کیا، اس کے بعد متعدد طلبائے ندوہ نے داخلہ کے لیے بہ شوق خطوط لکھے تو یہ قرار پایا کہ تمام طلبہ بقرعید کے بعد آ جائیں (مسعود-۲۴) مولوی ابوالحسنات عبدالشکور ندوی مرحوم سابق رفیق دارالمصنفین[1] کا انتخاب خود مولانا ہی نے فرمایا تھا، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں: ''عبدالشکور کا ایک قصیدہ ملا، تمہارے پتہ سے جواب مانگا ہے، جواب کیا حاجت ہے، بقرعید کے بعد آ جانا چاہیے۔''

قصیدہ میں کچھ غلطیاں اور کم زوریاں ہیں لیکن طبیعت میں قابلیت ہے، اس لیے بہت جلد یہ خامیاں نکل جائیں گی۔'' (مسعود-۲۵)

اس رائے کے مستحکم ہو جانے کے بعد ندوہ کے جن طلبہ کو قابل تربیت سمجھتے تھے، ان پر خود بخود ان کی نگاہ پڑی، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں، عبدالرحمن نگرامی[2] بھی قابل تربیت ہے'' (سلیمان-۶۹)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں: ''سید سلیمان نے محسن[3] کی تعریف لکھی ہے کہ وہ میرے پاس رہنے کے قابل ہیں، انشا پردازی کا بھی مادہ ہے، خلیل[4] صاحب اگر آئیں تو بلا لوں، ان کے لیے تو وظیفہ میں خود اپنے ہاں سے دوں گا۔''

---

۱ عین شباب میں وفات ہوئی، یہ بہار کے ایک قصبہ کے تھے، ان کے حالات کے لیے دیکھیے معارف نومبر ۱۹۲۴ء
۲ عین جوانی میں انہوں نے بھی وفات پائی، یہ نگرام ضلع لکھنؤ کے باشندہ تھے، اور ایک علمی و مذہبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، تفصیل کے لیے دیکھیے معارف مارچ ۱۹۲۶ء ۳ یہ بہار کے کاغذی محلّہ کے باشندہ اور ندوہ کے فارغ التحصیل تھے، کچھ دنوں ندوہ کے کتب خانہ میں کام کرتے رہے، پھر وطن چلے گئے اور وہاں کے ایک مقامی اسکول میں ہیڈ مولوی ہو گئے اور چند سال کے بعد مرض دق میں مبتلا ہو کر وفات پائی، ان کو عربی ادب سے کافی ذوق تھا، رحمۃ اللہ تعالیٰ ۴ یہ مشہور محدث یمنی شیخ حسین صاحب عرب کے جو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی قدر دانی سے بھوپال میں رہ گئے تھے اور ہزاروں علما اور محدثین کے استاد تھے، پوتے تھے، ان کے والد شیخ محمد صاحب عرب ندوہ میں مدرس ادب تھے، اسی سلسلہ میں شیخ محمد خلیل صاحب نے ندوہ میں تعلیم پائی، تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس مقرر ہوئے، پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے استاد مقرر ہوئے، چند سال کے بعد مزاج کی ناسازی کے سبب سے مستعفی ہو کر بھوپال چلے گئے اور اس وقت ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء مجلس علمائے بھوپال کے رکن ہیں جو ریاست بھوپال کا ایک معزز سرکاری منصب ہے۔

بہر حال کام جس سرگرمی سے ہو رہا تھا، اس کے لحاظ سے ۲ر نومبر ۱۹۱۴ء تک مولانا اس قابل ہو گئے تھے کہ دو تین مہینہ کے بعد اپنے احباب خاص کو دار المصنّفین کے دیکھنے کے لیے مدعو کر سکیں، چنانچہ نواب علی حسن خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''میرا تو یہ حال ہے کہ میں نے اچھا وسیع قطعہ دار المصنفین اور دار التکمیل کے لیے لے لیا ہے اور جو قوت اور افادہ وہاں بیکار جا رہا تھا اس کو موزوں اور مناسب موقع پر صرف کروں گا۔''

دو تین مہینہ کے بعد آپ کو تکلیف دوں گا کہ آپ خود بھی دیکھ لیں۔'' (علی حسن خاں-۱۵)

لیکن اس کے سولہ ہی دن کے بعد مولانا نے داعی اجل کو لبیک کہا اور دل کی حسرت دل میں رہ گئی، تاہم مولانا نے دار المصنّفین کے متعلق جو یہ پیشین گوئی کی تھی کہ ''شاید وہی میرا مدفن بھی ہو'' (شروانی-۱۱۳) وہ پوری ہوئی، ان کی نیک نیتی سے ان کے بعد ہی دار المصنّفین قائم ہوا اور اب تک جس طرح چل رہا ہے اس کو ہر شخص بطور خود دیکھ سکتا ہے۔

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ذات نبوی ﷺ سے عقیدت استاذ مرحوم کو حضور انور ﷺ کی ذات مبارک سے بڑی شیفتگی تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ اس نام نامی کے ساتھ ان کی عقیدت کی کوئی حد و پایاں نہ تھی، یہاں تک کہ سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں بہ ظاہر اس حد سے بھی تجاوز کرتے ہیں، کہتے ہیں:

شیفتگانیم و پیمبر پرست[1] سجدہ اگر نیست زمین بوس ہست

بدءالاسلام انہوں نے علی گڑھ آ کر نئی طرز پر جب تصنیفات کا آغاز کیا تو یہ آغاز بھی ذات مبارک کے ذکر خیر ہی سے فرمایا اور بدءالاسلام کے نام سے عربی میں سیرۃ نبوی ﷺ پر ایک مختصر رسالہ لکھا جو علی گڑھ کالج کے نصاب میں داخل تھا۔

سیرت کا ابتدائی خیال اردو میں جب نام ورانِ اسلام کا سلسلہ چھیڑا تو بار بار ان کے اور دوسروں کے دل میں خیال آیا کہ ان نام وروں سے پہلے سب سے اول اس نام ور کا نام آنا چاہیے، جس کی نام وری نے ان سب کو نام ور بنایا ہے، اس لیے الفاروق والغزالی کے بعد ۲۸ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ مطابق ۵ جون ۱۹۰۳ء کو انہوں نے حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں اس کام کا آغاز کیا اور ۳ھ تک کے واقعات قلمبند کیے (یہ مسودہ اب تک دارالمصنفین کے کتب خانہ میں موجود ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس انداز سے وہ اس کو لکھ رہے تھے، وہ خود ان کو پسند نہیں آ رہا تھا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اس کو راز رکھا اور سارے مکتوبات میں کہیں ایک حرف بھی اس کے متعلق انہوں نے اپنے دوستوں میں سے کسی سے نہیں کہا، صرف ایک خط میں اس کا تذکرہ اس بنا پر آ گیا ہے کہ حیدرآباد میں مولوی حسین عطاء اللہ صاحب کے پاس بہت اچھا کتب خانہ تھا، اس کتاب کے لیے ان کو بعض کتابوں کی ضرورت پیش آئی تو ۲۷ رمئی ۱۹۰۳ء کو ان کو لکھا: ''میں نے جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانح عمری لکھنی شروع کی ہے، جو سعادت دارین کا ذریعہ ہے، اس کے لیے اس قسم کی کتابوں کی ضرورت ہے، میرا کتب خانہ تمام وطن میں ہے۔'' (مکاتیب اول طبع دوم ص ۳۴۶) لیکن اس پر بھی وہ غزوۂ خندق سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

---

[1] پرستیدن کے دو معنی ہیں، پوجنا اور خدمت کرنا، یہاں دوسرے معنی مراد ہیں، یعنی ہم خادم رسول ہیں مگر شاعرانہ ابہام، دوسرے غیر مقصود معنی کی طرف لے جا کر لطف پیدا کرتا ہے۔۱۲

اصل یہ ہے کہ ان کے ذہن میں اس زیر تجویز کتاب کا معیار بہت بلند تھا، اس سے کم کوئی چیز ان کے دل کو نہیں بھاتی تھی، فرماتے تھے کہ "سوانح عمری ایسی لکھنی چاہیے جس سے صاحب سوانح کا پایہ اونچا نظر آئے لیکن ہم مسلمانوں کے دلوں میں سرورِ کائنات ﷺ کی عقیدت کا پایہ اتنا اونچا ہے کہ کوئی کتاب (اس کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتی، اس لیے سیرت کی کوئی کتاب مشکل ہی سے معیار پر پوری اتر سکتی ہے" غالباً ان کے اسی خیال کا عکس ان کے اس قطعہ میں ہے، جس کو غالباً ۱۹۱۴ء میں نظم فرمایا تھا:

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حالِ سرورِ عالمؐ — دبیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامین لکھتے
صدا یہ بارگاہِ عالمِ قدوس سے آئی — کہ "ہے یہ اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے"

فرماتے ہیں تھے کہ نعت کے متعلق عرفی نے بالکل صحیح کہا ہے:

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحراست — آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودان — نعتِ شہِ کونین و مدیح کے و جم را

تالیف سیرت کا عزم اس مشکل کے باوجود سیرت کی ضرورت کے لیے مسلمانوں کی طرف سے بار بار رہ رہ کر آوازیں بلند ہوتی تھیں اور وہ ان کو سن کر چپ رہ جاتے تھے لیکن جدید تعلیم جس تیزی کے ساتھ پھیلتی جاتی تھی، مذہبی بے خبری بھی اسی قدر بڑھتی چلی جاتی تھی اور یہ صورتِ حال ایسی تھی جس کی روک تھام کی بڑی ضرورت تھی، اس ضرورت کے احساس کا آغاز ان کو سب سے پہلی دفعہ ۱۹۰۶ء میں ہوا، یہ وہ زمانہ ہے جب اس سے ایک سال پہلے ۱۹۰۵ء میں اوکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیوتھ نے محمد ﷺ کے نام سے سیرت میں ایک کتاب انگریزی میں لکھی اور بڑی محنت سے لکھی اور اس خصوصیت کے ساتھ لکھی کہ اس میں اکثر حوالے احادیث کی کتابوں کے تھے، یہ کتاب بڑی زہرناک تھی اور انگریزی تعلیم یافتہ اس کی تحقیق وتلاش کے نتیجوں سے نہایت متاثر ہو رہے تھے اور اس تاثر کا اظہار سب سے پہلے مولانا کے سامنے اسی نے کیا جو اس عہد میں جدید تعلیم کا سب سے مایۂ ناز فرزند گزرا ہے، یعنی محمد علی مرحوم نے، مرحوم اس زمانہ میں بڑودہ کی ریاست میں ایک عہدہ پر ممتاز تھے، گو وہ نئی تعلیم کے سب سے بہترین پیداوار تھے، تاہم ان کا دل ہمیشہ سے مسلمان تھا، ۱۰ / اگست ۱۹۱۸ء کو چھنڈواڑہ (سی پی) سے جہاں وہ نظر بند تھے، مجھے ایک خط میں لکھا جو ان کے مجموعۂ خطوط میں چھپ گیا ہے اور جو حسب ذیل ہے:

''۱۹۰۶ء میں مولانا واستاذ ناشبلی مرحوم بڑودہ میری دعوت پر تشریف لائے اور میرے ہی پاس مقیم تھے،اس زمانہ میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تو فرمایئے کہ سیرۃ نبوی ﷺ کا کیوں انتظام نہیں فرماتے، ہندوستان میں کون ہے جو کفار کے پے درپے مگر بیجا سے بیجا تر حملوں کا جواب دے گا، خصوصاً اپنے اوکسفورڈ کے .. استاد مارگولیوتھ کی طرف اشارہ تھا...... نہ معلوم اس سے قبل مولانا مرحوم کو کتنی بار اس مقدس کام کا خیال آیا ہوگا، مگر طرز گفتگو سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ میری تقریر نے اثر کیا اور آخری فیصلہ کم سے کم بڑودہ ہی میں رہ کر کیا گیا۔''(خطوط محمد علی مکتبہ جامعہ ص ۵۹)

بہر حال جدید تعلیم کی اس ضرورت کے ساتھ اس کے بعد ہی ارتداد وغیرہ کے جو ہنگامے شروع ہوئے اور اشاعت وحفاظت اسلام کی جو تدبیریں ان کے سامنے آتی رہیں، ان سب نے مل کر سیرت نبوی کی تالیف کے ارادہ کو اور زیادہ مستحکم کر دیا، چنانچہ ۱۹۱۲ء کے شروع میں ان کے ارادہ نے عزم کی صورت اختیار کر لی، چنانچہ محرم ۱۳۳۰ھ مطابق جنوری ۱۹۱۲ء میں انہوں نے اپنے اس عزم کا اعلان کر دیا، اسی اعلان میں جو اسی ماہ وسال کے الندوہ میں چھپا ہے، اس کو بھی واضح کر دیا ہے کہ ان کو اس ضرورت کا احساس کیوں ہوا، فرماتے ہیں ''سیرۃ نبوی ﷺ کی ضرورت اس لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ قوم میں جدید تعلیم وسعت سے پھیلتی جاتی ہے اور یہی جدید تعلیم یافتہ گروہ ایک دن قوم کی قسمت کا مالک ہوگا، یہ گروہ آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی اگر جاننا چاہتا ہے تو اردو میں کوئی مستند کتاب نہیں ملتی، اس لیے اس کو چار و ناچار انگریزی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، جن میں یا تعصب کی رنگ آمیزیاں ہیں، یا ناواقفیت کی وجہ سے ہر موقع پر غلطیاں ہیں...... میں ایک مدت سے ان باتوں کا احساس کر رہا تھا لیکن اس بنا پر قلم اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ آنحضرت ﷺ کے واقعات میں ایک حرف بھی صحت کے معیار سے ذرا اتر جائے، تو سخت جرم ہے...... قوم کی طرف سے ایک مدت تقاضا ہے کہ میں سب کام چھوڑ کر سیرت نبوی ﷺ کی تالیف میں مصروف ہو جاؤں، خود میں بھی اپنی پہلی رائے سے رجوع کر چکا ہوں اور اس شدید ضرورت کو تسلیم کرتا ہوں۔''(مقالات شبلی جلد ۸ ص ۳۲)

اب مصنف نے احادیث وسیر کا مطالعہ شروع کیا اور جیسے جیسے یہ مطالعہ بڑھتا گیا، نظر میں وسعت، دل میں تڑپ اور روح میں بالیدگی بڑھتی گئی، سیرت کے جو اوراق انہوں نے ۱۹۰۳ء میں لکھے تھے، ان کو ۱۹۱۳ء والے اوراق سے ملا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کتاب صرف دماغ سے

اور دوسری دل سے لکھی گئی ہے، نقش اول میں مورخ کے قلم کی گلکاری ہے اور نقش ثانی میں جو سراپا کھینچا گیا ہے، اس میں مورخ کے ساتھ محدث کی قلم کاری بھی شامل ہے، ہمارے دوست اور رفیق درس اور مولانا کے عزیز شاگرد مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی (ایم اے انسپکٹر مدارس عربیہ الہ آباد) نے الندوہ کے سلسلۂ جدید میں ''یادِ ایام'' کے نام سے جو مسلسل مضمون لکھا ہے، اسی میں اس موقع پر لکھتے ہیں: ''علی گڑھ سے چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا، یہ وہ زمانہ ہے کہ ندوہ میں اسٹرائیک[۱] ہو چکی ہے، مولویوں نے قبضہ کر لیا ہے، ایک آنکھ میں نزول ماء شروع ہو گیا ہے، اسٹرائیک کا قضیہ سنتا ہوں قلق ہوتا ہے، ان کی معذوری پیش نظر ہو جاتی ہے، اب وقت اس قسم کے ہیجان برداشت کرنے کا نہیں ہے، عقیدت مند شاگرد مشورہ یکسوئی کا دیتا ہے اور یہ عرض کرتا ہے کہ اس وقت تک آپ نے جو کچھ کیا اگرچہ وہ دینی خدمت ایک حد تک تھی، مگر اب مخلصین لہ الدین کا وقت ہے، الامر بالخواتیم، استاذ علامہ بے چین ہو جاتے ہیں، استاد شاگرد آبدیدہ ہو جاتے ہیں، استاذ فرط محبت سے شاگرد کو لپٹا لیتا ہے اور پھر دو باتیں پیش نظر ہو جاتی ہیں، علوم القرآن اور سیرۃ نبوی ﷺ شاگرد عرض کرتا ہے کہ پہلے میں اشکال زیادہ ہے، یہ کام ساری عمر کا ہونا چاہیے تھا، پھر ہندوستان میں اس کا مخاطب کون ہے، اردو میں اس کو دلچسپ بنانا ایک اور محنت چاہتا ہے، جو آپ کے سن و سال وقویٰ کے مناسب حال نہیں، آخر میں سیرۃ ہی پر رائے مختتم ہو جاتی ہے، دوسری مرتبہ حاضر ہوا تو مسودۂ اعلان یا اپیل تیار تھا، مجھے دکھایا، پھر طباعت کو بھیج دیا، کچھ خدمت مواد کے متعلق سپرد ہو جاتی ہے، جس کی تعمیل بمشورہ ڈاکٹر ہارویز کر کے بھیج دی گئی، مگر یہ عرض کیا کہ کتاب ہر قسم کے مباحثوں سے الگ، محض صحیح واقعات اور عمدہ ترتیب پر مبنی ہونی چاہیے، مولوی کچھ سمجھیں، انما الاعمال بالنیات یہ میرا ایمان ہے کہ خلوص کی کمی نہ تھی علم وفہم میں کیا کسر تھی، قبولیت کیوں حاصل نہ ہوتی، عشق رسول کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔''

مجلس تالیف سیرت بہر حال جیسا کہ ابھی گذرا، ۱۹۱۲ء کی شروع تاریخیں تھیں کہ ان کے ارادہ نے عزم کی صورت اختیار کر لی، ۲۰ جنوری ۱۹۱۲ء کو مولانا شروانی کو لکھا ''سیرۃ نبوی ﷺ کا شروع سال سے عزم ہے لیکن پچاس ہزار سرمایہ کی ضرورت ہے، کیا قوم سے یہ امید ہو سکتی ہے۔'' (شروانی-۹۶) مگر اس عزم

---

[۱] مضمون نگار کو واقعہ کی صحیح تاریخ میں کچھ تشابہ ہو گیا ہے، ندوہ کی اسٹرائک کا واقعہ اس کے دو سال بعد مارچ ۱۹۱۴ء میں پیش آیا، اور سیرۃ کی تالیف کا اعلان جنوری ۱۹۱۲ء میں ہوا ہے، بہر حال اختلافات شروع ہو چکے تھے، اور مولانا بددل ہو رہے تھے، جس کا آخر نتیجہ اسٹرائک تھا۔'' ''س''

نے چند ہی روز میں یہ شدت اختیار کی کہ محرم ۱۳۳۰ھ مطابق جنوری ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں سیرۃ نبوی ﷺ کی تالیف کا برملا اعلان کر دیا اور قوم سے اس کے ماہانہ مصارف کے لیے ڈھائی سو ماہوار اور خرید کتب کے لیے کچھ اور نقد روپے کی درخواست کی اور تجویز پیش کی مجلس تالیف سیرۃِ نبوی ﷺ کے نام سے ایک مجلس قائم کی جائے جس میں وہ ارکان شامل ہوں جو مربی بن کر کم از کم ایک ہزار یکمشت یا دس روپے ماہوار دیں یا جو عام ارکان میں داخل ہو کر ایک روپیہ ماہوار عنایت کریں، یا معین بنیں اور نایاب و قلمی کتابیں بہم پہنچائیں یا اور کسی مفید طریقہ سے مدد دیں تا کہ مصنفین یورپ نے جو کتابیں سیرت میں لکھی ہیں، ان کو یک جا کیا جا سکے اور کچھ مترجم ہوں جو ان کو پڑھ کر ان کے اعتراضات کا خلاصہ کر سکیں اور کچھ علما ہوں جو روایات کی تلاش و تنقید اور چھان بین کا کام کریں، کچھ مسودہ نویس ہوں جو مسودوں کو صاف کریں۔

سرکار عالیہ بھوپال کی امداد اس اعلان کا شایع ہونا تھا کہ ہر طرف سے مسلمانوں نے اس کو لبیک کہا اور فال نیک یہ کہ سب سے پہلے ایک مسلمان خاتون بنت نصیر الدین حیدر تیموریہ (حیدر آباد دکن) کا خط اشاعت کے قابل ٹھہرا، جس کو مولانا نے اپریل ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں شایع کیا، یہ قدرت الٰہی کی طرف سے اس بات کا اشارہ تھا کہ اس کام کے لیے دانہ دانہ چننے اور کوڑی کوڑی بٹورنے کی ضرورت نہ ہوگی، بلکہ کوئی مخدومۂ جہان خود آگے بڑھ کر روپیوں کی تھیلی سامنے رکھ دے گی، چنانچہ یہی ہوا، منشی محمد امین صاحب زبیری نے جو ہز ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال کے لٹریری سکریٹری تھے، سرکار سے عرض کیا کہ ”حضور! آج کونین کی دولت لٹ رہی ہے، آپ اس کو بڑھ کر کیوں اٹھا نہیں لیتیں، یعنی ایک عاشق رسول مصنف گلے میں جھولی ڈال کر سیرۃ نبوی ﷺ کی تصنیف کے لیے قوم سے بھیک مانگنے نکلا ہے، یہ عزت حضور کیوں نہیں حاصل کر لیتیں اور اس فقیر کی جھولی میں ڈھائی سو ماہوار ڈال دیتیں کہ وہ دل جمعی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو جائے، یہ بات بیگم صاحبہ کے دل میں اتر گئی، انہوں نے اس حصول سعادت کی رضامندی ظاہر کی، منشی صاحب نے مولانا کو مطلع کیا اور اپریل ۱۹۱۲ء کے شروع میں ان سے باقاعدہ درخواست منگوائی گئی، جو ۱۴؍ اپریل ۱۹۱۲ء کو دو برس کے لیے دو سو ماہوار کے حساب سے منظور ہوئی، مولانا نے مئی ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں بڑی مسرت سے اس کا اظہار کیا، مجلس تالیف سیرت نبوی ﷺ کے لیے چندوں کے وصول کرنے کی جن مختلف تدابیر کا اعلان کیا گیا تھا، ایک زبیدۂ وقت کی فیاضی نے ان سب کو منسوخ کر دیا، عام مسلمانوں کو سیرت نبوی ﷺ کے ساتھ جس شدت سے شغف

اور اعتنا ہے، اس کا اثر یہ ہوا کہ اعلان کے بعد مجالس قومی نے جدید تعلیم کے افراد عالیہ نے، قدیم تعلیم یافتہ اشخاص نے، رؤسائے ملک نے، عام مسلمانوں نے اور نہ صرف جنس رجال نے بلکہ جنس اناث نے بھی نہایت جوش کے ساتھ مالی، علمی اور عام امداد کے لیے آمادگی ظاہر کی، بعض لوگوں نے بلا طلب چندے بھی بھیجنا شروع کر دیے لیکن عدم ضرورت کی بنا پر واپس کیے گئے، بعضوں نے اصراراً بھیجے، لیکن پھر واپس کیے گئے، یہ دلائل ہیں ذاتِ رسالت مآب ﷺ کے ساتھ اس غیر فانی عقیدت مندی کے جس کو مسلمانوں کے سینوں سے نہ تعلیم جدید محو کر سکتی ہے اور نہ مغربی بے اعتنائی کے قومی اثرات اس کو مٹا سکتے ہیں۔"

کتابوں کی خریداری کے لیے دو ہزار روپیے نواب زادہ حمید اللہ خاں موجودہ اعلیٰ حضرت فرماں روائے بھوپال کی طرف سے منظور ہوئے۔

مصارف کی طرف سے مطمئن ہو کر مولانا نے سیرۃ نبوی ﷺ کا دفتر قائم کیا، ایک عربی کا مددگار دو انگریزی کے مترجم رکھے، عربی کے مددگار کے عہدہ پر انہوں نے اپنی شفقت سے خاکسار کو منتخب فرمایا اور صیغۂ تعلیم سے ہٹا کر سیرت کے اسٹاف میں لے لیا اور یہ خدمت سپرد ہوئی کہ صحیح بخاری سے سیرۃ کے واقعات کو یک جا کروں اور انگریزی مترجموں میں سے ایک کو پروفیسر مارگولیوس کی کتاب محمد اور دوسرے کو سرِ ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد ترجمہ کے لیے دی گئی لیکن خود مولانا اشاعت اسلام وغیرہ کی مشغولیتوں کی وجہ سے کام جلد شروع نہ کر سکے، ۱۷؍ اپریل ۱۹۱۲ء کو منشی محمد امین صاحب کو لکھتے ہیں: "ریاست کے عطیہ کی درخواست تو کی لیکن اب قبول کرنے میں ایک بڑا بار محسوس کرتا ہوں۔

میں آج کان پور روانہ ہوتا ہوں، نومسلموں پر آریہ جو جال ڈال رہے ہیں، وہ سخت خطرناک درجہ تک پہنچ گیا ہے، اس غرض سے تمام اضلاع میں دفاعی انجمنیں اور دیہات میں مکاتب قائم کرنا مقصود ہے لیکن چوں کہ گرمی سخت ہو رہی ہے، اس لیے یہ دورہ مختصر ہوگا، اسی طرف سے بھوپال آؤں گا، پھر بنگلور یا بمبئی جاؤں گا، کتابیں ساتھ نہیں جا سکتیں، نہ اسٹاف ساتھ جا سکتا ہے، اس لیے سیرۃ نبوی ﷺ کا کام باضابطہ بارش سے شروع ہوگا، یہ بھی خیال ہے کہ یہ کام کسی طرح دو برس میں انجام نہیں پا سکتا، اس پر مستزاد یہ ہے کہ ایک آنکھ میں پانی اتر رہا ہے، اس لیے جلدی بھی کرتا ہوں کہ کچھ کر لوں ورنہ جس قدر میں کر سکتا ہوں اتنا کرنے والا بھی نظر نہیں آتا، کتابوں کی فہرست تیار ہو رہی ہے، بہت سی کتابیں تو خود ندوہ میں موجود ہیں، زائد جو مطلوب ہیں، ان کو منگوانا ہے، اشاعت کی فکر نہ کیجیے، میں خود کر سکتا ہوں۔" (۷)

لکھنؤ میں رہ کر ان کو سکون نہیں ملتا تھا، اس لیے سیرۃ کی تالیف کی خاطر بمبئی کے کسی ایک گوشہ میں بیٹھ کر عزلت گزیں ہونا چاہا، منشی صاحب کو ۱۰؍مئی ۱۹۱۲ء کو لکھا ''میرا ارادہ ہے کہ مستقل بمبئی میں قیام کر کے سیرت کو ختم کر دوں، یہاں روز ایک قصہ رہتا ہے، اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا، اسٹاف ساتھ لے جاؤں گا، سید سلیمان ساتھ رہیں گے، خوشنویس اور انگریزی مترجم وغیرہ بھی۔'' (۹)

مئی کے آخر میں بمبئی جاتے ہوئے مولانا بھوپال اترے اور حضور عالیہ نے شرف ملاقات بخشا، مولوی عبدالرزاق صاحب مصنف البرامکہ کا جوان دنوں بھوپال میں تھے، بیان ہے کہ مولانا نے اسی موقع پر اپنا یہ قطعہ پڑھ کر سنایا:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی | مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتمؐ | خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سرکارِ عالیہ اس کو سن کر بے حد متاثر ہوئیں اور مصنف کی پیشین گوئی بھی پوری ہوئی، سرکار بھوپال سے سیرت کی امداد کا اجرا صرف دو برس کے لیے ہوا تھا، یہ زمانہ ظاہر ہے کہ ایک ایسی اہم کتاب کے لیے بہت ہی کم تھا، چنانچہ ۲؍نومبر ۱۹۱۲ء کو منشی محمد امین صاحب کو لکھا ''میں جانتا ہوں کہ کام دو برس میں نہ ہوگا، یہ بھی احتمال ہے کہ سرکارِ بھوپال رقم بند کر دیں لیکن اب روپے کا نہیں میری جان کا معاملہ ہے، ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا اور اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی۔ (۱۲)

دو برس تمام ہوتے ہوتے سرکارِ عالیہ نے ۲۳؍دسمبر ۱۹۱۳ء کو اپنی امداد کی مدت تکمیل بڑھا دی، اس سے خوش ہو کر مولانا نے قطعہ کہا، جس کو ۱۰؍مئی ۱۹۱۴ء کو منشی محمد امین صاحب کے خط میں لکھ کر بھوپال بھیجا:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت | کہ ابرِ فیض سلطانِ جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی | تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل | کہ جس میں اک فقیرِ بے نوا ہے ایک سلطان ہے

مولانا کا خیال تھا کہ سرکار عالیہ کی یہ امداد اس سلسلہ کی دوسری تالیفات کے لیے ہمیشہ جاری رہے تو بڑے کام نکلیں، چنانچہ ۳۰؍جنوری ۱۹۱۴ء کو منشی صاحب موصوف کو لکھا: ''سیرت کی رقم بھی مستقل

ہو جاتی تو بہت اچھا تھا، اس مد کی تصنیف کا مستقل سلسلہ قائم رہتا، کانوں میں بھنک تو ڈال دیجئے، یہ وسیع سلسلہ ہے، مثلاً سیرۃ صحابہ، سیرۃ ازواج پیغمبر علیہ السلام وغیرہ وغیرہ"۔

عجیب بات ہے کہ مولانا اور سرکار عالیہ کی وفات کے بعد اعلیٰ حضرت نواب حمید اللہ خاں کے عہد میں مولانا کی یہ آرزو تکمیل کو پہنچی، سرکاری امداد مستقل ہوگئی اور سیر الصحابہ وغیرہ بھی دس بارہ جلدوں میں لکھ کر پوری کر دی گئی۔

تالیف سیرۃ کا آغاز سیرۃ کی تالیف کا آغاز باب کعبہ یعنی بمبئی میں بیٹھ کر کیا گیا، یعنی وہیں قلم نے سیرۃ کی پہلی سطریں لکھیں، آغاز کا زمانہ بھی معلوم ہے، ۱۶؍ جون ۱۹۱۲ء کو لکھتے ہیں: "ابھی تک میں نے لائف کا کچھ کام نہیں کیا، طبیعت مطمئن نہیں، کل اب کام شروع کروں گا......"

اگر وہاں کتب خانہ میں تفسیر فتح البیان مع تفسیر ابن کثیر موجود ہو تو ضرور لیتے آیئے گا، یہاں نہیں ہے اور میں ساتھ نہیں لایا، سید سلیمان آ گئے۔" (امین-۱۰)

مولانا نے مجھے اس لیے بلایا کہ میں انہیں روایات کی تلاش اور رواۃ کے ناموں کی تحقیق میں مدد دوں، یہ بھی ذکر کے قابل ہے کہ بمبئی میں سیرت کے آغاز کا مقدس کام کس مکان میں ہوا، کھڑا پارسی کے پاس "پالن جی" ہوٹل نامی ایک مکان تھا، اس کے اوپر کے ایک کمرہ میں مولانا مقیم تھے اور خاکسار بھی اسی عمارت کے دوسرے گوشہ کے ایک دوسرے بالائی کمرہ میں ٹھہرایا گیا تھا، اس سڑک کی خصوصیت یہ تھی کہ ادھر سے ٹریم نہیں گزرتی تھی اور مکان بھی سڑک سے فاصلہ پر تھا، اس لیے بمبئی کے عام شور وغل سے یہ محفوظ تھا اور یہی اس کے انتخاب کی وجہ ترجیح تھی۔

مولانا نے بڑے روحانی جوش و سرمستی کے ساتھ کتاب کا آغاز کیا، ابھی چند ہی صفحے لکھنے پائے تھے کہ سفر ڈھاکہ کی ضرورت پیش آ گئی، سفر کا باعث ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ میں شرکت تھی، مگر اس کا ثانوی مقصود کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ سے فائدہ اٹھانا تھا، ۲۱؍ جولائی ۱۹۱۲ء کو شروانی صاحب کو لکھتے ہیں: "سیرت کے لیے ایشیاٹک سوسائٹی میں بعض کتابیں بھی دیکھنی ہیں، انگریزی کتابوں سے جس قدر اقتباسات ہو رہے ہیں، ان سے کذب و افترا کا عجیب منظر سامنے آ جاتا ہے، مرگولیس پروفیسر آکسفورڈ سب سے بڑا عربی عالم ہے، اس کی لائف آف محمد دیکھنے کے قابل ہے، لکھتا ہے کہ عبد المطلب، مطلب کے غلام تھے، کعبہ آنحضرت ﷺ سے صرف ۱۰۰ برس پہلے کی عمارت

تھی، وغیرہ وغیرہ'' کام ہو رہا ہے، سیرت کی ماخذ اصلی صرف تین کتابیں ہیں، ابن ہشام، ابن سعد، طبری، ان کے تمام رواۃ کا استقصا کر کے ان کے اسماء الرجال، تہذیب وغیرہ سے مرتب کرا رہا ہوں کہ روایتوں کے انتقاد میں آسانی ہو، سید سلیمان یہ کام کر رہے ہیں اور وہ یہیں ہیں، خود الگ سیرت میں مشغول ہوں، انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی ہو رہا ہے۔'' (شروانی-۱۰۲)

وہ اگست کے شروع ہفتہ میں کلکتہ ہو کر ڈھاکہ گئے (عبدالقادر-۲۵) اور پھر اسی طرف سے کلکتہ میں کتابیں دیکھ کر بمبئی واپس آ گئے، اس وقت تک انگریزی میں سیرت کی بہت سی کتابوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا، اگرچہ لائق گریجویٹ ان میں سے بعض اہم کتابوں کا ترجمہ کر رہے تھے، پھر بھی ان ساری کتابوں کے ترجمہ کے لیے بڑی محنت اور بڑا سرمایہ درکار تھا، اس لیے یہ تجویز کیا کہ اپنے دوستوں میں سے ان اصحاب کو جو انگریزی جانتے ہیں، ایک ایک دو دو کتابیں بانٹ دیں اور ان سے خواہش کریں کہ وہ ان کو پڑھ کر قابل اعتراض مقامات پر نشان لگا دیں، چنانچہ اسی تجویز کے مطابق ۱۴ اگست ۱۹۱۲ء کو ان اصحاب کے نام خطوط جاری کیے، جن میں سے مولانا شروانی اور شیخ عبدالقادر صاحب کے نام خطوط مکاتیب میں درج ہیں (شروانی-۱۰۲، عبدالقادر-۱۸) جن صاحبوں نے اس خدمت کو قبول کیا، ان کے پاس کتابیں بھیج دیں اور انہوں نے ان کو دیکھ کر واپس کیا۔

ستمبر ۱۹۱۲ء تک مولانا بمبئی میں رہے، اس اثنا میں ولادت باسعادت سے لے کر خانۂ کعبہ کی تعمیر کے باب تک لکھا جا چکا تھا کہ جنازۂ سفر نے ہندوستان کا رخ کیا، یعنی مولانا وقف وغیرہ کے کاموں کے سبب سے لکھنؤ واپس چلے آئے، تاہم اس وقت تک کتاب کے ۱۰۰ صفحے ہو چکے تھے[1]، ۲۰ نومبر ۱۹۱۲ء تک ان پر نظر ثانی ہوئی اور مضامین میں حذف و اضافہ ہوا، اسی تاریخ میں لکھتے ہیں ''سیرۃ کے سو ۱۰۰ صفحے ہو چکے تھے، لیکن نظر ثانی میں پھر کچھ کا کچھ ہو گیا، یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے، ان کے ایک ایک حرف کے لیے سیکڑوں اوراق الٹنے پڑتے ہیں، یہ کمبخت لکھتے تو جھوٹ ہیں لیکن بے پتہ نہیں لکھتے، یہاں ہمارے سیرت نگاروں نے خود بہت بے احتیاطیاں کیں۔'' (امین-۱۲)

فروری ۱۹۱۳ء میں وہ بدر تک پہنچے تھے (عبدالباری-۲۱) لیکن اپنی ناسازی طبع کے سبب سے ان کے دل میں یہ خیال کانٹا سا کھٹکتا تھا کہ وہ اس کی تکمیل اس حالت میں کر سکیں گے یا نہیں، یکم مارچ ۱۹۱۳ء کو اپنے ایک عزیز شاگرد کو لکھتے ہیں: ''سیرۃ چل رہی ہے، اب نظر آتا ہے کہ واقعی ایک ایسی تصنیف کی

---

[1] جلد اول ص ۳۳، (طبع اول) تک۔

سخت ضرورت تھی، یہ دوسری بات ہے کہ میں پورا کرسکوں گا یا نہیں۔ (عبدالباری-۳)

بایں ہمہ ۳۱ / مارچ ۱۹۱۳ء کو سیرۃ کا سادہ مسودہ فتح مکہ و حنین تک پہنچ چکا تھا۔ (عبدالباری-۴)

پہلا حصہ | اس زمانہ میں ندوہ کے کاموں میں بہت سے الجھاوے پڑ گئے، جن میں سب سے اہم مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی کا مسئلہ تھا، جس پر اخباروں میں بڑی بحثیں رہیں، اس لیے جون ۱۹۱۳ء میں وہ تنہائی اور دماغی سکون کی خاطر پھر بمبئی چلے گئے، اس سفر میں میرے بہ جائے مددگار عربی کی حیثیت سے مولوی عبدالسلام صاحب ندوی ان کے ساتھ تھے، اس دفعہ وہ نیونا گپاڑہ روڈ بائی کلہ اکبر بلڈنگ میں ایک مکان کرایہ پر لے کر رہے، اور سیرت جلد اول کی تالیف میں ہمہ تن مصروف ہو گئے، بلکہ دارالعلوم کی معتمدی سے بھی استعفا دے دیا تا کہ دربار رسول ﷺ کے لیے دماغ کو پوری یکسوئی حاصل ہو[1]، ۹ / جولائی ۱۹۱۳ء کو شروانی صاحب کو لکھا "پہلی جلد کا نصف حصہ گویا تیار ہے، ہر ہفتہ میں طبیعت دو تین روز ناساز ہو جاتی ہے، اس لیے ناغہ سے ہرج ہو جاتا ہے، بڑے بڑے معرکے طے ہوئے، اس فن کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی ضرورت تھی، مجھ کو خود خیال نہ تھا کہ ایسی کامیابی ہوگی، لیکن قدر کون کرے گا، کوئی شخص پہلے طبری و ابن اثیر کو چھان چکا ہو تب اندازہ کر سکتا ہے۔ (شروانی-۱۰۸)

اس پر بھی کام اس محنت سے کیا کہ ۳ / اگست ۱۹۱۳ء کو اندازہ تھا کہ دو تین مہینہ میں سیرت کا پہلا حصہ تمام ہو کر مطبع چلا جائے گا (شروانی-۱۱۰) اسی لیے وہ بمبئی سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے، اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام نے ان سے کلکتہ آنے کی فرمائش کی تو ۲۰ اگست ۱۹۱۳ء کو انہیں لکھا: "کلکتہ آنے کو سو سو بار جی چاہتا ہے، لیکن کیا کروں، سیرت کے لیے کتابوں کی کئی الماریاں ساتھ رکھنی پڑتی ہیں، ان کو کہاں کہاں لیے پھروں، یہاں سورتی[2] سے استعارۃً بھی کتابیں مل جاتی ہیں، اس پر بھی بہت سی خریدنی پڑیں، ایک کافی ذخیرہ ساتھ آیا تھا، پھر بھی ہر قدم پر ضرورت پیش آتی ہے، چوں کہ بہت کچھ کام ہو بھی چکا ہے، اس لیے اب ہر منٹ گراں معلوم ہوتا ہے، اور جی چاہتا ہے کہ جلد سے جلد پریس میں جا سکے۔" (ابوالکلام-۳۶)

اس بنا پر اس دفعہ بمبئی میں چار پانچ مہینے جم کر اکتوبر ۱۹۱۳ء کے شروع میں جس طرح بنا سیرت کے پہلے حصہ کا مسودہ قریب قریب پورا کر لیا اور ادھر سے یک گونہ اطمینان پا کر نواب عمادالملک

---

[1] ۲۱ / جولائی ۱۹۱۳ء کو سید عبدالحکیم صاحب دسنوی کو لکھتے ہیں: "بہر حال اب تو ایک دو برس...... نجات رہے گی، اور دربار رسالت کا آستانہ ہوگا۔ (۳)۔

[2] ابنائے غلام رسول سورتی، تاجرین کتب بمبئی۔

کی خواہش حیدرآباد تشریف لے گئے، وہاں پہنچ کر ۱۳؍اکتوبر ۱۹۱۳ء کو منشی محمد امین صاحب کو لکھا: ''کتاب کا پہلا حصہ جس میں سادہ حالات زندگی ہیں، قریباً تیار ہوگیا ہے، اگرچہ اس میں بھی نہایت کدوکاوش اور تمام کتب حدیث و رجال کی چھان بین کرنی پڑی، تاہم اصلی مرحلے آگئے ہیں، کتاب پانچ جلدوں میں ہوگئی، جو حصہ گویا تیار ہے وہ قریباً پانچ سو صفحوں میں ہے، پوری کتاب کو اس کا چوگنا کر لیجیے۔ (امین-۱۷)

حیدرآباد میں ان کو ایک نہایت پرفضا مکان مل گیا، اس لیے وہاں کئی مہینے رہے۔ (ابوالکلام-۳۹) یہاں طبیعت بھی فی الجملہ صحیح رہی اور ارادہ فرمایا کہ جلد اول تمام کر کے یہاں سے اٹھیں، وہاں کا کتب خانہ بھی ان کے اس قیام میں مُعین رہا۔ (امین) تاہم نومبر ۱۹۱۳ء تک سیرت کا پہلا دیباچہ سپرد قلم نہیں فرمایا، ہنوز اس کا خاکہ ان کے ذہن ہی میں تھا۔ (امین-۸) ۱۷؍نومبر ۱۹۱۳ء تک ان کی یہ خواہش تھی کہ وہیں چار پانچ مہینے رہ کر پہلی جلد تمام کر کے اٹھیں، (عبدالماجد-۴) اسی لیے مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی سے خواہش کی کہ وہ چند روز کے لیے سیرۃ کے انگریزی دفتر کی نگرانی قبول کریں تو پہلی جلد نکل جائے، کیوں کہ معلوم نہیں کہ یورپ کے بے شمار ذخیرہ میں کیا کیا چیزیں لینے کے قابل ہیں اور عام مترجم یہ نہیں بتا سکتے (عبدالماجد-۴) مولوی صاحب نے اس عہدہ کو قبول فرمایا اور کئی مہینے تک لکھنؤ میں بیٹھ کر یہ کام انجام دیتے رہے۔

دسمبر کے شروع میں ہم لوگوں کے اصرار سے مولانا حیدرآباد سے لکھنؤ آئے اور چاہا کہ یہاں بھی سکون نصیب ہو کہ کم از کم پہلی جلد اتمام کو پہنچے (۱۳ جنوری ۱۹۱۴ء بہ نام شروانی صاحب-۱۱۱) لیکن ان کے استعفے کی وجہ سے طلبہ اور مدرسین میں ایک ہیجان برپا تھا، جس کا نتیجہ طلبہ کی اسٹرائیک میں جا کر نکلا، اور کئی مہینے اس کے ادھیڑ بن میں گزر گئے، آخر مئی ۱۹۱۴ء میں اصلاح ندوہ کا جلسہ دہلی میں ہوا اور اصلاح ندوہ کی بہت سی تجویزیں منظور ہوئیں اور جون ۱۹۱۴ء کے شروع تک وہ دہلی میں مصروف کار رہے، مگر ان جھمیلوں میں بھی جن میں ہر روز ان کی تشویش خاطر کی ایک نئی صورت پیش آتی رہتی تھی، وہ سیرت سے غافل نہ رہے، جیوں ہی ذرا ان کو چھٹی ملی، وہ جون کے وسط میں بمبئی روانہ ہوگئے، بھائی کلہ اکبر بلڈنگ میں قیام ہوا اور سکون کے ساتھ پہلی جلد کو ہر جہت سے مکمل کرنے لگے اور اب کتاب کی پہلی جلد اس حیثیت کو پہنچ گئی تھی کہ اس کی چھپائی کے مشورے بھی ہونے لگے، اسی درمیان میں سیرت کا وہ مقدمہ جو فن مغازی و سیر کی تاریخ اور اسلامی فن روایت کے اصول پر ہے، مرتب فرمایا۔

ایک فتنہ مولانا ابوالکلام کی تحریک تھی کہ سیرت خوش نما ٹائپ میں چھپے، مولانا نے نمونہ کے طور پر چھاپنے کے لیے اس مقدمہ کو ان کے پاس الہلال پریس کلکتہ میں بھیج دیا، مولانا ابوالکلام نے اس مقدمہ کو الہلال میں بھی چھاپ دیا تا کہ اہل نظر دیکھ سکیں کہ کتاب کس تحقیق و تدقیق سے لکھی گئی ہے لیکن بعض مخالفین جن کو دل سے یہ بات پسند نہ تھی کہ سرکارِ عالیہ کی سرپرستی میں جو سیرۃ نبوی ﷺ لکھی جائے، وہ مولانا شبلی کے قلم سے ہو، اس کے منتظر تھے، کہ سیرۃ کا کوئی صفحہ منظر عام پر آئے اور وہ اعتراضوں کی بوچھار کریں، یہ مقدمہ نکلا تو مولوی عبدالشکور صاحب اڈیٹر ''النجم'' نے اپنے نقطۂ نظر سے اس مقدمہ پر نہایت سخت تنقید لکھی، مخالفین نے جن میں دیوبند کے کچھ لوگ بھی تھے، اس تنقید کو دستاویز بنالیا، اس کو چھاپ کر ہر جگہ تقسیم کیا اور بعض ذرائع سے وہ سرکارِ عالیہ تک پہنچائی گئی، انہوں نے مولانا سے حقیقت حال دریافت فرمائی اور اس کے جواب لکھنے کی فرمائش کی، بلکہ خود مولانا کو بھوپال آنے کا اشارہ فرمایا، مولانا نے منشی محمد امین صاحب کو لکھا کہ ''نہایت مہمل اور معاندانہ اعتراضات ہیں'' جواب کے متعلق لکھا کہ وہ لکھ دیا جائے گا لیکن میرے نام سے نہیں چھپے گا، غرض اظہارِ حقیقت ہے، نہ اظہارِ نام، وہ یا تو رسالہ کی صورت میں چھپے یا الہلال میں بھیج دیا جائے[1]'' آخر میں لکھا ''میں بارش کے قبل نہیں آ سکتا، بہت ضرورت ہو تو ایک دو دن کے لیے آ جاؤں لیکن اگر اسی درجہ کے لوگوں کے لکھنے پر میری دارو گیر ہوتی رہے گی تو میں سمجھتا ہوں کہ اعانت سے مستعفی ہو جاؤں۔'' (امین-۲۶)

سرکاری مراسلہ کے جواب میں لکھا کہ: ''سرکارِ عالیہ کسی مستند عالم کو تجویز فرمائیں تا کہ مسودہ اس کے پاس بھیج دیا جائے'' اور اپنی طرف سے شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کا نام اس کام کے لیے تجویز فرمایا، چنانچہ مولانا نے مولانا محمود الحسن صاحب کی خدمت میں مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کے ذریعہ سے اپنی خواہش پیش کی اور ساتھ ہی اپنا مسودہ بھی مولانا سندھی کے پاس بھیج دیا کہ وہ ان کو لے کر مولانا محمود حسن صاحب کی خدمت میں جائیں لیکن اس تجویز کا جو حشر ہوا، وہ ان ہی کی زبان سے سنئے، آج ان کا (مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کا) خط آیا کہ وہ گئے لیکن دیوبند پارٹی کو بھوپال سے اطلاع مل چکی تھی، ان لوگوں نے مولوی محمود حسن صاحب کو باز رکھا کہ وہ مسودہ کا سرے سے دیکھنا ہی منظور نہ کریں، دیوبند کے خیالات سے مولوی محمود حسن صاحب فی نفسہٖ الگ ہیں، چنانچہ

[1] سیرۃ النبی ﷺ جلد اول کے صفحہ ۵ پر جو بڑا حاشیہ ہے وہ اسی جواب کا ایک حصہ ہے۔

مولوی عبید اللہ صاحب سندھی کو ان لوگوں نے کافر بنا دیا لیکن مولوی محمود حسن صاحب کے تعلقات اب تک ان سے وہی ہیں، بہر حال اب غور کرنا چاہیے کہ کیا کیا جائے، چوں کہ مولویوں نے ایک جتھا بنا لیا ہے، اس لیے سر دست اور کوئی مولوی مسودہ دیکھنے کی ذمہ داری اپنے سر نہ لے گا، ورنہ سمجھے گا کہ برادری سے خارج ہونا پڑے گا۔

اب اگر معاملہ اس پر موقوف ہے تو مجھ کو وظیفہ بھوپال سے خود دست بردار ہو جانا چاہیے، اخبارات میں تو یہ پہلے ہی شایع ہو چکا ہے کوئی نئی بات نہیں، میں بھی کشمکش سے نجات پا جاؤں گا اور کتاب کو مطبع میں بھیج دوں گا۔

میں جانتا ہوں کہ سرکار کو بھی مولویوں کے بدنام کرنے کا لحاظ ہوگا، اور ہونا چاہیے، اب اگر سرکار چاہیں تو یا تو سرے سے اس رقم کو بند کر دیں یا دار المصنفین کی طرف منتقل کر دیں، یا جو ان کی مرضی ہو، مجھ کو ہر حال میں ان کی رضا مندی منظور ہے، یہ معلوم ہے کہ میرا کام رُک نہیں سکتا، میں خود مصارف کا متکفل ہو سکتا ہوں، اس کے علاوہ جس ریاست سے خواہش کروں اعانت کے لیے تیار ہوگی، جواب جلد عنایت ہو، ورنہ اسٹاف کا خرچ ابھی سے کم کر دینا ہوگا۔'' (امین-۲۹)

فتنہ کی ناکامی چنانچہ اس کارروائی سے جو بالکل صاحب تھی، سرکار عالیہ نے سمجھ لیا کہ یہ چند مولویوں کی محض معاندانہ باتیں ہیں، منشی محمد امین صاحب نے اس کی اطلاع مولانا کو دی، مولانا نے اس کے جواب میں ۲۹؍ جولائی ۱۹۱۴ء کو لکھا: ''آپ کا خط پہنچا، اطمینان ہوا، میں جس تحقیق و تدقیق سے سیرت لکھ رہا ہوں، ناممکن تھا کہ مولوی محمود حسن صاحب اس کو دیکھتے اور تحسین نہ کرتے لیکن مخالفوں نے ان کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ سرے سے دیکھنے ہی سے انکار کر دیں، البتہ مولوی عبید اللہ صاحب سندھی مسودہ دیکھ رہے ہیں، ان کی رائے آ جائے گی تو بھیج دوں گا، مولوی عبد اللہ صاحب ٹونکی پر اگر اطمینان ہو، تو ان کے پاس بھیج دوں یا جو مصلحت ہو، یا یہ صورت ہے کہ سر دست اس قصہ ہی کو خاموش چھوڑ دیا جائے۔'' (۳۰)

اس پریشان خاطری کے باوجود سیرت کا کام بدستور جاری تھا، ۱۶؍ جولائی ۱۹۱۴ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں: ''تسلیم! سیرت کے اہتمام کے لیے یہیں (بمبئی) کی خاموشی اور سکوت درکار ہے، دن بھر کوئی جھانکتا تک نہیں، اس لیے ارادہ تو یہ ہے کہ جلد اول بہمہ جہت تمام کر کے اٹھوں، ہر روز کوئی نہ کوئی نیا تاریخی اور تحقیقی راز کھلتا ہے اور بعض مشکلات حل ہو جاتی ہیں...... خوشنویس (کاپی نویس) کو

یہیں بلوالیا ہے، ایک خاص دراندازی[1] کی وجہ سے دیر ہوگئی، ورنہ مسودہ مطبع میں جاچکا ہوتا، ریاست پر زور ڈالا جارہا ہے کہ سیرت چھپنے نہ پائے۔'' (شروانی-۱۱۸)

منشی محمد امین کو یہ بھی لکھا کہ اس دفعہ بمبئی میں پورے سال بھر قیام کا ارادہ ہے، بمبئی میں سارا دن کام کے لیے ملتا ہے، دن بھر کوئی جھانکتا نہیں، اس لیے برس دن یہاں سے ٹلنے کا ارادہ نہیں۔ (امین-۱۸)

سیرۃ کی ناتمامی کا داغ لیکن آہ! ع مادر چہ خیالیم وفلک در چہ خیال، اس عزم پر ایک ہفتہ بھی گزرنے نہیں پایا تھا کہ جولائی کے تیسرے عشرہ میں ان کو الہ آباد میں اپنے بھائی کی شدید علالت کی اطلاع ملی اور فوراً ہی وہ الہ آباد روانہ ہوگئے، بھائی نے ۵/اگست ۱۹۱۴ء کو وفات پائی اور وہ دل شکستگی کے ساتھ گھر (اعظم گڑھ) واپس آئے، ۲۹/اگست ۱۹۱۴ء کو مولوی مسعود علی صاحب کو اپنے وطن واپس آنے کی خبر ان لفظوں میں دیتے ہیں: ''آخر ساری دنیا لٹا کے گھر میں آیا'' (۱۹) لیکن اس عالم میں بھی سیرت کا خیال دل میں بسا تھا، ۱۳/اکتوبر ۱۹۱۴ء کو منشی محمد امین صاحب کو لکھتے ہیں: ''میں اب بالکل دل شکستہ ہوگیا ہوں، برادرم اسحاق کی موت نے دل بٹھا دیا..... سیرت[2] کا کام جاری ہے، گویا تاخیر طبع سے طبیعت اچھی طرح آگے نہیں بڑھتی۔'' (امین-۳)

سیرت کے ان مباحث میں جن کا تعلق صحف بنی اسرائیل اور قرآن پاک سے ہے، وہ اپنے بھائی مولوی حمید الدین صاحب سے جنھوں نے اس قسم کے مسائل پر بہ تحقیق غور کیا تھا، اکثر مشورے کرتے رہتے تھے، جن کا حوالہ مکاتیب شبلی میں جابجا ہے، اسی سلسلہ میں ان کو ۱۶/اکتوبر ۱۹۱۴ء کو کس حسرت سے لکھتے ہیں: ''افسوس یہ ہے کہ سیرت پوری نہ ہوسکی اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کرسکے۔''

---

[1] بھوپال میں معاندین کی کارروائیوں کی طرف اشارہ ہے۔ [2] یہاں دارالمصنفین کا ذکر ہے۔

وفات

۱۳۳۲ھ - ۱۹۱۴ء

خرابی صحت مولانا اگرچہ اپنی نوجوانی کے زمانہ میں بڑے قوی و توانا تھے لیکن علی گڑھ کے زمانہ قیام میں یہاں کی آب و ہوا کا اثر ان کی صحت و توانائی پر نہایت مضر پڑا اور معدہ کی مختلف شکایتیں مثلاً قبض، تبخیر وغیرہ پیدا ہو گئیں، جو اخیر عمر تک قائم رہیں، سفرِ کشمیر کے بعد علالت صحت کا سلسلہ جو برسوں قائم رہا، اس نے ان کو اور بھی ضعیف و ناتواں کر دیا، چلنے پھرنے سے معدہ کو جو فائدہ پہنچتا تھا، واقعۂ شکست پا کے بعد اس سے بھی محروم ہو گئے، اس لیے معدہ کی شکایتوں میں اور بھی اضافہ ہوا، لکھنؤ کی آب و ہوا نے ان شکایتوں کو اور بھی المضاعف کر دیا، اور پیچش اور اسہال کے دورے پڑنے لگے اور حکیم عبدالولی صاحب لکھنوی اور حاذق الملک حکیم اجمل خاں دہلوی کے علاج و تدبیر سے افاقہ ہوتا رہا، ان ہی شکایتوں کی بنا پر اخیر عمر میں تبدیل آب و ہوا کے لیے بمبئی کو پسند کیا تھا، وہاں ہر سال موسم گرما میں جا کر چند مہینے قیام کرتے تھے اور وہاں کی آب و ہوا کا اثر ان کی صحت پر نہایت عمدہ پڑتا تھا، چنانچہ ۸؍ستمبر ۱۹۱۳ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''یہاں (بمبئی میں) بلا مبالغہ وہاں (لکھنو) کی بہ نسبت دونی غذا ہے، دعوتوں میں ثقیل غذائیں کھا لیتا ہوں کہ لکھنؤ میں وہ مہینوں کی بیماری کے لیے کافی ہیں، یہاں صرف ایک آدھ وقت کا غرہ کر دینا کافی ہو جاتا ہے۔'' (حمید-۶۴)

لیکن بایں ہمہ وہاں کی آب و ہوا کا اثر بھی ان کی صحت میں کوئی ایسا نمایاں تغیر نہیں پیدا کر سکتا تھا کہ ان کو صحیح و تندرست کہا جا سکتا، اسی مہینہ اس سے ایک ہفتہ پہلے یکم ستمبر ۱۹۱۳ء کو خود بمبئی سے ایک خط میں لکھتے ہیں: ''ہاں نسبتہً بہت اچھا ہوں، دوگنی بلکہ چوگنی ترقی ہوئی ہے، تاہم صرف ایک وقت کی غذا رہ گئی ہے اور وہ بھی دو توس۔'' (سمیع-۵۶)

غرض پیچش و اسہال کے جو دورے اکثر پڑا کرتے تھے، انہوں نے مولانا کی زندگی سے بہت کچھ مایوس کر دیا تھا، چنانچہ ۱۹۱۲ء ہی میں جب لکھنؤ میں اسہال کا دورہ پڑا اور اس سے صحت یاب ہو کر بمبئی تشریف لے گئے تو مولوی عبدالسلام صاحب ندوی ساتھ تھے، چوں کہ ضعف سے خود خطوط کا

جواب نہیں لکھ سکتے تھے، اس لیے وہ اس فرض کو انجام دیتے تھے، اسی حالت مایوسی میں ایک دوست کو خط میں لکھوایا کہ: ''اب اسہال کے دورے جلد جلد پڑنے لگے، اس لیے سال دو سال سے زیادہ جینے کی توقع نہیں'' بہر حال وفات سے چند سال پیش تر صرف ایک حباب تھے، جو ذرا سی ٹھیس میں ٹوٹ سکتا تھا، چنانچہ ایک عزیز شاگرد مولوی عبدالباری صاحب کو ۱۰؍جون ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں: ''اب بمبئی کے قابل بھی نہیں رہا، یعنی دن بھر دروازے بند رکھتا ہوں، ہوا ذرا خنک ہوگئی ہے تو اس کی برداشت نہیں ہوسکتی، ایک مرتبہ صرف اسی بے احتیاطی سے بخار آچکا، بھائی تیل تمام ہو چکا، بخدا اب مجھ میں کچھ نہیں رہا، غذا ۲۴ گھنٹوں میں سب ملا کر پاؤ بھر، بات کرنا گراں ہوتا ہے، حالاں کہ بخار وغیرہ کی کچھ شکایت نہیں۔'' (عبدالباری-۵)

لیکن بایں ہمہ ضعف وعلالت دل ودماغ صحیح تھے، اس لیے دل میں طرح طرح کے علمی مذاق، قومی اور مذہبی ولولے پیدا ہوتے تھے اور جن کاموں کی تکمیل کا ارادہ کر چکے تھے، اس سے کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے لیکن مولوی اسحاق مرحوم کی وفات نے دل ودماغ کو بھی ماؤف کر دیا، اگر چہ اس حالت میں بھی ان کا دماغ عملی تخیلات سے خالی نہ تھا، تاہم اب وہ اپنی زندگی سے کلیۃً مایوس ہو چکے تھے، اور ہر کام کے لیے اپنا جانشین ڈھونڈتے تھے، چنانچہ مرض الموت سے تقریباً ایک مہینہ پہلے مولوی حمید الدین صاحب مرحوم کے نام ۱۶؍اکتوبر ۱۹۱۴ء کو جو خط لکھا ہے اس سے اس مایوسی کی جھلک صاف طور پر نمایاں ہوتی ہے: ''دو دن اچھا رہا تو چار دن بیمار رہتا ہوں لیکن بات چیت کرتا رہتا ہوں، لوگ جانتے ہیں کہ کوئی شکایت نہیں، نظام جسم برہم ہو چکا، ابھی ابھی سخت سردی لگی، حالاں کہ دو پہر کا وقت ہے۔''

''افسوس یہ ہے کہ سیرت پوری نہ ہوسکی اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کر سکے اور اگر دار المصنفین قائم ہوا تو تمہارے سوا کون چلائے گا، آج سید سلیمان آئیں گے اور کل پرسوں چند طلبۂ تکمیل لیکن بیماری سب منصوبے غلط کر رہی ہے۔''

اسی زمانہ میں عید اضحیٰ کی تقریب سے ۱۰؍ذی الحجہ کو اپنے وطن بندول تشریف لے گئے، وہاں سے دوسرے دن پلٹ کر آئے تو اپنے قدیم مرض اسہال وپیچش میں مبتلا ہوئے۔

یہ نومبر کی ۷؍تاریخ تھی، تین دن تک پیچش اور بواسیر کا دورہ رہا، ضلع کے اسسٹنٹ سرجن کا علاج رہا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا، چوتھے دن لوگوں نے طبی علاج شروع کیا، شہر کے طبیب نے پیچش کا معمولی نسخہ استعمال کرایا، نسخہ کے استعمال سے اس دن ۵۰، ۶۰، دست آ گئے اور ایک بار اس قدر خون آیا کہ طشت کا تین

ثلث حصہ خون سے بھر گیا، یہ جسم کی قوت کی پہلی شکست تھی، اس کے بعد ضعف برابر ترقی کرنے لگا۔

جب حالت نازک ہوگئی تو حکیم اجمل خاں مرحوم کو دہلی اور حکیم عبدالولی صاحب مرحوم کو لکھنؤ تار دیا گیا، حکیم اجمل خاں مرحوم نہیں آ سکے، اتفاق یہ کہ حکیم عبدالولی صاحب مرحوم خود بیمار تھے اور اسی بیماری میں انہوں نے وفات پائی، وہ لکھنؤ میں مولانا کے پرانے معالج تھے، انہوں نے نسخہ اور تجویز بنا کر اپنے چھوٹے بھائی حکیم عبدالقوی صاحب کو بھیجا، مگر افسوس وہ اس وقت پہنچے جب بیمار ''افاقۃ الموت'' پاچکا تھا۔

مولانا کو اپنی صحت سے پہلے ہی یاس ہوچکی تھی، جب تھوڑی طاقت تھی، اسی وقت سیرۃ نبوی ﷺ کے تمام مسودے اور مبیضے کپڑے میں بندھوا کر ایک الماری میں مقفل کرادیے اور عزیزوں کو جو تیمارداری میں تھے، یہ وصیت فرمائی کہ ''یہ مسودے حمید الدین اور سید سلیمان کے سپرد کیے جائیں، ان دو کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ دیے جائیں'' اس پر بھی سیرت کی ناتمامی کا داغ ان کے دل کو رہ رہ کر بے چین کر رہا تھا، آخر وفات سے تین دن پہلے ۱۵ر نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمید الدین صاحب کو حیدرآباد، مولانا ابوالکلام کو کلکتہ اور مجھے پونہ، کلکتہ اور دیسنہ[۱] کے پتہ سے تار دیے، مولانا ابوالکلام کو جو تار دیا اس کا مضمون یہ تھا، اگر آپ اس اثنا میں مل جاتے تو سیرت نبوی ﷺ کی اسکیم کا کچھ انتظام ہوجاتا، ورنہ سب کارروائی بیکار ہوجائے گی، سید سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلان سمجھا دیتا''۔ (ابوالکلام-۴۰)

مولانا ابوالکلام کا کچھ پتہ نہ چلا، معلوم نہیں ان کو یہ تار ملا یا نہیں، میں اس وقت بانکی پور میں تھا، مجھے بھی ان میں سے کوئی تار نہیں ملا لیکن بلا اطلاع دل نے خود زیارت کی کشش ظاہر کی اور میں صبح سویرے کسی سے کہے بغیر چل کھڑا ہوا۔

لیکن آہ! جب ۱۵ر نومبر کی شام کو میں پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی، میں سرہانے کھڑا تھا، میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے، مولانا نے آنکھیں کھول کر حسرت سے میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ اب کیا رہا، پھر زبان سے دوبارہ فرمایا ''اب کیا! اب کیا!'' لوگوں نے پانی میں جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ پلادیا تو جسم میں ایک فوری طاقت آگئی تو معاہدہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا ''سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کے سیرت تیار کردو'' میں

---

[۱] پونہ اس لیے کہ راقم ان دنوں دکن کالج پونہ میں عربی و فارسی کا لکچرر تھا، اور کلکتہ کا تار الہلال کے تعلق سے اور دیسنہ بہار کا ایک گاؤں جو خاکسار کا وطن ہے۔

ثلث حصہ خون سے بھر گیا، یہ جسم کی قوت کی پہلی شکست تھی، اس کے بعد ضعف برابر ترقی کرنے لگا۔

جب حالت نازک ہوگئی تو حکیم اجمل خاں مرحوم کو دہلی اور حکیم عبدالولی صاحب مرحوم کو لکھنؤ تار دیا گیا، حکیم اجمل خاں مرحوم نہیں آسکے، اتفاق یہ کہ حکیم عبدالولی صاحب مرحوم خود بیمار تھے اور اسی بیماری میں انہوں نے وفات پائی، وہ لکھنؤ میں مولانا کے پرانے معالج تھے، انہوں نے نسخہ اور تجویز بنا کر اپنے چھوٹے بھائی حکیم عبدالقوی صاحب کو بھیجا، مگر افسوس وہ اس وقت پہنچے جب بیمار "افاقۃ الموت" پاچکا تھا۔

مولانا کو اپنی صحت سے پہلے ہی یاس ہوچکی تھی، جب تھوڑی طاقت تھی، اسی وقت سیرۃ نبوی ﷺ کے تمام مسودے اور مبیضے کپڑے میں بندھوا کر ایک الماری میں مقفل کرادیے اور عزیزوں کو جو تیمارداری میں تھے، یہ وصیت فرمائی کہ "یہ مسودے حمیدالدین اور سید سلیمان کے سپرد کیے جائیں، ان دو کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ دیے جائیں" اس پر بھی سیرت کی ناتمامی کا داغ ان کے دل کو رہ رہ کر بے چین کررہا تھا، آخر وفات سے تین دن پہلے ۱۵/نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمیدالدین صاحب کو حیدرآباد، مولانا ابوالکلام کو کلکتہ اور مجھے پونہ، کلکتہ اور دیسنہ[1] کے پتہ سے تار دیے، مولانا ابوالکلام کو جو تار دیا اس کا مضمون یہ تھا، اگر آپ اس اثنا میں مل جاتے تو سیرت نبوی ﷺ کی اسکیم کا کچھ انتظام ہوجاتا، ورنہ سب کارروائی بیکار ہوجائے گی، سید سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلان سمجھا دیتا"۔ (ابوالکلام-۴۰)

مولانا ابوالکلام کا کچھ پتہ نہ چلا، معلوم نہیں ان کو یہ تار ملا یا نہیں، میں اس وقت بانکی پور میں تھا، مجھے بھی ان میں سے کوئی تار نہیں ملا لیکن بلا اطلاع دل نے خود زیارت کی کشش ظاہر کی اور میں صبح سویرے کسی سے کہے بغیر چل کھڑا ہوا۔

لیکن آہ! جب ۱۵/نومبر کی شام کو میں پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی، میں سرہانے کھڑا تھا، میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے، مولانا نے آنکھیں کھول کر حسرت سے میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ اب کیا رہا، پھر زبان سے دوبارہ فرمایا "اب کیا! اب کیا!" لوگوں نے پانی میں جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ پلادیا تو جسم میں ایک فوری طاقت آگئی تو معاہدہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا "سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کے سیرت تیار کردو" میں

[1] پونہ اس لیے کہ راقم ان دنوں دکن کالج پونہ میں عربی وفارسی کا لیکچرر تھا، اور کلکتہ کا تار الہلال کے تعلق سے اور دیسنہ بہار کا ایک گاؤں جو خاکسار کا وطن ہے۔

نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''ضرور، ضرور!!''

اس کے بعد ان کی حالت روز بروز بلکہ ساعت بہ ساعت نازک تر ہوتی گئی، اسہال خونی اور آخر میں صرف اسہال برابر جاری رہا، آنتوں میں خراش سے زخم ہوگیا تھا، غذا تمام ایام علالت میں موقوف رہی، لاغری ونحافت کا یہ حال ہوگیا کہ پیٹ اور پیٹھ کے جرم میں شاید دو تین انگل کا حجاب ہو، طبی علاج واہتمام جاری تھا لیکن مولانا نے دوا کے استعمال سے قطعاً انکار کردیا تھا اور پھر تین روز تک قطعاً دوا نہیں پی، ۱۶ر کی شام کو مولانا حمید الدین صاحب بھی تشریف لائے، جن کے لیے مولانا ابتدا سے منتظر تھے، ۱۷ر کی صبح کو مجھے اور انہیں یاد فرمایا، زبانِ مبارک سے تین مرتبہ ''سیرت! سیرت! سیرت!!'' کہا اور پھر انگلی سے لکھنے کا اشارہ کرکے کہا ''سب کام چھوڑ کے''۔

ڈاکٹر محمد نعیم صاحب انصاری جو انصاری طبی وفد ترکی کے ایک ممبر رہ چکے تھے اور ان دنوں جون پور میں مطب کرتے تھے، مولانا کی رحلت سے ۱۲ گھنٹہ پیش تر پہنچ گئے، انہوں نے نہایت توجہ کے ساتھ مریض کا ایک ایک عضو دیکھا اور بہ حالت یاس کہا کہ دماغ کے سوا اور تمام اعضا معطل ہو چکے ہیں اور اب تدبیر بے سود ہے، آخر ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۸ر ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کی صبح کو ساڑھے پانچ بجے بروز چہار شنبہ روح نے آخری سانس لی، عزیزوں اور شاگردوں میں جو پاس کھڑے تھے، کہرام برپا ہوگیا، تجہیز وتکفین کی فکر ہوئی، مقام دفن میں لوگوں کا اختلاف تھا، آخر ان کا مسکن ہی جیسی ان کی پیشین گوئی تھی، مدفن بنا، عصر کے وقت لاش ''شبلی منزل'' کے ایک گوشہ میں جہاں آج سے آٹھ برس پہلے ان کے شکستہ پاؤں کے ریزے دفن کیے گئے تھے، سپرد خاک کی گئی، تمام شہر اور اطراف کے مسلمان نماز میں شریک تھے، سرکاری عدالتیں اور شہر کے مشن اور مسلم اسکول بند کیے گئے۔

استاذ بزرگ وار! جا جا اور سایۂ رحمت میں آرام کر، دنیا تجھ کو بہت ڈھونڈے گی، لیکن نہ پائے گی لیکن تیرے علمی فیوض وبرکات کا منظر ہمیشہ نظر آتا رہے گا:

بعد از وفات تربت مادر زمیں مجو ‏ ‏ ‏ در سینہ ہائے مردمِ عارف مزارِ ما

تمام ملک میں ان کی وفات کی خبر سے شورِ قیامت برپا ہوگیا، ہر طرف سے تعزیتی خطوط اور تار آنے لگے، اخبارات میں مہینوں ان کا ماتم ہوتا رہا، مضمون نگاروں اور اخباروں کے اڈیٹروں نے ان کے کارناموں پر بے شمار مضامین اور شعرا نے ان کے مرثیے اور تاریخی قطعے لکھے، جو زمانہ تک اخباروں میں

چھپتے رہے۔

مولوی ضیاء الحسن صاحب ندوی یادِ ایام[1] کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ وہ اس وقت علی گڑھ میں تھے اور اس وقت تک مولانا کی خبر وفات علی گڑھ نہیں پہنچی تھی، اسی رات کو انہوں نے خواب میں دیکھا کہ عیدگاہ میں ایک بہت بڑی محفل سیرت منعقد ہے اور مولانا وہاں کھڑے ہوئے بیان فرما رہے ہیں، دوسرے روز خبر وفات ملی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

(شبلی)

---

[1] الندوہ اگست ۱۹۴۱ء، ص ۲۷۔

آل واولاد

مولانا کی دو شادیاں ہوئی تھیں، پہلی شادی خود مولانا کے خاندان ہی میں اور گاؤں ہی میں ہوئی تھی، یعنی بندول میں اور اس محل سے متعدد اولاد ہوئی، جن میں بعض نے بچپن ہی میں انتقال کیا اور دو صاحب زادیوں نے صاحب اولاد ہو کر مولانا کی زندگی ہی میں وفات پائی، ان میں سے ایک کا نام فاطمہ اور دوسری کا نام رابعہ تھا، دونوں نے اچھی تعلیم پائی تھی، رابعہ بی بی نے ۱۹۰۴ء میں انتقال کیا، فاطمہ بی بی کے نام مکاتیب میں کئی خط ہیں، مولانا ان کو بہت چاہتے تھے، انہوں نے بھی مرض دق میں مبتلا ہو کر ۱۹۰۹ء میں وفات پائی، اس وقت مولانا کی اولاد نرینہ میں صرف حامد[1] نعمانی موجود ہیں، ۱۸۸۰ء ان کی پیدائش کی تاریخ ہے، علی گڑھ میں ایف، اے تک تعلیم پائی، گورنمنٹ میں تحصیلدار (سب ڈپٹی کلکٹر) ہو کر اب پنشن یاب ہو چکے ہیں۔

اس محل نے ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا، ان کے انتقال کے بعد مولانا نے عدم تاہل کا ارادہ کر لیا تھا اور پانچ سال تک غیر متاہلانہ زندگی بسر بھی کی، لیکن ۱۹۰۱ء میں جب ایک جگہ جمعیت خاطر سے بیٹھنا چاہا تو پاؤں میں ایک زنجیر ڈالنی چاہی، اس لیے دوسری شادی بھی کی، چنانچہ ۱۷ جون ۱۹۰۱ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ پانچ برس کے تعطل کے بعد میں نے جو تعلق اختیار کیا وہ صرف اس لیے تھا کہ ایک زنجیر پاؤں میں پڑ جائے تاکہ مارا مارا نہ پھروں۔'' (سمیع-۴۸)

مولانا کے اس محل سے بھی دو لڑکیاں اور ۱۹۰۴ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا لیکن تینوں نے بچپن ہی میں انتقال کیا، اس محل سے جو لڑکا پیدا ہوا تھا، اس سے مولانا کو خاص دل بستگی تھی، چنانچہ ۲ مئی ۱۹۰۴ء کو حیدرآباد سے ایک خط میں لکھتے ہیں: ''اس پیرانہ سالی میں خدا نے مجھ کو باپ بنایا، کتاب سے گھبراتا ہوں تو اس سے جی بہلاتا ہوں۔'' (مہدی-۱۲)

---

[1] افسوس کہ ان کی یہ جسمانی یادگار بھی جو مدت سے مرض قلب میں مبتلا تھی، ۲ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۹۴۲ء کو مٹ گئی، جون پور میں جہاں بہ ضرورت ۱۶ مارچ کو گئے تھے، وہیں رات کو یعنی ۱۹ مارچ کا دن گزار کر ۲۰ کی شب کو دفعۃً انتقال کیا اور لاش اعظم گڑھ آکر شبلی منزل میں باپ کے پہلو میں دفن ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

لیکن یہ کھلونا بھی ۱۹۰۵ء میں جب مولانا حیدرآباد چھوڑ کر لکھنؤ آ کر رہے تھے، جاتا رہا، لکھنؤ کے محلہ گولہ گنج میں منشی احتشام علی صاحب کا ایک بڑا محل سرائے تھا، اسی کو کرایہ پر لے کر مع اہل وعیال رہتے تھے، وہیں یہ حادثہ پیش آیا اور کچھ ہی دنوں کے بعد اسی سال یہ بیوی بھی مرض دق میں مبتلا ہوگئیں[1]، جب حالت بہت غیر ہوگئی تو ان کو اعظم گڑھ لے کر آئے، یہاں پہنچ کر انہوں نے بھی جدائی کا داغ دیا، جس سے مولانا بہت متاثر ہوئے، اس سفر میں مولانا کے ساتھ مولانا ابوالکلام بھی لکھنؤ سے اعظم گڑھ آئے تھے، وہ کہتے تھے کہ بیوی کی وفات پر مولانا بہت بے چین ہوئے اور چیخ چیخ کر روئے۔ اس کے بعد انہوں نے کوئی شادی نہیں کی اور یہ دس برس تجرد میں بسر کیے۔

---

[1] مکاتیب حمید-۲۹۔

اخلاق و عادات

انسان کے جسم کو دیکھا جائے تو وہ دراصل خاک کا ایک تودہ ہے، اس کی اصلی زندگی اس کے اچھے اخلاق اور عادات ہی سے ہے، مولانا کی پیدائش ایک آسودہ خاندان میں اور ایسے ماحول میں ہوئی تھی، جس میں ان کے پھسلنے اور بہکنے کے کئی مواقع تھے، مگر انہوں نے تعلیم وتربیت کی اس دشواری کو بخیر وخوبی طے کیا اور فرماتے تھے کہ یہ برکت ان کو اپنی والدہ ماجدہ کے بدولت حاصل ہوئی، وہ بہت نیک، عبادت گزار، سحر خیز اور وقت کی پابند تھیں، مولانا نے یہ سبق ان سے بہت کچھ سیکھا۔

مولانا کا شب وروز کا پروگرام مولانا صبح سویرے ۴ بجے کے قریب اٹھ بیٹھتے تھے، پہلے تو یوں ہی بستر پر پڑے پڑے قرآن پاک کی کچھ آیتیں جو ان کو یاد آ جاتیں، لحن کے ساتھ زور زور سے پڑھتے تھے، پھر حماسہ کے دو چار عربی اشعار ادھر ادھر سے گاتے تھے، ذرا مطلع صاف ہوا تو پاس ہی چائے کا چولہا جو مٹی کے تیل سے جلتا تھا، رکھا رہتا تھا، خود اٹھ کر اس کو روشن کرتے اور چائے کا پانی اس پر رکھ دیتے تھے، ساتھ لوٹے میں پانی اور طشت رکھا رہتا تھا، اس سے وضو کر کے نماز سے فرصت کر لیتے تھے، اسی وقت چائے بھی پی لیتے تھے، ان کو قبض کی شکایت ہمیشہ رہتی تھی، اس لیے بیت الخلا میں جا کر دیر تک بیٹھتے تھے، اسی لیے وہ بیت الخلا ہمیشہ غیر مشترک چاہتے تھے اور رکھتے تھے اور وہ بھی نہایت صاف ایسا صاف کہ وہاں اخبارات ساتھ لے جاتے تھے اور وہیں پڑھتے تھے کہ یہ وقت بھی ضائع نہ ہو، حاجت ضروری سے فارغ ہو کر لکھنے کی میز پر بیٹھ جاتے تھے، آٹھ نو بجے تک اس سے فارغ ہو جاتے تھے، ضروری خطوں کا جواب بھی وہ اسی وقت لکھ لیتے تھے، یہ وقت ان کی پوری تنہائی کا ہوتا۔

اس کے بعد وہ کتب بینی میں مصروف ہو جاتے تھے، کوئی باہر سے یا اور کوئی ممتاز آدمی آ گیا تو مل بھی لیے، مگر وہ اس وقت خوش دلی سے نہیں ملتے تھے لکھنؤ میں جب تھے تو پھاٹک پر ایک نوٹس لگا رکھا تھا کہ کوئی صاحب ۱۰ بجے سے پہلے ملنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیں۔

اسی وقت نو دس ۱۰ر بجے کے قریب وہ کھانا بھی کھا لیتے تھے، اب ۴ بجے شام تک وہ الٹ پلٹ کر کتابیں دیکھا کرتے جو آیندہ لکھنا ہوتا، اس کا مواد تلاش کرتے، ضروری مقامات پر نشانات لگا دیتے، ۴ر بجے کے بعد سے احباب، طلبہ اور ملنے والوں کی آمد ہوتی، نشست بالکل سادہ تھی، ایک دو

کرسیاں، باقی دس بارہ مونڈھے، ایک کھرّی چارپائی جس پر وہ خود بیٹھتے تھے، لوگ ادھر ادھر بیٹھ جاتے تھے، بڑی شگفتہ اور بامعنی مجلس ہوتی تھی، اس وقت وہ بلبل ہزار داستان بن جاتے تھے، عموماً مغرب تک یہ مجلس قائم رہتی تھی اور کبھی مغرب کے بعد تک بھی، رات کا کھانا عام طور سے مغرب کے آگے پیچھے وہ کھا لیتے تھے اور رات کو نو بجے وہ سونے کے لیے لیٹ جاتے تھے، سونے کے لیے یہ اہتمام تھا کہ اپنے پاس اتنی دور تک کہ سونے والے کے خراٹے کی آواز سنائی دے، کسی کو سونے نہیں دیتے تھے، باہر والوں کی نقل وحرکت ناگوار ہوتی، وہ گھڑی ٹائم پیس رکھتے تھے، اس کی ٹک ٹک کی آواز بھی ان کی نیند میں خلل انداز ہوتی تھی، اس لیے یا تو اس کو بھی دور رکھواتے تھے، یا بند کر دیتے تھے۔

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ کلکتہ میں ایک موقع پر میرا ان کا شب کو ایک کمرے میں سونا ہوا تو فرمایا: ''آج عمر میں یہ پہلا اتفاق ہے، بالآخر دوسرا کمرہ تجویز ہوا۔''

شکل وشمائل | قد بلند وبالا تھا، پیشانی چوڑی، آنکھیں بڑی، ناک لمبی کھڑی، دہانہ بڑا، چہرہ لمبا، رنگ گندمی، ہاتھوں کی انگلیاں لمبی، بھویں گھنی اور لمبی، گردن اونچی، سر کے بال چھوٹے رکھتے تھے، مونچھیں چھوٹی، لبوں تک، داڑھی، نہ لمبی نہ چھوٹی، درمیانی، بال قبل از وقت پک گئے تھے، اور ستاون برس کی عمر میں وہ بالکل سن سپید ہو گئے تھے۔

وہ اپنی جوانی میں بہت توانا وتنومند تھے، کہتے تھے کہ گھونسے سے وہ اینٹ توڑ ڈالتے تھے، کرسی کو ایک پایہ پکڑ کر اٹھا لیتے تھے، پنجے بڑے مضبوط تھے، پنجہ کشی کی مشق کبھی نہیں کی تھی، اس پر یہ حال تھا کہ بڑے بڑے پنجہ کش ان کا پنجہ نہیں پھیر سکتے تھے، شجاعت اور پہلوانی کے قصوں اور کارناموں سے ان کو بڑی دلچسپی تھی، اس لیے وہ مغل بادشاہوں کے بڑے دلدادہ تھے اور ان کی شجاعت اور بہادری کے قصے بڑے جوش وخروش سے بیان کیا کرتے تھے، گو وہ خود کشتی کبھی نہیں کھیلتے تھے لیکن وہ پہلوانوں کی کشتی اور دنگل دیکھنے کے شائق تھے، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی فرماتے تھے کہ میں نے ان کو سب سے پہلے علی گڑھ کی نمائش میں دنگل میں دیکھا، نواب مزمل اللہ خاں مرحوم نے جو ساتھ تھے، بتایا کہ: ''یہی مولوی شبلی ہیں'' تو وہ فرماتے تھے کہ ''مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ایک مولوی اور دنگل'' الہ آباد کی ۱۹۱۲ء والی بڑی نمائش میں رستمِ ہند غلام پہلوان اور دوسرے پہلوانوں کی جو مشہور کشتی ہوئی تھی، اس میں وہ شریک تھے اور وہ بھی ان لوگوں میں تھے، جنھوں نے غلام کو تمغے پہنائے تھے۔

ان کی پیشانی کی رگ اور پٹھے جلد جلد حرکت کرتے رہتے تھے، ہم نے یہ بڑھاپے میں دیکھا، مولوی حمید الدین صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ جب مولانا کا شباب تھا تو پورے سر کی رگوں اور پٹھوں میں اتنی تیزی سے حرکت ہوتی رہتی تھی کہ لکھنؤ کے کام کی دو پلڑی ٹوپی جو وہ اس زمانہ میں پہنتے تھے، وہ تھوڑی دیر میں سر سے جھک جاتی تھی اور کبھی نیچے گر پڑتی تھی۔

لباس ان کا لباس جب سے میں نے دیکھا یہ تھا، موٹے ململ کا کرتا، جس سے بدن نمایاں نہ ہو، کسی قدر چوڑی مہری کا سپید چھالٹی کا پائجامہ، ڈھیلی شروانی جس کو وہ باہر نکلنے میں پہنتے تھے، پاؤں میں دلی کا معمولی کام کا سرخ سلیم شاہی جوتہ، پاؤں کے حادثہ کے بعد ایک مصنوعی پاؤں لگانے کے سبب سے جب پاؤں لگاتے تھے تو بوٹ پہن لیتے تھے، سر پر اونی یا سادہ کپڑے کی سیاہ ایرانی ٹوپی، ٹرکی کے سفر پر بھی جب نکلے تھے تو وہ اسی قسم کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے اور اسی لیے عربوں نے انہیں شیعہ سمجھا۔

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ: ''میں نے جس زمانہ میں سب سے اول دنگل میں ان کو دیکھا تو سر پر سیاہ مخمل کی گول ٹوپی تھی، اس کی باڑھ سادہ اونچی تھی، اوپر کا حصہ گول چین دار تھا، عرصہ تک یہ ٹوپی استعمال فرماتے رہے، شیروانی زیب تن تھی۔''

جاڑوں میں وہ روئی دار بنڈی اور روئی دار دَگلا پہنتے اور کندھوں پر کشمیر کا شالی رومال رکھتے تھے، جس کو گلے سے لپیٹ لیتے تھے، جاڑوں میں نکلتے تو سرج کا پاجامہ پہنتے، عجیب بات ہے کہ گرمیوں میں بھی وہ توشک بچھاتے تھے اور رضائی پائتانے رکھی رہتی تھی۔

مولانا شروانی فرماتے ہیں: ''سردی میں کوئی رزائی گرم نہ تھی، حبیب گنج کے قیام میں پہلی شب کو ساری رزائیاں اوڑھائی گئیں، سردی کی شکایت رہی، دوسرے دن خاص طور پر ڈھائی سیر روئی کا لحاف تیار کیا گیا، جب چین آیا، حبیب گنج سے بھیکم پور نواب مزمل اللہ خان مرحوم کے یہاں گئے تو شب کو وہی لحاف طلب ہوا، اسی کے ساتھ کوئی پانی ان کے واسطے ٹھنڈا نہ تھا، صراحی کا باسی پانی بھی پاس نہ ہوا، برف دیہات میں موسم سرما میں تھی نہیں، فرماتے تھے میرا دماغ گرم ہے، جسم سرد ہے، یہ میرے اس سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ یہ اجتماع ضدین کیا ہے، رحمہ اللہ تعالیٰ۔''

وہ عام طور سے سر پر عمامہ نہیں باندھتے تھے، مگر قومی جلسوں اور تقریبوں میں وہ زرد ریشمی کام کا عزیز اللّٰہی عمامہ اور عمدہ مدنی عبا زیب تن کرتے تھے اور اسی لیے ان کے پاس کئی کئی عبائیں اور

عمامے رہتے تھے، مگر ان سے قرینہ سے عمامہ بندھتا نہ تھا، ان کے استاد مولانا فاروق صاحب کا بھی یہی حال تھا، وہ عمامہ کیا باندھتے تھے، سر پر الٹے سیدھے اس کو لپیٹ لیتے تھے، مولانا شبلی مرحوم ان سے تو اچھا باندھتے تھے، مگر پیچ ٹھیک نہیں ہوتے تھے، ایک مرتبہ ندوہ میں کوئی تقریب تھی، مولانا قیمتی ریشمی کام کا عمامہ باندھ کر آئے تھے، اتفاق سے راقم بھی سوتی ململ کا صافہ باندھ کر حاضر ہوا، فرمانے لگے ''دیکھو میرے سر پر کتنا قیمتی عمامہ ہے، مگر بندھا ایسا ہے کہ کسی دیہاتی کی پگڑی معلوم ہوتی ہے اور تمہارا چھ ٹکے کا صافہ ہے، مگر اس قرینے سے بندھا ہے کہ زیب دیتا ہے۔

طعام کھانے کے شایق تھے لیکن اس کے یہ معنی نہ تھے کہ وہ امرا کی طرح متنوع اور متعدد لذیذ کھانوں کے دلدادہ تھے، فرماتے تھے کہ ''کھانے کی عمدگی کے یہ معنی ہیں کہ عمدہ پکا ہوا ہو، میں عمدہ پکی ہوئی دال کھا سکتا ہوں اور برا پکا ہوا گوشت نہیں کھا سکتا۔''

کھانے میں نمک تیز پسند تھا، دسترخوان پر نمک رکھ لیتے تھے اور کھانے میں ڈالتے جاتے تھے، شیرینی بہت مرغوب تھی اور اس کے لیے کسی قسم خاص کی ضرورت نہ تھی جو بھی ہو اور جیسی بھی ہو، فرماتے تھے کہ ''شیرینی کے لیے صرف میٹھا ہونا کافی ہے'' ایک دفعہ نواب علی حسن خاں صاحب کے عزیز خواجہ رشید الدین صاحب عرف اچھے صاحب نے مولانا کے لیے چوگنے شکر کے میٹھے چاول پکوائے، کھاتے وقت مولانا سے پوچھا کہ ''مولانا میٹھا تو ٹھیک ہے؟ چوگنی شکر چھوڑی ہے'' مسکرا کر فرمایا یہ کون کہتا ہے کہ شکر میں مٹھاس ہوتی ہے۔''

مولانا شروانی فرماتے ہیں ''ایک بار ندوہ کے اجلاس سے واپسی میں بریلی سے علی گڑھ مولانا کی ہمراہی ہوئی، میں نے دیکھا کہ ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر مٹھائی خریدی، چکھی، خواہ اچھی تھی یا ناقص، میں نے استعجاب ظاہر کیا تو فرمایا مٹھائی ہے، شیرینی کے متعلق لطیفے خوب خوب یاد تھے، ایک موقع پر فرمایا کہ ایک دوست نے دوسرے شیرینی پرست دوست کو مدعو کیا تو انھوں نے کہا یار کیا کھلاؤ گے، کہا بہت اعلیٰ میٹھے چاول، گھر آ کر باورچی طلب ہوا، باصرار شیرینی کی مقدار بڑھائی گئی، چوگنا میٹھا پڑا، فخر سے کھلایا، ختم طعام پر داد چاہی تو جواب ملا، جتنے چاول تھے، اسی قدر پھیکا تھا۔''

بنارس کے قیام میں ایک روز دوپہر کو سخت لو کے وقت ملا جی میرے رفیق اور اپنے ندیم سے فرمائش کی کہ گنے کی گنڈیریاں بازار سے لاؤ، انھوں نے کہا کہ ایسی دھوپ میں فرمایا، بڑا لطف رہے گا،

ملا جی گئے، گنڈیریاں لائے، دونوں نے مل کر کھائیں، لطف کی باتیں ہوئیں'' ع سخنہائے شیریں بہ از قند ہست''

رساول بہت شوق سے کھاتے تھے اور اس اہتمام سے پکواتے تھے کہ مصنوعی طریقوں سے اس کو صاف کروانا بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ اس سے اس کی طبعی مٹھاس کم ہو جاتی ہے، اسی لیے رساول میں بالائی یا دودھ نہیں ملاتے تھے، ایک دفعہ مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے ان کے پاس رساول بھیجی اور اودھ کے مذاق کے مطابق اس میں بالائی ملادی ملاقات ہوئی تو فرمایا تم نے تو رساول کو غارت کر دیا، بالائی سے تو پھیکی ہو جاتی ہے۔

مصری کے ڈلے چبایا کرتے تھے، بیٹھے بیٹھے انگریزی شکر کے ایک ایک دانے منہ میں ڈالا کرتے تھے اور بیکاری کے اوقات میں یہ ان کا لذیذ ترین مشغلہ تھا، پیشاب میں شکر آتی تھی، طبیب، ڈاکٹر اور احباب اس طرح شکر کھانے سے روکتے تھے، مگر وہ نہیں مانتے تھے، ایک دفعہ نواب سید علی حسن خاں صاحب اور اچھے صاحب فرماتے تھے کہ مولانا بیمار تھے تو ہم لوگ دیکھنے کے لیے گئے، سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھے تھے، منہ بھی بند تھا، مگر کچھ دانتوں کے چلنے کی آواز آتی تھی، پوچھا آپ کیا کر رہے ہیں؟ فرمایا'' کچھ نہیں لحاف الٹا تو دیکھا کہ سینہ پر شکر کی ایک طشتری رکھی ہے اور وہ ذرا ذرا اس کو کھا رہے ہیں، ہم نے عرض کی، اس حالت میں شکر سے پرہیز فرمایئے، فرمایا'' تو پھر جی کر کیا کروں گا۔''

چائے وہ دن رات میں کئی دفعہ پیتے تھے لیکن صبح کو جب سویرے اٹھتے تھے تو اس وقت ملازم کو تکلیف نہیں دیتے تھے، بلکہ خود اپنے ہاتھ سے چائے بنا لیتے تھے، چائے کی پیالیاں چھوٹی ہوتی تھیں، عموماً سادی چائے پیتے تھے، فرماتے تھے'' چائے میں دودھ کی آمیزش انگریزوں کی بدعت ہے۔''

کھانے میں عمدہ پکا ہوا صرف ایک قسم کا سالن ہوتا تھا اور اس کے لیے بڑا اہتمام کرتے تھے، دہی ضرور ڈلواتے تھے، باورچی کے ہاتھ کا سالن پسند نہیں آتا تھا تو اپنے سامنے منگوا کر اپنے ہاتھ سے گوشت بھونتے تھے، سامنے لوہے کا چولہا یا آتش دان رکھ لیتے اور اس پر دیگچی رکھ کر گوشت بھونتے تھے، کھانے میں سادہ پیاز شوق سے کھاتے تھے، مرچوں سے گھبراتے تھے، فرماتے تھے ہر مزہ میں شدت مرغوب، مگر مرچ، باقی دال اور روٹی جو ندوہ کے باورچی خانہ میں عموماً پکا کرتی تھی، وہی مولانا کے دسترخوان پر بھی نظر آتی تھی، بمبئی میں ضعف معدہ کی وجہ سے چوکر کی پاؤ روٹی منگوایا کرتے تھے اور

اخیر میں تو صرف توس ہی کھایا کرتے تھے، کبھی کبھی میٹھے چاول بھی پکواتے تھے، پڈنگ بھی نہایت پسند تھی اور بمبئی میں اکثر کھاتے تھے، فصل میں آم بہ شوق کھاتے تھے، برف کی قلفیاں بھی کھاتے تھے لیکن اس کا کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے، ایک بار برف کی قلفیاں بکنے کو آئیں تو خریدنا چاہی، کسی نے کہا اچھی نہیں ہیں، فرمایا "منہ تو بہرحال ٹھنڈا ہو جائے گا" پانی ہمیشہ ٹھنڈا پسند کرتے تھے، یہاں تک کہ جاڑوں میں بھی برف استعمال کرتے تھے، تازہ اچھے گھی کے بہت شائق تھے، وطن آتے تھے تو اس کی فرمایش کرتے تھے، لکھنؤ میں لکھنؤ کے آس پاس کے رہنے والے شاگردوں سے ان کے گاؤں سے فرمایش کر کے گھی منگواتے تھے، مولوی مسعود علی صاحب گھی اور رساول کی خدمت انجام دیا کرتے تھے، بمبئی میں گھی اچھا نہیں ملتا تو باہر سے ڈاک سے اچھا گھی دوستوں اور عزیزوں سے فرمایش کرتے تھے، یہ شوق اخیر اخیر تک قائم رہا، بمبئی سے ۱۸/مئی ۱۹۱۳ء کو مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو مظفر پور لکھتے ہیں "اگر آپ صرف سیر بھر تازہ اور عمدہ گھی بھیجیں تو میں ممنون ہوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ اگر سیر بھر سے ایک ماشہ بھی زیادہ ہوا تو گستاخی معاف ہو، مگر واپس کر دوں گا اور تازگی کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کو بنے ہوئے دو تین روز سے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو، یہاں گھی کے سوا ہر چیز ملتی ہے، میں نے وطن کی مختلف قرابتوں میں بھی فرمایش بھیج دی ہے، مگر مقدار وہی مقرر کی ہے جو آپ سے کی ہے۔" (ریاض-۲۲)

بمبئی میں اچھا گھی نہیں رہتا تھا تو تازہ مکھن لے کر اس کا گھی بنا لیتے تھے۔

دولت کی بے قدری مولانا نے جس ماحول میں زندگی بسر کی اس کا قدرتی نتیجہ تو یہ تھا کہ وہ دولت، عزت، شہرت، حکومت اور شان و شوکت وغیرہ کے اسی قدر دلدادہ ہوتے، جتنا ایک دنیادار آدمی ہوسکتا تھا، غور کرو، ایک ایسا شخص جس نے ایک آسودہ خاندان میں پرورش پائی ہو جو ایک صاحب اقتدار زمین دار ہو، جس کے باپ، جس کے بھائی اور جس کے عزیز و اقارب وکیل، بیرسٹر اور اعلا سرکاری عہدہ دار ہوں اور انگریزی طریق پر بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہتے ہوں، جس نے علی گڑھ میں سولہ برس تک قیام کیا ہو اور اس کی نگاہ سے دنیاوی جاہ و جلال کے تمام مناظر گزر چکے ہوں، جو مدتوں حیدرآباد کے امرا کی سوسائٹیوں میں زندگی بسر کر چکا ہو، اس کے دل میں دنیوی جاہ و جلال، دنیوی نام و نمود اور دنیوی عیش و عشرت کے علاوہ اور کون سا خیال پیدا ہوسکتا تھا۔

لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی دنیاوی آرایش و آسایش کی طرف ان کو متوجہ نہ کر سکی، انہوں

نے عام طور پر اپنی زندگی نہایت سادگی سے بسر کی، تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے چند دنوں نقل نویسی اور امانت کا کام کیا، جس کی تنخواہ نہایت کم تھی، امانت کی ملازمت میں دیانت کی بدولت جو مصیبتیں اٹھائیں ان کو لطف سے بیان فرماتے تھے، چند روز وکالت کی اور آمدنی کے لحاظ سے ان کا وہی حال رہا جو ایک نئے وکیل کا ہو سکتا ہے، علی گڑھ میں ملازمت کی تو ابتدائی تنخواہ چالیس روپیہ ماہوار قرار پائی اور ۱۶ برس کی مدت میں بتدریج سو روپیہ تک پہنچی، اسی تنخواہ میں ایک بچہ ایک بھائی ایک معلم دو نوکر اور خود مولانا کے مصارف شامل تھے اور ایک بنگلہ میں رہتے تھے، تعجب ہوتا ہے کہ اس قلیل رقم میں وہ اتنی صاف ستھری زندگی کیوں کر بسر کرتے تھے، علی گڑھ سے قطع تعلق کیا تو حیدر آباد سے جو وظیفہ مقرر ہوا، اس کی مقدار بھی اس سے زیادہ نہ تھی، بعد کو وہ اگرچہ حیدر آباد میں چند سال کے لیے بمشاہرہ پانچ سو ماہوار ملازم ہو گئے تھے لیکن اس میں بھی وہ ایک معقول رقم والد کے قرضہ میں نکل جاتی تھی اور بقیہ وہاں کی کثیر المصارف زندگی کی نذر ہوتی تھی، حیدر آباد سے مستعفی ہوئے تو پھر وہی سو روپیہ کا وظیفہ جاری ہو گیا، اخیر میں اگرچہ اس میں دو سو کا اور اضافہ ہو گیا تھا لیکن موت نے ان کو اس سے ایک سال سے زیادہ متمتع ہونے کا موقع نہیں دیا اور وہ بھی زیادہ تر دوسرے کاموں میں صرف ہوا۔

ان کے خاندان اور سسرال کی دو تین ہزار کی جائیداد بھی تھی، مگر کبھی انہوں نے اس سے اپنا حصہ لینا پسند نہیں کیا اور ہمیشہ اپنی ہی کمائی کی روٹی پر قناعت کی، اسی طرح اپنی کتابوں کی آمدنی سے بھی انہوں نے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا، جب تک علی گڑھ میں رہے، ان کی تالیفات کالج کی نذر ہوتی رہیں، یعنی اسی نے ان کو چھپوایا اور اسی نے منافع حاصل کیا، حیدر آباد گئے تو ان کی کتابیں سررشتۂ علوم وفنون کی ملکیت رہیں، ان کی ذات کو ان سے کوئی تعلق نہیں رہا، جب ۱۹۰۵ء میں ندوہ آئے اور سوانح مولانائے روم، موازنہ اور شعر العجم چھپیں تو ان کے زمانہ میں شاید ان کی لاگت نکل آئی ہو تو نکل آئی ہو، اس زمانہ میں اگر ان کو فائدہ ہوا تو یہ ہوا کہ ایک کتاب کی فروخت سے جو کچھ ہاتھ آتا وہ دوسری کتاب کی چھپائی میں خرچ ہو جاتا۔

امتحانات کے پرچوں سے بھی ان کو کچھ آمدنی ہو جاتی تھی، مگر وہ ضروریات ہی میں صرف ہو جاتی۔

حیدر آباد کے بعد بے سہارے ندوہ آ کر بیٹھ جانا ایسا واقعہ تھا کہ ''علی گڑھ پارٹی'' کے لوگ اس کو خودکشی کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے، اس وقت مولانا کے لیے حصولِ معاش کے بیسیوں دروازے

کھلے ہوئے تھے، بالخصوص علی گڑھ کالج تو ان کے لیے بالکل چشم براہ تھا اور نواب محسن الملک مولانا کو ہر قسم کی ترغیبات دے کر کالج میں بلانا چاہتے تھے، چنانچہ جب مولانا نے حیدرآباد سے الگ ہو کر ندوہ میں آنا چاہا تو نواب صاحب نے لکھا کہ فوراً کالج میں چلے آیئے، حیدرآباد کا سابق وظیفہ بھی جاری ہو جائے گا اور ۱۰۰ روپیہ کالج سے بھی ملیں گے لیکن مولانا نے اس کو نامنظور کیا، اس کے بعد ہز ہائینس بیگم صاحبۂ بھوپال کی طرف سے ان کو بھوپال جانے کی ترغیب دی لیکن یہ افسوں بھی کارگر نہ ہو سکا، ندوہ میں آنے کے بعد انہوں نے مولانا کا پیچھا نہیں چھوڑا، چنانچہ جب کالج میں عربی کی ایک اعلیٰ کلاس کھولی گئی اور اس کے لیے ایک مشہور جرمن مستشرق یوسف هارویز بلائے گئے تو نواب محسن الملک نے مولانا کو دوسو روپیہ ماہوار پر ان کی اسسٹنٹی کے لیے بلایا لیکن مولانا نے صاف لکھ دیا کہ

ع "شاخِ بریدہ را نظرے بر بہار نیست"

حیدرآباد میں علوم مشرقیہ کی یونیورسٹی قائم ہوئی تو نظامت کے لیے بمشاہرۂ معقول مولانا کا نام پیش ہوا لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا اور ایک خط میں لکھا "یونیورسٹی کی نظامت مجھ کو دیتے ہیں، مشاہرہ بھی معقول ہے لیکن اب کسی کے آگے کیا سر جھکاؤں۔" (مہدی-۴۷)

بہر حال اگر مولانا کی آمدنی کا اوسط نکالا جائے تو سو روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ ہوگا اور یہ ایک ایسی رقم ہے جو مولانا کے کمالات کے سامنے بالکل ہیچ ہے، سادہ زندگی کی وجہ سے اگرچہ ان کے ذاتی مصارف کچھ زیادہ نہ تھے تاہم انہوں نے کبھی بدحیثیتی کے ساتھ زندگی بسر نہیں کی، ایک دو ملازم ہمیشہ ان کے ساتھ رہتے تھے، کپڑے متوسط درجے کے پہنتے تھے، کھانے کے شوقین تھے، یعنی بدمزہ کھانا وہ کبھی نہیں کھا سکتے تھے، قلمی کتابوں کا شوق الگ تھا، ایک ایک کتاب کے سوسوا اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے وہ دے ڈالتے تھے، بڑے بڑے چندے بھی دیتے تھے، قومی اور علمی کاموں کے لیے اکثر اپنے کرایہ سے سکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے، بلاد اسلامیہ کے سفر کے کل مصارف خود برداشت کیے اور کسی سے اس میں ایک حبہ کی مدد قبول نہیں کی، اخیر میں تبدیل آب و ہوا اور ترقی صحت کے لیے ہر سال بمبئی چار پانچ مہینہ قیام کرتے تھے اور اس حالت میں ان کے مصارف بہت زیادہ بڑھ جاتے تھے، ان اسباب سے ان کی مالی حالت کبھی اچھی نہیں رہتی تھی، مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار حیدرآباد سے وظیفہ آیا اور انہوں نے اسی وقت اس کو ضروری مصارف میں خرچ کرنا شروع کیا، اخیر میں صرف چند روپے رہ گئے

تو دبی زبان سے فرمایا کہ "یہ رقم کافی نہیں ہوتی" اگر اتفاق سے کبھی روپے زیادہ بچ جاتے تو ان کو یوں ہی بے گنے ایک چھوٹے سے آفس بکس میں ڈال دیتے اور اس میں سے نکالتے رہتے اور جب کچھ نہ رہتا تو سمجھ لیتے کہ سب خرچ ہو گیا اور وہ اس باب میں ایسے سادہ تھے کہ ان روپیوں میں سے کوئی دوسرا نکال لیتا تو ان کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی، ایک دفعہ مولانا کے ایک عزیز طالب علم جو ان کے پاس ندوہ کے قیام کے زمانہ میں آتے جاتے رہتے تھے، کئی مہینہ تک اس میں سے نکالتے رہے اور مولانا کو کچھ پتہ نہ چلا، آخر میں اس میں سے ایک گنی نکال لی جو اس میں رکھی ہوئی تھی تو احساس ہوا، روپے، پیسے، نوٹ یوں ہی بے قدری سے فرش پر ڈال دیتے تھے، کتابوں میں رکھ دیتے تھے، وہ گم بھی ہو جاتے تھے۔

ایک دفعہ مولانا پٹنہ گئے، اتفاق سے میں بھی وہیں تھا، ملنے گیا تو فرمایا "رات مچھروں نے بہت دق کیا، کسی پتلے کپڑے کی ایک چادر سلوا دو" یہ کہہ کر روپیہ دیا، میں شام کو کپڑا خرید کر اور چادر سلوا کر لایا تو وہ موجود نہ تھے، میں نے ان کے بستر کے سرہانے چادر رکھی اور ایک کاغذ پر اس کا حساب لکھ کر رکھ دیا اور باقی پیسے بھی وہیں رکھ دیے، دوسرے دن ملنے گیا تو ملال کا اظہار کیا کہ تم کو ایک روپیہ کے حساب لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

شروع شروع میں جب وہ ندوہ آئے ہیں تو مدرسہ گولہ گنج کے ایک مکان میں تھا، اس کی سب سے بالائی چھت پر ایک کمرہ تھا، جس کی لمبائی چوڑائی ۱۰×۳۰ فیٹ ہو گی، مولانا کا پورا اثاثہ یہیں تھا، یہی خواب گاہ، یہی ملاقات کا کمرہ، یہی دار المطالعہ، یہی کھانے کا کمرہ اور یہی مہمان خانہ، سب تھا، ایک طرف پلنگ پر بستر تھا، باقی دری تھی، جس پر وہ خود اور آنے جانے والے بیٹھتے تھے، مجھے بار بار حیرت ہوتی کہ وہ ہستی جس کے آوازہ سے سارا ہندوستان معمور ہے، وہ کیوں کر ایک چھوٹے سے کمرہ میں زندگی گزار رہا ہے اور اس خوبی سے کہ خود باغ و بہار، جو پاس بیٹھے وہ بھی شگفتہ ہو کر جائے۔

اور ان کا اثاثہ کیا تھا، بستر اور کپڑوں کا ایک بکس، چائے کا مختصر سامان، لکھنے پڑھنے کی ایک میز اور دو کرسیاں، باہر کچھ مونڈھے اور بس، غرض ان کی زندگی گویا حدیث نبوی ﷺ

كن فى الدنيا كانك غريب او كعابر سبيل (ترمذی)	دنیا میں ایسے رہو گویا کہ تم مسافر ہو یا راہ سے گزر رہے ہو۔

کے مطابق تھی۔

استغنا اور بے نیازی قدیم علما کی ایک بڑی خصوصیت بے نیازی تھی اور مولانا میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر پائی جاتی تھی، آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں، کالج سے علاحدہ ہونے کے چند روز بعد امیر عبدالرحمٰن خاں والی کابل کو جب ترجمہ ابن خلدون کا خیال پیدا ہوا اور انہوں نے اس کے لیے ایک معقول رقم یعنی دس ہزار روپیہ صرف کرنا چاہا اور اپنے سفیر ہندوستان کو اس کی اطلاع دی اور سفیر موصوف نے اس کے لیے مولانا سے خط و کتابت کی تو مولانا نے صاف انکار کیا، امیر صاحب نے نہایت وسیع پیمانہ پر کلکتہ میں ایک دارالترجمہ قائم کرنا اور مولانا کو اس کا سکریٹری مقرر کرنا چاہا تو مولانا نے اس عہدے کو بھی قبول نہیں کیا۔

حیدرآباد میں چند سال کی ملازمت بھی جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے، مجبوراً اختیار کی تھی، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں "گھر کے مصائب نے یہاں تک بھی پہنچا دیا ورنہ میں اپنے گوشۂ عافیت کو فلک نما سے کم نہیں سمجھتا ہوں۔" (مکاتیب سمیع-۴۷)

یہی وجہ ہے کہ جب حیدرآباد میں سیاسی تغیر ہوا تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے لیے کسی قسم کا جوڑ توڑ کرتے، نہایت خوشی کے ساتھ اس تعلق کو چھوڑ کر غریبانہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو گئے، اس کی نسبت خود لکھتے ہیں "میں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ کوئی معقول بات نکل آئے تو خیر ورنہ دنیاوی خواہشوں سے صاف دست بردار ہوتا ہوں، سو روپے ہیں، چھاؤنی، عالیہ، اسکول وغیرہ کے چالیس پچاس نکل جائیں گے، باقی جس قدر بچے گا اس سے غریبانہ زندگی خاصی طرح بسر ہو سکتی ہے۔" (مکاتیب اسحاق-۱۹)

مولانا جس طرح مال و دولت سے بے نیاز تھے، اسی طرح جاہ و شہرت کی بھی ان کو ہوس نہ تھی، جاہ و عزت کا سب سے بڑا مرکز علی گڑھ تھا لیکن انہوں نے علی گڑھ کالج پر غریب ندوہ کی خدمت کو ترجیح دی، خود ندوہ میں سب سے بڑی چیز نظامت تھی، جس کے لیے اور بھی بہت سے مدعیانِ توکل و قناعت مدتوں امیدوار رہے لیکن جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، مولانا نے کبھی نظامت کی خواہش نہیں کی اور ہمیشہ وزیر بن کر کام کرنا چاہا، یہ سچ ہے کہ ندوہ میں وہ تمام کام اپنے نام سے کرتے تھے، جس سے بعض لوگوں کو خیال پیدا ہوتا تھا کہ وہ یہ سب کچھ نام و نمود کے لیے کر رہے ہیں لیکن درحقیقت اس کے دو سبب تھے، ایک تو یہ کہ ان کاموں کی طرف ان ہی کو توجہ پہلے ہوتی تھی، وہی ضرورت محسوس کرتے تھے، پھر دوسروں کو متوجہ کرتے تھے، اس لیے قدرتی طور پر ان کی حیثیت اصل محرک کی اور دوسروں کی مؤید کی ہوتی تھی۔

دوسری بات یہ تھی کہ دنیا اس قدر ظاہر پرست واقع ہوئی ہے کہ جب تک کوئی تحریک کسی ممتاز

آدمی کی طرف سے نہیں اٹھتی، اس کی طرف توجہ نہیں کرتی، مولانا بار بار تجربہ کر کے اس کو دیکھ چکے تھے، اس لیے مجبوراً اپنے کو آگے رکھتے تھے۔

ندوہ کی مخالفتوں کے زمانہ میں اشاعت اسلام کے سلسلہ میں ایک دفعہ میں نے جرأت کر کے مولانا کو لکھا کہ ان خطوں میں ان کے بہ جائے کسی دوسرے رکن انتظامی کا نام لکھ دیا جائے تو اچھا ہے تاکہ مخالفوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ یہ ہر کام میں اپنے ہی کو آگے رکھتے ہیں، اس پر جواب آیا، لکھتے ہو کہ لوگ میرے نام سے گھبرا گئے، بھائی یہ کاغذات دو برس سے چھپے پڑے ہیں، بیسیوں ضروری فرائض آنکھ سے دیکھتا ہوں اور زبان سے ہر وقت ہائے پکارتا ہوں، اسی اشاعت کے متعلق الہلال میں خط تک چھپوا دیا، جب کوئی نہ کرے تو کیا کروں، واللہ اب نام و نمود اور افسری کا شوق نہیں، کوئی کرے اس کے ساتھ ہوں، اور پیرو بن سکتا ہوں۔"

اسی خط میں لکھتے ہیں "تم کہتے ہو کہ بہ جائے اپنے مشیر حسین یا نواب علی حسن خاں کا نام لکھوں، وقف اولاد کے متعلق ابتدأ میں نے خود اشتہار دیا تھا کہ جو چندہ بھیجا جائے منشی احتشام علی کے پاس بھیجا جائے، صرف آٹھ روپے ان کے پاس آئے، پھر اچھے صاحب کے نام سے انگریزی کاغذات بھیجے، ایک شخص نے الٹ کر جواب نہیں دیا، مشیر حسین وغیرہ کا نام لکھ کر دیکھ لو، ایک درجن آدمی بھی جواب نہ دیں گے، تجربہ کرو تو معلوم ہو جائے گا، تم سمجھتے ہو کہ میں اپنے نام کے لیے ہر کام میں اپنا نام رکھتا ہوں، لیکن تجربہ کر کے ایسا کرنا پڑتا ہے۔" (۴۰)

اخیر زندگی میں جس کے چند ہی روز کے بعد انہوں نے وفات پائی، اپنے بھائی مولوی حمید الدین صاحب کو لکھا کہ ضرورت اس کی تھی کہ دار المصنفین کے لیے چند لوگ یک جا ہو جاتے لیکن میری دنیا طلبی کا یہ حال ہے کہ خود بے نیاز ہو گیا ہوں لیکن عزیزوں کی بے تعلقی شاق[1] گزرتی ہے:

مرا گر تو بگذاری اے نفس طامع بس پادشاہی کنم در گدائی"

کتنے مؤثر فقرے ہیں۔

خودداری | مولانا اگرچہ مغرور نہ تھے، تاہم وہ فطرۃً سخت خوددار تھے اور جب ان کو کوئی کام خودداری کے خلاف کرنا پڑتا تھا تو ان کو سخت صدمہ ہوتا تھا، ابتدائی زمانہ میں ان کو امانت و نقل نویسی کے کام سے خلاف مذاق ہونے کے علاوہ اس بنا پر بھی عار و شرم محسوس ہوتی تھی کہ وہ اس کو اپنی خودداری اور عزت

[1] ترک خدمت و نوکری۔ "س"

نفس کے خلاف سمجھتے تھے، نقل نویسی کی تنخواہ ان کو ۱۰ روپیہ ماہوار ملتی تھی، جس کی نسبت فرماتے تھے کہ جب اس کا تصور کرتا تھا تو مجھے رونا آتا تھا، کچہریوں کے معمولی ملازم عموماً پیدل جایا کرتے تھے لیکن مولانا نے اس حالت میں بھی اپنی خودداری کو قائم رکھا تھا اور فرماتے تھے کہ باوجودیکہ میری تنخواہ دس روپے ماہوار تھی، تاہم میں کچہری ہمیشہ یکہ سے جاتا تھا اور تنخواہ کے نو روپے صرف یکہ کے کرایہ میں صرف ہو جاتے تھے، علی گڑھ میں گئے تو اگرچہ ابتداً اسکول کی مدرسی قبول کر لی تاہم وہ اس کو اپنے لیے موجب ذلت سمجھتے تھے، چنانچہ اس زمانہ کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں، اینجا کہ آرمیدہ ام واین مذمت برخویش پسندیدہ نہ دانم ناچرخ رادریں پردہ چہ نیرنگہاست'' (مکاتیب-۲)

اس زمانہ میں صرف چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ تھی، تاہم انہوں نے کبھی ذلت کے ساتھ رہنا گوارا نہیں کیا، ابتدا میں وہ شہر میں رہتے تھے، جو کالج سے دور تھا، اس لیے کالج میں پیدل نہیں آ سکتے تھے لیکن فرماتے تھے کہ باوجود قلت تنخواہ میں نے کبھی یکہ پر آنا جانا پسند نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ گاڑی پر آیا جایا کرتا تھا۔

کالج میں اگرچہ ان کے تعلقات تمام لوگوں کے ساتھ دوستانہ اور مساویانہ تھے اور سرسید نواب محسن الملک اور مولوی سمیع اللہ خاں وغیرہ ان کی نہایت عزت اور قدر کرتے تھے، تاہم جب کبھی اصول وقواعد کی رو سے ان کو اپنی حیثیت اور لوگوں سے کم نظر آتی تھی تو ان کو اس کا سخت صدمہ ہوتا تھا، فرماتے تھے کہ ایک بار اسٹریچی ہال میں جلسہ ہوا اور لوگ تنخواہ کے لحاظ سے درجہ بدرجہ آگے پیچھے بٹھائے گئے اور اس وقت میری کرسی بہت پیچھے رہی تو میں نے یہ منظر دیکھ کر گردن جھکا لی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔''

ملازمت سے نفرت اور آزاد وظیفہ کی خواہش اگرچہ ان کو زیادہ تر اس بنا پر تھی کہ وہ ملازمت کی پابندی کے ساتھ خالص علمی اور قومی زندگی نہیں بسر کر سکتے تھے، تاہم اس میں خودداری کا مخفی جذبہ بھی موجود تھا، کیوں کہ ملازمت کی وجہ سے بعض اوقات ایسی باتیں پیش آ جاتی تھیں جن کو وہ گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن باوجود اس خواہش کے انہوں نے وظیفہ کے لیے کبھی اپنی خودداری کو صدمہ نہیں پہنچایا، وہ جس زمانہ میں علی گڑھ میں تھے، اس وقت نواب علی حسن خاں بہادر بھوپال میں تھے، اور ریاست بلکہ خود

نواب شاہ جہاں بیگم پر ان کا بہت بڑا اثر تھا، وہ مولانا کے بہت بڑے دوست اور نہ صرف دوست بلکہ سخت معتقد تھے اور اپنے جاہ واقتدار سے مولانا کو ہر قسم کے امکانی فوائد پہنچانا چاہتے تھے اور اس کے لیے مولانا کے اشارہ کے منتظر رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ مولانا کی طرف سے کسی خواہش کا اظہار ہو، لیکن ایک مدت تک تو مولانا کی خودداری نے اس کا موقع ہی نہیں دیا اور ان کے بار بار کے اصرار سے ایک بار وظیفہ کے لیے لکھا بھی تو شرم وغیرت نے آب آب کر دیا، فرماتے تھے کہ عرفی نے ایک موقع پر کہا تھا:

ردو دمان اصیلم ہمیں گواہم بس　　　　که شرم ایں تخم خوے ز چہرہ بیروں داد

میں نے بھی جب نواب صاحب کو یہ خط لکھا تو مجھے پسینہ آ گیا۔"

انہوں نے حیدرآباد میں بعض مجبوریوں سے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، گو ملازمت اختیار کر لی تھی لیکن وہ اس کو دل سے پسند نہیں فرماتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں "بے شبہ اگر میں ملازمت کر سکتا اور کسی قدر دنیا داری بھی مجھ سے بن پڑتی تو دنیاوی فائدے بہت حاصل ہوتے، لیکن میاں سمیع، عمر کا بہت بڑا حصہ صرف ہو چکا، چند برسوں کے لیے دامن زندگی کو کیا آلودہ کروں، دعا کرو کہ جو گردن ہمیشہ بلند رہی بلند رہے، گھر کے مصائب نے یہاں تک بھی پہنچایا، ورنہ میں اپنے گوشۂ عافیت کو فلک نما سے کم نہیں سمجھتا ہوں۔" (مکاتیب سمیع-۴۷)

حیدرآباد کی ملازمت سے چند ہی سال کے بعد ان کو الگ ہونا پڑا، جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی خودداری چھوڑ کر امرا کے سامنے سر جھکانے پر آمادہ نہ ہوئے، چنانچہ ایک خط میں نواب محسن الملک بہادر کو تحریر فرماتے ہیں "مولوی صاحب! روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ اور کسی کو نہیں، میں کچھ ابراہیم ادہم اور بایزید نہیں ہوں، میرا رُواں رُواں دنیا کی خواہشوں سے جکڑا ہے لیکن دنیا کو سلیقہ کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں، مجھ سے جوڑ توڑ، سازش، دربارداری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہیں ہو سکتی اور بغیر اس کے کامیابی معلوم، اس لیے میں نے گوشۂ عافیت پسند کیا۔"

ایشیائی سلطنتوں میں مدح گستری اور قصیدہ گوئی کامیابی کا ایک بڑا ذریعہ خیال کی جاتی ہے، اور دیسی ریاستوں میں اب بھی ایشیا کی یہ قدیم شان قائم ہے، مولانا فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے، اس لیے اگر انہوں نے ایشیائی شعرا کی اس مبتذل روش کو اختیار کیا ہوتا اور امرا کی قصیدہ خوانی کر سکتے تو ان کو اپنی کامیابی کا نہایت آسان ذریعہ ہاتھ آ جاتا لیکن انہوں نے ہمیشہ امرا وسلاطین کی مداحی کو اپنے

لیے ننگ و عار سمجھا، ۱۹۰۱ء میں موجود حضور نظام حیدر آباد اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں بندوق کے صدمے سے بال بال بچ گئے، تو مولانا نے اس مسرت میں بے شبہ ایک قصیدہ لکھا لیکن یہ اعیانِ حیدر آباد کی فرمایش بلکہ اصرار کا نتیجہ تھا، صلہ و کام یابی کی خواہش کو اس میں دخل نہ تھا اور وہ بھی تمام تر تہنیت اور دعائے سلامتی پر مشتمل رہا۔

بیگم صاحبہ بھوپال نے جب ۱۹۰۸ء میں ندوۃ العلما کے لیے دوسو روپیہ ماہوار مقرر فرمائے تو اس کے شکریہ کے لیے جو جلسہ کیا گیا، اس میں بھی مولانا نے ایک قصیدہ پڑھا تھا، یہ قصیدہ اگرچہ ایک قومی حیثیت رکھتا تھا، تاہم مولانا اپنی خودداری کو ذرہ برابر ٹھیس لگانا پسند نہیں کرتے تھے، آخر اخیر کے شعر میں اپنی خوددارانہ شان کا اظہار کر ہی دیا:

شبلیِ غمزدہ را مدحِ شہاں شیوہ نہ بود　　　لیک لطفت ہمہ رابندۂ احساں کردہ است

۱۹۰۲ء میں جب مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر ہوئے تو بحیثیت ملازم سرکار وہ بھی ان کو نذر دینے گئے، تو ان کے ایڈیکانگ نے کہا کہ آپ نے تو تہنیت کا قصیدہ لکھا ہوگا، تو انہوں نے ذرا تیکھے ہو کر کہا ''یہ اوروں کا پیشہ ہے، میں یہ کام نہیں کرتا'' اس پر ردو بدل ہوئی اور انہوں نے ناگواری کے ساتھ کہا کہ میں کسی کی مدح نہیں کرتا۔

اسی طرح ۱۹۰۹ء میں بیگم صاحبہ جنجیرہ نے ندوہ کی تعمیر میں ایک رقم بھیجی تو اس کے جواب میں ان کو شکریہ کا ایک قطعہ لکھ کر بھیجا، مگر ان میں سے کسی میں بھی شاعرانہ خوشامد و مذلت کی خورو نہیں رکھی۔

نذر و نیاز کے طریقہ کو بھی خودداری کے خلاف سمجھتے تھے اور اس پر کتنے ہی خوش نما پردہ ڈالا جائے لیکن اس سے ہمیشہ احتراز کرتے تھے، نواب علی حسن خاں بہادر نے ان کے ساتھ ایک بار اس قسم کا سلوک کرنا چاہا اور ریل پر چلتے وقت ایک معقول رقم نذر کرنی چاہی، لیکن انہوں نے قبول کرنے سے انکار کیا، ایک دفعہ مولانا شروانی فرماتے تھے، بہت ابتدائی زمانہ تعلق و ملاقات میں جب مولانا کو میں نے پہچانا نہ تھا، ایک کتاب مطبوعہ میرے یہاں سے طلب فرمائی جو میرے یہاں نہ تھی، میں نے سادہ لوحی سے لکھ دیا کہ کتاب دوکان سے طلب کر لیجیے، رقم میں ادا کر دوں گا، اس پر اس گرمی سے ڈانٹا کہ آج تک یاد ہے، میری معذرت ساختہ یہ تھی کہ مقصد یہ تھا کہ کتاب آ جائے گی تو میرے یہاں رہے گی''، ہر ہائینس بیگم صاحبہ مرحوم بھوپال نے اپنی ایک تصنیف کی اصلاح کے معاوضہ میں دوسو روپے

نذر کیے، لیکن مولانا نے ان کو خود لینا پسند نہیں فرمایا، سرکاری اہل دفتر کو ہدایت فرمائی کہ وہ ان کو ندوہ کے حساب میں منتقل کر دیں۔

ایک بار ٹرکی کے سفر میں اس قسم کا نہایت بدنما منظر سامنے آیا، مولانا ذکی پاشا سے ملنے گئے، تو عربی وضع میں تھے، پاشا موصوف کو اس وقت نہایت جلدی تھی، سلام علیک کے ساتھ ہی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ مجیدیاں (ٹرکی سکہ) نکالیں، پہلے تو مولانا کو سخت تعجب ہوا، پھر خیال آیا کہ انہوں نے ان کو گداگر سمجھا، اس خیال سے مولانا کو سخت رنج ہوا اور رنج کے ساتھ غصہ آیا اور چلا کر کہا:

شو هذا ما جئنا لهذا لسنا من الفقراء۔ یعنی یہ کیا ہے؟ ہم اس لیے نہیں آئے، ہم محتاج نہیں ہیں۔

شیخ علی ظبیان بھی مولانا کے ساتھ تھے، پاشائے موصوف نے ان سے مولانا کے غصہ کی وجہ پوچھی، انہوں نے مولانا کے آنے کی غرض و غایت بیان کی تو پاشائے موصوف کو سخت ندامت ہوئی اور معذرت کے ساتھ کہا کہ آپ بالا خانہ پر چلیے میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں، مولانا اس واقعہ کی تفصیل کے بعد لکھتے ہیں ''مجھ کو اس بات کے معلوم ہونے سے کہ یہاں علما اور متصوفین جب کسی امیر یا عہدہ دار سے ملتے ہیں تو اسی غرض سے ملتے ہیں کہ ابعض نورانی ہاتھ آئے، ذکی پاشا کی بدگمانی کا رنج تو جاتا رہا، لیکن اس فرقہ کے حال پر بہت افسوس ہوا، نذر و نیاز کے طریقہ کو میں ہندوستان کے ساتھ مخصوص سمجھتا تھا لیکن افسوس یہاں بھی اس سے نجات نہیں پائی۔'' (سفرنامہ ص-۶۷)

نہ صرف نذر و نیاز بلکہ عموماً کسی قسم کی مالی اعانت قبول کرنا پسند نہیں فرماتے تھے، ایک بار وہ بیمار تھے، ان کے بھائی مولوی اسحاق مرحوم نے بغرض علاج ان کے پاس دو سو روپے بھیجے لیکن انہوں نے واپس کر دیے۔

اٹلی سے ان کے نام اورنٹیل کانفرنس کی شرکت کا دعوت نامہ آیا تو نواب علی حسن خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ اس علمی سفر کے مصارف قومی چندے سے ادا کیے جائیں لیکن مولانا نے ان کو لکھا کہ ''میری مالی اعانت کی ضرورت نہیں اور اگر کسی قدر ہے تو اس کو حمیت نفس نے رفع کر دیا ہے، اصل یہ ہے کہ ابھی ملک کی یہ حالت نہیں کہ اس قسم کے کام تحسین کی نگاہ سے دیکھے جائیں، آپ کو تو یہ پہلو پیش نظر ہے کہ قوم نے مل کر ایک اچھا کام کیا اور عام زبانوں پر یہ ہوگا کہ شبلی دریوزہ گری کر کے یورپ گیا۔'' (مکاتیب دوم)

ندوہ کی کام یابی کے لیے اگر چہ وہ ہر قسم کی کوششیں کرتے تھے، تاہم اس کے لیے بھی ان کا لب سوال بہ مشکل کھلتا تھا، شملہ ڈیپوٹیشن میں گئے، تو اپنے لکچر میں نہایت دبی زبان سے چندہ کی تحریک کی تو یہ شعر پڑھا:

عاشق تازہ ہوں اور وصل کی اول شب ہے شرم سے کہہ نہیں سکتا ہوں کہ کیا مطلب ہے

ایک بار لکھنؤ میں جان محمد مالک ہوٹل کی نسبت مشہور ہوا کہ وہ ایک معقول رقم کسی قومی کام میں دینا چاہتے ہیں، بعض احباب کے اصرار سے مولانا بھی ان سے ملنے گئے اور اسی قسم کی قومی باتیں ہوئیں، مولانا فرماتے تھے ''مجھے تعجب تھا کہ میں اس قدر ذلیل ہو گیا کہ روپیہ کے لیے دولت مندوں کے گوشۂ چشم کا منتظر رہتا ہوں، میری یہ حالت تھی کہ علی گڑھ کے ایک رئیس نے مجھ سے ملنا چاہا اور اس غرض سے اپنی گاڑی بھیج دی لیکن میں نے صاف کہہ دیا کہ اگر ان کو ملاقات کا شوق ہے تو خود آئیں، میں نہیں جا سکتا۔''

ایک بار حافظ عبدالحلیم صاحب رئیس و تاجر کان پور نے ندوہ میں پانچ سو روپے دیے، مولوی عبدالسلام صاحب ندوی اس وقت الندوہ کے سب ایڈیٹر تھے، انہوں نے اپنے شذرات میں اس کا ذکر منت پذیری کے ساتھ کیا اور اخیر میں لکھا کہ ''ان کی فیاضی ندوہ کو گل بداماں کر سکتی ہے'' چوں کہ شذرات میں جو کچھ لکھا جاتا تھا، مولانا کی طرف منسوب ہوتا تھا، اس لیے مولانا نے اس کو دیکھا تو سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ میں اس قسم کی خوشامدانہ الفاظ کو اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہیں کر سکتا۔

ایک بار کسی جشن کے موقع پر ندوہ کی طرف سے نواب صاحب بھاولپور کی خدمت میں دعا نامہ بھیجنے کی تحریک ہوئی اور مولانا سے دعا نامہ لکھنے کی خواہش کی گئی، تو انہوں نے اس کو سخت ناپسند کیا اور لکھا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ نہایت دنائت کی بات ہے کہ موقع جشن پر اور منگتوں کی طرح ندوہ کا وفد بھی اپنا بھجن گائے، علما کی شرکت اسی قسم کے خیالات پیدا کرتی ہے، کیا علی گڑھ کالج بھی ایسی بدہمتی کر سکتا ہے۔'' (عبدالحی-۱)

عدم قبول احسان خود داری اور بے نیازی نے مولانا کو ہمیشہ لوگوں کے احسانات سے سبک دوش رکھا، عربی کی طالب علمی کے زمانہ میں تو یہ گناہ عموماً معاف ہوتا ہے، مگر وہ اس گناہ کے کبھی مرتکب نہیں ہوئے اور ہمیشہ اپنے کھانے پینے کا سامان خود کیا، ان کے والد جو کچھ ماہوار بھیجتے تھے،

بن پڑتا تھا، بسر کرتے تھے، طالب علمی کے بعد جب خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لائق ہوئے تو والد ماجد کو بھی زحمت دینے سے احتراز کیا، حیدرآباد کے وظیفہ کے لیے تو بے شبہہ انہوں نے بعض احباب کا احسان اٹھایا لیکن اس کے علاوہ انہوں نے کسی سے معمولی سے معمولی احسان کا اٹھانا بھی گوارہ نہیں کیا، ممالک اسلامیہ کے سفر کو روانہ ہونے لگے تو اپنے والد سے بھی مالی امداد قبول نہیں کی اور نہیں چاہا کہ ان کی وجہ سے کوئی دوسرا زیر بار ہو، بعض بزرگوں نے اس پر بھی ان کے قسطنطنیہ پہنچنے کے بعد ان کے پاس روپے بھیجے تو واپس کر دیے، واپسی کے بعد ریاست رام پور نے سفر کے کل مصارف ادا کرنے چاہے تو اس سے بھی انکار کیا۔

لکھنؤ میں نواب سید علی حسن خاں مولانا کے بہت بڑے دوست بلکہ بہت بڑے معتقد تھے، وہ بہت چاہتے تھے کہ مولانا سال میں چند مہینے ان کی کوٹھی میں قیام کریں لیکن مولانا نے اس کو کبھی پسند نہیں کیا، بمبئی میں اگرچہ مکانات بہت گراں ہیں اور بعض حالات میں بہ مشکل ملتے ہیں لیکن مولانا نے وہاں بھی کسی دوست یا کسی تاجر کے یہاں قیام کرنا پسند نہیں کیا، ایک دفعہ بمبئی میں ایک رئیس نے ان کو اپنے یہاں ٹھہرانا چاہا لیکن انہوں نے اس کو منظور نہیں کیا، بمبئی سے چار مہینہ کے لیے حیدرآباد گئے تو وہاں بھی کرایہ کا مکان لیا۔

اگر کسی موقع پر ان کے ساتھ کوئی سلوک کرتا تو جہاں تک ہوتا وہ اس کا معاوضہ ادا کرتے اور اس کے احسان کے بوجھ سے سبکدوش ہوتے، سفر قسطنطنیہ میں حسین آفندی جو پہلے سفیر بمبئی رہ چکے تھے، مولانا کے ساتھ نہایت حسن اخلاق سے پیش آتے تھے، مولانا نے وہیں ان کے احسانات کی گراں باری کو محسوس کیا اور ان سے سبکدوش ہونے کے لیے اپنے والد کو لکھا ''ان کے اخلاق نے مجھ کو نہایت گرانبار کر دیا ہے اور میں کسی قدر سبکدوش ہونا چاہتا ہوں، اس لیے عرض ہے کہ نہایت اہتمام، نہایت تلاش اور جد و جہد کے ساتھ نظام آباد کے برتن ارسال فرمایئے، کسی ہوشیار شخص کو نظام آباد بھیجئے جو وہاں کے کسی رئیس کی معرفت فرمایشی بنوا کر لائے، یہاں ہندوستان کے ظروف گلی گلی آتے ہیں، مگر اچھے نہیں آتے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو لکھنؤ کی چکن کا ایک تھان، مگر نہایت عمدہ فروی بوٹیاں ہوں، نہایت باریک اور نازک کام ہو اور تیس روپیہ سے کم قیمت کا نہ ہو، خواجہ عزیز الدین صاحب کی معرفت اگر خریدا جائے تو غالباً اچھا ہوگا، میں آخر اگست تک رہوں گا، اس وقت تک آ جائے، یہ بھی نہ ہو تو مراد آباد کا کوئی برتن، مگر نہایت عمدہ، غرض

کوئی نادر چیز ضرور بھیجئے۔'' (مکاتیب-ا)

راست بازی بیان واقعہ میں راست گوئی اور راست بازی ان کی عادت تھی، وہ کسی کی غیبت و حکایت وشکایت نہیں کرتے تھے اور یہ طریقہ ان کو سخت ناپسند تھا، وہ جس زمانہ میں تعلیم سے فارغ ہوئے علما کے لیے اس وقت سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ کام یاب ذریعۂ معاش جو تھا، وہ وکالت کا پیشہ تھا، مولانا نے بھی اگر چہ اعزہ واحباب بالخصوص والد کے اصرار سے وکالت کا امتحان پاس کیا لیکن ان کی فطری راست بازی نے بہت جلد ثابت کر دیا کہ وہ اس پیشہ کے لیے ناموزوں ہیں اور ایک موقع پر جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، خود ان کے والد کو یہ کہنا پڑا کہ بس آپ وکیل بن چکے۔''

اسی وکالت کے زمانہ میں پیشہ وکالت کے متعلق جس کو انہوں نے مجبوراً اختیار کیا، لکھتے ہیں ''مگر چہ کنم کہ والد قبلہ را جز وکالت روے ودا ہے نیست، و بہ ایں آزادہ دلی اگر بہ وکالت ناساختہ باشم درنظر انصاف مرا دریں میانہ گنا ہے، نخواہد بود، آہ ازاں ہنگام کہ دولت روے گرداند و کار بدست من افتد، دوراں آشوب دل بر جانہ دارم وخواست و ناخواست روے بہ وکالت آرم وخویش را اندازہ نہ نہم و مردمان را بہرزہ ولاف فریب وہم وایں خواری بہ خویش در پذیرم۔ (مکاتیب)

وکالت کے پیشہ پر ان کی یہ تنقید ان کی فطری راست پسندی کی غماز ہے، بالآخر وکالت چھوڑ کر علی گڑھ گئے، وہاں محمڈن کالج میں مدرسی قبول کر لی، جس کی تنخواہ ۴۰ روپے ماہوار تھی، اگر چہ مولانا کی خودداری اس کو بھی پسند نہیں کرتی تھی، تاہم انہوں نے دروغ بافی پر اس کو ترجیح دی۔

سفارشوں میں جھوٹ بولنا یا مبالغہ کرنا عموماً برا نہیں سمجھا جاتا، مگر وہ اس باب میں بھی بہت محتاط تھے اور وہیں تک کہتے یا لکھتے تھے، جو ان کے نزدیک صحیح ہوتا، ان سے جب کوئی شخص کوئی خلاف قیاس بات روایت کرتا تھا تو وہ محدثانہ اصول سے اس سے مواخذہ کرتے تھے اور اس کا سلسلہ روایت دریافت کرتے تھے اور اس پر تنقید کرتے تھے اور یہ واقعہ ہر دوسرے تیسرے دن ضرور ہی پیش آیا کرتا تھا۔

سفارشوں میں احتیاط سفارش نیکی کا کام ہے، مگر درحقیقت یہ ایک قسم کی شہادت بھی ہے، اس لیے اس میں احتیاط کی سخت ضرورت ہے، عام لوگ اس کی نیکی ہی کے پہلو کو دیکھتے ہیں، دوسرے سے چشم پوشی کرتے ہیں، مولانا کا عمل اس کے برخلاف تھا، اس میں ایک تو ان کی خودداری کو دخل تھا کہ وہ اس کو بھی امرا کے سامنے اظہار حاجت ہی سمجھتے تھے، جس سے ان کو ہمیشہ اجتناب رہا، وہ جس قدر

صاحب اثر تھے اور جس قسم کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، ان کے ذریعہ سے اگر وہ لوگوں کو فائدہ پہنچانا چاہتے تھے تو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے تھے لیکن جس طرح انہوں نے اپنے لیے کسی کے سامنے زبان سوال نہیں کھولی، اسی طرح اپنے اعزہ واحباب کے لیے بھی کسی سے سفارش کرنا پسند نہیں کیا، حامد ان اکلوتے بیٹے تھے اور مدتوں نائب تحصیل داری تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے لیکن مولانا نے ان کو اس میں کسی قسم کی مدد نہیں دی، چنانچہ مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی کو جنہوں نے ان سے سفارش کی خواہش کی تھی، ایک خط میں لکھتے ہیں ''بات یہ ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کے لیے بھی کبھی سفارش نہیں کی، لیکن موقع آجائے تو ہر طرح کی تائید کرسکتا ہوں۔

مولانا کے والد لوگوں پر اس قسم کے احسانات بہت کیا کرتے تھے لیکن مولانا فرماتے تھے کہ مجھے تعجب آتا ہے کہ وہ حکام سے اس طرح لوگوں کی سفارشیں کیا کرتے تھے کہ گویا معمولی بات چیت کر رہے ہیں، ایک خط میں نواب محسن الملک کو جو اپنے کالج کے طالب علموں کے لیے ہر قسم کی سفارشوں کے لیے تیار رہتے تھے، یہ لکھا'' رہا قوم کی خدمت تو اس کی یہ تدبیر نہیں کہ جھوٹی سفارش کر کے دو چار کو نوکری دلا دیجائے، ان کو اس قابل بنانا چاہیے کہ وہ خود اپنی سفارش کرسکیں، (مکاتیب اول محسن الملک) فرمایا کرتے تھے کہ جھوٹی سفارش کر کے ایک کو فائدہ پہنچایا جاتا ہے، اور سیکڑوں کو نقصان۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ خودداری کے علاوہ لوگوں کی سفارش نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ جب تک ان کو کسی شخص کی اہلیت وقابلیت پر کافی اطمینان نہیں ہوتا تھا وہ اس کے لیے سفارش کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور سفارش نامہ میں صرف اس قدر لکھتے تھے، جتنا ان کو صحیح طور پر معلوم ہوتا تھا، محض سنی سنائی باتوں کی بنا پر یا ایشیائی حسن ظن وحسن اخلاق کی بنا پر وہ کسی کی سفارش کرنا پسند نہیں کرتے تھے، مولوی منصور احمد صاحب ایم اے علی گڑھ سے تحصیل عربی کے لیے یورپ جارہے تھے اور سرکاری وظیفہ کے لیے سند چاہتے تھے، اگرچہ ان کو خود ڈاکٹر ہارویز سرٹیفیکٹ دینے والے تھے لیکن انہوں نے مولانا سے بھی سند لینا چاہی اور چوں کہ وہ مولانا کے مذاق طبیعت سے واقف تھے، نمونہ کے طور پر عربی عبارت بھی لکھ کر بھیجی، اس کے متعلق مولانا مولوی ضیاء الحسن ندوی کو جو اس وقت کالج میں تھے، لکھتے ہیں ''عربی عبارت تو معمولی ہے، اس سے گئی گزری اور کیا ہوتی، سرٹیفیکٹ لکھوں گا تو یہ لکھوں گا کہ عربی عبارت معمولی لکھ سکتے ہیں۔'' (مکاتیب دوم ضیاء الحسن)

البتہ جو لوگ علمی مذاق رکھتے تھے، یا علمی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، وہ اس سے مستثنیٰ تھے اور یہ مولانا کی علم پروری کی سب سے بڑی دلیل ہے، انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے کبھی سفارش نہیں کی، لیکن اپنے فرزندان روحانی کی سفارش میں کبھی دریغ نہیں کی، بلکہ ہمیشہ ان کے لیے عمدہ مواقع کی تلاش میں رہے، ۱۹۰۸ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ایک مدرس کی جگہ خالی تھی، راقم نے آنریبل مولوی سید شرف الدین صاحب جج ہائی کورٹ کلکتہ کی وساطت سے درخواست دی اور کلکتہ جانے لگا، مولانا نے سنا تو پاس بلوایا اور از خود مولوی سید شرف الدین صاحب کے نام ایک تعارفی خط لکھ کر دیا، جس میں راقم کا ذکر اچھے لفظوں میں فرمایا تھا، جامعہ عثمانیہ میں بھی میرے لیے سفارش فرمائی تھی۔ (سلیمان ـ ۲۳) لیکن جب اس کا موقع آیا اور ناظم تعلیمات سرکار نظام (الماطیفی صاحب) نے مجھے بلانا چاہا تو مولانا کا انتقال ہو چکا تھا اور میرے سر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہو گئی تھی، اس لیے انکار کرنا پڑا، دکن کالج پونہ کی اسسٹنٹ پروفیسری پر راقم کا تقرر مولانا ہی کی سفارش بلکہ کوشش سے ہوا، مولوی عبدالسلام صاحب کے لیے بھی مولانا نے بھوپال وغیرہ میں سفارشیں کیں، مولوی عبدالباری صاحب ندوی علی گڑھ میں رہ کر تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے، مولانا نے ان کے لیے بھی سفارش کی اور وہ وہاں سے چلے گئے، تب بھی وہ وعدہ کیا کہ آیندہ مراحل کے لیے بھی مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے، میں ہمیشہ موجود ہوں۔

اسی طرح جن لوگوں کی لیاقت و قابلیت پر ان کو اعتبار تھا، ان کی سفارش پوری قوت سے کرتے تھے۔

مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کو علی گڑھ کالج کی اسسٹنٹ پروفیسری مولانا ہی کی سفارش سے ملی، دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپلی پر ان کا تقرر مولانا ہی کی کوشش سے ہوا۔

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر حیدرآباد سے علاحدہ کیے گئے تو بھوپال میں ان کے لیے پرزور سفارش کی۔

کالج میں نائب ناظم دینیات کی تجویز ہوئی اور اس کے متعلق مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی خدمت میں حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری کے لیے سفارش چاہی گئی تو مولانا نے ان کو لکھا، مولوی محمد اسلم جیراجپوری کی مجھ سے سفارش چاہی گئی ہے، میں صرف ان کی نیک بختی کا حال جانتا ہوں، باقی معلومات مذہبی اور پابندی فرائض کو آپ خود تحقیق کریں، مجھ کو علم نہیں'' (مکاتیب اول شروانی)

ردو کد سے احتراز مولانا کے متعلق اخبارات میں رطب و یابس بہت کچھ لکھا جاتا تھا، ان کی تصنیفات پر بعض لوگ مخالفانہ ریویو بھی لکھا کرتے تھے، ان کی متعدد کتابوں کا رد بھی لکھا گیا لیکن وہ کسی کا جواب نہیں دیتے تھے، ایک بار مولانا نے مسئلہ ارتقا پر ایک فلسفیانہ مضمون لکھا، اس پر بعض مذہبی حلقوں میں شورش پیدا ہوئی اور بعض اشخاص نے سخت لہجے میں اس پر اعتراضات کیے، مولانا حسب عادت خاموش رہے لیکن راقم نے ''قرآن مجید اور مسئلہ ارتقا'' کی سرخی سے ایک مضمون لکھا، جس میں ثابت کیا کہ یہ مسئلہ مجید کے مخالف نہیں، اگرچہ یہ مضمون مولانا کے قلم سے نہیں نکلا تھا تاہم ان کو ناگوار ہوا اور مجھے لکھا ''ارتقا پر جو مضمون تم نے لکھا گو میں نے نہیں دیکھا اور ممکن ہے کہ اچھا ہو لیکن میری ناراضی کی وجہ یہ ہے کہ اس سے کم ظرفوں کا حوصلہ بڑھتا ہے کہ ہم بھی اتنے ہیں کہ لوگ ہمارا جواب لکھیں، یہ کون یقین کرے گا کہ تم نے لکھا ہے، سب میری طرف منسوب کریں گے۔'' (مکاتیب سلیمان-۱۷)

علم الکلام اور الکلام پر ایک طالب علم فلسفی نے رسالۂ الناظر لکھنؤ میں زیادہ سخت تنقید لکھی، جس کو پڑھ کر میں بے چین ہو گیا اور اسی علم میں مولانا کے پاس پہنچا، میں اپنی نادانی سے یہ سمجھے تھا کہ جب مجھے اتنا غصہ ہے تو خدا جانے مولانا کا کیا حال ہوگا، وہاں پہنچا تو دیکھا دریا پوری طرح ساکن ہے، مگر پھر بھی یہ عرض کیا کہ اس کا جواب لکھا جائے، ارشاد ہوا، جو وقت اس کے جواب میں صرف کیا جائے، اسی میں کوئی دوسرا نیا کام کیوں نہ کر لیا جائے۔''

دکن ریویو میں جب وہ حیدرآباد دکن سے نکلتا تھا، مولانا کے بعض شاگرد جن کو ان سے کدسی ہو گئی تھی، ان کے مضامین اور تصنیفات پر نہایت بدنما تنقیدیں لکھتے رہے، مگر انہوں نے کبھی الٹ کر نہیں دیکھا۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب (ترقی اردو) نے کسی وجہ سے ۱۹۰۲ء سے گویا اپنا یہ مسلک ہی مقرر کر لیا تھا کہ جا و بے جا ان پر اعتراض کریں، مگر کبھی انہوں نے اس کے سوا کہ ''یہ الزام صحیح نہیں'' ان سے کچھ اور نہیں کہا، (چند ہم عصر، مؤلفہ مولوی عبدالحق صاحب سوانح مولوی سید علی بلگرامی)

سیرت نبوی ﷺ کے دیباچہ پر جب لکھنؤ کے ایک مولوی صاحب نے اعتراضات کیے، اگرچہ بعض مصالح کی بنا پر مولانا نے اس کا جواب لکھا لیکن اپنے نام سے چھپوانا پسند نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ لکھی کہ ''...... گو میں مخاطب نہیں کر سکتا، اس لیے کسی اور کے نام سے وہ چھپ سکتا ہے، میں اپنے نام سے نہیں چھپوا سکتا، غرض اظہار حقیقت ہے نہ اظہار نام۔''

ابتدائے زمانہ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے المامون پر جو اعتراضات کیے تھے، مولانا نے صرف اس کا جواب لکھا، اس کے علاوہ انہوں نے کسی ریویو کا جواب لکھنا پسند نہیں کیا اور یہ نتیجہ تھا جیسا کہ خود مولانا شروانی فرماتے ہیں ''ایڈیٹر اخبار آزاد لکھنؤ کے اصرار کا'' مولانا شروانی کا بیان ہے،'' غالباً صرف یہی ایک ریویو تھا جس کا علامہ شبلی نے جواب لکھا، یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں مذکور تھا:

رسی آنکہ بدر دما کہ چوما   خامہ گیری و حرف بنگاری

ندوہ کے مخالفتوں کے زمانہ میں جب بعض ارکان ندوہ کے غلط الزامات سے ان کو قلب حقیقت کا خوف ہوا تو بے شبہ اخبارات میں ایک دو صاحبوں کی تحریروں کا جواب دیا جو مقالات میں شامل ہے۔

صفائی پسندی مولانا باوجود سادگی کے نہایت صفائی پسند تھے، کپڑے ہمیشہ صاف پہنتے تھے اور ہفتہ میں کئی بار بدلتے تھے، بعض لوگ جو نمایشی صفائی پسند ہوتے ہیں، یہ کرتے ہیں کہ اوپر سے صاف کپڑے پہن لیتے ہیں اور نیچے میلی بنیاین یا میلا کمر بند رہنے دیتے ہیں، ایک دفعہ ایک ملازم نے یہ حرکت کی تو سخت برہم ہوئے، فرماتے تھے کہ ''رات دن ایک ہی کپڑا پہننے سے جلد میلا ہو جاتا ہے، اس لیے ایک بار میں نے خیال کیا کہ رات کو کوئی دوسرا کپڑا پہن کر سویا کروں، لیکن پھر خیال ہوا کہ آخر وہ بھی تو میلا ہی ہوگا اور گو اس پر دوسروں کی نگاہ نہ پڑے لیکن خود میری طبیعت اس کو گوارا نہیں کرتی''، جس کمرے میں رہتے تھے وہ باوجود سادگی کے نہایت صاف وشفاف رہتا تھا، اس میں روزانہ جھاڑو دلواتے تھے، وہ ہر چیز کو صاف کرواتے تھے، ندوہ کے کسی جلسہ میں گئے تو ایک حجرہ ٹھہرنے کے لیے ملا، چوں کہ کوئی ملازم ساتھ نہ تھا، اس لیے خود ہی جھاڑو دے لیا کرتے تھے۔

لوٹا ملازم سے روزانہ منجواتے تھے، خود پان نہیں کھاتے تھے اور پان کھانے والوں سے سخت نالاں رہتے تھے، اگر کوئی شخص پان کھا کر ان کے مکان میں تھوک دیتا تھا تو سخت منغص ہوتے تھے اور اس کو چھلوا ڈالتے تھے۔

گنا یا آم کھاتے تو ملازم سامنے ایک طشت رکھ دیتا، اسی میں چھلکا اور گٹھلی رکھتے جاتے، زمین پر نہ پھینکتے، ایک بار دارالعلوم میں ایک بڑے مدرس کے سامنے زمین پر آم کے چھلکے دیکھے تو

فرمایا ’’آپ چھلکے کسی برتن میں کیوں نہیں رکھتے، انہوں نے کہا، بھنگی آئے گا تو اٹھا لے جائے گا، بولے کہ ’’مولوی پہلے لکھتے ہیں، پھر مٹاتے ہیں۔‘‘

کھانے میں ہاتھ بہت کم آلودہ کرتے، ان کے دسترخوان پر چمچہ بلکہ کبھی کبھی چھری کانٹا بھی ہوتا اور اسی سے بوٹیاں اور ترکاریاں وغیرہ کھاتے، بدبو سے سخت نفرت تھی، اور اسی لیے حقہ پینے والوں کے پاس بیٹھنے سے سخت بیزار ہوتے تھے، پان کثرت سے چبانا یا تمباکو ڈال کر کھانا سخت ناپسند تھا۔

نفاست پسندی | مولانا اپنی سادگی کے باوجود بہت نفاست پسند تھے اور اس کا اثر ان کی ایک ایک چیز سے نمایاں ہوتا تھا، مسودات ہمیشہ سفید اور فلسکیپ کاغذ پر لکھتے تھے، میز پر قلم دوات نب وغیرہ ہمیشہ عمدہ قسم کی رکھتے تھے، مسودات نہایت خوش خط کاتب سے صاف کرواتے تھے، فرماتے تھے کہ جتنا زیادہ صاف اور خوشخط ہو، اسی قدر اس کے بنانے میں جی لگتا ہے، کتاب ہمیشہ بہتر سے بہتر چھپواتے تھے، یورپ اور بیروت کی عمدہ چھپی ہوئی کتابوں کو گراں قیمت پر خریدتے تھے اور ان کی نہایت خوشنما جلد بندھواتے تھے، مولوی عبدالسلام صاحب کہتے ہیں کہ ایک بار بمبئی میں میرے سامنے آغانی خریدی اور جلد بندھنے کے لیے دے دی، جلد ساز جلد بھدی باندھ کر لایا تو سخت برہم ہوئے۔

مولانا میز پر لکھنے کے عادی تھے، میز پر بانات جڑا رہتا تھا، ایک دفعہ یہ بانات میلا ہو گیا تھا یا کوئی داغ پڑ گیا تھا تو طبیعت میں وہ انشراح نہیں رہا، جو ایک مصنف کے لیے درکار ہے، بڑھئی نہ ملا، اتفاق سے ایک طالب علم (مولوی سید محمد صاحب ندوی رائے بریلوی اور اب ایم اے) اس وقت موجود تھے، ان کو اس قسم کے کاموں کا ذوق تھا، بازار سے کپڑا آیا اور اسی وقت انہوں نے پیچ سے میز کی گوٹ کھولی اور پرانا کپڑا نکال کر نیا کپڑا منڈھا تو ان کو خوشی ہوئی اور فرمایا کہ ’’اب لکھتے خوب بنے گا‘‘۔

کپڑے اگرچہ بہت گراں نہیں پہنتے تھے، لیکن نفاست کا خیال ہمیشہ پیش نظر رہتا تھا، کھانے کی خوبی کے لیے صرف یہی کافی نہ تھا کہ خوش ذائقہ ہو، بلکہ یہ بھی لازمی تھا کہ خوش رنگ ہو اور سلیقہ کے ساتھ دسترخوان پر چنا جائے۔

اسی نفاست پسندی کی بنا پر لکھنؤ کے تمدن کو دلی کے تمدن پر ترجیح دیتے تھے۔

چائے ہمیشہ سادی پیتے تھے اور اس میں بہتر سے بہتر دانہ دار اور انگریزی شکر بلکہ کبھی کبھی مصری ڈالتے تھے، فرماتے تھے کہ دودھ ڈالنے سے چائے کی لطافت چلی جاتی ہے اور دیسی شکر اگرچہ

میٹھی زیادہ ہوتی ہے لیکن اس میں ایک قسم کی ہیک ہوتی ہے، ہندوستانی عطر کی تیزی کو ناپسند فرماتے تھے، بلکہ انگریزی عطر البتہ انگیز کر لیتے تھے، (اگرچہ استعمال نہیں کرتے تھے) فرماتے تھے کہ اس کی خوشبو میں لطافت ہوتی ہے، ایک دفعہ میں نے غسل کیا تھا، کپڑے بدلے تھے اور کوئی تیز ہندوستانی عطر لگایا تھا اور اس شان سے ان سے ملنے گیا، بیٹھا ہی تھا کہ فرمایا ''تم نے عطر لگایا ہے، کیسی سخت بو ہے'' میں نے چاہا ہٹ کر دور بیٹھوں، فرمایا ''اس سے کیا ہوتا ہے''۔

خاک ساری مولانا باوجود خودداری کے بیحد خاک سار تھے، ہر قسم کے آدمیوں سے بلا تکلف ملتے تھے اور ان سے گھنٹوں بات چیت کرتے تھے، اعظم گڑھ میں ایک جلد ساز تھے، جو مولانا کے زمانہ طالب علمی کے دوست تھے، اخیر عمر میں اعظم گڑھ میں قیام کیا تو ان سے روزانہ صحبت رکھتے تھے، جب کبھی وہ نہ آتے تو ان کو خود بلواتے تھے۔

لکھنؤ میں رہتے تھے تو منشی محمد علی صاحب محرر دارالعلوم کے کمرہ میں اکثر جا بیٹھتے اور چائے پیتے، تمام طلبہ سے بے تکلف ملتے اور ان کی عیادت کرتے، امین آباد اور چوک میں بے تکلف جاتے، کبھی کبھی بعض دوکانوں پر بھی بیٹھ جایا کرتے تھے۔

جس زمانہ میں علاقہ کا انتظام کرتے تھے، اس وقت راجپوت وغیرہ جو اسامی تھے، آتے تھے تو زمین پر بیٹھتے لیکن مولانا خود ہی ان کو برابر بٹھاتے تھے۔

کبھی مکان پر جاتے تو تمام اعزہ واحباب کے مکان پر جا کر ان سے ملاقات کرتے۔

ایک دفعہ لکھنؤ میں گولہ گنج کی ایک سڑک پر جہاں دارالعلوم تھا، مدرسہ سے نکل کر وہ اپنے قیام گاہ (مکان نواب مرشد آباد جو ان دنوں اخبار حق کا دفتر تھا) پر جا رہے تھے، راقم الحروف ساتھ تھا، اتفاق سے کچھ دیہاتی مسلمان دھوتی باندھے پیچھے سے آ رہے تھے، جب وہ میرے برابر آئے تو چپکے سے مجھ سے پوچھا کہ ''مولوی شبلی یہیں ہوں'' میں نے کہا ہاں، وہ آگے بڑھ گئے، مولانا نے فرمایا یہ کیا کہتے تھے، میں نے کہا پوچھتے تھے کہ مولوی شبلی صاحب یہی ہیں، یہ سن کر مولانا مسکرائے اور فرمایا خدا کی قسم مجھے ان کے اتنے سے فقرہ سے جو خوشی ہوئی وہ بڑوں بڑوں کی تعریف سے نہیں ہوئی۔

مسلم لیگ سے اختلاف کے زمانہ میں کسی نے راجہ صاحب محمود آباد کی نسبت ان سے یہ کہا کہ راجہ صاحب کہتے ہیں کہ میں شبلی کو تباہ کر دوں گا، تو جواب میں کہلایا کہ راجہ صاحب مجھے آپ تباہ نہیں

کر سکتے کیوں کہ میں زمین کی گھاس ہوں، آندھیاں اونچے اونچے درختوں کو گراتی ہیں، زمین کی بے قدر گھاس کو نہیں[1]۔

عموماً معمولی کپڑے پہنتے تھے، کھری چارپائی اور چٹائی پر بیٹھتے تھے، آرایش اور تکلف سے پاک تھے۔

مخصوص اوقات میں خلوت پسندی شہرت نے اگرچہ مولانا کو شمع محفل بنا دیا تھا، بہت سے لوگ ان سے ملنے آتے تھے وہ خود جلسوں اور محفلوں میں شریک ہوتے تھے، یار باش اور احباب پسند تھے، مگر کام کے اوقات اور سونے کے وقت میں ان کو خلوت ہی پسند تھی، کام کے اوقات اور آرام کے گھنٹوں میں کسی شخص کا وجود بلکہ تخیل بھی ان کے لیے سخت تکلیف دہ ہوتا تھا، رات کو جیسا کہ پہلے گزر چکا، ہمیشہ کمرے میں تنہا سوتے تھے اور کتنا ہی بڑا مکان ہو، لیکن اس میں کسی دوسرے کو سونے نہیں دیتے تھے، فرماتے تھے کہ دوسرے شخص کے تخیل سے بھی نیند نہیں آسکتی۔

بعض اوقات لوگ ان سے ملنے آتے اور دیر تک بیٹھے رہتے تو ان کو سخت تکلیف ہوتی، وہ خود فرماتے تھے کہ میں نے عجیب متضاد طبیعت پائی ہے، احباب کی صحبت لازمی ہے، لیکن چند مخصوص گھنٹوں میں بالکل تنہائی ہونی چاہیے، صحبت کے لیے چار بجے شام سے آٹھ بجے شب تک کا وقت مخصوص تھا، ان کے دروازے پر جلی قلم میں لکھا ہوا یہ اعلان چسپاں رہتا تھا کہ ''چار بجے سے پہلے ملنے کی اجازت نہیں۔''

بمبئی کو انہوں نے جن اسباب کی بنا پر پسند کیا تھا، ان میں ایک خلوت گزینی بھی تھی، فرماتے تھے کہ یہاں شبلی پڑا پھرتا ہے، اور کوئی جانتا بھی نہیں کہ یہ شبلی ہے'' (بروایت مولانا عبدالسلام) اسی خلوت گزینی کی بنا پر بعض اوقات بمبئی میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں ''بمبئی میں سارا دن کام کے لیے ملتا ہے، دن بھر کوئی جھانکتا نہیں، اس لیے برس دن تک یہاں سے ٹلنے کا ارادہ نہیں۔''

اظہارِ رائے میں بے باکی مولانا اپنی جو رائے قائم کر لیتے تھے، اس کے اظہار میں بے باک تھے، جو لوگ اس رائے کے مخالف ہوتے تھے، ان کے دلائل کا رد بھی اسی سختی سے کرتے تھے، مولانا شروانی

---

[1] حدیث شریف میں مسلمانوں کی تمثیل میں یہی آیا ہے''مثل المومن کمثل الزرع الریاح تفیئه ولا یزال المومن یصیبه بلاء، ومثل المنافق کمثل شجرة الا ازلا تهتز حتی تستحصد'' (ترمذی ابواب امثال)۔

اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں ''دوستی اور مخالفت دونوں شدید تھیں، لیکن دوستوں کی مروت کبھی ان کو رسمی تملق اور چاپلوسی پر آمادہ نہیں کرتی تھی، عزیز سے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے، مخالفین کی مخالفت سے رو برو نہیں رکھتے تھے، مگر ان کے پس پشت بیانِ اختلاف میں بھی ان کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکلتے تھے جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی پر دلالت کرے، مخالف کی رائے کی تردید سختی سے کرتے تھے، اپنی رائے کے دلائل کا زور شور سے اظہار کرتے، باوجود اس کے یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مخالف کے ذاتی یا صفاتی عیوب پیش کر کے اس کو ذلیل و رسوا کرتے۔''

جس زمانہ میں وہ علی گڑھ تشریف لے گئے، تمام کالج بلکہ تمام قوم پر سید صاحب کا اثر محیط تھا، اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ جب سید صاحب نے کانگریس کی مخالفت کی تو دفعۃً تمام قوم سیاسیات میں حصہ لینے سے الگ ہوگئی اور ایک مدت تک الگ رہی، لیکن مولانا جیسا کہ خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے ایک مضمون میں لکھا ہے، اسی وقت سے سید صاحب کی اس پالیسی کے شدت کے ساتھ مخالف تھے، اخیر میں انہوں نے پالیٹکس پر جو آزادانہ نظمیں اور آزادانہ مضامین لکھے، ان کی نسبت بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زمانہ اور قوم کی موجودہ روش کا نتیجہ تھے اور مخالفین اس کو جاہ پرستی اور شہرت طلبی پر بھی محمول کرتے تھے، لیکن درحقیقت ان کو ابتدا ہی سے اس پالیسی سے نفرت تھی اور اس وقت سے اخیر دم تک وہ اپنی رائے پر قائم رہے۔

اس وقت قدیم عربی نصاب کی مخالفت کرنا اور ایک عربی مدرسہ میں انگریزی اور علوم جدیدہ کا داخل کرنا ایک ایسا کام تھا جو ایک شخص کو تمام علما کی لعنت و ملامت کا آماج گاہ بنا سکتا تھا لیکن مولانا نے لوگوں کی مخالفت مول لی، مگر جس راستہ کو انہوں نے صحیح سمجھا اس سے پیچھے نہ ہٹے، کم زور دل کے لوگ بدنامی کے خوف سے اپنی رائے کا آزادانہ اظہار نہیں کر سکتے لیکن مولانا اس قسم کی بدنامی سے بالکل نہیں گھبراتے تھے، ایک بار ندوہ میں انگریزی کے داخل کرنے کی تحریک مولانا نے نہایت شدومد کے ساتھ کی لیکن مولانا حبیب الرحمٰن خاں نے جو غالباً اس جلسہ کے پریسیڈنٹ تھے، بحث کا موقع نہیں دیا، مولانا نے جلسہ کے بعد ان سے پوچھا کہ ''آپ کیوں اس قدر اس بحث سے کتراتے ہیں؟'' تو انہوں نے کہا ''تمہاری بدنامی کے ڈر سے۔''

لیکن علما کے لیے انگریزی تعلیم کی ضرورت کی جو رائے انہوں نے قائم کر لی تھی، اس پر برابر

اڑے رہے، اور بالآخر وہ کام یاب ہوئے، ندوہ میں انگریزی تعلیم داخل ہوئی، اور اب بہت سے مدرسوں میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے اور بے تکلف مولوی سیکھ رہے ہیں، مگر یہ سارا فیض ان ہی کے استقلالِ رائے کا ہے۔

سچائی کے مقابلہ میں وہ عوام کی مطلق پروانہیں کرتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میرا اصول یہ ہے کہ انسان ہر کام کے نقص و ہنر کا خود فیصلہ کرسکتا ہے، اس کے بعد لوگوں کے اور خصوصاً عوام کے کہنے کی کچھ پروانہیں کرنی چاہیے۔''

اور اگر ان کے سامنے کبھی یہ تذکرہ آتا کہ فلاں کام سے فلاں شخص ناراض ہوجائے گا، تو فرماتے تھے کہ ''میں یہ کب چاہتا ہوں کہ تمام دنیا مجھ سے خوش رہے، اور اس کے ساتھ یہ شعر بھی پڑھتے تھے:

خاطرِ یک دو کس ارشاد شود از تو بس است
زندگانی بہ مرادِ ہمہ کس نتواں کرد

علم کلام کے سلسلہ میں بعض مذہبی مسائل کی تشریح میں اپنا راستہ عام شاہراہ سے الگ اختیار کیا اور جن باتوں کو امام غزالی اور امام رازی نے صرف خلوت میں کہا تھا، ان کو علانیہ برسر عام ظاہر کیا، جس کی بدولت ان پر کفر کا فتویٰ بھی لگایا گیا، مگر اس کی کچھ پروا نہ کی، البتہ جب آخر میں سیرت نبوی ﷺ کی تاثیر سے ان میں انقلاب حال پیدا ہوا تو صورت اور ہوگئی۔

وہ فقہی مسلک میں حنفی تھے اور نہایت سخت حنفی تھے، اس کے بعد کثرت سے مطالعہ اور وسعت نظر سے سب کچھ بن گئے، مگر بہرحال وہ حنفی ہی رہے اور عمر بھر اپنی حنفیت کا اعلان کرتے رہے۔

سادگی | مولانا کا خاندان ایک آسودہ خاندان تھا، ان کے والد بہت بڑے وکیل تھے اور رئیسانہ زندگی بسر کرتے تھے، ان کے تین بھائی کام یاب وکیل اور بیرسٹر اور انگریزی طرز معاشرت کے دلدادہ تھے، مولانا نے کامل سولہ سال علی گڑھ کالج میں بسر کیے، جو دینوی جاہ وجلال کی نمائش گاہ تھا، مدتوں حیدرآباد میں ایک معقول مشاہرہ پر ملازم رہے، جہاں کے تمدن کا اندازہ داغ کے اس شعر سے ہوسکتا ہے:

نہیں حیدرآباد پیرس سے کچھ کم
یہاں بھی سجے ہیں مکاں کیسے کیسے

اس بنا پر خیال ہوسکتا ہے کہ ان پر بھی اس طرز معاشرت کا اثر پڑا ہوگا اور انہوں نے اس قدیم سادگی کو کھودیا ہوگا، جو گروہِ علما کا تمغۂ امتیاز ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا فطرۃً نہایت سادگی پسند تھے اور ہمیشہ اپنے معتقدین وتلامذہ کو

سادگی کی تعلیم دیا کرتے تھے، یہ سچ ہے کہ خودداری اور بلند ہمتی کی وجہ سے وہ کسی سوسائٹی میں پست ہو کر رہنا نہیں چاہتے تھے، اس بنا پر وہ حیدرآباد میں کسی قدر تزک و احتشام کے ساتھ رہتے تھے، چنانچہ نواب محسن الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں ''مجھ کو سردست ۵۰۰ ماہوار سے زیادہ نہیں مل سکتے اور یہی یہاں کا خرچ ہے، پھر جس قدر تنخواہ بڑھتی جاتی ہے، خرچ بڑھتا جاتا ہے، البتہ اگر یہاں کی سوسائٹی میں مبتذل بدحیثیت، بے وقعت ہو کر رہوں تو پس انداز ہو سکتا ہے۔'' (محسن الملک--۱۰)

تاہم وہ طبعاً سادگی کی طرف مائل تھے اور ابتدا سے انتہا تک انہوں نے اس شان کو قائم رکھا، ان کو نہایت کثرت سے سفر کرنے پڑتے تھے لیکن ان کا خود بیان ہے کہ میں نے سفر میں ملازم ساتھ نہیں لیا، تنہا گھوما کرتا تھا، قسطنطنیہ کے طویل سفر کے لیے اگرچہ اعزہ واحباب نے باصرار کہا:

لاجرم خادمکے نیز بہ ہمراہ بہ بر

لیکن مولانا یکہ وتنہا روانہ ہو گئے۔

مولانا صحرائیت وفضائیت کے بہت دلدادہ تھے، اس لیے اگرچہ مکان وسیع، پرفضا اور خوش منظر پسند کرتے تھے لیکن اس کے علاوہ ان کو دوسرے قسم کی زیب وزینت اور سامان آرائش کی کچھ پروانہ تھی، مولوی عبدالسلام صاحب کہتے ہیں کہ میں نے ان کو کان پور میں مسجد کے ایک حجرے میں ٹھہرتے ہوئے دیکھا تھا، ندوہ میں مدتوں وہ اوپر کے ایک کمرہ میں مقیم رہے، فرنیچر کی کل کائنات ایک چٹائی، ایک فرش اور ایک پلنگ سے زیادہ نہ تھی، البتہ صحن کسی قدر وسیع تھا اور اِدھر اُدھر فضائیت تھی، اس کے بعد انہوں نے کرایہ کا ایک بڑا مکان لیا جس میں متعدد کمرے تھے لیکن ان کی ضروریات کے لیے صرف ایک کمرہ تھا، بقیہ میں طلبہ اور بعض مدرسین رہتے تھے، آخر میں امین آباد پارک کے ایک بالائی کمرے میں اٹھ آئے تھے، جس کا کرایہ ۱۰ روپیہ ماہوار تھا لیکن پارک کی فضائیت کے اس قدر شیفتہ تھے کہ فرماتے تھے کہ ایسی کوئی جگہ بمبئی میں بھی نہیں، ایک بار یہ دیکھ کر کہ بڑے بڑے لوگ ان کے پاس آتے ہیں، اس کمرے کو فرش بھی کیا، ایک دری اور ایک قالین، متعدد کرسیاں منگوائیں لیکن جب ''خدام الدین'' کی جماعت قائم کی اور ان کو زہد وتقشف اور سادہ زندگی اختیار کرنے کی طرف مائل کیا تو کرسیاں دفتر سیرت نبوی ﷺ کو دے دیں، اور دری اپنے فرزند محمد حامد صاحب کو عنایت کی اور خود ایک چٹائی پر بیٹھنا پسند کیا، فرماتے تھے کہ ایک میز اور ایک کرسی تو البتہ میرے لیے لازمی ہے کہ بغیر اس کے لکھ نہیں سکتا اور تمام چیزیں غیرضروری ہیں۔

کپڑے بھی نہایت سادہ پہنتے تھے، کپڑوں کی تعداد بھی نہایت محدود تھی، سات آٹھ سپید پائجامے، اسی قدر سپید کرتے اور تین چار سرد اور گرم شروانیاں اور یہ کپڑے کوئی بہت زیادہ قیمتی بھی نہیں ہوتے تھے، عمامہ اور عبا کا استعمال صرف مخصوص جلسوں میں کرتے تھے اور غالباً یہ چیزیں کسی قدر گراں قیمت ہوتی تھیں، اخیر اخیر میں تو طبیعت سادگی کی طرف بے انتہا مائل ہوگئی تھی، ایک بار مولوی عبدالسلام صاحب سے فرمایا کہ دگلے کے لیے مجھے کوئی چھینٹ لا دو، وہ ۴ گز کی ایک نقلی جامہ دار لے گئے، وہ دل میں ڈر رہے تھے کہ اگر یہ ناپسند ہوئی تو مجھ پر جھلائیں گے لیکن اس کو بار بار ادھر ادھر سے دیکھ کر فرمایا کہ ''ہاں نہایت عمدہ ہے، اب اس سے بہتر کپڑا دگلے کے لیے کیا ہوسکتا ہے'' چنانچہ اسی کا دگلا بنوایا اور دو سال اسی کو پہنتے رہے، ایک بار تو شیروانی وغیرہ سب بالائے طاق رکھ دی تھی اور صرف ایک کرتہ ایک صدری اور میرٹھ کی ٹوپی استعمال کرنی شروع کی تھی، ندوہ کے جس جلسۂ انتظامیہ میں مولانا پر کمیشن بیٹھا تھا، اس میں مولانا اسی وضع میں گئے تھے، فرماتے تھے کہ اس لباس نے مجھ میں کچھ ایسا انکسار پیدا کر دیا تھا کہ میں خاموش تمام لوگوں کا منہ دیکھتا رہا، شیروانی پہننے سے بدن میں جو چستی پیدا ہوتی تھی، اس کا مطلق اثر نہیں معلوم ہوتا تھا ورنہ ایک ڈانٹ میں تمام کمیشن ہوا ہو جاتا۔''

اپنے زیر تربیت طلبہ کو ہمیشہ سادہ لباس اور عالمانہ وضع اختیار کرنے کی ترغیب دیتے تھے اور ان کے سامنے خود اپنا نمونہ پیش کرتے تھے، وفات سے صرف ایک ماہ پیشتر اپنے ایک حوصلہ مند عزیز شاگرد کو لکھتے ہیں ''افسوس ہے کہ مجھ کو اصولی امر میں اختلاف ہے، میں تیس برس سے مسلمانوں کی حالت پر غور کر رہا ہوں، خوب دیکھا، اصلی ترقی کا مانع وہی گراں زندگی ہے، جو سید صاحب سکھا گئے، ہندو اسی سے بازی لے گئے اور قیامت تک لے جائیں گے، میں اپنے مصارف برابر گھٹا رہا ہوں، سرمائی کچھ نہیں بنوائی، پرانی چھینٹ کی اچکن اس سال کو بھی ختم کرلے گی اور انشاء اللہ اخیر سادگی تک آجاؤں گا، بھائی! ظاہری ٹیپ ٹاپ سے کیا ہوتا ہے، یہ سچ ہے کہ لوگ بدحیثیت کی وقعت نہیں کرتے لیکن یہ ان لوگوں کے لیے ہے جن کو دو چار دن کا تجربہ ہو، جن لوگوں میں برسوں آدمی رہ چکا اور رہے گا، وہاں ظاہری ٹیپ ٹاپ محض بیکار ہے۔'' (مسعود-۳۴)

دارالمصنفین میں تعلیم و تربیت کے لیے جن طلبہ کو انتخاب کرنا چاہا، ان کے لیے یہ شرط بھی لگادی: ''وضع و لباس و فرائض میں علما کی وضع کے پابند رہ سکتے ہیں یا نہیں، گو یہ جزئی بات ہے لیکن میں

شروانی اور بوٹ تک کو ناپسند کرتا ہوں، قص لحیہ[1] تو سخت ناگوار ہے، میں صرف تعلیم نہیں بلکہ تربیت بھی چاہتا ہوں، ایسے لوگ درکار ہیں جن کی صورت اور سیرت دونوں عالمانہ ہو۔'' (مسعود-۲۱)

ندوہ میں خدام دین کی جماعت اسی اصول کے مطابق قائم کی تھی اور وہاں سے الگ ہو کر مدرسۃ سرائے میر کو بالکل گروکل کے اصول پر چلانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

یو پی کے گورنر لاٹوش صاحب ولایت واپس جارہے تھے، چوں کہ وہ ہر دل عزیز رہے تھے، اس لیے ان کو الوداع کہنے کے لیے اسٹیشن پر بڑا مجمع تھا، مولانا بھی تشریف لے جارہے تھے لیکن ان کے پاس کوئی اچھی عبا نہ تھی، مجھے لکھا کہ تمہارے پاس کوئی اچھی عبا ہو تو بھیج دو'' میں نے اپنی دو تین عبائیں بھیج دیں، مولانا نے ان میں سے ایک سبز رنگ کی عبا جس میں ریشم کی دھاریاں تھیں اور مدنی وضع کی تھی، پسند کی اور اس کو پہن کر تشریف لے گئے، جب میں حسب معمول شام کو مولانا سے ملنے گیا تو فرمایا کہ آج تمہاری عبا نے مجھ کو بہت ذلیل کیا، وہاں مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) بھی تھے، وہ چار آنے گز کی شروانی پہنے تھے، مجھے بڑی شرم آئی۔

رحم دلی | وہ فطرۃً نہایت رقیق القلب تھے، اس لیے معمولی سے معمولی دردانگیز واقعہ سے ان کا دل بھر آتا تھا۔

ایک بار اعظم گڑھ سے پالکی پر سوار ہو کر مکان جارہے تھے، راستے میں دیکھا کہ چند آدمی شدت کے ساتھ گریہ وزاری کررہے ہیں، واقعہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ غریب کاشت کار ہیں، ان کا بیل مرگیا ہے، فوراً ان لوگوں کو دس روپے دیے۔

مولانا کے خاندان کے لوگ اسامیوں پر سختی کرتے، ان کو مارتے پیٹتے تو مولانا اس کو بہت ناپسند فرماتے، کسی کی فاقہ زدگی سے سخت متاثر ہوتے تھے، فرماتے تھے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ایک شخص فاقہ سے ہے تو میں کھانا نہیں کھا سکتا۔

فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی بادشاہ کی رعایا میں ایک شخص بھی فاقہ سے رہ جائے تو اس کو کھانا حرام ہے۔

یہ رحم دلی ہی کا اثر تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر رو دیتے تھے، ادھر دل پر ذرا چوٹ لگی اور ادھر

[1] ڈاڑھی ترشوانا۔

آنکھوں میں آنسوں تیرنے لگے۔

ایک دفعہ شام کے وقت امین آباد پارک کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، مکان کے پہلو میں ایک لڑکی کا کان چھیدا جا رہا تھا، وہ بار بار چیختی تھی، تو مولانا کے چہرہ و پیشانی پر شکن پڑ پڑ جاتی تھی، جب ضبط نہ ہو سکا تو ملازم کو بلا کر کہا کہ "اس لڑکی کی ماں سے جا کر کہہ دو کہ اپنی لڑکی کو کیوں ذبح کر رہی ہے، مولانا سمجھتے تھے کہ ماں لڑکی کو مار رہی ہے لیکن ملازم نے آ کر کہا کہ لڑکی کا کان چھیدا جا رہا ہے۔

ذکاوت حس دنیا میں جو بڑے بڑے اشخاص گزرے ہیں وہ بیش تر نہایت شدید الاحساس تھے اور اسی قوت انفعالی نے ان کو قوم کی اصلاح، مذہب کی تجدید اور علم کی خدمت پر آمادہ کیا تھا، مولانا میں بھی یہ قوت شدت کے ساتھ موجود تھی اور اسی قوت نے ان کو ایک فطری شاعر، ایک پر جوش مقرر اور ایک قومی مصلح بنایا تھا۔

اس قوت کا اثر مولانا کے اخلاق و عادات کے ایک ایک جزئیات سے نمایاں ہوتا تھا، معمولی سے معمولی ناگوار واقعہ پیش آ جاتا تو ان کی پیشانی پر گرہ پڑ جاتی تھی، کوئی بات خلاف مزاج ہو جاتی تو سخت برہم ہو جاتے لیکن تھوڑی دیر کے بعد غصہ کافور ہو جاتا، سکون و اطمینان میں ذرہ برابر خلل پڑتا تو بدحواس ہو جاتے، رات کو سوتے تو گھڑی کے کھٹکھٹانے کی آواز ناگوار ہوتی، امین آباد میں یکہ والے چلاتے تو ناگواری ظاہر کرتے، بمبئی میں مکان لیتے تو خاطور پر اس کا لحاظ رکھتے کہ ٹریم کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز وہاں تک نہ پہنچے، بدن پر مکھی بیٹھ جاتی تو سخت ناگواری محسوس کرتے، فرماتے تھے کہ "بمبئی میں بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں مکھیاں نہیں ہوتیں، شور و غل سخت ناپسند تھا، ہجوم و کشمکش سے سخت گھبراتے تھے اور سکنڈ کلاس میں صرف اسی لیے سفر کرتے تھے اور اسی لیے دوستوں کے مکانوں کے بہ جائے ہوٹلوں میں ٹھہرتے تھے، ورنہ ان باتوں سے ان کو جاہ و اعزاز مقصود نہ تھا، اسی ذکاوت حس نے ان کو کسی قدر عجلت پسند بھی بنا دیا تھا، کسی کام کا خیال آتا تو اس کے کرنے میں نہایت عجلت سے کام لیتے، ہم لوگوں کو کسی بات کا حکم دیتے تو چاہتے کہ یہ کام فوراً ہو جائے، اگر ذرا دیر ہو جاتی تو سخت برہم ہوتے، اکثر ایسا ہوتا کہ وہ یاد فرماتے تو ہم یہ سوچ کر سہم جاتے کہ کوئی کام ایسا تو نہیں کہ انھوں نے کرنے کو کہا اور ہم نے اب تک نہیں کیا اور وہ اسی کی باز پرس کے لیے یاد فرما رہے ہوں۔

جب بیگم صاحبہ بھاول پور نے ندوہ کی عمارت کے لیے پچاس ہزار روپے عنایت فرمائے تو

ایک رات مولانا کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ندوہ کا بورڈنگ بھی تمام تر مستورات کے چندہ سے تیار ہو، یہ خیال پیدا ہونا تھا کہ اضطراب سے بستر پر کروٹیں بدلنے لگے، بالآخر ضبط نہ ہو سکا اور ۳ بجے شب کو شمع جلائی اور مستورات کے نام ایک اپیل لکھا، جس کو صبح کے وقت چھپنے کے لیے بھیجا، ایک بار اعظم گڑھ میں برسات کا زمانہ تھا اور نیشنل اسکول کی عمارت تعمیر ہو رہی تھی، ایک رات کو شدت سے پانی برسنے لگا اور مولانا کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ پانی برس رہا ہے، عمارت کی دیواریں گر رہی ہوں گی، اس تخیل سے اس قدر پریشان ہوئے کہ لحاف پھاڑ کر روئی نکالی اور کان میں ڈالی تا کہ پانی کے آواز سننے میں نہ آئے اور پریشانی دور ہو۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے ان کی ذکاوتِ حس کے مظاہر کو ان کے وفات کے مضمون میں نہایت استقصار کے ساتھ جمع کیا ہے، وہ فرماتے ہیں ''احساس بہت شدید تھا اس لیے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے، ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس کے زمانہ میں وہ اور میں ایک مکان میں مقیم تھے، ایک روز ایک نیم مردہ بھڑ نے ان کے پاؤں پر ڈنک مار دیا، اس قدر بیتاب ہوئے کہ مجھ کو حیرت ہوگئی، اس قدر زمانہ گزرنے پر آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے، یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا۔''

عصبیت دینی مولانا کے مزاج میں سخت عصبیت پائی جاتی تھی اور اس کا اثر مختلف مظاہر سے نمایاں ہوتا تھا، ابتدا میں وہ ایک متعصب حنفی تھے اور حنفیوں کی تائید اور غیر مقلدین کی تردید میں رسالے لکھتے تھے اور ان سے مناظرے کرتے تھے، مولانا کے گاؤں کے متصل ایک موضع کا نام جیراج پور ہے، یہاں مولوی سلامت اللہ صاحب ایک غیر مقلد عالم تھے، ان کا اور مولانا کا حریفانہ مقابلہ رہتا تھا۔

عام قومی حیثیت سے وہ عربوں اور ترکوں کے سخت حامی تھے، عربوں کے اس لیے کہ وہ اسلام کے منبع و ماویٰ، نبی کریم ﷺ کی قوم ہیں اور قرآن ان کی زبان میں ہے اور ترکوں کے اس لیے کہ ان کے زمانہ میں مسلمانوں کی عزت اور اسلام کی سلطنت ان ہی کے دم قدم سے قائم تھی، قسطنطنیہ کے سفر میں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، مسٹر آرنلڈ مولانا کے ساتھ تھے اور مولانا سے عربی پڑھا کرتے تھے، جہاز پر اسپین کا ایک عیسائی بھی ساتھ تھا، جو مسٹر آرنلڈ کے عربی پڑھنے سے نہایت جلتا تھا اور تحقیر کے ساتھ عربی حرفوں کو نہایت برے لہجہ میں ادا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ اونٹوں کی زبان ہے، مولانا سفرنامہ

میں اس واقعہ کو لکھ کر تحریر فرماتے ہیں" اگرچہ مجھ کو اس کی ان حرکتوں سے رنج ہوتا تھا لیکن جو قوم ایک مدت تک ذلت کے ساتھ عربوں کی زیردست رہ چکی تھی، عرب اور عربی زبان کے ساتھ اس کا یہ سلوک بے جا نہ تھا۔"

اسی سفر میں مولانا کی رگِ حمیت پر ایک اور نشتر لگا، جب جہاز عدن میں پہنچا تو سمالی قوم کے بہت سے لڑکے ڈونگیوں پر سوار ہو کر جہاز کے قریب آئے اور بہت سے مبتذل حرکتیں کرنا شروع کیں، ناچے، گائے، بغلیں بجائیں اور ان کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ لوگ دوئی چونی پیسے جو کچھ انعام میں دینا چاہتے تھے اس کو سمندر میں پھینک دیتے تھے اور وہ غوطے مار کر نکال لاتے تھے، اکثر انگریز اس تماشے میں مصروف تھے، اور مسٹر آرنلڈ کو بھی اس میں مزا آتا تھا لیکن مولانا کی حالت کچھ اور تھی، چوں کہ غلطی سے ان کا خیال تھا کہ یہ عرب کے بچے ہیں، اس لیے یہ طبعی بات تھی کہ وہ ان کو عزت و محبت کی نگاہ سے دیکھتے لیکن وہ انعام لینے کے لیے ایسے مبتذل حرکتیں کرتے تھے کہ یہ مولانا کو کسی طرح گوارا نہیں ہوسکتا تھا، ان کو عبرت ہوئی کہ عرب کی اب یہ حالت ہوگئی کہ غیروں کے سامنے ان کو اس قسم کے حرکات سے مطلق شرم نہیں آتی، اس لیے ان کا دل بے اختیار بھر آیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور بے اختیار زبان سے نکلا ہم یا عمر! مسٹر آرنلڈ پاس تھے، ان کو مولانا کی تغییر حالت کا خیال ہوا، مولانا نے اپنے دل کی کیفیت اور اس کا سبب بیان کیا، تو انہوں نے ایک بار آنکھ اٹھا کر مولانا کی طرف دیکھا اور چپ ہو رہے لیکن بعد کو جب معلوم ہوا کہ سمالی قوم عرب نہیں ہے، تو مولانا کو کسی قدر تسکین ہوئی، اسی غصہ و رنج کا نتیجہ تھا کہ قصیدۂ سفریہ میں مولانا کے قلم سے اس قوم کے ہجو میں یہ اشعار نکلے:

مردم شہر کہ خود را بہ سمالی نامند	حیوان اند نہ بل از حیواں ہم بدتر
خوار و بدبخت و سیہ کار و سیہ چہرہ درشت	سفلہ و ممتحس و کج روش و بد گوہر
خویشتن را بہ عرب بستہ و حاشا کہ عرب	ایں چنیں خوار و زبوں شاں نہ پسندد داور
چوں زبانِ ہمہ تازی بود و ہم چو عرب	نام شاں بستہ بود با لقب جدید پدر
عامیانِ در خلط افتند و گماں باز برند	کہ مگر در نسب و نسل ز معاداند و مضر
تخم و ہم ریشۂ ایں نخل ز خاکِ حبش است	کہ دریں جائے بیار آمد و افشاند ثمر

جرجی زیدان کی کتاب "تاریخ تمدن اسلامی" کی تردید جن اسباب کی بنا پر کی ان میں ایک

بڑا سبب یہ تھا کہ اس نے عرب کی تحقیر کی تھی، ان کی طرف بہت سے معائب منسوب کیے تھے، چنانچہ الانتقاد میں مؤلف سے جو معذرت کی ہے، اس کی تمہید ان الفاظ میں شروع کی ہے۔

"اے فاضل مؤلف! میں آپ کے احسان کا انکار نہیں کر سکتا، کیوں کہ آپ نے اس کتاب میں میرا نام شان دار طریقہ سے لیا ہے، مجھ کو مستند قرار دیا ہے، میرے اقوال سے استشہاد کیا ہے اور مجھ کو مشاہیر علمائے ہند میں شمار کیا ہے لیکن بایں ہمہ کیا میں یہ پسند کر سکتا ہوں کہ آپ میری تعریف اور عربوں کی ہجو کریں، ان کو اپنے تیر و سنان کا آماجگاہ بنائیں، ان کی طرف ہر قسم کے عیوب و شنائع منسوب کریں، یہاں تک کہ ان کے اعضا کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں اور ان کے پرخچے اڑا دیں۔"

اسی عصبیت کی بنا پر ترکوں کے تمام معاملات سے نہایت دلچسپی رکھتے تھے، جب ٹرکی پر کسی یورپین سلطنت کی طرف سے حملہ ہوتا تھا تو ہر ممکن طریقہ سے ترکوں کی اعانت میں حصہ لیتے تھے، ان کی کام یابی سے خوش اور ناکام یابی سے رنجیدہ ہوتے تھے، ترکوں اور روسیوں میں جو جنگ ہوئی تھی، اس میں مولانا نے ترکوں کی امداد و اعانت کے لیے ایک انجمن قائم کی، خود اس کے سکریٹری بنے اور اپنے ضلع سے تین ہزار کی رقم چندہ کر کے بھیجی، جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو ندوہ میں مولانا نے ایک پرجوش تقریر کی، تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو ان پر رقت طاری ہوگئی اور گلوگرفتہ ہوگئے، چندہ ہوا تو خود سو روپیہ کی رقم دی۔

سلطان المعظم کو نہایت وقعت و محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، قسطنطنیہ میں عید کے دن سلطان کا جو جلوس دیکھا، اس سے سخت متاثر ہوئے، اسی تاثر اور انفعال کی حالت میں مثنوی عید یہ لکھی ہے جس میں سلطان المعظم کا نام نہایت عقیدت مندانہ طریقہ سے لیا ہے اور طرح طرح سے ان کے وجود کو اپنے قومی و اسلامی جذبات کی تسکین کا سرمایہ بنانا چاہا ہے۔

ترکوں کے اخلاق اور حسن معاشرت کے نہایت معترف تھے، چنانچہ سفرنامہ میں ترکوں کے اخلاق و طرز معاشرت کا ایک عنوان قائم کیا ہے اور اس میں ان کے تمام اخلاق و محاسن گنائے ہیں، سفرنامہ کا اختتام بھی ترکوں ہی کی مدح سرائی پر کیا ہے۔

عربوں اور ترکوں کے علاوہ تمام سلاطین اسلام کے سخت حامی تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے لے کر مامون جہاں گیر اور عالم گیر پر جو الزامات لگائے جاتے تھے، شدت کے ساتھ ان کی تردید

کرتے تھے، جہاں گیر کو تمام دنیا صرف ایک عیش پسند بادشاہ خیال کرتی تھی لیکن مولانا نے اس پر الندوہ میں جو مضمون لکھا ہے، اس میں اس قسم کے مذہبی، سیاسی اور علمی واقعات اس کثرت سے جمع کیے ہیں جن سے اس خیال کی بہت کچھ تردید ہو جاتی ہے، عالم گیر پر تعصب و تنگ دلی کا جو الزام قائم کیا جاتا تھا، ایک سلسلۂ مضمون میں اس کی تردید نہایت پرزور طریقہ سے کی ہے۔

ان کی یہ عصبیت ان کے اس خیال کا نتیجہ تھی کہ یہ بادشاہ بہر حال مسلمانوں کے نمایندے اور اسلام کے فرمانروا تھے، مخالفین ان کی برائیاں اس لیے دکھاتے تھے کہ اس سے اسلام اور مسلمان بدنام ہوں اور مولانا کو یہ بدنامی کسی حال میں گوارا نہ تھی۔

پابندی اوقات وہ اپنے معمولات اور فرائض کے سخت پابند تھے، فرماتے تھے کہ جب میں علی گڑھ میں تھا تو مجھے یاد آتا ہے کہ جب کالج کی گھنٹی ہوتی تھی تو ٹھیک وقت پر پہنچنے کے لیے میں اس تیزی سے دوڑتا تھا کہ پاؤں میں درد ہو جاتا تھا، علی گڑھ سے علاحدہ ہو کر اگرچہ انہوں نے تمام عمر آزادانہ بسر کی لیکن اس حالت میں بھی جو معمول تھا اس میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا تھا، عموماً صبح کو بہت سویرے اٹھتے تھے اور دن نکلنے تک تمام ضروریات سے فارغ ہو کر تصنیف و تالیف کے لیے بیٹھ جاتے تھے اور آٹھ بجے تک اس سے بھی فارغ ہو جاتے، اس کے بعد اخبار بینی، کتب بینی اور دوسرے متفرق کام کرتے تھے، خطوط کا جواب روزانہ دیتے تھے، قاضی تلمذ حسین صاحب جو ایک زمانہ میں مولانا کے سخت مخالف ہو گئے تھے، فرماتے تھے کہ ''تمام عیوب کے ساتھ مولانا شبلی میں بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خط کا جواب ٹھیک وقت پر دیتے ہیں'' وہ خطوں کا جواب اس پابندی سے دیتے تھے کہ ایک دن کی بھی دیر نہیں کرتے تھے، ہم لوگ ڈاک آنے جانے کے دن گن کر جواب کی امید باندھتے تھے اور ٹھیک وقت پر جواب آجاتا تھا۔

الندوہ کی اشاعت میں اکثر دیر ہو جایا کرتی تھی، اس سے سخت پریشان ہوتے تھے اور اس کے لیے صاحب مطبع اور مضمون نگاروں پر سخت پابندیاں عائد کرتے تھے، جب ان سے بھی کام نہیں نکلتا تھا تو فرماتے تھے کہ اب تو یورپ میں رہنے کو جی چاہتا ہے، جہاں کام ٹھیک وقت پر انجام پاتا ہے۔

اعزہ واقارب سے محبت مولانا اگرچہ بالکل بے تعلق زندگی بسر کرتے تھے، تاہم اعزہ واقارب سے نہایت محبت رکھتے تھے، والدہ کے انتقال کو اگرچہ ایک مدت ہو چکی تھی لیکن مولانا کے دل میں اب تک ان کی محبت کی یاد تازہ تھی، فرماتے تھے کہ جب کبھی والدہ یاد آجاتی ہیں تو تڑپ تڑپ جاتا ہوں۔

مولانا کے والد نے مولانا کی والدہ کی زندگی ہی میں ایک دوسری شادی کر لی تھی اور مولانا کو اس سے اس قدر اختلاف تھا کہ جب تک مولانا کے والد زندہ رہے، انہوں نے اس مکان میں قدم تک نہیں رکھا، جس میں یہ دوسری بی بی رہتی تھیں لیکن والد کے مرنے کے ساتھ ہی محبت اور انسانیت کے اقتضا سے مولانا نے خود اسی مکان میں قیام کیا اور باوجودیکہ مولانا کے دوسرے بھائی وکیل تھے اور مولانا سے زیادہ آمدنی رکھتے تھے لیکن مولانا نے خود اپنے وظیفہ سے ۳۰ روپیہ ماہوار ان کی تنخواہ مقرر کر دی اور اس کو برابر دیتے رہے، چنانچہ اپنے بھائی مولوی اسحاق مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں "دنیاوی خواہشوں سے صاف دست بردار ہوتا ہوں، سو روپیے ہیں چھاؤنی، عالیہ، اسکول وغیرہ کے چالیس پچاس نکل جائیں گے، باقی جس قدر بچے گا، اس سے غریبانہ زندگی خاصی طرح بسر ہو سکتی ہے۔" (الحق-۱۹)

بھائیوں سے اس قدر الفت رکھتے تھے کہ مہدی مرحوم نے انتقال کیا تو مولانا نے ہفتوں کسی سے بات چیت تک نہیں کی، فرماتے تھے کہ والد مرحوم آتے تھے اور لوگوں سے ہنستے بولتے تھے تو مجھے تعجب ہوتا تھا" ایک بار مولوی عبدالسلام صاحب نے پوچھا کہ آپ نے ان کا مرثیہ کیوں نہیں لکھا، تو بولے کہ حواس کب بجا تھے۔

مہدی مرحوم کی بیوہ سے اگرچہ مولانا بذات خود ناراض رہتے تھے لیکن اپنے وظیفہ میں ان کو بھی شریک کر لیا تھا اور ایک ماہوار رقم ان کو ہمیشہ دیا کرتے تھے۔

اخیر میں مولوی اسحاق صاحب کی موت نے تو ان کی زندگی کا خاتمہ ہی کر دیا، مولانا پر اس حادثہ کا جو اثر ہوا، اس کا اندازہ ان خطوط سے ہو سکتا ہے، جو انہوں نے اس زمانہ میں لکھے ہیں، ان کے انتقال کے بعد جتنے دنوں زندہ رہے، ان ہی کے ماتم میں رہے اور آخر کار اسی غم میں جان دی۔

پہلے محل سے اولاد نرینہ میں صرف ایک حامد صاحب ہیں، وہ ایک دفعہ والد سے ناراض ہو کر کہیں چل دیے تھے، تو اس قدر بدحواس ہوئے کہ کئی دن تک کھانا پینا چھوڑ دیا تھا، وہ ایک دفعہ اعظم گڑھ میں طاعون میں مبتلا ہوئے، مولانا لکھنؤ میں تھے، خبر ملی تو فوراً لکھنؤ سے اعظم گڑھ روانہ ہو گئے اور ان کی تیمارداری کی۔

مولانا کی دوسری شادی سے جو لڑکا پیدا ہوا، اس سے بھی وہ بڑی محبت رکھتے تھے، ان کی محبوب ترین چیز صرف کتاب تھی لیکن صرف یہی لڑکا تھا جو اس معاملہ میں کتاب کی قائم مقامی کر سکتا تھا،

چنانچہ حیدرآباد سے ایک خط میں لکھتے ہیں "اس پیرانہ سالی میں خدا نے مجھ کو پھر باپ بنایا، کتاب سے گھبراتا ہوں تو اس سے جی بہلاتا ہوں۔" (مہدی-۱۲)

افسوس ہے کہ اس لڑکے نے وطن میں انتقال کیا، اس وقت مولانا حیدرآباد میں تھے، یہ افسوسناک خبر پہنچی تو ان پر بدحواسی کا عالم طاری ہوگیا، فرماتے تھے کہ تین دن تک پڑا پڑا ہائے ہائے!! کر کے رویا کرتا تھا۔

لڑکیوں سے نہایت محبت رکھتے تھے، چھوٹی لڑکی فاطمہ بیمار ہوئی اور بیماری نے طول کھینچا تو لکھنؤ بلا کر نہایت اہتمام کے ساتھ علاج کیا لیکن افاقہ نہ ہوا اور وطن میں جا کر اس نے انتقال کیا، مولانا کو اس کی خبر ہوئی تو سب کو ہٹا دیا اور کمرے میں جا کر خوب روئے، اس کی علالت کی حالت میں اس کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان سے محبت کا اظہار ہوتا ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں "قرۃ العین من! سخت افسوس سے سنا کہ تم کو ابھی تک افاقہ نہیں ہوا، عزیزی! میری اولاد میں جس کو مجھ سے پدری محبت ہے، صرف تمہیں ہو، اس لیے تم سمجھتی ہو کہ مجھ کو کس قدر تمہاری بیماری کا رنج ہے، میں اس وقت لکھنؤ سے بہت دور ہوں، ورنہ فوراً پہنچتا، خدا نے چاہا تو لکھنؤ پہنچ کر سب سے پہلے بندول آؤں گا۔" (فاطمہ خانم-۳)

نواسوں سے بھی محبت رکھتے تھے، ایک بار بڑی لڑکی کے لڑکے کو اپنے ساتھ لکھنؤ لائے اور اس کو چند دنوں ساتھ رکھا۔

پوتے سے نہایت الفت تھی، ایک مرتبہ غازی پور میں حامد صاحب کا بچہ بیمار ہوا تو مولانا بنارس میں تھے، خبر ہوئی تو سخت پریشانی کی حالت میں غازی پور گئے اور کئی دن مقیم رہ کر اس کا علاج کیا، چنانچہ ایک دوست کو لکھتے ہیں "میاں حامد کا بچہ سخت علیل ہوگیا اور میں نہایت پریشانی میں غازی پور گیا اور آج آ کر پھر واپس جاتا ہوں۔" (مہدی-۲۲)

بدقسمتی سے اسی علالت میں اس بچے نے انتقال کیا، اس کے بعد تا مرگ دوسرے پوتے کے پیدا ہونے کی حسرت دل میں رہی۔

دوسری بی بی سے بھی بہت محبت رکھتے تھے، چنانچہ ان کا انتقال ہوا تو فرماتے تھے کہ میں اس زور سے چیخ کر رویا کہ خود مجھے اپنی جان کا خوف پیدا ہوگیا۔"

اپنے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولوی حمید الدین صاحب مرحوم سے نہایت خلوص تھا اور

ان کو ہر بات میں اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے، کابل سے ترجمۂ ابن خلدون کی تحریک ہوئی تو انہی کا نام پیش کیا، علی گڑھ کی عربی پروفیسری کے لیے نواب محسن الملک نے لکھا تو انہی کے لیے کوشش کی اور وہ اسی کوشش سے وہاں کے پروفیسر مقرر ہوئے، دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپلی کے لیے مولانا کا انتخاب ہوا تو انہوں نے یہ جگہ بھی مولوی حمید الدین صاحب کو دلا دی، ان کی فارسی سخن سنجی نکتہ آفرینی اور آخر میں ان کی قرآن فہمی کے بے حد معترف تھے، مسائل کی تحقیق میں ان سے مشورے کرتے تھے، ان کے فارسی کلام کی نسبت کہتے تھے کہ یہ زبان ہے، ان کی مذہبی علمی و عملی شیفتگی اور پابندی کی بنا پر ان کو درویش کہتے تھے اور تھے بھی، وہ ایسے ہی عقیدۃً اور عملاً نمونۂ سلف رحمۃ اللہ تعالیٰ، دیندار اور عبادت گزر، تہجد گزار، متقی، متوکل، صابر و قانع، متواضع و خاکسار، غرض مجموعۂ اوصاف۔

اعزہ میں مولوی محمد سمیع صاحب سے بھی بہت انس تھا، چنانچہ سفر قسطنطنیہ میں ان کو ساتھ لیجانا چاہا تھا، اسی تعلق کی بنا پر ان کے بھائی علی ضامن کا بہت خیال رکھتے تھے اور تعلیمی معاملات میں ان کو مالی اعانت دیتے تھے۔

وہ اپنے تلامذہ سے بھی مثل عزیزوں ہی کے محبت رکھتے تھے، راقم الحروف فراغت کے بعد ۱۹۰۸ء میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں ایک ملازمت کے خیال سے لکھنؤ سے چلنے لگا تو مولانا سے رخصت ہونے گیا، انہوں نے پہلے آنریبل مولوی شرف الدین صاحب جج ہائی کورٹ کلکتہ کے نام ایک سفارشی خط لکھ کر دیا کہ وہ سرڈینی سن راس[1] صاحب سے جو ان دنوں مدرسۂ عالیہ کے صدر تھے، مجھے ملا دیں، خط لکھ کر میرے ہاتھوں میں دیا تو ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پھر فرمایا ''سلیمان اگر ندوہ میں گنجایش ہوتی تو میں تم کو کہیں جانے نہ دیتا۔''

دوسرے تلامذہ سے بھی ان کا برتاؤ یہی تھا اور ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ وہ مجھی سے زیادہ محبت رکھتے ہیں، حالاں کہ مولانا کا مزاج بہت جھلا تھا، یعنی ان کو غصہ جلد آتا تھا، پھر بھی ہر شاگرد ان پر نچھاور ہونے کو تیار رہتا تھا اور اس غصہ کو بھی ان کی محبت ہی کا مظہر سمجھتا تھا۔

کتب بینی | مولانا کو بچپن ہی سے کتب بینی کا نہایت شوق تھا، جب اعظم گڑھ میں ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے تو روزانہ ایک کتب فروش کی دوکان پر جا کر فارسی کی کتابیں دیکھا کرتے تھے، ایک روز

---

[1] افسوس ہے کہ راس صاحب نے ان دنوں ستمبر ۱۹۴۰ء میں قسطنطنیہ میں وفات پائی جہاں وہ انگریزی دفتر کی مصالحت کی بنا پر مقیم تھے۔۱۲

مولانا کے والد نے ان کو کتب فروش کی دوکان پر دیکھا تو منع فرمایا، اب مولانا نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کی دوکان سے کتابیں لے آتے تھے اور مکان پر دیکھتے تھے، بڑے مزے کی بات تو یہ تھی کہ باوجود اس شوق کے کتاب کا مطلب نہیں سمجھتے تھے، فرماتے تھے کہ صفحے کے صفحے پڑھ جاتا تھا لیکن صرف ایک آدھ لفظ اور ایک آدھ سطر سمجھ میں آتی تھی اور اسی کو غنیمت سمجھتا تھا۔

تحصیل علم سے فارغ ہو کر کسب معاش کے کاموں میں مصروف ہوئے، تب بھی یہ شوق قائم رہا، امانت کا کام کرتے تھے اور ادھر ادھر گھوڑے پر سوار ہو کر دورہ کرتے پھرتے تھے لیکن اس حالت میں بھی دیوانہ حماسہ ساتھ رہتا تھا، جہاں ذرا سا آرام لینے کا موقع ملا، اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔

حج و زیارت کے سلسلہ میں جب مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو وہاں کے کتب خانوں کی بھی سیر کی، فرماتے تھے کہ احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ ان ہی کتب خانوں میں نظر آیا، تمہید ابن عبدالبر یہیں دیکھی تھی۔

علی گڑھ تشریف لے گئے تو اس شوق کے پورا کرنے کا کافی سامان ہاتھ آیا، سید صاحب کا کتب خانہ بہترین کتابوں کا مجموعہ تھا اور انہوں نے مولانا کے ذوقِ علم کو دیکھ کر مطالعہ کی عام اجازت دے دی اور مولانا نے دل کھول کے اس گنجینۂ علم سے فائدہ اٹھایا، چنانچہ ایک خط میں نہایت مسرت کے ساتھ لکھتے ہیں "سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے، سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیۂ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کو حقیقت میں بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے، مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئیں، گبن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپیہ کے صرفہ سے کرایا ہے، میرے مطالعہ میں ہے۔" (سمیع۔۳)

علی گڑھ میں مولانا کے ایک اور دوست تھے جن کو کتابوں کا بڑا شوق تھا، وہ مولانا کے پاس نخریہ کتابیں بھیج دیتے تھے اور مولانا نہایت شوق سے ان کا مطالعہ کرتے تھے، چنانچہ ایک عزیز کو نہایت مسرت کے ساتھ اس کی اطلاع دیتے ہیں "یہاں ایک شخص عبدالحمید نامی اہل مد محکمۂ کلکٹری ہیں، یہ صاحب دیوان ہیں اور کتابوں کے بڑے شائق، بہت سا حصہ ان کی تنخواہ کا کتابوں میں صرف ہوتا ہے، ان کا دعویٰ تھا کہ کوئی دیوان وغیرہ فارسی کا ایسا نہیں جو چھپا ہو اور میرے پاس نہ ہو، میں نے ان کو

بہت سی کتابیں لکھوادی ہیں اور وہ بہت جلد ان کو منگوانا چاہتے ہیں، یہ خوب آدمی ہیں، ان کے ذریعہ سے کتابیں دیکھنے کو خوب ملتی ہیں، یہ بیچارے فخر یہ کتابیں بھیج دیا کرتے ہیں...... ممکن ہے سلمان ساوجی وطالب آملی دیکھنے کو مل جائے۔" (سمیع -۲)

گزشتہ تعلیم المامون اور سیرۃ النعمان کی تصنیف تک تو ہندوستان کے علمی سرمایہ نے مولانا کا ساتھ دیا لیکن الفاروق کی تصنیف کا خیال ہوا تو مولانا کو یہ سرمایہ ناکافی معلوم ہوا، اس لیے مصر وقسطنطنیہ کے افق کی طرف نگاہ اٹھائی اور محض ذوق علم کے لیے طویل المسافت اور کثیر المصارف سفر کے لیے تیار ہو گئے اور ہندوستان کی علمی تاریخ میں ممالک اسلامیہ کا غالباً یہ پہلا سفر ہے جو محض ذوقِ علم کے لیے کیا گیا، مولانا قسطنطنیہ پہنچے تو کتب خانوں کی سیر میں مصروف ہوئے، کتب خانے نہایت دور دور واقع تھے لیکن مولانا پیدل جاتے تھے اور ان کو دیکھتے تھے، چنانچہ اپنے والد کو قسطنطنیہ سے ایک خط میں لکھتے ہیں "کتابیں نہایت عجائب وغرائب ہیں، لیکن حسرت کے سوا کچھ حاصل نہیں، نہ نقل ہو سکتی ہے، نہ حافظہ ان کے لیے کافی ہے، میں ہر روز دو تین میل پیادہ سیر کرتا ہوں کیوں کہ کتب خانہ دور دور واقع ہیں۔" (مکاتیب -۱)

ایک خط میں سید صاحب کو لکھتے ہیں "سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ دو تین سو یا اس سے زیادہ روپیے بھیج دیں کہ جو کتاب جس وقت ہاتھ آئے لی جائے یا نقل و کتابت کا انتظام کیا جا سکے، کتابیں یہاں بہت ہیں اور نادر ہیں لیکن کہاں تک لکھوائی جا سکتی ہیں، امام غزالی کی تصنیفیں یہاں موجود ہیں اور بوعلی سینا کی تو شاید کل تصنیفات مل سکتی ہیں، امام غزالی کے خطوط بھی موجود ہیں۔

اس وقت بلکہ زمانۂ قیام تک مطلق فرصت نہیں مل سکتی، ہر روز تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا ہے، بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتب خانے وغیرہ دور دور واقع ہیں۔" (مکاتیب -۱)

سفر نامہ میں قسطنطنیہ کے جو حالات لکھے ہیں، ان میں کتب خانوں کا ذکر اس تمہید کے ساتھ کیا ہے۔ "ترتیب مضمون اور نسق کلام کی وجہ سے میں اس عنوان پر دیر میں پہنچا، ورنہ ذاتی شوق اور غایت سفر کے لحاظ سے یہی مضمون تھا، جس کو میں سب سے اول اور سب سے مفصل لکھتا...... اسلامی دنیا کے جن حصوں میں آج تعلیم و تعلم کا چرچا ہے، وہ ہندوستان، عرب، مصر، شام، بلاد مغرب، فارس اور ایران ہیں، ان میں سے اکثر مقامات کا علمی سرمایہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جو نہیں دیکھا ہے وہ ایسے قوی وسائل سے معلوم ہے کہ دیکھنے کے برابر ہے، اس بنا پر میں کافی یقین کے ساتھ

کہہ سکتا ہوں کہ تمام اسلامی دنیا میں قسطنطنیہ عربی تصنیفات کا سب سے بڑا مرکز ہے۔'' (ص ۸۹، ۹۰)

ہندوستان کا شاید ہی کوئی کتب خانہ ہو جس کو انہوں نے بار بار نہیں دیکھا، رام پور کا سرکاری کتب خانہ، لکھنؤ میں مولوی حامد حسن صاحب کا کتب خانہ، خدا بخش خاں لائبریری بانکی پور، ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کلکتہ، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد وغیرہ کے علاوہ لوگوں کے ذاتی کتب خانوں کی بھی سیر فرمایا کرتے تھے، بلکہ جب کسی شہر میں جاتے تھے، تو وہاں اگر کتابوں کا کوئی ذخیرہ کسی کے پاس ہوتا تو اس کو جا کر ضرور دیکھتے۔

مطالعہ کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی کتاب اول سے آخر تک نہیں پڑھتے تھے، فرماتے تھے کہ اگر یہ طریقہ اختیار کروں تو ایک ہی کتاب میں الجھ کر رہ جاؤں، بے ترتیبی کے ساتھ ادھر ادھر اوراق الٹتے پلٹتے رہتے تھے اور نہایت سرعت کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے لیکن بایں ہمہ کتاب میں جو بہترین معلومات ہوتیں، ان پر نگاہ پڑ جاتی اور ان معلومات پر اس قدر حاوی ہو جاتے کہ کتاب پر ریویو کرنے کے لیے بالکل تیار ہو جاتے۔

مولانا کی تصنیفات کا زیادہ تر حصہ بہ ظاہر تاریخ و سیر میں ہے، اس بنا پر بہت سے ناواقف لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا نے تاریخ و ادب کے سوا اور کوئی فن سرے سے پڑھا ہی نہیں تھا اور کم از کم یہ خیال تو ہر شخص کے دل میں گزرتا ہوگا کہ ان کے مطالعہ میں تاریخ و سیر کے سوا اور کسی فن کی کتابیں نہیں رہتی ہوں گی لیکن واقعہ یہ ہے مولانا نے فلسفہ، منطق، فقہ، تفسیر، حدیث غرض تمام علوم کو بالاستیعاب پڑھا تھا اور ہمیشہ ان علوم کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے، تاریخ و ادب کی نسبت جس کو ان کی تمام تر کائنات سمجھا جاتا ہے، مولانا خود فرماتے تھے کہ ''یہ تو ہمارے دسترخوان کی چٹنی ہے۔''

صحت و علالت، سفر و حضر، جلوت و خلوت، غرض ہر حالت میں کتابیں ان کی رفیق رہتیں، سفر کشمیر سے واپس آ کر جب سخت بیمار پڑے تو اس حالت میں بھی مطالعہ برابر جاری تھا، فرماتے تھے کہ میں اس زمانہ میں اکثر صدرا دیکھا کرتا تھا۔''

ایک بار جب اعظم گڑھ میں سخت طاعون آیا اور خود مولانا کے فرزند محمد حامد صاحب مبتلائے طاعون ہوئے تو لوگ شہر سے باہر چھپروں میں نکل گئے اور مولانا بھی مع حامد کے چھپر میں مقیم تھے اور شبلی منزل کو چھوڑ دیا تھا، ایک روز اسی حالت میں محقق طوسی کی شرح اشارات دیکھ رہے تھے، محقق طوسی

نے امام رازی پر ایک اعتراض کیا تھا جو مولانا کو غلط معلوم ہوا، باوجودیکہ شہر میں طاعون تھا اور بنگلہ بند تھا، لیکن فوراً اٹھے اور بنگلہ کھول کر محاکمات نکالی اور اس میں دیکھا تو واقعی محقق طوسی کا اعتراض غلط تھا۔

وہ بذاتِ خود اگرچہ ہر چیز میں ترتیب و نظام چاہتے تھے لیکن مطالعہ کے معاملے میں ان کو مجبوراً یہ اصول توڑ دینا پڑتا تھا، کمرے میں کتابیں ادھر ادھر پڑی رہتی تھیں، مولانا کو اگرچہ یہ بے ترتیبی ناگوار تھی لیکن فرماتے تھے کہ کیا کیا جائے؟ اگر کتابوں کو مرتب رکھوں تو مطالعہ میں خلل واقع ہو۔

مولانا کی کثرت تصنیفات کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ان کے اوقات کا اکثر حصہ تصنیف وتالیف میں صرف ہوتا ہوگا لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ صبح کو صرف ایک دو گھنٹے تصنیف وتالیف میں صرف کرتے تھے اور صرف صفحہ دو صفحہ لکھتے تھے، بقیہ اوقات کتب بینی کے نذر ہوتے تھے، فرماتے تھے کہ ''میں تنہائی میں کبھی بغیر کتابوں کے نہیں بیٹھ سکتا'' مولوی وحیدالدین سلیم جب لکھنؤ میں مسلم گزٹ کے اڈیٹر تھے اور امین آباد پارک میں مولانا کے پہلو میں رہتے تھے، وہ کہتے تھے کہ ''مولانا شبلی کیوں قاق ہوگئے ہیں؟ میں جب جاتا ہوں کبھی ان کو بیکار نہیں پاتا، ہر وقت کتابیں الٹا پلٹا کرتے ہیں، یہ صحت کے لیے سخت مضر ہے، مولانا عبدالحیؒ مرحوم فرنگی محلی کو اس کی بدولت صرع کا عارضہ ہوا اور وہی ان کی موت کا سبب ہوگیا۔''

اسی طرح مولانا کی نظر سے تمام موجودہ کتابیں گزر چکی تھیں، فرماتے تھے کہ ''اب تو کتابیں دیکھنے کو نہیں ملتیں'' جب کسی نئی اور نادر کتاب کا پتہ چلتا تو اس کے دیکھنے کے شوق میں بیتاب ہو جاتے، بمبئی کی جامع مسجد میں ایک مختصر سا کتب خانہ ہے، مولوی عبدالسلام صاحب جب بمبئی میں ان کے ساتھ تھے، تو ان سے فرمایا کہ جاکر اس کتب خانہ کو دیکھ آؤ اور اگر کوئی نادر اور قلمی کتاب ہو تو اس کا نام لکھ لاؤ، وہ چند کتابوں کے نام لکھ لائے، انہی کتابوں میں قفال کی کتاب محاسن الشریعہ کا نام بھی تھا، قفال بہت بڑے متکلم ہیں اور عقلی طرز پر قرآن مجید کی تفسیر کی ہے، تفسیر کبیر میں جابجا ان کے اقوال مذکور ہیں اور مولانا نے ان کو علم کلام کے بانیوں میں قرار دیا ہے اور علم کلام اور الکلام میں ان کے جستہ جستہ اقوال سے جو تفسیر کبیر میں مذکور ہیں فائدہ اٹھایا ہے، مولانا نے ان کی کتاب کا نام پڑھا تو شوق کے لہجہ میں فرمایا کہ یہی ایک کتاب دیکھنے کے قابل ہے اور دوسرے روز خود گئے اور اس کو دیکھا۔

مولانا کتب بینی کے لیے نہایت نادر اور بلند کتابیں انتخاب کرتے تھے اور جو لوگ معمولی

کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، ان کی حالت پر سخت افسوس کرتے تھے اور اس کو نظام تعلیم کی ابتری کا نتیجہ بتاتے تھے، قسطنطنیہ میں جو مسلمانوں کے تمام قدیم علمی جواہرات کی کان ہے، جب ان کو نظر آیا کہ یہاں لوگ معمولی درجہ کی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتے ہیں، تو سخت متاسفانہ انداز میں یہ ریمارک کیا" میں کتب خانوں میں جب لوگوں کو کتابوں کے مطالعہ میں مشغول دیکھتا تھا تو ہمیشہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ کس قسم کی کتابیں ان کے پیش نظر ہیں لیکن میں نے کسی کے سامنے مختصر معانی، ایسا غوجی، شرح وقایہ، جلالین وغیرہ کے سوا کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی۔

حقیقت یہ ہے کہ کل دنیائے اسلام میں تعلیم کا طریقہ ایسا ابتر اور ذلیل ہوگیا ہے کہ چند درسی کتابوں کے سوا لوگوں کو کسی قسم کی جدید معلومات کی طرف رغبت ہی نہیں ہوتی، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ جدت اور ایجاد کا مادہ قوم سے مسلوب ہوتا جاتا ہے اور جس قدر کہیں کہیں کچھ رہ گیا ہے، آیندہ اس کی بھی امید نہیں۔" (سفرنامہ ص ۹۷، ۹۸)

کتابوں کا نہایت شوق تھا، مصر، بیروت، شام اور یورپ میں جو بہترین کتابیں شائع ہوتیں ان کو بہت شوق سے منگواتے اور عمدہ جلد بندھوا کر ان کو میز یا الماری میں رکھتے، قدیم قلمی کتابوں کی جستجو میں ہمیشہ مصروف رہتے اور جب کوئی عمدہ کتاب مل جاتی تو نہایت فیاضی کے ساتھ خریدتے، مونس الارواح کا ایک مطلا و مذہّب نسخہ ہاتھ آیا، تو اس کو سو روپیہ پر خریدا، ایک قرآن دو سو روپیہ پر ہدیہ لیا، بہت سی قلمی کتابیں نقل کرواتے تھے اور ان پر بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے، خصائص ابن جنی، اخبار الحکما، شہرزوری، کشف الادلہ، رباعیات سحابی، رد المنطق لابن تیمیہ کے نسخے ان کے کتب خانے میں اسی طرح دور دور سے نقل ہو کر آئے تھے لیکن اس شوق کے پورا کرنے کے لیے ان کے پاس کافی روپیہ نہ تھا، اس لیے اگر کہیں بہترین کتابیں ان کی نظر سے گزر جاتی تھیں تو ان کو اپنی مفلسی پر سخت افسوس ہوتا تھا، ایک بار مولوی سید علی بلگرامی کے کتب خانہ میں مطبوعاتِ یورپ نظر سے گزریں، تو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھا "مولوی سید علی صاحب کے کتب خانہ میں عربی مطبوعات یورپ دیکھ کر میں سخت حیرت زدہ ہوگیا ہوں، علمی زمین نے اپنے خزانے اگل دیے ہیں، کیا کہوں اپنے علما کی بدقسمتی اور اپنی مفلسی پر افسوس آتا ہے۔" (شروانی-۳۲)

جن نادر چیزوں کو خود نہ خرید سکتے، اپنے علم دوست دولت مند دوستوں کو ان کے خریدنے کی

ترغیب دیتے، چنانچہ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام اس قسم کے متعدد خطوط ہیں، ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں ''اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کی علمی نفاست پسندیوں کے وہ نمونے آج کل یہاں آگئے ہیں کہ عقل کی وسعت اس کے اندازہ سے کمی کرتی ہے، ہیئت کے نوادر، اس میں کتاب الآلات کا بھی ایک عمدہ نسخہ ہے۔

لیکن میں جس چیز کی ترغیب دیتا ہوں وہ خوشنویسوں کے قطعے اور تصاویر ہیں، خدا بخش خاں وغیرہ کے خزانے بھی ان جواہرات سے خالی ہیں، ابھی قیمتیں متعین نہیں ہوئیں، ایک آدھ پر میں بھی حوصلہ آزمائی کروں گا۔'' (شیروانی-۱۷)

مولانا شروانی لکھتے ہیں کہ میں نے وہ مرقع مولانا کی تحریر پڑھ کر خریدا، کتاب خانے میں ہے، منصور کے قلم کا سرخ سوسن کا بوٹا اس میں ہے، امریکہ کے ایک مؤلف نے حال میں لکھا ہے کہ ساری دنیا میں حبیب گنج میں منصور کے ہاتھ کی گلکار (FLORAL) تصویر ہے۔''

درس وتدریس علما کے فرائض و اعمال میں تصنیف و تالیف، وعظ و پند اور ہدایت و ارشاد کے علاوہ درس و تدریس بھی ہے، مولانا نے اگرچہ اور مشاہیر علما کی طرح اپنا کوئی مستقل حلقۂ درس قائم نہیں کیا، تاہم بہت سے خوش قسمت لوگوں کو ان کی تعلیم و تربیت سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہوا، تحصیل علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اعظم گڑھ میں خود بھی ادب کی تکمیل کرتے تھے اور ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں ''دریں فرصت بادب کار دارم خود چیزے از ادب می خوانم و دیوانِ حماسہ بہ دیگرے می آموزم۔'' (مکاتیب-۲)

وکالت کی غرض سے بستی میں چند روز کے لیے طرح اقامت ڈالی تو وہاں بھی یہ مشغلہ جاری تھا، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں ''دریں روز ہا دکان کشادہ ام وتن بآموختن کساں درداده''

مولانا حمید الدین صاحب مرحوم اسی زمانہ کے تربیت یافتہ ہیں۔

وکالت چھوڑ کر علی گڑھ میں آئے تو اگرچہ کالج کے تعلق سے یہ مستقل مشغلہ ہو گیا لیکن ایک ایسے شخص کے نزدیک جس کے سر پر صدرا، شمس بازغہ اور حمد اللہ کی دقت آفرینیوں کا نشہ ہو، جس کی زبان پر عرب جاہلیت کے اشعار چڑھے ہوئے ہوں، جو حدیث و فقہ کے بہترین علما سے درس حاصل کر چکا ہو، فارسی کے چند انتخابات کی کیا وقعت ہوسکتی ہے، اس لیے یہاں بھی خارجی طور سے بعض لوگ مولانا سے ادب کا درس حاصل کرتے رہے۔

ندوۃ العلما میں تشریف لائے تو یہ بہ کثرت طلبہ کو مولانا سے مستفید ہونے کا موقع ملا لیکن ندوہ میں انہوں نے باضابطہ طور پر کبھی درس نہیں دیا، بلکہ اس کی صورت یہ تھی کہ کبھی قرآن مجید کے حقائق و معارف پر درس دیتے، کبھی صدرا شروع ہوتی اور اوپر کے درجہ کے طلبہ شریک ہوتے، مولانا حفیظ اللہ صاحب پڑھاتے اور مولانا اس پر نکتہ چینی کرتے یا خود کسی مسئلہ پر تقریر کرتے، کبھی ادب کی کوئی کتاب شروع کراتے، کبھی صحیح بخاری پڑھاتے، بعض اوقات قدیم طریقۂ املا کے موافق کسی علمی مسئلہ پر خطبہ دیتے اور اس میں تمام طلبہ شریک ہوتے، اسی طرح ہمیشہ طلبہ کو مولانا سے مختلف علوم وفنون کی تحصیل کا موقع ملتا رہا، تصنیف و تالیف، تحریر و تقریر کی تعلیم اس سے الگ تھی اور ندوہ کے طلبہ میں مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کا جو مذاق پیدا ہو گیا ہے وہ اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے

علی گڑھ کالج کے زمانہ میں مولانا فارسی عربی اور قرآن مجید کا درس کالج کے طلبہ کو دیتے تھے، یہ طلبہ ان علوم کے علاوہ ادب و شاعری کا ذوق بھی مولانا سے حاصل کرتے تھے، چنانچہ چودھری خوشی محمد ناظر، سید سجاد حیدر[1] یلدرم، مولوی ظفر علی خاں، مولانا محمد علی وغیرہ ان کے اس فیضِ صحبت سے مستفید تھے۔

لطف صحبت مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اپنے مضمون مندرجہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ (مورخہ ۲۷ر جنوری ۱۹۱۵ء) میں تحریر فرماتے ہیں "صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی، انسان خواہ کسی درجہ کا ہو، ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا، جس مسئلہ پر گفتگو کرتے ان کے کمال کی خوبیاں نظر آتیں، عقلی پیرایہ، مورخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی، ان کے بیان کے رفیق و ہمدم تھے، جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو ہوئی بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کیے، فضول باتیں میں نے ان کی زبان سے کبھی نہیں سنیں۔"

عام طور پر مولانا کی صحبت سے مستفید ہونے کا وقت ۴ بجے شام سے شروع ہوتا تھا اور آٹھ بجے شب تک ختم ہو جاتا تھا، چار بجے شام کے بعد ان سے ملنے کی عام اجازت تھی اور ہر کہ ومہ بلاتکلف ان سے مل سکتا تھا، مولانا اس مخصوص وقت کے لیے کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے تھے، نہ ان کے یہاں ترتیب سے کرسیاں بچھائی جاتی تھیں، نہ لوگوں کی خدمت میں پان اور سگریٹ پیش کیا جاتا تھا اور نہ چائے وحقہ کا دور چلتا تھا، چند کرسیاں اور چند مونڈھے ادھر ادھر پڑے رہتے تھے اور مولانا کبھی آرام کرسی پر اور کبھی کھرے پلنگ پر لیٹے ہوتے تھے، جو آتا کرسی یا مونڈھا گھسیٹ لیتا اور بیٹھ جاتا، ظاہرداری اور

---

[1] افسوس کہ ۱۲ر اپریل ۱۹۴۳ء کی رات کو لکھنؤ میں بہ عارضہ قلب وفات پائی۔ "س"

تصنع سے کسی کی تعظیم وتکریم بالکل نہیں کرتے تھے، اگر کوئی نیا شخص ہوتا تو پلنگ سے اٹھ بیٹھتے یا کرسی پر ذرا سنبھل کے بیٹھ جاتے، معمولی طور پر صرف یہ پوچھ لیتے ''کہاں سے آنا ہوا'' اور ''کیا مقصد ہے؟''

محاضرات کی کتابوں میں بعض کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، جن کو کشکول کہتے ہیں، ان کتابوں کا کوئی خاص موضوع نہیں ہوتا، بلکہ ان تمام علوم وفنون کے متعلق نادر اور لطیف نکتے جمع کر دیے جاتے ہیں، اس لیے انسان ان سے دل بھی بہلا سکتا ہے اور علمی فوائد بھی حاصل کر سکتا ہے، بعینہٖ یہی حال مولانا کی صحبت کا بھی تھا، وہ ایک مختلف الحیثیات صاحب کمال تھے، یعنی بہت بڑے شاعر تھے، بڑے فلاسفر تھے، بہت بڑے مورخ تھے، بہت بڑے انشا پرداز تھے، بہت بڑے سیاح تھے، بہت بڑے وسیع المعلومات تھے، بہت بڑے سیاسیات کے نکتہ شناس تھے، بہت بڑے جامع الفنون تھے، اس بنا پر ان کی صحبت میں ہر قسم کے لوگ جمع ہو جاتے تھے اور وہ ہر فن کے متعلق نہایت بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے، شعر و شاعری کا ذکر آ جاتا تو عربی فارسی اور اردو کے سیکڑوں منتخب اشعار سنا دیتے اور اس کے ساتھ ان پر تنقید بھی کرتے جاتے، کسی فن کے متعلق کتابوں کا ذکر آ جاتا تو بیسیوں مطبوع اور قلمی کتابوں کا نام بتا دیتے، فلسفہ اور منطق کے کسی مسئلہ کا ذکر آ جاتا تو مع مالہ وماعلیہ اس پر تقریر کر دیتے، وسعت نظر کی بنا پر سیکڑوں تاریخی واقعات اور سینکڑوں مہذب لطیفے یاد تھے، سیر وسیاحت میں ہر قسم کی چیزیں نظر سے گزر چکی تھیں، بڑے بڑے علما وفضلا اور رہبرانِ قوم سے ملنے جلنے کا اتفاق ہو چکا تھا اور ان کے خیالات سے واقف تھے، اس بنا پر ان چیزوں کی آمیزش سے یہ علمی صحبت نہایت شگفتہ اور دل چسپ ہو جاتی تھی، ان کی صحبت میں فضول، لغو یا عام باتیں کبھی نہیں ہوتی تھیں، کبھی کوئی علمی مسئلہ چھڑ جاتا، کبھی کسی زیر تالیف کتاب کے متعلق کوئی گفتگو شروع ہو جاتی، کبھی قومیات وسیاسیات کا تذکرہ ہو جاتا، کبھی کسی مضمون کا ذکر ہوتا۔

بڑے بڑے ارباب کمال کی صحبتوں میں عموماً یہ عالم نظر آتا ہے کہ حاضرین مودبانہ خاموشی کے ساتھ بیٹھے ہیں، اور ایک باوقار اور پر عظمت ہستی کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے، اس کو کانوں سے سن لیتے ہیں لیکن بے تکلفی، سادگی اور خاکساری کی بنا پر مولانا کی صحبت اس سے بالکل مختلف تھی، ان کے یہاں ہر شخص نہایت بے تکلفی کے ساتھ بیٹھ کر ان کی گفتگو میں حصہ لے سکتا تھا، ان کے خیالات کی مخالفت اور ان پر نہایت بے باکی کے ساتھ نکتہ چینی کر سکتا تھا۔

ان کو بعض مولویوں اور عربی خوانوں کی پست ہمتی اور عدم صفائی وغیرہ سے سخت تنفر تھا، اس لیے

علی الاعلان اس کی بھی برائی کرتے تھے لیکن اگر کسی شخص میں کوئی خوبی نظر آتی تو اسی طرح اس کا تذکرہ بھی کرتے اور نہ صرف تذکرہ کرتے بلکہ لوگوں کو خطوط میں بھی لکھتے، مولوی حمید الدین صاحب کی فارسی زبان دانی کے قائل تھے اور تعریف کرتے تھے، آخر میں ان کی تفسیر نظام القرآن کے متعلق دوسرے رسائل کی بھی مدح فرماتے، ندوہ میں جو طلبہ کسی قابل نکلے مولانا نے ان کو اسی طرح ہر جگہ روشناس کیا، مولانا حفیظ اللہ صاحب فرماتے تھے کہ "طلبہ کی تعریفیں کر کر کے مولوی شبلی ان کو خراب کر دیتے ہیں، اپنے اساتذہ میں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری کے حسن اخلاق وتورع، مولانا ارشاد حسین صاحب کے تفقہ، مولانا فیض الحسن صاحب کی عربیت اور محمد فاروق صاحب کی ادبیت ومعقول دانی کا تذکرہ ہمیشہ نہایت مدح وستایش کے ساتھ کرتے تھے، معاصرین میں مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی اور مولانا شیر علی صاحب (حیدر آباد) کی نکتہ رسی کی داد دیتے تھے، مولانا شاہ سلیمان صاحب کے حسن تقریر اور مولانا عبدالحق صاحب حقانی کی خوبی بیان کی مدح فرماتے تھے اور علمائے دیوبند میں سے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کی روشن خیالی اور سیاسی گہرائی اور مولانا محمود احسن صاحب کے علم وفضل اور تقویٰ کے معترف تھے، کبھی کبھی ان سے خط وکتابت بھی رہتی تھی اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی دینی برکت وصحبت اور بے نیازی کی بھی قدر کرتے تھے۔ (شروانی-۵۷)

اسی طرح سرسید کی انشا پردازی، مولانا حالی کی سخن فہمی اور نواب وقار الملک کی اخلاقی قوت کے بے حد مداح تھے اور ہر موقع پر اس کا ذکر فرماتے تھے۔

احباب مولانا کے تعلقات نہایت وسیع تھے، اس لیے ان کے احباب کے ناموں کا استقصا نہایت مشکل ہے، تاہم جن لوگوں سے اخیر تک تعلقات قائم رہے ان میں نواب محسن الملک، مولانا حالی، نواب وقار الملک، نواب عماد الملک، مولوی سید حسین بلگرامی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، حاذق الملک حکیم اجمل خاں، نواب سید علی حسن خاں، ایم مہدی حسن، مولوی ریاض حسن خاں صاحب اور خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی کے نام خصوصیت کے ساتھ ممتاز ہیں۔

نواب محسن الملک کے ساتھ مولانا کے تعلقات علی گڑھ میں پیدا ہوئے اور وہیں ان تعلقات نے استحکام کیا، نواب صاحب مولانا کے فضل وکمال کے معترف تھے اور مولانا ان کے فضل واحسان اور لطف عمیم کے ہمیشہ مداح رہے، ساتھ ہی ان کی کج و پیچ پالیسی سے ہمیشہ گھبراتے بھی تھے، تاہم

گورنمنٹ سے ان کی صفائی کرانے میں نواب صاحب کی کوششوں کا بڑا حصہ شامل تھا، حیدرآباد کی ملازمت اور اجراے وظیفہ میں بھی نواب صاحب کی کوششیں شامل تھیں، نواب صاحب نے مولانا کو بار بار علی گڑھ بلانا چاہا لیکن مولانا نے اس کو منظور نہیں کیا، سفر کشمیر سے واپس آ کر مولانا علیل ہوئے تو نواب صاحب عیادت کے لیے خود اعظم گڑھ تشریف لائے، واقعہ شکست پا کے بعد مولانا لکھنؤ آئے تو نواب صاحب نے لکھنؤ آ کر مولانا کی عیادت کی، نواب صاحب کا انتقال ہوا تو ان کے ماتم میں مولانا نے الندوہ میں ایک پردرد مضمون لکھا، جس میں ان کی تمام خوبیاں گنائیں۔

مولانا حالی سے ان کے تعلقات علی گڑھ کے قیام میں پیدا ہوئے، اکثر ایسا ہوتا کہ مولانا حالی کالج میں آ کر قیام کرتے اور دونوں صاحبوں میں شعر وسخن اور علم وفن کی صحبتیں ہوتیں، بلند شعر پڑھے جاتے اور سنے جاتے، مطالعہ کے لیے کتابیں منتخب کی جاتیں، مولانا حالی بہت نیک طینت، متواضع اور خاکسار بزرگ تھے، بڑوں کا کیا ذکر، وہ چھوٹوں سے بھی چھوٹے ہو کر ملتے، وہ گو مولانا سے عمر میں بڑے اور تصنیفی عہد کے لحاظ سے بھی مقدم تھے، مگر وہ مولانا کا ذکر دوسروں سے اس طرح کرتے تھے جیسے کسی اپنے سے کسی بڑے کا ذکر کر رہے ہیں، علی گڑھ کے بعد جب مولانا اعظم گڑھ گئے تو مولانا شیروانی سے ان کی خیریت دریافت کرتے اور جب وہ حیدرآباد گئے تو مولوی عبدالحق صاحب سے ان کی خیریت پوچھتے، انہی کے ذریعہ ان کو سلام کہلاتے، حیدرآباد میں تقرر پر مبارکباد انہی کے ذریعہ بھجوائی اور حیات جاوید کا نسخہ بھی ہدیہ بھیجا۔ (مکتوبات حالی)

مولانا شبلی جب ندوہ آئے اور وہاں کے طلبہ کے بعض مضامین الندوہ میں چھاپے تو سب سے پہلے مولانا حالی ہی نے ان کی تعریف کی اور حوصلہ افزائی فرمائی، مولانا کے پاؤں میں گولی لگنے کا جب واقعہ پیش آیا تو بہت مضطرب ہوئے، خط لکھا، اس واقعہ پر نظم لکھی اور ان کے عزیزوں سے ان کی خیریت دریافت کی۔

مولانا سید علی بلگرامی سے مولانا کے تعلقات علم دوستی کی راہ سے تھے، حیدرآباد کے وظیفہ کے تقرر اور ملازمت میں ان کی کوششوں کو بہت دخل تھا، مولانا حیدرآباد جاتے تھے تو ان کے مکان پر مہینوں قیام فرماتے تھے، الفاروق کے دیباچہ میں مولانا نے ان کا نام خاص طور پر لیا ہے، ایک بار وہ لکھنؤ میں آئے تو مولانا ان کو ندوۃ العلما میں معائنہ کی غرض سے لائے اور ان کے سامنے مختلف طلبہ سے عربی

میں تقریریں کرائیں، مولوی سید علی صاحب مولانا کو بعض عمدہ کتابیں ہدیۃً بھیجا کرتے تھے۔

نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی سے مولانا کے تعلقات سرسید کے ذریعہ سے ہوئے، یعنی چوں کہ نواب صاحب ایک علم دوست آدمی تھے، اس لیے سرسید نے نواب صاحب کو اسی راستہ سے اپنی تحریک سے وابستہ کیا، مولانا کی تصنیفات ان کے پاس بھیجیں اور خود ان سے اس سلسلہ میں ایک دو تصنیف کے طالب ہوئے، غرض اس طرح مولانا کے نام اور کام سے نواب صاحب کو تعلق خاطر پیدا ہوا، جو طرفین سے اعتراف کی حد تک پہنچا اور یہ تعلقات سراسر علمی تھے، ان سے ان ہی مسائل پر برابر مراسلت اور خط و کتابت رہتی تھی۔

انہوں نے مولانا ہی کے تعلقات کی بنا پر اپنا انگریزی کتب خانہ ندوہ کو عنایت فرمایا تھا، جلسہ دہلی میں انگریزی میں ترجمۂ قرآن کی تجویز منظور ہوئی تو مولانا نے ان ہی کو ترجمہ کے لیے انتخاب فرمایا تھا، دارالمصنّفین پر ان کی جو نگاہِ لطف و کرم تھی وہ درحقیقت مولانا ہی کے تعلقات کا نتیجہ تھی۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے جس طرح تعلقات قائم ہوئے اور جس طرح انہوں نے وسعت حاصل کی، اس کی تاریخ خود مولانا شروانی نے لکھی ہے "علامہ مرحوم سے میری سب سے اول ملاقات اندازاً ۱۸۸۷ء میں ہوئی، آغازِ تعارف اختلاف سے ہوا، کتاب المامون جب شائع ہوئی تو میں نے ایک ریویو لکھا، بعض اہم مسائل پر اعتراض کیا، غالباً صرف یہی ایک ریویو تھا جس کا علامہ شبلی نے جواب لکھا، یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں مذکور تھا:

رسی آنکہ بدردِ ما کہ چوما　　　خامہ گیری و حرف بنگاری

یہی اختلاف باعث ملاقات ہوا، ملاقات بڑھ کر سرحد نیازمندی تک پہنچی، نیاز مخلصانہ محبت سے مبدل ہوا اور الحمدللہ کہ وہ اخلاص علامہ ممدوح کی رحلت تک قائم رہا اور یقین ہے کہ میری حیات تک دل سے محو نہ ہوگا، موت نے اخلاص میں کمی نہیں کی، بلکہ حسرت کا اضافہ کر دیا، قریباً ۳۰ سالہ مودت کے دوران میں صدہا ملاقاتیں ہوئیں، بارہا پاس رہنے کا اتفاق ہوا، حبیب گنج بھی چند مرتبہ قدوم سے مشرف ہوا، ہر قسم کے مسائل پر بحث و مباحثے رہے، اس تمام تجربے کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ مرحوم سچے اور با اخلاص[1] دوست تھے۔"

---

[1] اس مسودہ کو دیکھتے وقت مولانا شروانی نے اس پر ایک حاشیہ لکھا ہے جو حسب ذیل ہے:

"الحمدللہ تعلق اخلاص آج بھی اس درجہ پر ہے جو زمانہ حیات علامہ میں تھا، حالاں کہ نصف صدی سے زیادہ عمر تعلق محبت کی ہے۔"

تعلقات کی شگفتگی کا اندازہ ان مراسلتوں سے نہایت تفصیل کے ساتھ ہو سکتا ہے، جو دونوں دوستوں میں باہم ہوئی ہیں، مولانا حبیب الرحمٰن خاں فارسی میں غزلیں کہتے ہیں اور مولانا کی خدمت میں بھیجتے ہیں، وہ ان کے ٹوکنے پر تغیر و تبدل کرتے ہیں، مولانا کی تصنیفات پر ریویو لکھتے ہیں اور مولانا داد دیتے ہیں، ان کے زورِ تحریر کو دیکھ کر مولانا کو مضمون نگاری کا میدان تنگ نظر آتا ہے اور ایک مستقل تصنیف کا مشورہ دیتے ہیں، ایک مشترک کتاب کی تصنیف کی تجویز ہوتی ہے، جس کا نام "حبیب شبلی" تجویز کیا جاتا ہے، تصنیفی مشورے ہوتے ہیں اور مولانا اس کا خاکہ پیش کرتے ہیں، مولانا علیل ہوتے ہیں تو ان سے حکیم عبدالمجید خاں کے نام خط لکھواتے ہیں، غسل صحت کے بعد ایک جلسہ دعوت ترتیب دیتے ہیں تو ان کو خصوصیت کے ساتھ مدعو فرماتے ہیں ندوہ میں جو اہم معاملات پیش آتے ہیں ان میں ان کی اعانت کے محتاج ہوتے ہیں، نادر اور بیش قیمت کتابیں نظر سے گزرتی ہیں تو ان کو خریدنے کا مشورہ دیتے ہیں، تصنیف و تالیف کے لیے کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے تو بلا تکلف ان کے کتب خانے سے منگواتے ہیں، اپنا کتب خانہ فروخت کرنا چاہتے ہیں تو اس راز کی صرف انہی کو خبر دینا چاہتے ہیں، غرض ان گوناگوں تعلقات کی بنا پر وہ مولانا کے دوست بھی تھے ممنونِ مشورہ بھی تھے، محسن بھی تھے اور ایک عزیز بھائی بھی تھے۔

حاذق الملک حکیم اجمل خاں کے تعلقات کی ابتدا معلوم نہیں، غالباً حکیم صاحب کے قیام رام پور کے زمانہ سے ہوئے، جب رام پور کا کتب خانہ حکیم صاحب کے زیر انتظام تھا، آخر زمانہ میں جب حکیم صاحب رام پور سے چلے آئے تھے اور قومی کاموں میں دلچسپی لینے لگے تھے تو ان تعلقات میں مزید وسعت ہوئی، اصلاح ندوہ کے سلسلہ میں اور بھی تعلقات بڑھ گئے تھے اور حکیم صاحب ہی کے مکان پر قیام فرماتے تھے، دہلی میں ندوۃ العلما کا سالانہ جلسہ حکیم ہی صاحب کی کوششوں سے ہوا اور مولانا کے مخالفین کی قوت کو ان ہی کے اثر نے نمایاں نہیں ہونے دیا، اصلاح ندوہ کے لیے دلی میں جو جلسہ ہوا اس میں اگر حکیم صاحب کا ہاتھ کام نہ کرتا تو اس کا انعقاد ناممکن ہو جاتا۔

نواب سید علی حسن خاں صاحب مولانا کے بیحد معتقد و معترف تھے، تعلقات کی ابتدا گزشتہ تعلیم اور المامون سے ہوئی، ۱۸۹۱ء میں جب حیدر آباد کا سفر کیا تو نواب صاحب نے راستہ میں مولانا کو اپنے ہاں بھوپال میں روک لیا، یہ پہلی ملاقات تھی، نواب صاحب کو نواب شاہ جہاں بیگم نے جب اپنی ریاست کا ڈائرکٹر تعلیم مقرر کیا تو نواب صاحب نے مولانا سے مشورے طلب کیے اور اس سلسلہ

میں وہ کئی دفعہ بھوپال جا کر ان کے ہاں ٹھہرے۔

نواب صاحب نے متعدد بار مولانا کو مالی نذرانے بھی پیش کرنا چاہے لیکن مولانا کی خود داری اور بے نیازی نے ان کو قبول نہیں کیا، اتفاق سے ۱۹۰۳ء میں نواب صاحب بھوپال چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے اور مولانا بھی معتمد دارالعلوم کی حیثیت سے ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ رہنے لگے، تو تعلقات میں اور زیادہ استواری پیدا ہوگئی، اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں، نواب صاحب مولانا کو گاڑی بھیج کر بلواتے تھے اور اپنی کوٹھی کے قیام پر اصرار کرتے تھے، کبھی کبھی مولانا وہاں چند روز کے لیے قیام بھی کرتے تھے۔

ندوہ پر انہوں نے اپنا قیمتی کتب خانہ مولانا ہی کے اثر سے وقف کیا، ندوہ کی رکنیت اور دلچسپی بھی مولانا ہی کے تعلقات کا نتیجہ تھی، یہی وجہ ہے کہ جب مولانا نے استعفا دیا تو وہ بھی مستعفی ہو کر اصلاح ندوہ کی کوششوں میں مصروف ہوگئے اور آخر میں ندوہ کی نظامت کا کام انہوں نے اسی دوستی و محبت کی یادگار میں قبول کیا، جس کو وہ سالہا سال انجام دیتے رہے۔

ایم مہدی حسن سے لطف ادب اور حسن معاشرت کے تعلقات تھے، ان میں اور مولانا میں نہایت پر لطف اور بے تکلفانہ خط و کتابت ہوتی تھی، وہ نہایت عمدہ قسم کے لفافے اور خط کے کاغذ بھیج دیتے تھے کہ ان کے نام جو خطوط بھیجے جائیں، ان کے لیے یہ کاغذ مخصوص کر لیے جائیں، مولانا کی ذات سے ان کے مرنے کے بعد بھی اپنی دلچسپی قائم رکھی اور ''شبلی سوسائٹی'' اور ''معاصرانہ چشمک'' کے عنوان سے معارف میں جو مضامین لکھے وہ اسی دل چسپی کا نتیجہ تھے۔

ان کے علاوہ مختلف شہروں مثلاً بمبئی، علی گڑھ، پٹنہ، کلکتہ اور الہ آباد میں مولانا کے بہت سے احباب تھے اور جب مولانا ان شہروں میں جاتے تھے تو ان سے صحبتیں رہتی تھیں۔

احباب علما مولانا کے احباب کی اس فہرست پر نظر ڈالنے سے مولانا کے مذاق طبیعت کا اندازہ نہایت آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے، مولانا کے ان تمام احباب کی حیثیتیں اگرچہ مختلف ہیں، تاہم ذوقِ علم ایک ایسی چیز ہے جو سب میں مشترک ہے، علما میں سے ان کے تعلقات ندوہ کے سبب سے سب سے قائم تھے، ان میں قابل ذکر اشخاص یہ بزرگ وار ہیں، مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری، مولانا سید محمد علی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلما، مولانا شیر علی صاحب حیدر آباد، مولانا فضل حق صاحب رام پور، مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتح پور، مولانا ابراہیم صاحب آروی، مولانا ثناء اللہ

صاحب امرتسری، مگر چوں کہ وہ قدیم وجدید کے درمیان واسطہ تھے، اس لیے کبھی کبھی قدیم کی خاطر جدید اصحاب سے اور کبھی جدید کے سبب سے قدیم علما سے ان کا تصادم ہوتا رہتا تھا اور یہی سبب ہے کہ بے غرض اصحاب علم کے سوان سے سب ہی سے ان بن ہوتی ہی رہتی تھی، چنانچہ مولانا شروانی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں ''علامہ شبلی چوں کہ سالہا سال تک کالج میں رہے تھے، ایک حد تک ان کے خیالات آزاد تھے، علما کے موجودہ رسمی طریقوں کو وہ لوازم دین نہیں خیال کرتے تھے، اعتراض کرنے میں بے باک تھے، ان کی وسیع نظر کے سامنے متقدمین کا دور اور اس کے آثار تھے، لہٰذا متاخرین کے انداز کے زخم خوردہ نہ تھے، یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے قدیم علما کو ان کی جانب سے شبہات تھے، بعض کا عرصہ تک یہ خیال رہا کہ وہ کالج کے سفیر بن کر ندوہ میں آئے تھے، تاکہ یہاں بھی الحاد کا رنگ جمائیں، خلاصہ یہ کہ اخیر وقت تک علامہ شبلی قدیم طبقہ کے علما میں شیر وشکر نہ ہوسکے، تاہم اس قدر کہنا بیجا نہ ہوگا کہ علامہ شبلی کی ذات واسطہ تھی قدیم وجدید سوسائٹی کی صلح وآشتی کا، لیکن افسوس کہ مذکورہ بالا اختلافات نے ان کوششوں کو بارآور نہ ہونے دیا۔''

باہم معاصرین کے اعترافات مولانا نے اپنے معاصرین کے ساتھ اور ان کے معاصرین نے ان کے ساتھ ہمیشہ خوش گوار تعلقات قائم رکھے، دونوں نے ایک دوسرے کے فضل وکمال کا اعتراف کیا اور علانیہ ایک نے دوسرے کی مدح وستایش کی۔

مولانا کو نواب محسن الملک، مولانا حالی، مولانا نذیر احمد، مولانا آزاد، اور خواجہ عزیز الدین کے ساتھ شرف معاصرت حاصل تھا اور ان میں ہر ایک دوسرے کے فضل وکمال کا معترف تھا، نواب محسن الملک کو مولانا کے ساتھ جو حسن ظن تھا، اس کا اعتراف انہوں نے ایک تقریر میں نہایت واضح الفاظ میں کیا ہے، چنانچہ شمس العلما کے خطاب پر مولانا کو مبارک باد دینے کے لیے علی گڑھ کالج میں جو جلسہ ہوا، اس میں بحیثیت پریسیڈنٹ کے انہوں نے یہ الفاظ فرمائے ''وہ ہمارے زمانہ کے پہلے مصنف ہیں، جنہوں نے اپنی تالیفات میں فصاحت بیان اور سلاست عبارت اور لٹریچر کی تمام خوبیوں کے ساتھ اعتدال اور بے تعصبی اور انصاف کا لحاظ رکھا اور شاعرانہ خیالات اور ایشیائی مذاق کے موافق مبالغہ اور استعارہ، عبارت آرائی اور تصنع سے پاک اور بلاغت سے فلسفیانہ طرز پر سوانح عمری اور لائف کے لکھنے کا طریقہ جاری کیا۔''

نواب محسن الملک اور مولانا کے اخلاق وفطرت میں بہت بعد تھا، اس بنا پر گو متعدد بار اختلاف کے اسباب بھی پیدا ہوگئے اور علی گڑھ پارٹی کے بہت سے لوگوں نے ان کی مخالفت بھی کی،

لیکن بایں ہمہ مولانا اور نواب صاحب کے تعلقات میں اخیر دم تک عملاً فرق نہیں آیا۔

مولانا کو اپنے معاصرین میں مولانا حالی کے ساتھ سب سے زیادہ عقیدت، محبت اور الفت تھی اور ان کی دقت نظر اور ان کی سخن فہمی کے ہمیشہ مداح رہے، فرماتے تھے کہ وہ جوہر کو خوب سمجھتے تھے اور بڑی نازک تنقید کرتے تھے، فرماتے تھے کہ جاحظ کی کتاب البیان والتبیین جب نئی نئی چھپ کر آئی تو مجھے وہ بے ترتیب اور پراگندہ معلوم ہوئی، رات کو مولانا حالی آئے اور وہ کتاب مانگ کر لے گئے، صبح کو واپس کی تو فرمایا کہ ''یہ نثر کا حماسہ ہے'' مولانا کہتے تھے کہ ان کے اس فقرہ نے کتاب کے موضوع کو میرے سامنے آئینہ کر دیا اور اس کی ترتیب کا وہ پہلو میرے سامنے آ گیا، جو پہلے سامنے نہ تھا۔

فرماتے تھے ''میں دریا ہوں اور حالی کنواں ہیں'' میرا علم دریا کی طرح وسیع ہے اور حالی کے پاس معلومات اگرچہ کم ہیں لیکن وہ گہرے ہیں، جب تک کافی مواد تحریر موجود نہ ہو، میں ایک قدم بھی چل نہیں سکتا، مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں، ان کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور یہ کمالِ اجتہاد کی دلیل ہے، مولانا حالی کی تصنیفات میں حیات سعدی کو نہایت پسند فرماتے تھے، شعر العجم حصہ دوم میں سعدی کے حالات لکھنے میں اس لیے پس و پیش کرتے تھے کہ حالی کے بعد اس میں کیا اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن مجبوراً سعدی کے حالات لکھے تو اس کے ساتھ یہ حاشیہ لکھا'' مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیاتِ سعدی میں، سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا ہے، اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا۔''

حیات سعدی شایع ہوئی تو اس پر ریویو لکھا، مولانا کا عام قاعدہ تھا کہ جس چیز کو خود پسند کرتے تھے، اپنے اعزہ، تلامذہ اور احباب کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے، حیات سعدی بھی اسی قسم کی پسندیدہ چیزوں میں تھی، چنانچہ ایک عزیز کو لکھتے ہیں، ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفۃً بھیجی ہے، یہ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ اور محققانہ سوانح عمری ہے، میں نے بے اختیار اس کو تمہارے لیے پسند کیا اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیج دیں، دیکھو کہیں واپس نہ جائے، قیمت ایک روپیہ چار آنہ ہے، واقعی بے مثل ہے اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے، اس کتاب کے اور خریدار پیدا کرنے چاہئیں۔

پاؤں کے حادثہ کے بعد مولانا حالی نے ایک رباعی لکھ کر الندوہ میں چھپنے کے لیے بھیجی تو اس کے شکریہ میں مولانا نے شذرات میں مولانا حالی کی ذرہ نوازی کے عنوان سے یہ نوٹ لکھا ''مولانا کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا محض ان کی ذرہ نوازی ہے، وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا ننگ گوارا کرتے ہیں لیکن میری عزت یہ ہے کہ مجھ کو اپنے نیازمندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیں، اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئی ہیں جن کو دیکھ کر قدما کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، خدا ان بزرگوں کا سایہ قائم رکھے۔''

مولانا حالی کو بھی مولانا سے نہایت عقیدت اور محبت تھی، سیرۃ النعمان شایع ہوئی تو مولانا حالی نے اس پر ریویو لکھا جس میں فرماتے ہیں ''انہوں نے (شبلی نے) اپنی ہر ایک پہلی تصنیف میں جس بلندی پر آپ کو دکھایا ہے، اس کے بعد کی تصنیف میں ان کی لیاقت اور روشن دماغی، اس سے بلندتر منظر پر جلوہ گر ہوتی ہے اور جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے، سیرۃ النعمان کو ان سب سے اعلا منظر پر پاتا ہوں جس طرح حسن تناسب اعضاء کا نام ہے، سیرۃ النعمان میں روایت ودرایت کی تطبیق اور جس موزوں طریقہ پر رائے وقیاس سے کام لیا گیا ہے، اسی طریقۂ استدلال سے فلسفہ ومذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور مصنف (یعنی شبلی) نے اپنی فضیلت اور لیاقت پر سے پردے اٹھا دیے ہیں۔''

مولانا حالی مولانا کی تصنیفات کو شوقیہ منگاتے تھے اور لائبریری میں رکھتے تھے، ایک بار مولانا کی چند کتابیں لائبریری کے لیے منگائیں اور لکھا کہ خود تو آنکھوں سے معذور ہوں لیکن یہ کتابیں دوسروں کے لیے منگوائی ہیں کہ

قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلّالی

بعض اوقات مولانا خود اپنی تصنیفات ان کی خدمت میں ہدیۃً بھیجتے تھے اور وہ اس کی نہایت قدر کرتے تھے، دستۂ گل شایع ہوا اور اس کو مولانا نے ان کی خدمت میں ہدیۃً بھیجا تو مولانا حالی نے اس کے جواب میں لکھا کہ ''کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے، جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں، غزلیں کاہے کو ہیں، شراب دوآتشہ ہے، جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے، غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دل ربائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ

سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔"

دودل بودن دریں رہ سخت ترغیب است سالک را   خجل ہستم زکفرِ خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

شاید لوگ تعجب کریں کہ اس شعر میں وجد کرنے کی کون سی بات ہے، مگر اس شعر سے ہر شخص لطف نہیں اٹھا سکتا، الاالذی ابتلی بمثل ما ابتلی به القائل،

میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نظم ونثر جو کچھ ہے، اس کو بھی چھپوا کر شایع کر دوں، مگر دستۂ گل دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں، ولیس فی ذالك شائبة التصنع۔

مولانا نے سوانح مولانا روم ہدیۃً بھیجی تو مولانا حالی نے رسید میں لکھا "سوانح کو میں اب تک ایک سرسری نظر سے دیکھ سکا ہوں، اول مولوی وحیدالدین دیکھنے کو لے گئے، اس کے بعد غلام حسنین نے مانگ لی، آپ کی تصنیفات کی نسبت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ من عرف منزلتکم فی التصنیف کل لسانه آپ کا وجود قوم کے لیے باعث فخر ہے، خدائے تعالیٰ آپ کو بہت مدت تک زندہ وسلامت رکھے۔"

باہم اخلاقی تعلقات بھی نہایت شگفتگی کے ساتھ قائم تھے، سفر کشمیر کے بعد مولانا کو ایک طویل علالت سے صحت یاب ہونے کی توقع ہوئی اور اس مسرت میں ایک جلسۂ دعوت کرنا اور اس جلسہ میں جن احباب کو مدعو کرنا چاہا، ان میں ایک مولانا حالی بھی تھے، چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں" آپ اس بات کے لیے تیار رہیں کہ اگر خدا نے صحت کامل دی تو میں اپنے تمام خالص دوستوں کو مدعو کروں گا، جن میں مولانا حالی، خواجہ عزیز الدین، میر ولایت حسین وغیرہ ہوں گے، آپ کو بھی تکلیف کرنی پڑے گی۔" (شروانی-۹)

صحت یاب ہونے کے بعد مولانا نے قصیدۂ کشمیریہ لکھا اور مولانا حالی کی خدمت میں بھیجا تو مولانا حالی نے ایک طویل خط لکھا، جس کی ابتدا اس قطعہ[1] سے کی جس کا پہلا شعر یہ ہے:

للہ الحمد پس از نا خوشی و رنج دراز   شبلی ما بمراد از سرِ بالیں برخاست

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں "مولانا! قصیدۂ کشمیریہ کی متعدد کاپیاں وصول ہوئیں، پہلے اس سے کہ آپ کے عطیہ کا شکریہ ادا کروں مجھ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے، جس نے مدت دراز کے بعد آپ کی صحت کا مژدہ آپ ہی کی زبان سے سنوایا، فی الواقع آپ کی حالت نازک ہوگئی تھی اور مرض کو حد

---

[1] یہ اشعار پہلے گزر چکے ہیں، دیکھیے صفحہ ۳۴۶۔

سے زیادہ امتداد ہو گیا تھا، باوجودیکہ تبدیل آب و ہوا کی بہت ضرورت تھی، مگر آپ کو اس کا موقع نہیں ملا، اب درحقیقت صرف خدا کے فضل پر اور بحسب ظاہر شفیق و ہمدرد معالج پر صحت کا انحصار تھا، اذا اراد الله شيئاً هيأ اسبابه، ایسی حالت میں ڈاکٹر مصطفےٰ خاں صاحب کا آنا صاف دلالت کرتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کو ابھی آپ کی قومی خدمات کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رکھنا منظور تھا، فالحمد لله ثم الحمد لله علىٰ ما انعم علينا ببقائكم فينا وبنعمة وجودكم لدينا''

مولانا کے پاؤں میں گولی لگی تو مولانا حالی کو اس سے سخت تشویش لاحق ہوئی، اخبارات میں جو حالات شایع ہوئے، اس کے سننے سے تسکین نہیں ہوئی، تو مولانا کے فرزند محمد حامد نعمانی کو بغرض استفسار حال ایک خط لکھا اور باوجود اس ضعف کے مولانا کی عیادت کے لیے اعظم گڑھ آنے کا ارادہ کیا، چنانچہ اس خط میں تحریر فرماتے ہیں ''آج تک جو کچھ اخبارات کے حوالہ سے جناب مولانا کے حالات سنے گئے ہیں ان سے کچھ تشفی نہیں ہوئی، اس لیے ناچار آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ میرا یہ خط مولانا کو دکھا کر اور جو کچھ وہ اپنا حال لکھوائیں اس کو قلمبند کر کے از رہِ لطف میرے پاس بھیج دیں، نیز یہ بھی لکھیں کہ بمبئی کے ڈاکٹر رجب علی جو مولانا کو وہاں بلاتے ہیں، وہاں جانے کا ارادہ ہے یا نہیں۔

بہت دن سے ارادہ کر رہا ہوں کہ میری پوتی یعنی غلام الثقلین کی اہلیہ جو لکھنؤ میں ہے، اس سے ملنے کے لیے لکھنؤ آؤں اور وہاں سے مولانا کو دیکھنے اعظم گڑھ آنے کا بھی قصد ہے، مگر اب تک ایسے موانع پیش آتے رہے کہ یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا، اگر لکھنؤ آنا ہوا تو اعظم گڑھ آنے سے پہلے آپ کو وہاں سے اطلاع دوں گا، مولانا کی خدمت میں بصد حسرت دیدار و اشتیاق زیارت سلام و نیاز کہہ دیجئے گا''۔

لیکن باوجود ان مخلصانہ تعلقات کے مولانا کی بعض عبارتوں اور بعض خطوط سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ دونوں معاصرین میں باہم چشمک بھی تھی، مثلاً ایک موقع پر سوانح مولانا روم میں لکھتے ہیں ''تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا، وہ سعدی، عراقی اور مولانا روم ہیں، اس لحاظ سے مولانا کے دیوان پر ریویو کرتے ہوئے ہمارا فرض تھا کہ سعدی اور عراقی سے ان کا موازنہ کیا جاتا، تینوں بزرگوں کے نمونے دکھائے جاتے اور ہر ایک کی خصوصیات بیان کی جاتیں اور چوں کہ مولانا ہمارے ہیرو ہیں، اس لیے مذاق حال کے موافق خواہ مخواہ بھی ان کو ترجیح دی جاتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا واقعہ نگاری کے فرض کے بالکل خلاف ہے[1]''

---

[1] سوانح مولانا روم، ذکر ''دیوان'' ص ۵۰، طبع اول۔

موازنۂ انیس و دبیر میں ایک موقع پر لکھتے ہیں "ہمارے زمانہ میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں، ان میں باوجود دعوائے آزادی کے تنقید اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا اور اس کا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رخ اس کو دکھائے جائیں[1]۔"

موجودہ سوانح نگاری کے متعلق اسی قسم کی تنقید مولانا نے اپنے بعض مضامین میں بھی کی ہے اور لکھا ہے کہ "یہ طریقہ ہماری زبان کے سوانح نگاروں نے یورپ سے سیکھا ہے، اردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں کا یہی انداز ہے۔"

ان عبارتوں سے یہ ظاہر ہے یہ چوٹ مولانا حالی پر ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں سے "حیات جاوید" مراد ہے کہ کنایہ سے گزر کر مولانا نے خطوط میں حیاتِ جاوید کے متعلق تصریحاً بھی یہ الفاظ لکھے ہیں کہ "حیاتِ جاوید کو میں لائف نہیں بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل، خیر وللناس فی ما یعشقون مذاهب"۔ (شیروانی-۲۵)

لیکن یہ مولانا حالی کی ذات پر نہیں جن کی وہ بیحد قدر کرتے تھے، بلکہ سرسید کے ناتمام بائیگرفی (سوانح عمری) پر اظہار خیال ہے، اگر حیاتِ جاوید کا مصنف مولانا کا کوئی عزیز بھی ہوتا تب بھی وہ اس تصنیف کے متعلق اسی قسم کی رائے قائم کرتے۔

مولوی نذیر احمد اور مولانا میں اگرچہ وہ ربط واخلاص نہ تھا جو مولانا کو مولانا حالی کے ساتھ اور مولانا حالی کو مولانا کے ساتھ تھا، تاہم بالکل بے تعلقی بھی نہ تھی، کانفرنسوں کے اجلاس میں اکثر دونوں بزرگ ایک ساتھ پبلک اسٹیج پر نظر آتے تھے اور ایک دوسرے کے متعلق جو کچھ کہتا تھا، اس سے بے تکلفانہ تعلقات کی جھلک نمودار ہوتی تھی، ایک بار اسٹریچی ہال میں کانفرنس کا اجلاس ہوا، تو مولوی نذیر احمد نے اپنی تقریر میں ظریفانہ لہجہ میں کہا "میں نے کسی زمانہ میں عربی اچھی پڑھی تھی، اب تو ایسا ذہول ہوگیا کہ مولوی شبلی ایک صیغہ پر پوچھ بیٹھیں تو بغلیں جھانکنی پڑیں۔"

دہلی میں ندوہ کا اجلاس ہوا تو مولانا مولوی نذیر احمد سے ملے اور چوں کہ چند لڑکوں کو عربی میں تقریر کرنے کے لیے ساتھ لے گئے تھے، اس لیے مولانا نے خصوصیت کے ساتھ ان کو جلسہ میں شریک ہونے کے لیے دعوت دی اور الندوہ جاری ہوا تو مولوی نذیر احمد صاحب نے اس کی تعریف میں ایک

---

[1] موازنہ زیر عنوان "اعتراضات" ص ۲۳۵ طبع اول۔

خط لکھا اور چند عربی شعر لکھ کر بھیجے جن کو مولانا نے الندوہ کے شذرات میں شایع کیا، شعر یہ تھے:

یقولون ان العلم والفضل والنهی حبیس علی المتقدم المتبصر

فلما تصفحنا صحائف ندوة وجدنا بان الفضل للمتاخر

ترجمہ: لوگ کہتے ہیں کہ فضل وکمال اگلوں کا حصہ تھا، مگر جب میں نے الندوہ کے صفحے دیکھے تو پایا کہ فضل وکمال تو پچھلوں ہی کا حصہ ہے۔

مولانا نے ۱۸۹۰ء کی کانفرنس میں جو قصیدہ پڑھا تھا، اس میں ان دونوں بزرگوں کے نام بڑی عزت سے لیے ہیں:

نکہ از مہر سوئے حالی آزادہ فگن وآں نذیر احمد طوطیِ شکر خا بنگر

مولانا محمد حسین آزاد سے تعلقات نہ تھے، ان سے صرف ایک بار لاہور میں ملاقات ہوئی تھی، جب کہ ان کا دماغ خراب ہو چکا تھا، بایں ہمہ مولانا ان کو اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز مانتے تھے اور فرماتے تھے کہ آزاد اردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے، اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں، وہ اصلی معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے۔"

الندوہ میں جہاں گیر پر جو مضمون لکھا ہے، اس کی تمہید میں نیرنگ خیال کی عبارت کا اقتباس اس الفاظ میں کیا ہے "ہندوستان کے سب سے بڑے انشا پرداز نے نیرنگِ خیال میں جہاں گیر کی یہ تصویر کھینچی ہے۔"

جس زمانہ میں شعرالعجم لکھ رہے تھے، آزاد کی کتاب "سخندانِ پارس" نکلی، اس کی نسبت ایک دوست کو تحریر فرماتے ہیں" آزاد کی کتاب آج ویلو آئی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں، تاہم وہ ادھر ادھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو وحی معلوم ہوتا لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیارہ لکچر تک اس نے میری سرحد میں قدم بھی نہیں رکھا، بارہویں میں یہ میدان میں اترا ہے لیکن زور پہلے صرف ہو چکا تھا، اس لیے یونہی سرسری چکر لگا کر نکل گیا۔" (مہدی-۳۶)

مولانا محمد حسین آزاد کی وفات کی خبر جب مولانا کو پہنچی تو ان پر بے حد اثر ہوا، اسی وقت مدرسہ بند کرادیا اور تعزیت کا ایک جلسہ کرایا، جس کے پہلے مقرر وہ خود تھے، اس تقریر کے وقت نہ صرف ان کے چہرہ سے بلکہ ایک ایک لفظ سے شدت غم کا اثر محسوس ہوتا تھا، تقریر میں سب سے پہلا فقرہ جوان

کے منہ سے نکلا وہ یہ تھا:

''آج خدائے سخن مر گیا''

خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی سے نہایت وسیع تعلقات تھے، قیصر نامہ ان کی مشہور فارسی مثنوی ہے، مولانا ان کی فارسی دانی اور قادر الکلام کے قائل تھے، تعلقات کا آغاز غالباً اس وقت سے ہوا، جب علی گڑھ جا کر مولانا نے اپنی اور حزین کی فارسی غزلیں خواجہ صاحب کے پاس اظہار رائے کے لیے بھیجی تھیں، اس کے بعد سے تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے، ندوہ کے قیام سے پہلے مولانا جب لکھنؤ جاتے تھے، تو اکثر انہی کے یہاں قیام فرماتے تھے، قیام لکھنؤ کے زمانہ میں بھی بعض اوقات ان کے یہاں جا کر دن دن بھر رہتے تھے، مولانا خواجہ صاحب کی بلند ہمتی اور خودداری کے دل سے معترف تھے، البتہ شاعری میں ان کے مراعاتِ لفظی کو پسند نہیں فرماتے تھے، مولانا کے پاؤں میں گولی لگی تو خواجہ صاحب نے ایک رُباعی لکھی، مولانا بعض فارسی تحریروں کے متعلق خواجہ صاحب سے مشورہ بھی لیتے تھے، ایک بار ''الناظر'' نے مولانا کو خواجہ صاحب کا شاگرد لکھ دیا تھا، اس کی تردید میں مولانا نے لکھا کہ: ''خواجہ صاحب میرے مخدوم ہیں لیکن میں ان کا شاگرد نہیں''۔ (مکاتیب-۱)

خواجہ صاحب کو الناظر کے اس بیان کا حال معلوم ہوا تو سخت افسوس کا اظہار کیا۔

۱۹۰۸ء تھا کہ مولانا نے حضور نظام سابق میر محبوب علی خان بہادر کی خدمت میں ندوہ کی طرف سے ایک خریطہ پیش کرنے کے لیے یہ شعر کہا تھا:

تاجہاں باشد و ایں گنبد گرداں باشد　　　دہر فرمان بر محبوب علی خاں باشد

پھر یہ شعر بغرض مشورہ خواجہ صاحب کے پاس بھیجا جو صاحب گئے تھے، انہوں نے آ کر کہا کہ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ گنبد گرداں کی ترکیب اچھی نہیں معلوم ہوتی، مولانا نے یہ سن کر فرمایا کہ اب ہمارے خواجہ صاحب سٹھیا گئے۔

آخر میں مولانا کے معاصر دوستوں میں سے ایک بزرگ کا نام لینا چاہتے ہیں، جو بفضلہٖ تعالیٰ اس وقت تک ہم میں ہیں اور کہنہ سالی کے باوجود قلم و کاغذ کی تفریحات اور علمی مشاغل میں مصروف ہیں، میری مراد مولوی عبدالرزاق صاحب کان پوری سے ہے، جو مصنف البرامکہ کی حیثیت سے مشہور ہیں اور اس وقت جب کہ ان کی عمر اسی کے قریب ہوگی، بھوپال کے محکمۂ تاریخ کے مہتمم ہیں اور ابھی اپنی کتاب البرامکہ کا دوسرا ایڈیشن جو پہلے سے دونا ہے مرتب کر کے چھپوایا ہے، مولوی صاحب ممدوح کو مولانا سے ان

کے علی گڑھ کے زمانۂ قیام سے بے تکلفانہ دوستی، آمد و رفت اور مشاغل علمی میں استشارہ کا تعلق تھا، وہ گویا علمی میدان میں مولانا مرحوم کے ہم رکاب تھے، مولانا نے جو سلسلہ فرماں روایانِ اسلام کا شروع کیا تھا، اس کی مناسبت سے انہوں نے سلسلہ وزرائے اسلام شروع کیا تھا اور اس سلسلہ میں البرامکہ اور نظام الملک طوسی دو کتابیں لکھیں اور دونوں کے مسودے چھپنے سے پہلے مولانا کی نظر سے گزر چکے تھے، مولوی صاحب نے آج کل اپنی زندگی کے دلچسپ مشاہدات یادِ ایام کے نام سے لکھے ہیں، اس میں مولانا کے اور اپنے بے تکلفی کے واقعات اور آمد و رفت کے حالات بھی درج کیے ہیں، مگر:

عہد پیری شباب کی باتیں   ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

امرا اور والیانِ ملک سے تعلقات مولانا کے علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں بڑے بڑے امرا اور والیانِ ملک کالج کو دیکھنے آتے تھے، اور وہاں ان کے خیر مقدم کے جلسے ہوتے تھے، ان جلسوں کے پروگرام کا ضروری جز مولانا کی نظم ہوتی تھی، اس تعلق سے تمام معزز مہمانوں سے وہ نہ صرف روشناس ہو جاتے تھے، بلکہ ان کے فضل و کمال کا سکہ ان مہمانوں کے دلوں پر ثبت ہو جاتا تھا، خلیفہ محمد حسین وزیر پٹیالہ، سر آسمان جاہ صدر اعظم حیدر آباد، جنرل عظیم الدین خاں مدار المہام رام پور وغیرہ سے وہ اسی طور سے روشناس ہوئے تھے اور سب نے ان کی قابلیت کا اعتراف کیا۔

پہلے پہل جب سرسید کے ساتھ ۱۸۹۱ء میں حیدر آباد گئے تو اکثر امرائے کبار نے ان کی قدر و منزلت کی اور خود اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں تک ان کی شہرت پہنچی، دوبارہ ۱۸۹۶ء میں جب وہ حیدر آباد گئے تو امرا اور اکابر دکن کی قدردانی اس حد تک پہنچی کہ انہوں نے جلسہ کر کے ان کو ایڈریس پیش کیا اور اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں نے از راہ قدردانی سو روپیہ ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کیا اور ۱۹۰۱ء میں ان کو اپنے ایک عہدۂ جلیلہ پر فائز فرمایا، جس سے ۱۹۰۵ء میں وہ مستعفی ہوئے تو پھر بدستور پہلا وظیفہ جاری فرما دیا، ۱۹۱۶ء میں جب اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں تک دار المصنفین کی امداد کے تعلق سے مولانا کا اسم گرامی پہنچا تو تعریف فرمائی اور ان سے ملاقات نہ ہونے پر افسوس ظاہر فرمایا، منصب داران و امرائے دکن میں سے مولانا کے تعلقات زیادہ تر نواب فخر الملک بہادر وزیر تعلیم، نواب سر افسر الملک بہادر سپہ سالار آصفیہ اور نواب عماد الملک بہادر معتمد تعلیمات سے تھے۔

دوسرے والیانِ ریاست میں سے بیگم صاحبہ مرحومۂ بھوپال سے متعدد بار ان کو ملاقاتیں

ہوئیں، ایک دفعہ ۱۹۰۶ء میں ندوۃ العلما کی امداد کے تعلق سے اور دوسری دفعہ ۱۹۱۲ء میں سیرۃ نبوی کے لیے ان ملاقاتوں میں ان سے مولانا بہت متاثر ہوئے، پہلی ملاقات کے تاثرات اسی زمانہ میں الندوہ میں لکھے ہیں، دوسری دفعہ کی ملاقات کا ذکر مکاتیب میں ہے (شروانی۔۱۰۱) اس سفر میں ہز ہائینس مرحومہ نے مولانا سے دریافت فرمایا تھا، آپ کی صحت کی یہ حالت ہے، آپ اپنا جانشین تو تیار کرلیں، مولانا نے سیرت کے متعلق دو شعر کہے تھے، جن میں ایک یہ ہے:

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل کہ جن میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

سلطان کا اشارہ سلطان جہاں بیگم کی طرف تھا۔

جب مولانا کا انتقال ہوا تو بیگم صاحبہ نے بہ حسرت فرمایا کہ ''فقیر بے نوا تو چل بسا، سلطان باقی ہے، بیگم صاحبہ نے اپنی بعض تصانیف میں بھی مولانا سے مشورہ لیا ہے۔

نواب حامد علی خاں بہادر والیِ رام پور سے ان کے تعلقات ان کی ولی عہدی کے زمانہ سے تھے، جب زمامِ انتظام جنرل عظیم الدین خاں کے ہاتھ میں تھی اور مولانا مدرسۂ عالیہ اور کتب خانہ کے تعلق سے رام پور آیا جایا کرتے تھے، مولانا جب سفر ترکی سے واپس آئے تو ریاست رام پور نے ان کے اس سفر کے مصارف ادا کر کے ان کی اس علمی زحمت فرمائی کا شکریہ ادا کرنا چاہا، مگر مولانا نے قبول نہیں کیا، سرسید کی وفات کے بعد رام پور میں جب ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اس میں پھر ملاقات ہوئی، ۱۹۱۰ء میں ندوہ کے تعلق سے پھر جا کر ملے اور نواب صاحب نے پانچ سو روپے سالانہ ندوہ کے لیے مقرر فرمائے جو چند سال جاری رہے۔

نواب صاحب جزیرہ (جنجیرا) اور ان کا پورا خاندان مولانا کا شیدائی تھا، چنانچہ جب بمبئی جاتے تھے تو اکثر ان لوگوں سے ملاقاتیں اور صحبتیں رہتی تھیں، ایک بار اکتوبر ۱۹۱۲ء میں خود جزیرہ (جنجیرہ) تشریف لے گئے تھے۔

مولانا کو صرف ہندوستان ہی میں یہ عزت حاصل نہ تھی، بلکہ ان کی شہرت کا غلغلہ بیرونی ممالک میں بھی پہنچ گیا تھا اور وہاں سے عملاً اس کا اعتراف ہوتا تھا، چنانچہ ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ گئے تو وہاں کے تمام اکابر سے ملاقاتیں رہیں اور گورنمنٹ ترکی کی طرف سے تمغۂ مجیدی عطا ہوا، امیر عبدالرحمٰن خاں والیِ کابل نے ترجمہ کا محکمہ قائم کیا تو اس کی سکریٹری شپ کے لیے مولانا کا انتخاب کیا

لیکن مولانا نے اس عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔

انگریزی گورنمنٹ نے شمس العلما کا خطاب دیا اور اپنی مختلف علمی و تعلیمی کمیٹیوں میں ان کو ممبر بنایا، دربار میں بھی بحیثیت شمس العلما ان کی کرسی تھی، دربار تاجپوشی کے موقع پر بھی وہ شریک دربار ہوئے تھے اور شاہ ایڈورڈ نے ان کو ہار بخشا تھا۔

مذہب مولانا کی مذہبی زندگی میں مختلف تغیرات پیدا ہوتے رہے، ابتدا میں وہ ایک متعصب حنفی اور متشدد مولوی تھے، غیر مقلدوں سے مناظرے کرتے تھے، ان کی تردید میں رسالے لکھتے تھے، خود فرائض و سنن کے سخت پابند تھے اور دوسروں سے نہایت سختی کے ساتھ ان کی پابندی کراتے تھے، فریضۂ حج سے تو زمانہ طالب علمی ہی میں مشرف ہو چکے تھے اور دوسرے فرائض کا بھی نہایت شدت سے اہتمام کرتے تھے۔

ان کے خالو نے اعظم گڑھ میں ایک برف خانہ بنوایا تھا، فرماتے تھے کہ ''جب ہم لوگ گرمی کے زمانہ میں افطار کے وقت برف پیتے تھے، تو اپنے خالو کے حق میں دعائیں کرتے تھے، امانت کا کام کرتے تھے تو اسی گرمی کے زمانہ میں متصل کئی کئی کوسوں کا دورہ کرنا پڑتا تھا لیکن بایں ہمہ وہ روزہ قضا نہیں کرتے تھے، علی گڑھ کے زمانہ قیام میں سخت گرمیوں میں سرسید کے ساتھ نینی تال گئے تھے، اس سفر میں بھی روزہ کا اہتمام تھا، اثنائے قیام ندوہ میں ۱۳۲۹ھ کے رمضان میں جو اگست ۱۹۱۱ء میں پڑا تھا، دن میں کثرت مطالعہ کے سبب سے ایک آنکھ میں پانی آنے لگا اور اس کی بینائی جاتی رہی، تاہم روزے رکھے۔

ندوہ میں آنے کے بعد بعض اوقات جماعت میں شریک ہوتے تھے، البتہ پاؤں کے حادثہ کے بعد معذوری ہوگئی تھی، پھر بھی ایک دفعہ یہ اہتمام کیا کہ کہار مقرر کیے اور ڈولی پر بیٹھ کر مسجد جانے لگے، مگر چوں کہ مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم جو امامت فرماتے تھے، نمازوں میں لمبی لمبی سورتیں پڑھتے تھے اور رکوع وسجود میں دیر تک رہتے تھے اور مولانا اپنے پاؤں کی معذوری کے سبب سے اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لیے چند روز کے بعد جماعت کی شرکت چھوڑ دی۔

اسی طرح اخیر زمانۂ قیام اعظم گڑھ میں ایک دفعہ ایک حافظ صاحب نے جو بہت کھینچ کھینچ کر قرأت کرتے تھے، مغرب کی نماز میں امامت کی، مولانا مقتدی تھے، نصف ساق تک ایک پاؤں نہ ہونے کی وجہ سے دیر تک ایک پہلو پر بیٹھنے میں ان کو تکلیف ہوتی تھی، اس لیے نماز کے بعد بہت جھلائے اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ والی حدیث کا حوالہ دے کر فرمایا'' کہ آپ لوگوں کو معذروں کا ذرا خیال

نہیں ہوتا' وہ صبح کو بہت سویرے اٹھتے تھے اور سویرے ہی وضو کر کے نماز پڑھتے تھے۔

صبح کو کبھی زبانی اور کبھی قرآن پاک دیکھ کر تلاوت کا معمول تھا اور اس میں بھی ان کے مزاج میں یہ نفاست پسندی تھی کہ وہ تلاوت کے لیے مطبوعہ قرآن کے نسخوں کو بہت کم پسند کرتے تھے، وہ ہمیشہ اس کے لیے قرآن پاک کا کوئی نہ کوئی قلمی نسخہ رکھتے تھے اور اخیر عمر میں بھی بمبئی میں اس کے لیے جو نسخہ خریدا تھا وہ بڑا قیمتی تھا۔

علی گڑھ جا کر ان کی مذہبی زندگی میں جو انقلاب پیدا ہوا اس کے متعلق لوگوں کے دلوں میں عجیب عجیب بدگمانیاں ہیں اور عوام بلکہ علما تک کا خیال ہے کہ وہ علی گڑھ میں جا کر وضع قطع، عقائد و اعمال کے لحاظ سے معاذ اللہ بالکل آزاد خیال نیچری ہو گئے تھے لیکن یہ تمام سر خلاف واقعہ ہے، یہ بالکل سچ ہے کہ علی گڑھ جا کر ان کے مذہبی خیالات میں بہت کچھ وسعت اور آزادی پیدا ہو گئی تھی، یہ بھی سچ ہے کہ جس شدت کے ساتھ وہ پہلے پابند تھے علی گڑھ میں وہ اہتمام وتشدد باقی نہیں رہا، بلکہ حیدر آباد تک یہی حال رہا اور یہ متکلمین کی ہر قسم کی کتابوں کے مطالعہ کا نتیجہ تھا اور کچھ ماحول کا اثر بھی لیکن اس پر بھی ان کی حنفیت کا غلو اپنی جگہ پر قائم رہا۔

لطیفہ: دار العلوم کی پرانی عمارت کے صحن میں ایک مسقّف حوض تھا، خاکسار نے ایک دفعہ حوض کے پائپ سے وضو کیا اور اس کی چھت پر نماز پڑھنے لگا، ساتھ ہی میلانِ خاطر کی بنا پر اتفاقاً اس وقت رفع یدین بھی کیا، میں نے مولانا کو نہیں دیکھا وہ مولانا حفیظ اللہ صاحب کے چھپر کے نیچے بیٹھے ہوئے مجھے دیکھ رہے تھے، نماز پڑھ چکا تو پاس بلایا، پھر فرمایا، میری عجیب قسمت ہے میں تو پکا حنفی ہوں اور جو مجھ سے پڑھتا ہے وہ اہل حدیث ہو جاتا ہے، حمید الدین[1] کا یہی حال ہوا اور تمہارا ابھی یہی حال ہے۔

جب وہ کالج میں گئے ہیں تو طلبہ کی مذہبی زندگی ان کو پسند نہ آئی، گو یہ ان کے فرائض منصبی میں نہ تھا، تاہم انہوں نے طلبہ میں نماز کی پابندی کا شوق پیدا کر دیا، لجنۃ الصلوٰۃ کے نام سے طلبہ کی ایک انجمن قائم ہوئی جس میں وہ شریک تھے، کالج کے طلبہ میں مذہبی معلومات پیدا کرنے کی خاطر وہ سال میں ایک دفعہ مجلس میلاد کیا کرتے تھے اور خود اس میں بیان فرمایا کرتے تھے اور دینیات کے درس میں

[1] مولانا حمید الدین صاحب مرحوم اپنے چچا مولوی سلیم صاحب کے اثر سے جو عامل بالحدیث تھے، ایک زمانہ میں اہل حدیث ہو گئے تھے، پھر رجوع کر لیا۔

وہ دل چسپی پیدا کر دی تھی کہ طلبہ ان کے کلاس میں شوق سے شریک ہونے لگے، خود سرسید کی اس شکایت پر کہ طلبہ نماز میں کیوں شریک نہیں ہوتے، یہ صاف کہہ دیا کہ ''چوں کہ آپ شریک نہیں ہوتے'' (سرسید سلسل البول کی شکایت کے سبب سے گھر جا کر نماز پڑھتے تھے اور جمع بین الصلوٰتین بھی کرتے تھے)

وضع و قطع کے لحاظ سے مولانا اگرچہ کوئی متقشف مولوی نہیں معلوم ہوتے تھے، تاہم انگریزی لباس انہوں نے کبھی استعمال نہیں کیا، لطیفہ: سیرۃ النعمان کے جواب میں مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی نے ''حسن البیان'' نام کتاب لکھی تھی، اس میں غلط فہمی کی بنا پر مولانا پر انگریزی لباس پہننے کا الزام لگایا تھا، مولانا فرماتے تھے کہ ''اتفاق سے ایک جگہ میری ان کی ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ میں انگریزی لباس تو کبھی نہیں پہنتا، مولانا رحیم آبادی نے پشیمانی ظاہر کی اور فرمایا کہ میں نے یوں ہی سنا تھا۔''

ڈاڑھی کی غیر شرعی ہیئت سے بھی ان کو سخت بیزاری تھی۔

ایک عزیز کی شادی کی تقریب میں لوگوں نے رقص و سرور کا سامان کیا، ان کو معلوم ہوا تو سخت خفگی ظاہر فرمائی اور شرکت سے انکار کر دیا، آخر وہ حرکت ملتوی کی گئی، تب انہوں نے شرکت کی۔

اپنے صاحب زادہ کی پہلی شادی میں ہر قسم کے رسوم و بدعات سے احتراز کیا اور اس موقع پر ایک موثر تقریر کی جس میں ان تمام رسوم کی جڑ کاٹ دی اور اہل برادری کے لیے شادیوں میں جہیز وغیرہ کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا، جس کی تعمیل بہت دنوں تک ہوتی رہی اور اب بھی کسی قدر ہے۔

قسطنطنیہ کے سفر میں جہاز پر پرندوں کے گوشت کھانے سے کئی روز تک اس بنا پر اجتناب کیا کہ ان کو پہلے سے یہ معلوم تھا کہ جہاز پر پرند ذبح نہیں کیے جاتے، مگر انہوں نے خود جا کر دیکھا کہ اس جہاز پر پرند ذبح کیے جاتے ہیں، گردن مروڑ کر مارے نہیں جاتے، تب گوشت کھانا شروع کیا۔

عقائد وخیالات تاہم عقائد وخیالات کے لحاظ سے وہ عقلیت پسند تھے لیکن ان کی عقلیت پسندی کے معنی یہ ہیں کہ وہ احکامِ مذہبی کو مصالح و حکم پر مبنی سمجھتے تھے، اسی لیے وہ احکام الٰہی کی مصلحتوں اور حکمتوں کی تلاش میں رہتے تھے اور اشاعرہ کے اس خیال کے کہ احکام الٰہی کا منشا محض مشیت الٰہی ہے[1] اور وہ کسی

---

[1] حالاں کہ ان دونوں باتوں میں جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ نے ثابت کیا ہے اور ماتریدیہ کا مسلک بھی یہی ہے، کوئی تضاد نہیں، بے شبہ یہ احکام مصالح و حکم پر مبنی ہیں لیکن یہ بھی مشیت الٰہی کا کرشمہ ہے، خاک سار کا ایک شعر ہے:

تیری قدرت وہ کر سکتی ہے جو تیری مشیت ہے　　　مگر تیری مشیت آپ ہی پابند حکمت ہے

لیکن یہ ضرور نہیں کہ یہ مصالح اور حکم پوری طرح بندوں کی سمجھ میں بھی آ جائیں اور جو بندے سمجھیں وہ تمام تر صحیح بھی ہو۔

مصلحت و حکمت پر مبنی نہیں، سخت مخالف تھے، اسی بنا پر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ معجزات کے بھی قائل نہ ہوں گے، کیوں کہ وہ خرقِ عادت پر مبنی اور خلاف عقل ہوتے ہیں لیکن یہ سوءِ ظن قطعاً غلط ہے، وہ معجزات کے قائل تھے اور سرسید وغیرہ کی تاویلات کو دور از کار اور ملمع سمجھتے تھے، چنانچہ الکلام میں لکھتے ہیں لیکن خرق عادت تمام مذاہب کا ایک ضروری عنصر ہے اور اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اسلام میں بھی کچھ نہ کچھ اس کی جھلک موجود ہے، اس لیے اس عقدہ کا حل کرنا ضرور ہے، قرآن مجید میں اس قسم کے جو واقعات منقول ہیں، فرقۂ جدیدہ ان کی عموماً تاویل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی مذکور نہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ قرآن مجید بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس قسم کے واقعات کے مذکور ہونے سے انکار نہیں ہوسکتا، بے شبہ اشاعرہ کی افراط بچوں کی وہم پرستی کے درجہ تک پہنچ گئی لیکن انکار محض کرنا بھی کچھ کم ہٹ دھرمی نہیں ہے، ہمارے زمانہ کے لوگوں نے جو تاویلیں کی ہیں، ہم اس سے بخوبی واقف ہیں، بے شبہ یہ تاویلیں نئے تعلیم یافتہ لوگوں لوگوں کے لیے کافی ہیں، جو بیچارے عربی زبان اور اس کے طرز و اسلوب سے نا آشنا ہیں، مگر ماہر عربیت کے سامنے یہ تلمیع کیا کام دے سکتی ہے۔'' (ص ۸۵، ۸۶)

لیکن بایں ہمہ وہ بات بات کو معجزہ نہیں مانتے تھے، ان کے نزدیک معجزات کے ثبوت کے لیے قطعی شہادت کی ضرورت تھی اور قرآن مجید چوں کہ قطعی الثبوت ہے، اس لیے اس میں جہاں خرقِ عادت کا ذکر ہوگا، واجب التسلیم ہوگا۔

لیکن مولانا کے نزدیک یہ امر نہایت غور اور دقت نظر سے طے کرنا پڑے گا کہ فی الواقع قرآن مجید کے الفاظ اس کے ثبوت میں قطعی الدلالۃ ہیں یا نہیں، مفسرین میں بہ قول مولانا جو محقق گزرے ہیں، مثلاً قفال، ابو مسلم اصفہانی، ابوبکر اصم وغیرہ ان کی تحقیقات کے مطابق قرآن مجید میں بہت کم خرق عادت مذکور ہیں اور جو واقعی مذکور ہیں، ان کی صحت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے[1]۔

ان کا یہ خیال الکلام کے لکھتے وقت یعنی ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۴ء تک تھا لیکن سیرت کی تصنیف کے وقت وہ اپنے پچھلے خیال سے پھر چکے تھے، چنانچہ احادیث صحیحہ میں رسول اللہ ﷺ کے جو معجزات مذکور ہیں، ان کا ذکر خود سیرۃ النبی ﷺ کی دو جلدوں میں کیا ہے اور مقدمہ میں لکھ بھی دیا ہے، البتہ جن

---

[1] الکلام بحث معجزات۔

معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہے، مثلاً معراج اور تکثیر طعام وغیرہ ان کو اس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے۔'' (خاتمہ دیباچہ سیرت جلد اول)

وہ جن اور شیطان کے وجود کو بھی تسلیم کرتے تھے لیکن ان کے متعلق عوام جو واقعات بیان کرتے ہیں ان کو وہم پرستی سمجھتے تھے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ کے حال میں ان کا جو مضمون ہے، اس میں لکھتے ہیں'' جن کے وجود سے انکار نہیں لیکن جن یوں صورت بدل کر لوگوں کے پاس آیا جایا نہیں کرتے۔'' (مقالات شبلی ج ۵ ص ۷۳)

اس سے شاید مولانا کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ دوسروں کی صورت بن کر نمایاں نہیں ہوا کرتے، ورنہ شخصیتوں سے امان اٹھ جائے، ہاں احادیث میں شیاطین کا یہ تبدیل صورت نظر آنا صاف وصریح مذکور ہے۔

وہ گو فرشتوں کے وجود کے پہلے بھی قائل تھے لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ملائکہ کا اطلاق حسب تصریح مولانا روم و مولانا بحر العلوم شارح مثنوی بعض ملکات نبوی اور ملکات بشری پر بھی ہوا ہے، جیسا کہ سوانح مولانا روم میں انہوں نے لکھا ہے لیکن سیرت کی تالیف کے زمانہ میں اس حقیقت کے چہرہ سے بھی پردہ اٹھ چکا تھا اور جبریل امین اور دوسرے فرشتوں کے مستقل شخصی وجود کے نام ان کی اس کتاب میں اسی طرح آئے ہیں، جس طرح عام مسلمان مانتے ہیں۔''

حشر ونشر، جنت و دوزخ اور واقعات مابعد الموت کے متعلق جہاں تک ان کی قدیم کلامی تصنیفات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے، وہ اپنی کلامی مشغولیتوں کے زمانہ میں ان چیزوں کو فقط روحانی سمجھتے تھے، مگر جب سے انہوں نے ادھر چند اخیر برسوں میں سیرۃ النبی ﷺ کے تعلق سے احادیث کا مطالعہ شروع کیا تھا، ان کے خیالات میں بڑا انقلاب پیدا ہو گیا تھا، ان کے ذہن وعقل کی دنیا ہی بدل گئی تھی، ان کے اس انقلاب میں علامہ ابن تیمیہ کی تصنیفات کو بھی بڑا دخل تھا۔

بدعات سے ان کو ہمیشہ سے سخت نفرت تھی، بدعات شعبان ومحرم کا ان کے ہاں پتہ بھی نہ تھا، اسی طرح بزرگوں کے مزارات پر جا کر عوام جن بدعات کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ ان کو شرک سمجھتے تھے، بلکہ بعض دفعہ وہ غصہ میں احتیاط سے آگے بڑھ جاتے تھے، ایک بار ایک صوفی ان سے ملنے آئے، سلسلۂ کلام میں مولانا نے فرمایا کہ اجمیر وغیرہ کے بتکدوں کو جلا دینا چاہیے، اس وقت تو وہ صاحب

خاموش رہے لیکن وہاں سے اٹھ کر آئے تو مولوی عبدالسلام ندوی صاحب سے کہا کہ ان حضرت کو مراق تو نہیں ہو گیا ہے، اگر ان کا یہ خیال تھا تو کم از کم میرے سامنے اس طرح ظاہر نہیں کرنا چاہیے تھا۔

لطیفہ: ایک دفعہ مولانا بمبئی سے اجمیر کے راستہ سے لوٹے، اجمیر کے اسٹیشن پر پہنچے تو مجاور جو اسٹیشن پر زائروں کے لینے کے لیے آتے ہیں، مولانا کی طرف بڑھے، مولانا نے ان سے بے رُخی برتی تو انہوں نے کہا کہ "یہ حضرت فرعون بے سامان معلوم ہوتے ہیں" مولانا نے فرمایا "ہاں میں تو فرعون بے سامان ہوں، مگر آپ فرعون باسامان ہیں۔"

الفاروق میں ایک ضمنی موقع پر لکھتے ہیں "اسلام نے شرک کو کس زور شور سے مٹایا لیکن غور سے دیکھو تو قبروں اور مزاروں کے ساتھ عوام ایک طرف، خواص کا جو طرزِ عمل ہے، اس میں اب بھی کس قدر شرک کا مخفی اثر موجود ہے، گو استفادہ عن القبور اور حصول برکت کے خوش نما الفاظ نے ان پر پردہ ڈال رکھا ہے۔"

الکلام میں مولانا نے ملحدین کے بہت سے اعتراضات نقل کر کے ان کے جوابات دیے ہیں، بعض لوگوں نے دیدہ و دانستہ یا نادانستہ ان اعتراضات کو مولانا کے عقائد میں داخل کر دیا، ۱۹۱۴ء میں معاملات ندوہ کی تحقیقات کے لیے دلی میں جو جلسہ ہوا، اس میں بعض مخالف علما نے ان ہی عقائد کی بنا پر ان پر کفر کا فتویٰ لگایا اور ظاہر کیا کہ وہ مادہ کو قدیم اور غیر مخلوق اور نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں، اس پر سید عبدالسلام صاحب مرحوم مالک مطبع فاروقی دہلی نے مولانا سے اس کے متعلق سوال کیا، مولانا نے اس کا جواب یہ لکھا "جس کا یہ عقیدہ ہو کہ وہ قدیم ہے اور خدا کا مخلوق نہیں ہے، وہ ملحد اور زندیق ہے، میں مادہ کو نہ قدیم بالذات تسلیم کرتا ہوں، نہ قدیم بالزمان، البتہ میں یہ مانتا ہوں کہ خدا کے تمام اوصاف قدیم ہیں۔

الکلام میں اگر اس قسم کے اقوال مذکور ہیں تو وہ غیر مذہب والوں کے عقائد ہیں اور اس غرض سے نقل کیے ہیں کہ ان کا رد کیا جائے۔

نبوت کے متعلق میرا ہرگز یہ اعتقاد نہیں ہے کہ وہ اکتسابی ہے اور ہر شخص نبی ہو سکتا ہے، میں نبوت کو عطیہ الٰہی سمجھتا ہوں اور آنحضرت ﷺ کو خاتم الانبیا یقین کرتا ہوں اور جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ آنحضرت ﷺ کے بعد بھی کوئی نبی ہو سکتا ہے، اس کو مسلمان نہیں جانتا، باقی میرے عقائد وہی ہیں جو قرآن شریف اور احادیث سے ثابت ہیں، میں عقیدۃً اور فقہاً دونوں لحاظ سے اہل سنت و جماعت سے ہوں۔"

اس اعلان میں آخری سطریں یونہی چھپی ہوئی ہیں، مگر چوں کہ میں اس واقعہ کے وقت حاضر تھا، جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے، اس لیے مجھے علم ہے کہ اصل میں پہلے جو کچھ مولانا نے لکھا تھا، اس کی اخیر سطریں انہوں نے یہ لکھی تھیں، جو ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اب تک میرے پاس ہیں ''باقی میرے عقائد وہی ہیں جو حضراتِ حنفیہ کے عقائد ہیں، میں عقائد اسلام اور مسائل فقہیہ دونوں میں حنفی ہوں۔'' (شبلی ۹رمئی ۱۹۱۴ء)

فوٹو

مگر چوں کہ سید عبدالسلام صاحب اہل حدیث تھے، اس لیے ان کی درخواست پر مولانا نے وہ الفاظ رکھے جو اعلان میں ہیں، یہ ان کی وفات سے صرف چھ مہینے پہلے کی تحریر ہے۔

جن صاحبوں نے عقلیت پسندی کی بنا پر ان کو معتزلی سمجھا یا سمجھانا چاہا ہے[۱]، وہ غلطی پر ہیں، چنانچہ مولانا نے اس اعلان میں تمام صفات الٰہی کے قدیم ہونے کا جو عقیدہ ظاہر کیا ہے وہ معتزلہ کا نہیں کہ وہ سرے سے صفات کو نہیں مانتے اور نہ ذاتِ الٰہی کے سوا کسی چیز کو وہ قدیم مانتے ہیں[۲]، نہ اشاعرہ کا ہے کہ وہ صفات فعلی کو حادث کہتے ہیں، بلکہ یہ خالص ماتریدیہ کا عقیدہ ہے، جیسا کہ کتب ماتریدیہ میں مذکور ہے۔

''وہ عقیدۃً بھی حنفی تھے'' یہ فقرہ ذرا تشریح طلب ہے، آج عام طور سے حنفی اور غیر حنفی مسلمان سب گویا اشعری ہیں، یا اشعری سمجھے جاتے ہیں، مگر شروع میں یہ کیفیت نہیں تھی، حنبلی جس طرح عقائد میں امام احمد بن حنبل کے اور مالکی امام مالک کے پیرو تھے، اسی طرح شافعی عموماً امام شافعی کے بعد پیدا ہونے والے ایک شافعی المذہب امام ابوالحسن اشعری المتوفی (۳۲۴ھ) کے پیرو بنے اور حنفی امام اعظم کے ایک شاگرد در شاگرد امام ابومنصور ماتریدی حنفی (المتوفی ۳۳۳ھ کے مقلد ہوئے)۔

۱؎ جیسا کہ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے اپنے اس مضمون میں جو مولانا کی وفات پر لکھا ہے، بتایا ہے، مولانا شرر اپنے نظری مسلک کے لحاظ سے فقہاً اہل حدیث اور عقیدۃً اشعری تھے، مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کے شاگرد تھے، مولانا اور وہ جب یک جا ہوتے تو میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ دونوں میں اشعریت پر تیز و تند گفتگو ہوتی، اس ضد میں مولانا شرر کا اخیر میں خیال تھا کہ وہ امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری لکھیں، مولانا نے اس کے مآخذ بھی ان کو بتائے تھے۔ ۲؎ مولانا نے الکلام میں ایک جگہ لکھ دیا ہے کہ اسلام کا ایک بڑا فرقہ معتزلہ مادہ کو قدیم مانتا ہے، (ص ۵۴) یہ مولانا کا سہو قلم ہے، معتزلہ مادہ کو قدیم نہیں حادث مانتے ہیں۔ (مقالات الاسلامیین امام ابوالحسن اشعریؒ مقالہ معتزلہ)۔

بہت سے اصولی مسئلوں میں اشعریوں اور ماتریدیوں کا اتفاق ہے لیکن پندرہ بیس مسئلوں میں اختلاف بھی ہے، بعضوں نے کوشش کی ہے کہ اختلافات کو اختلافات لفظی بتا کر دونوں کو متفق بتائیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کے بعض اہم مسائل میں جو شدید اختلاف ہے، وہ کسی لفظی تاویل سے مٹ نہیں سکتا۔

مولانا کو ان بعض اختلافی مسائل میں اشاعرہ سے بحدِ غلو اختلاف تھا، چنانچہ انہوں نے اپنی ہر کلامی تصنیف میں ان کی مخالفت کی اور بے حد مخالفت کی اور ان کو اس بات سے بے حد رنج تھا کہ حنفی کیوں اشعری بن گئے ہیں، اسی لیے انہوں نے ایک دفعہ اپنے زیرِ ہدایت میرے قلم سے ایک مضمون لکھوایا تھا، جس کا عنوان یہ ہے۔

"فرقۂ حنفیہ عقائد میں کس کا مقلد ہے؟"

یہ مضمون الندوہ مارچ ۱۹۱۲ء (ربیع الاول ۱۳۳۰ھ) میں چھپا ہے اور خود انہوں نے بھی علم الکلام میں اس کے متعلق حسب ذیل فقرے لکھے ہیں "یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ فرقۂ حنفیہ جو تمام فرقہ ہائے اسلامیہ سے تعداد میں زائد ہے، اعتقادات کے لحاظ سے ماتریدیہ ہے، تاہم علم کلام میں اشعریہ کے مقابلہ میں ماتریدیہ کی شہرت بہت کم ہے، اس عدم شہرت کا یہاں تک اثر ہوا کہ آج اکثر علمائے حنفیہ اشاعرہ ہی کے ہم عقیدہ ہیں، حالاں کہ قدیم زمانہ میں کسی حنفی کا اشعری ہونا نہایت تعجب کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، علامہ ابن الاثیر تاریخ کامل واقعات ۴۶۶ھ میں لکھتے ہیں " وھذا مما یستظرف ان یکون حنفی اشعریا" یعنی یہ نہایت عجیب بات ہے کہ کوئی شخص حنفی ہو کر اشعری ہو۔" (علم الکلام ص ۹۰)

اس کے بعد مصنف نے ماتریدیہ کے ان عقائد کی فہرست دی ہے جن میں وہ اشاعرہ سے الگ ہیں۔

مولانا مرحوم اپنی کتابوں میں سے علم الکلام کو بہت ناقص سمجھتے تھے، فرماتے تھے کہ "مجھے افسوس رہ گیا کہ جس تفصیل سے اشاعرہ کے علم الکلام کا ذکر میں نے کیا، ماتریدیہ کا کیوں نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ انہوں نے اس کتاب کو علالت کے زمانہ میں لکھا، جس کے سبب سے پوری تفصیل نہ کی جا سکی اور شاید یہ بھی وجہ ہو کہ علمائے احناف نے علم کلام پر بہت کم کتابیں تصنیف کیں، چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں "ماتریدیہ کی گمنامی کی وجہ یہ ہوئی کہ علمائے حنفیہ نے علم کلام میں بہت کم تصنیفات

گیں، اس فن میں جس قدر مشہور اور معرکۃ الآرا کتابیں ہیں وہ شافعیہ کی تصنیفات ہیں، جو عموماً اشعریہ تھے۔ (علم الکلام ص ۹۰)

فروری ۱۹۰۹ء میں شیخ عبدالقادر صاحب (پونہ) مولانا سے ایک کلامی مسئلہ کی تشریح چاہتے ہیں، وہ اس کے جواب میں لکھتے ہیں'' جملہ مستفسرہ اشاعرہ کا عقیدہ ہے، اشاعرہ سنی فرقہ کی ایک شاخ ہے لیکن اب تو تمام سنی اسی حماقت میں گرفتار ہیں، خیر اس فقرہ کو رہنے دیجئے، گو میرے ذاتی عقیدہ کے خلاف ہے۔''(۸)

اس خط پر میرا حاشیہ ہے جو ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا ہے۔

''عقائد میں (مولانا) ماتریدیت کو ترجیح دیتے تھے۔''

بہر حال اہل سنت کے یہ دو مقابل کے فرقے تھے، علامہ سبکی جو مشہور اشعری ہیں، شرح عقیدۂ ابن حاجب میں لکھتے ہیں:

وبالجملة فهم (اى اهل السنة) بالاستقراء ثلاث طوائف ، الاول اهل الحديث ومعتمد مباديهم الادلة السمعية والثانى اهل النظر العقلى والصناعة الفكرية وهم الاشعرية والحنفية وشيخ الاشعرية ابوالحسن الاشعرى وشيخ الحنفية ابو منصور الماتريدى (اتحاف السادہ جلد ا ص ٦)

''حاصل یہ کہ اہل سنت کے تین گروہ ہیں، پہلا گروہ اہل حدیث ہے اور ان کے اصول کی بنیاد نقلی دلیلوں پر ہے اور دوسرا گروہ عقلی اور فکری علم و استدلال والے اور وہ اشعریہ اور حنفیہ ہیں، اشعریہ کے امام ابوالحسن اشعری اور حنفیہ کے امام ابومنصور ماتریدی ہیں۔''

یہ اشاعرہ اور ماتریدیہ اسی طرح باہم مختلف اور دست و گریباں ہیں، جس طرح اسلام کے اور دوسرے فرقے، گو ان میں صلح پسندوں کے بیچ بچاؤ سے کبھی کبھی روک تھام بھی ہوتی رہی، ان اختلافات کی شدت کی صحیح حیثیت اگر کسی کو دیکھنی ہو تو امام ماتریدی کی شرح فقہ اکبر (منسوب الیہ) امام فخر الاسلام بزدوی کی کتاب العقیدہ، ابوشکور سالمی کی کتاب التمہید ابن ہمام کی مسایرہ اور متاخرین میں ملا علی قاری کی شرح فقہ اکبر دیکھئے۔

جن مسائل میں حنفیہ اور اشعریہ کا اختلاف ہے، ان میں چند مسائل حسب ذیل ہیں:

۱- اللہ تعالیٰ کے صفات فعلیہ جیسے خلق ورزق ورحمت وغیرہ اشعریہ کے نزدیک حادث ہیں، اور ماتریدیہ کے نزدیک تمام صفات الٰہی قدیم ہیں۔

۲- اشیا میں حسن وقبح اشعریہ کے نزدیک فقط شرعی ہے، اور ماتریدیہ کے نزدیک شرعی کے ساتھ عقلی بھی ہے۔

۳- اشعریہ کے نزدیک بندوں میں اپنے افعال پر جو قدرت ہے وہ وہمی ہے، اس کو افعال کے صدور میں کوئی دخل وتاثیر نہیں، ماتریدیہ کے نزدیک بندوں کی قدرت کو ان افعال کے صدور میں دخل وتاثیر ہے اور اسی لیے ان سے مواخذہ ہے۔

۴- ماتریدیہ کے نزدیک خدا جس طرح جور وظلم سے اور جو صفات اس کے شایان شان نہیں، ان سے شرعاً پاک ہے، اسی طرح عقلاً بھی پاک ہے، اشاعرہ کے نزدیک شرعاً پاک ہے عقلاً نہیں۔

۵- ماتریدیہ کے نزدیک خدا نے اپنے احکام اپنے بندوں پر اپنی رحمت سے مصالح اور حکمت پر مبنی کیے ہیں، اشعریہ کے نزدیک مصالح وحکمت پر مبنی نہیں۔

۶- ماتریدیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے اشیا میں خواص اور تاثیرات ودیعت کی ہیں، اشاعرہ کے نزدیک اشیا میں کوئی خاصہ اور تاثیر نہیں، اللہ تعالیٰ ضرورت کے وقت ان میں تاثیر پیدا کرتا ہے۔

۷- ماتریدیہ کہتے ہیں کہ خدا کسی کو تکلیف مالا یطاق نہیں دیتا، اشعریہ کے نزدیک نہ صرف یہ کہ وہ دے سکتا ہے، بلکہ اس نے دی ہے۔

۸- ماتریدیہ کے نزدیک ایمان کم اور زیادہ نہیں ہوتا، اشاعرہ کے نزدیک ہوتا ہے۔

مولانا شبلی نے علم الکلام اور الکلام دونوں کتابوں میں طرح طرح سے اشاعرہ پر حملے کیے ہیں اور بڑے زور شور سے ان کے دلائل کا رد کیا ہے، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اشاعرہ کا رد انہوں نے معتزلہ کی محبت میں کیا ہے، حالاں کہ یہ معتزلہ کی محبت میں نہیں، بلکہ ماتریدیہ کی محبت میں ہے، البتہ ان کا قصور یہ ہے کہ وہ اس مخالفت پر بھی اپنی کلامی تصنیفات میں اشاعرہ کے چکر سے نہیں نکل سکے اور امام غزالی اور امام رازی کی گرفت میں جو راس الاشاعرہ ہیں، عرصہ تک رہے۔

امام غزالی اور امام رازی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے عام رسائل میں اشعریت کا حد درجہ التزام کرتے ہیں، حتیٰ کہ امام رازی تفسیر میں کسب کیا جبر تک کے ثابت کرنے کے لیے قدم قدم پر رکتے ہیں مگر

وہ مطالب عالیہ وغیرہ مخصوص کتابوں میں بلکہ تفسیر میں بھی بعض حقائق کی حکیمانہ تشریح میں اشعریت کی کوئی پروانہیں کرتے، امام غزالی کبھی معتزلہ کے ہم زبان ہوتے ہیں، کبھی صوفیہ کے، کبھی حکما کے، یہی سبب ہے کہ قاضی ابن رشد نے اپنی کتاب کشف الادلہ میں امام غزالی کی نسبت جل کر یہ لکھ دیا کہ ''ابوحامد غزالی کا کیا کہنا وہ اشعریوں کے ساتھ اشعری، معتزلیوں کے ساتھ معتزلی اور صوفیوں کے ساتھ صوفی ہیں۔''

امام غزالی کی کتابوں میں سے جواہر القرآن، المنقذ من الضلال، التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ، المضنون بہ علی غیر اہلہ وغیرہ ابتدائی کلامی رسائل مولانا کے زیر نظر رہے اور ان دونوں اماموں کی ان ہی تصانیف سے مولانا نے ان کے ان خیالات کو چن لیا ہے، جو آج کل کے خیال اور مذاق کے مطابق ہو سکتے تھے اور یہی ان کا علم کلام ہے۔

غرض الکلام لکھتے وقت ان پر سب سے زیادہ غزالی کا اور پھر رازی کا اثر تھا لیکن اس کے بعد جب علامہ ابن تیمیہ کی کتابیں چھپ چھپ کر آنے لگیں تو علامہ ممدوح کا اثر ان پر غالب آنے لگا، اس اثر کا آغاز علامہ ابن تیمیہ کی کتاب ''الرد علی المنطقیین'' سے شروع ہوا اور آخر یہاں تک بڑھا کہ وہ جولائی ۱۹۱۴ء میں یعنی وفات سے چار ماہ پہلے مجھے لکھتے ہیں کہ ''تم نے شروع کر دیا تو خیر، ورنہ ابن تیمیہ کی لائف فرض اولین ہے، مجھے اس شخص کے سامنے رازی وغزالی سب ہیچ نظر آتے ہیں، ان کی تصنیفات میں ہر روز نئی باتیں ملتی ہیں۔'' (ص-۷۸)

آخر میں مجھ سے فرماتے تھے کہ ''میں اب ہر چیز میں ابن تیمیہ کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کو تیار ہوں۔''

آخر زمانہ میں ان میں روحانی جستجو کی خلش پیدا ہوگئی تھی، اسی زمانہ میں بعض صوفیوں سے بھی ملاقاتیں کیں، ایک دفعہ ایک ملاقات میں مولانا وارث حسن[1] صاحب نے جن سے مولانا کے بھائی مولانا حمید الدین صاحب الہ آباد یونیورسٹی کی عربی پروفیسری کے زمانہ میں جو شاید ۱۹۱۰ء ہو، بیعت ہو چکے تھے، مولانا کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن مولانا نے تقلیدی بیعت پسند نہیں کی، مگر ان کو مانتے تھے۔

مولانا کے اخیر زمانہ کی فارسی غزلوں میں خواجۂ شیراز کی شراب کا رنگ صاف نظر آتا ہے، اس کو دیکھ کر بعض صاحبوں کو خیال ہوا تھا کہ مولانا پر تصوف کا رنگ آرہا ہے، اور اس کی تلاش تھی کہ ان

[1] کوڑا جہاں آباد وطن تھا، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے فیض حاصل کیا تھا لکھنؤ میں شاہ پیر محمد صاحب کی مسجد میں قیام فرمالیا تھا، وہیں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں، لکھنؤ کے بہت سے تعلیم یافتہ اصحاب نے ان سے تربیت پائی اور بہت سے شہروں میں ان کے فیض روحانی نے وسعت حاصل کی، خاکسار بھی ان کی زیارت سے بار ہا سعادت مند ہوا۔

کی اس شرابِ حقیقت کا پیرِ مغاں کون ہے، مگر یہ واقعہ نہ تھا، تاہم اتنا درست ہے کہ فلسفہ وحکمت کا نشہ ان کے سر سے اتر چکا تھا اور یہ کہنے لگے تھے:

دودل بودن دریں رہ سخت ترغیب است، سالک را
خجل ہستم ز کفر خود کہ داد و بوے ایمان ہم

فلسفی سرِ حقیقت نتوانست کشود
گست راز دگر آں راز کہ افشامی کرد

لطیفہ: ۱۹۱۴ء کے شروع میں جب اصلاح ندوہ کے سلسلہ میں ان کو دہلی میں قیام کا اتفاق ہوا تو ایک دفعہ خواجہ حسن نظامی صاحب کے حلقۂ مشائخ میں انہوں نے تصوف پر تقریر فرمائی جو بڑی جامع و مانع و موثر تھی، تقریر کے بعد خواجہ صاحب نے کہا کہ اگر تصوف قالی چیز ہوتی تو میں آج آپ ہاتھ پر بیعت کر لیتا[1]۔

اسی زمانہ میں دلی میں اہل حدیث کے زیر اہتمام ایک مجلس میں توحید پر ایسا عمدہ مدلل اور موثر بیان فرمایا کہ خود اہل حدیث اس غالی حنفی کی پاکیزہ توحید سے متاثر نظر آتے تھے، اگر کچھ روز اور ان کی زندگی وفا کرتی تو عجب نہیں کہ یہ قال حال بن جاتا اور جو انقلاب روحانی گزشتہ متکلموں کے حالات و خیالات میں پیش آیا وہ چودہویں صدی کے اس متکلم میں بھی نظر آتا، جس کے آثار ان میں روز بروز نمایاں سے نمایاں تر ہوئے چلے جاتے تھے، شاید اسی عالم میں یہ فرمایا ہوا:

ساغر زندگیم حیف کہ جز درد نداشت
جز ہمیں جرعۂ آخر کہ بہ پایاں زدہ ام

مولانا حکیم عبدالشکور صاحب مرزاپوری نے مجھ سے بیان کیا:

''غالباً ۱۹۱۰ء کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کان پور تشریف لائے، میں اس زمانہ میں مدرسہ الٰہیات کے آخری سال میں پڑھتا تھا، اراکین مدرسہ کی درخواست پر مولانا معائنہ کے لیے مدرسہ تشریف لائے اور طلبہ کا امتحان لیا، چنانچہ مجھ سے دریافت فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو کیسے زندہ کیا کرتے تھے، میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ میں اس وقت موجود نہ تھا، یہ سنتے ہی مولانا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اٹھ کر مجھے سینہ سے لگا لیا اور فرمایا تمہارے جواب نے میرے ایمان کو تازہ کر دیا، ان کی اس حالت اور اس کہنے کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ آج تک ان کی وہ کیفیت اور ان کا وہ مقولہ بھولتا نہیں، جب یاد کرتا ہوں ان کی ایمانی صورت سامنے آ کر لطف دے جاتی ہے۔''

---

[1] بہ روایت مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی، اڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ، یہ مولانا کے اخیر زمانہ میں ندوہ میں زیر تعلیم تھے۔

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ناقل ہیں کہ ''جس زمانہ میں مولانا الکلام لکھ رہے تھے، متکلمین نے وجود باری پر عقلی دلیلیں قائم کی ہیں، ان میں سے ہر ایک کے ضعف وقوت پر نقد کر رہے تھے، ایک دن ایک صحبت میں انہوں نے اقبال صاحب سے فرمایا کہ تم وجودِ باری پر کوئی مضبوط عقلی دلیل دے سکتے ہو؟ انہوں نے متداول عقلی دلیلیں پیش کیں، مولانا نے ایک ایک کی کم زوری ظاہر کر دی، اسی طرح وہ دیر تک ایک کے بعد دوسری دلیل پیش کرتے رہے اور مولانا ان کو توڑتے رہے، آخر میں انہوں نے تھک کر کہا کہ ''اچھا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو دعویٰ کیا وہ معاذ اللہ غلط اور جھوٹ ہے''؟ ان الفاظ کا سننا تھا کہ مولانا پر تاثیر کا ایک عالم پیدا ہوا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور دیر تک روئے رہے اور جب ذرا سکون ہوا تو ان سے کہا ''عزیز من!

ع با خدا دیوانہ باش و با محمد ﷺ ہوشیار

اصل یہ ہے کہ مولانا وجود باری کی ان فلسفیانہ دلیلوں کو جن کو متکلمین نے پیش کیا ہے، اعتراضات اور شبہات سے بری نہیں سمجھتے تھے، وہ وجود باری کے اقرار کو فطری کہتے تھے اور اس کو دلیل منطقی کا محتاج نہیں سمجھتے تھے اور اس کے لیے قرآن پاک نے جو تنبیہی شہادتیں پیش کی ہیں ان ہی کو مفید یقین کرتے تھے، چنانچہ الکلام میں بحث کے خاتمہ پر لکھتے ہیں: ''آج جب کہ تحقیقات و تدقیقات کی انتہا ہوگئی ہے جب کہ کائنات کے سیکڑوں اسرار فاش ہو گئے ہیں، جب کہ حقائق اشیا نے اپنے چہرہ سے نقاب الٹ دیا ہے، بڑے بڑے فلاسفر اور حکما انتہائے غور و فکر کے بعد خدا کے ثبوت میں یہی استدلال پیش کر سکے، جو قرآن مجید نے تیرہ سو برس پہلے نہایت قریب الفہم اور صاف طریقہ میں ادا کیا تھا۔[1]

اور یہی صحت ایمان کا وہ اخیر نقطہ ہے جس پر امام جوینی امام غزالی اور امام رازی بلکہ قاضی ابن رشد بھی جو عمر بھر عقلی دلیلوں کی جمع و ترتیب میں سرگرداں رہے، بالآخر رُکے تھے اور اسی پر ان کا خاتمہ ہوا۔

یہ لا الہ الا اللہ ہے، محمد رسول اللہ ﷺ یہ کہ

حضرت سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ بابرکت کے ساتھ ان کو جو غیر معمولی شیفتگی ہمیشہ سے تھی، جیسا کہ سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں علانیہ فرمایا، شیفتگا نیم و پیمبر پرست، وہ سیرت نبوی ﷺ کی تالیف و تصنیف کے زمانہ میں جوں جوں آگے بڑھتے جاتے، ترقی کرتی جاتی تھی،

[1] الکلام، ص ۳۸، طبع اول۔

احادیث کے مطالعہ نے ان میں روحانیت کی ایک سرخوشی پیدا کردی تھی اور آخر میں ہمیشہ اسی پاک شراب کے نشہ میں مخمور رہتے تھے، چنانچہ اس زمانہ میں اخلاقی نظموں کا جو سلسلہ انہوں نے شروع کیا تھا، وہ اسی ذاتی اور وجدانی حالت کا نتیجہ تھا۔

یہ بھی سلسلۂ وفات میں اوپر آپ پڑھ چکے کہ مرتے وقت بھی جو چیز ان کے لب ناتواں پر بار بار آتی تھی، وہ یہی محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت تھی۔

ع تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

آخر ان کی یہ پیشین گوئی بھی جو اسی سال کی تھی پوری ہوئی:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

دو سال پہلے ۱۹۱۲ء میں ایک ادب نواز دوست کو کس حسرت سے لکھا تھا ''شعرالعجم اب کہاں، ایک آنکھ میں پانی اتر آیا، دوسری بھی ضعیف ہوگئی، سیرت پر خاتمہ ہو جائے تو یہ حسن خاتمہ ہے۔''[1]

بحمد للہ کہ یہ دعا قبول ہوئی اور محبوب ﷺ کی سیرت ہی پر خاتمہ ہوا، جو حسن خاتمہ کی نشانی ہے۔

خاتمہ

ناظرین! آپ نے نو سو صفحوں تک میری رفاقت کی، اس اثنا میں آپ کے اس شریک سفر اور رفیق نظر نے ایک مجسمہ علم وفن اور پیکر خدمت دین وملت کی زندگی کا مرقع جیسا کہ اس نے دیکھا یا دیکھنے والوں نے بتایا کھینچ کر آپ کے سامنے پیش کیا، اس مرقع میں کہیں کہیں بشری کم زوریوں کی جھائیاں بھی ہوں گی لیکن مجموعی طور سے حسن و جمال کا ایک غیر معمولی منظر بھی تصور کی آنکھوں کے سامنے ہوگا، آیئے ہم اور آپ اس کی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں اور زبان سے کہیں، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَهٗ وَارْحَمْهُ۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

۳۰؍اپریل ۱۹۴۱ء
شبلی منزل، اعظم گڑھ

---

[1] مکاتیب-۲، مہدی-۶۷۔

ضمیمہ

مراثی وقطعات

مولاناؒ کی وفات پر اخبارات ورسائل میں اس کثرت سے مرثیے اور تاریخی قطعے شایع ہوتے رہے کہ ان کو اگر جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے لیکن اس موقع پر ان چند خاص مرثیوں اور تاریخی قطعوں کا ضمیمہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جو ان کے خاص عقیدت مندوں نے لکھے ہیں اور جو ان کی زندگی کی سوانح کے بیان میں تکملہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مرثیہ فارسی

از

مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل، ایم اے، ایل ایل بی، ایڈوکیٹ اعظم گڑھ

جائے نشاط در چمنِ روزگار نیست — آہے ست سرد جنبش بادِ بہار نیست
کو لالہ کہ داغِ جگر در نہاں نہ داشت — کو نو گلے کہ چاکِ دلش آشکار نیست
خونے ست تو بتو کہ گلشن نام کردہ اند — زہریست سر برون زدہ ایں سبزہ زار نیست
سنگست دیدہ گر نمِ اشکش نمی چکد — کوراست دل گرش نگہ اعتبار نیست
زنہار چشم دل بہ فریب رخش مدوز — دنیا عجوزہ ایست عروس نگار نیست
بنیادِ کاخِ عمر بہ بادے نہادہ اند — آرے نہادِ باد تو دانی قرار نیست
در کاروان سرا نتواں خانہ ساختن — خود ایں زمانہ چیست اگر رہ گزار نیست
یارے کزیں خرابہ رود در غمش منال — کایں کاخ را اساسِ بقا استوار نیست
ابرو کشادہ دار بہ شیریں و تلخ دہر — دانی کہ نوش و نیشِ جہاں پائیدار نیست

نتواں چو جامِ عیش دریں خاکداں زدن
بر تلخی زمانہ نیز ز و فغاں زدن

لیکن کنوں کہ سیل حوادث زسرگزشت | باید زشیونِ من بیچارہ در گزشت
بگزار تا بہ نالہ دل از غم تہی کنم | کارم کنوں زسعی تواے چارہ گرگزشت
بپذیر عذرِ تلخ نوائی زمن کہ باز | زہر آبۂ غمم زگلو تا جگر گزشت
چوں کعبہ گر سیاہ بہ پوشیم می سزد | کاں نقشبندِ سیرت خیر البشر گزشت
آوارہ گشتہ گلہ و چوپاں بخواب رفت | در رہ بماند قافلۂ و راہبر گزشت
آرے اگر دلت نہ گداز و بحال قوم | بارے بہ بیں چہ برسرِ علم و ہنر گزشت
زیبد اگر فتد علم علم سرنگوں | کز کشورِ کمال شہِ داد گر گزشت
نزہت گہ ہنر کہ بداں برگ و ساز بود | بازش نگہ کنید و مپرسید سرگزشت
ناصح بہ دجلہ باری مژگانِ ما مگیر | کایں گریہ نیست بہرعزیزے کہ برگزشت

ما ایں فغان بہ بیکسی علم و فن کنیم
یا شیو نے بہ زندگی خویشتن کنیم

دانشورِ یگانہ بہ دارالقرار شد | زیبد اگر جہاں ہمہ اش سو گوار شد
بادِ سحر بہ ماتم او آہ برکشید | چشم ستارہ در غم او اشکبار شد
دانشورانِ دہر بہ ماتم نشستہ اند | کز روزگارِ نادرۂ روزگار شد
تا رُخ نہفت ساقی خمخانۂ علوم | آبِ بقا بہ کامِ خضر ناگوار شد
دردا کہ گنجدارِ معارف ز دہر رفت | وا حسرتا کہ شبلی معجز نگار شد
اے جہل شاد باش کہ گیتی بہ کام تست | وائے علم خوں بشو کہ درونت فگار شد
آوخ کہ ہچو گنج بہ خاکش نہاں کنند | کز وے ہزار گنج نہاں آشکار شد
گلزار دیں کہ از نم کلکش بہار داشت | بے برگ ماندہ است کہ آں آبیار شد
عیسٰی دمے کہ جان بہ تن مردگانِ دمید | آخر چہ شد کہ خود ز جہاں برکنار شد

خلقے ز خواب واہمہ ہشیار کرد و خفت
بخت ہنر بہ زمزمہ بیدار کرد و خفت

دردا کہ وجہ نازشِ اہل جہاں نماند
فخر زمیں ز عربدۂ آسماں نماند

اکنوں کہ چامہ گوئے نظیری نظیر مرد
در شیوۂ سخن شرفِ ہندیاں نماند

یکتا گلے کہ بادِ بہار گزشتہ داد
آں ہم کنوں ز غارت بادِ خزاں نماند

از سر بہ پاست ماتمِ رازی و ابن رُشد
کاں یادگارِ دانش پشینیاں نماند

دردا کہ باز دامن اردو زباں تہی است
کلکے کہ بود شاخچۂ گل فشاں نماند

در یوزۂ شرار غمے از کجا کنیم
کاں دل کہ بود در غم ملت تپاں نماند

آوخ کجا روند و چہ سازند چوں زیند
اکنوں کہ خضر جادۂ اسلامیاں نماند

چرخِ خمیدہ پشت چہ جوئی نظیر او
کانیک گلے چو او سرایں گلستاں نماند

سیرت نہ شد تمام و دریغا کہ کس زما
شایستۂ نگارشِ آں داستاں نماند

تخمے فشاندہ بود برش برنچید و رفت
شاخے نشاندہ بود بہارش ندید و رفت

اے شمع جمع فضل کہ از ماجد اشدی
ما را بہ غم گزاشتہ آخر کجا شدی

بیگانگان کمال تو نشناختند حیف
زین رہ مگر بہ بزم گہ آشنا شدی

شاید کہ نشر علم بہ گردوں ہم آرزوست
کایں خاکدان گذاشتہ سوے سما شدی

دادت کسے نہ داد مگر از جہانیاں
کائے دادخواہِ قوم بہ پیشِ خدا شدی

دربار گاہِ قدس مگر شاعرے نہ بود
تا بہر نغمہ سنجی حمد و ثنا شدی

در سیرت است حاجت تحقیق نکتہ
تا خود کنوں بہ بارگہِ مصطفےٰ شدی

یا جلوہ بے حجاب تمنا است کز جہاں
مستانہ وار در حرم کبریا شدی

مادر فغان و ہیچ نہ پرسی زحال من
آخر کنوں چہ شد کہ تو نا آشنا شدی

ایں خستہ را بہ منزل مقصود ہم رساں
آخر نہ خود ز لطف و کرم رہنما شدی

اے راہبر بماں کہ شتابت نمی سزد
تو بخت قوم ہستی و خوابت نمی سزد

غافل زحالِ ملت بیضا چگونہ	خامش دریں قیامت صغریٰ چگونہ
ما خاکیاں بہ ماتم تو خاک برسریم	تو برفراز چنبر مینا چگونہ
اینجا دلت طپید ہجران مصطفےٰ	در خلوت وصال بفرما چگونہ
در فکر قوم سیر چمن خوش نداشتی	در حیرتم بخلد شکیبا چگونہ
اہل جناں بحسن کلام تو کے رسند	در بزم خلد انجمن آرا چگونہ
در چار دانگ دہر نظیرت نہ داشتی	اینجا یگانہ بودۂ آنجا چگونہ
ما بے تو ہم چو عسکرے بے شاہ ماندہ ایم	اے تاجدارِ فضل تو بے ما چگونہ
با خاکیانِ تیرہ درون سخت زیستی	با قدسیانِ عالم بالا چگونہ
دیر است تاز حالِ تو آگاہ نیستیم	بارے بہ گوبہ چاکرِ خود تا چگونہ

وقت است سرد را کہ سراز خواب برکنی
برحال خستگان بہ عنایت نظر کنی

بنگر کہ حالِ ما بفراقِ تو چوں شد است	از دیدہ خواب رفتہ واز دل سکون شدست
ہر نقش آرزو کہ برانگیختم ز دل	چوں رشتۂ نگاہ کنوں غرق خوں شد است
آں ندوہ کز فیوضِ تو مہدِ کمال بود	ہر خام را ستیزہ گہِ آزموں شد است
وآں نیشنل کہ ہمت تو دادہ اش وجود	یکسر خراب وخستہ وخوار وزبوں شد است
باغے کز آبیاریٔ تو خرمی گرفت	تاراجِ فتنہ سازی چرخ حروں شد است
جامے کہ پر ز بادۂ نابش گذاشتی	چوں کاسۂ سپہر دگر واژگوں شد است
دارالمصنّفین کہ بہشت فیوض تست	می سود سر بہ چرخ مگر بے ستوں شد است
بدخواہ دیں کہ چیداساس حصار کذب	باز از گلولہ باری کلکت مصون شدست
تو چوں کلیم طور نشینِ وصال وقوم	از سادگی فریفتۂ ہر فسوں شدست

برخیزد با ز لطف بہ اہل نیاز کن
بر مادرِ خزینۂ تحقیق بازکن

نوحۂ استاذ

از خاکسار سلیمان ندوی

اے متاعِ عزتِ پیشیں کے پیچھے کارواں
آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشاں

شامِ اقبالِ گزشتہ! مقطعِ عہدِ سلف!
شمعِ بزم! صحبتِ آخر! نشانِ رفتگاں

غنچۂ فصلِ پسیں! موجِ نسیمِ صبح دم!
نغمۂ آخر سحر! مرغِ گلستانِ خزاں

علم وفن کا عشق تھا جس کی طبیعت کا خمیر
صفحۂ قرطاس جس کا فخرِ قومی کا نشاں

جس کے لب کی جو صدا تھی نوحۂ اسلاف تھی
جس کی ہر فریاد تھی صورت درائے کارواں

جس کی ہر رائے زریں آزارِ ملت کا علاج
جس کی ہر تجویز قومی زندگی کی پاسباں

جس کی اِک اِک بات تھی روحِ بلالی کی اذاں
جس کی رگ رگ میں تھیں سوزِ درد کی چنگاریاں

جس کے ہر مصرع میں سوزِ آتشِ زخم دروں
جس کے ہر فقرہ میں مخفی مرہمِ دردِ نہاں

جس کے خامہ کی روانی میں نہاں رودِ فرات
جس کے ہر صفحہ کا دامن رشتِ دریائے عماں

پیکر آرائے سخن جس کا دماغِ نکتہ ور
مرکبِ پروازِ معنی جس کی پانچوں انگلیاں

اب ہمیشہ کے لیے وہ آہ! ہم سے چھٹ گیا
وائے ناکامی ہمارا قافلہ اب لٹ گیا

کیا فریبِ صبر کھائے غم نصیبِ دل فگار
جس کی دولت لٹ گئی کب اس کو دل پر اختیار

جانتا ہوں ہر بشر کو راہ روِ عاجل سفر
جانتا ہوں زندگی کو اِک لباسِ مستعار

جس کے دم سے تھی تسلی جب وہی جاتا رہا
پھر دلِ اندوہ گیں کو کس طرح آئے قرار

یاد آئے جب وہ اس کا فقرۂ نا مختتم
’’آہ سیرت! آہ سیرت چھوڑ کر سب کاروبار‘‘

اس طرف لب توصیہ فرمائے تکمیلِ عمل
اس طرف جاں مبتلائے نزع و رنجِ احتضار

پھر رُکے کس طرح پر شوری قلبِ مضطرب
کس طرح رُک جائے خوں نابی چشمِ اشکبار

اے سروشِ موت! اِک لحہ توقف کر کہ میں
پوچھ لوں ’’اے احمدِ مختار کے سیرت نگار

تیرے اوراقِ پریشاں کس طرح ترتیب دوں
کچھ طریقِ نقد سکھلا، کچھ بتا اندازِ کار

جب سوادِ خطِ ترا آئے گا آنکھوں کو نظر
کس طرح پائے گا قلبِ مضطرب صبر وقرار

اہلِ میت اک توقف پوچھ لوں آقا سے میں | میرے آقا میں فدا! اور جاں مری تجھ پر نثار
تو نے فرمایا کہ ''تاریخ عرب'' تحریر ہو | ہو چکی تعمیل، اب ہو کون دیباچہ نگار

بہرِ تسکینِ دل بے صبر کچھ فرمایئے
میرے آقا پھر ذرا سحرِ بیاں دکھلایئے

کون اب بتلائے مجھ کو طرزِ اعجازِ بیاں | کون پھونکے اب مرے بے جان سے فقروں میں جاں
مرکزِ امید جو تھا آہ وہ جاتا رہا | جذبۂ شوقِ زیارت اب مجھے کھینچے کہاں
اب پرِ پروازِ معنی کون بخشے گا مجھے | پست مضموں کون پہنچائے گا اب تا آسماں
کون کھولے گا مرا اب عقدۂ اشکالِ فن | کون سمجھائے گا رمزِ حسنِ اسلوبِ بیاں
کون دیکھے گا مرا اب زور بازوے قلم | کون دیکھے گا مری جولانی طبعِ رواں
کون نامہ میں کرے گا اب عزیزی! سے خطاب | کس کا ''تم'' کہنا بڑھائے گا مری توقیر وشاں
کس کے نامہ کو بناؤں اب میں عنوانِ خطاب | ''سیدی'' ''مولائی'' ''استاذی'' ''غزالی الزماں''
اس کی مجلس تھی تماشا گاہِ اربابِ نظر | آہ اے دستِ اجل تو نے مٹایا وہ سماں
میں نے جب پوچھا بتائے اس نے ہرفن کے رموز | اب اگر چاہوں تو ڈھونڈوں آہ کس کا آستاں
جب اسے دیکھا نئی روحِ عمل پیدا ہوئی | اس کی باتیں جب سنیں پائی نئی تاب وتواں

اس دلِ پرشور میں گر شور تھا تو اس سے تھا
میرے بازو میں اگر کچھ زور تھا تو اس سے تھا

تیرے فرزندانِ ندوہ تیری کوشش کے ثمر | کم سنی ہے سہ نہیں سکتے ابھی رنجِ پدر
کچھ ابھی بچے ہیں رازِ مرگ سے واقف نہیں | رو کے مچلے ہیں کہ کیوں آقا نے چھوڑا ہے یہ گھر
کیا ابھی جانیں یہ خوں نابہ فشانی چشم کی | کس طرح سمجھائیں ان کو صدمۂ داغِ جگر
نوجواں جو ہیں وہ کہتے ہیں کہیں ایسا نہ | ہو ملالِ طبع ہم سے باعثِ عزمِ سفر
کس ہوس سے تو نے ان کی تربیت فرمائی تھی | آہ کس امید سے تو نے لگائے تھے شجر
باغباں کیا رک نہیں سکتے ہوا گلی فصل تک | لوگ کہتے ہیں کہ اب کی لائیں گے یہ برگ وبر
طاقت پرواز تک تاخیر کرنی تھی ضرور | اب نکل آنے لگے تھے بازوؤں پر بال وپر
جب کبھی باہر ہوا جانا تو ان سے مل گئے | وعدۂ دیدار کیوں اٹھا ہے اب کی حشر پر

ان کی خاطر سے ہوئے اکثر ارادے ملتوی | ملتوی ہو جائے کچھ دن کے لیے عزمِ سفر
اور اگر کارِ ضروری ہے کہ ٹل سکتا نہیں | عرض اتنی ہے کہ ہو ان کی یتیمی پر نظر

اپنے بچوں کا کوئی سامان کرنا تھا ضرور
پھر خدا جانے کہ ملنا کب ہو اور جانا ہے دور

تو نے جب چھیڑا ہے کوئی سخت یا آسان کام | نا پسند آیا ہے اس کو چھوڑ دینا نا تمام
مقصدِ اعظم ترا یعنی بنائے درس گاہ | جس میں طرزِ نو سے ہو تعلیمِ فن کا انتظام
شائقِ فن کے لیے سامانِ تکمیلِ علوم | اور اک چھوٹی سی تصنیفی جماعت کا قیام
تھے ابھی پیشِ نظر کچھ اور قومی مسئلے | نشر دیں، تعطیلِ جمعہ، انتظامِ وقفِ عام
ان مقاصد کے علاوہ اور بھی تھے کچھ امور | تیرے ہاتھوں سے ابھی پانا تھا جن کو انصرام
کام ادھورے ہیں، بہت پھر کیوں ہوا عزمِ سفر | اس قدر تو ہو توقف ان کا بن جائے نظام

لوگ ٹھہرائیں جنازہ پوچھ لوں بھولا نہ ہو
یا ہوا اس وقت اور عالم میں کہیں ایسا نہ ہو

کوچ ہوتا ہے جہاں سے قوم کے غمخوار کا | کون ہو اب چارہ ساز اس ناتواں بیمار کا
شغلِ دائم جس کا تھا غم خواری دین میں | اب وداعِ دائمی ہوتا ہے اس غمخوار کا
وقفِ ماتم جو رہا جب تک کہ اس میں جاں رہی | کون اب ماتم کرے اس جانِ ماتم کار کا
سوگوار اپنے بزرگوں کا رہا جو عمر بھر | کون ہو اب سوگوار اس سوگوارِ زار کا
خون روئے جس نے قومی بے کسی پر تیس سال | نوحہ گر ہو کون اب اس دیدۂ خونبار کا
تھا صفِ میدانِ ملت کا وہی شمشیر زن | عرصۂ ہیجا میں ہو کون اب حریفِ اغیار کا
دل نہ تھا پہلو میں اس کے پارۂ سیماب تھا | یا سراپا زخم خوردہ درد کی تلوار کا
چارہ گر آزارِ قومی کا جو تھا رخصت ہوا | مدعی کو ہے صلا! اب چارۂ آزار کا
بے نواز داستانِ غم نہ تھی اس اس کی زباں | اِک ترانہ تھا وہاں میں لحنِ موسیقار کا

عالمِ اسلام میں تھا اک وہی روشن دماغ
آہ اس تاریک خانہ کا وہی تھا اک چراغ

وداعِ شبلی

از خان بہادر مولوی رضا علی صاحب وحشت کلکتہ

خوں می چکد ز ناصیۂ داستانِ ما — آہ از وفاتِ شبلی شیوا بیان ما
ما خستگانِ خنجر جور زمانہ ایم — غیر از متاعِ درد مخواہ از دکان ما
اسلامیان بہ ماتم شبلی نشستہ اند — ہے ہے چو روئے کفر سیہ شد جہان ما
زین بزم آں مورخ بالغ نظر گذشت — کز رفتنش برفت اثر داستانِ ما
آں نو بہارِ گلشن صدق و صفا نماند — شد پائمالِ جور ز خزاں گلستانِ ما
آں خضر پے خجستہ کجا رفت ظاہر است — با منزل آشنا نہ شود کاروانِ ما
آں نکتہ دانِ بزم تغزل کجا شتافت — شد بے چراغ مجلسِ عشرت نشانِ ما
از قند پارسی کہ ز لبہاش می چکید — ایراں بہ رشک بود ز ہندوستان ما

صد حیف آں ادیب اریب از میاں بہ رفت
وحشت نہ ماند لذت کام و دہانِ ما

قطعۂ تاریخ

از جناب خواجہ عزیز الدین صاحب لکھنوی

المتوفی ۱۳۳۳ھ-۱۹۱۵ء

آہ! سرِ دفتر اربابِ کمال — کہ ز دفتر کدۂ فانی رفت
حاکم محکمہ علم و حکم — ناظم ملک سخن دانی رفت
فاضل و افضل و بے مثل نماند — کامل و اکمل و لاثانی رفت
باکمالے کہ تو آگاہی ازد — ہمہ دانے کہ تو می دانی رفت
ہمتش بیں کہ بیک پائے آخر — تا بہ منزل گہ روحانی رفت
راہ داں آمد و ہم راہ شناس — رہِ دشوار بہ آسانی رفت
بر دل و جانِ من از رفتن او — رنج روحانی و جسمانی رفت

خاست چوں از سرِ جان ہاتف گفت
مولوی شبلی نعمانی رفت

قطعاتِ مرثیہ و تاریخ

از

ہیچ مداں سلیمان

کون کہتا ہے کہ زیرِ خاک ناپیدا ہوا
شبلی سیرت نگارِ مرسلِ قدسی سرشت
عشقِ پیغمبر میں فرقت سے بہت بےچین تھا
لے گیا ہے شوقِ دیدارِ نبی سوئے بہشت

فلک پہ دھوم ہوئی عاشقِ رسولِ اممؐ
سوانحِ نبویؐ کر رہا ہے خوب رقم
ہوا یہ حکمِ الٰہی مجھے پسند آیا
حضور میں اسے لاؤ بصد وقار و حشم

برائے لوحِ مزار

سعدیِ عصر و غزالیِ زمان خلدونِ وقت
شبلی نعمانی والا گہر عالی سرشت
سیزدہ صد بود وسی و دو در روز پنجمیں
بست و ہشت ماہِ ذی الحجہ کہ ایں منزل بہشت

۱۳۳۲ھ   چہار شنبہ   ۲۸ ذی الحجہ

قطعۂ تاریخ

از

مولوی سید احمد مرتضیٰ نظر صاحب، وکیل سرونج (مالوہ)

مولف آثار مالوہ و صولت شیر شاہی

چو علامہ شبلی پاک باطن
بحکمِ الٰہی ز دار فنا رفت
نظر ہاتف غیب سال وفاتش
بگفتا کہ "شبلی بہ دار بقا رفت"

۱۳۳۲ھ

PRINT ART Delhi Ph.: 23654222, Fax 23514268

ISBN 81-906613-3-7

9 788190 661331